الکوکب الدّرّی

شرح جامع التّرمذی

جلد دوم

ابواب الصّلوٰة

افادات

ابوحنیفۂ عصر، بخاری دھر، جنید وشبلی دوراں، رئیس الطائفہ، قطب الاقطاب

حضرت اقدس مولٰینا رشید احمد گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ

ناقل وجامع افادات

الشیخ الادیب الاریب بحر العلوم حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

محشی

برکۃ العصر حضرت الشیخ مولینا محمّد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ، ضروری اضافات وعنوانات

ابوطلحہ محمّد زکریا مدنی ظلہ العالی

اُستاذِ حدیث جامعہ معہد الخلیل الاسلامی

ناشر مکتبۃُ الشّیخ

۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔ فون: ۰۲۱-۳۴۹۳۵۴۹۳

الکوکب الدری

شرح جامع الترمذی

جلد دوم

ابواب الصلوٰۃ

افادات

ابوحنیفۂ عصر، بخاریٔ دہر، جنید و شبلی دوراں، رئیس الطائفہ، قطب الاقطاب

حضرت اقدس مولینا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

ناقل وجامع افادات

[illegible] الاریب بحر العلوم حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

محشی

برکۃ العصر حضرت الشیخ مولینا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب جدید مع اضافات وعنوانات

ابوطلحہ محمد زکریا مدنی مدظلہ العالی

ناشر مکتبۃ الشیخ

۴۴۵/۳، بہادر آباد، کراچی نمبر ۵۔ فون: ۳۴۹۳۵۴۹۳-۰۲۱

تقریظ

عمدة الفقهاء والمحدثین، شیخ الاسلام، فضیلة الشیخ

حضرت مولانا المفتی القاضی محمد تقی العثمانی افاض اللہ فیوضهم علی العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد:

عزیز گرامی قدر جناب مولانا محمد زکریا صاحب مدنی حفظہ اللہ تعالیٰ نے قطب الارشاد
حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی تقریر ترمذی "الکوکب الدری"
اور اس پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ کے حواشی کو
اپنی ترتیب اور عنوانات کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے جس کا پہلا حصہ جو
"کتاب الطہارۃ" پر مشتمل ہے، پہلے شائع ہو چکا ہے، اور اب کتاب الصلاۃ کا
حصہ شائع ہو رہا ہے۔ بندہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس سے استفادہ
نہیں کر سکا، لیکن حضرت مولانا محمد عاقل صاحب مدظلہم نے
اس کے کچھ حصوں کو دیکھ کر اس کی تصدیق و تصویب فرمائی ہے، اور
عزیز موصوف کی صلاحیت سے بھی امید ہے کہ ان شاء اللہ ترجمہ
صحیح ہوگا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس خدمت کو اپنی رضائے کامل
کے ساتھ قبول فرمائیں، اور نافع بنائیں۔ آمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۸ر شوال ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین حمد الشاکرین والصلوٰۃ والسلام علی خیر البریۃ محمد بن عبداللہ خاتم النبیین وعلیٰ آلہ وصحبہ الطاھرین وعلیٰ من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

قطب الارشاد والتکوین رئیس الطائفۃ حضرت العلامہ مولانا رشید احمد گنگوہی الایوبی الانصاری قدس اللہ سرہ العزیز کی ذاتِ بابرکات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حجۃ اللہ فی الارض رئیس المتکلمین والمناظرین قاسم العلوم والخیرات حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز دارالعلوم دیوبند کے مؤسس اور بانی تھے تو حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ دارالعلوم دیوبند کی اساس اور بنیاد تھے۔ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی اس کے بعد سے ربع صدی تک دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اعلیٰ حضرت گنگوہیؒ ہی تھے۔ حضرت والا کی سرپرستی کا یہ دور دارالعلوم دیوبند کے عروج کا دور ہے۔ اسی دور میں دارالعلوم دیوبند کی شہرت اوج ثریا تک جا پہنچی۔ مکتبۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس مکتبۂ فکر کے عقائد، نظریات، طرزِ حیات اور انکے علمی و عملی کمالات سے باخبر ہوتا کہ ان کی تقلید کرتا رہے کیونکہ عمل کا درجہ تو علم کے بعد کا ہے۔ اسی طالبعلمانہ تشنگی کی خاطر حضرت قطب الارشاد کی تقریر ترمذی کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی یہ ایک سعی ہے۔ کتاب الطہارۃ کے بعد اب کتاب الصلوٰۃ کے حصہ کو اللہ پاک نے اپنے فضل خاص وتوفیق سے مکمل کرنے کی سعادت بخشی۔

☆ کتاب الطہارۃ کے حصہ کی اشاعت کے بعد حضرات اکابر کی طرف سے حوصلہ افزائی اور تشجیعی کلمات سننے کو ملے۔ بعض اکابر خاصکر جن کو روزانہ کی بنیاد پر حضرت گنگوہیؒ کے علوم اور خاص کر اس تقریر ترمذی سے استفادہ کا موقع کئی عشروں سے حاصل رہا۔ ان حضرات نے اس عاجز سے یہ بھی فرمایا کہ ''اکابر کی روح آپ سے خوش ہوئی ہے۔ وغیرہ'' وقد قال العلامۃ القاری فی المرقاۃ السنۃ الخلق اقلام الحق۔ یہ کلمات سننے سے امید بندھی ہوئی ہے کہ شاید روزِ محشر ان اکابر کے جھنڈے تلے حشر نصیب ہو وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ بہرحال ان امور بالا کے سبب اس جلد ثانی کی نشر واشاعت اور اس کے مراحل کی طرف اپنی سعی اور کوشش کو مبذول کر رکھا جواب آپ کے سامنے ہے۔

☆ اس کتاب الصلاۃ میں گزشتہ کتاب الطہارۃ کی مانند جامع ترمذی کا مکمل متن اس کے الفاظ واعراب کی تصحیح اور ترجمہ کے بعد تشریح کے عنوان کے تحت حضرت قطب الاقطاب کی تقریر ترمذی کو رکھا گیا ہے۔

☆ اس کتاب الصلاۃ میں خاصکر جہاں حضرت شیخ الحدیثؒ نے حاشیہ میں ''والبسط فی الاوجز/کذا فی الاوجز'' وغیرہ الفاظ سے حوالہ دیا ہے وہاں حضرت شیخ الاسلام شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ارشاد مبارک'' آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھا ہے یا اوجز کا اشتہار دیا ہے الخ'' ان الفاظ کے یاد آنے پر ان مباحث کے بقایاجات

کواوجز المسالک سے تفصیلی طور پر جمع کرنے کی سعی بھی کی ہے۔اس طرح تقریر کا حجم بڑھتا ہی چلا گیا۔

☆ گاہے گاہے سندِ حدیث کے رواۃ کے حالاتِ زندگی کو حسبِ ضرورت حافظ کی تہذیب یا علامہ مزّی کی تہذیب الکمال سے ذکر کر کے ان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

☆ احادیثِ مبارکہ کے ترجمہ کرتے وقت اس کے متعلق مباحث کو سامنے رکھ کر جو مفہوم اقرب الی الفہم تھا وہ ترجمہ پیش کیا گیا۔کہاں اذا ظرفیہ ہوگا؟اور کہاں شرطیہ؟ان امور کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

☆ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت قطب الاقطاب گنگوہیؒ کو علم حدیث میں وسعت نظر اور احادیثِ مختلفہ میں تطبیق کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا ایسے ہی مسائل فقہیہ میں حضرت والا کو درجہ اجتہاد حاصل تھا۔کتاب الصلوٰۃ میں دسیوں مقامات پر حضرت والا نے مشہور مذہب حنفی کے خلاف، دوسرے پہلو کو اختیار فرما کر اس پر دلائل قائم فرمائے۔ایسے متعدد مقامات پر اس عاجز نے کتب متداولہ کے حوالہ جات ذکر کئے ہیں اور حضرت والا کے مختار مذہب کو واضح کیا ہے۔

☆ بقول حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب مدفیوضھم حضرت شیخ الحدیثؒ ساری زندگی یہی فرماتے رہے کہ میں تو ایک طالب علم ہوں الخ شروع ہی سے تصنیف کا چسکہ خاصکر بذل المجہود کی تصنیف کے بعد تصنیف کے چسکہ کے ساتھ ساتھ اکابر سے ورثہ میں ملا ہوا تحقیقی ذوق اللہ پاک نے آپ کو خوب عطا فرما تھا۔اسلئے حاشیہ میں حضرت گنگوہیؒ کی تحقیق پر اپنا تبصرہ بلکہ عموماً اس کے خلاف ہی تحقیق کو دلائل سے مبرھن فرماتے ہیں جیسا کہ ذوقِ مطالعہ رکھنے والے پر مخفی نہیں۔ ومن لم یذق لم یدر اس حاشیہ نے اس تقریر ترمذی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔اس عاجز نے اس تقریر ترمذی کی مباحث طویلہ کی تقطیع پیراگراف بدل بدل کر کی ہے۔نیز ہر صفحہ پر متعدد عنوانات مفیدہ کا اضافہ کیا ہے۔یہی عنوانات درحقیقت اس تقریر کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں۔

☆ تحقیقی مسائل، تفصیلی مباحث کے موقع پر اس عاجز نے حوالہ کے ساتھ کچھ اضافے بھی کئے ہیں مثلاً صلوٰۃ الوسطی کی تعیین میں حافظ کے کلام سے بیس اقوال اور ساعۃ فی یوم الجمعۃ کی تعیین میں بیالیس اقوال نقل کئے ہیں۔حدیث المسیئ فی الصلوٰۃ میں کئے جانے والے اضافے، مسئلۃ رفع الیدین میں خصم کے دلائل کا ایک جائزہ وغیرھا من المباحث۔

☆ بہر حال اپنے ناقص علم کے مطابق سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعریب اور اس کی اردو میں منتقلی کے ساتھ اس فرمان نبوی کی تشریح میں اکابر کے کلام کو ذکر کیا ہے۔جو ذرہ خیر اس میں ہے وہ محض توفیقِ خداوندی اور اسکا فضل و انعام ہے اور جو کچھ کمی کوتاہی ہے اسے میری طرف منسوب کیا جائے اور اس عاجز کو مطلع فرمایا جائے تاکہ اس پر غور وخوض ہو سکے۔

یہی میرا راز و نیاز ہے　　کہ اسیرِ زلفِ رشید ہوں
اسی سلسلہ کا مرید ہوں　　میرا اس پہ دار و مدار ہے

محمد زکریا مدنی
۱۷ / شوال المکرم ۱۴۳۳ھ

فہرستِ ابواب و مضامین

❀.....☆.....❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ابواب الصلاۃ عن رسول اللہ ﷺ﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نماز کے ابواب کا تفصیلی بیان

باب ما جاء فی مواقیت الصلوۃ عن النبی ﷺ

اوقاتِ نماز کا بیان جو احادیثِ مرفوعہ میں مذکور ہیں

☆حدثنا هَنَّاد بن السری حدثنا عبد الرحمن بن ابی الزناد عَن عبد الرحمن بن الحرث بن عیاش بن ابی ربیعة عن حکیم بن حکیم وهو ابن عباد بن حنیف قال اخبرنی نافع بن جبیر بن مطعم قال: اخبرنی ابن عباس ان النبی ﷺ قال: اَمَّنِی جِبْرِیلُ علیه السلام عِنْدَ الْبَیْتِ مَرَّتَیْنِ ، فَصَلَّی الظُّهْرَ فِی الْاُولٰی مِنْهُمَا حِینَ کَانَ الْفَیْءُ مِثْلَ الشِّرَاكِ، ثم صَلَّی الْعَصْرَ حِینَ کَانَ کُلُّ شَیْءٍ مِثْلَ ظِلِّهِ ، ثُمَّ صَلَّی الْمَغْرِبَ حِینَ وَجَبَتِ الشَّمْسُ، وَاَفْطَرَ الصَّائِمُ ، ثُمَّ صَلَّی الْعِشَاءَ حِینَ غَابَ الشَّفَقُ، ثم صَلَّی الْفَجْرَ حِینَ بَرَقَ الْفَجْرُ وَحَرُمَ الطَّعَامُ عَلَی الصَّائِمِ۔

وَصَلَّی الْمَرَّةَ الثَّانِیَةَ الظُّهْرَ حِینَ کَانَ ظِلُّ کُلِّ شَیْءٍ مِثْلَهُ، لِوَقْتِ الْعَصْرِ بِالْاَمْسِ، ثُمَّ صَلَّی الْعَصْرَ حِینَ کَانَ ظِلُّ کُلِّ شَیْءٍ مِثْلَیْهِ ،ثُمَّ صَلَّی الْمَغْرِبَ لِوَقْتِهِ الْاَوَّلِ، ثُمَّ صَلَّی الْعِشَاءَ الآخِرَة حِینَ ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّیْلِ،ثُمَّ صَلَّی الصُّبْحَ حِینَ اَسْفَرَتِ الْاَرْضُ، ثُمَّ الْتَفَتَ اِلَیَّ جِبْرَئِیلُ فقال: یَا مُحَمَّدُ، هٰذَا وَقْتُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِكَ، وَالْوَقْتُ فِیمَا بَیْنَ هٰذَیْنِ الْوَقْتَیْنِ۔ قال ابو عیسی:وفی الباب عن ابی هریرة، وبریدة، وابی موسی ، وابی مسعود، الانصاری، وابی سعید وجابر وعمرو بن حزم والبراء وانس۔

☆حدثنا احمد بن محمد بن موسی اخبرنا عبد اللّٰه بن المبارك اخبرنا حسین بن علی بن حسین اخبرنی وهب بن کیسان عن جابر بن عبد اللّٰه عن رسول اللّٰه ﷺ قال: اَمَّنِی جِبْرِیلُ فَذَکَرَ نَحْوَ حدیثِ ابنِ عباسٍ بمعناه، ولم یذکرفیه لوقت العصر بالامس قال: وحدیث جابر فی المواقیت قدرواه عطاء بن ابی رباح وعمرو بن دینار وابو الزبیر عن جابر بن عبد اللّٰه عن النبی ﷺ

نحو حدیث وھب بن کیسان عن جابر عن النبی ﷺ ۔ قال ابو عیسیٰ حدیث ابن عباس حدیث حسن وقال محمد: أَصَحُّ شيءٍ في المواقیت حدیث جابر عن النبی ﷺ۔

﴿ترجمہ﴾

جبیر بن مطعم فرماتے ہیں کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے دو مرتبہ (دو دن) بیت اللہ کے پاس میری امامت کروائی پس ان دو (دنوں) میں سے پہلے دن ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ سایہ (جوتے کے) تسمہ کے مثل ہوتا ہے (اس کو سایہ اصلی بھی کہتے ہیں۔ یہ وقت زوال کے متصل ہوتا ہے) پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو گیا۔ پھر مغرب کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد پڑھائی جس وقت روزہ دار نے روزہ افطار کر لیا (یعنی جب روزہ داروں کے روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا) پھر شفق غائب ہونے کے بعد عشاء کی نماز پڑھائی۔ پھر فجر پڑھائی جبکہ طلوع فجر ہو گئی اور روزہ دار پر کھانا حرام ہو گیا (یعنی روزہ شروع ہونے کے وقت) اور (دوسرے دن) دوسری مرتبہ ظہر کے نماز اس وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو گیا یعنی جس وقت گذشتہ دن عصر کی نماز پڑھائی تھی۔ (یہاں گزشتہ دن کی عصر کے وقت کہا حالانکہ یہ وقت بالکل اسکے متصل بعد کا تھا جب مثلِ ثانی شروع ہو چکا تھا لیکن وقت اتنا قریب تھا گویا کہ وہی وقت ہو اسلئے راوی نے گذشتہ دن کی عصر کا وقت فرمایا) پھر عصر کی نماز پڑھائی جس وقت ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو گیا پھر مغرب اس کے پہلے دن والے وقت میں پڑھائی (یعنی گذشتہ دن کی مغرب جس وقت پڑھائی تھی) پھر عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا۔ پھر صبح (فجر) کی نماز اس وقت پڑھائی جب زمین روشن ہو گئی۔ پھر جبرئیل علیہ السلام میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے محمد! یہ آپ سے پہلے انبیاء کا وقت ہے اور ان دونوں اوقات کے درمیان (نماز کا) وقت ہے۔ اور باب میں حضرت ابو ہریرہ بریدہ ابو موسیٰ، ابو مسعود، ابو سعید، جابر، عمرو بن حزم، براء اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

حدیث نمبر۲: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے میری امامت کروائی پس (امام ترمذی نے فرمایا کہ) انہوں (جابرؓ) نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کی ہم معنیٰ حدیث ذکر فرمائی اس میں لوقت العصر بالامس (کے الفاظ) ذکر نہیں فرمائے اور جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو نماز کے اوقات سے متعلق ہے اس کو عطاء بن ابی رباح اور عمرو بن دینار اور ابو زبیر (تینوں

راوی) جابر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح نقل کرتے ہیں جس طرح وھب بن کیسان، جابر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن ہے اور امام محمد رحمہ اللہ (بخاری) فرماتے ہیں جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے مواقیت کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے شافعیہ کا استدلال ''اقتداء المفترض خلف المتنفل'' جائز ہے: (قولہ امنی جبرئیل الخ) اس حدیث سے شوافع نے اپنے دعویٰ پر استدلال کیا ہے کہ اقتداء المفترض خلف المتنفل جائز ہے کیونکہ جبرئیل علیہ السلام پر نماز فرض نہیں تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی؟

حدیثِ باب کے جوابات: جواب (۱) جب جبرئیل علیہ السلام کو نماز پڑھانے کا حکم دیا گیا[۱] تو ان پر بھی یہ دس نمازیں فرض ہوگئیں۔ اگرچہ اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ مکلف نہیں ہیں اور نہ تھے۔ لہٰذا یہ مفترض کی نماز متنفل کے پیچھے نہیں بلکہ مفترض کی نماز مفترض کے پیچھے ہے۔

جواب نمبر (۲):[۲] شاید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام نمازوں کا جو جبرئیل امین علیہ السلام کی اقتداء میں پڑھی تھیں بعد میں اعادہ فرمالیا ہو۔ یہ تاویل بعید تو ہے لیکن اس کا احتمال ضرور موجود ہے۔

مکہ مکرمہ کے رہائشی کیلئے عینِ کعبہ کا استقبال فرض ہے: (قولہ عند البیت) اس جملہ سے اشارہ[۳] ہے کہ مکہ کے رہنے والے پر عینِ کعبہ کا استقبال فرض ہے، صرف جہتِ کعبہ کیطرف منہ کرنا کافی نہیں۔

---

۱ چنانچہ امامت جبرئیل والی حدیث میں "بھذا امرت" کی تصریح ہے۔ اور یہ لفظ ت کے زبر اور پیش دونوں طرح ضبط کیا گیا ہے جیسا کہ امام نووی نے تصریح کی ہے۔

۲ **جواب نمبر (۳):** یہاں ایک تیسری توجیہ ہے کہ حضور علیہ السلام بھی اس وقت متنفل تھے کیونکہ ابھی تک نماز کی تفصیلی کیفیت معلوم نہ ہوئی تھی۔ حضور گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس توجیہ کی طرف آگے جا کر اشارہ فرمایا ہے۔

۳ لیکن یہ استدلال اس پر موقوف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوں حالانکہ مشہور تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کا قبلہ شام (بیت المقدس) تھا البتہ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف رخ کرتے تھے۔

جبرئیل امین علیہ السلام کے نمازِ ظہر میں تشریف لانے کی حکمت (فجر میں تشریف کیوں نہ لائے): یہاں پر یہ امر قابلِ تنبیہ ہے کہ نماز تو لیلۃ الاسراء میں فرض ہوئی تھی لیکن نماز کی کیفیت معلوم نہیں تھی کہ کس طرح پڑھنی ہے اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز ادا نہیں فرمائی کیونکہ اس کی پوری کیفیت کا علم نہ تھا البتہ لیلۃ الاسرٰی میں پانچ نمازوں کی فرضیت سے اس حکم کے برحق ہونے کا عقیدہ رکھنا ضروری تھا لیکن ان نمازوں کا ادا کرنا واجب نہیں تھا۔ پھر جب جبرئیل علیہ السلام نے ظہر کی نماز پڑھائی تو نماز کی کیفیت معلوم ہوگئی اب نماز کا ادا کرنا بھی فرض ہو گیا۔

حین کان الفیء مثل الشراک پر اشکال اور اسکا جواب: (یہاں پر اشکال ہے کہ ظہر کی نماز کا ابتدائی وقت اسوقت شروع ہوتا ہے جب سایہ اصلی (نصف النہار کے وقت کے سایہ) کے علاوہ کچھ سایہ ظاہر ہو لیکن حدیثِ مبارکہ میں سایہ اصلی کا ذکر نہیں؟ اس اشکال کا جواب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ دے رہے ہیں۔ از مترجم) یعنی زوال کے سایہ کے علاوہ اس قدر (تسمہ کے بقدر) سایہ مزید ہو گیا تو مخاطب کی سمجھ پر اور دوسری مفصل روایت پر اعتماد کرتے ہوئے اس جملہ کان الفیء مثل الشراك کو ذکر کیا (ورنہ سایہ اصلی کے علاوہ یہ سایہ تسمہ کے بقدر تھا)۔

نیز فیئ کا لغوی معنیٰ رجوع کا ہے لہٰذا اس سے مراد زوال کے وقت کا سایہ ہے کیونکہ استواءِ شمس کے وقت والے سایہ پر فیئ لغوی معنی کے اعتبار سے صادق نہیں آ سکتا۔ اس کلام کی یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس زمانہ میں مکہ میں عین استواء کے وقت سایہ اصلی بالکل نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا تھوڑے سے سایہ کا ذکر فرمانا صحیح ہے۔

عصر کے ابتدائی وقت کا بیان: (ثم صلی العصر حین کان کل شیئ مثل ظله [1]) یعنی سایہ اصلی کو چھوڑ کر ایک سایہ مزید بڑھ گیا تھا...... یا یہاں ایک تخمینہ اور اندازے کا ذکر ہے کہ تقریباً سایہ ایک مثل ہو گیا تھا اب اگر یہ ثابت ہو

---

[1] **ظہر کے وقتِ آخر اور عصر کے وقتِ اول میں اختلاف:** ائمہ ثلاثہ، صاحبین، ابوثور، داؤد ظاہری وغیرہ کا مذہب اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ مثل اول پر ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مشہور روایت مثلین والی ہے۔ عطاءؒ کے نزدیک ظہر کا وقت سورج کے زرد ہونے تک اور طاؤسؒ کے نزدیک ظہر وعصر کا وقت رات تک رہتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ظہر کا مستحب وقت مثل اول تک ہے البتہ ظہر کی نماز غروب شمس سے اتنے وقت پہلے تک پڑھی جاسکتی ہے جتنے وقت میں عصر ادا کی جاسکے۔ کذا فی المغنی لابن قدامة۔ اوجز المسالک میں ہیکہ امام مالکؒ اور ایک جماعت کے نزدیک مثل اول پر عصر کا وقت داخل ہوجاتا ہے اور ظہر کا وقت ختم نہیں ہوتا بلکہ مثلِ اول کے بعد چار رکعت کے بقدر وقت میں ظہر اور عصر دونوں پڑھ سکتے ہیں۔ بعض شافعیہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک دونوں نمازوں کے وقت میں تھوڑا سا فصل ہے۔ جمہور کے نزدیک نہ کوئی مشترک وقت ہے اور نہ دونوں وقتوں کے درمیان کوئی فصل ہے۔

جائے کہ حجاز میں عین نصف النہار کے وقت بالکل سایہ نہیں ہوتا تھا تو پھر کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ثم صلی العصر کا معنی یہ ہے کہ مثل اول پر عصر کی نماز شروع فرمائی تھی یہ مطلب نہیں کہ مثل اول پر عصر کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے (از مترجم: اس تشریح سے مالکیہ کا مذہب باطل ہو جائے گا جن کے نزدیک چار رکعت کی مقدار وقت ظہر اور عصر میں مشترک ہے وہ اس جملہ سے استدلال کرتے ہیں تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے)۔ فافہم

(حین وجبت الشمس) یعنی سورج غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھی۔

(قولہ افطر الصائم) یہ جملہ مزید تعجیل کیلئے بطور تاکید کے ہے اور اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد بغیر انتظار کئے نماز پڑھ سکتے ہیں اسکی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان "ثم اتموا الصیام الی اللیل" یہ آیت واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ روزہ دن میں اپنے آپ کو اشیاء ثلثہ اکل وشرب و جماع سے روکنے کا نام ہے۔ رات کا کوئی جزء روزے میں داخل نہیں لہٰذا حدیث باب میں افطار کے ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ غروبِ شمس کے بعد مغرب کی نماز کے وقت داخل ہونے کیلئے کسی بھی چیز کا انتظار نہ کیا جائے جیسا کہ افطار کے وقت کے داخل ہونے کیلئے مزید انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ غروب ہونا ہی افطار کے وقت کی علامت ہے اور بس۔

شفق کی تعیین میں علماء کا اختلاف: (ثم صلی العشاء حین غاب الشفق) شفق کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس شفق کے معنی کی تعیین میں اختلاف کی وجہ سے مغرب کے وقتِ آخر اور عشاء کے وقتِ ابتداء میں اختلاف مرتب ہوگا۔

بروق کے متعلق علماء احناف کے دو قول: (قولہ ثم صلی الفجر حین برق الفجر) (از مترجم: نماز اور روزہ میں جہاں حتی یتبیّن لکم الخیط الابیض اور برق الفجر مذکور ہے وہاں تبیین اور بروق سے کیا مراد ہے علماء احناف کے دو قول ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے ان اقوال کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔) اس حدیث کا ظاہر ان کی تائید کر رہا ہے جن کے نزدیک روزہ میں صبح صادق کے نفس الامر میں موجود ہونے پر مدار ہے صبح کی روشنی پھیلنے اور ظاہر ہونے پر مدار نہیں (یعنی جیسے ہی صبح صادق کی پو پھٹے گی فوراً ہی نماز کا وقت داخل ہو جائے گا اور روزہ شروع ہو جائیگا) اور اللہ تعالیٰ کے فرمان حتی تبین لکم الخیط الابیض میں مراد طلوع فجر کا یقین ہونا اور حقیقی طور پر اس کا ظاہر ہونا ہے (یعنی نفس الامر میں)۔ جو علماء روزہ میں روشنی کے پھیلنے کو (اول وقت کیلئے) مدار بناتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں[1] کہ کھانے اور پینے کے مباح ہونے کا مدار روشنی کے نہ پھیلنے پر ہے۔

---

[1] اس سے مراد فریقِ ثانی ہے جو روزہ میں روشنی کے پھیلنے کو مدار بناتے ہیں نہ کہ تحقق الصبح فی نفس الامر کو۔

قرآن کریم نے روشنی کے پھیلنے پر کھانے پینے سے منع کردیا ہے تو اس طرح فجر کا کچھ حصہ رات میں صرف روزہ کے حق میں داخل ہوگا کیونکہ فرض نماز اور فرض روزہ کے درمیان وجہ فرق موجود ہے لہٰذا فجر کی نماز کا وقت تو طلوع فجر فی نفس الامر سے ہی شروع ہو جائیگا اور یہ طلوع فجر، روزہ کے حق میں لاگو نہ ہوگا اور روزہ میں مدار صبح کی روشنی کے پھیلنے پر ہے اس سے دن شروع ہوگا اور یہ حکم نماز کے حق کی طرف متعدی نہ ہوگا بلکہ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں لہٰذا نماز اور روزہ میں سے ہر ایک کے متعلق جو حکم وارد ہوا ہے اس کے ظاہر کے مطابق عمل کیا جائیگا کہ (روزہ میں مثلاً مدار صبح کے روشن ہونے پر ہے لہٰذا اس پر قیاس کرتے ہوئے کوئی یوں کہے کہ نماز فجر بھی صبح کے روشن ہونے کے بعد ہی جائز ہوا ایسا نہ ہوگا وکذا العکس)۔ نیز حدیث باب میں حین برق الفجر مذکور ہے اس سے مراد صبح صادق کا پہلا جزو نہیں ہے بلکہ اس میں بھی یہ احتمال ہے کہ اس سے صبح کی روشنی کا پھیلنا مراد ہو جیسا کہ لفظ قرآن تبیین اور لفظ حدیث برق الفجر اس پر دلالت کر رہا ہے۔ لیکن فریق اول[1] کی طرف سے جواب یہ ہے کہ حدیث میں حرم الطعام کا لفظ دلالت اور تفسیر کر رہا ہے کہ یہاں قرآن میں روشنی کا پھیلنا مراد نہیں بلکہ نفس الامر میں طلوع فجر کا ابتدائی حصہ مراد ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ فجر کی نماز کے وقت کا داخل ہونا روشنی کے پھیلنے پر موقوف نہیں لہٰذا قرآن کریم میں حتی یتبین لکم الخ میں تبین کی تفسیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان حرم الطعام علی الصائم سے ہوگئی کہ اس سے مراد طلوع فجر کا پہلا جزو ہے۔

مثلِ اول پر ظہر کا انتہائی وقت اور عصر کے ابتدائی وقت ہونے کا مطلب: (وصلی الظهر المرة الثانية حين كان ظل كل شئ مثله) یعنی زوال کے سائے کو ملا کر اس کا سایہ ایک مثل ہو چکا تھا۔ (از مترجم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ''زوال کے سایہ کو ملا کر'' یہ قید بظاہر اسلئے لگائی ہے کہ مثل اول پر تو پہلے دن عصر پڑھی تھی تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ دوسرے دن مثل اول پر ظہر کی نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہیکہ سایہ زوال ملا کر مثل اول تھا یعنی زوال کے بعد کا سایہ ابھی مثل اول نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی مثل اول مکمل ہونا باقی تھا۔ راوی نے مثل اول مع سایہ اصلی کا ذکر کیا ہے۔ فللّٰه دره ما ادق نظره)

ایک اہم توجیہ: (لوقت العصر بالامس) عصر کے بعینہ وقت میں نماز ظہر پڑھنا مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ گذشتہ کل عصر کا جو وقت تھا آج ظہر کی نماز اس وقت کے قریب، ذرا پہلے پڑھی گئی۔ (قال الاستاذ ادام الله علوه ومجده وافاض على العالمين بره ورفده: لوقت العصر بالامس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دن مثلِ اول پر نماز عصر شروع کی تھی اور صلی الظهر حين

---

[1] یہ فریقِ اول والوں کی طرف سے فریقِ ثانی والوں کو جواب ہے۔

کان کل شیٔ مثلہ کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے دن مثلِ اول پر ظہر کی نماز ختم ہو چکی تھی تو لفظ صلی کا استعمال فعل صلاۃ کو شروع کرنے کیلئے بھی ہوتا ہے اور فعل صلاۃ سے فارغ ہونے کیلئے بھی، اب مطلب یہ ہوا کہ دوسرے دن ظہر کی نماز سے اسوقت فارغ ہوئے تھے جس وقت میں پہلے دن عصر کی نماز شروع فرمائی تھی۔ و لا یخفیٰ لطفه و لله الحمد [1]

اس جملہ سے صاحبین کا مذہب ثابت ہو رہا ہے: (ثم صلی العصر حین کان ظل کل شیٔ مثلیه) اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کا مستحب وقت سایہ کے دو مثل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے اور یہ امر بھی ظاہر یہ کہ باب مواقیت الصلوٰۃ کی احادیث میں سے کوئی بھی حدیث مثل اول کے بعد عصر کے مکروہ ہونے پر دلالت نہیں کرتی تو اس حدیث میں اشارہ ہے کہ صلوٰۃ عصر کا مستحب وقت مثلِ اول سے لیکر مثلِ ثانی تک ہے تو حدیثِ جبرئیل سے ان علماء کے مذہب کی تائید ہو رہی ہے جن کے نزدیک ظہر کا وقت مثلِ اول [2] پر ختم ہو جاتا ہے۔ فافہم

(ثم صلی المغرب لوقت الاول) اس جملہ سے تنبیہ [3] ہے کہ مغرب کا مستحب وقت مختصر سا ہے ورنہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام مغرب کی نماز دونوں دنوں میں دو الگ الگ وقتوں میں پڑھتے۔

---

[1] **ظہر اور عصر کے اوقات کے درمیان میں کوئی وقت مشترک نہیں:** اس توجیہ کے مطابق مالکیہ وغیرہ نے جو یہ قول کیا ہے کہ چار رکعت کی مقدار وقتِ ظہر اور عصر کے درمیان مشترک ہے اس قول کی ضرورت نہیں پڑتی جمہور کے مذہب میں عصر اور ظہر کے وقتوں کے درمیان نہ کوئی وقت مشترک ہے نہ وقتِ مہمل کیونکہ بہت سی احادیث میں "وقت الظهر ما لم تحضر العصر" کے الفاظ ہیں۔ کذا فی الاوجز

[2] **مثلِ اول سے پہلے نمازِ ظہر ختم کر لینا مبنی بر احتیاط ہے:** یہ صاحبین کا مذہب اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی دوسری مشہور روایت یہ ہے کہ ظہر کی نماز کا وقت مثلین تک رہتا ہے اور عصر کا وقت مثلین کے بعد شروع ہوتا ہے ان کے دلائل کی تفسیر اس کے مقام پر موجود ہے احتیاط اس میں ہے کہ ظہر کی نماز مثلِ اول سے پہلے پڑھے اور عصر کی نماز مثلین کے بعد پڑھے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام میں آ رہا ہے۔

[3] امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شوافع کے محققین علماء نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ مغرب کی نماز شفق کے غائب ہونے تک پڑھ سکتا ہے اور اس پورے وقت کے ہر جزء میں نمازِ مغرب شروع کی جاسکتی ہے اور اول وقت سے تاخیر کرنے پر گنہگار نہیں ہوگا یہی صحیح مذہب ہے۔

نمازِ مغرب کے متعلق حدیث جبرئیل مؤول ہے، اسکی تین تاویلات: حدیثِ جبرئیل میں دونوں دن اول وقت پر مغرب کی نماز پڑھی گئی اس کی کئی وجوہات ہیں:

۱۔ اس حدیث میں وقت مستحب کو بیان کیا گیا ہے نہ کہ وقتِ جواز کو چنانچہ حدیثِ جبرئیل میں ہر نماز کے وقتِ مستحب کو بیان کیا گیا ہے۔ سوائے ظہر کے کہ ظہر کی نماز کے مکمل وقت کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(ثم صلی العشاء الآخرة حین ذهب ثلث اللیل) اس سے معلوم ہوا کہ عشاء کا وقتِ مستحب ثلث اللیل تک ہے اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

(ثم صلی الصبح حین اسفرت الارض) اس حدیث میں فجر کے وقتِ مستحب کا بیان ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ اس حدیث میں وقت کی انتہاء کا بیان ہے لہٰذا طلوعِ فجر سے متصل پڑھنا بھی مستحب وقت ہے۔ بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسفار میں نماز پڑھنا بھی مستحب ہے اور حنفیہ نے اسفار میں فجر پڑھنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں تکثیرِ جماعت ہے جس پر اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔

هٰذا وقت الانبیاء من قبلک پر اشکال: اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچ نمازیں گذشتہ امتوں پر بھی فرض تھیں حالانکہ بعض احادیث میں تصریح ہے کہ عشاء کی نماز اس امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے؟ جواب نمبر ا: انبیاء کرام علیہم السلام پر پانچوں نمازیں فرض تھیں۔[1] تو دوسری امتوں کے لحاظ سے عشاء کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے انبیاء علیہم السلام کے اعتبار سے خصوصیت نہیں۔

جواب نمبر ۲: اس سے مراد[2] یہ ہے کہ پچھلی امتوں کے لئے اکثر نمازوں کا یہی وقت تھا تمام نمازیں مراد نہیں۔ اب مطلب

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۲۔ حدیثِ جبرئیل ابتداءِ اسلام میں مکہ میں وارد ہوئی ہے اور دوسری احادیث جو دلالت کرتی ہیں کہ مغرب کا وقت غروبِ شفق تک ہے یہ بعد کی ہیں اور مدینہ منورہ کی ہیں تو یہ دوسری احادیث قابلِ اعتماد ہیں۔

۳۔ یہ احادیث حدیثِ جبرئیل کے مقابلے میں اصح اسناداً ہیں لہٰذا یہ والی احادیث حدیثِ جبرئیل پر مقدم ہوں گی۔ انتہی

قلت: یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ ساری توجیہات ظہر کے وقت میں بھی جاری ہونی چاہئیں۔ (از مترجم: لہٰذا اسکے مطابق یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظہر کی نماز کا وقت جو حدیثِ جبرئیل میں بیان کیا گیا ہے وہ وقتِ مستحب ہو۔ ابتداءِ زمانہ میں مکہ میں ہو اور سند کے اعتبار سے غیر اصح ہو۔ یہ تینوں توجیہات یہاں بھی جاری ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ فرما سکتے ہیں کہ مثلین والی حدیث میں وقتِ جواز کو بتایا گیا ہے نیز وہ بعد کے زمانہ کی بھی ہیں اور اصح اسناداً بھی ہیں) تو ظہر کی نماز اور بقیہ نمازوں کے حکم میں تفریق کرنا ترجیح بلا مرجح ہے۔

[1] یا انبیاء کرام علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پانچوں نمازیں بطور نفل کے پڑھتے ہونگے۔

[2] هٰذا وقت الانبیاء من قبلک کی توجیہات: ابن العربی رحمہ اللہ کا میلان اس طرف ہے کہ حدیث شریف میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ہم نے آپ کی نمازوں کیلئے ایک وسیع وقت مقرر کیا ہے جس کا اول بھی ہے آخر بھی ہے۔ اسی طرح گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی نمازوں کا وقت بھی کشادہ اور دو اطراف والا تھا جس کے اول و آخر دونوں حصے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہ حکم گذشتہ امتوں پر منقسم ہونے کے اعتبار سے ہے یعنی پانچوں نمازوں کا پڑھنا...... اور عشاء کا پڑھنا تو اس امت کی خصوصیت ہے عشاء کی نماز کے علاوہ بقیہ نمازیں پہلی امتوں پر فرض تھیں بطور تقسیم کے یعنی بعض امتوں پر بعض نمازیں فرض تھیں اور دوسری بعض امتوں پر دوسری بعض۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ هٰذا سے اشارہ اسفار کی طرف ہے تو گذشتہ تمام انبیاء اور امتیں روشنی میں نمازیں پڑھا کرتی تھیں۔ کذا فی البذل

یہ ہوا کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی نمازوں کے اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مقرر کردہ وقت کیطرح تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز کا جو وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ہر نماز کا وقت اسی طرح گذشتہ امتوں کیلئے بھی تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء کی نمازوں کے اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مقرر کردہ وقت کے علاوہ نہیں تھے۔

(قولہ والوقت فیما بین ھذین) یعنی ان دونوں وقتوں کے درمیان وقتِ مستحب ہے۔ یہ بات جاننی چاہئے کہ حدیثِ باب میں وقتِ مستحب سے مراد یہ ہے کہ ان مذکورہ اوقات کے بعد وقتِ مستحب ختم ہو جاتا ہے (اور پھر وقتِ مکروہ داخل ہو جاتا ہے) اور ان اوقات کے آخر کے اعتبار سے وقتِ مستحب کا آخری وقت اس حدیثِ جبرئیل میں مذکور ہوا۔ ان اوقات کے اول جزء کے اعتبار سے وقتِ مستحب کا بیان یہاں حدیثِ جبرئیل میں مقصود نہیں کیونکہ اس حدیثِ جبرئیل میں پہلے دن جن اوقات میں نماز پڑھی گئی اس سے پہلے کوئی وقت نہیں ہے نہ وقتِ کامل نہ وقتِ ناقص، تو پہلا جزء وقتِ جواز ہوا نہ کہ وقتِ مستحب لہٰذا۔

فیما بین ھذین، کا مرجع: فیما بین ھٰذین سے پہلے دن نماز کے شروع ہونے کا اول جزء اور دوسرے دن نماز سے فارغ ہونے کا آخری لمحہ مراد ہے اس سے وہ وقت مراد نہیں جس میں پہلے دن نماز پڑھ چکے تھے یا دوسرے دن نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے کہ ھٰذین الوقتین سے معلوم ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دونوں دن پڑھی جانے والی نمازیں خارج وقت میں پڑھی گئی ہیں کیونکہ یہ دونوں نمازیں تو مابین کے عموم میں داخل نہیں اس لئے کہ یہ مابین ھٰذین نہیں ہیں بلکہ یہ نمازیں عین ھٰذین ہیں۔ (اس اشکال کا جواب اوپر گزر چکا)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مابین ھٰذین الوقتین کے عموم میں یہ دونوں نمازیں داخل نہیں ہیں لیکن بداہۃً ان دونوں نمازوں کا وقت میں ہونا معلوم ہو گیا کیونکہ اگر یہ دونوں نمازیں وقتِ معتبر میں داخل نہ ہوتیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل علیہ السلام ان وقتوں میں نماز نہ پڑھاتے۔

قال ابو عیسیٰ کی تشریح: (وحدیث جابر رضی اللہ عنہ فی المواقیت قد رواہ عطا بن ابی رباح الخ) مقصد یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح کے اعتبار سے یہ روایت مشہور[1] ہے۔ کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ سے حدیثِ مواقیت کو کثیر راوی نقل کر رہے ہیں۔

---

[1] **حدیثِ مشہور کی اصطلاحی تعریف:** اصلاحِ محدثین میں مشہور اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے دو سے زیادہ متعدد طرق ہوں اور وہ حدِ تواتر کو نہ پہنچی ہو۔ کذا فی کتب الاصول۔ لیکن حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ محدثین کے نزدیک مرسل ہے کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ ایک انصاری مدنی صحابی ہیں انہوں نے لیلۃ الاسراء کی صبح اس واقعہ کا مشاہدہ نہ کیا تھا اور انہوں نے جن صحابی سے اس حدیث کو سنا ہے اس صحابی کو ذکر بھی نہ کیا تو یہ مرسل صحابی ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب منه

باب اسی سے متعلق

☆ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا محمد بن فضيل عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: إِنَّ لِلصَّلَاةِ أَوَّلًا وَآخِراً، وإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ الظُّهْرِ حِينَ تَزُولُ الشَّمْسُ، وآخِرَ وَقْتِهَا حِينَ يَدْخُلُ وَقْتُ العَصْرِ، وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ العَصْرِ حِينَ يَدْخُلُ وَقْتُهَا، وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ تَصْفَرُّ الشَّمْسُ، وَإِن أَوَّلَ وَقْتِ الْمَغْرِبِ حِينَ تَغْرُبُ الشَّمْسُ، وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ يَغِيبُ الشَّفَقُ، وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ العِشَاءِ الآخِرَةِ حِينَ يَغِيبُ الْأُفُقُ، وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حين يَنْتَصِفُ اللَّيْلُ، وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ الفَجْرِ حِينَ يَطْلُعُ الفَجْرُ، وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ۔

قال : وفی الباب عن عبد الله بن عمرو۔

قال ابو عيسى: و سمعت محمدا يقول: حديث الاعمش عن مجاهد فی المواقيت: أَصَحُّ من حديث محمد بن فضيل عن الاعمش، وحديث محمد بن فضيل خطأٌ، أَخْطَأَ فيه محمد بن فضيل۔

☆حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا ابو اسامة عن ابی اسحق الفزاری عن الاعمش عن مجاهد قال: كان يقال: ان للصلاة اولا و آخِراً، فَذَكَرَ نحوَ حديث محمد بن فضيل عن الاعمش ، نحوه بمعناه۔

☆حدثنا احمد بن منيع والحسن بن الصباح البزار واحمد بن محمد بن موسى، المعنى واحد، قالوا: حَدَّثَنَا اسحق بن يوسف الازرق عن سفيان الثوری عن علقمة بن مرثد عن سليمان بن بريدة،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن قطان، صاحبِ قوت المغتذی اور شیخ ابوالطیب وغیرہ نے حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کے مرسل ہونے کی تصریح کی ہے اس پر اشکال یہ ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ترمذی میں عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بذاتِ خود یہ حدیث سنی ہے۔ ابن قطان اور ان کے متبعین کی طرف سے یہ جواب ممکن ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مشہور الفاظ "ان جبرئیل اتی النبی صلی الله علیه وسلم " ہیں۔ جیسا کہ مسندِ احمد ،نسائی، حاکم اور بیہقی میں ہے۔ اسی طرح زیلعی نے نصب الرایۃ میں ذکر کیا ہے اور حافظ نے درایۃ میں ان کی اتباع کی ہے۔ ان دونوں نے اس حدیث کی نسبت ترمذی، نسائی، مسندِ احمد وغیرہ کی طرف کی ہے۔ فتامل

عن ابیہ قال: اَتَی النَّبِیَّ ﷺ رَجُلٌ فَسَأَلَہٗ عَنْ مَوَاقِیْتِ الصَّلَاۃِ؟ فَقَالَ: اَقِمْ مَعَنَا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ، فَاَمَرَ بِلَالًا فَاَقَامَ حِیْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ، ثُمَّ اَمَرَہٗ فَاَقَامَ حِیْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ فَصَلَّی الظُّھْرَ، ثُمَّ اَمَرَہٗ فَاَقَامَ فَصَلَّی الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ بَیْضَاءُ مُرْتَفِعَۃٌ، ثُمَّ اَمَرَہٗ بِالْمَغْرِبِ حِیْنَ وَقَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ، ثُمَّ اَمَرَہٗ بِالْعِشَاءِ فَاَقَامَ حِیْنَ غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ اَمَرَہٗ مِنَ الْغَدِ فَنَوَّرَ بِالْفَجْرِ ثُمَّ اَمَرَہٗ بِالظُّھْرِ فَاَبْرَدَ وَاَنْعَمَ۔ اَنْ یُبْرِدَ، ثُمَّ اَمَرَہٗ بِالْعَصْرِ فَاَقَامَ وَالشَّمْسُ آخِرَ وَقْتِھَا فَوْقَ مَا کَانَتْ، ثُمَّ اَمَرَہٗ فَاَخَّرَ الْمَغْرِبَ اِلٰی قُبَیْلِ اَنْ یَغِیْبَ الشَّفَقُ، ثُمَّ اَمَرَہٗ بِالْعِشَاءِ فَاَقَامَ حِیْنَ ذَھَبَ ثُلُثُ اللَّیْلِ، ثُمَّ قَالَ: اَیْنَ السَّائِلُ عَنْ مَوَاقِیْتِ الصَّلَاۃِ؟ فَقَالَ الرجلُ: اَنَا، فَقَالَ: مَوَاقِیْتُ الصَّلَاۃِ کَمَا بَیْنَ ھٰذَیْنِ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن غریب صحیح، قال: وقد رواہ شعبۃ عن علقمۃ بن مرثد ایضا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک ہر نماز کیلئے اول وآخر ہے اور بے شک ظہر کی نماز کا اول وقت یہ ہے کہ سورج ڈھل جائے اور اس کا آخر وقت یہ ہے کہ جب عصر کا وقت داخل ہو جائے اور بے شک عصر کا اول وقت اسکا وقت شروع ہونے کا وقت ہے اور اس کا آخر وقت (یعنی وقتِ مستحب) سورج کے زرد پڑ جانے (سورج ڈھلنے) کا وقت ہے اور مغرب کا اول وقت سورج کے غروب ہونے کے بعد ہے اور اس کا آخری وقت شفق کے غائب ہونے کے وقت ہوتا ہے اور عشاء کا اول وقت افق آسمان سے سفیدی کے غائب ہونے کا وقت ہے اور اس کا آخری وقت آدھی رات کا وقت ہے اور فجر کا اول وقت صبح طلوع ہونے (یعنی صبح صادق) کا وقت ہے اور اس کا آخری وقت سورج طلوع ہونے کے وقت ہے۔

اور باب میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد رحمہ اللہ (اسماعیل بخاری) کو فرماتے ہوئے سنا کہ حدیثِ اعمش جو مواقیت کے باب میں مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے وہ محمد بن فضیل عن الاعمش والی حدیث سے اصح ہے اور محمد بن فضیل کی حدیث (خطا) صحیح نہیں ہے اس میں محمد بن الفضیل کو وہم ہوا ہے۔

اعمش مجاہد سے روایت کرتے ہیں مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ کہا جاتا تھا کہ ہر نماز کا اول وقت بھی ہے اور آخر وقت بھی ہے

پس انہوں نے محمد بن الفضیل کی طرح انہی کے ہم معنی حدیث ذکر فرمائی۔

☆ سلیمان بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے فرمایا کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے نمازوں کے اوقات کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ نے چاہا ہمارے ساتھ ٹھہرو! پھر بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انہوں نے (اذان و) اقامت کہی۔ جب فجر (صبح صادق) طلوع ہوئی پھر حکم فرمایا تو انہوں نے (اذان و) اقامت کہی۔ جب زوالِ شمس ہو گیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی پھر ان (بلال) کو حکم دیا تو انہوں نے اذان و اقامت کہی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عصر پڑھائی جبکہ سورج سفید اور خوب بلند تھا پھر انہیں مغرب کی اذان و اقامت کا حکم فرمایا جب کہ شفق غائب ہوئی پھر دوسرے دن فجر کی اذان و اقامت کا حکم فرمایا پس فجر کی نماز خوب روشنی کے بعد پڑھائی پھر ظہر کیلئے حکم فرمایا پس خوب ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیا پھر ظہر پڑھائی پھر عصر کی نماز کیلئے حکم فرمایا تو بلال رضی اللہ عنہ نے اذان و اقامت کہی جب کہ سورج آخر وقت پر پہنچ گیا (یعنی گذشتہ کل جس بلندی پر تھا اس سے نیچے چلا گیا پھر بلالؓ کو اذان و اقامت کا) حکم فرمایا پس مغرب کی نماز کو شفق کے غائب ہونے سے ذرا پہلے تک موخر کر دیا پھر عشاء کیلئے حکم فرمایا تو (بلال رضی اللہ عنہ) اذان و اقامت کہی جبکہ تہائی رات گزر گئی (یعنی تمام نمازیں پہلے اور دوسرے دن اس وقت پڑھائیں جبکہ ان نمازوں کا مستحب وقتِ اول و آخر تھا) پھر فرمایا کہ اوقاتِ نماز کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس شخص نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان دونوں وقتوں (جن میں پہلے اور دوسرے دن نمازیں پڑھی گئیں) کے درمیان نماز کے اوقات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیثِ حسن غریب صحیح ہے اور اس کو شعبہ نے علقمہ بن مرثد سے بھی روایت کیا ہے۔

﴿تشریح﴾

پہلا مطلب: (ان للصلوٰۃ اولا و آخرا) اس کا مطلب یہ ہیکہ[1] عین نماز کی ابتدا اور انتہاء ہے پھر جملہ متانفہ کے

---

[1] یعنی ان للصلوٰۃ اولا و آخرا سے نماز کے وقت کا بیان ہے جیسا کہ اس کا ذکر آگے آرہا ہے تو "ان اول وقت الظهر" سے اس اجمال کی تفصیل ہوگی اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان للصلوٰۃ اولاً سے مراد نماز کے وقت کا بیان نہیں بلکہ عین نماز کا اول و آخر مراد ہے۔ پھر آگے چل کر نماز کے احکام میں سے ایک حکم وقت کا بیان ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں تکبیرِ تحریمہ اور سلام کا ذکر ہے اس حدیث کو مسندِ احمد اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے۔ قاله السيوطیؒ فی در المنثور

طور پر آگے نماز کے ابتدائی اور انتہائی وقت کو بیان کیا جارہا ہے کیونکہ یہ دونوں وقت بھی عین نماز کا جزء ہیں بایں طور کے وقت نماز کی شرائط میں سے ہیں۔ جیسا کہ تکبیر تحریمہ اور سلام پھیرنا نماز کے اجزاء میں سے مستقل جزء ہیں۔

دوسرا مطلب: ان للصلوٰۃ اولا و آخرا کا معنی یہ ہے کہ نماز کے وقت کا ابتدائی حصہ بھی ہوتا ہے اور انتہائی حصہ بھی تو یہاں لفظِ وقت مضاف محذوف ہے یا مسبب (نماز) کو ذکر کے سبب (وقت) مراد لیا گیا ہے یا حال (نماز) کو ذکر کرے کے محل (وقت) کا ارادہ کیا گیا ہے۔

وقتِ ظہر شروع ہونے کا بیان: (حین تزول الشمس) اس سے اشارہ ہے کہ گذشتہ روایت حدیثِ جبرئیل میں حین کان الفیء مثل الشراك والی تشبیہ سے مراد عادت کا بیان ہے اور اسکا مقصد سورج کے تھوڑے سے سایہ کا ظاہر ہونا ہے۔ اصل مسئلہ کے اعتبار سے (جیسا کہ حدیث باب سے معلوم ہو رہا ہے کہ) ظہر کا وقت زوالِ شمس سے شروع ہو جاتا ہے۔ سایہ کے ہونے پر دخولِ وقتِ ظہر کا مدار نہیں۔

اشکال: (و آخر وقتها حین یدخل وقت العصر) (ظہر کا آخری وقت مثلِ اول یا مثلین پر ختم ہوتا ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت سے ظہر کا آخری وقت کیوں نہیں بیان فرمایا؟ **جواب**: اس اشکال کا جواب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ دے رہے ہیں۔ اضافہ از مترجم) ممکن ہے کہ کسی راوی نے ظہر کی نماز کا آخری وقت ذکر نہ کیا ہو اور اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالتصریح اس کا وقت بیان فرمایا ہوگا۔ یا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کا آخری وقت ذکر نہ فرمایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ حاضرین مجلس کو ظہر کا وقتِ انتہاء اچھی طرح معلوم ہے۔

(وان آخر وقتها حین تصفر الشمس) اس حدیث میں جہاں جہاں نماز کے اول وقت اور آخر وقت کا ذکر ہے اس سے وقتِ مستحب[1] کا اول اور آخری حصہ مراد ہے چاہے اس وقت کے بعد کا وقت وقتِ مکروہ ہو یا اس وقت کے بعد بالکل وقت ہی نہ رہے۔ اب عصر کی نماز میں اصفرار شمس تک وقتِ مستحب ہے اور اس کے بعد وقتِ مکروہ ہے اور فجر وغیرہ دوسری نمازوں میں آخر وقت کے بعد کوئی وقت باقی ہی نہیں رہتا۔ (چنانچہ حدیثِ باب میں فجر کا آخر وقت طلوعِ شمس اور ظہر کا آخری وقت دخولِ عصر بتلایا گیا ہے اس کے بعد کوئی وقت نہیں رہتا۔ از مترجم)۔

---

[1] کیونکہ اگر حین تصفر الشمس سے وقتِ مستحب کا آخری حصہ مراد نہ لیا جائے تب تو لازم آئے گا کہ اصفرارِ شمس کے بعد عصر کا وقت ختم ہو جاتا ہے حالانکہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ عصر کا وقت مغرب تک رہتا ہے (اسلئے یہ توجیہ لازمی ہے۔ از زکریا)۔

عشاء کی نماز کا وقتِ آخر: حدیثِ باب میں عشاء کی نماز کا آخری وقت نصف اللیل بتایا گیا ہے حالانکہ عشاء کا وقت نصف اللیل کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور نصف اللیل کے بعد نماز پڑھنا (نفسِ وقت کے لحاظ سے) مکروہ بھی نہیں ہے لیکن چونکہ عموماً نصف اللیل سے تاخیر کرنے سے عشاء کی نماز فوت ہو جاتی ہے اس لئے حدیث شریف میں اس عارض کی وجہ سے اس کو (نصف اللیل کو) آخرِ وقت قرار دیا ہے۔ فافہم

حدیثِ باب اور حدیث جبرئیل کے درمیان تعارض اور انکے جواباتِ ثلٰثہ: اشکال (۱) اس حدیثِ باب اور گذشتہ حدیثِ جبرئیل میں تعارض ہے۔ اس طرح کہ مثلاً حدیثِ جبرئیل سے ثلث اللیل کے بعد عشاء کی نماز پڑھنے کی کراہت معلوم ہوتی ہے اور حدیثِ باب میں ثلث اللیل کے بعد نصف اللیل تک نماز پڑھنے کو مستحب کہا جا رہا ہے؟

تعارض (۲) اسی طرح حدیثِ جبرئیل میں عصر کی نماز کے مثلین کے بعد پڑھنے کی کراہت معلوم ہوتی ہے اور حدیثِ باب میں مثلین کے بعد عصر کی نماز کو اصفرارِ شمس تک مستحب قرار دیا جا رہا ہے تو یہ دونوں حدیثیں متعارض ہوئیں؟

جواب نمبرا: وقتِ مستحب کے دو حصے ہوتے ہیں: پہلا حصہ جس میں نماز پڑھنا کامل درجہ مستحب ہے اور دوسرا حصہ وہ جس میں نماز پڑھنا فی الجملہ مستحب ہے (کمال استحباب نہیں) تو ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ حدیثِ جبرئیل میں وقتِ مستحب کے اعلیٰ درجہ کو بیان کیا گیا ہے اور حدیثِ باب میں وقت کے دوسرے درجہ کو۔

جواب نمبر۲: نصف اللیل اور ثلث اللیل والی روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ حدیثِ باب میں نصف اللیل سے مراد شرعی رات کا نصف ہے یعنی غروبِ شمس سے طلوعِ فجر تک کا آدھا حصہ اور حدیثِ جبرئیل میں ثلث اللیل سے مراد عرفی رات کا ثلث ہے یعنی غروبِ شمس سے لیکر طلوعِ شمس تک کے وقت کا ثلث حصہ تو ان دونوں احادیث میں زیادہ فرق نہیں رہتا اور دونوں روایتوں کا مقتضیٰ تقریباً ایک ہی وقت ہو جاتا ہے۔

جواب نمبر۳: حدیثِ جبرئیل جس میں ثلث اللیل کا ذکر ہے اس سے مراد ہے کہ عشاء کی نماز ثلث اللیل پر شروع فرماتے اور حدیثِ باب میں نصف اللیل سے مراد یہ ہے کہ نصف اللیل پر عشاء کی نماز ختم ہو چکی ہوتی تھی اس طرح دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

تعلیمِ فعلی کی حکمت: (فقال اقم معنا ان شاء الله تعالیٰ) ا۔حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو ٹھہرنے کا حکم اس لئے دیا کہ اگر آپ علیہ السلام فعلی طور پر نماز کا بیان فرمائیں تو یہ زیادہ واضح ہوگا بخلاف اس کے کہ قولی طور پر بیان فرمایا جائے

نیز اس طرح اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن (نماز) کے متعلق جس قدر اہتمامِ شان کیا جا رہا ہے وہ واضح ہے۔

۲۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید یہ سائل اپنی قوم کا نمائندہ ہو تو اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف قولی طور پر بیان فرمانے پر اکتفا فرماتے تو ممکن تھا کہ اس پر بعض الفاظ مشتبہ ہو جاتے یا وہ ان کے سمجھنے میں کم سمجھی سے کام لیتا اس طرح بہت بڑے نقصان کے واقع ہونے کا شبہ تھا۔

(حاجب الشمس) یعنی مغرب کی نماز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ادا فرمائی جب سورج کا اوپر والا کنارہ باقی رہ گیا تھا۔ چونکہ سورج کے اکثر حصے کے غروب ہونے کے بعد سورج ایک ابرو (بھنوں) کی صورت میں رہ جاتا ہے اسلئے اس کو حاجب الشمس سے تعبیر کیا۔

(فاخر المغرب الی قبیل ان یغیب الشفق) جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غروبِ شفق سے پہلے مغرب اسلئے ادا فرمائی تاکہ مغرب کی نماز کا آخری جزء اس کے وقت کے ختم ہونے کے بعد واقع نہ ہو۔

(مواقیت الصلوٰۃ کما بین هذین) کما میں کاف زائدہ ہے۔

ظہر کے آخری وقت میں اختلاف: جاننا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے درمیان ظہر کے آخر وقت میں کچھ اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر کا آخری وقت یہ ہے کہ ایک شئے کا سایہ زوال کے سایہ کے علاوہ دو مثل ہو جائے۔ صاحبینؒ کے نزدیک زوال کے سایہ کے علاوہ ایک مثل ہونے پر ظہر کا وقت ختم ہوگا۔ صاحبین کے نزدیک مثلِ اول کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے۔

اسنادِ حدیث پر کلام: یہ امر قابلِ تنبیہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیثِ باب کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن فضیل نے تنبیہ کی ہے اس حدیث کو دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسنداً صحیح نہیں کیونکہ ابن فضیل کو اس میں وہم ہوا ہے۔ ابن فضیل کے علاوہ راوی اس روایت کو عن الاعمش عن مجاہد مرسلاً نقل کرتے ہیں تو یہ روایت مرسلہ زیادہ اصح ہے مسند کے مقابلے میں۔

قال ابن الجوزی فی التحقیق: ابن فضیل ثقہ راوی ہے تو ممکن ہے کہ اعمش نے اس روایت کو مجاہد سے مرسلاً سنا ہو نیز اعمش نے ابو صالح سے اس روایت کو مسنداً "عن ابی هریرةؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم" سنا ہو تو (دونوں ہی روایتیں صحیح ہوں) ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس سند کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سند میں ابن فضیل سے وہم ہوا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو مسنداً نقل کر دیا حالانکہ ان کے علاوہ اعمش کے دوسرے تمام شاگرد اس حدیث کو مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں۔ ابن قطان فرماتے ہیں کہ یہ بات کوئی بعید نہیں کہ اعمش راوی سے دونوں سندیں مروین ہوں۔ قاله الزيلعي

امام ابوحنیفہ کی روایت مثل اول کے بعد وقتِ مہمل ہے اور اس کی تضعیف: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے جو یہ روایت[1] مروی ہے کہ مثلِ اول کے بعد سے مثلین تک کا درمیانی وقت، وقتِ مہمل ہے کسی بھی نماز کا وقت نہیں ۔ یہ روایت نا قابلِ اعتماد ہے کیونکہ امام صاحب سے یہ روایت شہرت کیساتھ منقول نہیں اور نہ ہی نقل وعقل اس کے موافق ہے لہٰذا اس روایت پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے ۔ البتہ احتیاط اس میں ہیکہ مثل اول کے ختم ہونے سے پہلے ظہر پڑھ لی جائے اور مثلین کے بعد عصر کی نماز شروع کرنی چاہیئے اور یہ سمجھے کہ مثلِ اول کے بعد کا وقت، عصر کا وقت ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ کی دوسری اور تیسری روایت ہے یا مثلِ اول کے بعد کے وقت کو ظہر کا وقت سمجھے جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی روایت گزری۔

حضرت گنگوہیؒ کے کلام میں صاحبین کے مذہب مثلِ اول والے قول کی ترجیح: امام ابوحنیفہؒ سے مشہور روایت یہ ہے کہ ظہر کا آخری وقت مثلین پر ختم ہوتا ہے اور اس کے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ متون میں اسی روایت کو لیا گیا ہے کیونکہ یہ اکثر متون علماء خراسان کے تصنیف کردہ ہیں اور اہلِ خراسان نے اس روایت پر اعتماد کیا تھا اسی لیئے ان اصحاب المتون نے ان روایت کو اپنے متون میں ذکر کر دیا۔ اور یہ متون والی روایت کو اصول کی روشنی میں ترجیح دی جاتی ہے۔

یہاں دلائل کی روشنی میں صاحبین[2] کا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ البحر الرائق اور فتح القدیر میں اسی مثلِ اول والی روایت کو ترجیح دی گئی۔

---

[1] یہ امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت ہے چنانچہ بدائع میں لکھا ہے کہ اسد بن عمرؒ نے امام صاحب سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب ہر شئے کا سایہ زوال کے سایہ کو چھوڑ کر ایک مثل ہو جائے تو ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور عصر کا وقت دو مثل ہونے پر داخل ہوتا ہے، اس روایت کے مطابق ظہر اور عصر کے درمیان وقتِ مہمل ہوتا ہے جیسا کہ نماز فجر اور ظہر کے درمیان وقتِ مہمل پایا جاتا ہے۔ انتہی

بعض شافعیہ اور داؤد ظاہری کے مذہب میں بھی ظہر اور عصر کے درمیان وقتِ مہمل ہے۔ جمہور کی دلیل مسلم کی روایت ہے جس میں وقت الظهر مالم تحضر العصر کے الفاظ ہیں۔ کما فی الاوجز

مسلم کی یہ روایت دلالت کر رہی ہے کہ جس طرح ظہر اور عصر کے درمیان کوئی وقتِ فاصل نہیں ہے اسی طرح اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیان کوئی وقتِ مشترک بھی نہیں۔ جیسا کہ مالکیہ اور بعض علماء کے نزدیک ظہر اور عصر کے درمیان چار رکعت کے بقدر مشترک وقت ہے۔ تو یہ مسلم کی حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔

[2] اصل مخطوطہ میں اس طرح "یرجحهما" کے الفاظ ہیں شاید ھما ضمیر کا مرجع صاحبین ہیں۔

مثلین والی روایت کی دلیل کوئی [1] سی بھی ہو ضعف سے خالی نہیں مثلاً ان دلائل میں سے۔

دلیل نمبر۱۔ ایک دلیل ہدایہ وغیرہ میں ہیکہ بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی پھر اقامت کہنے کا ارادہ فرمایا تو حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا: ابرد یعنی ظہر کی نماز کو مؤخر کر کے پڑھو۔ اسی طرح دوسری احادیث میں "ابردوا بالظهر فان شدة الحر من فيح جنهم" کے الفاظ ہیں اور بلادِ عرب میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت پر اسی وقت میں پڑھی جائیگی جبکہ مثلِ اول ہو چکا ہو۔ مثل اول سے پہلے انتہائی شدید گرمی کا وقت ہوتا ہے۔

جواب: لیکن یہ دلائل امام صاحب کے مسلک پر صریح [2] اور واضح نہیں ہیں۔ نیز ٹھنڈا وقت ایک اضافی شئے ہے زوالِ شمس کے تھوڑی دیر بعد بھی کچھ نہ کچھ ٹھنڈ ہو ہی جاتی ہے اگر چہ اس ٹھنڈ کو محسوس نہیں کیا جاتا کیونکہ اس وقت ساری زمین گرمی اور تپش میں ہوتی ہے بلکہ عرف میں تو مغرب سے پہلے وقت کو ٹھنڈا وقت سمجھا جاتا ہے تب تو مغرب سے قبل ظہر کی نماز پڑھنی چاہیئے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

ہاں سورج کی ٹکیہ کی گرمی کو دیکھتے ہوئے زوال شمس کے بعد کچھ نہ کچھ ٹھنڈ تو ہو ہی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ امامتِ جبرئیل کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی حدیث سے منسوخ ہو گیا جس میں مدینہ منورہ میں

---

[1] **مثلین والے قول کی ترجیح: (حضرت شیخ رحمہ اللہ نے صاحبین کے بجائے حضرت امام کے قول کو ترجیح دی ہے)**
قلت: حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے فرمان کو اگر تسلیم کر لیا جائے تب بھی آگے ذکر کردہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دلائل سے ظہر کے وقت کے نکلنے کے متعلق مثل اول پر شبہ پیدا ہو گیا کہ ظہر کا وقت مثل اول پر ختم ہو گیا یا نہیں اور یہ قاعدہ ہیکہ شک کی وجہ سے وقت ختم نہیں ہوتا۔ نیز قرآن کریم کا ظاہر بھی امام صاحبؒ کے مذہب کیلئے مؤید ہے جیسا کہ قرآن میں ہے اقم الصلوٰة طرفي النهار (دن کے دوسرے کنارہ پر ہونے والی نماز نمازِ عصر ہے) اسی طرح فسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها (قبل غروبہا سے عصر کی نماز مراد ہے) اور یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ اگر مثل اول پر عصر پڑھ لی جائے تو چوتھائی دن سے زیادہ وقت ابھی باقی ہوتا ہے تو اس کو طرف النھار اور قبل الغروب نہیں کہا جاتا۔ بلکہ مثلِ اول پر تو وسط یوم میں نماز پڑھی جارہی ہے نہ کہ غروب سے پہلے۔

[2] لیکن امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب تجربہ سے قوی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو گرمی زوال کے وقت ہوتی ہے مثل اول کے بعد یہ گرمی نہیں رہتی تو حدیث میں اس انتہائی گرم وقت کے نکلنے کے بعد ظہر پڑھنے کا حکم ہے نفسِ گرمی مراد نہیں کیونکہ سخت گرمی کے زمانہ میں تو اگلے دن طلوع فجر تک یہ گرمی رہتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو نماز کا طریقہ فعلی طور پر سکھلایا تھا[1]۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیثِ جبرئیل کو منسوخ کہنا بے بنیاد ہے کیونکہ نسخ کے لئے ضروری ہے کہ ایسی مضبوط دلیل پائی جائے کہ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

تیسری دلیل: اس طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تیسری دلیل جس سے مثلین والا مذہب ثابت کیا جاتا ہے مؤطا مالک کی روایت ہے کہ ایک شخص نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ظہر اور عصر کے وقت کے بارے میں پوچھا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ایک مثل پر ظہر کی نماز پڑھو اور مثلین پر عصر پڑھو۔ یہ حدیث صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ عصر کا وقت، مثلین پر شروع ہوتا ہے اور ظہر کا وقت مثل اول کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ کیونکہ اس روایت میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مثل پر ظہر پڑھنے کا حکم دیا ہے اس سے لازم ہو رہا ہے کہ مثل اول کے بعد ظہر سے فارغ ہوئے ہونگے۔

جواب: لیکن اس کا جواب ظاہر ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سوال کا مقصد یہ تھا کہ نماز کا ایسا جامع وقت بتلا دیں کہ پھر پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ وقت سارے سال میں قابلِ عمل ہو تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زوال کے سایہ کو ملا کر جب سایہ ایک مثل ہو جائے تو اس وقت نماز پڑھنے میں گرمیوں میں ابراد والے حکم پر عمل ہو جائے گا اور فیئ زوال کے سایہ کے علاوہ جب کسی شیئ کا سایہ ایک مثل ہوگا تو ظہر کی نماز ختم ہو چکی ہوگی اور سردی کے موسم میں تو زوال کا سایہ ہی مثلِ اول کے قریب ہوتا ہے تب تو حدیث میں ظہر کی نماز کو ابتدائی وقتِ ظہر میں پڑھنے کا حکم ہوا اس طرح امام

---

[1] **حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی طرف سے مثلین والے کے قول کی وجوہِ ترجیحات:** قلت: لیکن محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام فجر کے آخری وقت کے متعلق منسوخ ہے (کیونکہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں دوسرے دن فجر کی نماز اسفار میں پڑھی ہے) حالانکہ بالاجماع طلوعِ شمس تک فجر کا وقت رہتا ہے (اسی طرح حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں دوسرے دن عصر کی نماز مثلین پر پڑھی ہے) حالانکہ عصر کا وقت غروب تک رہتا ہے تو عصر کے آخر وقت میں بھی یہ حدیث منسوخ ہے (اسی طرح مغرب کی نماز دوسرے دن وقتِ اول پر اور عشاء کی نماز ثلث اللیل پر پڑھی) جبکہ امت کا اجماع ہے کہ مغرب کا وقت غروبِ شفق تک رہتا ہے اور عشاء کا وقت طلوعِ فجر تک رہتا ہے تو جب چار نمازوں کے آخری وقت کے متعلق حدیثِ جبرئیل منسوخ ہوئی تو ظہر کے آخری وقت کے متعلق حدیثِ جبرئیل کو منسوخ ماننے میں کیا مانع ہے؟

صاحب کا مدعیٰ ثابت نہیں [1] ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال اسی وقت ہوگا جبکہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہاں ایک مثل سے مراد اصلی سایہ کو چھوڑ کر ایک مثل ہے اور یہ بات کہیں سے ثابت نہیں اسلیئے روایتِ ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ امام صاحب کی دلیل نہیں بن سکتی۔

امام ابوحنیفہؒ کی چوتھی دلیل: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ایک اور دلیل جس سے وہ مثلین کو ثابت کرتے ہیں وہ روایت ہے جس کو اکثر محدثین نے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسل نے ایک تمثیل بیان فرمائی کہ ایک شخص کو کوئی فجر سے لیکر ظہر تک اپنا اجیر (مزدور) رکھتا ہے اس سے مراد یہودی ہیں اور دوسرے شخص کو ظہر سے عصر تک مزدور رکھتا ہے اس سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اور تیسرے کو عصر سے مغرب تک کام کیلئے رکھتا ہے اس سے مراد امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے پہلے دونوں کو ایک ایک قیراط ملتا ہے اور آخری مزدور کو دو دو قیراط۔ تو پہلے دونوں مزدور کہتے ہیں کہ کام تو ہم نے زیادہ کیا لیکن مزدوری کم ملی جبکہ تیسرے مزدور نے کم کام کیا اور مزدوری زیادہ ملی تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصر کا وقت ظہر کے وقت سے کم ہے ورنہ یہ تمثیل صحیح نہ ہوگی اور عصر کا وقت تب ہی کم ہوگا جبکہ مثلین کے بعد اس کی ابتداء ہو۔

جواب: اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ ظہر کا وقت چاہے مثلِ اول پر ختم ہو تب بھی عصر کے وقت پر بڑھا ہوا ہے جیسا

---

[1] **اثرِ ابی ہریرۃ سارے سال کے احکام بتلانے کیلیئے ہے تب بھی ظہر کا وقت مثلین تک ہونے کی تائید کرتا ہے:** لیکن اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس اقلیم (علاقہ) میں گرمیوں کے دنوں میں زوال کے وقت تو سایہ ہوتا ہی نہیں چنانچہ زیلعی کے حاشیہ میں ہے کہ زوال کے وقت ہر چیز کا سایہ ہوتا ہے لیکن مکہ مدینہ اور صنعاء یمن میں طویل دنوں میں سایہ بالکل نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت میں سورج چہار جانبوں کے درمیان آ جاتا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ زوال کے وقت ان جگہوں پر سایہ ہوتا ہے تب بھی یہ سایہ جوتے کے تسمے سے زیادہ نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے بھی گزرا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اثر میں پورے سال کے احکام کو بتلانا مقصود ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے خود تصریح کی ہے تب تو گرمی میں ظہر کی نماز کا مثلِ اول کے بعد ہونا ظاہر ہے تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ سردی میں تو ظہر کا وقت مثلِ اول تک رہتا ہے اور گرمی میں مثلین تک (جب اس حدیث میں تصریح ہے کہ مثلِ اول پر ظہر کی نماز پڑھو اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ان ممالک میں مثلِ اول ابتدائے زوال میں نہیں بلکہ کافی وقت گزرنے پر یہ سایہ ظاہر ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ ظہر کا وقت مثلین تک ممتد ہے۔ از مترجم عفی عنہ)

کہ اس میں غور وخوض [۱] کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر ظہر کا وقت مثلِ اول پر ختم ہو تو عصر کا وقت کافی طویل ہوتا ہے تو اقل عملاً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عمل اگر چہ بہت زیادہ ہے لیکن ظہر کے مقابلہ میں تھوڑا کم ہے اور اگر ظہر کا وقت مثلین تک رہتا ہے تب تو عصر کا وقت کم ہے ہی۔ بہر حال حدیث شریف میں تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ عصر کا وقت ظہر سے فی الجملہ کم ہوتا ہے مقدار میں تشبیہ دینا مراد نہیں اگر چہ یہاں پر کلام کی گنجائش ہے۔ وہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ [۲] اس تمثیل والی حدیث میں ظہر اور عصر کے اول وقت پر نماز پڑھنا مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تیسرے مزدور کو عصر کی نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد کام پر مامور کرنا ہے اور عصر کو چونکہ مؤخر کرنا مستحب ہے اسلئے یہ وقت عصر کے وقتِ مستحب کا درمیانہ حصہ ہوگا لہٰذا اگر چہ عصر کا وقت ظہر کے وقت سے زیادہ ہو تب بھی حدیث سے مثلِ اول والوں پر اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں تمثیل، ظہر وعصر کے اصلی وقت کے اعتبار سے نہیں (بلکہ یہاں تمثیل اس لحاظ سے ہے کہ ظہر کی نماز

---

[۱] اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ زوال اور مثل اول تک کے فاصلے میں غور کرنے میں اور مثلِ اول سے لیکر غروب تک کے وقت کو دیکھنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ پہلا وقت زیادہ طویل ہے لیکن یہ فرق بہت باریک ہے جو بہت مشقت سے سامنے آتا ہے اسی وجہ سے زیلعی نے کہا ہے کہ یہ اشکال نہ کیا جائے۔

اشکال: کہ زوال سے لیکر مثل اول تک تین گھنٹے سے زیادہ ہوتے ہیں اور مثلِ اول سے غروب تک تین گھنٹے سے کم ہوتے ہیں لہٰذا حدیث کا مطلب واضح ہیکہ نصاریٰ لمبے زمانے کی وجہ سے زیادہ کام کرتے تھے (اگر چہ ظہر کا وقت مثل اول پر ہی ختم ہو)۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آسان اور ظاہری معنیٰ سمجھا جائے تو ظہر کا وقت مثلین تک ممتد ہوگا: جواب نمبر۱: ظہر کا وقت مثل اول پر ختم ہونے کی صورت میں ظہر کے وقت کا عصر کے وقت سے لمبا ہونا چند منٹوں کے اعتبار سے ہوگا جو علمِ حساب سے سمجھ میں آتا ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ظہر کا وقت عصر کے وقت پر اس قدر طویل ہے کہ ہر امتی پر اس کا طویل ہونا واضح ہوجائے۔

جواب نمبر۲: یہ ہے کہ اگر ظہر کا وقت مثلِ اول پر ختم ہو رہا ہے تو دوسرے اور تیسرے فریق کے کام کرنے کا وقت تقریباً برابر ہوجاتا ہے حالانکہ حدیث شریف کے سیاق سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ پہلے دو فریق کا وقت تقریباً برابر سرابر ہے لہٰذا پہلے دو فریق کا وقت اسی وقت برابر ہوگا جبکہ ظہر کا وقت مثلین تک باقی رہے۔

[۲] لیکن اس توجیہ پر اشکال یہ ہے کہ جن علماء کے نزدیک ظہر کا وقت مثلِ اول تک ہے ان میں سے اکثر علماء اول وقت میں نماز کو مستحب قرار دیتے ہیں لہٰذا اس توجیہ سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

با جماعت ادا کرنے کے بعد دوسرا مزدور رکھا جا رہا ہے اور عصر کی نماز کو باجماعت اس کے مستحب وقت کے وسط میں ادا کرنے کے بعد تیسرا مزدور رکھا جا رہا ہے) اس طرح عصر کی نماز با جماعت پڑھنے کے بعد والا وقت تھوڑا ہوگا بنسبت ظہر کی نماز با جماعت پڑھنے کے بعد سے لیکر نمازِ عصر تک (تو عصر کا وقت مثل اول پر ہی شروع ہو تب بھی یہ مزدور اقل عملاً ہے)۔

مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں شدت سے بچا جائے اور احتیاط والے پہلو پر عمل کیا جائے: لہٰذا محققین نے اس کو اختیار کیا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ ظہر کا وقت مثلِ اول پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہوتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ مثلِ اول کے ختم ہونے سے قبل ظہر پڑھ لے اور عصر کی نماز مثلین کے بعد پڑھنی چاہیئے تاکہ تمام ائمہ کے مذہب کے مطابق اس کی نمازیں صحیح ہو جائیں لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس مسئلہ میں تشدد اور سختی اختیار کرنا غلط ہے لہٰذا مخالفین سے جھگڑنا نہیں چاہیئے کیونکہ ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل موجود نہیں جس سے ہم کوئی قطعی حکم ثابت کر سکیں۔ واللہ ولی التوفیق

باب ماجاء فی التغلیس بالفجر

یہ باب ہے اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا قتیبه عن مالك بن انس ح قال: وحدثنا الانصاری حَدَّثَنَا معن حَدَّثَنَا مالك عن یحیی بن سعید عن عمرة عن عائشةقالت: اِنْ کَانَ رسولُ اللهِ ﷺ لَیُصَلِّی الصُّبْحَ فَیَنْصَرِفُ، النساءُ، قال الانصاری: فَتَمُرُّ النِّسَاءُ مُتَلَفِّفَاتٍ بِمُرُوطِهِنَّ مَایُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ وقال قتیبةُ، مُتَلَفِّعَاتٍ۔

قال وفی الباب عن ابن عمر، وانس وَقَیْلَةَ بِنْتِ مَخرَمَةَ قال ابو عیسی:حدیث عائشة حدیث حسن صحیح۔ وهو الذی اختاره غیر واحد من اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ منهم، ابوبکر وعمر ومن بعدهم من التابعین۔ وبه یقول الشافعی، واحمد، واسحق :یَسْتَحِبُّونَ التَّغْلِیسَ بصلاة الفجر۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے تھے۔ پھر عورتیں لوٹتی تھیں انصاری (کی حدیث میں ہے انہوں) نے فرمایا (تمر النساء) عورتیں گزرتی تھیں (دونوں کے معنی یعنی

فینصرف النساء اور فتمر النساء کے معنی ایک ہی ہیں) وہ چادروں میں لپٹی ہوتی تھیں (اور نماز چونکہ اندھیرے میں شروع فرما کر اندھیرے ہی میں ختم فرماتے تھے اسلئے اندھیرے کی وجہ سے) پہچانی نہیں جاتی تھیں۔قتیبہ (راوی) فرماتے ہیں (متلفعات۔انہوں نے متلففات کی جگہ متلفعات ذکر کیا ہے)۔

باب میں ابن عمر، انس، قیلہ بنت مخرمہ سے روایات مروی ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو صحابہ کرام میں سے بہت سے اہلِ علم نے پسند فرمایا ہے ان میں ابوبکر وعمر (حضراتِ شیخین) اور ان کے بعد حضرات تابعین ہیں اور یہی امام شافعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے وہ سب مطلقا فجر کی نماز غلس (اندھیرے) میں پڑھنے کو پسند فرماتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

تغلیس بالفجر کے استحباب کا بیان: یہاں سے مصنف وقتِ مستحب کی تفصیل بیان کرنا چاہ رہے ہیں اور اس کی طرف اشارہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل اور قول سے جو وقت مستحب معلوم ہوتا ہے اس کو بیان کیا جائے اس لئے یہ تغلیس بالفجر کا باب قائم کیا۔ جاننا چاہیئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب میں فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھنا افضل ہے[1] ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اندھیرے میں فجر کی نماز پڑھتے تھے۔

باب ماجاء فی الاسفار بالفجر

باب ہے روشنی ہونے کے وقت فجر کی نماز پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا هَنّادٌ حَدَّثَنَا عبدة هو ابن سليمان عن محمد بن اسحق عن عاصم بن عمر بن قتادة عن محمود بن لبيد عن رافع بن خديج قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: اَسْفِرُوا بالْفَجْرِ، فَاِنَّهُ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ۔

---

[1] **فجر کے وقتِ مستحب میں ائمہ کے مختلف اقوال:** امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب اور امام احمد کی ایک روایت شوافع کے ساتھ ہے کہ تغلیس افضل ہے۔امام احمد کی دوسری روایت اوجز اور مغنی میں ہے اس طرح لکھی ہے کہ نمازیوں کی حالت کا اعتبار ہوگا اگر وہ اسفار میں پڑھنا چاہیں تو اسفار افضل ہوگا۔حنفیہ کے تینوں ائمہ کے نزدیک اسفار افضل ہے۔امام طحاوی رحمہ اللہ کا میلان اس طرف ہے کہ تغلیس میں فجر کی نماز شروع کی جائے اور قراءت کو اتنا لمبا کیا جائے کہ خوب اسفار میں نماز ختم ہو۔حنفیہ کے دلائل بہت عمدہ طریقے سے تفصیل کے ساتھ اوجز میں موجود ہیں۔

قال :وقد روی شعبة والثوری هذا الحدیث عن محمد بن اسحق ، قال ورواه محمد بن عَجْلَانَ اَیضاًعن عاصم بن عمر بن قتادة۔قال:وفی الباب عن ابی برزة الاسلمی وجابر، وبلال۔

قال ابو عیسی:حدیث رافع بن خدیج حدیث حسن صحیح ۔

وقد رای غیر واحد من اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعین الاسفار بصلاة الفجر۔ وبه یقول سفیان الثوری.

وقال الشافعی واحمد واسحق : معنی الاسفار :ان یضح، الفجر فلا یشك فیه ، ولم یروا ان معنی الاسفار تاخیر الصلاة۔

﴿ترجمه﴾

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ فجر کو روشن کر کے پڑھا کرو کیونکہ اس طرح نمازِ فجر کو روشن کرنے میں اجر وثواب زیادہ ملتا ہے۔

باب میں ابو برزہ، جابر، بلال رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں اور (عبدہ کے علاوہ) شعبہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ نے بھی اس حدیث کو محمد بن اسحاق کی سند سے نقل کیا ہے اور اس کو محمد بن عجلان نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے (محمد بن عجلان، محمد بن اسحاق کے متابع ہیں)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین میں سے بے شمار اہلِ علم سے نماز فجر کو روشن کر کے پڑھنا مروی ہے اور یہی قول سفیان ثوری رحمہ اللہ کا ہے۔ امام شافعی، احمد و اسحاق فرماتے ہیں (اسفار) روشن کرنے کے معنی یہ ہیں کہ صبح (فجر) واضح ہو جائے اور اس میں شک نہ رہے اور اسفار کا مطلب نماز کو تاخیر سے پڑھنا نہیں ہے۔

﴿تشریح﴾

تغلیس واسفار میں سے اسفار کو ترجیح حاصل ہے: ہماری دلیل حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کبھی اسفار میں پڑھتے تھے اور کبھی غلس میں لہٰذا یہ نہیں معلوم کہ کونسا فعل مستحب تھا اور کونسا عارض کی وجہ سے۔ چنانچہ ہم نے غور کیا کہ کیا کسی ایک فعل کے متعلق حدیث میں ثوابِ عظیم کا ذکر ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے یا پھر دونوں

طرح پڑھنا برابر درجہ رکھتا ہے؟ تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ " اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر" والی حدیث اس پر دلالت کررہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ فعل زیادہ محبوب ہے جس میں ثواب زیادہ ہے اور وہ اسفار میں نماز پڑھنا ہے۔ نیز اس میں تکثیرِ جماعت بھی ہے لہٰذا یہی افضل ہوگا۔

جن احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلس میں فجر ادا فرمائی ہے اس کا جواب: یہ فعل[۱] (غلس میں نماز پڑھنا) عارض کی وجہ سے تھا کہ اس زمانے میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں (اس لئے زیادہ پردے کیلئے غلس میں نماز پڑھتے تھے) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسفار میں نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب ملتا ہے لہٰذا جس قدر اسفار زیادہ ہوگا اسی قدر ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ جیسا کہ ایک روایت میں ان الفاظ کی تصریح بھی موجود ہے۔

جواب نمبر۲: جمہور کا مستدل تغلیس والی حدیث کا یہ جواب بھی دیا جاتا ہے کہ تغلیس سے مراد مسجد کے اندر کا اندھیرا ہے کیونکہ اس تغلیس کے کئی درجات ہیں یہاں پر آخری درجہ مراد ہے اب حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کے اندھیرے کی وجہ سے عورتیں نہیں پہچانی جاتی تھیں اور کوئی معنی مراد لینا صحیح نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ فجر کی نماز میں پچاس ساٹھ آیات تلاوت فرماتے تو اس سے فراغت کے بعد شدید اندھیرا باقی ہو یہ بات سمجھ سے بالا تر ہے۔ نیز طلوعِ فجر کے بعد اذان دی جاتی پھر سنتیں پڑھی جاتیں[۲] اسی طرح نمازِ فجر سے فارغ ہوکر تسبیحاتِ فاطمی کے ورد

---

[۱] **تغلیس کا حکم عارض کی وجہ سے تھا جب عارض نہ رہا تو یہ حکم بھی باقی نہ رہا:** منہ کا مرجع عارض کی طرف راجع ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھنا عارض کی وجہ سے تھا ان عوارض میں سے یہ بھی ہے کہ عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں بدائع میں یہ ہے کہ اگر فجر کی نماز تغلیس میں ثابت ہوجائے تو یہ خاص فعل اسلئے فرمایا کہ اس دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی سفر کرنا چاہتے تھے یا پھر یہ تغلیس شروع زمانے میں تھیں جبکہ عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں پھر جب عورتوں کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دے دیا گیا تو پھر یہ تغلیس بھی منسوخ ہوگئی۔

قلت: ابن ابی شیبہ اور طحاوی میں ابراہیم نخعی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کسی بھی شئے کے بارے میں ایسا اجماع اور اتفاق نہ ہوا تھا جیسا کہ سب صحابہ متفق تھے کہ فجر اسفار میں پڑھنی چاہیئے۔ کیا آپ کے خیال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ آپ کے فعل کے خلاف پر اجماع کررہے تھے؟

[۲] نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں کے بعد تھوڑا سا آرام بھی عموماً فرماتے تھے (تو لامحالہ تاخیر فی الفجر تو ہوگی۔ از مترجم عفی عنہ)

کرنے کا ذکر حدیث میں آتا ہے تو اس قدر وقت کے گزر جانے کے بعد فضا میں اس قدر اندھیرے کا باقی رہنا کہ عورت گھر سے باہر ہو اس کی شخصیت اور قد وقامت کے باوجود عورت پہچاننے میں نہ آئے (اگر چہ چہرہ چھپا ہوا ہوتا ہے) یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے (لہٰذا مطلب یہی ہے کہ مسجد کے اندھیرے کی وجہ سے عورتیں پہچانی نہیں جاتی تھیں)۔

جمہور ائمہ ثلاثہ کی طرف سے اسفروا بالفجر کی توجیہ اور اس کا جواب: جمہور اسفروا بالفجر کا معنی یہ کرتے ہیں کہ طلوع فجر کا یقین ہو جائے اور فجر کے طلوع ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔ اس کا جواب یہ ہیکہ پھر اعظم اجراً کا کیا معنی ہوگا؟ (از مترجم: کیونکہ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ اسفار سے پہلے نماز پڑھنے میں بھی ثواب ہے لیکن کم ہے اور اسفار میں ثواب زیادہ ہے اور آپ کی تشریح کے مطابق) اسفار سے قبل نماز پڑھنے میں ثواب ہی نہیں ہے کیونکہ وقت داخل ہی نہ ہوا۔

باب ما جاء فی التعجیل بالظهر

باب ہے ظہر کی نماز جلدی پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا هَنَّادٌ بن السری حَدَّثَنَا وَکِیعٌ عن سفیان عن حکیم بن جبیر عن ابراهیم عن الاسود عن عائشة قالت: مَارَاَیْتُ اَحَداً کَانَ اَشَدَّ تَعْجِیلاً لِلظُّهْرِ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا مِنْ اَبِی بَکْرٍ وَلَا مِنْ عُمَرَ۔

قال: وفی الباب عن جابر بن عبد اللّٰه، وَخَبَّابٍ وَاَبِی بَرْزَة، وابن مسعودٍ، وزید بن ثابت وانس وجابر بن سمرة۔

قال ابو عیسی، حدیث عائشة حدیث حسن۔

وهو الذی اختاره اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعدهم۔

قال علی بن المدینی: قال یحیی بن سعید: وقد تکلم شعبة فی حَکِیم بنِ جُبَیْرٍ من اجلِ حدیثه الذی رَوَی۔ عن ابن مسعودٍ عن النبی ﷺ: مَنْ سَاَلَ النَّاسَ وَلَهُ مَایُغْنِیهِ۔

قال یحیی: ورَوَی له سفیانُ وزائدةُ، ولم یَرَ یحیی بحدیثه باساً۔

قال محمد: وقد رُوی عن حکیم بن جبیر عن سعید بن جبیر عن عائشة عن النبی ﷺ فی

تَعْجِيلِ الظُّهْرِ۔

☆حدثنا الحسنُ بنُ على الحلوانى اخبرنا عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزهرى قال: اخبرنى انس بن مالك: اَنَّ رسول الله ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ۔

قال ابو عيسى: هذا حديث صحيح ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور (حضرات شیخین) حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ ظہر کی نماز میں جلدی کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔

باب میں جابر بن عبداللہ، خباب، ابو برزہ، ابن مسعود، زید بن ثابت، انس اور جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن ہے اور یہ وہی بات ہے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے بعد اہلِ علم نے اختیار کیا ہے۔

علی (ابن المدینی) فرماتے ہیں کہ یحیٰی بن سعید (القطان) نے فرمایا کہ شعبہ نے حکیم بن جبیر کے بارے میں ان کی اس حدیث کی وجہ سے کلام کیا ہے جس کو انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ جو شخص لوگوں سے اس حال میں سوال کرے کہ اس کے پاس اتنا مال موجود ہو جو اسے (لوگوں سے) بے نیاز کر دے...... (ازمترجم: یہ حدیث کتاب الزکوۃ میں آرہی ہے)۔

یحیٰی فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری اور زائدہ نے ان (حکیم) کی روایتیں لی ہیں اور خود یحیٰی بھی ان سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے (گویا یحیٰی بن سعید شعبہ کے حکیم پر کلام کرنے کو بے بنیاد قرار دے رہے ہیں)

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا حکیم بن جبیر سے سعید بن جبیر کی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہر کی نماز میں جلدی کرنا بھی مروی ہے۔

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز (سردی کے موسم میں) زوالِ شمس کے (فوراً) بعد پڑھی۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

تعجیل اورتاخیر والی احادیث میں تطبیق کہ یہ دونوں الگ الگ زمانوں پرمحمول ہیں:

جواب نمبر۱: حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ ظہر کی نماز کے متعلق بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعجیل اور تاخیر دونوں طرح ثابت ہے کیونکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اول وقت میں ظہر ادا فرماتے تھے اور دوسری بعض احادیث اس کے خلاف ہیں لہٰذا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی طرف رجوع کیا تو اس میں "ابردوا[1] فی الظھر فان شدۃ الحر من فیح جھنم" سے معلوم ہوا کہ گرمی کے زمانے میں ظہر جلدی نہیں پڑھنی چاہیئے اس لئے گرمی کے زمانہ کے علاوہ تمام اوقات اور سارے زمانوں میں ظہر کی نماز اول وقت میں پڑھنا مستحب ہے کیونکہ سخت گرمی کے وقت کو حدیث شریف میں تعجیل ظہر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

قولی حدیث فعلی حدیث پرراجح ہوتی ہے۔ جواب نمبر۲: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل آپ کے قول کے معارض نہیں بن سکتا کیونکہ ممکن ہے کہ یہ فعل (تعجیل الظہر والا) کسی عارض اور عذر کی وجہ سے ہو (جبکہ قول کی حیثیت قاعدہ کلیہ کی سی ہے) اس لئے ہم نے امتثالِ امر کیلئے قولی حدیث کو ترجیح دی اور اس پر عمل کیا۔

حکیم ابن جبیر راوی کی تضعیف: (من سال الناس وله ما يغنيه) (اس حدیث کے نقل کرنے کی وجہ سے حکیم ابن جبیر راوی پر کلام کیا گیا ہے۔ از مترجم) حالانکہ اس روایت کے نقل کرنے کی وجہ سے راوی کے ضعیف ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے۔ البتہ حکیم بن جبیر نے اپنی روایت میں یہ تفصیل نقل کی ہے کہ مایغنیہ سے مراد یہ ہے کہ اس کے

---

[1] علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ابردوا بالظہر کے حکم کے متعلق اختلاف ہے قاضی عیاض وغیرہ نے کہا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک یہ حکم وجوبی ہے۔ التوضیح میں ہے کہ علماء میں ظہر کی نماز کو موخر کرنے کے متعلق اختلاف ہے بعضوں کے نزدیک ظہر کو اول وقت میں پڑھا جائیگا اور وہ ابردوا بالظہر کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ظہر کو اول وقت میں پڑھو جو کہ آنے والے وقت کے اعتبار سے ٹھنڈا ہے۔ جمہور صحابہ وتابعین ظہر کو موخر کرنے کے قائل ہیں اب ایک قول میں ظہر کو مؤخر کرنا عزیمت ہے اور ایک قول میں واجب جبکہ تیسرے قول میں رخصت ہے۔ انتہیٰ

ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ سردی اور ابر کی صورت میں فقہاء کا اجماع ہے کہ ظہر کو اول وقت میں پڑھنا چاہیئے۔ سخت گرمی کے موسم میں اختلاف ہے امام احمدؒ، اسحٰقؒ، مجتہدین فقہاء کرام (حنفیہ) ابن منذرؒ وغیرہ کے نزدیک سخت گرمی میں نماز ظہر کو موخر کرکے پڑھنا مستحب ہے کیونکہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوٰۃ" یہ ان حضرات کی دلیل ہے۔

پاس پچاس درہم ہوں (از مترجم: اس روایت کو مصنف نے کتاب الزکوٰۃ میں "باب من تحل له الزکوٰۃ" میں ذکر کیا ہے اور وہاں پر اس کلام کا بھی اعادہ ہے۔ دیکھیئے ترمذی صفحہ ۱۴۱۔ ایچ ایم سعید) اور اس سائل کے اہل وعیال زیادہ ہوں اس کے ایک دن کا خرچہ پچاس درہم ہو تو حکیم بن جبیر کی اس حدیث میں پچاس درہم سے کم مال کی موجودگی کے باوجود سوال کرنے کی جو اجازت ذکر ہے وہ بعض افراد کے اعتبار سے ہے لیکن ظاہر حدیث کے معنی کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے حکیم بن جبیر پر اعتراض کیا کہ وہ ایسی حدیث نقل کر رہے ہیں کہ پچاس درہم سے کم مال ہونے کے باوجود سوال کرنا جائز ہے اس لئے ان کو ضعیف قرار دیا لیکن ہم نے حکیم بن جبیر کی حدیث کا معنی بتادیا ہے اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ حکیم بن جبیر کی وہ حدیث صحیح ہے کیونکہ اس کے متابعات موجود ہیں اور محدثین کرام نے عموماً اس کی حدیث کو ضعیف نہیں کہا۔

مصنف کے نزدیک حکیم راوی کی تضعیف نا قابلِ اعتبار ہے: جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان کی حدیث پر وہاں حدیث حسن کا حکم لگایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی نے ان کو ضعیف کہنے والے ائمہ کے قول کا اعتبار نہیں کیا ورنہ (کتاب الزکوٰۃ) میں ان کی حدیث کو حسن نہ کہتے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہاں پر "فقد تکلم شعبه فی حکیم بن جبیر" کے متعلق) امام ترمذی کی رائے یہ ہے کہ شعبہ نے حکیم بن جبیر کو جو ضعیف کہا ہے ان کی یہ تضعیف نا قابلِ اعتبار ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قال محمد وقدروی حکیم بن جبیر عن سعید بن جبیر عن عائشه رضی الله عنها الخ) یعنی یہ روایت جس طرح حکیم بن جبیر نے اوپر متن میں عن ابراهیم عن الاسود عن عائشه نقل کی ہے اسی طرح[1] حکیم بن جبیر نے عن سعید بن جبیر عن عائشہ بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

باب ماجاء فی تاخیر الظهر فی شدة الحر

باب ہے سخت گرمی میں ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا قُتَيْبَةُ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عن ابن شِهَابٍ عن سعيدِ بن الْمُسَيِّبِ وأبى سَلَمَةَ عن ابى هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا عن الصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ۔

وفی الباب عن ابی سعید، وابی ذر، وابن عمر والمغیرة، والقاسم بن صفوان عن ابیه، وابی موسی، وابن عباس، وانس، ۔

---

[1] ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی یہاں سے حدیث باب میں اضطراب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں بیہقی نے کہا ہے کہ حدیث باب میں دوسری وجوہ سے بھی اضطراب موجود ہے۔

قَالَ وَرُوِیَ عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ ھٰذَا وَلَا یَصِحُّ۔

قَالَ اَبُوْ عِیْسٰی: حَدِیْثُ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔ وَقَدْ اِخْتَارَ قَوْمٌ مِّنْ اَھْلِ الْعِلْمِ تَاخِیْرَ صَلَاۃِ الظُّھْرِ فِیْ شِدَّۃِ الْحَرِّ۔ وَھُوَ قَوْلُ اِبْنِ الْمُبَارَکِ، وَاَحْمَدَ وَاِسْحٰقَ۔

قَالَ الشَّافِعِیُّ: اِنَّمَا الْاِبْرَادُ بِصَلَاۃِ الظُّھْرِ اِذَا کَانَ مَسْجِداً۔ یَنْتَابُ اَھْلُہٗ مِنَ الْبُعْدِ، فَاَمَّا الْمُصَلِّیْ وَحْدَہٗ وَالَّذِیْ یُصَلِّیْ فِیْ مَسْجِدِ قَوْمِہٖ: فَالَّذِیْ اُحِبُّ لَہٗ اَنْ لَّایُؤَخِّرَ الصَّلَاۃَ فِیْ شِدَّۃِ الْحَرِّ۔

قَالَ اَبُوْ عِیْسٰی: وَمَعْنٰی مَنْ ذَھَبَ اِلٰی تَاخِیْرِ الظُّھْرِ فِیْ شِدَّۃِ الْحَرِّ ھُوَ اَوْلٰی وَاَشْبَہُ بالاتِّبَاعِ۔

واَمَّا ماذھب الیہ الشافعی انَّ الرخصۃ لِمَنْ یَنْتَابُ من البُعْدِ والْمَشَقَّۃِ علی الناس۔ فاِنَّ فی حدیث ابی ذَرٍ مایَدُلُّ علی خلافِ ماقال الشافعی۔

قال ابوذر: کُنَّا مع النبی ﷺ فی سَفَرٍ فَاَذَّنَ بِلَالٌ بِصَلَاۃِ الظُّھْرِ، فقال النبی ﷺ: یَابِلَالُ اَبْرِدْ ثُمَّ اَبْرِدْ۔ فلو کان الامر علی ماذھب الیہ الشافعی: لم یکن للابراد فی ذلک الوقت معنی، لاجتماعھم فی السفر، وکانوا لایحتاجون ان ینتابوا من البعد۔

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود الطیالسی قال: انبانا شعبۃ عن مھاجر ابی الحسن عن زید بن وھب عن ابی ذر: اَنَّ رسول اللّٰہ ﷺ کان فی سَفَرٍ وَمَعَہٗ بِلَالٌ، فَاَرَادَ اَنْ یُقِیمَ، فقال: اَبْرِدْ، ثُمَّ اَرَادَ اَنْ یُقِیمَ، فقال رسول اللّٰہ ﷺ: اَبْرِدْ فی الظُّھْرِ، قال حَتّٰی رَاَیْنَا فَیْءَ التُّلُولِ، ثُمَّ اَقَامَ فَصَلّٰی، فقال رسول اللّٰہ ﷺ: اِنَّ شِدَّۃَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ، فَاَبْرِدُوا عَنِ الصلاۃِ۔

قال ابو عیسی: ھٰذا حدیثٌ حسنٌ صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب گرمی سخت ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو! اسلئے کہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے سے ہوتی ہے۔

باب میں ابوسعید، ابوذر، ابن عمر، مغیرہ، قاسم بن ابی صفوان عن ابیہ، ابوموسیٰ، ابن عباس، اور انس رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں اور اس (باب) میں عن عمر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بھی روایت ہے اور وہ صحیح نہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کی ایک جماعت نے گرمی کے

موسم میں ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھنے کو پسند کیا ہے اور یہ ابن مبارک، امام احمد اور اسحق کا قول ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کر کے اس وقت پڑھا جائے گا جبکہ مسجد کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے نمازی دور دور سے آتے ہوں اور جو خود اپنی نماز (علیحدہ) پڑھنے والا ہو اور جو اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھے پس اس کیلئے میں پسند کرتا ہوں کہ وہ گرمی کی سختی کے وقت میں (بھی) نماز کو تاخیر کر کے نہ پڑھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور جن حضرات نے سخت گرمی میں مطلقاً ظہر کی نماز کی تاخیر کو مستحب قرار دیا ان کی بات زیادہ بہتر اور اتباع کے مناسب ہے اور امام شافعی نے جس بات کو اختیار کیا ہے کہ یہ (نماز کو ٹھنڈے وقت پڑھنا) تو رخصت ہے اس شخص کیلئے جو دور سے اور مشقت اٹھا کر لوگوں کے پاس (مسجد میں) آتا ہو۔لیکن ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی تردید ہوتی ہے۔ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور بلال نے ظہر کی نماز کے لئے اذان کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! ٹھنڈا کرو۔ (یعنی وقت کو ٹھنڈا ہونے دو) پھر خوب ٹھنڈا ہونے دو۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ظہر کے ٹھنڈے وقت کا انتظار کرنے کا حکم فرمایا)۔ پس اگر حکم اس طرح ہوتا جس طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے مراد لیا تو ٹھنڈا کرنے کا اس وقت کوئی معنی نہیں بنتا اسلئے کہ اس وقت صحابہ کرام سب جمع تھے اور انہیں دور سے آنے کی حاجت نہ تھی۔ (باوجود اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر میں تاخیر کروائی جو اس بات کی دلیل ہے کہ گرمیوں میں ظہر کی نماز میں تاخیر کرنا مستحب ہے)۔

☆ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے اور بلال رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے پس بلال نے (اذان و) اقامت کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وقت کو ٹھنڈا ہونے دو پھر (تھوڑی دیر بعد دوبارہ بلال نے اذان و اقامت) کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دوبارہ) فرمایا ظہر کی نماز کیلئے وقت کو ٹھنڈا ہونے دو۔ ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ل کہ یہاں تک کہ ہم نے دیکھا ٹیلوں کا سایہ (ٹیلوں کے بقدر۔ اور یہ مثلِ اول میں ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو (بلال نے) اقامت کہی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بے شک گرمی کی شدت جہنم کے پھیلاؤ (سانس لینے) سے ہوتی ہے تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

گرمی کی شدت کے دو سبب ہیں ایک حقیقی جسکو حدیث بیان کر رہی ہے، دوسرا ظاہری جو حواسِ ظاہرہ سے سمجھ میں آتا ہے: اشکال: (فان شدة الحر من فيح جهنم) گرمی تو سورج کے قرب اور بعد سے ہوتی ہے نہ کہ جہنم سے؟

جواب: ہم عالم محسوسات میں بہت ساری چیزیں ایسی دیکھتے ہیں جو بظاہر سمجھ میں نہیں آتیں لیکن غور وخوض کے بعد عقل کی رسائی اس تک ہو جاتی ہے تو یہاں پر بھی ممکن ہے کہ اللہ جل جلالہ نے سورج اور جہنم کے درمیان ایک ایسا تعلق رکھا ہو کہ جہنم کی گرمی سورج تک پہنچتی ہو (لہٰذا بظاہر تو دنیا میں گرمی سورج سے پہنچ رہی ہے لیکن حقیقت میں یہ گرمی جہنم ہی سے پہنچ رہی ہے) لہٰذا اب یہ بات صحیح ہے کہ خارج میں سورج کے قرب وبعد سے گرمی میں کمی بیشی ہوگی کیونکہ ظاہری سبب یہی سورج ہے۔

نمازوں میں تعجیل اور تاخیر میں مدار گرمی اور سردی کے موسم کا ہے یا پھر انکے وجود کا: اگر کسی دن گرمی نہ ہو یا سرد علاقہ ہو تو وہاں بھی نمازِ ظہر کو موخر کرنا مستحب ہے یا نہیں اس مسئلہ میں اختلاف ہے جن علماء نے تاخیر ظہر کے حکم کو معلول بالعلۃ قرار دیا ہے ان کے نزدیک ان حالات میں ظہر کو جلدی پڑھنا چاہیئے اور جن حضرات کے نزدیک یہ حکم عام ہے[۲] تو ان کے یہاں ہر حال میں ظہر میں تاخیر مستحب ہے چاہے وہاں گرمی نہ ہو۔

---

[۱] اشکال: سخت گرمی کے وقت میں نماز پڑھنے سے کیوں منع کیا گیا حالانکہ اس وقت میں تو نماز پڑھنی چاہیئے کیونکہ گرمی جہنم کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے اور نماز کا پڑھنا جو رحمت کا سبب ہے لہٰذا نماز پڑھنے سے تو عذاب کی صورت (گرمی) دور ہوگی؟

جواب: شریعت میں یہاں پر اسی طرح حکم آیا ہے لہٰذا اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے اگرچہ ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے بہت سے جوابات بھی دیئے گئے ہیں جن کو میں نے اوجز المسالک میں ذکر کیا ہے۔

[۲] قلت: حنفیہ کے مذہب میں راجح قول کے مطابق یہ حکم عام ہے چنانچہ اوجز المسالک میں درمختار وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز کو مطلقاً تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے چاہے شدید گرمی ہو یا نہیں چاہے وہ ملک سرد ہو یا گرم اور چاہے کثرتِ جماعت کیلئے نماز کو موخر کرے یا یہ نیت نہ ہو۔ جوہرہ وغیرہ میں یہ شرط جو لگائی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں انتہائی گرمی کی صورت میں اور ملک کے گرم ہونے کی شرط کے ساتھ ظہر کو مؤخر کرنا چاہئے یہ شروطِ ثلثہ لگانا صحیح نہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تینوں شرطیں شوافع نے اپنی کتابوں میں صراحۃً لگائی ہیں۔ قلت: حنابلہ میں سے قاضی...... کا بھی یہی مذہب ہے زرقانی نے مالکیہ کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ پورے سال نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھنا چاہئے اور سخت گرمی کی صورت میں مزید موخر کرنا چاہیئے۔ (از مترجم: معارف السنن صفحہ ۵۴ جلد دوم پر ہے، مسئلہ فقہیہ کا بیان: ظہر کی نماز کے ٹھنڈا کرنے کے متعلق احناف کے دو قول ہیں: ۱۔ گرمی کے موسم میں مطلقاً نمازِ ظہر کو ٹھنڈے وقت تک مؤخر کیا جائیگا چاہے سخت گرمی ہو یا نہیں اسکو صاحبِ بحر الرائق نے اختیار کیا ہے، ۲۔ اس میں اصل علت حدیث باب میں شدۃ الحر ہے لہٰذا سخت گرمی کی صورت میں نمازِ ظہر کو مؤخر کرنا چاہیئے اس کو علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں اختیار فرمایا ہے یہی قول اولیٰ ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ کے زیادہ اقرب ہے، اسی طرح نمازِ جمعہ کو اول وقت میں پڑھنے کے متعلق احناف کے دو قول ہیں: ۱۔ بحر الرائق میں لکھا ہے کہ نمازِ جمعہ ظہر کی طرح ہے کہ گرمی کے موسم میں تاخیر کر کے پڑھی جائیگی اور سردی کے موسم میں اول وقت میں پڑھی جائیگی یہ مستحب ہے، ۲۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں حنفی مذہب میں جمعہ کو ہر موسم میں اول وقت میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ جمعہ کو اول وقت میں پڑھنے کیوجہ سے صحابہ جب اس سے فارغ ہوتے تو دیواروں کا سایہ نمودار نہیں ہوتا تھا الخ۔

باب ماجاء في تعجيل العصر

باب ہے عصر کی نماز جلدی پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا قُتَيبَةُ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عن ابنِ شِهَابٍ عن عُرْوَةَ عن عائشةَ انها قالت:صَلّٰى رسول الله صلّٰى الله عليه وسلم العَصْرَ وَالشَّمْسُ فى حُجْرتِها، لَمْ يَظْهَرِ الفَىْءُ، مِنْ حُجْرَتِهَا۔

قال:وفى الباب عن انس ، وابى اروى وجابر، ورافع بن خديج۔

قال: ويروى عن رافع ايضا عن النبى ﷺ فى تاخير العصر، ولا يصح۔

قال ابو عيسى: حديث عائشة حديث حسن صحيح۔

وهو الذى اختاره بعض اهل العلم من اصحاب النبى ﷺ منهم: عمر وعبد الله بن مسعود وعائشة وانس وغير واحد من التابعين : تعجيل صلاة العصر، وكرهوا تاخيرها۔

وبه يقول عبد الله بن المبارك، والشافعى،واحمد، واسحق۔

☆حدثنا علىُّ بنُ حُجرٍ حَدَّثَنَا اسمعيل بنُ جعفرٍ عن العلاءِ بن عبدالرحمن:انَّه دخلَ على انس بن مالكٍ فى داره بالبصرة حين انصَرَفَ مِنَ الظُّهرِ ،وَدَارُهُ بِجَنْبِ الْمَسْجِدِ۔ فقال: قُومُوا فَصَلُّوا العَصْرَ،قال: فَقُمْنَا فَصَلَّيْنَا، فَلَمَّا انصَرَفْنَا قال: سمعتُ رسولَ الله صلّٰى الله عليه وسلم يقول: تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ، يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ۔ حتى اِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ۔قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعاً لَايَذْكُرُ اللّٰهَ فِيهَا اِلَّا قَلِيلاً۔ قال ابو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے اس حال میں کہ دھوپ ابھی ان کے حجرہ (صحن) میں ہوتی۔یعنی سایہ ان کے حجرہ (کی دیوار) پر نہ چڑھا ہوتا۔

باب میں حضرت انس، ابواروی، جابر، رافع بن خدیج سے روایات ہیں اور رافع سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عصر کی نماز تاخیر سے پڑھنے کے بارے میں بھی روایات مروی ہیں اور وہ صحیح نہیں ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے اور وہ بات وہی ہے جس کو نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بعض اہل علم نے اختیار کیا ہے ان میں عمر، عبداللہ، عائشہ، انس اور بے شمار تابعین رضی اللہ عنہم ہیں کہ عصر کی نماز جلدی پڑھی جائے۔ اور وہ ناپسند کرتے ہیں اس (عصر کی نماز) میں تاخیر کرنے کو اور یہی عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے۔

☆ حضرت علاء بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ وہ ظہر کی نماز (جماعت سے) پڑھنے کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں جو بصرہ میں تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد سے متصل تھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کھڑے ہو جاؤ اور عصر پڑھو! چنانچہ سب نے عصر با جماعت پڑھی پھر جب ہم فارغ ہوئے تو (حضرت انس رضی اللہ عنہ نے) فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا سورج کا انتظار کرتا رہے یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو یہ (منافق) شخص کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں جلدی جلدی مار لیتا ہے۔ اس میں اللہ کا بہت تھوڑا سا ہی ذکر کرتا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

جمہور کے نزدیک حدیثِ باب میں حجرۂ عائشہ میں سورج کا ہونا تعجیلِ عصر پر دلیل ہے: (والشمس فی حجرتها لم يظهر الفیٔ من حجرتها) حجرہ سے یہاں مراد[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کا صحن ہے، مصنف کے

---

[1] حدیثِ باب سے عصر کی نماز کے اول وقت میں پڑھنے پر جمہور نے استدلال کیا ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث سے اول وقت میں نماز پڑھنے پر استدلال نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی دیواریں چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے سورج بالکل غروب کے قریب بھی دیواروں سے چھپتا ہوگا۔ یہ حدیث تو تاخیر عصر پر دلالت کر رہی ہے نہ کہ تعجیل پر؟ بدائع میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی دیواریں چھوٹی تھیں تو سورج کی روشنی سورج کے زرد ہونے تک اس میں رہتی تھی۔ کذا فی الاوجز

شرح ابی الطیب میں نووی سے نقل کیا ہے کہ صحن چھوٹا سا تھا اور اس کی دیواریں صحن کی پیمائش سے بھی چھوٹی تھیں۔ ابن سید الناس نے لم يظهر من حجرتها کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ سورج کا سایہ چھت تک نہیں چڑھا تھا تو اس طرح عصر کی نماز مثلِ اول کے کافی بعد پڑھی گئی بلکہ مثلین کے بھی بعد ہوئی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی دھوپ کمرے کی چھت تک نہیں تھی بلکہ مشرقی دیوار پر اس کی دھوپ پڑ رہی تھی اور یہ بات گزر چکی ہے کہ غربی دیوار صحن کی پیمائش سے چھوٹی تھی۔ انتہی

نزدیک اس حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ عصر کی نماز بہت جلدی پڑھنی چاہیئے کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کا صحن زیادہ لمبا نہ تھا (اور ابھی تک دھوپ صحن کے اندر ہی تھی) معلوم ہوا کہ ابھی مثل اول کے بعد کا وقت ہے؟

جمہور کے استدلال کا جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ صحن کی دیواریں چھوٹی چھوٹی تھیں (از مترجم: تو بیوت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شرقی دیواریں سورج کی دھوپ کو گھر میں داخل ہونے سے جب ہی مانع ہونگی جب سورج غروب کے بالکل قریب پہنچ جائیگا اس طرح تو یہ روایت تاخیر عصر کی دلیل ہوئی۔ ص ۶۱ معارف السنن جلد ۲) مسجدِ نبوی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے اور صحن کا نقش اس طرح ہے کہ مدینہ کا قبلہ جنوبی ہے لہٰذا مشرق ان کے بائیں طرف ہے اور مغرب ان کے دائیں طرف ہے مسجد کے شرقی جانب حضرت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے کا دروازہ ہے اس کو حدیث باب میں حجرہ کہا گیا ہے اور اسی صحن کو حدیثِ باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمرہ کہا گیا ہے۔ فتفکر (از مترجم: حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث میں حجرہ سے کمرہ (بناء مسقّف) مراد لیا ہے اس صورت میں سورج کی دھوپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے میں صرف اس دروازہ سے داخل ہوسکتی ہے جو دروازہ مسجد میں کھلتا ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمرہ جانب مشرق میں تھا اور انکا دروازہ جانب مغرب میں کھلتا تھا تو اس صورت میں دیواروں کے بڑے اور چھوٹی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ اس صورت میں دھوپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرہ میں غروب کے قریب قریب تک رھیگی لیکن احناف نے یہاں حجرہ سے مراد صحن لیا ہے چنانچہ علامہ سمہودیؒ نے لکھا ہیکہ جناب رسول اللہ ﷺ کی ہر اہلیہ کے کمرے کے ساتھ چھوٹا سا صحن تھا...... اور عرف میں سب جانتے ہیں کہ صحن کی دیواریں، کمرہ کی دیواروں سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ ص ۶۳، نیز ص ۶۲ پر ہیکہ بخاری کی روایت میں صحن کی دیواروں کے چھوٹا ہونے کی تصریح ہے۔ معارف السنن)

(عن العلاء بن عبدالرحمن انه دخل) یعنی یہی علاء تابعی داخل ہوئے۔

(علی انس بن مالك) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور اپنے گھر سے نہیں نکلتے تھے اور گھر میں ہی تمام گھر والوں کو نماز پڑھا دیتے تھے۔

(فی دار ہ بالبصرۃ) یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں گھر تھا۔ وہاں پر علاء تابعی گئے تھے۔ (از مترجم: حافظؒ نے فتح الباری میں تصریح کی ہیکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں ۹۳ھ میں انتقال ہوا" وکان آخر من مات بالبصرۃ من الصحابة" ص ۲۳۷: فتح الباری جلد اول۔ نیز علامہ قسطلانی نے بھی "باب من الایمان ان یحب لاخیه ما

یحب لنفسه" میں بھی تصریح کی ہے "آخر من مات من الصحابة بالبصرة سنه ثلاث و تسعین"۔ص ۹۵:ارشادالساری)

(حین انصرف من الظهر) یعنی علاء تابعی مسجد سے ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر انس رضی اللہ عنہ کے گھر گئے تھے۔

(و داره بجنب المسجد) یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا گھر مسجد کے ایک جانب میں واقع تھا۔ بظاہر اہل مسجد نے ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت کی تکمیل پر یعنی آخری وقت میں پڑھی ہوگی[1] پھر ظہر کے فرض پڑھنے کے بعد علاء تابعی سنتوں اذکار اور نوافل وغیرہ میں مشغول ہوئے ہونگے۔ بہر حال اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ علاء تابعی کے ظہر پڑھنے کے فوراً بعد انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے عصر کی نماز شروع کر دی تھی بلکہ ظاہر یہ ہے جیسا کہ مہمانوں کے آنے کے بعد یہ طریقہ ہے کہ انس رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر علاء کے ساتھ بیٹھے ہونگے پھر کچھ دیر باتیں کی ہونگی پھر عصر کی نماز پڑھانے کھڑے ہونگے تو کوئی یہ وہم نہ کرے کہ یہاں عصر وظہر دونوں نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھی گئی ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک وہ تاخیر مطلوب ہے جو زیادتی ثواب کے حصول کیلئے ہے نہ کہ ایسی تاخیر جو ممنوع ہو اور ثواب میں کمی کردے: (فقال قوموا فصلوا) کیونکہ یہ صحابی انس رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں کے ساتھ عصر اول وقت میں پڑھتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ اول وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

تلک صلوٰۃ المنافق والی حدیث کا جواب: لیکن انہوں نے استدلال میں جو حدیث پیش کی تلك صلوٰة المنافق الخ والی اس سے استدلال صحیح نہیں بلکہ عصر میں اتنی تاخیر کرنا کہ عصر کی نماز اصفرارِ شمس میں پڑھی جائے اس کو حدیث میں منافق کی نماز کہا گیا نہ کہ مطلقاً تاخیر کو اور حنفیہ بھی اتنی تاخیر کے قائل نہیں۔ بہر حال عصر کی نماز کے متعلق تعجیل بھی احادیث میں مروی ہے اور تاخیر بھی تو ان روایات میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ ہم نے یہ غور کیا کہ کس صورت میں ثواب زیادہ ملیگا تو غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نوافل پڑھنا منع ہیں لہٰذا اگر عصر کی نماز جلدی پڑھ لی جائیگی تو اس صورت میں نوافل کے اوقات کا بہت سارا وقت نکل جائیگا اور نوافل میں کمی واقع ہوگی۔ نیز عصر کے بعد عموماً لوگ دنیاوی مشاغل، خرید وفروخت وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں تو ایسے لغو کام کیلئے بہت بڑا وقت خراب کرنا پڑے گا اسلئے حنفیہ نے تاخیر عصر کا قول کیا۔

---

[1] قلت: یہ بات کوئی بعید نہیں کہ اہلِ مسجد کے ہاں ظہر کا وقت مثلین تک رہتا ہوگا اسی لئے انہوں نے مثلِ اول کے بعد ظہر پڑھی اور انس رضی اللہ عنہ مثل اول کے قائل ہونگے اسلئے انہوں نے مثلِ اول کے بعد عصر پڑھی ہوگی (لہٰذا حدیثِ باب میں تاویل کی ضرورت نہیں۔ ازمترجم)

باب ماجاء فی تاخیر صلاة العصر

باب ہے عصر کی نماز تاخیر سے پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا عليُّ بنُ حُجرٍ حَدَّثَنَا اسمعيل بنُ عُلَيَّةَ عن ايوبَ عن ابن ابی مُلَيکَةَ عن اُمِّ سلمة اَنها قالت: كان رسول الله صلّى الله عليه وسلم اَشَدَّ تَعجِيلاً للظُّهرِ مِنكُم، وَاَنتُم اَشَدُّ تَعجِيلاً لِلعصر منه۔

قال ابو عيسى:وقد روى هٰذا الحديث عن ابن جريج عن ابن ابی مليكة عن ام سلمة نحوه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں تم سے زیادہ جلدی فرمایا کرتے تھے اورتم عصر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ جلدی کرتے ہو۔

امام ترمذی فرماتے ہیں اور یہ حدیث ابن جریج سے عن ابن ابی ملیکہ عن ام سلمہ کی سند سے اس طرح مروی ہے۔

باب ماجاء فی وقت المغرب

باب ہے مغرب کی نماز کے وقت کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا قُتَيبَةُ حَدَّثَنَا حاتم بن اسمعيل عن يزيد بن ابی عبيد عن سلمة بن الاكوع قال: كان رسول الله صلّى الله عليه وسلم يُصَلِّی المغربَ اِذَا غَرَبَتِ الشَّمسُ وَتَوَارَتْ بِالْحِجَابِ۔

قال:وفی الباب عن جابر وزيد بن خالد وانس، ورافع بن خَدِيجٍ وابی ايوب، وامِّ حَبِيبَةَ، وعباس بن عبد المطلب۔وحديثُ العباس قدروی موقوفاً عنه، وهو اصح۔

قال ابو عيسى: حديثُ سَلَمَةَ بَنِ الاَكوَع حديثٌ حسنٌ صحيحٌ۔

وهو قولُ اكثر اَهلِ العلم من اصحابِ النبی صلّى الله عليه وسلم ومن بعدهم من التابعين: اِختَارُوا تعجيلَ صلاةِ المغربِ ، وكرهوا تأخيرها، حتّٰى قال بعضُ اهلِ العلم: ليس لصلاة المغرب الّا وقتٌ واحدٌ، وذَهَبُوا اِلى حديث النبی صلّى الله عليه وسلم حَيثُ صلّى به جبريلُ۔ وهو قولُ ابنِ المبارك ، والشافعیّ۔

﴿ترجمہ﴾

سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب سورج غروب ہو جاتا تھا اور اوٹ میں چلا جاتا تھا۔

باب میں جابر، زید بن خالد، انس، رافع بن خدیج، ابی ایوب، ام حبیبہ اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔ اور عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ان سے موقوفاً بھی مروی ہے اور وہ اصح ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہی قول صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے تابعین میں سے اکثر اہل علم کا ہے یعنی انہوں نے مغرب کی نماز میں جلدی کرنے کو پسند کیا ہے اور اس میں تاخیر کو ناپسند کیا ہے یہاں تک کہ بعض اہل علم تو فرماتے ہیں کہ مغرب کی نماز کا صرف ایک ہی وقت ہے (یعنی مغرب کا وقت بہت تنگ ہے) اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کروائی تھی اور یہی ابن مبارک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا قول ہے۔

﴿تشریح﴾

(حتی قال بعض اهل العلم لیس لصلوٰة المغرب الا وقت واحد) مطلب یہ ہے کہ ان علماء کے نزدیک مغرب کا وقتِ مستحب ایک مختصر سا وقت ہے اس کے بعد نماز مکروہ ہے لیکن جمہور کے نزدیک مغرب میں تاخیر مکروہ ہے البتہ اول وقت کے بعد مغرب کی نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے کیونکہ نفسِ وقت میں کوئی کراہت نہیں۔

باب ماجاء فی وقت صلاة العشاء الآخِرَة

باب ہے عشاء کی نماز کے وقت کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا محمد بن عبد الملك بن ابی الشوارب حَدَّثَنَا ابو عوانة عن ابی بشر عن بشیر بن ثابت عن حبیب بن سالم عن النعمان بن بشیر قال: اَنَا اَعْلَمُ النَّاسِ بِوَقْتِ هٰذِهِ الصَّلَاةِ: كَانَ رسولُ الله صلّی الله علیه وسلم یُصَلِّیهَا لِسُقُوطِ القَمَرِ لِثَالِثَةٍ۔

☆حدثنا ابو بکر محمد بن اَبَانَ حَدَّثَنَا عبدُ الرحمن بنُ مَهْدِیٍ عن ابی عَوَانَةَ بهذا الاسناد نَحْوَهُ۔

قال ابو عیسی: رَوَی ھٰذَا الحدیث ھُشَیْمٌ عن ابی بِشْرٍ عن حبیب بن سالم عن النعمان بن بشیر۔ ولم یذکرفیه هشیم، عن بشیر بن ثابت ۔وحدیث ابی عوانة اصح عندنا لانّ یزید بن هرٰون رَوَی عن شُعبةَ عن ابی بشرٍ نحو روایة ابی عوانة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں لوگوں میں سب سے زیادہ اس نماز کے وقت کا علم رکھتا ہوں ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عشاء کی نماز پڑھتے تھے جس وقت تیسرے تاریخ کا چاند غروب ہوتا ہے۔

ابوبکر محمد بن ابان عبدالرحمٰن بن مھدی سے اور وہ ابوعوانہ سے اسی سند کے ساتھ نقل اسی طرح کرتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو ہشیم نے ابوبشیر کے واسطے سے نقل کیا ہے اور انہوں نے بشیر بن ثابت کو ذکر نہیں کیا اور ابوعوانہ (جنہوں نے بشیر بن ثابت کے واسطے سے نقل کیا ہے) کی حدیث ہمارے نزدیک اصح ہے اسلئے یزید بن ہارون نے شعبہ سے ابوبشیر کے واسطے سے ابوعوانہ کی روایت کی طرح روایت کی ہے۔

﴿تشریح﴾

(انا اعلم الناس) بسا اوقات ایک شخص نے کسی مسئلہ میں خوب غور وخوض اور بحث وتحقیق سے کام لیا ہوتا ہے اسلئے وہ اپنے آپ کو اس مسئلہ کا سب سے زیادہ جاننے والا سمجھتا ہے، یہاں بھی اسی طرح ہوا۔ نیز حاضرین مجلس نے ان کے اعلم الناس کہنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کو مسئلہ زیادہ اچھی طرح یاد تھا دیگر حاضرین مجلس کو اس طرح معلوم نہ تھا۔

باب ماجاء فی تاخیر صلاۃ العشاء الآخرۃ

باب ہے عشاء کی نماز میں تاخیر کرنے کا بیان

☆ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا عبدة عن عبیدالله بن عمر عن سعید المقبری عن ابی هریرة قال: قال النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم: لَوْلَاأَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ أَنْ يُؤَخِّرُوا العِشَاءَ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ أَوْنِصْفِهِ۔

قال:وفی الباب عن جابر بن سمرة۔ وجابر بن عبد الله، وابی بَرْزَةَ، وابن عباسٍ، وابی سعیدٍ الخدری وزید بن خالد وابن عمر۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرة حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

وھو الذی اختارہُ اکثرُ اھلِ العلم من اصحاب النبیؐ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم و التابعینَ وغیرھم : راوا تاخیر صلاۃِ العشاء الآخرۃِ۔ وبہ یقولُ احمد ، واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ اپنی امت پر مشقت میں پڑ جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز کو تہائی رات تک یا نصف رات تک موخر (کر کے پڑھا) کریں۔

باب میں جابر بن سمرہ، جابر بن عبداللہ، ابو برزہ، ابن عباس، ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی بات کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے اکثر اہل علم نے اختیار کیا ہے یعنی ان کی رائے ہے کہ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھی جائے اور یہی قول امام احمد اور امام اسحٰق کا ہے۔

﴿تشریح﴾

(لولا ان اشق علی امتی لامرتھم) یہاں امر سے مراد امر وجوبی ہے۔

اشکال: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو خود ہی مامور اور احکام الٰہی کے پیروکار تھے تو آپ اپنی طرف سے کس طرح وقت مقرر کر سکتے ہیں؟

جواب: لامرتھم کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس نماز عشاء کے ثلث تک تاخیر کرنے کا حکم سنانا ہے۔[1]

---

[1] **لامرتھم کی توجیہات: کیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے بھی احکام صادر فرماتے تھے اسمیں چار قول ہیں:** حدیث باب کی ایک توجیہ تو یہی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے فیصلہ فرماتے تھے تو اس سے اہل اصول کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے بھی احکام صادر فرماتے تھے۔ ابوداؤد کی شرح میں ابن رسلان نے اس مسئلہ کے متعلق چار قول ذکر کیئے ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے تھے۔
۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہیں فرماتے تھے سب وحی ہوتا تھا۔
۳۔ امورِ جنگ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے تھے احکامات میں نہیں
۴۔ توقف کیا جائیگا اس کے متعلق۔

(الی ثلث اللیل او نصفہ) یا تو یہ مطلب ہے کہ ایک اندازہ کے مطابق ثلث اللیل یا نصف اللیل تک نماز کو موخر کرنے کا حکم دیتا...... یا مطلب یہ ہے کہ ثلث اللیل پر نمازِ عشاء شروع کرواور نصف اللیل پر ختم کردو۔ اب کوئی اشکال نہ رہے گا۔

بَابُ مَاجَاءَ فِیْ کَرَاهِيَةِ النَّوْمِ قَبْلَ الْعِشَاءِ وَالسَّمَرِ بَعْدَهَا

باب ہے عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد قصہ گوئی کے مکروہ ہونے کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن منیع حَدَّثَنَا هشیم اخبرنا عوف قال احمد: وحدثنا عَبَّادُ بنُ عَبَّادٍ هو الْمهَلَّبِیُّ واسمٰعیل بنُ عُلَیَّةَ: جَمِیعاً عن عَوْنٍ عن سَیَّارِ بن سَلَامَةَ هو ابو المنهَالِ الرِّیَاحِیُّ عن ابی بَرْزَةَ قال: کان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم: یَکْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ العِشَاءِ والَحدِیثَ بَعْدَهَا۔

قال وفی الباب عن عائشة وعبد اللّٰه بن مسعود وانس قال ابو عیسی: حدیث ابی برزة حدیث حسنٌ صحیحٌ۔

وقد کَرِهَ اکثرُ اهل العلم النومَ قبلَ صلاة العشاء والحدیث بعدَها ورَخَّصَ فی ذٰلك بعضهم۔

وقال عبد اللّٰه ابن المبارك: اکثرُ الاحادیث علی الکراهیة ورَخَّصَ بعضهم فی النوم قبل صلاة العشاء فی رمضانَ وسَیَّارُ بنُ سلامةَ: هو ابو الْمِنهَالِ الرِّیَاحِیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے قبل سونے کو اور عشاء کے بعد باتین کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔

باب میں عائشہ، عبداللہ بن مسعود، اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں ابو برزہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم نے عشاء کی نماز سے قبل سونے کو ناپسند فرمایا ہے اور بعض اہل علم اس میں رخصت کے قائل ہیں اور عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث (اس مسئلے میں) کراہیت پر مبنی ہیں اور بعض حضرات (اہل علم) عشاء سے پہلے سونے کی رمضان کے مہینے میں رخصت دیتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

عشاء سے قبل اس شخص کیلئے سونا مکروہ ہے جسکی جماعت نکلنے کا اندیشہ ہو ورنہ عشاء سے قبل سونا مکروہ نہیں۔

باب ماجاء من الرخصةفی السمر بعد العشاء

باب ہے عشاء کے بعد بات چیت کی رخصت کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن منیع حَدَّثَنَا ابو معاویة عن الاعمش عن ابراھیم عن علقمة عن عمر بن الخطاب قال: کان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم یَسْمُرُ مَعَ اَبِی بَکرٍ فِی الْاَ مْرِ مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِینَ وَاَنَامَعَهُمَا۔

وفی الباب عن عبد اللّٰہ بن عمرو ، واوسِ بن حُذَیْفَةَ وعمران بن حصین۔

قال ابو عیسی: حدیث عمر حدیثٌ حسنٌ۔

وقد روی هٰذَا الحدیث الحسنُ بْنُ عُبَیْدِ اُللّٰهِ عن اِبرٰهیم عن علقمة عن رَجُلٍ مِنْ جُعْفِی یقال له قیس او ابن قیس عن عمر عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم :ھذا الحدیث فی قصَّةٍ طویلةٍ۔

وقد اختلف اهل العلم من اصحاب النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم والتابعین ومن بعدهم فی السَّمَرِ بعد صلاة العشاء الآخرة: فکره قومٌ منهم السمر بعد صلاة العشاء، ورخَّصَ بعضُهم اِذَاکان فی مَعْنَی العلم وَمَا لَابُدَّ مِنْهُ مِنَ الْحَوَائِجِ ، واکثر الحدیث علی الرُّخْصَةِ۔

وقدوُوِیَ عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسم قال: لاسَمَرَ اِلَّا لِمُصَلٍ اَوْ مُسَافِرٍ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات کے متعلق گفتگو فرمایا کرتے تھے اور میں ان دونوں کے ساتھ ہوتا تھا (یہاں عشاء کے بعد گفتگو فرمانا مراد ہے)۔

باب میں عبداللہ بن عمرو، اوس بن حذیفہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس حدیث کو حسن بن عبید اللہ نے ابراہیم سے انہوں نے علقمہ سے انہوں نے ایک رجل جعفی سے جس کو حسن یا بن حسن کہا گیا ہے اور انہوں نے عمر رضی اللہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس حدیث میں طویل قصہ ہے۔ اور صحابہ کرام، تابعین اور ان کے بعد لوگوں میں اہل علم

کا اس میں اختلاف ہے یعنی عشاء کے بعد گفتگو کرنے کے بارے میں۔ پس ان میں سے بعض حضرات نے تو اس کو ناپسند فرمایا ہے اور بعض حضرات نے عشاء کے بعد گفتگو کرنے کی اجازت دی ہے جبکہ وہ علمی گفتگو ہو اور جو باتیں ایسی ہوں جو ضروریات سے متعلق ہوں کہ ان کا کرنا ضروری ہو اور زیادہ تر احادیث رخصت پر مبنی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گفتگو کرنے کی اجازت صرف نمازی (جو نماز کے انتظار میں ہو) اور مسافر کیلئے ہے۔

﴿تشریح﴾

نمازی اور مسافر کے علاوہ دیگر افراد کو عشاء کے بعد گفتگو کی ممانعت: (لا سمر الا لمصلی الخ) لمصل کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی رات کو نماز وغیرہ میں مشغول ہے اور اسکو نیند آنے لگے تو وہ شخص باتوں کے ذریعے اپنی نیند کو بھگا سکتا ہے۔

(اولمسافر) یعنی جو مسافر رات میں باتیں کر کے اپنا سفر طے کرنا چاہتا ہو اس سے معلوم ہوا کہ رات کو باتیں کرنے کی ممانعت لازمی نہیں ہے بلکہ بلاضرورت بات چیت کرنا منع ہے ضرورت کے موقع پر جائز ہے۔

باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل

باب ہے اول وقت میں نماز پڑھنے کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا ابو عَمّارٍ الحسینُ بنُ حُرَیْثٍ حَدَّثَنَا الفضل بنُ موسی عن عبد اللّٰہ بن عمر العمری عن القاسم بن غنام عن عمتہ ام فروۃ، وکانت مِمَّنْ بایعتِ النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم قالت: سُئِلَ النبیُّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ قال: اَلصَّلَاۃُ لِاَوَّلِ وَقْتِهَا۔

☆ حَدَّثَنَا احمد بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا یعقوبُ بنُ الولید الْمَدَنِیُّ عن عبد اللّٰہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: الوقت الاول من الصَّلَاۃِ رِضْوَانُ اللّٰہِ، وَالْوَقْتُ الْاٰخِرُ عَفْوُ اللّٰہِ۔

☆حدثنا قُتَیبۃ قال حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن وھب عن سعید بن عبد اللّٰہ الْجُھَنِیِّ عن محمد بن عُمَرَ بن علیٍّ بن ابی طالب عن ابیہ عن علی بن ابی طالب ان النبیَّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم قال لہ: یاعلُی ثلاثٌ

لَاتُؤَ خِّرْهَا: الصَّلَاةُ اِذَا اٰنَتْ وَالْجنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ ، وَالْاَیِّمُ ـ اِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُواً۔

قال وفی الباب عن علی وابن عمر، وعائشة ، وابن مسعود،

قال ابو عیسی: حدیثُ اُمِّ فَرْوَةَ لَایُرْوَی اِلّا من حدیث عبد اللّٰه بن عمر العمری ولیس هو بالقوی عند اهل الحدیث ، واضطر بوا فی هٰذا الحدیث۔

☆حدثنا قُتَیْبَةُ حَدَّثَنَا مروانُ بنُ معاویةَ الفزاریُّ عن ابی یعفور عن الولید بن العیزار۔ عن ابی عمرو الشیبانی۔ اَنَّ رَجُلاً قال لِابنِ مسعودٍ۔ اَیُّ العَمَلِ اَفْضَلُ؟ قال: سَاَلْتُ عنه رسولَ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم؟ فقال: الصَّلَاةُ عَلَی مَوَاقِیتِهَا قُلْتُ: وماذا یارسول الله؟ قال: وبرُّ الوَالِدَیْنِ قلتُ: وماذایا رسولَ اللّٰه؟ قال: و الْجِهَادُ فی سَبِیلِ اللّٰهِ۔

قال ابو عیسی: وهٰذَا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

وقدرَوَی المسعودیُّ وشعبةُ و سلیمانُ هو اَبو اسحق الشَّیْبَانِیُّ وغیرُ واحدٍ عن الولیدبنِ العَیْزَارِ: هٰذَا الحدیث۔

☆حدثنا قُتَیْبَةُ حَدَّثَنَا اللیثُ عن خالد بن یزید عن سعید بن ابی هلالٍ عن اسحق بن عمر عن عائشة قالت:مَاصَلَّی رسولُ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم صَلَاةً لِوَقْتِهَا الآخِرِ مَرَّتَیْنِ۔ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰهُ۔قال ابو عیسی: هذا حدیثٌ غریبٌ ولیس اسناده بمتصل۔

قال الشافعیُّ: والوقت الاولُ من الصلاة افضلُ، ومما یَدُلُّ علی فضلِ اولِ الوقت علی آخره: اختیارُ النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم وابی بکر وعمر فلم یکونوا یختارون اِلّا ماهو افضل ، ولم یکونوا یَدَعُونَ الفضل، وکانوا یُصَلُّونَ فی اول الوقت۔

قال: حَدَّثَنَا بذٰلك ابو الولید المکی عن الشافعی۔

﴿ترجمه﴾

☆ قاسم بن غنام اپنی پھوپھی ام فروہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں اور وہ ان عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت (سلوک) کی تھی۔فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل سب

سے افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز کو اپنے اول وقت پر پڑھنا۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز کا اول وقت اللہ کی رضا مندی (کا وقت) ہے اور آخری وقت اللہ کی معافی (کا وقت) ہے (یعنی آخری وقت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے)۔

باب میں علی، ابن عمر، عائشہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

☆ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے علی! تین چیزیں ایسی ہیں جن کو موخر نہیں کرنا چاہئے۔ نماز جبکہ اس کا وقت آجائے اور جنازہ جبکہ وہ حاضر ہو جائے (یعنی مردے کے انتقال کے بعد تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ اور تدفین میں جلدی کرنی چاہئے) اور غیر شادی شدہ عورت (چاہے وہ کنواری ہو یا بیوہ یا مطلقہ وغیرہ) جب اس کیلئے مناسب جوڑا مل جائے تو اس کا فوراً نکاح کر دو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ام فروہ رضی اللہ عنہا کی حدیث عبداللہ بن عمر العمری کے علاوہ کسی سے مروی نہیں ہے اور وہ (عبداللہ بن عمر العمری) محدثین کے نزدیک کمزور راوی ہیں۔ اور اس حدیث میں اضطراب ہے۔

☆ ابوعمرو شیبانی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ میں نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کو اس کے اوقات پر پڑھنا (سب سے افضل) ہے۔ میں نے دریافت کیا اور کیا (چیز افضل ہے) یارسول اللہ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ میں نے پوچھا اور کیا یارسول اللہ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس حدیث کو مسعودی، شعبہ، شیبانی اور بے شمار حضرات نے ولید بن عیزار سے نقل کیا ہے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ بھی کبھی نمازوں کو انکے آخر وقت پر نہیں پڑھا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں ہے۔ (از مترجم: غریب ہونے کی وجہ اسحاق

بن عمر راوی اَحدُ المجاھیل ہے۔ دار قطنی کے یہاں یہ متروک راوی ہے اور سند کے متصل نہ ہونے کی وجہ اس اسحاق بن عمر کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں۔ معارف السنن جلد دوم: صفحہ ۸۹)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور نماز کا اول وقت پر پڑھنا افضل ہے۔ اور نماز کے اول وقت کا اس کے آخر وقت پر افضل ہونا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے عمل سے ثابت ہے اسلئے کہ وہ افضل چیز کو ہی اختیار کرنے والے تھے اور فضیلت کو چھوڑنے والے نہ تھے اور وہ اول وقت نماز پڑھتے تھے۔

﴿تشریح﴾

اشکال: حدیث باب سے احناف پر اشکال وارد ہوتا ہے کیونکہ احناف کے نزدیک فجر اور عصر کو مطلقا تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے اسی طرح عشاء کی نماز مطلقاً تاخیر سے پڑھی جائیگی۔ اور گرمیوں میں ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے جبکہ حدیثِ باب میں مطلقاً اول وقت کو رضوان اللہ کہا گیا ہے؟

جواب: حدیث میں اول وقت سے مراد وقتِ مستحب کا پہلا جزء ہے: اول وقت سے مراد وقتِ مستحب کا پہلا جزو ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں وقتِ آخر آرہا ہے جس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ وقتِ مکروہ کے مقابلے میں مستحب وقت میں نماز پڑھنا رضوان اللہ ہے۔ وقتِ آخر سے وقتِ مکروہ مراد ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اس کو عفو اللہ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت کے بالکل آخر میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اسی پر عفو اور معافی کا ترتب ہے[1]۔ فتدبر

اوقات واحوال کے اختلاف کی وجہ سے ایک سوال کے مختلف جوابات ہیں: (ای الاعمال افضل) اس سوال کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جوابات دیئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والوں کے مختلف احوال کو دیکھتے ہوئے اسی طرح امکنہ اور ازمنہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایسا جواب مرحمت فرماتے تھے جو کہ سائل کے مناسبِ حال ہوا کرتا تھا۔ یا ان سب اعمال کی فضیلت جزئی ہے کہ بعض جہتوں سے کوئی افضل الاعمال ہے اور دوسری جہتوں سے کوئی دوسرا عمل افضل الاعمال ہے۔

---

[1] یعنی حدیث میں وقتِ آخر سے مراد وقتِ مکروہ ہے کیونکہ عفو اللہ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ آخری وقت میں نماز پڑھنا ناپسندیدہ اور مکروہ فعل ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی معافی کا ترتب ہوگا۔ اور اگر یہ ناپسندیدہ نہیں تو معافی کس بات کی۔

(الجنازة اذا حضرت) اگر جنازہ وقتِ غیر مکروہ میں آئے تب تاخیر کرنا صحیح نہیں [۱]۔ حدیث میں حضورِ جنازہ کا مطلب یہ ہے کہ اس جنازہ کو اس لئے لایا گیا کہ اس پر نماز پڑھی جائے اگر اس سے مراد دفن کرنے کیلئے جنازہ لانا ہو تو جمہور کے نزدیک اوقات مکروہہ میں بھی دفن کیا جائیگا۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (واضطربوا فی هذا الحدیث) **اضطراب اس طرح ہے کہ فضل بن موسیٰ** نے عن عبدالله العمری عن قاسم عن عمته ام فروه نقل کیا ہے لیکن وکیع نے عن القاسم عن بعض امهاته عن ام فروه نقل کیا ہے۔ اور بعض راویوں نے عن جدته الدنیا عن ام فروه نقل کیا ہے اور یعقوب المدنی نے عن عبدالله بن عمر عن نافع عن ابن عمر رضی الله عنه نقل کیا ہے اور دوسرے راویوں نے دوسری طرح نقل کیا ہے جیسا کہ دارقطنی نے اس اضطراب کو مفصلاً نقل کیا ہے [۲]۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: (لوقتها الآخر مرتین) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیاری طور سے دو دفعہ آخری وقت میں نماز ادا نہیں فرمائی۔ لہٰذا اب یہ اشکال کہ جبرئیل علیہ السلام نے دوسرے دن آخری وقت میں نمازیں پڑھائی تھیں یا خندق کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نمازیں قضا ہوئی تھیں تو یہ تو دو دفعہ آخری وقت میں نمازیں پڑھی گئی ہیں؟ (تو اس کا ایک جواب گزرا کہ یہ واقعات تو اضطراری تھے اور نفی اختیاری فعل کی ہے۔ از مترجم)

جواب نمبر۲: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیاری طور سے دو دفعہ نماز میں تاخیر نہیں فرمائی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک دفعہ سوال کرنے والے کے سوال پر مدینہ منورہ میں فعلی طور پر نماز کا طریقہ سکھلانے کیلئے نمازوں کو آخری وقت میں پڑھا تھا یہ روایت ترمذی وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ رہا جبرئیل علیہ السلام کے واقعہ میں تاخیر سے نمازیں پڑھنا تو یہ

---

[۱] لیکن یہ بات غور طلب ہے کیونکہ علامہ شامی نے تفصیلاً حنفیہ کا مذہب اس طرح نقل کیا ہے کہ اگر جنازہ اوقاتِ مکروہہ میں آجائے تو نمازِ جنازہ کراہت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے شاید حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے جیسا کہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ صاحبِ درمختار کی مراد مکروہ سے ایک قول میں مکروہ تحریمی کی نفی ہے البتہ اوقاتِ مکروہہ میں نمازِ جنازہ مکروہِ تنزیہی ہے۔

[۲] قلت: ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی میں اس اضطراب کو مجملاً ذکر کیا ہے لیکن بہت ہی خوب لکھا ہے اور پھر لکھا ہے کہ یہ اضطراب دلالت کررہا ہے کہ حدیث میں دو ایسی علتیں ہیں جو سند کو ضعیف قرار دے رہی ہیں۔

آپ کے اختیار[۱] سے باہر تھا۔

جواب نمبر۳: یہاں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں یہ مراد نہیں صرف ایک دفعہ تاخیر فرمائی تھی دو دفعہ نہیں کی بلکہ اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ تاخیر والا فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی بار صادر نہیں ہوا تو یہاں بطور مبالغہ کے فرمایا کہ دو دفعہ بھی تاخیر نہیں ہوئی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھار جو تاخیر ثابت ہے اس کی نفی نہیں ہے۔(از مترجم: چوتھی توجیہ: علامہ انور شاہؒ نے یہ فرمائی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نفی انکے اپنے علم کے اعتبار سے ہے کیونکہ شبِ معراج والے واقعہ میں مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں نہیں تھیں۔ الخ

پانچویں توجیہ: ہمارے ہندوستانی نسخوں میں اسی طرح عبارت ہے "ما صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة لوقتها الآخر مرتين حتى قبضه الله" لیکن حافظ زیلعی نے نصب الرایۃ میں، دارقطنی اور امام ذہبی نے ماصلی کے بعد الا مرتین کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ اور ترمذی کے بعض مصری نسخوں میں بھی اسی طرح ہے لہٰذا اس صورت میں کسی توجیہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ معارف السنن: جلد دوم صفحہ ۸۹)

باب ماجاء فی السهو عن وقت صلاة العصر

باب ہے عصر کی نماز کا وقت بھول جانے کے بارے میں

☆ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ حَدَّثَنَا الليث بن سعد عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلّى الله عليه وسلم قال: الَّذِی تَفُوتُهُ صَلَاةُ العَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ اَهْلَهُ وَمَالَهُ۔

---

[۱] حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ یہاں حدیث میں اشکال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الوقت الآخر میں ایک دفعہ سے زیادہ نماز پڑھی ہے تو اس اشکال کی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے تین توجیہات فرمائی ہیں: ان تین توجیہات میں فرق بہت باریک ہے خصوصاً پہلی اور دوسری توجیہ کے درمیان بہت غور وخوض کے بعد فرق ظاہر ہوتا ہے ایک فرق تو یہ ہے کہ پہلی توجیہ میں یہ پیشِ نظر اور مقصود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر نماز میں مطلقاً تاخیر فرمائی ہی نہیں۔ یہاں ایک دفعہ تاخیر کرنے کا اثبات نہیں تو پہلی توجیہ لابشرط الشئی کے درجہ میں ہے اور دوسری توجیہ کا مقصد ایک دفعہ تاخیر کو ثابت کرنا ہے تو یہ بشرط اثبات ہوا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحب سمجھ کر کبھی نماز کو وقتِ آخر میں نہیں پڑھا اور دوسری توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر قصداً نماز کو وقت کے آخر میں نہیں پڑھا۔ وغیرہ ذالک فتامل

وفی الباب عن بُرَيْدَةَ، وَنَوْفَلِ بِنِ مُعَاوِيَةَ۔ قال ابوعیسی: حدیث ابنِ عمر حدیثٌ حسنٌ صَحیحٌ۔

وقد رواہ الزهری ایضاً عن سالمٍ عن ابیه ابن عمر عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کی نماز عصر فوت ہوگئی وہ ایسا ہے گویا کہ اس کا مال وعیال لٹ گیا ہو۔

باب میں بریدہ اور نوفل بن معاویہ سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس کو زہری نے بھی عن سالم عن ابیه عن النبی صلی الله علیه وسلم کی سند سے نقل کیا ہے۔

باب ماجاء فی تعجیل الصلاۃ اذا اَخَّرَهَا الْاِمَامُ

باب ہے جب امام نماز میں غیر معمولی تاخیر کردے تو نماز تنہا (جلدی) پڑھ لی جائے

☆حدثنا محمد بن موسی البصری حَدَّثَنَا جعفر بن سلیمان الضبعی عن ابی عمران الجونی عن عبد اللّٰہ بن الصامت۔ عن ابی ذر قال: قال النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: یَا اَبَاذَرٍ اُمَرَاءٌ یَکُونُونَ بَعْدِی یُمِیتُونَ الصَّلَاۃَ فَصَلِّ الصَّلَاۃَ لِوَ قْتِهَا فاِنْ صُلِّیَتْ۔لِوَقْتِهَا کَانَتْ لَکَ نَافِلَةً۔ وَاِلَّا کُنْتَ قَدْ اَحْرَزْتَ صَلَاتَکَ۔

وفی الباب عن عبد اللّٰہ بن مسعود وعبادۃ بن الصامت۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی ذر حدیث حسن۔

وهو قول غیر واحد من اهل العلم: یَسْتَحِبُّونَ اَنْ یُصَلِّیَ الرجلُ الصلاۃَ لِمیقَا تِهَااِذَا اَخَّرَهَا الامامُ ،ثم یُصَلِّیْ مَعَ الْاِمَامِ، وَالصَّلَاۃُ الْاُولٰی هی المکتوبة عنداکثر اهل العلم۔

وابو عمران الجونی اسمه عبد الملک بن حبیب۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوذر! میرے بعد

کچھ حکمران ہونگے جو نمازوں کو ماردیں گے (قضا کر کے یا وقتِ مکروہ میں ادا کرنے کی وجہ سے) سو تم نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا پھر اگر امام کے ساتھ ہی نماز وقت پر ادا کی گئی (تمہارے انفرادی پڑھنے سے پہلے) تو تم بھی اس کے ساتھ پڑھ لینا تو وہ تمہارے لئے زیادتی ثواب کا باعث ہوگی اور اگر ایسا نہ ہوا (کہ امام نماز وقت پر نہ پڑھائے بلکہ قضا پڑھائے یا وقتِ مکروہ میں پڑھائے) تو تم نے تو اپنی نماز (کے ثواب) کو جمع کر ہی لیا۔ (یعنی وقت پر پڑھ لینے کی وجہ سے تمہارا کچھ نقصان نہ ہوا)۔

باب میں عبداللہ بن مسعود اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور یہ بے شمار اہل علم کا قول ہے کہ وہ مستحب سمجھتے ہیں اس بات کو کہ جب امام نمازوں کو تاخیر سے پڑھے تو آدمی کو چاہیئے کہ تنہا اپنی نمازوں کو ان کے اوقات میں پہلے پڑھ لیا کرے پھر امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جایا کرے اور اس کی پہلی نماز فرض ہو جائے گی اکثر اہل علم کے نزدیک اور ابو عمران الجونی کا نام عبدالملک بن حبیب ہے۔

﴿تشریح﴾

(صل الصلاۃ لوقتها فان صلیت لوقتها) صلیت مجہول کا صیغہ ہے۔

(کانت) یہ دوسری نماز (لك نافلة) تمہارے لئے نماز نفل ہوگی (یعنی تم اپنے وقت پر نماز پڑھو پھر اگر امام کے ساتھ بھی یہ نمازِ پڑھ لی گئی وقت مستحب میں) تو امام کے ساتھ پڑھی جانے والی یہ دوسری نماز نفل ہو جائیگی۔ اس طرح انتشارِ ضمائر سے حفاظت ہو جائیگی۔

(والا کنت قد احرزت صلاتك) یعنی تم ہمیشہ اول وقت میں نماز پڑھنا کیونکہ اگر امام مستحب وقت میں نماز نہ پڑھے تو یہاں چار صورتیں ہیں:[1]

۱۔ امام وقتِ مکروہ میں نماز پڑھے اور تم پہلے مستحب وقت میں پڑھ چکے ہو اور اب بھی امام کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

۲۔ امام وقتِ مکروہ میں پڑھے اور تم اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔

۳۔ امام نماز قضا پڑھے اور تم اس کے ساتھ شریک نہ ہو کیونکہ ادا پڑھ چکے ہو۔

---

[1] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان والا کنت احرزت چار صورتوں کو شامل ہے جیسا کہ گنگوہی رحمہ اللہ نے تفصیل سے نقل کیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں صورتوں پر یہ جزاء مرتب کی ہے اپنے اس فرمان سے کہ تم اپنی پہلے پڑھی ہوئی نماز کا ثواب محفوظ کر لو گے۔

۴۔امام نماز قضا پڑھائے اور تم ادا پڑھنے کے بعد اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ گے بطور نافلہ کے۔
چاروں صورتوں میں تمہیں اپنی نماز مستحب وقت میں پڑھنے کا ثواب مل گیا چاہے تم امام کے ساتھ شریک ہو یا نہ ہو۔تو یہاں والا احرزت کا ترتب ان چاروں احتمالات پر ہو رہا ہے۔

باب ماجاء فی النوم عن الصلاۃ

باب ہے نماز سے سوتے رہ جانے کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا قُتَیْبَۃُ حَدَّثَنَا حمادُ بن زیدٍ عن ثابتٍ البُنَانِیِّ عن عبد اللّٰہ بن رَبَاح الانصاری عن ابی قَتَادَۃَ قال: ذَکَرُوا للنبیِّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نَوْمَھُمْ عَنِ الصَّلَاۃِ؟ فقال: اِنَّہٗ لَیْسَ فِی النَّوْمِ تَفْرِیطٌ، اِنمَا التَّفْرِیطُ فِی الیَقَظَۃِ، فَاِذَا نَسِیَ اَحَدُکُمْ صَلَاۃً اَوْ نَامَ عَنْھَا فَلْیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا۔

وفی الباب عن ابن مسعود، وابی مَرْیَمَ، وعِمْرَانَ بن حُصَیْنٍ، وجُبَیْرِ بن مُطْعِم، وابی جُحَیْفَۃَ وعَمْرِ وبن اَمَیَّۃَ الضَّمْرِیِّ، وذی مِخْبَرٍ ویقال:ذی مِخْمَرٍ وھو ابنُ اَخی النَّجَاشِیِّ۔

قال ابو عیسی: وحدیثُ ابی قتادۃ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

وقد اختلف اھل العلم فی الرجل یَنَامُ عن الصلاۃ اَوْ یَنْسَاھَا فَیَسْتَیْقِظُ اَوْ یَذْکُرُوَھُوَفِیْ غَیْرِ وَقْتِ صَلَاۃٍ۔عند طُلُوْعِ الشَّمْسِ اَوْ عِنْدَ غُرُوْبِھَا۔

فقال بعضھم: یُصلیھا اذا استیقظ او ذکر، وان کان عند طلوع الشمس اوعند غروبھا، وھو قولُ احمد، واسحق، والشافعی، ومالك وقال بعضھم:لایُصَلِّی حتی تطلُعَ الشمس او تغرب۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نماز سے سوتے رہ جانے کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک سوئے رہ جانے میں کوتاہی نہیں۔کوتاہی تو بیداری کی حالت میں نماز قضا کرنے میں ہے پس جب تم میں سے کوئی نماز کو بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے۔

باب میں ابن مسعود، ابومریم، عمران بن حصین، جبیر بن مطعم، ابوجحیفہ، عمرو بن امیہ اور ذومخبر سے روایات ہیں اور وہ (ذو

مخبر) نجاشی کے بھتیجے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قتادہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اس بات میں اختلاف ہے جو شخص نماز سے سوتا رہ گیا یا اسے بھول گیا پھر وہ بیدار ہوا یا اسے یاد آیا اور وہ وقت نماز کا نہیں یعنی (وقتِ مکروہ) طلوعِ آفتاب یا غروب آفتاب کا وقت ہو تو بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ جب یہ شخص نیند سے بیدار ہو یا اسے نماز یاد آجائے تو وہ اس نماز کو پڑھ لے اگرچہ طلوع آفتاب یا غروبِ آفتاب ہی کا وقت ہو اور یہ امام شافعی، امام احمد، امام اسحٰق اور امام مالک کا قول ہے اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ جب سورج طلوع یا غروب ہو جائے اس کے بعد پڑھے۔

﴿تشریح﴾

اس باب اور اگلے باب سے دو الگ الگ مسئلوں کا بیان ہے:

ترجمۃ الباب کی غرض: اس باب کو اس لئے لایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کیوجہ سے نماز سے غافل ہو جائے تو اب کیا کرے؟ اس کے ضمن میں نماز کو بھولنے کا حکم بھی تبعاً آگیا ہے۔ اگلے باب الرجل ینسی الصلاۃ میں اس کے برعکس ہے کہ وہاں مقصود نماز کو بھولنے کی صورت میں حکم بتلانا ہے اور تبعاً نوم عن الصلاۃ کا مسئلہ بھی وہاں آگیا۔ اسلئے ابواب میں تکرار نہ رہیگا۔

گذشتہ باب اور موجودہ باب کے درمیان فرق: دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ باب میں جو سہو کا ذکر تھا وہ الگ ہے اور موجودہ باب میں جس نسیان کا ذکر ہے وہ الگ ہے کیونکہ وہاں پر سہو سے مراد دنیاوی کاموں کیوجہ سے نماز سے غفلت اور لاپرواہی برتنا ہے لہٰذا سہو کی صورت میں خود نمازی کی جانب سے کوتاہی پائی جارہی ہے جس پر گذشتہ حدیث میں عقاب اور خسارہ کا ذکر ہے۔ نسیان اور نیند کی صورت میں جو خسارہ ہوگا وہ بھی بالکل ظاہر ہے لیکن اس میں اتنا خسارہ نہیں جو خسارہ جان بوجھ کر غفلت برتنے کی صورت میں ہوگا۔ یہ بھی توجیہ ہوسکتی ہے کہ سہو اور نسیان سے دونوں ابواب میں ایک ہی معنی مراد ہے[1]۔ اب دونوں ابواب میں فرق اس طرح ہوگا کہ پہلے باب کا مقصد یہ ہے کہ نماز چھوڑنے کی صورت میں کس قدر خسارہ ہوتا ہے اسکو پہلے باب میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرے باب کا مقصد یہ ہے کہ اس خسارہ کی حتی الامکان تلافی کی صورت کو بیان کیا جائے۔

---

[1] اس توجیہ کے مطابق گذشتہ باب میں صلوٰۃ العصر کی قید احترازی نہ ہوگی ان دونوں ابواب میں اور بھی بہت سارے وجوہ سے فرق ہیں جو غور کرنے سے ظاہر ہوجاتے ہیں ہم انکو اختصاراً چھوڑ رہے ہیں۔

(وقال بعضهم لایصلی حتی تطلع الشمس او تغرب) بعضھم سے مراد احناف کے علاوہ دوسرے ائمہ ہیں۔
کیونکہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اسی دن کی عصر کی نماز بالکل غروب کے وقت میں شروع کی تو عصر یومہ کو ختم نہ کرے گا بلکہ اس نماز کو مکمل کرے گا اگر چہ سورج غروب ہونا شروع ہو جائے۔ لہٰذا قال بعضهم سے حنفیہ مراد نہیں اگر اس سے حنفیہ مراد ہوں تو یہ نسبت امام ترمذی نے ان کی طرف غلطی سے کر دی کیونکہ ان کو معلوم نہ تھا کہ حنفیہ کے نزدیک عین طلوع کے وقت فجر کی نماز پڑھنا منع ہے لیکن غروب کے وقت عصر یومہ پڑھنا منع نہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ فِیُ الرَّجُلِ یَنۡسٰی الصَّلَاۃَ

باب ہے اس شخص کے بارے میں جو نماز کو بھول جائے

☆ حَدَّثَنَا قُتَیۡبَۃُ وبِشۡرُ بنُ مُعَاذٍ قالا: حَدَّثَنَا ابو عَوَانَۃَ عن قتادۃَ عن انس بن مالکٍ قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: مَنۡ نَسِیَ صَلَاۃً فَلۡیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا۔

وفی الباب عن سمرۃ وابی قتادۃ۔ قال ابو عیسی: حدیث انس حدیث حسن صحیح۔

ویُرۡوٰی عن علیٍّ بن ابی طالب: انہ قال فِیُ الرَّجُلِ یَنۡسٰی الصَّلَاۃَ قال: یُصَلِّھَا مَتٰی مَا ذَکَرَھَا فِی وَقۡتٍ اَوۡفِیُ غَیۡرِ وَقۡتٍ، وھو قولُ الشافعی،و احمد بنِ حنبلٍ واسحٰقَ۔

ویُرۡوٰی عَنۡ اَبِی بَکۡرَۃَ: اَنَّہٗ نَامَ عَنۡ صَلَاۃِ الۡعَصۡرِ، فَاسۡتَیۡقَظَ عِنۡدَ غُرُوۡبِ الشَّمۡسِ، فَلَمۡ یُصَلِّ حتی غَرَبَتِ الشَّمۡسُ۔

وَقَدۡ ذَھَبَ قَوۡمٌ مِنۡ اَھۡلِ الۡکُوۡفَۃِ اِلٰی ھٰذَا۔ واما اصحابنا فذھبوا الی قول علیٍّ بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص نماز کو بھول جائے تو جب اسے یاد آئے تو پڑھ لے۔

باب میں سمرہ اور قتادہ رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں حدیثِ انس حسن صحیح ہے اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا اس شخص کے بارے میں جو نماز بھول جائے کہ جب بھی اسے یاد آجائے پڑھ لے چاہے وقت میں ہو یا غیر وقت میں اور

یہی امام احمد اور اسحٰق کا قول ہے۔

اور ابوبکرہ سے مروی ہے کہ وہ نماز عصر سے سوتے رہ گئے پھر وہ غروب شمس کے قریب بیدار ہوئے تو انہوں نے نماز نہ پڑھی جب تک تک سورج غروب نہ ہو گیا اور اہل کوفہ کی ایک جماعت نے اس بات کو اختیار کیا ہے اور جو ہمارے اصحاب (شوافع حضرات) ہیں وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف گئے ہیں۔

﴿تشریح﴾

شافعیہ کا استدلال اور اسکا جواب: (واما اصحابنا فذهبوا الی قول علی بن ابی طالب رضی الله عنه) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گزشتہ حدیث "فلیصلّها اذا ذکرها" کے عموم کی وجہ[1] سے یہ مذہب اختیار کیا تھا کہ انسان فجر اور عصر کی نماز جب بھی اس کو یاد آئے پڑھے گا چاہے نماز کا وقت میں اس کو یاد آئے یا وقتِ مکروہ میں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شافعیہ کا مشہور اصول ہے کہ کوئی بھی عام ایسا نہیں ہوتا جس میں کسی بھی فرد کو خاص نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا فلیصلها اذا ذکرها کے عموم سے بھی بعض صورتیں مستثنیٰ ہونگی۔ تو یہاں پر انہوں نے اپنے اس مشہور اصول کو کیوں چھوڑ دیا؟

امر ونہی کی احادیث میں نہی والی حدیث کو ترجیح حاصل ہے: نبی اکرم ﷺ کے فرمان فلیصلها اذا ذکرها کا مقصد یہ ہے کہ نماز کو یاد آنے کے بعد ادا کرنا چاہیئے تو یہ حدیث نماز کو یاد آنے پر ادا کرنے کے متعلق نص ہے اور وقت کو بیان کرنے

---

[1] جیسا کہ "فلیصلها اذا ذکرها" کا عموم دلالت کر رہا ہے کہ اذا عموم ازمنہ کیلئے ہے لفظ اذا کے متعلق مشہور اختلافی مسئلہ ہے جو فقہ اور اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "انت طالق اذا شئت" او "اذا ما شئت" یا "متی شئت" یا "متی ما شئت" کہے اور عورت اس اختیار کو رد کر دے تو اس کا اختیار ختم نہ ہوگا اور نہ ہی مجلس تک محدود ہوگا بلکہ مجلس کے بعد بھی عورت کو اختیار برقرار رہے گا۔ متی اور متی ما کا کلمہ تو وقت کیلئے وضع ہے اور اس سے عموم اوقات مراد ہوتا ہے تو انت طالق متی شئت اور متی ماشئت کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت تم چاہو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہو۔ رہے کلمہ اذا اور اذا ما تو صاحبین کے نزدیک یہ بھی عموم وقت کیلئے وضع ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جیسے یہ اذا، اذا ما وقت کیلئے استعمال ہوتے ہیں ایسے ہی شرط کیلئے بھی لیکن جب ایک دفعہ طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں چلا گیا تو شک کیوجہ سے اختیار اس کے ہاتھ سے نہ نکلے گا۔ انتہی

نور الانوار میں ہے: کوفہ کے علماء نحو کے نزدیک لفظ اذا وقت اور شرط دونوں کیلئے یکساں استعمال ہوتا ہے لہٰذا جب اذا شرط کیلئے ہوگا تو اس کی جزاء بھی آئیگی اور جب وقت کیلئے ہوگا تو اسکی جزاء نہیں آئیگی۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بصرہ کے علماء نحو کے نزدیک لفظ اذا وقت کیلئے حقیقۃً استعمال ہوتا ہے اور شرط کیلئے بطور مجاز کبھی کبھار استعمال ہو جائیگا اور یہ صاحبین کا مذہب ہے۔ انتہی

کے متعلق ظاہر ہے جبکہ نھی عن الاوقات المکروھہ والی حدیث وقت کو بیان کرنے میں نص ہے کہ ان مکروہ اوقات میں نماز پڑھنے سے احتراز کیا جائے تو نہی عن الاوقات الثلثہ والی حدیث جو کہ نص ہے حدیث باب (جو کہ ظاہر ہے) پر مقدم ہوگی۔ حدیثِ باب نہی والی حدیث کا معارضہ نہیں کر سکتی اس وجہ سے حنفیہ نے نہی والی حدیث کو فلیصلھا امر والی حدیث پر مقدم کیا ہے۔ یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث باب کے عموم سے دوسری حدیث نہی کے پیشِ نظر وقت مکروہ کو خاص کر لیا گیا ہے کہ وقت مکروہ میں یہ نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ اسکی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الرَّجُلِ تَفُوْتُهُ الصَّلَوَاتُ بِاَیَّتِهِنَّ یَبْدَأُ

باب اس شخص کے بارے میں جس کی کئی نمازیں قضاء ہوگئیں ہوں تو وہ اب کس نماز سے ابتداء کرے گا؟

☆حدثنا هَنَّادٌ قال اخبرنا هشيمٌ عن ابی الزبير عن نافع بن جبير بن مطعم عن ابی عبيدة بن عبد اللّٰه بن مسعود قال: قال عبد اللّٰه بن مسعود :اِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ شَغَلُوا رسولَ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم عن اَرْبَعِ صَلَوَاتٍ يومَ الْخَنْدَقِ حَتّٰى ذَهَبَ من اللَّيْلِ مَا شَاءَ اللّٰهُ، فَاَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ ، ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ، ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ، ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعِشَاءَ۔

قال: وفی الباب عن ابی سعيدٍ ، وجابرٍ۔

قال ابو عيسى: حديث عبد اللّٰه ليس بإسناده بأس اِلَّا اَنَّ ابا عبيدةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ عبد الله۔

وهو الذی اختارهُ بعض اهل العلم فِی الْفَوَائِتِ: اَنْ يُقِيْمَ الرَّجُلُ لِكُلِّ صلاة اذاقضاها۔ وَاِنْ لَّمْ يُقِمْ اَجْزَاَهُ۔ وهو قول الشافعی۔

☆ حَدَّثَنَا محمدُ بْنُ بَشَّارٍ بُنْدَارُ حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ هشامٍ حدثنی ابی عن يحيى بن ابی كثيرٍ حَدَّثَنَا ابو سلمة بن عبد الرحمن عن جابر بن عبد الله: اَنَّ عمر بن الخطاب قال يومَ الخندَق،وَجَعَلَ يَسُبُّ كُفَّارَ قُرَيْشٍ، قال:يَارسولَ اللّٰه! ماكِدْتُ اُصَلِّى الْعَصْرَ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ، فقال رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم : وَاللّٰهِ اِنْ صَلَّيْتُهَا۔ قال: فَنَزَلْنَا بُطْحَانَ ،فَتَوَضأَ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم وَتَوَضَّأنَا، فَصَلَّى رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم الْعَصْرَ بعدَ ماغَرَبَتِ الشمسُ، ثم صَلَّى بَعْدَهَا الْمَغْرِبَ۔

قال ابو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خندق کے دن مشرکین نے چار نمازوں سے مشغول کر دیا۔ یہاں تک کہ رات کا اتنا حصہ گزر گیا جتنا اللہ نے چاہا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ چنانچہ انہوں نے اذان کہی پھر اقامت کہی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی پھر انہوں نے اقامت کہی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ مغرب پڑھائی۔ پھر انہوں (بلال) نے اقامت کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھائی۔

باب میں حضرت سعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند میں کوئی خرابی نہیں مگر اتنی بات ہے کہ ابوعبیدہ کا (اپنے والد) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔

اور بعض علماء فوت شدہ نمازوں میں اسی بات کو پسند کرتے ہیں کہ آدمی ہر نماز کیلئے اقامت کہے جبکہ انہیں قضا کرے اور اگر اقامت نہ کہے گا تو بھی اس کو کافی ہو جائے گا اور یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔

☆ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خندق کے دن آئے اور وہ کفارِ قریش کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قریب نہ تھا کہ میں عصر کی نماز پڑھ سکوں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے (یعنی سورج غروب ہونے سے پہلے بڑی مشکل سے عصر کی نماز پڑھ سکا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بخدا! میں نے تو پڑھی ہی نہیں۔

راوی کہتے ہیں پھر ہم بطحان نامی وادی میں اترے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو ہم نے بھی وضو کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی سورج غروب ہونے کے بعد۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

روایاتِ مختلفہ میں تطبیق: (شغلوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اربع صلوات) یہاں پر چار نمازیں تغلیباً کہا گیا ہے کیونکہ مشرکین کی وجہ سے اس واقعہ میں تین نمازیں قضا ہوئی تھیں اور چوتھی نمازِ عشاء وقت معہود سے موخر ہوگئی

تھی گویا کہ چار نمازیں مشرکین نے پڑھنے نہیں دی تھیں۔ حدیث باب سے یہ قاعدہ[1] معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ ترتیب شخص کیلئے فوت شدہ نمازوں کے درمیان (جب صرف قضاً عمری پڑھ رہا ہے تو ان نمازوں کے درمیان آپس میں بھی ترتیب ضروری ہے اسی طرح) اور فوائت ووقتیہ کے درمیان ترتیب واجب ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (الا ان ابا عبیدۃ لم یسمع من ابیہ) امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث کے منقطع ہونے کے باوجود اس کو لیس باسنادہ باس فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ حدیث منقطع میں جب تلقی بالقبول ہو تو وہ حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

(ما کدت اصلی العصر حتی تغرب الشمس) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں غروب شمس سے پہلے عصر پڑھ سکوں اگر چہ کچھ امید لگی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ کا د، کا استعمال وہاں پر ہوتا ہے جہاں فعل کے وقوع کا انتظا ہو تو اس جملہ کا معنی تو یہ ہوا کہ مجھے عصر کی نماز قبل الغروب پڑھنے کا یقین نہ تھا اگر چہ اس کی امید لگی تھی یعنی (نہ لگتا تھا کہ نماز پڑھونگا میں قبل از غروب)۔

(واللہِ اِنْ صَلَّیْتُھَا) کلمہ ان نافیہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تسلی دی ہے کہ تم اس غم کو

---

[1] **فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی کی ترتیب میں ائمہ کی اختلاف ہے:** یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر مکلف شخص کی کئی نمازیں فوت ہو جائیں تو کیا انہیں ترتیب وار قضا کرے گا جیسے فوت ہوئی تھیں یا بلا ترتیب کے؟ فوت شدہ نمازوں میں ترتیب لازم ہے یا نہیں؟ امام احمد واسحٰق کے نزدیک اگر یاد ہوں تو ترتیب واجب ہے اور اگر بھول جائے تو ترتیب ساقط ہو جائے گی۔ اِلّا یہ کہ اگر نمازیں زیادہ ہو جائیں تو ترتیب مطلقاً ساقط ہو جائے گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ، ابوثور کے نزدیک فوت شدہ نمازوں میں ترتیب لازم نہیں۔

پس اگر اسے وقتی نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ اس پر تو گذشتہ نماز کی قضا رہ گئی ہے تو اگر یہ شخص وقتی ادا نماز منفردا پڑھ رہا ہے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور یہ پہلے قضا نماز پڑھے گا پھر وقتی اداء نماز کا اعادہ کرے گا اور اگر یہ شخص امام کے پیچھے ہو تو امام کے ساتھ نماز پوری کرے پھر جو قضا نماز یاد آئی تھی اسے پہلے پڑھے پھر امام کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز کو لوٹائے یہی ہمارا (مالکیہ) مذہب ہے۔ اور اسی کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، احمد واسحٰق نے اختیار کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف قضا نماز جو یاد آئی ہے اس کا اعادہ کرے گا۔ انتہیٰ

قلت: امام احمد کے نزدیک ترتیب واجب ہے جیسا کہ ان سے صراحۃً یہ بات منقول ہے۔ کما قالہ ابن قدامہ۔ اور ان کے نزدیک چاہے قضا نمازیں کس قدر کثیر تعداد میں ہوں بہر حال ترتیب ساقط نہیں ہوتی۔ جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک اگر قضا نمازیں پانچ سے زیادہ ہو جائیں تو ترتیب ساقط ہو جائے گی۔ کما فی الاوجز بالتوضیح والدلائل

ہلکا کرو کیونکہ میں بھی جنگ سے فارغ نہیں ہوا کہ مجھے نماز ادا کرنے کا وقت ملتا (میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ از مترجم) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر نہیں پڑھی کیونکہ ہر ایک کے سامنے ایسے حالات تھے کہ دوسرے کی خبر کسی کو نہ تھی۔

(**اشکال**: اس حدیث میں ایک نماز کے قضا ہونے کا ذکر ہے جبکہ گذشتہ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں غزوہ خندق میں فوت ہوئیں؟ اضافہ از مترجم)

جواب: غزوہ خندق کئی روز تک[1] جاری رہا لہٰذا ایک دن چار نمازیں قضا ہوئی تھیں اور کسی دوسرے دن صرف عصر کی نماز قضا ہوئی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ نمازِ فجر کو مؤخر فرمانا اس سے مذہب احناف ثابت ہو رہا ہے: جاننا چاہیئے کہ یہ حدیث باب نیز لیلۃ التعریس والی حدیث سے ہمارے مذہبِ حنفیہ کی تائید ہوتی ہے کہ طلوعِ آفتاب کے وقت نماز فجر پڑھنا صحیح نہیں لہٰذا فلیصلها اذا ذکرها والی حدیث سے مراد یہ ہے کہ وقتِ غیر مکروہ میں جب یاد آئے تو اس وقت میں نماز پڑھے۔ اگر وقتِ مکروہ میں یاد آنے پر نماز پڑھنا مراد ہوتو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات میں نماز فجر کو موخر نہ فرماتے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اذا ذکرها میں اذا کا لفظ اذا مفاجاتیہ نہیں جو فی الفور[2] فعل کے وجود کا تقاضا کرے (بلکہ مراد یہ ہے کہ وقتِ مکروہ کے ختم ہو جانے کے بعد نماز پڑھے۔ از مترجم)

---

[1] حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے مسئلۃ الباب کی دو مختلف روایتوں میں یہ مذکورہ بالا تطبیق دی ہے علماء کے اس اختلافِ روایت کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعضوں نے جمع و تطبیق کا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں سب سے عمدہ تطبیق حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی ہے۔
ابن العربی رحمہ اللہ کا میلان ترجیح کی طرف ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ گذشتہ باب کی حدیث (چار نماز قضا ہونے والی) منقطع حدیث ہے اگرچہ اس کے راوی اور سند لابأس بہ کے درجے میں ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنے صحابہ کے خندق کے غزوہ میں ایک نماز (عصر کی نماز) نہ پڑھ سکے تھے۔ انتہی

[2] کیونکہ تمام روایات میں (غزوہ خندق والے واقعہ میں) تصریح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے ہی نماز یاد آئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً نہیں پڑھی بلکہ نماز فجر کو اتنا موخر فرمایا کہ سورج ایک نیزے کے بقدر بلند ہو گیا تھا پھر نماز ادا فرمائی جیسا کہ بہت سی روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِیْ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰی اَنَّهَا الْعَصْرُ وَقَدْ قِیْلَ اِنَّهَا الظُّهْرُ

باب ہے اس بیان میں کہ درمیانی نماز عصر کی نماز ہے اور ایک قول میں یہ ظہر کی نماز ہے

☆حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا عَبْدَةُ عن سعیدٍ عن قتادة عن الحسن عن سمرة بن جندب عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم انه قال:فی صَلَاةِ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الْعَصْرِ۔

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابوداود الطیالسیء وابو النَّضْرِ عن محمد بن طلحةَ بن مُصَرِّفٍ عن زُبَیْدٍ عن مُرَّةَ الهَمْدَانِیِّ، عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ قال: قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم: صَلَاةُ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الْعَصْرِ۔

قال ابو عیسی: هٰذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

قال : وفی الباب عن علی ، وعبد اللّٰه بن مسعود وزید بن ثابت وعائشة وحفصة وابی هریرة وابی هاشم بن عتبة قال ابو عیسی: قال محمد: قال علی بن عبد الله: حدیث الحسن عن سمرة بن جندب حدیث حسنٌ وقد سمع منه وقال ابو عیسی: حدیثُ سمرة فی صلاة الوسطی حدیث حسن وهو قول اکثرالعلماء من اصحاب النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم وغیرهم۔ وقال زیدُ بنُ ثابتٍ وعائشة: صَلَاةُ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الظُّهْرِ۔وقال ابن عباس وابن عمر:صَلَاةُ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الصُّبْحِ۔

☆حدثنا ابو موسی محمد بن المثنی حَدَّثَنَا قریش بن انس عَنْ حَبِیْبِ بْنِ الشَّهِیْدِ قَالَ: قَالَ لِیْ مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ: سَلِ الْحَسَنَ:مِمَّنْ سَمِعَ حدیثَ الْعَقِیْقَةِ؟فَسَأَلْتُهُ ، فَقَالَ سَمِعْتُهُ مِنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ۔

قال ابو عیسی: واخبرنی محمد بن اسمعیل حَدَّثَنَا علیُّ بنُ عبد اللّٰه ابن المدینی عن قریش بن انس بهٰذا الحدیث۔

قال محمد: قال علیٌّ: وَسِمَاعُ الْحَسَنِ مِنْ سَمُرَةَ صَحِیْحٌ، وَاحْتَجَّ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ درمیانی نماز عصر کی نماز ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ درمیانی نماز عصر کی نماز ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔

باب میں حضرت علی، عائشہ، حفصہ، ابو ہریرہ، ابو ہاشم بن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں امام محمد (اسماعیل بخاری) نے فرمایا کہ علی بن عبداللہ (المدینی) فرماتے ہیں کہ حضرت سمرہ جس کو حضرت حسن بصری نے روایت کیا ہے حسن ہے اور حضرت حسن بصری نے اس کو حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے۔

اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث درمیانی نماز کے بارے میں حسن ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے علاوہ اکثر اہل علم کا قول ہے۔ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں کہ درمیانی نماز نمازِ ظہر ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ درمیانی نماز صبح کی نماز ہے۔

☆ حبیب بن شہید کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن سیرین نے فرمایا کہ (آپ حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس حدیث پڑھنے جائیں تو ان) سے پوچھیں کہ انہوں نے عقیقہ والی حدیث کس سے سنی ہے؟ حبیب کہتے ہیں کہ میں نے ان سے یہ بات پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے وہ (حدیث) حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے سنی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے محمد بن اسماعیل بخاری سے علی بن عبداللہ المدینی عن قریش بن انس کی سند سے یہ حدیث پہنچی ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علی بن المدینی نے فرمایا کہ حسن بصری کا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے سماع صحیح ہے اور انہوں نے اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے۔

﴿تشریح﴾

حسن بصری کا بہت سے صحابہ سے سماع کے باوجود مرسلاً روایت کرنا فتنے سے بچنے کیلئے تھا: (حدیث الحسن عن سمرہ حدیث حسن و قد سمعه منه) حسن بصری کا سماع سمرہ رضی اللہ عنہ سے اسلئے ثابت ہے کیونکہ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ مدینہ سے جب تشریف لے گئے تھے اس وقت حسن بصری کی عمر پندرہ سال تھی نیز اور بہت سے صحابہ سے حسن

بصری کا سماع بالاتفاق ثابت ہے کیونکہ حسن بصری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں[1] مدینہ منورہ میں مقیم تھے اورخلافت علی کے زمانے میں مدینہ منورہ میں بہت سے صحابہ موجود تھے۔تو حسن بصریؒ کی جوروایات حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ دیگر صحابہ سے مروی ہیں وہ سب متصل کہلائینگی۔رہا حسن بصریؒ کا عنعنہ کرنا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اورانکے پیروکاروں کے دور حکومت کا تھا تو اگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صراحۃً روایت نقل کرتے تو اس میں فتنہ کا اندیشہ تھا[2] اس وجہ سے وہ عنعنہ کر کے ظاہر کرتے تھے کہ گویا میرا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع ہے ہی نہیں۔اس وجہ سے حسن بصری نے یہ طریقہ کار اختیار کیا اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے سنی ہوئی احادیث میں بھی حضرت حسن بصری نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرسلاً کہنا شروع کردیا تاکہ کسی پر ان کی مراد ظاہر نہ ہو۔

---

[1] **حضرت حسن بصری کی حضرت علی سے ملاقات وسماع پر مضبوط قرائن اور حضرت حضرت حسن بصریؒ کے حالات زندگی:** بظاہر یہاں پر ''الی'' کا لفظ رہ گیا ہے یعنی حسن رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت علی کی خلافت کے زمانہ تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے کیونکہ جب عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسال باقی رہ گئے تھے اس وقت انکی ولادت ہوئی تھی اس میں اہل الرجال کا اتفاق ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مبارک ہاتھ سے ان کی تحنیک فرمائی تھی ان کی والدہ ام سلمہ کی آزاد کردہ باندی تھیں کبھی ان کی والدہ کہیں چلی جاتی تھیں تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنا پستان ان کے منہ میں دیکر ان کو بہلایا کرتی تھیں کہ ان کی والدہ کے آنے تک یہ بہل جائیں پھر ان کی والدہ ان کو دودھ پلائیں۔یہ بھی مشہور تھا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس فعل کی برکت سے حسن بصریؒ کو اس قدر حکمت ودانائی عطا ہوئی تھی۔حضرت حسن بصریؒ مدینہ میں پیدا ہوئے اور وہیں مقیم رہے یہاں تک کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔اس کے بعد وہ بصرہ تشریف لے گئے۔اکمال میں اسی طرح لکھا ہے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ محدثین،حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حسن بصری کی ملاقات کا کیسے انکار کرتے ہیں حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔

[2] خلاصہ کے حاشیہ میں تہذیب الکمال سے نقل کیا ہے کہ یونس بن عبید نے حسن بصری سے پوچھا اے ابوسعید! آپ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کہتے ہیں حالانکہ آپ کی ملاقات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔تو حسن بصری رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اے بھتیجے! تم نے مجھ سے ایسا سوال کیا ہے جو تم سے پہلے کسی نے مجھ سے دریافت نہیں کیا۔اور اگر تمہارا یہ مقام میرے ہاں نہ ہوتا تو میں تم کو نہ بتاتا۔تم کو معلوم ہے کہ میں ایسے زمانے میں ہوں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو...... حضرت حسن رحمہ اللہ حجاج گورنر کے ماتحت لوگوں میں تھے...... جس حدیث میں تم مجھ سے یہ الفاظ سنو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کرسکتا۔انتہی

حسن بصری کا سماع سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے:

حدیث الباب میں سماع الحسن عن سمرۃ شیخین کے نزدیک متفق علیہ ہے: حدیث باب میں حسن بصری کا سماع حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے ہے یا نہیں تو اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان کسی کا واسطہ ہونے کا احتمال ہے ہی نہیں کیونکہ امام مسلم اور ان کے متبعین کا مذہب یہ ہے کہ اگر دو راویوں کے درمیان امکانِ لقاء ثابت ہو جائے تو عنعنہ والی حدیث کو اتصال پر محمول کر لینگے۔

امام بخاری اور ان کے ہم خیال محدثین کے نزدیک راوی اور مروی عنہ کے درمیان کسی ایک وقت میں ثبوتِ لقاء ضروری ہے اور جب ان دونوں کے درمیان ایک مرتبہ ملاقات ثابت ہوگئی تو تمام معنعن رویات کو اس پر محمول کر لینگے کہ راوی نے مروی عنہ سے بلا واسطہ اس حدیث کو سنا ہے بہرحال دونوں مذہبوں کے مطابق حسن بصری کا سماع حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ کیونکہ خود امام ترمذی نے آگے بیان کیا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حدیث عقیقہ میں تصریح کی ہے کہ میں نے اس حدیث کو سمرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے۔ لہٰذا بقیہ تمام روایات (معنعن) کو اس پر محمول کریں گے کہ حسن بصری نے سمرہ رضی اللہ عنہ بالمشافہہ ان روایات کو سنا ہے۔

صلاۃ الوسطیٰ میں مختلف اقوال ہیں: دوسرا مسئلہ: یہاں یہ ہے کہ صلوٰۃ الوسطیٰ کون سی نماز ہے؟

۱۔ تو مصنف رحمہ اللہ نے اس اختلاف[1] اور مذاہب کو واضح طور پر بیان کیا ہے ہر ایک امام کی اپنی دلیل ہے لہٰذا پانچوں نمازوں کو اہتمام سے ادا کرنا چاہیئے تاکہ بالکلیہ وہ مامور بہ پر عمل کرنے والا بن جائے اور مامور بہ بالیقین حاصل ہو جائے۔ شاید صلوٰۃ الوسطیٰ کے مخفی رکھنے میں یہ نکتہ بھی ہو، ۲۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر نماز صلوٰۃ الوسطیٰ ہے اس طرح کہ بعض تو وسط سے مشتق ہوں جس کا معنی درمیان کے ہے۔ یعنی یہ نماز بقیہ نمازوں کے درمیان میں واقع ہے۔ اور وسط کا دوسرا معنی بھلائی اور معتدل ہونے کے ہیں تو بعض نمازیں اس دوسرے معنی کے اعتبار سے وسطی ہونگی اور بعض نمازوں میں دونوں ہی معنی جمع ہونگے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں جو اقوال ذکر کئے ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے اقوال و مذاہب ہیں۔

۳۔ اکثر علماء کی رائے میں اس سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ بہت سی احادیث میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔

---

[1] ابن العربی فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ وسطی کا مطلب ہو "فضیلت والی نماز" اور یہ بھی احتمال ہے کہ وسطی وسط سے مشتق ہو یعنی دونوں اطراف کے درمیان والی شئے۔

۴۔جن علماء نے عصر کے علاوہ کوئی دوسری نماز مراد لی ہے وہ یہ تاویل کر سکتے ہیں کہ آیت میں جس نماز کو صلوٰۃ الوسطیٰ کہا گیا ہے وہ حدیث باب میں ذکر کردہ صلوٰۃ الوسطیٰ کے علاوہ ہے۔انتہی (از مترجم: حافظ ابن حجرؒ نے کتاب التفسیر میں حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطیٰ کی تفسیر میں اس صلاۃ الوسطیٰ کی تعیین میں بیس[۱] قول ذکر کئے ہیں: ا۔یہ فجر کی نماز ہے، یہ قول حضرت ابوامامہ، انس، جابر وغیرہ کا ہے، ۲۔یہ ظہر کی نماز ہے، یہ قول زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ہے۔اخرجہ ابوداؤد، ۳۔یہ نمازِ عصر ہے، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور امام ابوحنیفہ کا صحیح مذہب اور امام احمدؒ کا ایک قول اور شوافع کی ایک بڑی جماعت اور بعض اصحابِ مالک کا بھی یہی مذہب ہے، ۴۔نمازِ مغرب مراد ہے، یہ ابن عباسؓ سے مروی ہے، ۵۔اس سے تمام نمازیں مراد ہیں، یہ قول ابن عمرؓ سے مروی ہے، ۶۔اس سے مراد جمعہ کی نماز ہے قالہ ابن حبیب من المالکیہ، ۷۔عام دنوں میں ظہر کی نماز مراد ہے اور جمعہ کے دن جمعہ کی نماز، ۸۔اس سے مراد نمازِ عشاء ہے، نقلہ ابن التین والقرطبی، ۹۔اس سے مراد صبح اور عشاء کی نمازیں ہیں، قالہ الابھری المالکی، ۱۰۔اس سے مراد نمازِ فجر اور عصر ہے، ۱۱۔اس سے مراد باجماعت نماز پڑھنا ہے، ۱۲۔اس سے نمازِ وتر مراد ہے، رجحہ القاضی تقی الدین، ۱۳۔اس سے مراد صلوٰۃ الخوف ہے، ۱۴۔صلاۃ عید الاضحیٰ مراد ہے، ۱۵۔عید الفطر کی نماز مراد ہے، ۱۶۔چاشت کی نماز مراد ہے، ۱۷۔پانچ نمازوں میں سے کوئی ایک لاعلی التعیین ہے، ۱۸۔نمازِ فجر یا عصر میں سے ایک نماز ہے، ۱۹۔توقف اختیار کیا جائے، چنانچہ سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام صلوٰۃ الوسطیٰ کی تعیین میں بہت اختلاف رکھتے تھے اور انہوں نے تشبیک کر کے دکھایا اس طرح سے، ۲۰۔تہجد کی نماز مراد ہے۔فتح الباری جلد ثامن صفحہ ۲۴۹۔

(واحتج بہذا الحدیث) (امام بخاری نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے) بھذا الحدیث سے مراد.........[۲]

---

[۱] اس مسئلہ میں بذل المجہود اور اوجز المسالک میں بیس سے زیادہ اقوال نقل کئے گئے ہیں ان میں سے مشہور اقوال تین ہیں۔

۱۔صلاۃ الوسطیٰ سے فجر کی نماز مراد ہے اس کو امام مالک، شافعی وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

۲۔یہ ظہر ہے اس کو ابن عمر، عروہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ایک روایت بھی ہے۔

۳۔اس سے عصر کی نماز مراد ہے اور یہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، جمہور علماء حنفیہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔محققین شافعیہ میں سے امام نووی اور حافظ رحمہما اللہ نے اور مالکیہ میں سے ابن حبیب نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے۔

[۲] یہاں اصل مخطوطہ میں بیاض ہے بظاہر واحتج بھذا الحدیث سے مراد حدیث عقیقہ ہے کیونکہ محدثین کرام نے اس حدیث عقیقہ سے استدلال کیا ہے کہ حسن بصری کا سماع سمرہ سے ثابت ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة الصلاۃ بعدَ العصر وبعد الفجر

باب ہے نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد (نفل) نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں

☆حدثنا احمدُ بن مَنیع حَدَّثَنَا هشیم اخبرنا منصور، وهو ابن زاذانَ عن قَتَادَةَ قال اخبرنا ابو العالیة عن ابنِ عَبَّاس قال: سمعتُ غیرَ واحد من اصحاب النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم: منهم عمر بن الخطاب، وکان مِنُ اَحَبِّهِمُ اِلَیَّ: اَنَّ رسولَ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم نَهٰی عن الصَّلَاۃ، بعد الفجر حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وعن الصَّلَاۃِ بَعْدَ العَصْرِ حَتّٰی تَغْرُبَ الشَّمْسُ۔

وفی الباب عن علی وابن مسعود وابی سعید وعقبة بن عامر وابی هریرة وابن عمر وسمرة بن جندب وسلمة بن الاکوع وزید بن ثابت وعبدالله بن عمرو و معاذ بن عفراء والصنابحی ولم یسمع من النبیﷺ وعائشة وکعب بن مرة وابی امامة وعمرو بن عنبسة ویعلی بن امیة ومعاویة رضی الله عنهم اجمعین۔

قال ابو عیسیٰ حدیث ابن عباس عن عمر حدیث حسن صحیح وهو قول اکثر الفقهاء من اصحاب النبیﷺ ومن بعدهم انهم کرهوا الصلاۃ بعد صلاۃ الصبح حتی تطلع الشمس وبعد العصر حتی تغرب الشمس واما الصلوات الفوائت فلا باس ان تقضی بعد العصر وبعد الصبح قال علی بن المدینی قال یحییٰ بن سعید قال شعبة لم یسمع قتادة عن ابی العالیة الا ثلاثة اشیاء: حدیث عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّﷺ نهی عن الصلاۃ بعد العصر حتی تغرب الشمس وبعد الصبح حتی تطلع الشمس۔

وحدیث ابن عباسٍ عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: لایَنْبَغِی لِاَحَدٍ اَنْ یَقُولُ اَنَاخَیْرٌ مِنْ یُونُسَ بْنِ مَتّٰی وحدیثَ علیٍ: القُضَاۃُ ثَلَاثَةٌ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار صحابہ سے سنا جن میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ ان سب میں (جن سے میں نے یہ حدیث سنی ہے) مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز بعد نفل نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے

اورعصر کی نماز کے بعد نفل نماز سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے۔

باب میں حضرت علی، ابن مسعود، ابوسعید، عقبہ بن عامر، ابو ہریرہ، ابن عمر، سمرہ بن جندب، سلمۃ بن الاکوع، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں اور صنابحی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا۔ اور عائشہ، کعب بن مرہ، ابوامامہ، عمرو بن عنبسہ، یعلی بن امیہ، اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں ابن عباس کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ روایت حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اکثر فقہاء صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک اور عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک نماز پڑھنا مکروہ ہے البتہ فوت شدہ نمازیں عصر کی اور فجر کی نماز کے بعد پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کہ ان کی قضا کی جائے۔

علی ابن المدینی رحمہ اللہ نے کہا کہ یحییٰ بن سعید نے کہا کہ شعبہ فرماتے ہیں کہ قتادہ نے ابو العالیہ سے صرف تین احادیث سنی ہیں ایک حدیث عمر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کے سورج غروب ہو جائے اور صبح کی نماز کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔

اور دوسری حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں اور تیسری حدیثِ علی القضاۃ ثلثۃ۔

﴿تشریح﴾

(اخبرنا منصور وھو ابن زاذان) مصنف رحمہ اللہ نے اخبرنا منصور ابن زاذان نہیں فرمایا بلکہ یوں فرمایا کہ اخبرنا منصور وھو ابن زاذان کیونکہ انکے استاذ نے اخبرنا منصور کہا تھا لیکن جب شاگرد نے یہ ارادہ کیا کہ تنبیہ ہو جائے کہ اس سے کون سے منصور مراد ہیں تو شاگرد نے آگے اس کی وضاحت کی کہ وہ ابن زاذان ہیں اگر شاگرد نے استاذ سے اخبرنا منصور ابن زاذان کا لفظ سنا ہوتا تب تو اسی طرح نقل کرتے لیکن چونکہ یہاں استاذ نے صرف اخبرنا منصور کہا تھا لہٰذا شاگرد نے صرف اخبرنا منصور نقل کر کے ھوابن زاذان سے اس کی وضاحت کردی۔[1]

---

[1] محدثین کی طرف سے یہ انتہائی احتیاط والا فعل ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب استاذ نے کسی راوی کا نسب ذکر نہیں کیا ہوتا اور ان کا شاگرد اس کی نسبت بیان کرنے اور اس پر تنبیہ کرنے کا ارادہ کرتا تو پہلے تو استاذ کے الفاظ بعینہ نقل کرتا ہے اس کے بعد لفظ ھو، یعنی وغیرہ جیسے الفاظ کہکر اس راوی کا نسب وغیرہ بیان کرتا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الصَّلَاةِ بَعْدَ الْعَصْرِ

باب ہے عصر کی نماز کے بعد نفل نماز (پڑھنے) کے بیان میں

☆حدثنا قُتَيْبَةُ حَدَّثَنَا جرير عن عطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن ابن عباسٍ قال: اِنَّمَا صَلَّى النبيُّ صلّى الله عليه وسلم الركْعَتَيْنِ بعد العصرِ لانه آتَاهُ مَالٌ فَشَغَلَهُ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بعدَ الظهرِ، فَصَلَّاهُمَا بعدَ العصر، ثُمَّ لَمْ يَعُدْ لَهُمَا۔

وفي الباب عن عائشة وامِّ سَلَمَةَ، ومَيْمُونَةَ، وابى موسىَ۔قال ابو عيسى: حديث ابن عباسٍ حديثٌ حسنٌ۔

وقد رَوَى غيرُ واحدٍ عن النبيِّ صلّى الله عليه وسلم: اَنَّهُ صَلى بعدَ العصرِ ركعتين۔

وهذا خلافُ مارُوِيَ عنه: اَنَّهُ نَهَى عن الصلاةِ بعدَ العصر حتى تغربَ الشمسُ۔

وحديث ابنِ عباسٍ اصَحُّ حيثُ قال لَمْ يَعُدْ لَهُمَا وقد رُوِيَ عن زيدِ بنِ ثابتٍ نحوُ حديث ابن عباسٍ۔وقد رُوِيَ عن عائشة في هذا الباب رواياتٌ۔

رُوِيَ عنها: اَنَّ النبيَّ صلّى الله عليه وسلم مادَخَلَ عَلَيْهَا بعدَ العصرِ اِلَّا صلّى ركعتين۔

ورُوِيَ عنها عن أُمِّ سلمة عن النبيِّ صلّى الله عليه وسلم: اَنَّهُ نَهَى عن الصلاةِ بعد العصرِ حتى تغربَ الشمسُ، وَبَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ۔

وَالَّذِیْ اِجْتَمَعَ عَلَيْهِ اَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ: على كراهية الصلاة بعدَ العصر حتى تغرب الشمس، وبعد الصبح حتى تطلع الشمس الّا مااُسْتُثْنِيَ من ذٰلِكَ، مِثْلُ الصلاة بمكة بعد العصرحتى تغرُبَ الشمسُ، وبعدَ الصبح حتى تطلعُ الشمسُ بعدَ الطَّوَافِ، فقد رُوِيَ عن النبى صلّى الله عليه وسلم رُخْصَةٌ في ذلك۔وقد قال به قومٌ من اهل العلم من اصحاب النبيِّ صلّى الله عليه وسلم ومن بعدهم۔وبه يقولُ الشافعيُّ، واحمدُ، واسحٰقُ۔

وقد كَرِهَ قَوْمٌ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ بَعْدَهُمُ الصَّلَاةَ بِمَكَّةَ اَيْضاً بَعْدَ الْعَصْرِ وَبَعْدَ الصُّبْحِ۔ وبه يقولُ سفيان الثورى، ومالك بن انس، وبعض اهل الكوفة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھی اسلئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال آ گیا تھا۔ پس اس (مال کی تقسیم) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو رکعتوں سے مشغول کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دو رکعتیں عصر کے بعد ادا فرمائیں۔ پھر اس کے بعد کبھی دوبارہ (عصر کے بعد نماز) نہ پڑھی۔

باب میں حضرت عائشہ، ام سلمہ، میمونہ اور ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن ہے اور بے شمار حضرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس روایت کے خلاف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا غروبِ شمس تک اور حدیث باب (ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث) اصح ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر کبھی ان دو رکعتوں کو نہ پڑھا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح ہی مروی ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس باب میں مختلف روایات ہیں۔ ان سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کبھی ان کے پاس عصر کے بعد تشریف لے جاتے تو ضرور دو رکعتیں پڑھتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے بواسطہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے اور فجر کی نماز کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے اور اکثر اہل علم کا جس مسئلہ پر اجماع ہے وہ یہ ہے کہ عصر کے بعد سورج غروب ہونے اور فجر کے بعد سورج طلوع ہونے تک نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

البتہ وہ نوافل جو اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں جیسے مکہ مکرمہ میں عصر کے بعد نوافل پڑھنا غروب تک اور فجر کے بعد طلوع تک طواف کے بعد (یعنی طواف کے بعد دوگانہ جو واجب لغیرہ ہے) ان دو وقتوں میں پڑھ سکتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں اجازت مروی ہے اور صحابہ و تابعین اہل علم کی ایک جماعت اس کی قائل ہے امام شافعی، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

اور بعض صحابہ اور تابعین مکہ میں بھی عصر و فجر کے بعد نفل پڑھنے کو مکروہ کہتے ہیں اور یہ سفیان ثوری، امام مالک اور کوفہ

والوں میں سے بعض حضرات کا قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب حنفیہ کے مذہب (عصر کے بعد نوافل کے مکروہ ہونے) پر مستدل ہے:

اس جملہ سے ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے: (انما صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الرکعتین بعد العصر لانه اتاه مال) **اصل میں** ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر ان لوگوں کی پٹائی کرتے تھے جو عصر کے بعد نفل پڑھتے تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو عصر کے بعد نوافل پڑھے تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حدیث باب سے یہ جواب دیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صلوٰۃ بعد العصر پر قیاس نہ کرنا چاہیئے (کیونکہ وہ تو ایک خاص سبب سے ظہر کے بعد کی سنتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد پڑھی تھیں)۔

یہی جواب حنفیہ بھی دیتے ہیں کہ عصر کے بعد کی سنتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی یا پھر یہ نماز آپ پر واجب تھی لہٰذا یہ عصر کے بعد نفل پڑھنے کے قبیل سے نہیں بلکہ یہ تو قضاء پڑھنے کے قبیل سے ہے کہ ظہر کی سنتوں کی قضاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم تھی۔

حنفیہ کے نزدیک بھی عصر کے بعد قضاء نماز پڑھ سکتے ہیں تو یہ حدیث ہمارے مذہب کی تائید کر رہی ہے۔

(اشکال: (وقد روی غیر واحد عن النبی صلی الله علیه وسلم انه صلی بعد العصر رکعتین) ان روایات سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عصر کے بعد دو رکعتوں پر ہمیشگی اور مداومت فرماتے تھے جبکہ اوپر والی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک بار پڑھی تھی؟۔ اضافہ از مترجم)

اس تعارض کا جواب: صحیح بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک بار نماز پڑھی ہے اور یہاں پر بھی روی غیر واحد میں صلی کا لفظ ہے اس سے مراد ایک بار نماز پڑھنا ہے یہ لفظ استمرار پر دلالت نہیں کرتا۔

اشکال: عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی عصر کے بعد ان کے پاس تشریف لاتے تو ہر دفعہ دو رکعت نماز پڑھتے تھے؟

جواب: ....[۱]

صلوۃ بعد العصر کے معارض نہی والی روایات کا جواب: (هذا بخلاف ما روی عنه انه نهی عن الصلاة بعد العصر) (امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ صلوٰۃ بعد العصر والی روایات، نہی بعد العصر والی روایات کے معارض ہیں؟۔ اضافہ از مترجم)

اس کا جواب یہ ہے کہ نہی والی روایات میں امت کو منع کیا ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ممانعت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عصر کے بعد نفل نماز کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی پرستش کرنے والوں کیساتھ مشابہت لازم آتی ہے اور یہ مشابہت عین غروب کے وقت نماز پڑھنے سے ہوتی ہے نہ کہ قبل الغروب نماز پڑھنے کی صورت میں لیکن حدیث میں عصر کے بعد مطلقاً نوافل سے منع کیا گیا ہے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عصر کے بعد نماز شروع کردی جائے تو عین غروب کے وقت یہ نماز ختم ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں اوّلاً تشبہ بعبدۃ الشمس والی علت مفقود تھی۔ ثانیاً آپ کو غروب شمس کا وقت معلوم تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عصر کے بعد نوافل شروع فرمائیں گے تو اس میں عین غروب کے وقت نماز ختم ہونے کا شبہ نہیں۔

---

[۱] **صلوٰۃ بعد العصر کی روایات مضطرب ہیں یا خصائص نبوی میں سے ہیں:** یہاں اصل نسخہ میں بیاض ہے اس اشکال کا جواب اول یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات صلوٰۃ بعد العصر کے مسئلہ میں انتہائی مضطرب ہیں جیسا کہ کتب حدیث سے ممارست رکھنے والے پر یہ بات مخفی نہیں۔ لہٰذا ایسی مضطرب روایات سے استدلال صحیح نہیں۔

جوابِ ثانی یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو دوام کی نفی کی ہے وہ اپنے علم کے اعتبار سے ہے (ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دواماً دو رکعت بعد العصر پڑھتے تھے) اب دو رکعت بعد العصر دواماً کا جواب یہ ہوگا کہ یہ فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی فعل شروع فرماتے تو اس پر مداومت فرماتے تھے لہٰذا عصر کے بعد کی دو رکعتیں بھی خصوصیت اور اس پر مداومت بھی خصوصیت ہوئی۔

طحاوی میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! جب ہماری ظہر کی سنتیں فوت ہو جائیں تو کیا ہم بھی قضا کیا کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔

حافظ رحمہ اللہ نے اس زیادتی کو مسند احمد سے نقل کیا ہے تو یہ حدیث بطور نص کے دلالت کررہی ہے کہ یہ دو رکعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھیں۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام میں بھی اس جواب کی طرف اشارہ آرہا ہے۔

بہرحال اس فعل کی آپ کے ساتھ خصوصیت پر دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو گھر میں ادا فرمایا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ ہوتا کہ امت اس فعل میں آپ کی اقتداء کرے تو یہ نماز کھلم کھلا سب کے سامنے ادا فرماتے۔

(وقد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم رخصۃ فی[1] ذالك) اس سے مصنف نے کتاب الحج والی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اے بنوعبد مناف! تم کسی کو بھی بیت اللہ کا طواف اور حرم میں نماز سے دن رات کے کسی بھی حصہ میں نہ روکو!

شافعیہ کا استدلال اور اسکا جواب: (اس سے شافعیہ استدلال کرتے ہیں کہ مکروہ اوقات میں بھی نوافل ذوات الاسباب وغیرہ پڑھ سکتے ہیں؟۔ اضافہ ازمترجم)

جواب: چونکہ بنوعبد مناف کا محلہ مطاف میں بیت اللہ کے اردگرد تھا تو ان کو منع فرمایا ہے کہ اپنے گھروں کے دروازے مت بند کیا کرو۔ اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر وقت میں چاہے وقتِ مکروہ ہی کیوں نہ ہو نماز پڑھنا جائز ہے۔

---

[1] **اوقاتِ خمسہ منہیہ میں نماز پڑھنے کی تفصیل اور اس میں مذاہب ائمہ:** اس مسئلہ میں ائمہ کے مذاہب کی تفصیل اوجز میں اس طرح نقل کی ہے کہ داؤد ظاہری، ابن حزم وغیرہ کے نزدیک ان اوقات میں مطلقاً نماز پڑھنا صحیح ہے۔ حنابلہ کے نزدیک ان پانچوں اوقات میں (طلوع شمس، غروب شمس، استواء شمس، فجر کے بعد اور عصر کے بعد) مطلقاً نماز پڑھنا حرام ہے چاہے وہ نماز ذات السبب ہو یا نہیں مکہ ہو یا اور کوئی جگہ۔ البتہ جمع بین الصلوتین کی صورت میں ظہر کی سنتیں عصر کے بعد پڑھ سکتے ہیں اور طواف کی دو رکعتوں کا استثناء ہے نیز قضا نماز اور جس نماز کی نذر مانی گئی یہ دونوں نمازیں بھی ان اوقات میں پڑھ سکتے ہیں۔ شافعیہ کے نزدیک ان پانچوں اوقات میں تمام مقامات پر نوافل ذوات الاسباب پڑھ سکتے ہیں اور مکہ میں تو غیر ذوات الاسباب نفل بھی پڑھ سکتے ہیں لہٰذا جمع بین الصلوتین کی صورت میں ظہر کی سنتیں نہیں پڑھ سکتے ذات السبب کا مطلب یہ ہے کہ جس نماز سے پہلے اس کا سبب موجود ہو جیسے تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد وغیرہ۔ لہٰذا وہ نمازیں جن کا سبب ان کے بعد پایا جاتا ہے جیسے صلوۃ الاستخارہ، صلوۃ الاحرام ان کا پڑھنا جائز نہیں۔

مالکیہ کے نزدیک فرائض کے علاوہ کوئی نماز بھی طلوع اور غروب کے وقت جائز نہیں یہاں تک کہ جنازہ کی نماز بھی ناجائز ہے اور عصر اور فجر کے بعد نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ ان دو اوقات میں نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت نماز فجر کے بعد اسفار سے پہلے اور نماز عصر کے بعد اصفرار سے پہلے پڑھنا جائز ہے۔ حنفیہ کے نزدیک پہلے تین اوقات میں مطلقاً نماز پڑھنا جائز نہیں سوائے عصر یومہ کے، نیز اگر جنازہ خاص ان ہی تین اوقات میں لایا جائے تو اس کا بھی استثناء ہے اور باقی دو اوقات (عصر اور فجر کی نماز کے بعد ان) میں صرف نوافل پڑھنا منع ہے۔ والبسط فی الاوجز مع الدلائل

لہٰذا یہ حدیث حدیثِ باب (جس میں ممانعت ہے) کے معارض نہیں۔ جس باب[1] میں راویوں نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے اس میں مزید کلام اس حدیث کے متعلق آرہا ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ قبل المغرب

باب ہے نماز مغرب سے قبل (نفل) نماز کے جواز کے بیان میں

☆ حدثنا هنّادٌ حدّثنا وكيعٌ عن كهمس بن الحسين عن عبد الله بن بريدة عن عبد الله بن مغفل عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلَاةٌ لِمَنْ شَاءَ۔وفی الباب عن عبد اللّٰه بن الزبیر۔

قال ابو عیسی: حدیثُ عبد اللّٰه بن مغفل حدیث حسن صحیح۔

وقد اختلف اصحابُ النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم فی الصلاۃ قبل المغرب:فلم یَرَ بعضهم الصلاۃ قبل المغرب۔

وَقَدْ رُوِیَ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنَّهُمْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ، بَيْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ۔

وقال احمد واسحق :اِنْ صَلَّاهُمَا فَحَسَنٌ وَهٰذَا عِنْدَهُمَا عَلَی الْاِسْتِحْبَابِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے اس شخص کے لئے جو چاہے۔

باب میں عبداللہ بن زبیر سے روایت ہے۔

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مغرب کی نماز سے قبل نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے سو بعض صحابہ کرام تو مغرب کی نماز سے قبل نماز پڑھنے کے قائل نہیں اور متعدد صحابہ

---

[1] مصنف رحمہ اللہ نے کتاب الحج میں اس کے لئے مستقل ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اور اس میں اپنی سند سے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "یابنی عبدمناف! لا تمنعوا احدا" الحدیث نقل کیا ہے اس پر تفصیل سے بحث آئیگی۔

کرام سے مروی ہے کہ وہ نماز مغرب سے پہلے اذان واقامت کے درمیان دو رکعتیں پڑھتے تھے اور امام احمد واسحق فرماتے ہیں کہ اگر کوئی پڑھے تو اچھا ہے اور یہ حکم ان دونوں کے نزدیک استحباب پر محمول ہے۔

﴿تشریح﴾

مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنے سے متعلق ہمارے علماء حنفیہ[۱] کا آپس میں اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح قول یہ

---

[۱] **رکعتین قبل المغرب کے حکم میں ائمہ کا اختلاف:** اس مسئلہ میں سلف کا بھی اختلاف ہے بعض صحابہ وتابعین کے نزدیک رکعتین قبل المغرب مستحب ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ دو رکعتیں مستحب نہیں ہیں۔ چنانچہ دردیر کی شرح الکبیر میں ہے عصر کی نماز کے بعد مغرب کے فرض پڑھنے تک نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ اگر کوئی آدمی مغرب کی اقامت سے قبل مسجد میں داخل ہو گیا تو اس کو بیٹھ جانا چاہیے۔ دسوقی کہتے ہیں کہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علماء مالکیہ کے نزدیک عصر کے فرض ادا کرنے کے بعد غروب شمس تک نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا پورے سورج کے چھپ جانے تک نفل حرام ہیں۔ پھر اس کے بعد مغرب کے فرض پڑھنے تک دوبارہ وقت مکروہ ہے۔ انتہی

شرح الاقناع میں ہے کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ دو مزید اوقات بھی اوقات مکروہہ میں داخل ہیں جن میں سے مغرب کے بعد سے لیکر مغرب کی فرض نماز پڑھنے تک نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ صحیح قول کے مطابق یہ مکروہ تحریمی ہے۔ مشہور مذہب اس کے برخلاف ہے۔ بعض حنابلہ کے نزدیک مکروہ تحریمی والا قول قابل اعتبار (راجح) ہے اور یہی ان کا مذہب ہے۔ انتہی

قولہ والمشھور فی المذھب خلافہ اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کے نزدیک قابلِ اعتماد روایت مکروہ تنزیہی کی ہے۔ انتہی

الروض المربع میں ہے کہ مغرب کی اذان کے بعد دو رکعتیں پڑھنا مباح ہے۔ ابن مقدامہ کہتے ہیں کہ چار رکعتوں میں علماء کا اختلاف ہے۔ ان میں سے دو رکعتیں مغرب کی اذان کے بعد فرض سے پہلے والی ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ دو رکعتیں جائز ہیں سنت نہیں۔ چنانچہ اثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے مغرب کے فرض سے پہلے کی دو رکعتوں کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا ''میں نے زندگی میں صرف ایک دفعہ یہ دو رکعتیں پڑھی ہیں جب میں نے یہ حدیث سنی تھی اور اس مسئلہ میں بہت سی حسن اور صحیح احادیث موجود ہیں۔ پھر ان احادیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا اور ان سے جواز پر استدلال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی وغیرہ نے امام احمد کی طرف رکعتین قبل المغرب کے مستحب ہونے کو جو منسوب کیا ہے تو اگر یہ نسبت صحیح ہو تو یہ روایت مرجوحہ ہوگی جیسا کہ شارح الاقناع نے نقل کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک رکعتین قبل المغرب حرام ہیں اور یہ بھی صحیح ماننے کی صورت میں مرجوح روایت ہوگی۔

حنفیہ کے متعدد اقوال: حنفیہ کا اس میں کیا مذہب ہے؟ تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جیسے ذکر کیا ہے کہ اصحاب الفروع کا اس میں اختلاف ہے۔ صاحب الدر المختار وغیرہ نے رکعتین قبل المغرب کے مکروہ ہونے کو ترجیح دی ہے اور ابن ہمام نے اس کے مباح ہونے کو ترجیح دی۔ بہر حال ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ رکعتین قبل المغرب مستحب نہیں۔ البتہ مکروہ ہونے میں ان کا اختلاف ہے۔

ہے کہ اگر مغرب کی نماز کی تکبیر اولیٰ کے فوت ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ دو رکعتیں مکروہ نہیں ہیں۔

(بین کل اذانین صلوٰۃ) جن علماء کے نزدیک مغرب سے قبل دو رکعت مکروہ غیر مستحب ہے تو ان کے نزدیک اذانین سے مراد اکثر نمازوں کے اعتبار سے یہ حکم ہے اور جن حضرات کے نزدیک یہ دو رکعتیں مستحب ہیں وہ اس کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں کہ تمام نمازوں کی اذان واقامت کے درمیان دو رکعت پڑھنی چاہیئے۔

(فلم یر بعضهم الصلوٰۃ قبل المغرب) ان صحابہ کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ہمارے مذہب میں یہ کوئی دلیل نہیں کیونکہ نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھنا فعل کے عدم وجود پر دلیل نہیں بن سکتی۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْمَنْ اَدْرَکَ رَکْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ

باب ہے اس شخص کے بارے میں جس نے سورج غروب ہونے سے پہلے نمازِ عصر کی ایک رکعت پالی

☆حدثنا اسحق بن موسی الانصاری حَدَّثَنَا معن حَدَّثَنَا مالك بن انس عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار وعن بُسر بن سعيد وعن الاعرج يحدثونه عن ابی هريرة: ان النبی صلّی اللّٰه عليه وسلم قال: من ادرك من الصُّبحِ رَكْعَةً قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ ، وَمَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ رَكْعَةً قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ۔ وفی الباب عن عائشة۔

قال ابو عيسى: حديث ابی هريرة حديث حسن صحيحٌ۔

وبه يقول اصحابنا و الشافعی، واحمد، واسحٰق۔ ومعنى هٰذا الحديث عندهم لصاحب العذر، مِثْل الرجل ينام عن الصلاة اوينساها فيستيقظ ويذكر عند طلوع الشمس وعند غروبها۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالی تو اس نے فجر کی نماز پالی اور جس نے غروب شمس سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی تو اس نے عصر کی نماز پالی۔

باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہی قول ہمارے اصحاب (شوافع) اور امام شافعی اور احمد واسحٰق کا ہے اور اس حدیث کے معنی ان حضرات کے یہاں یہ ہیں کہ یہ حدیث عذر والے شخص کے لئے ہے مثلاً وہ شخص جو نماز سے سوگیا یا نماز بھول گیا پھر وہ بیدار ہو یا اسے یاد آجائے سورج طلوع ہونے کے وقت (قریب) اور سورج غروب ہونے کے وقت۔

﴿تشریح﴾

غرضِ مصنف: امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس باب سے غرض تنبیہ کرنا ہے کہ اگر سوتا ہوا شخص بیدار ہو یا ایک آدمی نماز کو بھولا ہوا تھا اس کو ایک دم تنبہ ہوا تو گذشتہ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جیسے ہی اس کو یاد آئے اسی وقت نماز پڑھ لے کیونکہ یہی اس کا وقت ہے تو اس گزشتہ حدیث پر تنبیہ مقصود ہے لہٰذا حدیث باب کا معنی یہ ہے کہ اگر اس شخص نے غروب آفتاب سے قبل عصر کی ایک رکعت پڑھ لی تو اس کی عصر کی نماز ہوگئی اور اس کو اپنی نماز پوری کرلینی چاہیے۔

حنفیہ کا مذہب: احناف کے مذہب میں عصر اور فجر کی نمازوں کے حکم میں فرق ہے۔

ہماری دلیل: ہماری دلیل علماء حنفیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب حدیث باب اور نھی عن الصلوٰۃ فی الاوقات المکروھۃ والی حدیث میں تعارض ہوگیا تو ہم نے قیاس کی طرف رجوع کیا کیونکہ جب احادیث میں تعارض ہوجاتا ہے تو قیاس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے چنانچہ قیاس نے نہی والی حدیث کو فجر کی نماز کے متعلق ترجیح دی کہ اگر فجر کی نماز پڑھنے کے دوران طلوع شمس ہوگیا تو نماز باطل ہوگی اور اسی قیاس نے عصر کی نماز کے متعلق من ادرك رکعۃ الخ والی حدیث باب کو ترجیح دی کہ عصر کی نماز غروبِ شمس سے باطل نہیں ہوگی وہ اس طرح کہ یہ قاعدہ ہے کہ نماز کا سبب وجوب وہ جزء ہوتا ہے جس جزء میں نماز کو شروع کیا جائے۔ عصر کی نماز جو کہ اس شخص نے ناقص وقت میں شروع کی تھی تو ناقص واجب ہوئی لہٰذا جب دورانِ نماز سورج غروب ہوگیا تو عصر کی نماز باطل نہیں ہوگی کیونکہ جس طرح واجب ہوئی تھی اسی طرح ادا بھی کی جارہی ہے تو یہاں ناقص واجب ہوئی اور ایسے ہی ناقص ادا بھی کی جارہی ہے بخلاف فجر کے وقت کہ اس کا پورا کا پورا وقت کامل وقت ہے اس وقت فجر کا کوئی جزء ناقص وقت نہیں۔ جب اس شخص نے طلوع شمس سے تھوڑی دیر پہلے نماز شروع کی تو چونکہ وقتِ کامل تھا لہٰذا نماز بھی کامل واجب ہوئی۔ اب دورانِ نماز سورج طلوع ہوگیا تو اس کی نماز باطل ہوجائیگی کیونکہ یہ کامل واجب ہوئی تھی اور ناقص صفت کے ساتھ ادا کی جارہی ہے تو یہ مؤدی مثل الواجب نہ ہوئی۔ یہ علماء احناف کا

طریقہ کار ہے۔

حنفیہ کے مشہور مذہب پر اعتراض: لیکن اس دلیل میں جو نقص ہے وہ کسی پر مخفی نہیں اسلئے کہ اصول فقہ کا قاعدہ[1] ہے کہ نہی عن الافعال الشرعیہ فی نفسہ اس فعل کی صحت کا تقاضہ کرتی ہے تو یہ اصول علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ دونوں نمازیں صحیح ہو جانی چاہئیں تب ہی تو اس پر ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اگر چہ اس وقت میں نماز پڑھنے سے سورج کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے اسلئے ان اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کہا گیا ہے (لہٰذا حدیث باب بھی قبل الغروب وقبل الطلوع نماز کے جواز پر دال ہے اور نہی والی روایت بھی اس فعل کی صحت کا تقاضہ کر رہی ہے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ ھٰکذا افہمت محمد زکریا مدنی)

بہر حال اگر اس نہی والی روایت سے قطع نظر بھی کر لیں تو یہ قول کہ فجر میں تو طلوع شمس سے نماز صحیح نہ ہوگی باطل ہوگی اور عصر کی نماز غروب شمس سے باطل نہ ہوگی۔ یہ قول سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وقت دونوں نمازوں کیلئے شرط ہے لہٰذا جب ایک یا دو رکعتوں کے ادا کرنے کے بعد سورج غروب ہو گیا تو بقیہ رکعتوں کے صحیح ہونے کیلئے جو وقت شرط تھا وہ نہ رہا۔ اسلئے عصر کی نماز بھی غروب شمس سے باطل ہونی چاہئے ورنہ یہ لازم آئیگا کہ نماز کی صحت کیلئے وقت شرط نہیں حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں اور اس قول کی صورت میں یہ بھی لازم آئیگا کہ جس شخص نے نماز اس حال میں شروع کی کہ اس کے کپڑے پر ایک[2] درہم یا اس سے کم نجاست لگی ہوئی تھی پھر ایک رکعت ادا کرنے کے بعد کسی شخص نے اس پر کچھ ناپاکی ڈالدی تو ایسے آدمی کی بھی نماز ہو جانی چاہئے۔ کیونکہ اس نے ناپاکی والی کیفیت کا التزام کر کے نماز شروع کی تھی اور وہ ایسی (ناپاکی والی) کیفیت پر نماز ادا بھی کر رہا ہے تو یہ موڈی مثل الواجب ہو گیا...... اس طرح ایک شخص نے نماز اس حال میں شروع کی کہ اس کو قضاء حاجت کا تقاضہ ہے پھر ایک یا دو رکعت پڑھنے کے بعد اس نے پیشاب کر لیا یا غائط سے فارغ ہو گیا تو اس کو بھی اپنی گذشتہ نماز پر بناء کرنی چاہئے کیونکہ یہاں پر بھی اس نے حدث والی کیفیت کا التزام کیا اور حدث سے لاحق ہونے کے بعد اس کیفیت کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے۔

---

[1] قلت: لیکن کتب اصول فقہ اور کتب فقہ میں غور کرنے سے اس قاعدہ میں مزید گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

[2] لیکن آنے والی دو مثالوں اور گذشتہ مثال میں واضح فرق موجود ہے کیونکہ گذشتہ مثال میں تو وقت نماز کی صحت کیلئے شرط نہ تھا بلکہ اداءِ نماز کیلئے شرط تھا جب وقت فوت ہو گیا تو نماز ادا نہ رہی بخلاف آنے والی مثالوں کے کہ ان میں حدث پایا جا رہا ہے جب کہ طہارت نماز کی صحت کیلئے شرط ہے تو حدث کی موجودگی میں نماز ہی نہ ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز کے فاسد ہونے اور باطل ہونے کے درمیان فرق نہیں کیا اسلئے بہت ساری خرابیاں لازم آرہی ہیں حالانکہ ان کے درمیان فرق بالکل واضح ہے کیونکہ اصفرارِ شمس کا وقت، وقتِ فاسد ہے اور غروب کے بعد بالکل وقت رہتا ہی نہیں [1] تو آپ کا ان دونوں وقتوں کو وقتِ فاسد کہنا کیسے صحیح ہے (جیسا کہ علماء احناف کا دعویٰ ہے کہ اصفرار کا وقت بھی وقتِ فاسد ہے اور غروب کے بعد بھی وقتِ فاسد ہے لہٰذا نمازِ عصر باطل نہیں ہونی چاہیئے...... حالانکہ غروبِ آفتاب کے بعد تو وقتِ باطل ہے۔ از مترجم) اور فقہاء نے اس وقت کو جہاں بھی وقتِ فاسد کہا ہے اس کا مطلب وقت باطل ہی ہے کیونکہ عبادات میں انہوں نے فساد اور بطلان کے درمیان فرق نہیں کیا شاید کہ فقہاء نے معاملات پر قیاس کیا ہو کہ جیسے معاملات میں فاسد اور باطل معاملہ میں مآلاً کوئی فرق نہیں (کہ دونوں ہی واجب الرد ہیں۔ از مترجم، تو یہاں پر بھی باطل اور فاسد میں کوئی فرق نہیں) لیکن میری عقل اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب عصر کا وقت ختم ہوگیا تو اس نماز کے صحیح ہونے کی کیا وجہ اور دلیل ہے لہٰذا اس تقریری سے معلوم ہوا کہ فجر اور عصر کی نماز کے حکم میں فرق کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جب نمازِ عصر پڑھنے والا شخص نماز شروع کردے مکروہ وقت میں پھر دوران نماز سورج غروب ہو جائے تو غروب آفتاب کے بعد والے وقت (اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس وقت کی کراہت غروب آفتاب کے وقت کی کراہیت کے برابر ہے) میں جب نماز پوری کی جارہی ہے تو عصر کی نماز کے قضا پڑھنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ بقول آپکے یہ غروب کے بعد والا وقت قبل الغروب والے وقت کے مشابہ ہی ہے اور کسی بھی امام کے نزدیک غروب سے پہلے نماز پڑھنے والے کو قضاء نماز پڑھنے والا نہیں کہا جاتا تو یہ شخص آپ کے نزدیک قضا پڑھنے والا کیسے ہوا؟ اس کی نماز تو ادا ہونی چاہیئے۔

---

[1] یہ بات تو صحیح ہے کہ غروب کے بعد بالکل وقت ہی نہیں رہتا لیکن یہ بات گزر چکی ہے کہ وقت ہونا نماز کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے نہیں ہے بلکہ نماز کے ادا کرنے کی شرائط میں سے ایک شرط وقت ہے لہٰذا غروب سے نماز ادا نہ رہی لیکن نفس عصر کی نماز صحیح ہوگئی کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ قضاء کی نیت سے ادا نماز پڑھنا اور ادا کی نیت سے قضا نماز پڑھنا جائز ہے لہٰذا عصر کی نماز باطل نہ ہونی چاہیئے (بلکہ یہ نماز غروب کے بعد بھی صحیح ہونی چاہیئے البتہ یہ نماز قضا کہلائیگی نہ کہ ادا۔ از مترجم) اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص ظہر کے آخری وقت میں نماز ظہر شروع کرتا ہے اور دوران نماز عصر کا وقت شروع ہوتا ہے تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی ایسا ہی یہاں پر ہے۔ فتفکر

مشہور مذہبِ حنفی کی ایک اہم دلیل[1]: اور یہ قول کہ غروب آفتاب والا وقت اور غروب کے بعد والا وقت دونوں ہم جنس ہیں (بخلاف عصر کے اصل وقتِ مستحب کے) یہ دونوں ہم جنس اس طرح ہیں کہ دونوں وقتِ مکروہ ہیں۔ نیز ان میں کراہت ذاتی نہیں بلکہ عارضی ہے اس طرح کہ عین غروب والا وقت سورج کی عبادت کرنے والوں کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ ہوا اور غروب کے بعد والا وقت چونکہ اس عصر کی نماز کا مقررہ وقت نہیں بلکہ یہ تو مغرب کا وقت ہے اسلئے یہ بھی وقت مکروہ ہوا بخلاف فجر کے وقت کے کہ وہ پورا وقت ہی کامل وقت ہے۔ اور طلوع کے بعد شاید جو وقت ناقص ہے اس کا نقص ذاتی ہے اسی وجہ سے اس وقت میں کوئی فرض نماز مشروع نہیں لہٰذا طلوع سے پہلے والا وقت اور طلوع کے بعد والے وقت کے درمیان مغایرت ہے (اور غروب شمس والے وقت اور غروب کے بعد والے وقت کے درمیان مجانست ہے) لہٰذا اگر سورج عصر کی نماز کے دوران غروب ہو جائے تو عصر کی نماز باطل نہ ہوگی کیونکہ جو نماز غروب کے بعد پڑھی جا رہی ہے وہ عین غروب کے وقت پڑھی جانے والی نماز کے مشابہ ہے کیونکہ دونوں کے اندر وصفی طور پر نقص موجود ہے (اور یہ دونوں اوقات وصفاً اوقاتِ فاسدہ ہیں) بخلاف اس کے کہ اگر فجر کی نماز کے دوران سورج طلوع ہو گیا تو فجر کی نماز باطل ہوگی کیونکہ طلوع کے وقت جب نماز فرض ہوئی تو کامل فرض ہوئی اور اب طلوع کے بعد جو نماز ادا کی جا رہی ہے تو یہ ناقص وقت میں ادا کی جا رہی ہے اس وقت کا نقص ذاتی ہے؟

تفصیلِ مذکور پر حضرتؒ کا جواب: ساری تقریر فضول اور بے فائدہ ہے کیونکہ اوقات نماز کیلئے مقرر کئے گئے یہ نماز کے وجوب ادا کے اسباب ہیں جیسا کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے لہٰذا جب وقت ختم ہو گیا تو چاہے وہ فجر کا وقت ہو یا عصر کا

---

[1] میری کوتاہ نظر اس طرف نہیں پہنچی کہ اس فرق کو کس امام نے ذکر کیا ہے بلکہ ہمارے فقہاء کی کتابوں میں تو عصر اور فجر کے درمیان یہ فرق مذکور ہے کہ عصر کی نماز میں قبل الغروب چونکہ وقت ناقص ہے لہٰذا سورج کا غروب ہونا نماز عصر کی صحت کے منافی نہیں بلکہ غروب کے بعد والا وقت قبل الغروب وقت سے بھی زیادہ ناقص ہے۔ بہر حال دونوں وقت ناقص ہونے میں شریک ہیں جبکہ فجر کی نماز میں طلوع سے پہلے والا وقت چونکہ وقتِ کامل ہے لہٰذا طلوع شمس سے ناقص وقت کا داخل ہونا اس نماز کو باطل کر دے گا۔

ہاں فقہاء نے یہ فرق لکھا ہے کہ غروب کے بعد والا وقت نماز پڑھنے کیلئے صحیح وقت ہے اسی لیئے تو اس میں مغرب کی نماز فرض قرار دے دی گئی لیکن طلوع شمس کے بعد والا وقت وقت ادائیگی نماز کیلئے صحیح نہیں کیونکہ ارتفاع شمس تک یہ وقت مکروہ رہے گا۔ اس طرح ان دونوں وقتوں میں فرق ہوا۔

دونوں صورتوں میں آدمی اپنی طرف سے یہ نماز ادا کرتا ہے۔تو یہ دونوں اوقات (فجر اور عصر دونوں نمازوں میں) بندے کے اپنی طرف سے ہونے میں برابر سرابر ہیں (لہٰذا دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے) کیونکہ طلوع آفتاب کے بعد سے لے کر زوال سے پہلے تک کا وقت بندہ کا حق ہے جیسا کہ تمام نمازوں کے اوقات سوائے فرض نماز میں جتنا وقت خرچ ہوا ہے۔اس کے علاوہ سارا وقت بندہ کا حق ہے لہٰذا یہ قول کیسے صحیح ہو کہ غروب آفتاب کے بعد والا وقت طلوع آفتاب کے بعد والے وقت کے مغائر ہے کیونکہ دونوں ہی وقت بندہ کا حق ہیں اور یہ دونوں اوقات عصر اور فجر کے مقررہ اوقات کا غیر ہیں اگر چہ غروب آفتاب کے بعد تو فرض نماز مشروع ہے اور طلوع کے بعد والے وقت میں فرض نماز مشروع نہیں اس فرق سے قطع نظر کہ یہ دونوں اوقات حق العبد ہونے اور غیر وقت ہونے میں مشترک ہیں اسلئے اس میں فرق کرنا غلط ہے۔ فافهم فلعل ذلك البحث دقيق

حدیث باب کی ایک عمدہ توجیہ: چونکہ احناف نے حدیث کا وہ معنی نہیں بیان کیا جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہاں فقد ادرك الخ میں ادرک سے مراد یہ نہیں کہ اس نے عصر کی نماز کو بالکلیہ پالیا۔ورنہ یہ لازم آئیگا کہ اگر اس نے غروب آفتاب تک ایک رکعت پڑھی ہے تو یہ ایک ہی رکعت اس کے لئے کافی ہو کیونکہ حدیث باب میں دونوں جگہ من ادرك سے یہ مراد لیا جائے کہ اس نے بالکلیہ نماز کو پالیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے طلوع یا غروب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی تو گویا اس نے پوری نماز پڑھ لی اور یہ معنی باطل ہے اس کا کوئی قائل نہیں۔معلوم ہوا کہ یہاں ادراک سے احاطہ کرنے کا معنی مراد نہیں جیسا کہ قرآن میں لا تدركه الابصار میں یہ احاطہ کرنا مراد ہے بلکہ حدیث باب میں ادراک سے مراد لحوق (پالینا) ہے چنانچہ ادرکت زیدا کا معنی ہوتا ہے کہ میں نے زید کو پالیا۔

اس حدیث باب کا یہ مطلب ہوا کہ جس نے طلوع شمس سے پہلے فجر کی ایک رکعت کو پالیا تو اس نے فجر کو پالیا۔تو حدیث ایسے شخص کے متعلق ہے جو سوتا رہ جائے یا نماز کو بھول جائے یا اس میں کوتاہی کرے پھر جب نماز کو شروع کرے تو ایک رکعت کا وقت باقی رہ جائے لہٰذا یہ شخص اگر نماز پڑھے اور اس کو پورا کر لے تو اس کی نماز صحیح ہوگئی باقی یہ نماز مکروہ ہے یا نہیں؟ تو یہ الگ بات ہے جس سے یہاں پر بحث نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت یہ بتلا رہی ہے کہ جو شخص عین طلوع اور عین غروب کے وقت فجر اور عصر کی نماز پوری کر لیتا ہے تو وہ اپنے عہدہ (ذمہ داری) سے بری ہو گیا اگر چہ اس کا یہ فعل کراہت سے خالی نہیں۔

ایک مشہور اعتراض اور اس کے جوابات:

اشکال: نہی والی حدیث (نہی عن الاوقات الثلثة) ان دونوں وقتوں میں نماز سے ممانعت کرنے کیوجہ سے اس کے معارض ہے

جواب: یہ ہیکہ یہ قاعدہ ہے کہ نہی عن الافعال الشرعیہ اس فعل کی صحت پر دلالت کرتی ہے لہٰذا دونوں حدیثیں دلالت کررہی ہیں کہ اوقات مکروہہ میں پڑھی جانے والی نمازیں فی نفسہ صحیح ہو جائینگی۔ البتہ حدیث باب میں اس نماز کے اندر موجود کراہت کو ذکر نہیں کیا گیا جبکہ نہی والی حدیث میں سے اس نماز کی کراہت کو بیان کیا گیا ہے کہ عین طلوع اور عین غروب کے وقت پڑھی جانے والی یہ نماز کراہت سے خالی نہیں۔

جواب نمبر۲: یا یہ کہا جائے کہ حدیث باب میں لفظ من ادرك میں من بیانِ جنس کیلئے نہیں بلکہ یہ بیان نوع کیلئے ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بچہ بالغ ہو جائے یا کافر مسلمان ہو یا عورت حیض ونفاس سے پاک ہو اور عصر وفجر کے اوقات میں اتنا وقت باقی ہو کہ یہ لوگ طہارت حاصل کرنے کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ سکیں تو ان لوگوں نے فجر اور عصر کی نماز پالی ہے لہٰذا فجر اور عصر کی نماز ان پر لازم ہوگئی اس کی یہ قضاء کریں گے۔ اس تقریر کو اچھی طرح سمجھ لو شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کرے[۱]۔ (جس سے احناف کا مذہب صحیح طرح واضح ہو سکے۔ ازمترجم)

بَابُ مَاجَاءَ فِي الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ

باب ہے دو نمازوں کو جمع کرنے کے بیان میں

☆حدثنا هَنَّادٌ حدثنا ابو معاوية عن الاعمش عن حبيب بن ابی ثابت عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: جَمَعَ رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم بين الظهر والعصر، وبين المغرب والعشاء بالمدينة، من غير خوف ولا مطر، قال: فقيل لابن عباس: ماراد بذلك ؟قال اراد ان لاتحرج امته۔

---

[۱] **حدیث باب من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ محتمل ہے اور احادیثِ نہی محکم ہیں:** قلت: گنگوہی رحمہ اللہ نے حدیث کی جو توجیہ کی ہے اس کے علاوہ بھی حدیثِ باب کی اور بہت سی توجیہات کی گئی ہیں جنکو اوجز میں تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز حنفیہ کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ حدیثِ باب من ادرك بہت سے معانی کا احتمال رکھتا ہے جبکہ حدیث نہی محکم ہے۔ جس میں تاویل کی گنجائش نہیں اسلئے نہی والی حدیث راجح ہوگی البتہ فقہاء حنفیہ نے عصر یومہ کا ایک عارض کی وجہ سے استثناء کیا ہے۔

وفي الباب عن ابي هريرة۔قال ابو عيسى: حديث ابن عباس قدرُوِيَ عنه من غير وجه: رَوَاهُ جابرُ بن زيدٍ وسعيد بن جبير، وعبد الله بن شَقِيقٍ العُقَيْلِيُّ۔

وقد رُوِيَ عن ابن عباس عن النبيِّ صلّى الله عليه وسلم غيرُ هذا:

☆ حَدَّثَنَا ابو سلمة يحيى بن خلف البصرى حَدَّثَنَا المعتمر بن سليمان عن ابيه عن حنش عن عكرمة عن ابن عباس عن النبى صلّى الله عليه وسلم قال: مَنْ جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد اتى بابا من ابواب الكبائر۔

قال ابو عيسى: وحَنَشٌ هذا هو: ابو على الرَّحَبِيُّ وهو حَنَشُ بن قيسٍ وهو ضعيف عند اهل الحديث، ضَعَّفَهُ احمد وغيره۔

والعمل على هذا عند اهل العلم: ان لايجمع بين الصلا تين الا فى السفر او بعرفة۔

ورخص بعض اهل العلم من التابعين فى الجمع بين الصلاتين للمريض۔وبه يقول احمد، واسحق۔

وقال بعض اهل العلم: يَجْمَعُ بين الصلا تين فى المطر۔ وبه يقول الشافعى، واحمد واسحق۔

ولم ير الشافعى للمريض ان يجمع بين الصلا تين۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو مدینہ میں رہتے ہوئے جمع فرمایا جبکہ نہ تو دشمن کا خوف تھا اور نہ بارش کا۔

راوی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس عمل سے کیا مقصد تھا؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مشقت میں نہ پڑے۔

باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان سے متعدد طرق سے مروی ہے جسے جابر بن زید سعید بن جبیر عبداللہ بن شفیق العقیلی ...... اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے علاوہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا تو وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر پہنچ گیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتی ہیں اور یہ حنش ابوعلی الرحبی ہیں اور ان کا نام حنش بن قیس ہیں اور یہ محدثین کے یہاں ضعیف راوی ہے امام احمد اور ان کے علاوہ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور اہل علم کا (ان کے ضعف کے باوجود) اسی پر عمل ہے کہ وہ سفر یا عرفہ کے دن علاوہ جمع بین الصلوٰتین کو جائز نہیں سمجھتے اور اہل علم تابعین نے مریض کیلئے جمع بین الصلوٰتین کی رخصت دی ہے اور یہی قول امام احمد اور اسحٰق رحمہما اللہ کا ہے اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ وہ بارش کے وقت میں جمع بین الصلوٰتین کرے گا اور یہ امام شافعی، احمد، اور اسحٰق کا قول ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ مریض کو جمع بین الصلوٰتین کی اجازت نہیں دیتے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب پر کسی امام کا عمل نہیں: (جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء بالمدینۃ من غیر خوف ولا مطر الحدیث) اس حدیث باب کے متعلق محدثین اور فقہاء کے اقوال مضطرب ہیں اور علماء کرام اس حدیث کے معنی میں حیران و پریشان ہیں یہاں تک کہ خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مشہور ائمہ میں سے کسی کا بھی اس پر عمل[1] نہیں۔

حدیثِ باب کی توجیہات: اس حدیث کے معنی مرادی میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام اعظم قدوۃ العلماء الاعلام سند الفقہاء والمحدثین رأس الجہابذہ العلماء والمتکلمین الامام الاعظم الکوفی نور اللہ ضریحۃ فرماتے ہیں کہ حدیث باب میں جمع سے مراد جمع صوری ہے نہ کہ حقیقی[2]۔ کیونکہ حدیث باب میں

---

[1] اوجز میں فتح الباری سے نقل کیا گیا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت نے حدیث باب کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مقیم ہونے کی حالت میں بھی ضرورت کی بناء پر جمع بین الصلوٰتین جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کو اپنی عادت نہ بنائے۔ ابن سیرین ربیعہ، اشہب، ابن المنذر، القفال الکبیر کا یہی مذہب ہے۔

[2] یہ توجیہ بالکل صحیح ہے اور اسی کو حافظ نے فتح الباری میں عینی نے بنایہ میں، شوکانی نے نیل الاوطار میں، حضرت سہارنپوری نے بذل المجہود میں، ابی نے اکمال شرح مسلم میں نقل کیا ہے حافظ فرماتے ہیں کہ قرطبی نے اس توجیہ کو سب سے بہترین توجیہ قرار دیا ہے۔ امام الحرمین ابن الماجشون اور طحاوی نے اسی کو ترجیح دی ہے تفصیل کیلئے اوجز ملاحظہ ہو۔

جمع کے متعلق تین احتمالات ہیں:۱۔ یہ دونوں نمازیں ظہر کے وقت میں پڑھے۔ ۲۔عصر کے وقت میں پڑھے۔
۳۔اس طرح جمع کرے کہ ہر ایک نماز اس کے وقت میں ہو۔یہی تیسرا معنی یہاں مراد ہے اور اس کی نظیر ہم بیان کر چکے ہیں کہ علاء بن عبدالرحمٰن ظہر آخر وقت میں پڑھ کر گئے تھے اور انس رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بصرہ میں عصر اول وقت میں پڑھ رہے تھے۔اس طرح احادیث میں نہ کوئی تعارض ہوگا اور نہ ہی حدیث کی کوئی تاویل کرنی پڑے گی۔

حدیث من جمع بین الصلاتین من غیر عذر الخ، مجتہدین کے تعامل سے موید ہے: دوسرے محدثین نے حدیث باب کو دوسری حدیث "من جمع بین الصلوٰتین من غیر عذر الخ" کے معارض سمجھا ہے۔
دوسری حدیث من جمع الخ اپنے ضعیف ہونے کے باوجود چونکہ مجتہدین کے عمل کے ساتھ موید ہے لہٰذا اس پہلی قوی حدیث کے معارض بن سکتی ہے۔[1]

بَابُ مَاجَاءَ فِیْ بَدْءِ الْاَذَانِ

باب ہے اذان کی ابتداء کے بارے میں

☆حدثنا سعید بن یحیی بن سعید الاموی حَدَّثَنَا ابی حَدَّثَنَا محمد بن اسحق عن محمد بن ابراھیم بن الحرث التیمی عن محمد بن عبد اللّٰہ بن زید عن ابیہ قال: لَمَّا اَصْبَحْنَا اَتَیْنَا رسول اللّٰہ ﷺ،

---

[1] **جمع بین الصلوٰتین کی علت میں ائمہ کا اختلاف:** اسی وجہ سے علماء نے حدیث باب کی تاویل کی ہے (کیونکہ اس حدیث ضعیف کو حدیث باب کے معارض سمجھا ہے اگر اس ضعیف حدیث کو اس کا معارض نہ سمجھتے تو حدیث باب کی تاویل کی کیا ضرورت پڑی)۔
۱۔امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں یہ تاویل کی ہے کہ یہ جمع بین الصلوٰتین بارش کیوجہ سے تھا۔محدثین کی ایک جماعت نے بھی یہی تاویل کی ہے لیکن بعض روایات میں من غیر مطر کی تصریح نے اس تاویل کو ضعیف قرار دیدیا۔
۲۔یہ جمع بین الصلوٰتین بیماری کے سبب تھا۔امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو سب سے بہتر تاویل قرار دی ہے۔سیوطی رحمہ اللہ کے بقول علامہ سبکی، بلقینی اور اسنوی نے اس توجیہ کو اختیار کیا ہے اور یہی توجیہ سیوطی رحمہ اللہ کو بھی پسند ہے۔انتہی
۳۔اس دن ابر (بادل) تھے جب ابر چھٹے تو معلوم ہوا کہ ظہر کی نماز تو عصر کے وقت میں پڑھی گئی۔
۴۔یہ فی المدینہ کا لفظ حدیث میں صحیح نہیں بلکہ حدیث میں فی سفر سافرھا کے الفاظ صحیح ہیں تو یہ سفر کا واقعہ ہے کیونکہ اکثر راویوں نے یہی ذکر کیا ہے تفصیل کیلئے اوجز ملاحظہ کیجئے۔

فَـاَخۡبَـرۡتُهٗ بالرُّؤيَا، فقال: اِنَّ هٰذِهٖ لَرُؤيَاحَقٌّ، فَقُمۡ مَعَ بلالٍ، فِاِنَّهٗ اَنۡدَی وَاَمَدُّ صَوتاًمِنۡكَ ، فَاَلۡقِ علیه ماقِیلَ لك، وَلۡیُنَـادِ بِـذٰلِكَ ، قال:فلمّا سمعَ عمر بن الخطاب نِدَاءَ بلالٍ بالصلاۃ خَرَجَ اِلی رسولِ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم ، وهو یَجُرُّ اِزَارَهٗ ، وهو یقول: یَارَسُولَ اللّٰهِ، والذی بَعثك بالحقِّ، لقد رایتُ مِثلَ الذی قال...... قال: فقال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم: فَلِلّٰهِ الحمدُ، فذٰلك اَثۡبَتُ

قال: وفی الباب عن ابن عمر۔

قـال ابـو عیسی: حدیثُ عبد اللّٰه بن زید حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔وقدرَوَی هذا الحدیث ابراهیم بـنُ سـعـدعـن مـحـمـد بـن اسحق اَتَمَّ من هذا الحدیث واطول ، وذَکَرَفیه قصة الاذان مَثۡنَی مَثۡنَی وَالاقـامَةِ مَـرَّۃًمرۃً وعبد اللّٰهِ بن زید هو ابن عبد ربه ویقال ابن عبد رب ولا نَعۡرِفُ له عن النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم شیئاً یَصِحُّ اِلّا هذا الحَدِیثُ الۡوَاحِدُ فِی الۡاَذَانِ۔

وعبد اللّٰه بن زید بن عاصم المازنی له احادیث عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم وهو عَمُّ عَبَّادِبن تـمیم۔

☆حدثنا ابوبکر بن النضر بن ابی النضر حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بنُ محمد قال: قال ابن جُرَیۡجٍ: اخبرنا نافعٌ عن ابـن عُـمَرَ قال: کان المسلمون حین قَدِمُوا المدینةَ یَجۡتَمِعُونَ فَیَتَحَیَّنُونَ الصَّلَوٰاتِ وَلَیۡسَ یُنادِی بِهَا اَحَدٌ ، فَتکلَّمُوا یوماًفی ذٰلك، فقال بعضهم:اِتَّخِذُوا نَاقُوساً مثلَ ناقوس النصارَی ، وقال بعضهم:اِتَّخِذُوا قَرۡناً مثلَ قَـرۡنِ الیهـودِ ، قـال فَـقَـالَ عُـمَـرُ:اَوَلَا تَبۡعَثُوۡنَ رَجُلاً یُنَادِی بِالصَّلوٰۃِ؟فقال رسول اللهﷺ یابَلَالُ ، قُمۡ فَنَادِ بِالصَّلاۃِ۔قال ابو عیسی:هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، غریبٌ من حدیث ابن عمر۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے صبح کی تو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خواب بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بے شک یہ خواب برحق ہے سو بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ اسلئے کہ وہ تم سے زیادہ بلند اور گونج دار آواز والے ہیں اور تم ان کو وہ کلمات بتلائے جاؤ جو تمہیں بتائے گئے ہیں اور انہیں چاہیئے کہ وہ ان کلمات کے ذریعے پکار لگائیں اور (راوی) کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کی نماز کے لئے دی جانے والی پکار (اذان) سنی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اس حال میں کہ وہ اپنا تہہ بند

گھسیٹ رہے تھے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے جس طرح بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا الحمد للہ! یہ خواب بکثرت صحابہؓ کا دیکھنا میرے اطمینان قلبی کا باعث ہے۔

باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن زید کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس حدیث کو ابراہیم بن سعد نے محمد بن اسحٰق کی سند سے مذکورہ حدیث سے زیادہ مکمل اور زیادہ طویل کیا ہے اور اس میں قصہ ذکر کیا ہے کہ اذان دو دو مرتبہ ہے اور اقامت ایک ایک مرتبہ ہے اور عبداللہ بن زید، عبدربہ کے بیٹے ہیں اور انہیں ابن عبدرب کہا گیا ہے اور ہم ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کردہ کوئی حدیث صحیح نہیں پہچانتے سوائے اس ایک حدیث کے جو اذان کے بارے میں ہے اور عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث ہیں اور وہ عباد بن تمیم کے چچا ہیں۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مدینے منورہ آئے تو وہ نمازوں کیلئے جمع ہوتے تھے پس نمازوں کے اوقات کا اندازہ کرتے تھے اور اس وقت نماز کیلئے بلانے والا کوئی شخص نہ تھا سو ایک دن انہوں نے اس بارے میں مشورہ کیا تو بعض لوگوں نے کہا کہ نصاریٰ کے ناقوس کی طرح ناقوس (نقارہ) بجایا جائے اور بعض نے یہ رائے دی کہ یہود کی طرح بگل بجایا جائے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ تم کیوں ایک شخص کو نہیں بھیجتے جو نماز کیلئے بلایا کرے (الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر)۔ راوی کہتے ہیں کہ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے بلال! کھڑے ہو جاؤ اور نماز کیلئے بلاؤ۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقابلے میں حسن صحیح غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ لما اصبحنا) یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ مصنف نے اس حدیث کو اختصاراً ذکر نہیں کیا۔[1]

---

[1] ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس روایت کو مکمل ذکر کیا ہے اور اس کے مختلف طرق پر بھی اشارہ کیا ہے۔ (اضافہ از مترجم: چنانچہ ابوداؤد باب بدء الاذان میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کے متعلق کہ لوگوں کو نماز کیلئے کیسے جمع کیا جائے مشورہ کیا کسی نے مشورہ دیا کہ نماز کے وقت نیزہ گاڑ دیا جائے جب اس نیزے کو دیکھیں گے تو ایک دوسرے کو نماز کی اطلاع دیدیں گے اور بعضوں نے یہود کی طرح باجا بجانے کا مشورہ دیا اور بعض لوگوں نے نصاریٰ کی طرح ناقوس کا مشورہ دیا بالآخر مجلس برخاست ہوئی پھر عبداللہ بن زید کو خواب میں اذان دکھائی گئی اور انہوں نے آکر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خواب بیان کیا۔ الی آخر ما قال

(فانه اندیٰ و امد صوتا منك) اس علت سے اشارہ ہے کہ جوشخص کسی بھلائی کیطرف رہنمائی کرتا ہوتو وہی اسکا زیادہ حق دار ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مؤذن کو بلند آواز ہونا مستحب اور پسندیدہ فعل ہے۔

صحابہ کے کثیر افراد کا خواب دیکھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجمعی کا باعث ہے: (فذالك اثبت) جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ سچا خواب میرے بہت سے امتیوں نے دیکھا ہے[1] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ان خوابوں کے توافق نے میرے دل کو مضبوط کر دیا ہے یہ مطلب نہیں کہ اے عمر! تمہارے خواب نے میرے دل کو تقویت بخشی ہے۔

صحابہ کے خواب سے اذان مشروع نہیں کی گئی بلکہ وحی غیر متلو کے ذریعہ اذان کا حکم نافذ کیا گیا: کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دینے کا حکم صحابہ کے خواب کی وجہ سے نہیں صادر فرمایا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اذان کی صفت وحی کی گئی اور ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اذان کے متعلق وحی بیان بھی نہیں فرمائی تھی کہ عبداللہ بن زید

---

[1] **نبی کا خواب وحی ہوتا ہے امتیوں کے خواب سے حکمِ شرعی ثابت نہیں ہوتا:** ابن العربیؒ فرماتے ہیں انبیاء کا خواب برحق ہوتا ہے اور وہ دین کے شرعی احکام کے مثل ہوتا ہے (اس سے شرعی احکام ثابت ہوسکتے ہیں) لیکن انبیاء کے علاوہ امتیوں کا خواب حجتِ شرعیہ نہیں ہے البتہ یہاں پر صحابہ کرام کے خواب سے شرعی حکم اس لئے ثابت ہورہا ہے اور یہ خواب دین کا جزء اسلئے بن گیا کہ اولاً تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی گئی کہ اس خواب کو شرعی حکم قرار دیں تو آپنے وحی کی وجہ سے اس کو شرعی حکم قرار دیا، ثانیاً اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جیسی اذان کو نماز میں جمع کرنے کیلئے پسند فرماتے تھے اور اس پر عمل چاہتے تھے تو آپ نے اس پر عمل کرنے کا حکم اپنی طرف سے جاری فرمایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں اس کی تائید فرمادیں یا اس سے منع فرمادیں یہ دوسری توجیہ ان علماء کے مذہب کے مطابق ہے جنکے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اجتہاد کی گنجائش تھی اور ان کے نزدیک یہ مسئلۃ الاذان، مسائل قیاسیہ میں سے ہے۔ ثالثاً اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غور فرمایا کہ اذان کے یہ کلمات ایک خاص طرز وترتیب دیئے ہوئے ہیں شیطان اسطرح کا مضمون نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی یہ شیطانی وساوس اور غلط خیالات کے قبیل سے ہیں۔ رابعاً اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات اذان سنائی گئی تھی جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا لیکن جب آپ پر شب معراج میں نمازیں فرض کی گئیں اس وقت اذان نہیں دی گئی یہاں تک کہ نماز باجماعت کے اوقات مدینہ منورہ میں مقرر کئے گئے تو اس وقت اذان مشروع ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا فذالك اثبت یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرا اور تیسرا احتمال راجح ہے۔ انتہی

نے اپنا خواب (اذان والا) بیان کردیا[1]۔ (بہرحال اذان وحی خفی کے ساتھ مشروع ہوئی اور صحابہ کے خواب کے توافق سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید اطمینان قلبی حاصل ہوا۔ چنانچہ محشی نے لکھا ہے کہ چودہ صحابہ کرام نے خواب میں اذان سنی تھی: از مترجم)۔

(فَيَتَحَيَّنُوْنَ) یعنی صحابہ اپنے اندازے سے نمازوں کے اوقات مقرر کرتے تھے[2]۔

نداء سے نداءِ معروف مراد ہے یا نداءِ لغوی: (اَوَلَا تَبْعَثُوْنَ رَجُلاً يُنَادِي بِالصَّلٰوةِ) اس سے مراد اذانِ معروف کا حکم دینا نہیں بلکہ[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ الصلوٰۃ الصلوٰۃ یا الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر نماز کا اعلان کرنے کیلئے ایک شخص بھیجا جائے۔ (از مترجم: حافظ ابن حجرؒ کی یہی رائے ہیکہ یہاں حدیث میں نداء سے مراد اذان معروف نہیں ہے۔ اسی قول کو حضرت گنگوہی اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ نے اختیار کیا ہے چنانچہ معارف السنن

---

[1] اس توجیہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قوت المغتذی میں ابوداؤد کی مراسیل سے نقل کیا گیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب خواب میں اذان سنی تو آپ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ یہ خواب سنائیں لیکن اس سے پہلے وحی اتر چکی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے ہوئے دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہارے آنے سے پہلے مجھ پر وحی اتر چکی ہے (جس میں اذان کی تفصیلی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ از مترجم) انتہی

[2] یعنی صحابہ اپنے اندازے سے نماز کا وقت مقرر کرتے تاکہ جماعت میں شریک ہوسکیں کیونکہ نماز کیلئے کوئی اذان وغیرہ نہیں دی جاتی تھی۔ حدیث میں لیس يُنَادیٰ بفتح الدال ہے۔ انتہی

[3] حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنی تقریر بخاری لامع الدراری میں دونوں احتمال ذکر فرمائے ہیں میں نے اس کے حاشیہ میں اس مسئلہ کے متعلق سلف کے اقوال مفصلاً ذکر کردیئے ہیں۔ (از مترجم: لامع الدرادی ص ۹۹، ج ۳ پر لکھا ہے کہ یہاں پر اگر نداء سے مراد نداءِ اصطلاحی ہو تو اس صورت میں حدیثِ باب کے درمیان میں اختصار واقع ہوا ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر نداء معروف کا فیصلہ نہیں ہوا تھا تو یہاں حدیث کا درمیانی حصہ محذوف ہے۔ چنانچہ لامع کے حاشیہ میں حضرت شیخ نے علامہ قرطبی سے نقل کیا ہے کہ قال او لا تبعثون رجلا ینادی کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب کے مطابق اذان شرعی دینے کی تجویز دی، اس صورت میں تقدیری عبارت ہوگی فافترقوا فرأى عبدالله بن زيد فجاء الى النبى صلى الله عليه و سلم فقص عليه فقال عمر رضى الله عنه الخ ۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ نداء سے مراد الصلوٰۃ جامعۃ کے ذریعہ پکارنا ہے۔ حافظ نے قاضی عیاض سے اسی قول کو نقل کیا ہے۔ حاشیہ لامع ج ۳: ص ۱۰۰)

میں نقل کیا ہے کہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شبِ معراج کی صبح والے واقعہ میں ظہر کی نماز کیلئے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر بلایا گیا تو یہ اذان لغوی ہوئی اس کے برعکس علامہ عینیؒ نے اس اذان سے اذان شرعی مراد لی ہے۔ انکے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مشورے کے بعد لوگ سو گئے پھر عبداللہ بن زید نے خواب میں اذان کہتے ہوئے سنی اس کے بعد پھر مشورہ ہوا تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوٰۃ فرمایا کہ اس خواب کے مطابق اذان شرعی کہلوائیں الخ، اس صورت میں عبارت میں یہ کلام محذوف نکالنا پڑتا ہے جو کہ خلافِ ظاہر ہے۔ معارف السنن ج ۲: ص ۱۷۲)۔

باب ماجاء فی الترجیع فی الاذان

باب ہے اذان میں ترجیع کے بیان میں

☆حدثنا بِشْرُ بنُ مُعَاذٍ البصریُّ حَدَّثَنَا ابراهیم بنُ عبد العزیز بن عبد الملك بن ابی مَحْذُورَةَ قال: اخبرنی ابی وجَدِّی جمیعاً عن ابی مَحْذُورَةَ: اَنَّ رسولَ اللّٰه صلَّی اللّٰه علیه وسلم اَقْعَدَهُ والقی علیه الاذان حرفاً حرفاً، قال ابراهیمُ: مِثْلَ اَذَانِنَا، قال بشْرٌ: فقلت له: اَعِدْعَلَیَّ، فَوَصَفَ الاذانَ بالتَّرْجِیعِ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی مَحْذُورَةَ فی الاذانِ حدیثٌ صحیحٌ، وقد رُوِیَ عنه من غیر وجهٍ۔ وعلیه العملُ بمکة وهو قولُ الشافعیِّ۔

☆حدثنا ابوموسی محمد بن المثنی حَدَّثَنَا عفان حَدَّثَنَا همام عن عامر بن عبد الواحد الاحول عن مکحول عن عبد اللّٰه بن محیریز عن ابی محذورة عن النبیﷺ ان النبیﷺ عَلَّمَهُ الْاَذَانَ تِسْعَ عَشْرَةَ کَلِمَةً وَالْاِ قَامَةَ سَبْعَ عَشْرَةَ کَلِمَةً۔

قال ابو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔ وابو مَحْذُورَةَ اسمه سَمُرَةُ بنُ مِعْیَرٍ۔ وقد ذَهب بعضُ اهل العلم الی هذا فی الاذان۔ وقد رُوِیَ عن ابی محذورة: انه کان یُفْرِدُ الاقامة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بٹھایا اور ان کو اذان کا ایک ایک کلمہ کہوایا۔ ابراہیم راوی فرماتے ہیں کہ ہماری اذان کے مثل (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمات کہلوائے)۔

بشر فرماتے ہیں تو میں نے ان سے کہا کہ اذان کہہ کر مجھے سنایئے۔ پس انہوں نے اذان کو ترجیع کے ساتھ سنایا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اذان کے بارے میں صحیح حدیث ہے اوران سے متعدد اسانید سے مروی ہے اور مکہ میں اسی پر عمل ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

☆ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات سکھائے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اورابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا نام سمرہ بن معیر ہے اور بعض اہل علم نے اذان کے بارے میں اسی حدیث کولیا ہے اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ اقامت ایک ایک مرتبہ کہا کرتے تھے۔

﴿تشریح﴾

ترجیع کہنے کے متعلق مشہور واقعہ: اس ترجیع[1] کی وجہ ابن ماجہ اورنسائی کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ پڑاوٗ ڈال کراذان دینے کا حکم فرمایا جب اس بستی کے بچوں نے موذن کودیکھا تو انہوں نے بھی اذان کی نقل

---

[1] **اذان میں ترجیع ہوگی یا نہیں؟:** ائمہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے امام مالک، شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اذان میں ترجیع سنت ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ان کے تلامذہ اورامام احمدؒ کے نزدیک یہ ترجیع سنت نہیں۔ محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک اس کواختیار ہے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ امام احمدؒ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اورعبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی اذان کواختیار کیا ہے جس میں پندرہ کلمات ہیں اوراس میں ترجیع نہیں ہے۔ امام ثوری، اسحاق رحمہما اللہ نے بھی اسی قول کواختیار کیا ہے۔ اسی قول کواختیار کرنا اولیٰ بھی ہے کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ کے سفر وحضر کے دائمی موذن تھے وہ اسی طرح بلاترجیع کے اذان دیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذانِ ابی محذورہ رضی اللہ عنہ کے بعد بھی (اسی طرح بلاترجیع کے اذان کہنے پر برقرار رکھا) کذا فی الاوجز وبسط فیہ الدلائل

مذہبِ حنفی کی وجوہِ ترجیحات: ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمارے مذہب کی ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ عبداللہ بن زید کی حدیث، باب الاذان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اوراس میں ترجیع کا ذکرنہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ اذان میں ترجیع مسنون نہیں۔

قلت: اسی طرح بلال رضی اللہ عنہ کی اذان میں بھی ترجیع نہیں ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور ...

اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے تک اذان دیتے رہے اوریہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ تو رئیس المؤ... (اگلے صفحہ پر)

اتارنی شروع کردی اور اللہ اکبر اللہ اکبر کہنے لگے جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) محدثین کا اتفاق ہے کہ ان کی اذان میں ترجیع کا ثبوت نہیں اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ابن جوزی وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔اس کی پوری تفصیل اوجز میں مذکور ہے۔

اقامت مثنیٰ مثنیٰ ہوگی یا فرادیٰ فرادیٰ۔تنبیہ: اس تقریر میں اقامت کے مسئلے میں کلام ذکر نہیں۔مولانا رضی الحسن کی تقریر اردو میں اس طرح ہے جس کی عربی یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اقامت کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔حنفیہ نے اقامت مثنیٰ مثنیٰ والی روایت کو ترجیح دی ہے۔انتہی

قلت: اس مسئلے کی وضاحت اس طرح ہے کہ ائمہ ثلثہ کے نزدیک اقامت فرادیٰ فرادیٰ ہوگی سوائے اول وآخر کی تکبیر کے کہ وہ مثنیٰ مثنیٰ ہوگی اس طرح قد قامت الصلوٰۃ بھی مثنیٰ مثنیٰ ہوگی۔لیکن مالکیہ کے مشہور قول میں قد قامت الصلوٰۃ ایک بار ہوگی اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم ہے۔اور امام ابوحنیفہ،سفیان ثوری،ابن مبارک اور اہل کوفہ کے نزدیک اقامت کے الفاظ اذان کی طرح ہیں اس میں قد قامت الصلوٰۃ کا دومرتبہ اضافہ بھی ہے۔کذا فی البذل

حنفیہ کے دلائل: حنفیہ کے مذہب پر بہت ساری احادیث دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ان دلائل میں سے ایک دلیل عبداللہ بن زید سے مروی ہے کہ خواب میں فرشتہ نے اذان کی طرح اقامت بھی سکھلائی تھی۔

دوسری دلیل امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ سے تواتر کے ساتھ مروی ہے کہ وہ تاحیات اقامت مثنیٰ مثنیٰ کہتے رہے۔

تیسری دلیل ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی مفصل روایات میں سے اکثر روایات دلالت کرتی ہیں کہ اقامت مثنیٰ مثنیٰ ہوگی اسکے علاوہ اور بہت سے دلائل ہیں چنانچہ جب بہت سی روایات میں الاقامۃ مثنیٰ مثنیٰ کا ثبوت ہے۔تو بلال رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جس میں اقامت کے فرادیٰ ہونے کا ذکر ہے اس روایت کی توجیہ کی ضرورت نہیں پڑھتی لیکن پھر بھی بذل میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی توجیہات ذکر کی گئی ہیں۔

میرے نزدیک اُمِرَ بِلَالٌ ان یشفع الاذان ویوتر الاقامۃ الخ کی سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ یہ دونوں جملہ قضیہ مہملہ ہیں اور قضیہ مہملہ جزئی کی حیثیت رکھتا ہے (نہ کہ کلی کی۔ازمترجم) لہٰذا حدیث میں اذان سے مراد خاص صبح کی اذان اور صبح (فجر) ہی کی اقامت ہے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اپنی فجر کی اذان کو ابن ام مکتوم کی اذان کے ساتھ ملا کر شفع کریں اور اقامت صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہیں۔(اس میں شفع نہیں کہ ابن ام مکتوم بھی اقامت کہیں ایسا نہیں ہے۔ازمترجم) اس توجیہ کے سوا الا الاقامۃ کا استثنیٰ بعض راویوں کی طرف سے مدرج ہے جیسا کہ مالکیہ بھی مدرج ہونے کی توجیہ کرتے ہیں اور اگر یہ تسلیم کیا جائے ہمارے نزدیک بھی اقامت فرادی فرادی جائز ہے۔ازمترجم) جیسا کہ حاشیہ میں مواہب الرحمن سے نقل کیا ہے۔

بچوں کو بلوایا چنانچہ وہ حاضر کئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کس کی آوز سب سے زیادہ بلند اور سب سے اچھی اور دور تک پہنچنے والی ہے تو ان بچوں نے کہا کہ ان ابومحذورہ کی آواز سب سے بلند اور اچھی ہے۔ اور واقع میں بات بھی یہی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله اکبر چار دفعہ کہو۔ انہوں نے اسی طرح کہا اور بلند آواز سے یہ کلمات کہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو فرمایا کہ اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله کہو! تو انہوں نے یہ کلمات کہے لیکن چونکہ یہ کلمات انکی قوم کے عقائد اور ان کے اپنے عقیدہ کے خلاف تھے اس لئے انہوں نے آہستہ آواز سے یہ کلمات کہے۔ اسلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا کہ اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله بلند آواز سے کہو! اس دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات بلند آواز سے ادا فرمائے۔ تو ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے بھی بلند آواز سے شہادتین کا اعادہ فرمایا اس طرح ان کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا تو ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اسی طرح اذان دیتے رہے۔ جبکہ حقیقت میں اس شہادتین کے تکرار سے مقصود انکی تعلیم تھی (کیونکہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے تو اسلام کو دل میں راسخ کرنے کیلئے شہادتین کو مکرر بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ از مترجم) لیکن ابومحذورہ رضی اللہ سمجھے کہ اذان میں شہادتین کا تکرار ہوتا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِيْ اِفْرَادِ الْاِقَامَةِ

باب ہے اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہنے کے بارے میں

☆حدثنا قُتَيْبَةُ حَدَّثَنَا عبد الوهاب الثقفی ویزید بن زریع عن خالدِ الحذّاءِ عن ابی قِلَابَةَ عن انس بن مالك قال: أُمِرَ بِلَالٌ اَن يَشْفَعَ الاذانَ ويُوتِرَ الاقامةَ۔

وفی الباب عن ابن عمر۔ قال ابو عیسی: وحدیثُ انسٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ

وهو قول بعضِ اهلِ العلم من اصحاب النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم والتابعین۔ وبه یقول مالك، والشافعی، واحمد، واسحق۔

﴿ترجمه﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان جفت (دو مرتبہ) اور اقامت طاق (ایک مرتبہ) کہا کریں۔

باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے بعض اہل علم کا یہی قول ہے اور امام مالک، امام شافعی اور امام احمد واسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

باب ماجاء ان الاقامة مثنى مثنى

باب ہے اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہنے کے بیان میں

☆حدثنا ابو سعيد الاشج حَدَّثَنَا عقبة بن خالد عن ابن ابی لیلی عن عمرو بن مرة عن عبد الرحمن بن ابی لیلی عن عبد الله بن زيد قال: كان اذان رسول الله صلّى الله عليه وسلم شَفْعاً شَفْعاً: فِی الْاَذَانِ وَالْإِقَامَةِ،

قال ابو عيسى: حديث عبد الله بن زيد رواه وكيع عن الاعمش عن عمرو بن مرة عن عبد الرحمن بن ابی لیلی قال: حَدَّثَنَا اصحابُ مُحَمَّدٍ ﷺ ان عبد الله بن زيد رَأَى الْاَذَانَ فِي الْمَنَامِ۔

وقال شعبة عن عمرو بن مرة عن عبد الرحمن بن ابی لیلی:ان عبد الله بن زيد راى الاذان فی المنام۔وهذا اصحُّ من حديث ابنِ ابی لیلی۔وعبد الرحمن بن ابی لیلی لم يسمع من عبد الله بن زيد

وقال: بعضُ اهل العلم: الاذان مثنى مثنى، والا قامة مثنى مثنى، وبه يقول سفيان الثوری ، وابن المبارك واهل الكوفةِ قال ابو عيسى: ابن ابی لیلی هو محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلی كان قاضی الكوفة، ولم يسمع من ابيه شيئاً الا انه يروی عن رجل عن ابيه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذان میں کلمات دو دو مرتبہ ہوتے تھے اذان میں بھی اقامت میں بھی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زید کی حدیث کو وکیع نے اعمش سے روایت کیا ہے انہوں نے عمرو بن مرہ سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے کہ عبداللہ بن زید نے خواب میں اذان دیکھی اور شعبہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن مرہ سے روایت ہے اور وہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

نے ان سے بیان کیا کہ عبداللہ بن زید نے خواب میں اذان دیکھی اور یہ ابن ابی لیلی کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلی نے عبداللہ بن زید سے سماع نہیں کیا۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ اذان دو دو مرتبہ ہے اور اقامت دو دو مرتبہ ہے اور اسی طرح سفیان ثوری اور ابن مبارک اور اہل کوفہ کا قول ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي التَّرَسُّلِ فِي الْاَذَانِ

باب ہے ٹھہر ٹھہر کر اذان دینے کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا احمد بن الحسن حَدَّثَنَا المعلی بن اسد حَدَّثَنَا عبد المنعم، هو صاحب السقاء قال: حَدَّثَنَا يحيى بن مسلم عن الحسن وعطاء عن جابر بن عبد الله ان رسول الله صلَّى الله عليه وسلم قال لبلال: يابلال، اذااَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ فى اذانك، واذااَقَمْتَ فاحدُر، وَاجعَلْ بَيْنَ اَذَانِكَ وَاِقَامَتِكَ قَدْرَ مايَفْرُغُ الآكِلُ من اكلِهِ، والشَّارِبُ من شُرْبِهِ، والمعْتَصِرُ إذا دَخَلَ لِقضاءِ حاجتِهِ۔ ولا تقوموا حتى تَرَوْنِي۔

☆حدثنا عَبْدُ بن حُمَيْدٍ حَدَّثَنَا يونس بن محمدٍ عن عبد المنعم نحوهَ

قال ابو عيسى: حديثُ جابرٍ هذا حديثٌ لانعرفه الا من هٰذاالوجه، من حديث عبد المنعم، وهو اسنادٌ مجهول۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے بلال! جب تم اذان دیا کرو تو اپنی اذان کے کلمات کو ٹھہر ٹھہر کر کہا کرو۔ اور جب اقامت کہا کرو تو جلدی جلدی کہا کرو اور اپنی اذان و اقامت کے درمیان اتنا فاصلہ رکھو کہ کھانہ کھانے والا کھانا کھا کر، اور پانی پینے والا پی کر اور قضائے حاجت کیلئے جانے والا قضائے حاجت سے فارغ ہو جائے۔ اور جب تک مجھے نہ دیکھو کھڑے نہ ہو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ کی جو یہ حدیث ہے ہم اس کو صرف اسی واسطے سے پہچانتے ہیں یعنی عبدالمنعم کی حدیث سے (یعنی عبدالمنعم سے پہلے اوپر وہی سند ہے) اور وہ سند مجہول ہے۔

باب ماجاء فی ادخال الاُصبُعِ فِی الْاُذُنِ عِنْدَ الاذان

باب ہے اذان دینے کے وقت کانوں میں انگلیاں دینے کا بیان

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا عبد الرزّاقِ اخبرنا سفیانُ الثّوریُّ عن عَوْنِ بن ابی جُحَیْفَةَ عن ابیه قال: رایتُ بلالاً یُؤَذِّنُ ویَدُورُ، ویُتبِعُ فاهُ هاهنا وهاهنا، وَاُصبَعَاهُ فی اُذُنَیْهِ ورسولُ اللّٰه صلّی اللّٰه علی وسلم فی قُبَّةٍلَهُ حَمرَاءَ اُرَاهُ قال: مِنْ اَدَمٍ،فخرجَ بلالٌ بین یدیهِ بِالْعَنَزَةِ فرَکَزَهَا بالبطْحاءِ فصَلّٰی الیها رسولُ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم یَمُرُّ بین یدیهِ الکلبُ والحمارُ وعلیه حُلّةٌحمراء کَاَنّی اَنظُرُ الی بَرِیقِ سَاقَیْهِ، قال سفیانُ: نُرَاهُ حِبرَةً۔

قال ابو عیسی: حدیثُ ابی جُحَیْفَةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

وعلیه العمل عند اهل العلم : یَسْتَحِبُّونَ ان یُدْخِلَ المؤذنُ اِصْبَعیه فی اذنیه فی الاذان۔

وقال بعض اهل العلم: وفی الاقامة ایضاً،یُدخِلُ اصْبَعیه فی اذنیه۔ وهو قولُ الاوزاعیّ۔

وابو جحیفة اسمه وهب بن عبد اللّٰه السوائی۔

﴿ترجمه﴾

عون بن ابی جحیفہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے بلال کو دیکھا کہ وہ اذان دے رہے ہیں اور گھوم رہے ہیں، چکر لگا رہے ہیں اور اپنا چہرہ دائیں اور بائیں گھما رہے ہیں اور اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے میں تشریف فرما تھے جو سرخ تھا۔

وہ (سفیان ثوری) فرماتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ انہوں نے (استاذ) نے (مِنْ اُدُمٍ) وہ خیمہ سرخ چمڑے کا تھا فرمایا تھا (پھر بلال رضی اللہ عنہ خیمے میں چلے گئے) تھوڑی دیر کے بعد نیزہ ہاتھ میں لیئے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے آگے نکلے انہوں نے وہ نیزہ بطحاء نامی میدان میں گاڑا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سے کتا اور گدھا گزر رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کیئے ہوئے تھے گویا کہ میں اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیوں کی چمک دیکھ رہا ہوں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوڑا) حبری یمنی دھاری دار جوڑا تھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو جحیفہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کا عمل اسی پر ہے وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ موذن اذان دیتے ہوئے انگلیوں کو کانوں میں ڈالے اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ اقامت میں بھی انگلیاں کانوں میں ڈالے اور یہ قول امام اوزاعی اور ابو جحیفہ کا ہے اور ابو جحیفہ کا نام وہب السوائی ہے۔

«تشریح»

اذان میں حیعلتین میں تحویل کی کیفیت: (یدور ویتبع فاہ ھھنا ھھنا) یتبع فاہ سے یدور کے لفظ کا بیان ہے مطلب یہ ہے کہ اذان میں حیعلتین کے وقت اپنی گردن کو دائیں اور بائیں طرف پھیرنا سنت ہے (سینہ قبلے سے نہ پھرنے پائے۔ از مترجم) اگر مینارہ کشادہ نہ ہو تو اپنی جگہ سے چل کر جانے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف دائیں اور بائیں طرف سر پھیر لینا کافی ہے اور اگر مینارہ کشادہ ہے کہ کھڑے کھڑے دائیں اور بائیں چہرہ نکالنا ممکن نہ ہو تو موذن کیلئے جائز ہے کہ وہ چل کر دائیں اور بائیں جانب اپنا چہرہ نکال کر حیعلتین کہے اسطرح اگر مینارہ اس طرح بنا ہوا ہو کہ چاروں طرف سے دیواروں نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے اور مینارہ سے آواز اسی وقت نکلے گی جبکہ اس کے سوراخ سے چہرے کو نکالا جائے تو ایسے آدمی کیلئے اذان میں اپنے چہرے اور جسم کو پھیرنا[۲] جائز ہے اس صورت میں قبلہ سے سینہ پھر جائے گا لیکن ضرورت کی وجہ سے اس کو معاف قرار دیا گیا کیونکہ اس کے بغیر اذان کا کوئی فائدہ نہیں۔ میناروں میں اذان کی ضرورت جب پڑتی ہے جبکہ انتہائی شدید گرمی یا انتہائی سردی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

(اصبعاہ فی اذنیہ) بعض علماء[۳] کے نزدیک اقامت میں بھی اپنی انگلیاں کانوں میں رکھنی چاہئیں۔ راجح قول یہ ہے کہ اگر نمازی زیادہ ہوں تو آواز پہنچانے کی غرض سے اقامت میں انگلیاں کانوں میں رکھی جاسکتی ہیں۔

مردوں کیلئے سرخ جوڑا پہننے کا شرعی حکم: (وعلیہ حلۃ حمراء قال سفیان نراہ حِبَرَۃً) حدیث باب سے معلوم ہو رہا ہے کہ

---

[۱] ابو الطیب فرماتے ہیں لفظ یتبع باب افعال کا صیغہ ضبط کیا گیا ہے اس میں فاعل کی ضمیر بلال رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے اور فاہ اس کا مفعول ہے اور ہٰہنا اس کا ظرف ہے۔

[۲] بحر الرائق میں لکھا ہے کہ اگر سینہ قبلہ سے پھیرے بغیر صرف چہرے کو دائیں بائیں پھیرنے سے آواز نہ پہنچتی ہو تو اس کیلئے جائز ہے کہ مینارہ میں گھومے (تاکہ آواز باہر پہنچ جائے۔ از مترجم)

[۳] امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام اوزاعی کا یہی مذہب نقل کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرخ جوڑا پہنے ہوئے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کیلئے سرخ کپڑا پہننے کو ممنوع قرار دیا ہے اسلئے حدیث باب کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں:

ا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سرخ جوڑا پہننا نسخ سے پہلے کا واقعہ ہے بعد میں آپ نے سرخ جوڑا پہننے کو منع فرما دیا۔ لیکن یہ جواب بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث باب کا واقعہ حجۃ الوداع کا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد بہت کم عرصہ حیات رہے تو پھر اسکے بعد کونسا نسخ آئیگا۔

۲۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ یہ جواب دے رہے ہیں کہ سرخ جوڑے سے مراد یہ ہے کہ اس کپڑے میں سفید و سیاہ، سرخ اور زرد لکیریں اور نقوش تھے لیکن سرخ لکیریں غالب تھیں تو جس طرح ایک کپڑے پر سیاہی غالب ہو تو اس کو اسود کہہ دیا جاتا ہے تو یہاں پر بھی چونکہ سرخی غالب تھی اس لئے اس کو حمراء کہا گیا۔

حبرۃ وہی جوڑا ہوتا ہے جس پر سرخی غالب ہو کیونکہ وہ کپڑے کی ایک خاص قسم ہے جس پر مختلف (دھاریاں) نشانات لگے ہوتے ہیں اور جو وصف غالب ہوتا ہے اس کے اعتبار سے اس کی صفت لائی جاتی ہے۔ چونکہ اس جوڑے میں سرخی غالب تھی اس لئے اسکو حمراء کہا گیا۔

سرخ اور زرد جوڑے پہننے کے متعلق حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ کپڑا جس کو زعفرانی رنگ یا زرد رنگ میں رنگا گیا ہو اس کا پہننا مردوں کیلئے مطلقاً منع ہے لیکن اگر کپڑا سرخ یا زرد دھاگوں سے بنا گیا ہو اور مکمل سرخ یا زرد ہو تو یہ منع نہیں ہے، فتویٰ کی رو سے ایسے کپڑے کا پہننا جائز ہے تقویٰ یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کرے[1]۔ واللہ اعلم بالصواب

---

[1] درمختار میں ہے کہ مردوں کیلئے زعفرانی رنگ میں رنگا ہوا کپڑا اور زرد رنگ میں رنگا ہوا کپڑا چاہے سرخ ہو یا زرد بہر صورت یہ کپڑا پہننا منع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کیلئے یہ کراہت نہیں ہے اسی طرح مردوں کیلئے ان رنگوں کے علاوہ دوسرے رنگ کے کپڑے پہننا جائز ہے۔

شرح نقایہ وغیرہ میں ہے کہ سرخ کپڑا پہننے میں کوئی حرج نہیں اس میں لفظ لاباس دلالت کر رہا ہے کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

تحفہ میں لکھا ہے کہ سرخ کپڑا پہننا حرام ہے معلوم ہوا کہ حدیث میں ممانعت تحریم کیلئے ہے کیونکہ مطلق نہی سے حرمت مراد لی جاتی ہے۔ علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں آٹھ قول ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ سرخ جوڑا پہننا مستحب ہے۔ انتہی

باب ماجاء فی التثویب فی الفجر

باب ہے فجر میں تثویب (الصلوۃ خیر من النوم) کا حکم

☆ حَدَّثَنَا احمد بن منیع حَدَّثَنَا ابو احمد الزبیری حَدَّثَنَا ابو اسرائیل عن الحکم عن عبد الرحمن بن ابی لیلی عن بلال قال: قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلم: لاتُثَوِّبَنَّ فی شیٔ من الصَّلَوَاتِ اِلّا فی صلاةِ الفجر۔

قال: وفی الباب عن ابی مَحْذُورَةَ۔قال ابو عیسی: حدیثُ بلالٍ لا نعرفه الّا من حدیث ابی اسرائیل الملائی۔وابو اسرائیل لم یسمع هذا الحدیث من الحکم بن عتیبة قال: انما رواه عن الحسن بن عمارة عن الحکم بن عتیبة۔وابو اسرائیل اسمه اسمعیل بن ابی اسحق ولیس هو بذاك القوی عند اهل الحدیث۔

وقد اختلف اهل العلم فی تفسیر التثویب۔فقال بعضهم: التثویب ان یقول فی اذان الفجر: الصلاة خیر من النوم، وهو قولُ ابن المبارك واحمد۔

وقال اسحٰق فی التثویب غیر هذا قال: التثویب هو شی احدثه الناس بعد النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم اذا اذان المؤذن فاستبطا القوم قال بین الاذان والاقامة: قد قامت الصلاة حَیَّ علی الصلاة حی علی الفلاح۔ قال: وهذا الذی قال اسحق: هو التثویب الذی قد کرهه اهل العلم والذی احدثوه بعد النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم۔

والذی فَسَّرَ ابنُ المبارك واحمد: اَنَّ التثویب ان یقول المؤذن فی اذان الفجر:الصلاة خیرٌ من النوم۔ وهو قول صحیحٌ ، ویقال له التثوب ایضاً۔ وهو الذی اختارَهُ اهلُ العلم وراوه۔

ورُوِیَ عن عبد اللّٰه بن عمر انه کان یقول فی صلاة الفجر۔ الصلاة خیرٌ من النوم۔

وَرُوِیَ عن مُجَاهِدٍ قال:دخلتُ مع عبد اللّٰه بن عمر مسجداً وقد اُذِنَ فیه ونحن نریدُ ان نصلی فیه فَثَوَّبَ المؤذنُ ، فخرج عبد اللّٰه بن عمر من المسجد ، وقال: اُخْرُجْ بنامن عند هذا الْمبْتَدِعِ ! ولم یُصَلِّ فیه۔

قال وانما کَرِهَ عبدُ اللّٰه التثویب الذی اَحْدَثَهُ الناسُ بَعْدُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فجر کی نماز کے علاوہ کسی نماز میں تثویب ہرگز نہ کرو۔

باب میں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ہم صرف ابواسرائیل ملائی کے واسطے ہی سے جانتے ہیں ابواسرائیل نے اس حدیث کو حکم بن عتبہ نہیں سنا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو اسرائیل نے حسن بن عمارہ سے روایت کیا ہے اور وہ حکم بن عتیبہ سے روایت کرتے ہیں اور ابواسرائیل کا نام اسماعیل بن ابی اسحٰق ہے اور وہ بھی محدثین کے یہاں بہت مضبوط راوی نہیں ہیں۔

اور اہل علم کا تثویب کی تفسیر میں اختلاف ہے پس بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ تثویب یہ ہے کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہے اور یہ قول امام احمد اور ابن مبارک کا ہے۔ اور امام اسحٰق تثویب کی تفسیر اس کے علاوہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کو لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایجاد کیا ہے کہ جب موذ اذان دیتا ہے پھر لوگ سستی کرتے ہیں تو وہ اذان واقامت کے درمیان کہتا ہے قد قامت الصلوٰۃ، حی علی الفلاح اور یہ تفسیر جو اسحٰق نے فرمائی ہے وہ تثویب ہے جس کو علماء نے مکروہ فرمایا ہے۔

اور اسی کو لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایجاد کیا ہے اور وہ تفسیر جو ابن المبارک اور امام احمد نے فرمائی ہے کہ تثویب یہ ہے کہ موذن فجر کی نماز میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہے وہ صحیح قول ہے اور اس کو بھی تثویب کہا جاتا ہے اور یہی وہ تثویب ہے جسے اہل علم نے اختیار کیا ہے اور وہ اس کو مسنون طریقہ سمجھتے ہیں اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فجر کی نماز میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہا کرتے تھے۔ اور مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک مسجد میں داخل ہوا جس میں اذان ہو چکی تھی اور ہمارا ارادہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کا تھا پس موذن نے تثویب کہی تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسجد سے باہر نکل گئے اور فرمایا کہ ہمیں اس بدعتی کی مسجد سے باہر لے چلو اور آپ نے وہاں نماز نہیں پڑھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس تثویب کو جو لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نکالی ہے ناپسند فرمایا ہے۔

﴿تشریح﴾

تثویب کی قسمیں اور اسکا شرعی حکم:(فقال بعضهم التثويب الخ) تثویب مکروہ ہے یا مستحب؟اس میں علماء کا اختلاف ہے درحقیقت یہ اختلاف تثویب کی تفسیر میں اختلاف ہونے پر مبنی ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں سستی کرنا مکروہ ہے لہٰذا ایسی تثویب جو مزید سستی پیدا کرے وہ تو مکروہ ہے اور جو ایسی نہ ہو وہ جائز ہے تو جن علماء نے تثویب کی تفسیر یہ کی ہے کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خير من النوم کہا جائے ان کے نزدیک تثویب مستحب ہے اور جن علماء نے تثویب کی یہ تعریف کی ہے کہ اذان کے بعد دوبارہ لوگوں کو نماز کیلئے بلایا جائے تو اس تثویب کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے البتہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ مسلمانوں کے امور میں مشغول ہوں جیسے بادشاہِ وقت، قاضی، مفتی وغیرہ ان لوگوں کو تثویب کی جانے کی اجازت ہے کیونکہ اگر یہ لوگ مسجد پہنچ کر نماز کا انتظار کریں گے تو عامۃ المسلمین کے کاموں میں خلل واقع ہوگا(کیونکہ یہ حضرات حاکم قاضی، مفتی، عوام کی خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔از مترجم) اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان کے بعد نماز کیلئے مطلع فرماتے تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے کاموں میں مشغول ہوتے تھے۔

(فاستبطأ القوم) یعنی اگر موذن لوگوں کی سستی اور کاہلی کو جانتا ہو تو وہ اذان کے بعد تثویب کرے۔

---

[۱] خلاصہ کلام یہ ہے کہ تثویب کہتے ہیں اعلام بعد اعلام کو۔حدیث میں اقامت پر تثویب کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح فجر کی اذان میں موذن کے الصلوٰۃ خیر من النوم کہنے کو بھی تثویب کہا گیا ہے۔تثویب کا یہ معنی جمہور کے نزدیک مستحب ہے۔نیز اذان اور اقامت کے درمیان لوگوں کو نماز کیلئے بلانے کو بھی تثویب کہتے ہیں یہ تثویب صحابہ کے زمانہ کے بعد ایجاد کی گئی ہے۔مصنف رحمہ اللہ نے تثویب کے آخری دو معنی بیان کئے ہیں۔

صاحبِ اوجز نے تثویب کے تینوں معانی ذکر کئے ہیں اور ان کے قائلین کے ناموں کے تعیین بھی کی ہے۔(اضافہ از مترجم: چنانچہ صاحب اوجز المسالک لکھتے ہیں کہ تثویب کے ایک معنی فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنا ہے اور امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ اور علامہ ابن مبارک سے یہی معنی نقل کیا ہے، ۲۔تثویب اذان اور اقامت کے درمیان لوگوں کو بلانے کو بھی کہتے ہیں، چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ تثویب اسے کہتے ہیں کہ نماز فجر میں اذان و اقامت کے درمیان دو دو مرتبہ حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کہہ کر لوگوں کو بلائے۔یہ تثویب کرنا حسن کا حکم رکھتا ہے فجر کی نماز کی تخصیص اس لئے کہ یہ نیند اور غفلت کا وقت ہے باقی نمازوں میں تثویب کرنا مکروہ ہے۔اس تثویب کو عہدِ صحابہ کے بعد علماء کوفہ نے لوگوں کے احوال بدلنے کی وجہ سے ایجاد کیا، ۳۔متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن سمجھا ہے کیونکہ دینی امور میں سستی واقع ہوتی جارہی ہے۔اوجز المسالک ص۲۲: ج۲ باب فی النداء فی الصلوٰۃ۔ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

باب ماجاء اَنَّ مَن اَذَّنَ فهو يُقِيمُ

باب ہے جس نے اذان کہی وہی اقامت کہے

☆حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا عَبْدَةُ ويَعْلَى بنُ عُبَيْدٍ عن عبد الرحمٰن بن زياد بن انعم۔ الافريقى عن زياد بن نُعيم الحضرمى عن زياد بن الحرث الصُّدَائى قال:اَمَرَنى رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم اَنْ أُوَذِّنَ فِي صَلَاةِ الْفَجرِ، فَاَذَّنْتُ ، فاراد بلالٌ ان يقيمَ فقال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم:ان اخا صُدَاءٍ قد اَذَّنَ ومَنْ اَذَّنَ فهو يُقيم۔

قال: وفى الباب عن ابن عمر. قال ابو عيسى: وحديث زيادٍ اِنَّمَا نعرفه من حديث الافريقى۔ والافريقى هو ضعيفٌ عند اهل الحديث، ضَعَّفَهٗ يحيى بنُ سعيدٍ القَطَّانُ وغيرُهٗ، قال احمد لااكتُب حديثَ الافريقىِّ۔قال: ورايتُ محمدَ بن اسمعيل يُقَوِّى اَمْرَهٗ، ويقول:هو مُقَارِبُ الحديثِ والعملُ على هذا عند اكثر اهل العلم: اَنَّ مَن اَذَّنَ فهو يقيم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فجر کی اذان دینے کا حکم فرمایا تو میں نے اذان دی تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک صدائی بھائی نے اذان دی ہے اور جو اذان دے وہی اقامت کہے۔

باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادہ کی حدیث کو ہم صرف افریقی کی سند سے پہچانتے ہیں اور افریقی محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں افریقی کی حدیث نہیں لکھتا۔اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ افریقی کی احادیث کو قوی کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ مقارب الحدیث ہے۔اور اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔

﴿تشريح﴾

(امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ اؤذِّنَ) اس سے معلوم ہوا کہ اگر اذان کا وقت مقرر ہو جائے اور خاص موذن

نہ ہوتو اس کا انتظار کرنا خلافِ سنت ہے۔

اس باب میں من اذن فھو یقیم کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اذان دے تو اسی کو اقامت کہنا مستحب ہے[1] یہ مطلب نہیں کہ اگر موذن کے علاوہ کسی دوسرے نے اقامت کہدی تو وہ صحیح ہی نہ ہوگی بلکہ یہ اقامت موذن کا حق ہے لہٰذا اگر موذن دوسرے کے اقامت کہنے پر راضی ہے یا موذن موجود ہی نہیں تو دوسرے شخص کے اقامت کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

باب ماجاء في كراهية الاذان بغير وُضوء

باب ہے بغیر وضو کے اذان دینے کے مکروہ ہونے کے بارے میں

☆حدثنا علی بن حجر حَدَّثَنَا الولید بن مسلم عن معاویة بن یحیی الصدفی عن الزهری عن ابی هریرة عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: لایُؤَذِّنُ اِلَّا مُتَوَضِّئٌ۔

☆حدثنا یحیی بن موسی حَدَّثَنَا عبد الله بن وهب عن یونس عن ابن شهابٍ قال: قال ابو هریرة: لایُنَادِی بالصلاة اِلَّا متوضئٌ۔

قال ابو عیسی: وهذا اصحُّ من الحدیث الاولِ۔

قال ابو عیسی: وحدیث ابی هریره لم یَرْفَعْهُ ابنُ وهب، وهو اصحُّ من حدیث الولید بن مسلم۔ والزهری لم یسمع من ابی هریرة۔

---

[1] **مؤذن کے علاوہ شخص کیلئے اقامت کہنے کا کیا حکم ہے:** امام احمد و شافعی رحمہما اللہ حدیث باب سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقامت صرف موذن ہی کہہ سکتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اقامت کہنے میں موذن اور عام نمازی برابر ہیں (کوئی بھی کہہ سکتا ہے) ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن بن زیاد اس حدیث کے نقل کرنے میں متفرد ہیں اور یہ حدیث محدثین کے نزدیک دلیل نہیں بن سکتی۔ امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ اذان کے کلمات حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تلقین کرو۔ جب بلال رضی اللہ عنہ اذان دے چکے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن زید سے فرمایا کہ اب تم اقامت کہو یہ حدیث سند کے اعتبار سے احسن ہے۔ انتہی کذا فی الاوجز

جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حنفیہ نے ان دونوں حدیثوں کو ملا کر اپنا مذہب مرتب کیا ہے (کہ اگر موذن دوسرے کی اقامت سے خوش ہے تب تو اس کا اقامت کہنا صحیح ہے ورنہ نہیں)

واختلَفَ اهلُ العلم فی الاذان علی غیر وضوء۔ فکرهه بعضُ اهل العلم، وبه یقول الشافعی، واسحق،ورَخّصَ فی ذلك بعض اهل العلم، وبه یقول سفیانُ الثوریُّ وابن المبارك ، واحمد۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باوضو آدمی ہی اذان دے۔

ابن شہاب سے مروی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نماز کیلئے صرف باوضو آدمی ہی اذان دے گا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور یہ دوسری روایت پہلی حدیث سے زیادہ صحیح حدیث ہے اور ابو وھب ابو ہریرہ رضی اللہ کی حدیث کو موقوف بیان کرتے ہیں اور یہ حدیث موقوف ولید کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے اور زہرہ کا سماع ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے اور علماء کا بغیر وضو اذان دینے کا مسئلہ میں اختلاف ہے پس بعض حضرات تو اس کو مکروہ فرماتے ہیں اور یہ قول امام شافعی اور اسحق رحمہما اللہ کا ہے اور بعض اہل علم نے اس مسئلہ میں رخصت دی ہے اور یہ (رخصت کا) قول سفیان ثوری، ابن المبارک اور امام احمد رحمہم اللہ کا ہے۔

﴿تشریح﴾

بغیر وضو اذان دینے کا شرعی حکم: (ولا یوذن الا متوضی) یہ حکم استحبابی ہے کیونکہ اذان ایک ذکر ہے اور اذکار میں سے سب سے افضل ذکر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ جنابت کے علاوہ ہر حال میں قرآن کریم سکھلایا کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے وضو ہونے کی وجہ سے ایک صحابی کے سلام کا جواب اس وقت تک نہ دیا جب تک کہ تیمم نہ فرمالیا (لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جب بے وضو قرآن کریم کی تعلیم کی اجازت ہے تو دوسرے اذکار اذان وغیرہ بھی بے وضو جائز ہیں اگرچہ افضل یہ ہے کہ باوضوء اذان دی جائے۔ از مترجم)۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (حدثنا یحییٰ بن موسی نا عبداللہ بن وھب عن یونس عن ابن الشھاب قال قال ابو ھریرۃؓ لا ینادی بالصلوٰۃ الا متوضی وھذا اصح من الحدیث الاول) یعنی چونکہ اکثر حفاظ حدیث نے حدیث باب کو ان الفاظ لا ینادی بالصلوٰۃ الا متوضی کے ساتھ موقوف علی ابی ھریرہ ذکر کیا ہے اسلئے یہ ابو ہریرہ رضی اللہ کا قول ہونا اصح ہے نہ کہ حدیث مرفوع۔ نیز پہلی حدیث میں انقطاع بھی موجود ہے۔[1]

---

[1] قلت: یہ انقطاع صرف پہلی حدیث میں نہیں بلکہ دونوں حدیثوں میں ہے کیونکہ دونوں میں زہری عن ابی ہریرہ کی سند ہے (اور زہری کا سماع حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ سے نہیں۔ از مترجم کما فی جامع الترمذی)

(فکرهه بعض اهل العلم) مطلب یہ ہے کہ ان علماء کے نزدیک بغیر وضوء کے اذان دینا مکروہ تنزیہی ہے۔[1]

(ورخص فی ذالك قوم) اس قوم میں ہم احناف بھی داخل ہیں کہ ہمارے نزدیک بے وضوء اذان دینے کی رخصت ہے کہ اس بے وضوء اذان دینے میں ایک فضیلت کا چھوڑنا لازم آتا ہے یعنی یہ فعل خلاف افضل ہے ہمارے نزدیک مکروہ نہیں ہے۔

باب ماجاء اَنَّ الامام احقُّ بالاقامة

باب ہے کہ امام کا حق ہے کہ اس کی اجازت سے اقامت کہی جائے

☆حدثنا یحیی بن موسی حَدَّثَنَا عبد الرزاق اخبرنا اسرائیل اخبرنی سماك بن حَرْبٍ سمع جابربن سمرة یقول : کان مُؤَذِّنُ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم یُمْهِلُ فلا یُقِیمُ، حتی اذا رای رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم قد خرج اقامَ الصلاةَ حین یَرَاهُ۔

قال ابو عیسی:حدیثُ جابرِ بن سَمُرَةَ هو حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔ وحدیثُ اسرائیل عن سِمَاكٍ نعرفه اِلّا من هٰذا الوجه۔وهکذا قال بعض اهل العلم: اِنَّ المؤذِّنَ اَمْلَكُ بالأ ذانِ ، والا مامَ املكُ بالاقامةِ۔

﴿ترجمه﴾

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) ٹھہرے رہتے تھے اور اقامت نہ کہتے تھے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (حجرہ سے) نکلتا ہوا نہ دیکھ لیتے پھر اس کے بعد اقامت کہتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور سماک کی حدیث کو ہم صرف اسی واسطے سے پہچانتے ہیں اور اسی طرح بعض علماء نے فرمایا ہے کہ موذن اذان کے بارے میں بااختیار ہے اور امام اقامت کے شروع کرنے کے متعلق بااختیار ہے۔

---

[1] ائمہ اربعہ کے مذہب بیان کرنے میں ناقلین مذہب کا کافی اختلاف ہے کہ اگر کوئی بے وضوء اذان دیدے تو اس کی اذان کا کیا حکم ہوگا؟ لہٰذا ائمہ کی کتب فروع کی طرف رجوع کیا جائے۔ حنفیہ کا مذہب ہدایہ میں اس طرح لکھا ہے کہ بے وضوء شخص کی اذان جائز ہے البتہ وضو کرنا مستحب ہے

﴿تشریح﴾

مطلب یہ ہے کہ امام کے آنے کے بعد ہی اقامت شروع کرنی چاہیئے البتہ امام اگر اتنی تاخیر کرے کہ وقت کے نکل جانے کا خوف ہو تو امام کا انتظار نہیں کیا جائیگا۔

یہاں یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو یہ مناسب نہیں کہ اقامت کہنا شروع کر دیں[1] تا کہ امام مجبور ہو کر (باہر نماز کیلئے) چلا آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب موذن اقامت کہے تو امام پر فوراً حاضر ہونا ضروری نہیں بلکہ اگر وہ چاہے تو اس وقت نہ آئے پھر جب تھوڑی دیر کے بعد وہ آ جائے تو اقامت کا اعادہ کرنا چاہیئے اگر پہلی اقامت کو کچھ وقت گزر چکا ہو۔

باب ماجاء فی الاُذان باللیل

باب ہے رات کی اذان دینے کے بارے میں

☆ حَدَّثَنَا قُتَیْبَةُ حَدَّثَنَا اللیث عن ابن شهاب عن سالم عن ابیه ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: اِنَّ بَلَا لًا یُؤَذِّنُ بِلَیْلٍ، فکلوا واشربُوا حتی تَسْمعُوا تَاْذِینَ ابنِ اُمِّ مَکْتُومٍ۔

☆قال ابو عیسی: وفی الباب عن ابن مسعودٍ، وعائشة وانیسة وانس وابی ذر، وسمرة۔

قال ابو عیسی: حدیثُ ابن عمر حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

وقد اختلف اهل العلم فی الاذان باللیل: فقال بعض اهل العلم: اذا اذن المؤذن باللیل اجزاه ولا یعید وهو قول مالك، وابن المبارك، والشافعی، واحمد، واسحق۔

وقال بعض اهل العلم: اذا اَذَّنَ بِلَیْلٍ اَعَادَ، وبه یقولُ سفیانُ الثوریُّ روی حماد بن سلمة عن ایوب عن نافع عن ابن عمر: اَنَّ بلالاً اَذَّنَ بِلَیْلٍ فَاَمَرَهُ النبیُّ صلّی اللّٰه علیه وسلم اَنْ یُنَادِیَ: اِنَّ العبد نَامَ۔

قال ابو عیسی: هٰذا حدیث غیر محفوظ۔ والصحیحُ ماروی عُبید اللّٰه بن عمر وغیره عن نافع عن ابن عمر ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: اِنَّ بلالاً یُؤَذِّنُ بلیلٍ، فَکُلُوا واشربوا حتی یُؤَذِّنَ ابنُ اُمِّ مَکْتُومٍ۔

---

[1] یعنی نمازیوں کیلئے یہ نامناسب ہے کہ وہ امام کو زبردستی حاضر کرنے کی غرض سے نماز کی اقامت شروع کر دیں۔

قال :وروی عبد العزیز بنُ ابی رَوَّادٍ عن نافع: ان مؤذناًلعُمَرَ اَذَّنَ بلیل، فامرہُ عمرُ ان یُعیدَ الاذان۔وهٰذا لایصحُّ ایضاً لانهُ عن نافع عن عمر: مُنقَطِعٌ ولعل حماد بن سلمة اراد هٰذا الحدیث۔

والصحیح روایةُ عبید اللّٰه وغیر واحد عن نافع عن ابن عمر، والزهری عن سالم عن ابن عمر ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال:اِنّ بلالاً یُؤَذِّنُ بلیل،

قال ابو عیسی:ولو کان حدیث حمادٍ صحیحا لم یکن لهٰذا الحدیث معنی، اذ قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم:اِنّ بلالا یوذن بلیل،فانما امرهم فیما یستقبل ، فقال: ان بلالا یوذن بلیل، ولو اَنّهُ امرہ باعادة الاذان حین اَذَّنَ قبل طلوع الفجر:لم یَقُلْ:اِن بلالاً یؤذن بلیل، قال علی بن المدینی: حدیث حماد بن سلمة عن ایوب عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم: هو غیر محفوظ وَاَخطَأفیه حماد بن سلمة۔

﴿ترجمہ﴾

سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بیشک بلال رضی اللہ عنہ رات میں اذان دیتے ہیں پس تم کھاتے اور پیتے رہو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم کی اذان سن لو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں باب میں ابن مسعود، عائشہ، انیسہ، انس ،ابوذر، اور سمرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور علماء کا رات (تہجد) کی اذان کے بارے میں اختلاف ہے پس بعض اہل علم نے فرمایا کہ جب موذن رات کو اذان دیدے تو کافی ہو جائے گا اور وہ پھر اعادہ نہیں کرے گا اور یہ قول امام مالک، ابن مبارک، امام شافعی، احمد و اسحاق کا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب رات کو اذان دے تو اس کا اعادہ کرے گا۔ اور سفیان ثوری کا یہی قول ہے اور حماد بن سلمہ سے روایت ہے انہوں نے ایوب سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ بلال رضی اللہ نے رات کو اذان دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اعلان کردیں کہ بندہ سو گیا تھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غیر محفوظ ہے اور صحیح وہ ہے جو عبید اللہ بن عمر وغیرہ نے نافع سے انہوں نے

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کی اذان دیتے ہیں پس تم کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دے دیں اور ابوعبدالعزیز بن ابی رواد نافع سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موذن نے رات کو اذان دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دوبارہ اذان دینے کا حکم دیا۔ یہ صحیح نہیں ہے اسلئے کہ نافع کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی اور شاید حماد بن سلمہ نے یہ حدیث مراد لی۔ صحیح روایت عبید اللہ بن عمر اور کئی حضرات کی ہے وہ نافع سے اور وہ ابن عمر اور زہری سے وہ سالم سے اور وہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیدیتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر حماد کی حدیث صحیح ہوئی تو اس روایت کے کوئی معنی نہ ہوتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلال تو رات کو اذان دیدیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں آئندہ کیلئے حکم دیا ہے کہ بلال تو رات کو اذان دیتے ہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلوع فجر سے پہلے دوبارہ اذان دینے کا حکم دیا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں۔ علی بن مدینی کہتے ہیں حماد بن سلمہ کی ایوب سے مروی حدیث غیر محفوظ ہے اسے ایوب نافع سے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں اسی میں حماد بن سلمہ کو غلطی ہوئی ہے۔

﴿تشریح﴾

طلوعِ فجر سے پہلے اذانِ فجر دیئے جانے کا حکم: حدیث باب[1] طرفین کے خلاف حجت ہے کیونکہ ان کے

---

[1] جاننا چاہیئے کہ فجر کے علاوہ باقی چار نمازوں میں وقت سے پہلے اذان دینا کسی بھی امام کے نزدیک دینا جائز نہیں یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ ابن قدامہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس مسئلہ میں کوئی اختلاف معلوم نہیں۔ ابن منذر فرماتے ہیں کہ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ نماز کے وقت کے داخل ہونے کے بعد اذان دینا سنت ہے۔ انتہی

طلوعِ فجر سے پہلے اذان فجر کس وقت دی جاسکتی ہے: فجر کی اذان میں اختلاف ہے ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک فجر کی اذان وقت سے پہلے دی جاسکتی ہے البتہ ان کا آپس میں وقتِ اذانِ فجر میں اختلاف ہے (۱) ایک قول میں رات کے آخری چھٹے حصے میں فجر کی اذان جائز ہے (۲) دوسرے قول میں نصف اللیل کے بعد اذان کہی جاسکتی ہے۔ (۳) تیسرے قول میں عشاء کی اذان کے بعد فجر کی اذان کہی جاسکتی ہے۔ (اضافہ از مترجم: چوتھے قول میں رات کے ثلث اللیل کے بعد (جو کہ عشاء کا وقتِ مستحب ہے) اس کے بعد اذانِ فجر دینا صحیح ہے، وقیل بعد نصف اللیل۔ پانچویں قول میں سردی کے موسم میں جب رات کا آخری ساتواں حصہ باقی رہ جائے تو اذان دی جائے اور گرمی کے موسم میں جب رات کا آخری چودھواں حصہ باقی رہ جائے تو اذانِ فجر دی جائے گی۔ معارف السنن ۲۱۳: جلد۲) علامہ باجی رحمہ اللہ کے بقول یہ آخری قول بعید ہے۔ امام ابوحنیفہ، محمد، زفر، اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک طلوع فجر کے بعد ہی فجر کی اذان دی جائیگی۔ کذا فی الاوجز۔

نزدیک وقت سے پہلے اذان دینا جائز نہیں اور اگر وقت سے پہلے اذان کہہ دی گئی تو اس کا اعادہ واجب ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک فجر کی اذان وقت سے پہلے دینا جائز ہے، حدیث باب سے ان کا استدلال ہے۔

حدیثِ باب کی توجیہات: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اذان فجر کی اذان نہ تھی بلکہ یہ اذان تو سونے والوں کو جگانے[1] کے غرض سے ہوتی تھی۔

جواب نمبر۲: اگر ہم یہ تسلیم بھی کریں کہ اذان نمازِ فجر کیلئے تھی تو اس اذان پر اکتفا نہیں کیا گیا[2] بلکہ نماز کے وقت کے اندر اس کا اعادہ کیا جاتا تھا۔

اب یہ اذان کیسی تھی؟ تو یا تو یہ کہا جائے گا نوافل کیلئے اذان دینا جائز ہے لیکن یہ قول ہمارے علماء احناف کی تصریح کے خلاف ہے یا یہ کہا جائے گا کہ وقت فجر سے پہلے اذان کا التزام کیا جاتا تھا تو یہ بھی مذہب احناف کے خلاف ہے۔ شافعیہ کے نزدیک یہ (قبل از وقت) اذان نماز فجر[3] ہی کیلئے ہوتی تھی۔ شافعیہ کی اس توجیہ کے مطابق اس صورت میں مثلاً ایک

---

[1] چنانچہ مسلم کی روایت میں ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اس اذان کا مقصد یہ تھا کہ نماز و عبادت میں مشغول صحابہ کرام آرام کریں اور سونے والے صحابہ کرام بیدار ہو کر عبادت میں مشغول ہوں ''الحدیث''

[2] ابن المنذر محدثین کی ایک جماعت اور امام غزالی کے نزدیک صرف اس اذان پر اکتفا کرنا صحیح نہیں بلکہ بعض ائمہ نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ کسی بھی حدیث میں صرف اس رات والی اذان پر اکتفا نہیں کیا گیا (بلکہ اس اذان باللیل کے بعد دوبارہ طلوع فجر کے بعد اذان دی گئی)۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں یہ بالکل واضح مذہب ہے۔ انتھی ابن قدامہ فرماتے ہیں کیونکہ فجر سے پہلے دی جانے والی اذان خلافِ مقصود ہے کیونکہ اذان کا مقصد نماز کے وقت کے داخل ہونے کی خبر دینا ہے لہٰذا جس طرح بقیہ چار نمازوں کی اذان وقت سے پہلے صحیح نہیں بالکل اسی طرح فجر کی اذان وقت سے پہلے دینا ناجائز ہے۔ ہاں اگر اس اذان کے دو موذن ہوں تو جو اذان وقت کے بعد ہوگی اس سے دخولِ وقت کی خبر ہو جائیگی انتھی۔ کذا فی الاوجز

[3] قلت: یہ دعویٰ کہ یہ اذان نماز فجر کیلئے ہوتی تھی بہت مشکل ہے کیونکہ اس طرح اذان کا مقصد الاعلام بدخول الوقت حاصل نہ ہوگا جیسا کہ ابن قدامہؒ کا قول ابھی گزرا۔ علامہ باجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں احادیث سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ اذان نماز فجر کیلئے نہیں تھی لہٰذا اگر ائمہ کا اختلاف اس میں ہے کہ اس وقت اذان دینا جائز ہے یا نہیں تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت (طلوع فجر سے پہلے) اذان دینا جائز ہے۔ اور اگر اختلاف اس میں ہے کہ آیا اس اذان سے ان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے؟ تو یہ غور کرنا چاہئے کہ یہ اذان فجر سے متصل ہوتی تھی یا نہیں۔ انتھی کذا فی الاوجز

نماز کیلئے دو دفعہ اذان دینا لازم آئیگی لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ بوقتِ ضرورت تمام ائمہ کے نزدیک ایک نماز کیلئے کئی اذانیں دی جاسکتی ہیں۔

مذہب احناف میں حدیث باب کی ایک توجیہ: لہٰذا اس کی یہی توجیہ ہوسکتی ہے کہ جیسا صحیح بخاری کے بعض شراح نے لکھا ہے کہ دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فصل ہوتا تھا کہ ایک موذن اذان دیکر اترتا تھا اور دوسرا چڑھتا تھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر کے طلوع کے بالکل ابتدائی حصہ میں اذان دیتے تھے اس وقت طلوع فجر کو ہر ایک نہیں جان سکتا تھا بہر حال حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان اور دعاء سے فارغ ہوکر منارہ سے اترتے تو ان کے اترتے ہی عبداللہ بن ام مکتوم منارہ پر چڑھ جاتے تھے۔ چونکہ وہ نابینا تھے اس لئے لوگ انہیں اصبحت اصبحت کہکر طلوع فجر کی اطلاع دیتے تھے بہر حال اس اذان کے جائز ہونے کا مدار ہمارے فقہاء کے اس قول پر ہے کہ روزہ دار شخص صبح سحری اس وقت تک کرسکتا ہے جب تک کہ روشنی خوب نہ پھیل جائے۔ نفس الامر میں طلوع فجر سے سحری حرام نہیں ہوتی۔ تو اس قول کے مطابق یہ دونوں اذانیں وقت کے اندر ہوا کرتی تھیں (پہلی اذان بلال رضی اللہ عنہ، وقت کے بالکل ابتدائی حصہ میں اور دوسری اذان ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جب روشنی خوب پھیل جاتی تھی دیتے تھے۔ از مترجم)

جن ائمہ کے نزدیک نفس طلوع ہی سے سحری کھانا حرام ہو جاتی ہے تو اس قول کے مطابق اذان اول کی کوئی بھی تاویل نہیں ہوسکتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کلوا واشربوا حتی یوذن ابن ام مکتوم سے صراحۃً معلوم ہورہا ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد بھی سحری کھانا صحیح تھا۔

ایک اہم اشکال اور اس کا جواب: ابھی گزرا کہ دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہوتا تھا کہ ایک موذن اذان دیکر منارہ سے اترتا اور دوسرا چڑھتا تو اتنے کم وقت میں سحری کرنا کیسے ممکن ہے؟

جواب: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سحری اس قدر ہوتی تھی جس سے کمر سیدھی ہو جائے تو اس کے کھانے کیلئے زیادہ وقت[1] کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کی سحری تو یہی تھی کہ چند کھجوریں کھا کر پانی کے چند گھونٹ لے لئے۔

---

[1] مجمع میں ہے کہ یجتزی بالعلقۃ کا مطلب یہ ہے کہ اسے تھوڑا سا کھانا کافی ہے یہ لفظ علقہ عین کے پیش کے ساتھ ہے۔ علقہ کہتے ہیں اتنا کھانا جو سدِ رمق کے بقدر ہو، کنایہ ہے قلت سے۔ انتہی

اصل اعتراض کا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم حنفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فرائض کے علاوہ نوافل وغیرہ کیلئے بھی اذان دینا مشروع ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ لگنے کے وقت اور آفات کے نزول وقت اذان دینے کا حکم فرمایا اسی طرح نوافل کیلئے بھی اذان مشروع اور جائز ہونی چاہیئے۔فقہاء کے کلام سے اس اذان کا استنباط کیا جا سکتا ہے کیونکہ فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف پانچ نمازوں کیلئے اذان دینا سنت ہے تو لفظِ سنت دلالت کر رہا ہے کہ فرائض کے علاوہ کیلئے اذان کے مشروع ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔[1]

امام ترمذی کے اعتراضات اور اسکے جوابات:(قال ابو عیسی ھذا حدیث غیر محفوظ) کیونکہ حدیث ان العبد نام اور دوسری حدیث ان بلالاً یوذن بلیل میں بظاہر تعارض نظر آ رہا ہے لہٰذا محدثین نے اس تعارض کو اس طریقے سے دور کیا جو طریقہ نا قابل قبول ہے کیونکہ ان محدثین نے بغیر دلیل کے ان بلالا یوذن بلیل والی حدیث کو ضعیف قرار دے دیا در حقیقت یہ سیدھا راستہ چھوڑ کر اس سے اعراض کرنے کے مترادف ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ کی تقریر اس مقام پر بالکل ظاہر و واضح ہے جس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مصنف رحمہ اللہ پر یہ اعتراض ہوگا کہ کسی ایک روایت کی تضعیف کی ضرورت تو جب پیش آتی ہے جبکہ دونوں حدیثوں کا ایک ہی محمل ہو حالانکہ یہاں اس طرح نہیں۔اسی طرح تعارض اس وقت متحقق ہوگا جبکہ بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان کیلئے متعین ہوں اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ دوسری اذان کیلئے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے سمجھا ہے (حالانکہ یہ دونوں موذن کبھی اذانِ اول دیتے اور کبھی اذانِ ثانی۔از مترجم) اسی طرح ابھی حدیث گزری ہے[2] کہ زیاد بن حارث رضی اللہ

---

[1] چنانچہ اوجز میں لکھا ہے کہ نومولود بچے کے کان میں اذان دینا مشروع ہے اسی طرح جب آفات کا ظہور ہو نیز جب سواری کے اڑ جانے کی وجہ سے وہ مشقت میں پڑ جائے یا کسی شخص کے اخلاق خراب ہو جائیں،غمزدہ شخص کے کان میں اور جس پر مرگی کی بیماری ہو اور جو شخص بہت غصہ کرتا ہو اور جب لشکر مخالفین پر حملہ کرے اور جب کوئی شخص یا مکان آگ کی لپیٹ میں آ جائے اور جو آدمی بیابان زمین میں ہو اور رستہ بھٹک جائے ان تمام مواقع پر اذان دینا مشروع اور مجرب ہے۔انتہی

[2] بلکہ حدیث باب کے برعکس بھی روایت مروی ہے چنانچہ ابن خزیمہ،ابن منذر،ابن حبان وغیرہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مختلف سندوں سے اسی طرح طحاوی وطبرانی نے دوسری سندوں سے نقل کیا ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ پہلی اذان دیتے تھے اور بلال رضی اللہ عنہ اذان ثانی۔ابن عبدالبر اور ایک جماعت نے اس تعارض کو دیکھتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ دوسری روایت صحیح نہیں اس میں قلب واقع ہوا ہے صحیح واقعہ وہی ہے جو ترمذی کی حدیث میں ہے۔حافظ فرماتے ہیں کہ میرا میلان بھی اسی قول کی طرف تھا پھر میں نے صحیح ابن خزیمہ کی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دو مزید سندوں سے اس دوسرے طریقے کو مروی دیکھا چنانچہ اس کے بعض الفاظ ایسے ہیں جس میں وہم کا قول کرنا بالکل بعید ہے پھر حافظ نے یہ تطبیق دی کہ یہ دونوں موذن باری باری اذان دیا کرتے تھے (کبھی ایک موذن کی باری اذان اول کی ہوتی تھی اور دوسرے موذن کی اذانِ ثانی کی باری ہوتی تھی اور کبھی اس کے برعکس۔از مترجم) حافظ نے ابن خزیمہ اور ابن حبان وغیرہ سے بھی اس تطبیق کو نقل کیا ہے۔

عنہ نے فجر کی اذان دی تھی (تو معلوم ہوا کہ یہ موذن کسی خاص اذان کیلئے مقرر نہ تھے۔ از مترجم) لہذا صحیح تطبیق یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کبھی رات کو اذان دیتے تھے اور کبھی طلوعِ فجر کے بعد اسی طرح ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کبھی فجر کے بعد اذان دیتے تھے اور کبھی رات کی اذان دیتے۔ اب ایک دن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان کی ذمہ داری تھی تو انہوں نے نیند اور غفلت کی وجہ سے وقتِ فجر سے پہلے ہی اذان دے دی حالانکہ دوسرے موذن نے رات والی اذان اس رات میں پہلے ہی دیدی تھی لیکن بلال رضی اللہ عنہ جب نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے جب افق روشن دیکھا تو نیند کی غفلت کی وجہ سے وہ یہ تمیز نہ کر سکے کہ یہ فجر کے وقت کی روشنی[1] ہے یا اس کے علاوہ دوسری شئی؟ لہٰذا انہوں نے اذان دینی شروع کر دی جس کا لوگوں کو انتظار تھا تا کہ لوگ نماز فجر پڑھ سکیں اور روزہ دار سحری سے رک جائیں لیکن چونکہ نفس الامر میں فجر کا وقت داخل نہ ہوا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا کہ اعلان کرو کہ میں نے غفلت کی وجہ سے قبل از وقت اذان دی تھی تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت طلوعِ فجر نہ ہوا تھا۔

مصنف کا اعتراض کہ اعادۂ اذان کا واقعہ تو عہدِ فاروقی میں رونما ہوا تھا نہ کہ عہدِ نبوی میں: رہا عمر رضی اللہ عنہ کا اثر تو وہ واقعہ الگ ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ فجر سے پہلے اذان صحیح نہیں ہوتی اس لئے انہوں نے اپنے موذن (از مترجم: انکا نام مسروح ہے کما فی سنن ابی داؤد۔ از معارف السنن ص ۲۱۹: جلد۲) کو اعادہ کا حکم ارشاد فرمایا پس معلوم ہوا کہ ان العبد قد نام والی حدیث اور لا یمنعنکم اذان بلال یہ دونوں ہی حدیثیں صحیح ہیں کیونکہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں اور ان العبد نام والی حدیث میں اعلان اس دن فرمایا تھا جب طلوع فجر سے پہلے فجر کی اذان دے دی گئی تھی۔

مصنف کی طرف سے ایک اور اعتراض اور اس کا جواب۔ اشکال: اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا قول ان بلالا یوذن بلیل فامرہ النبی صلی اللہ علیہ و سلم ان ینادی ان العبد نام کے ظاہر سے مصنف یہ اعتراض

---

[1] چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر سے پہلے اذان دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نیند سے بیدار ہوا اور مجھ پر نیند کے غلبہ کی وجہ سے غنودگی طاری تھی تو میں یہ سمجھا کہ طلوعِ فجر ہو چکی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ شہر میں تین مرتبہ یہ اعلان کرو ان العبد قد نام الحدیث (رواہ البیہقی واسنادہ حسن قالہ النیموی)۔

کررہے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تو اپنے وقت سے تاخیر کر کے اذان دی تھی نیند میں مشغولی کے سبب، نہ کہ جلدی اذان دی۔

جواب: جواب یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اس دن چونکہ فجر کی اذان کی باری تھی تو انہوں نے اس دن اذانِ فجر کیلئے رات کی اذان سے زیادہ اہتمام کیا پھر جب وہ بیدار ہوئے تو ان کو ڈر ہوا کہ کہیں مجھے فجر کی اذان کے وقت سے تاخیر تو نہیں ہوگئی؟ (میں زیادہ تو نہیں سو گیا) اسلئے انہوں نے یہ تحقیق کئے بغیر کہ طلوع فجر ہوئی ہے یا نہیں اذان دینی شروع کردی پھر جب ان پر سے نیند کا غلبہ دور ہوا اور ان کو معلوم ہوا کہ ابھی رات باقی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلان کا حکم فرمایا لہٰذا کسی ایک روایت کو ضعیف کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ تضعیف ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ حماد راوی کے یہ شایانِ شان[1] نہیں۔ (کہ ان کی اس روایت کو وہم قرار دیا جائے۔ از مترجم)

امام ترمذی کا اعتراض حضرت عمرؓ کا اعادۂ اذان والا واقعہ منقطع ہے۔ از مترجم: (عن نافع عن عمر منقطعاً) اس کا منقطع ہونا کوئی نقصان دہ نہیں[2] کیونکہ مرسل احادیث حنفیہ کے نزدیک قابل اعتبار ہوتی ہیں خصوصاً جبکہ اس روایت میں یہ معلوم ہے کہ ابن عمر راوی درمیان میں سے ساقط ہیں۔

---

[1] چنانچہ حافظ فرماتے ہیں کہ اس سند کے راوی حفاظ اور ثقہ ہیں پھر حافظ نے ذکر کیا ہے کہ محدثین نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن حافظ جواباً فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بہت سے متابعات موجود ہیں جن سے بعض سندوں کو دوسری سندوں کے ساتھ خوب تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ (از مترجم: بقول حافظ الا ان العبد نام والی حدیث چھ طرق سے مروی ہے اگر چہ یہ ساری سندیں ضعیف ہیں لیکن ان کثرت طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا، پھر حافظؒ نے فتح الباری میں آگے مذکور ائمہ پر رَد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام ذہلی، ابو حاتم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام دارقطنی وغیرہ سب متفق ہیں کہ حدیث باب میں حماد راوی حدیث کے مرفوع نقل کرنے میں غلطی کر گئے ہیں حالانکہ ان سندوں کی کثرت سے بعض سندوں کو بعض سے قوت ظاہرہ حاصل ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۲۲۰: معارف السنن جلد ۲)۔

[2] علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ اس روایت کو ابوداؤد اور دارقطنی نے نقل کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ انتہی

باب ماجاء فی کراهية الخروج من المسجد بعد الاذان

باب ہے اذان کے بعد مسجد سے نکلنے کی کراہیت کا بیان

☆حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا وكيع عن سفيان عن ابراهيم بن المهاجر عن ابی الشعثاء قال: خرج رجل من المسجد بعد ما اذن فيه بالعصر، فقال ابو هريرة : اَمَّا هٰذا فقد عَصَى ابا القاسم صلَّى الله عليه وسلم ۔

قال ابو عيسى: وفی الباب عن عثمان ۔ قال ابو عيسى: حديث ابی هريرة حديث حسن صحيح ۔

وعلى هٰذا العمل عند اهل العلم من اصحاب النبی صلَّى الله عليه وسلم ومن بعدهم: اَنْ لَایَخْرُجَ احدٌ من المسجد بعدَ الاذان اِلَّا مِن عذرٍ: ان يكون على غير وضوء او امر لابد منه ۔

ويروى عن ابراهيم النخعی انه قال: يخرج مالم ياخذ المؤذن فی الاقامة ۔

قال ابو عيسى: وهذا عند نا لمن له عذر فی الخروج منه ۔

وابو الشعثاء اسمه سليم بن اسود ، وهو والدُ اشعث بن ابی الشعثاء،

وقد روى اشعث بن ابی الشعثاء هذا الحديث عن ابيه ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوالشعثاء رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ایک شخص عصر کی اذان کے بعد مسجد سے نکلا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ اس شخص نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس باب میں عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث منقول ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اوران کے بعد کے اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ بغیر عذر کے اذان کے بعد مسجد سے کوئی نہ نکلے یعنی وضو نہ ہو یا کوئی ضروری کام ہو۔ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ موذن کے اقامت کہنے تک نکل سکتا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں ہمارے نزدیک یہ اس کیلئے ہے جس کے پاس نکلنے کیلئے عذر ہو۔ ابوالشعثاء کا نام سلیم ابن اسود ہے یہ اشعث بن ابوالشعثاء کے والد ہیں اور یہ حدیث اشعث بن ابواشعثاء نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے۔

﴿تشریح﴾

اگرکسی آدمی کو بہت ضروری کام ہواوراس کونماز کے وقت تک لوٹناناممکن ہوتو یہ شخص منفرداًاپنی نماز پڑھ کراذان کے بعد جاسکتاہےاوراگراذان سے پہلے ہی لے کوئی شخص نمازاداکرچکاہےتواس کے مسجد سے نکلنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس شخص پرموذن کی اذان پرلبیک کہناضروری نہیں کیونکہ یہ شخص پہلے ہی اس فریضہ کواداکرچکاہےلیکن اگراقامت اس کی موجودگی

لے **چاراہم اختلافی مسائل:** قلت: یہاں چاراختلافی اورتفصیلی مسائل ہیں جن پراوجزالمسالک میں تفصیلی کلام متفرق ابواب میں کیاگیاہے:

ا۔اذان کے بعدبغیرنماز پڑھے مسجد سے نکلنے کا کیاحکم ہے؟ حنفیہ کے مذہب میں یہ فعل مکروہ ہے ہاں اگرکوئی شخص کسی دوسری مسجد کا متولی(منتظم)ہواس کیلئے نکلناجائزہے کیونکہ ظاہرمیں یہ جماعت کوچھوڑرہاہےحقیقت میں یہ تکمیلِ جماعت ہے۔

۲۔جس مسجد میں ایک دفعہ باجماعت نمازاداہوچکی ہوتواس مسجد سے نکلنابعدالاذان جائزہےیانہیں؟ابن رشدفرماتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک اس کیلئے نکلناجائزہےاوریہ نماز کااعادہ نہیں کرے گا۔امام ابوحنیفہؒاورامام مالکؒ کایہی مذہب ہےبعض علماء کے نزدیک یہ شخص دوبارہ نماز کااعادہ کرے گا۔امام احمدوداؤدظاہری اس کے قائل ہیں۔انتہی

قلت: حنابلہ کےفروع میں مغرب کااستثناءہے(کہ اس کودوبارہ نہیں پڑھے گا)۔

۳۔ایک شخص منفرداًنماز پڑھ چکاہےاب مسجد میں اذان کے بعدداخل ہوجائےتویہ شخص مسجد سے نکل سکتاہے؟شافعیہ کے مذہب میں اس کیلئے مسجد سے نکلناناجائزہےتمام نمازوں کااعادہ اس کیلئے ضروری ہےاورحنابلہ کابھی یہی مذہب ہےلیکن اگرمغرب کی نماز ہو اوروقتِ مکروہ ہوتواس کیلئے مسجد سے نکلناجائزہےاورمالکیہ کابھی یہی مذہب ہےلیکن ان کے نزدیک مغرب اورفجر کااعادہ نہ کرے گا اسی طرح اگرمنفرداًعشاءپڑھ کروتربھی پڑھ چکاہےتواب عشاءکابھی اعادہ نہ کرے گاورنہ اگراس نےمنفرداًصرف عشاءپڑھی توعشاءکا اعادہ کرے گا۔حنفیہ کے مذہب میں جن نمازوں کے بعدنفل پڑھناجائزہےتوان کااعادہ بطورنفل کے کرے گالہٰذاصرف ظہراورعشاءکی نماز کااعادہ جائزہے۔

۴۔نماز کی اقامت کے بعدمسجد سے نکلنا؟توحنفیہ کے ہاں نماز چھوڑنے کی تہمت کی وجہ سے مکروہ ہے۔کذافی الاوجز

درِّمختار میں ہے کہ جوشخص فجراورعصراورمغرب کی نمازیں پڑھ چکاہوتواس کیلئے مطلقاًمسجد سے نکلنے کی اجازت ہےاگرچہ جماعت کھڑی ہوجائے کیونکہ فجراورعصر کے بعدنفل پڑھنامکروہ ہےاورمغرب کی نماز میں دوخرابیوں میں سے ایک خرابی لازم آئیگی یاتوصلوٰۃ البتیراءلازم آئیگی یااگرچوتھی رکعت ملائے گاتوامام کی مخالفت لازم آئیگی۔

میں شروع ہوگئی تو اکثر علماء کے نزدیک اگرچہ یہ شخص پہلے نماز ادا کر چکا ہے لیکن نفل کی نیت سے اس جماعت میں شریک ہوجائے اگر اس نماز کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ نہ ہو (جیسے ظہر اور عشاء کی نمازیں۔ از مترجم) اور اگر مغرب کی نماز میں یہ صورتِ حال پیش آئے تو ایک رکعت ملا کر اسے شفعہ بنالے۔[۱]

قال ابوعیسیٰ کی وضاحت: (قد روی اشعث بن ابی الشعثاء ھذ الحدیث عن ابیہ) یعنی جس طرح یہ روایت ابراہیم بن مہاجر نے ابوالشعثاء سے نقل کی ہے تو ان کا متابع اشعث بن ابی الشعثاء موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابوالشعثاء سے اس حدیث کو دوراویوں[۲] نے نقل کیا ہے۔ (۱) ابراہیم بن مہاجر نے (۲) اشعث بن ابی الشعثاء نے۔

باب ماجاء فی الاذان فی السفر

باب ہے سفر میں اذان کے متعلق

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیع عن سفیان عن خالد الحذاء عن ابی قلابة عن مالك بن الحویرث قال: قَدِمْتُ علی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم انا وابن عم لی فقال لنا: اذا سَافَرْتما فاذِّنَا واقیما۔ وَلْیَؤُمَّکُمَا اَکْبَرُکُمَا۔

قال ابو عیسی: ھذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

---

[۱] ابن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قول کو ذکر کیا ہے اور جمہور کا اس پر عمل ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ طحاوی میں شرح سیر سے نقل کیا ہے اگر مغرب میں یہ شخص دوبارہ شریک ہوگیا تو چوتھی رکعت بھی ملالے کیونکہ سنت کی مخالفت سے بہتر ہے کہ امام کی مخالفت اختیار کرے۔

[۲] ابراہیم بن مہاجر والی روایت ترمذی، ابوداؤد، اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے جبکہ اشعث والی سند نسائی نے ذکر کی ہے اور امام مسلم و بیہقی نے دونوں طریق ذکر کیئے ہیں۔ نیز نسائی نے ایک تیسری سند بھی ذکر کی ہے جس میں ابوصخرہ عن ابی شعثاء مروی ہے۔

تنبیہ: اہل اصول کا اختلاف ہے کہ صحابی اگر یہ کہے کہ اس شخص کا یہ فعل معصیت ہے یا یہ فعل طاعت ہے (جیسا کہ حدیث باب میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فقد عصا ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا۔ از مترجم) یہ قول موقوف کہلائے گا یا اس کا حکم حدیث مرفوع کا ہوگا۔ حضرت سہارنپوری نے بذل میں اس کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ فارجع الیہ

والعمل علیه عند اکثر اهل العلم: اختاروا الاذان فی السفر۔وقال بعضهم: تُجزِئُ الاقامة، انما الاذان علی من یرید ان یجمع الناس والقول الاول اصح، وبه یقول احمد، واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم دونوں سفر کرو تو اذان کہو اور اقامت کہو اور تم میں سے بڑا امامت کرے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے انہوں نے پسند کیا ہے سفر میں اذان دینے کو۔بعض حضرات کہتے ہیں اقامت کافی ہے بلا شبہ اذان تو اس پر ہے جو لوگوں کو جمع کرنا چاہے اور پہلا قول صحیح ہے اور اسی کو امام احمد واسحٰق نے لیا ہے۔

﴿تشریح﴾

سفر میں ہر ایک ساتھی کو اذان واقامت کہنے کا حکم اور اسکی وضاحت: (قوله اذاسافرتما فاذنا واقیما) دونوں کے اذان واقامت کہنے کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ یہاں مجازی معنی مراد[1] ہے کہ ایک شخص جب یہاں اذان واقامت کہے گا تو گویا دوسرا شخص اس کو اس پر ابھارنے والا تھا اور اس کا سبب بنا اور راضی بھی تھا کیونکہ دونوں نے یہ کام انجام دیا۔

---

[1] اس توجیہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ایک اذان چونکہ پوری جماعت والوں کیلئے کافی ہوتی ہے یہ اجتماعی مسئلہ ہے اسلئے یہ توجیہ کی گئی۔

دوسری توجیہ: تم دونوں اذان دو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے جو اذان دینا چاہے تو وہ اذان دے۔اب دونوں کی طرف اذان کے منسوب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اذان میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ فلاں عمر رسیدہ ہے لہٰذا اسے اذان دینے کا حق ہے بلکہ اذان دینے میں سب برابر ہیں۔بخلاف امامت میں بعض افراد بعض سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں اس کی تائید ایوب عن ابی قلابہ کی سند سے ہوتی ہے جس میں فلیوذن لکم احدکم کے الفاظ ہیں۔

تیسری توجیہ: فاذنا کا مطلب یہ ہے کہ ایک اذان دے تو دوسرا اس کا جواب دے۔ابوالحسن بن القصار نے حدیث کا ظاہری معنی لیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں ہی اذان دیں یہ ان کی غلطی ہے کذا فی البذل

اسلئے اذان اور اقامت کی نسبت دونوں کی طرف کردی گئی یہ تاویل اس وقت کی جائیگی جبکہ اَذِّنَا سے مراد حقیقۃً اذان دینا ہو۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ تم دونوں اذان و اقامت کا خیال رکھنا تب تو دونوں کی طرف نسبت کرنے میں کوئی اشکال ہے ہی نہیں۔

ایک مشہور اشکال اور اسکا جواب: (وَلْيَؤُمَّكُمَا أَكْبَرُكُمَا) (اشکال: امامت کا حقدار وہ شخص ہوتا ہے جو کہ علم و فضل ورع و تقویٰ میں بڑھا ہوا گر اس میں برابری ہو تو پھر عمر رسیدہ کو ترجیح ہوتی ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وجوہِ ترجیحات (علم و فضل الخ) کو کیوں ذکر نہیں فرمایا؟۔ اضافہ از مترجم)

جواب: یہ دونوں صحابی اکٹھے مسلمان ہوئے تھے لہٰذا قرآن کی تلاوت اور سنت کی معلومات اور ورع و تقویٰ میں دونوں برابر تھے[1] اسلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کی عمر زیادہ ہو وہ امامت کرائے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی وجہ ترجیح باقی نہ رہی تھی۔

سفر میں صرف اقامت پر اکتفا کیا جائیگا یا اذان و اقامت دونوں کہی جائیگی: (والاول اصح) پہلا قول (یعنی سفر میں اذان و اقامت دونوں کہنی چاہئیں) اصح اس لئے ہے کہ حدیث میں ہیکہ[2] جو شخص سفر میں اذان دیتا ہے تو اس کی نماز میں اس مقام کے ملائکہ اور غیبی انسان اور مسلمان جنات سب شریک ہوتے ہیں۔ نیز قیامت کے دن ہر وہ شئے جس نے اس کی اذان سنی ہوگی اس کے حق میں گواہی دے گی۔ نیز مصنف نے قول ثانی کے ائمہ کی جو دلیل ذکر کی ہے تو اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ سفر میں اقامت بھی نہ ہونی چاہئے کیونکہ سفر میں سب ساتھی اکٹھے ہی ہوا کرتے ہیں اور اقامت کا مقصد بھی تو یہ ہوتا ہے کہ اہل مسجد کو جمع کیا جائے اور یہاں جمع کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] جیسا کہ حدیث کے مختلف طرق میں یہ بطور نص کے موجود ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ہم دونوں اس وقت علم میں برابری رکھتے تھے۔ دوسری روایت میں راوی کہتا ہے کہ میں نے ابوقلابہ سے پوچھا کہ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوا سے مقدم ہونا چاہئے تو اس وجہ ترجیح کو کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ دونوں صحابی علم و قراءت میں برابری رکھتے تھے۔ اخرجھما ابوداؤد وغیرہ

[2] علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام علماء کے نزدیک مسافر کو اذان دینا مستحب ہے سوائے عطاء کے کہ ان کے نزدیک مسافر پر اذان دینا واجب ہے لہٰذا اگر وہ بغیر اذان و اقامت کے نماز پڑھے تو اس کی نماز واجب الاعادۃ ہوگی انتہی۔

قلت: ائمہ اربعہ کے نزدیک مسافر کو اذان دینا مستحب ہے جبکہ داؤدؒ کے نزدیک ضروری ہے۔ کذا فی الاوجز

باب ماجاء فی فضل الاذان

باب ہے اذان کی فضیلت کے متعلق

☆ حَدَّثَنَا محمد بن حميد الرازى حَدَّثَنَا ابو تميلة حَدَّثَنَا ابو حمزة عن جابر عن مجاهد عن ابن عباسٍ ان النبى صلّى الله عليه وسلم قال: مَن اَذَّنَ سبعَ سِنين مُحْتَسِباً كُتِبَتْ له براءةٌ من النار۔

قال ابو عيسى: وفى الباب عن عبد الله بن مسعودٍ وثوبان، ومعاوية وانس، وابى هريرة، وابى سعيد۔

قال ابو عيسى: حديث ابن عباس حديث غريب۔ وابو تميلة اسمه يحيى بن واضح۔ وابو حمزة السكرى اسمه محمد بن ميمون۔

وجابر بن يزيد الجعفى ضعفوه، تركه يحيى بن سعيد وعبد الرحمن بن مهدى۔

قال ابو عيسى: سمعتُ الجارودَ يقول: سمعتُ وكيعاً يقول: لولا جابر الجعفى لكان اهلُ الكوفة بغير حديث، ولولا حمادٌ لكان اهل الكوفة بغير فقهٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سات سال تک ثواب کی نیت رکھتے ہوئے اذان دیتا رہے اس کیلئے دوزخ سے نجات لکھ دی گئی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس باب میں ابن مسعود، ثوبان، معاویہ، انس، ابو ہریرہ، اور ابو سعید رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث غریب ہے۔ اور ابوتمیلہ کا نام یحییٰ بن واضح ہے اور ابوحمزہ سکری کا نام محمد بن میمون ہے اور جابر بن یزید جعفی کو علماء نے ضعیف کہا ہے۔ یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی نے ان سے روایت لینا ترک کر دیا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں جارود کو کہتے ہوئے سنا کہ وکیع کہتے ہیں کہ اگر جابر جعفی نہ ہوتے تو اہل کوفہ بغیر حدیث کے رہ جاتے اور اگر حماد نہ ہوتے تو اہل کوفہ بغیر فقہ کے رہ جاتے۔

﴿تشریح﴾

وکیع کے قول کی تشریح: (ولو لا جابر الجعفى لكان اهل الكوفة بغير حديث) اہل کوفہ سے مراد سفیان الثوری

ہیں کیونکہ وکیع سفیان الثوری سے بہت سی احادیث[1] نقل کرتے ہیں۔

جابر جعفی کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جابر جعفی کو دجال کذاب فرمایا اور ان سے کوئی حدیث نقل نہیں کی۔ یہ رافضی شخص تھا ایسے راویوں سے حدیث نقل کرنے میں علماء کی مختلف رائیں ہیں۔

بدعتی سے روایت حدیث نقل کرنے کا حکم: امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر یہ بدعتی اپنے مذہب کی طرف داعی نہ ہوتو ان کی روایت قابل قبول ہوگی جبکہ وہ جھوٹ نہ بولتا ہو نیز اس راوی میں وہ تمام شرائط موجود ہوں جو ایک عادل راوی میں پائی جاتی ہیں۔

[2] امام مسلم وغیرہ کے نزدیک بدعتی کی روایت مطلقاً ہی نا قابل قبول ہے لہٰذا جابر جعفی راوی کے متعلق ان محدثین کا اختلاف واقع ہوا کیونکہ اصول میں اختلاف تھا چنانچہ سفیان ثوری وغیرہ نے ان سے روایت کو نقل کیا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان کی روایت کو نا قابل قبول قرار دیا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ اَنَّ الْاِمَامَ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ

باب ہے اس بارے میں کہ امام ضامن ہوتا ہے (مقتدیوں کا) اور موذن امانت دار ہوتا ہے

☆ حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا ابو الاحوص وابو معاية عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ، اَللّٰهُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ۔

قال ابو عيسى: وفى الباب عن عائشةو سهل بن سعدٍ، وعقبة بن عامر۔ قال ابو عيسى: حديث ابى هريرة رواه سفيان الثورى وحفص بن غياث، وغير واحد عن الاعمش عن ابى صالح عن ابى

---

[1] چنانچہ وکیع سے مروی ہے کہ یہ جابر جعفی ثقہ راوی ہے یہاں تک کہ انہوں نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی پر کلام کرو گے اور انہیں ضعیف کہو گے تو میں تمہیں ضعیف قرار دونگا۔

[2] چنانچہ امام مسلم رحمہ اللہ نے مقدمہ مسلم میں مبتدعین سے روایت نقل کرنے پر نکیر فرمائی ہے لیکن بخاریؒ ومسلمؒ دونوں نے مبتدعین سے روایتیں نقل کی ہیں کما فی التدریب۔ سیوطیؒ نے اصلِ مسئلہ میں اہل فن حدیث کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جو وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

هريرة عن النبی صلّی اللّٰه عليه وسلم۔ وروی اسباط بن محمد عن الاعمش قال: حُدِّثْتُ عَن اَبِی صَالِحٍ عن ابی هريرة عن النبی صلّی اللّٰه عليه وسلم۔ وَرَوَی نَافِعُ بْنُ سُلَيْمَانَ عن محمد بن ابی صالح عن ابيه عن عائشة عن النبی صلّی اللّٰه عليه وسلم هٰذَا الْحَدِيْثَ۔ قال ابو عيسی: وسمعت ابا زرعة يقول: حديث ابی صالح عن ابی هريرة اَصَحُّ من حديث ابی صالح عن عائشة۔

قال ابو عيسی: وسمعتُ محمداً يقول: حديثُ ابی صالح عن عائشة اصح وَذَكَرَ عَن عَلِی بن الْمَدِينِی، انه لَمْ يَثْبُتْ حديث ابی صالح عن ابی هريرة ولا حديث ابی صالح عن عائشة فی هذا۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام ضامن ہے اور موذن امانت دار۔ اے اللہ! ائمہ کو ہدایت عطا فرما اور موذنین کی مغفرت فرما۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس باب میں عائشہ، سہل بن سعد، اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سفیان ثوری، حفص بن غیاث، اور متعدد افراد نے اعمش سے انہوں نے ابو صالح سے انہوں نے ابو ہریرہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ اسباط بن محمد، اعمش سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابو صالح سے انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی۔ نافع بن سلیمان نے بھی محمد بن ابو صالح سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابو زرعہ سے سنا ہے: ابو صالح کی ابو ہریرہ سے منقول حدیث ابو صالح کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول حدیث سے اصح ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا حدیث صالح بحوالہ عائشہ رضی اللہ عنہا اصح ہے اور علی بن مدینی سے مذکور ہے کہ ابو صالح کی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ثابت نہیں اور نہ ہی ابو صالح کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے حنفیہ کا استدلال: یہ حدیث باب حنفیہ کی دلیل ہے کیونکہ ضامن (وکفیل) شخص جن لوگوں کی

طرف سے کفالت کا ذمہ لیتا ہے تو عرف عام میں اس سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ ہوتی ہے لہٰذا یہاں پر جب امام کو ضامن قرار دیا گیا تو امام ان افراد کی طرف سے ضامن ہے جن کی ذمہ داری اس نے لی ہے تو جن لوگوں نے امام کے ساتھ اپنی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ وہ لوگ بے وضوء تھے یا کوئی اور شرط نہ پائی جاتی تھی تو ایسے لوگوں کی نماز امام کے ساتھ پڑھنے سے صحیح نہ ہوگی کیونکہ نماز کی شرائط نہ پائی جانے کے باعث امام ان کی طرف سے ضمانت نہیں کرسکتا۔ ہاں! جو لوگ امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں اور ان مقتدیوں میں تمام شرائط اقتداء بھی موجود ہیں تو اگر ان کی نماز میں کوئی کمی واقع ہو تو امام جو کہ کفیل ہے وہ اس کمی کو برداشت کریگا اور ان کی نماز صحیح قرار دی جائیگی۔

یہاں الامام ضامن سے معلوم ہوا کہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہوتی ہے یعنی امام کی نماز مشتمل ہوتی ہے مقتدیوں کی نماز پر تو فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح نہیں اسی طرح ایک فرض پڑھنے والا (مثلاً ظہر کی فرض قضاء پڑھنے والا) دوسری فرض نماز پڑھنے والے (عصر کی نماز ادا کرنے والے) کی اقتداء نہیں کرسکتا کیونکہ ایک شئے اپنے مثل اور اپنے سے[1] اعلیٰ پر مشتمل نہیں ہوسکتی لہٰذا الامام ضامن کا مطلب یہ ہے کہ امام کو امامت کے معاملے میں احتیاط کرنی چاہیئے تو امام کی نماز اگر فاسد ہوگئی تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہوجائیگی لہٰذا امام

---

[1] صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں: اور غیر معذور باوضو شخص ایسے شخص کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھ سکتا جو مستحاضہ کے مثل (معذور) ہو کیونکہ غیر معذور صحیح وسالم شخص معذور سے اقویٰ ہے اور یہ معذور اپنے سے اقویٰ (غیر معذور) کی نماز کی کفالت نہیں کرسکتا کیونکہ الامام ضامن کا معنی یہ ہے کہ امام مقتدی کی نماز کا کفیل اور ضامن ہے اور اس کے حواشی میں لکھا ہے کہ۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: یہ قاعدہ ہے کہ ایک شئے جس طرح اپنے سے اعلیٰ کی کفالت نہیں کرسکتی اسی طرح اپنے مثل کی بھی کفالت نہیں کرسکتی جیسا کہ مصنف نے خود باب المضاربۃ میں اس کی تصریح کی ہے لہٰذا مقتدیوں کی نماز امام کے پیچھے ناجائز ہونی چاہیئے کیونکہ امام کی حالت اقویٰ ہونی چاہیئے؟ جواب: امام اور مقتدیوں کی حالت برابر سرابر ہوتی ہے تو اس حالت میں نماز کا جائز ہونا خلافِ قیاس، اجماع سے ثابت ہے۔ انتہی۔ لہٰذا یہ اشکال کہ ظہر کی نماز پڑھنے والے کو ظہر کی امامت کرنے والے کے پیچھے بھی نماز نہ پڑھنی چاہیئے کیونکہ دونوں کی حالت برابر سرابر ہے؟ اس کا جواب بھی ماقبل کے ضمن میں آگیا یا اس کا یہ جواب دیا جائیگا کہ حضرت گنگوہیؒ کے کلام میں مثل سے بعینہ وہی نماز مراد نہ لیں بلکہ اس نماز کے مغائر دوسرے دن کی نماز مراد ہے لہٰذا آج کے دن کے ظہر پڑھنے والے کی نماز کسی دوسرے دن کے ظہر پڑھنے والے کے پیچھے جائز نہ ہوگی۔

کوخوب احتیاط کرنی چاہیئے اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ائمہ کو ایسی دعا دی ہے جس کی طرف تمام لوگ محتاج ہیں چنانچہ فرمایا: اللھم ارشد الائمہ لفظ رشد کا مطلب ہے ہدایت اور رہنمائی کرنا اس میں معافی ضمناً آ ہی گئی۔

امام کا رتبہ مؤذن کے رتبہ سے بڑھا ہوا ہے: تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ائمہ کا رتبہ مؤذنوں سے بڑھا ہوا ہے۔ مؤذنوں کیلئے مغفرت کی دعا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ ان پر اوقات کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ نماز کے مقررہ وقت کے علاوہ وقت میں اذان نہ دیدیں تو ان سے کبھی افراط وتفریط بھی ہوسکتی ہے کیونکہ یہ اہم امانت اور ذمہ داری ہے جس کو نبھانا انسان پر مشکل ہے لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واغفر للموذنین کہکر ان کو دعاء دی۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اذان ایسے شخص کو سونپی جائے جو اوقات نماز کے داخل ہونے کو جانتا ہو کیونکہ اذان ایک امانت ہے اور یہ امانت ایسے شخص کے ذمہ لگائی جائے جو اس کا مستحق ہو اور اس کے حقوق پورے کرے۔

قال ابوعیسیٰ کی وضاحت: (حُدِّثْتُ عَنْ اَبِی صَالِحٍ) لفظِ حُدِّثْتُ[1] سے معلوم ہوا کہ ابوصالح اور اعمش کے درمیان کوئی واسطہ ہے۔

(وَذَکَرَ) امام بخاری نے ذکر کیا (عن علی[2] بن المدینی انہ لم یثبت حدیث ابی صالح عن ابی ھریرۃ) یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں (ولا حدیث ابی صالح عن عائشۃ رضی اللہ عنہا فی ھٰذا) یہ دوسری روایت ثقہ راویوں کے مخالف[3] ہونے کی وجہ سے ثابت وصحیح نہیں کیونکہ ثقہ راوی اس حدیث کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مسندات میں سے ذکر کرتے ہیں نہ کہ مسند عائشہ میں سے۔ (یہ امام علی بن مدینی کی رائے ہے کہ دونوں ہی حدیثیں ضعیف غیر ثابت ہیں۔ از مترجم)

---

[1] ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجھے ابوصالح سے خبر دی گئی اور میرے خیال میں، میں نے یہ حدیث ان سے خود سنی ہے...... تو اعمش کو تردد ہے کہ انہوں نے ابوصالح سے اس حدیث کو بلاواسطہ سنا ہے یا کسی واسطہ سے سنا ہے۔ حافظ نے التلخیص الحبیر میں اس حدیث کے مختلف طرق اور اس میں اختلاف کو ذکر فرمایا ہے۔

[2] **حدیث باب کی کونسی سند صحیح ہے؟:** اس بارے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ ابوزرعہ نے حدیث ابی صالح عن ابی ھریرۃؓ کو حدیث ابی صالح عن عائشۃ رضی اللہ عنہا سے اصح قرار دیا ہے اور امام بخاریؒ نے اس کے برعکس قول اختیار کیا ہے اور امام بخاریؒ نے علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی بھی سند صحیح اور ثابت نہیں اس کے بالکل برعکس ابن حبان نے دونوں سندوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ابوصالح نے اس حدیث کو حضرت عائشہ وابوہریرۃ رضی اللہ عنہما دونوں ہی سے سنا ہے۔ قالہ الحافظ

[3] نیز اس حدیث کی سند میں ابوصالح راوی پر اختلاف بھی واقع ہوا ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

باب ماجاء مايقول الرجل اذااَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ

باب ہے اس بارے میں کہ جب موذن اذان دے تو سننے والا کیا کہے

☆حدثنا اسحٰق بن موسى الانصارى حَدَّثَنَا معن حَدَّثَنَا مالك قال:وحدثنا قُتَيْبَةُ عن مالك عن الزهرى عن عطاء بن زيدى الليثى عن ابى سعيد قال:قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم :اذا سَمعتمُ النداءَ فقولُوا مِثْلَ مايقولُ المُؤَذِّنُ۔

قال ابو عيسى: وفى الباب عن ابى رافع وابى هريرة وام حبيبة، وعبد اللّٰه بن عمرو، وعبد اللّٰه بن ربيعة، وعائشة ، ومعاذبن انس ومعاوية۔

قال ابو عيسى: حديث ابى سعيد حديث حسن صحيحٌ۔

وهكذا رَوَى مَعْمَرٌ وغيرُ واحد عن الزهرى مثل حديث مالك، وروى عبد الرحمن بن اسحٰق عن الزهرى، هذا الحديث عن سعيد بن المسيب عن ابى هريرة عن النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم ورواية مالك اصح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جب تم اذان سنوتو اسی طرح کہوجس طرح موذن کہتا ہے۔

اوراس باب میں ابورافع ،ابوہریرہ، ام حبیبہ،عبداللہ بن عمر،عبداللہ بن ربیعہ، عائشہ، معاذ بن انس اور معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی احادیث مروی ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوسعید کی حدیث حسن صحیح ہے اسی طرح معمر اور متعدد راوی زہری سے مالک کی حدیث کی مانند بیان کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے یہ حدیث زہری سے روایت کی ہے وہ سعید بن میّب سے وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جبکہ مالک کی روایت اصح ہے۔

﴿تشریح﴾

(فقولوا مثل ما یقول الموذن) اس حدیث میں بطور تغلیب [۱] کے فرمایا کہ جس طرح موذن کہے وہی کلمات کہا (چنانچہ دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ حیعلتین کا جواب حوقلتین کے ساتھ ہوگا۔ از مترجم)

باب ماجاء فی کراھیة ان یاخذ المُؤَذِّن علی الاذان اجرا

باب ہے موذن کا اذان پر اجرت لینے کی کراہت کے متعلق

☆ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا ابو زبید وهو عبثر بن القاسم عن اشعث عن الحسن عن عثمان بن ابی العاص قال اِنَّ مِن آخِرِ ماعَهِدَاِلَیَّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علی وسلم اَنْ اَتَّخِذَ مُؤَذِّناً لَایَاخُذُ عَلٰی اَذَانِهٖ اَجراً۔

قال ابو عیسی: حدیث عثمان حدیث حسن صحیح۔ والعمل علی هذا عند اهل العلم: کرهواان یاخذ الموذن علی الاذان اجراً،واستحبوا للمؤذن ان یحتسب فی اذانه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجھے آخری وصیت یہ تھی کہ میں ایسا موذن مقرر کروں جو اپنی اذان پر اجرت نہ لے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث عثمان حسن ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ انہوں نے موذن کے اذان پر اجرت لینے کو مکروہ سمجھا اور پسند کیا موذن کیلئے کہ وہ ثوابِ اخروی کیلئے اذان دے۔

---

[۱] **اذان کے جواب دینے کا شرعی حکم:** یعنی حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنا راجح ہے اس حدیث کے مسئلہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ اذان کا جواب دینا ظاہر یہ اور ابن حبیب کے یہاں واجب ہے اور جمہور کے نزدیک مستحب ہے۔ مشائخِ حنفیہ کے دونوں قول ہیں کہ اذان کا جواب ایک قول میں واجب ہے دوسرے قول میں مستحب۔ جیسا کہ شامی نے تصریح کی ہے۔ ابن قدامہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اذان کا جواب دینا مستحب ہے۔

حیعلتین کے جواب میں کیا کہا جائے: دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اذان کا جواب کن الفاظ سے دیا جائے تو ایک قول یہ ہے کہ جس طرح موذن کہے بعینہ تمام الفاظ جواب میں اسی طرح کہے جائیں۔ جیسا کہ شامی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے اور یہی بعض حنابلہ سے ایسے ہے اور بعض مالکیہ کی ایک روایت بھی ہے لیکن ائمہ اربعہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ حی علی الصلاۃ حی علی الفلاح کا جواب لا حول ولاقوۃ الا باللہ کے ساتھ دیا جائے۔ کما بسطه فی اوجز المسالك

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب احناف کا مستدل ہے: (کرھوا ان یاخذ علی الاذان اجرا) یہ حدیث باب شافعیہ کے مذہب کے خلاف[1] ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کی تعلیم پر مشاہرہ اور اجرت لینا جائز ہے لیکن شوافع یہ جواب دے سکتے ہیں کہ حدیث باب میں یہ حکم ہے کہ متولی ایسا موذن نہ رکھے، موذن کو اجرت لینے سے منع نہیں فرمایا لہٰذا قرآن کی تعلیم اور وعظ و نصیحت پر اجرت لینا ان کے مذہب میں جائز ہے۔ ہمارے علماء احناف کے متقدمین نے ان احادیث کے پیش نظر اذان وغیرہ پر اجرت کو منع فرمایا لیکن متاخرین حنفیہ نے ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا لہٰذا ہمارے مذہب میں بھی تعلیم القرآن، وعظ اور اذان پر اجرت لینا جائز ہے۔

تراویح میں قرآن سنانے والے کو اجرت لینا ناجائز ہے: لیکن تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینا ناجائز ہے اسی طرح مُردوں کو ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی کرنے والوں کو اجرت لینا حرام ہے کیونکہ اس میں کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تراویح میں غیر حافظ کو بھی امام بنایا جا سکتا ہے تو ایسا غیر حافظ امام جو اجرت نہ لے چھوٹی سورتیں تراویح میں پڑھا دے جو اسے یاد ہوں۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: قرآن کو تراویح میں ایک دفعہ ختم کرنا سنت موکدہ ہے لہٰذا اس کو ضرورت کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ جواب:[2]

---

[1] **اذان پر اجرت لینا حنفیہ کے اصل مذہب میں ناجائز ہے:** ابن قدامہ فرماتے ہیں: ظاہر المذہب کے مطابق اذان پر اجرت لینا ناجائز ہے اوزاعی، ابن منذر رحمہما اللہ نے اسے مکروہ فرمایا ہے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ اور بعض شافعیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ ایک متعین عمل ہے تو اس پر اجرت جائز ہونی چاہئے۔ انتہی۔ قلت: حنفیہ کے اصل مذہب میں اذان پر اجرت لینا ممنوع ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اور ہمارے شیخ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ نے بذل میں اس مسئلہ کو تفصیلاً لکھا ہے۔ ابن رسلان وغیرہ شوافع نے حدیث باب کا یہ جواب دیا ہے کہ اجرت لینا خلافِ اولیٰ ہے بالکل منع نہیں۔

[2] اصل مخطوطہ میں اس طرح لفظ جواب کے بعد خالی جگہ ہے۔ میرے نزدیک بہترین جواب یہ ہے کہ تراویح میں ایک بار قرآن ختم کرنا سنت موکدہ نہیں ہے بلکہ نفس تراویح کا پڑھنا سنت موکدہ ہے اور باجماعت تراویح پڑھنا سنت علی الکفایہ ہے جیسا کہ اہل فروع نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور تراویح میں ایک دفعہ پورا قرآن ختم کرنا اس کو سنت تو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سنت موکدہ نہیں کیونکہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر پورا قرآن پڑھنے میں لوگ سستی برتیں تو تراویح میں اتنا پڑھے جو انکی اکتاہٹ کا باعث نہ ہوتا کہ وہ تراویح ہی نہ چھوڑ جائیں لہٰذا جب ان کی اکتاہٹ کے خیال سے ختم قرآن کو چھوڑا جا سکتا ہے تو لوگوں کے ختم قرآن کی رعایت میں وہ حنفیہ کے مذہب کو چھوڑ کر اس ختم قرآن فی التراویح پر اجرت لینے کا قول کیسے درست ہو سکتا ہے؟

باب ماجاء مایقول الرجل اذا اذن الموذن من الدعاء

باب اس بارے میں کہ موذن جب اذان دے تو سننے والا کیا پڑھے

☆حدثنا قتبة حَدَّثَنَا اللیث عن الحکیم بن عبد اللّٰہ بن قیس عن عامر بن سعد عن سعد بن ابی وقاص عن رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم قال:مَن قال حینَ یسمع المؤَذِّنَ :وانااَشْھَدُ ان لااِلٰہ اِلا اللّٰہ وحدَہُ لاشریك لہ، وان محمداًعبدہُ ورسولُہُ، رَضِیتُ باللّٰہ رباً وبمحمدٍ رسولاً وبالاسلام دیناً۔ غَفَرَاللّٰہُ لہ ذُنُوبَہٗ۔ قال ابو عیسی: وھٰذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ غریبٌ لانَعْرِفُہُ اِلَّا مِن حدیث اللیث بن سعدٍ عن حُکَیمُ بن عبد اللّٰہ بن قیسٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا جس نے موذن کی اذان سننے کے بعد یہ کہاوانا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ وان محمدا عبدہ ورسولہ رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ہم اسے لیث بن سعد کی حکیم بن عبداللہ بن قیس کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔

باب منه آخر

باب ہے اسی سے متعلق (اذان کے بعد کی سنت دعا)

☆حدثنا محمد بن سھل بن عسکر البغدادی وابراھیم بن یعقوب قالا: حَدَّثَنَا علیٌّ بن عیاش الحمصی حَدَّثَنَا شعیب بن ابی حمزۃ حَدَّثَنَا محمد بن المنکدر عن جابر بن عبد اللّٰہ قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: مَنْ قال حین یسمعُ النداء:اللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذہ الدَّعوۃِ التامَّۃِ والصلاۃِ القائمۃِ آتِ محمداً الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ۔ الا حلت لہ الشفاعۃ یوم القیامۃ۔

قال ابو عیسی: حدیث جابر حدیث صحیح حسن غریب من حدیث محمد بن المنکدر، لانعلم احدا رواہ غیر شعیب بن ابی حمزۃ عن محمد بن المنکدر۔ وابو حمزۃ اسمہ دینار۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اذان سننے کے بعد یہ کہا اے اللہ! اس کامل دعا کے مالک اور نمازِ قائمہ کے پروردگار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور بزرگی عطا فرما اور ان کو مقامِ محمود پر پہنچا جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ تو قیامت کے دن اس کیلئے میری شفاعت حلال ہو گی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث محمد بن منکدر کی روایت سے حسن غریب ہے ہم نہیں جانتے کہ اسے شعیب بن ابی حمزہ کے علاوہ کسی اور نے روایت کیا ہو۔

﴿تشریح﴾

حلت کے معنی کی تشریح: (حلت)[1] یعنی یہ شخص شفاعت کا مستحق ہو جاتا ہے اور یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی مستحق شخص کو بغیر شفاعت کے محروم چھوڑ دینگے جبکہ اس امتی کو شفاعت کی ضرورت بھی ہوگی (لہٰذا اس تاویل کی ضرورت نہیں ہے کہ حلت کا معنی وجبت ہو)۔

دوسری توجیہ: یہ ہے کہ مآلاً اسے شفاعت حاصل ہو جائیگی (یہ حَلَّتْ کا معنی ہے) دونوں معنوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی توجیہ جو ہم نے ذکر کی ہے اس میں حلت کا اپنا مشہور معنی مراد ہے یعنی اس شخص پر شفاعت حرام نہ ہوگی بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں اس شخص کی شفاعت فرمائینگے کیونکہ یہ شخص اس وقت سفارش کا بہت ہی محتاج ہوگا لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ

---

[1] ابوالطیب کہتے ہیں بخاریؒ کی روایت میں لفظ حلت الا کے بغیر ہے اور یہی بظاہر صحیح ہے لیکن جن روایتوں میں الا حلت ہے تو حدیث میں من قال حین یسمع الموذن میں مَن استفہامیہ مراد لیا جائے اور استفہام انکاری ہو اور قال یقول کے معنی میں ہو لہٰذا اب اس کا معنی نفی کا ہو جائیگا کہ کوئی شخص یہ کلمات نہیں پڑھیگا مگر میری شفاعت اس پر حلال ہو جائیگی۔ حلت کا معنی وجبت ہے کیونکہ طحاوی میں الا وجبت کے الفاظ ہیں...... نیز یہ تاویل بھی ممکن ہے کہ لام بمعنی علیٰ ہو اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں حلت علیہ کے الفاظ ہیں یہاں حلت سے مراد حلال نہیں جو حرام کے مدمقابل ہوتا ہے کیونکہ یہ شفاعت تو ہر مسلمان کیلئے حلال ہوتی ہے جبکہ اس دعاء کے پڑھنے والے کے لئے واجب ہو جاتی ہے۔ یا یہ تاویل کی جائے کہ یہ شفاعت صرف ان کیلئے حلال ہے جن کے لئے اجازت ملیگی تو اب حَلَّتْ کنایہ ہوگا شفاعت کی اجازت مل جانے سے۔ انتہی

علیہ وسلم اسے بغیر سفارش خالی ہاتھ نہ چھوڑیں گے کیونکہ بڑا ہی ضرورت مند ہوگا اس معنی کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی شئے لازم نہیں ہوتی۔ دوسرے معنی کے مطابق آپ صلی اللہ علہ وسلم پر کچھ لزوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دعا کر کے آپ پر احسان کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اس احسان کا بدلہ لازم فرمالیا تھا اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کر کے اس کا احسان کا بدلہ چکائیں گے۔[1] ان شاء اللہ تعالیٰ

باب ماجاء فی ان الدعاء لایرد بین الاذان والا قامة

باب ہے اس بارے میں کہ اذان واقامت کے درمیان مانگی جانے والی دعا رد نہیں کی جاتی

☆ حَدَّثَنَا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا وكيع وعبد الرزاق وابو احمد وابو نعم قالوا: حَدَّثَنَا سفيان عن زيد العمی عن ابی ایاس معاوية بن قُرَّةَ عن انس بن مالكٍ قال: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: الدعاء لايرد بين الاذان والا قامة۔

قال ابو عيسى: حديث انس حديث حسن۔وقد رواه ابو اسحٰق الهمدانی عن بريد بن ابی مريم عن انس عن النبی صلّى اللّٰه عليه وسلم مثل هذا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اذان واقامت کے درمیان دعا کبھی رد نہیں کی جاتی (یعنی ہمیشہ قبول ہوتی ہے)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس رضی اللہ عنہ حسن ہے اور اسے ابن اسحٰق ہمدانی نے برید بن ابی مریم سے انہوں نے انس رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل بیان کیا ہے۔

---

[1] جامع ترمذی میں اس باب کے بعد باب الدعاء لا يرد بين الاذان والاقامة ہے لیکن حضرت والد صاحب نے اس باب کو جمعہ کے ابواب کے درمیان ذکر کیا ہے اسلئے ہم بھی انکا اتباع کرتے ہوئے اسے جمعہ کے ابواب کے درمیان ذکر کرینگے کیونکہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے۔ (از مترجم: یہ بات الکوکب الدری صفحہ ۱۴۱ پر باب ما جاء فی التبكير الى الجمعة اور باب ما جاء فی ترك الجمعة من غير عذر کے درمیان میں مذکور ہے)۔

باب ماجاء کم فَرَضَ اللّٰه علی عِبَادِهٖ من الصلوات

باب ہے اس بارے میں کہ اللہ نے اپنے بندوں پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں

☆حدثنا محمد بن یحیی النیسابوری حَدَّثَنَا عبد الرزاق اخبرنا معمر عن الزهری عن انس بن مالك قال: فُرِضَتْ علی النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم لیلة أُسْرِیَ بِهِ الصَّلَوَاتُ خَمْسِینَ، ثم نُقِصَتْ حتی جُعِلَتْ خَمْساً ثُمَّ نُودِیَ: یامحمدُ، انه لا یُبَدَّلُ القولُ لَدَیَّ، وَاِنَّ لك بهذا الخمسِ خمسین۔

قال : وفی الباب عن عُبَادَةَ بن الصَّامِتِ، وطلحَةَ بن عُبید اللّٰه، وابی ذَرٍ، وابی قتادة، ومالك بن صَعْصَعَةَ، وابی سعید الخدری۔ قال ابو عیسی: حدیث انس حدیث حسن صحیحٌ غریب۔

﴿ترجمه﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شبِ معراج میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں پھر ان میں کمی کی گئی یہاں تک کہ پانچ رہ گئیں۔ پھر پکارا گیا اے محمد! ہمارے قول میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی اور بلاشبہ آپ کیلئے ان پانچ نمازوں کا پچاس نمازوں کے برابر ثواب ہے۔

اور اس باب میں عبادہ بن صامت، طلحہ بن عبید اللہ، ابوقتادہ، ابوذر، مالک بن صعصعہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

واقعہ اسراء کس سن میں ہوا؟ (ثم نودی یا محمد) ایک قول کے مطابق دو ربیع الاول سنہ سات نبوی[1] میں یہ

---

[1] من الهجرة لفظ غلطی ہے صحیح لفظ من النبوة ہے یعنی نبوت کے ساتویں سال معراج والا واقعہ رونما ہوا۔ (از مترجم: علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی ص۶: جلد ۸ پر لکھا ہے کہ لیلۃ الاسراء کون سے سن نبوی میں ہوئی اس میں متعدد اقوال ہیں: ۱۔ نبوت کے دس سال اور تین ماہ بعد، ۲۔ نبوت کے پانچویں یا چھٹے سال، ۳۔ نبوت کے بارھویں سال، ۴۔ ہجرت سے ایک سال اور پانچ یا تین ماہ قبل...... پھر اس میں اختلاف ہے کہ شبِ معراج کون سے مہینے میں ہوئی: ۱۔ ماہ ربیع الاول میں، ۲۔ ماہ ربیع الثانی میں، ۳۔ ماہِ رجب میں، ۴۔ ماہ رمضان میں، ۵۔ ماہ شوال میں۔ پھر کونسی تاریخ تھی اس میں بھی اختلاف ہے: ۱۔ سترہ ربیع الاول، ۲۔ ستائیس ربیع الآخر الی آخر ما قال۔ لہٰذا ستائیس رجب کو شب معراج منانے کی کوئی اصل نہیں۔

اسراء کا واقعہ پیش آیا ور دوسرا قول یہ ہے کہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۲ نبوی میں یہ واقعہ پیش آیا۔

حدیث کی شرح میں دو قول: (لَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

ا۔ یہ نسخ اور تبدیلی بندوں کی سمجھ کے اعتبار سے ہو یعنی بندوں کی سمجھ کے اعتبار سے اب اس میں تبدیلی ناممکن ہے یہ نمازیں پانچ ہی رہینگی البتہ اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں کہ یہ حکم کس وقت تک ہے تو اللہ جل جلالہ خوب جانتے ہیں کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ابتداء میں پچاس نمازیں فرض تھیں پھر کچھ مدت کے بعد پینتالیس رہ گئیں پھر چالیس کر دی گئی اسی طرح پانچ پانچ کم کی گئیں یہاں تک کہ بالآخر پانچ نمازوں پر حکم شرعی آ کر ٹھہر گیا۔ شروع میں پچاس نمازوں کا ہونا پھر بالآخر پانچ ہو جانے کی توجیہ یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ (اللہ تبارک وتعالیٰ) کے علم کے اعتبار سے تو فرض نمازیں پانچ ہی تھیں اور ان پر پچاس نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن اے نبی! آپ یہ سمجھے تھے کہ نمازیں پچاس فرض کی گئی ہیں اسلئے آپ نے اس میں تخفیف کا مطالبہ شروع کر دیا اور ہم نے بھی اس مطالبہ کے وقت آپ کو تنبیہ نہیں فرمائی تھی لہٰذا تخفیف کے مطابق پانچ پانچ کم کرتے گئے لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ نے وان لك بهذا الخمس خمسين سے اصل بات کی طرف تنبیہ فرما دی تا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہو جائے وہ یہ نہ سمجھیں کہ اس تخفیف کرانے سے امت کے ثواب میں بھی کمی ہو جائیگی اور آپ کو یہ خیال بھی دامن گیر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں حکم کو پورا کرنے کی صلاحیت میں کمی دیکھی اسلئے تخفیف فرمائی ہوگی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے ان وساوس کو دور کرنے کیلئے فرمایا "یا محمد انه لا يبدل القول لدی" یعنی اے محمد! ہم نے اوّلاً پچاس نمازیں فرض کی ہوں پھر آپ کی امت میں کمزوری اور حکم کو نہ ماننے کی صفت کو دیکھ کر تخفیف فرمائی ہو...... بات دراصل اس طرح نہیں بلکہ ہمارے علم ازلی میں صرف پانچ نمازیں فرض تھیں اور ان پر پچاس نمازوں کے ثواب کا وعدہ ہے۔

پہلے پچاس نمازیں فرض فرما کر پھر تدریجاً کمی کر کے پانچ نمازیں فرض کیے جانے میں حکمت: رہا ظاہر میں اللہ تعالیٰ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً پچاس نمازوں کا حکم دینا پھر تدریجاً پانچ نمازوں کا فرض قرار دیئے جانے میں کیا نکتہ ہے؟ تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالانے اور فرمانبرداری کی انتہاء کو ظاہر کرنا تھا نیز یہ ظاہر کرنا تھا کہ امت محمدیہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا کہ جو بھی اوامر یا نواہی لاؤنگا اسے میری امت کے لوگ فوراً قبول کر لیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ خوف نہ کرتے کہ جو بھی اللہ کا حکم

نازل ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام خوف وڈر فرماتے کہ میری امت اسے قبول بھی کریگی یانہیں؟ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس تھوڑی سی مدت میں جتنے احکامات نازل ہوئے سب کو قبول فرمایا اور آپ نے یہ نہیں سوچا کہ مشاغل اور دیگر ضروریات کیوجہ سے میری امت ان احکامات پر عمل کرنے کی صورت میں بڑی آزمائش[1] میں پڑ جائیگی۔ بہرحال ان طاعات میں اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو وہ ہماری طرف منسوب ہونی چاہیئے اور اسے ہمارا گناہ سمجھنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کی طرف یہ نسبت نہ کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے مشقت والے مشکل اعمال ہم پر لازم کردیئے۔

بادشاہ محمود اور ایاز کا واقعہ: اس کی مثال ایسی ہے کہ ایاز[2] کا یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ بادشاہ وقت نے کانچ (بلور سفید و شفاف جوہر قسم کا ایک شیشہ (مصباح الغات ص ۷۱) کا ایک خوبصورت پیالہ خریدا جس کی قیمت[3] ایک ہزار (درہم یا دینار) تھی پھر ایاز کو حکم دیا کہ اسے توڑ دو! اس نے فوراً ہی توڑ ڈالا پھر بادشاہ نے کہا کہ اے ایاز! تم نے یہ پیالہ کیوں توڑا؟ تو ایاز نے کہا کہ میرے آقا! مجھ سے گناہ اور غلطی صادر ہوئی آپ اسے معاف فرما کر درگزر فرمایئے اسی طرح معراج کے واقعہ میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ عبودت کو ظاہر کرنا ہے اور یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات خندہ پیشانی سے قبول فرمانے والے ہیں۔

دوسرا مطلب: اس حدیثِ باب کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ شاید کسی کو اس طرح کم کرنے سے شبہ ہو کہ ان پانچ نمازوں میں بھی کمی ہوسکتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "لا یبدل القول لدی" یعنی پانچ نمازوں کی فرضیت ایک محکم فیصلہ ہے اس میں تبدیلی ناممکن ہے لہٰذا پانچ نمازوں سے کمی نہیں کی جائیگی۔

---

[1] اصل مخطوطہ میں یہاں الھرج ھا کے ساتھ ہے اگر یہ صحیح ہو تو اس کا معنی فتنہ وفساد کے ہیں۔

[2] یہ واقعہ اس وقت ہوا جب محمود بادشاہ نے ایاز کے کمال ادب اور انتہائی مطیع ہونے کا اظہار کرنا چاہا تاکہ ایاز کے بارے میں اسے ملامت کرنے والے خاموش ہوجائیں۔

[3] مولانا رضی الحسن کی تقریر میں ہے کہ یہ پیالہ دس ہزار درہم یا دینار کا تھا۔

باب ماجاء فی فضل الصلوات الخمس

باب ہے پانچ نمازوں کی فضیلت کے متعلق

☆ حَدَّثَنَا علی بن حجر اخبرنا اسمٰعیل بن جعفر عن العلاء بن عبد الرحمٰن عن ابیه عن ابی هریرة ان رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: الصلواتُ الخمسُ والجمعة الی الجمعةِ کَفَّارَاتٌ لما بینهنَّ، مالم تُغْشَ الکبائر۔

قال : وفی الباب عن جابر، وانس، وحنظلة الاسیدی۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ نمازیں اور ایک جمعہ آئندہ جمعہ تک گناہوں کا کفارہ ہے (صغیرہ گناہوں کا) بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

اور اس باب میں جابر، انس اور حنظلہ رضی اللہ عنہم اور اسیدی رضی اللہ عنہ سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے معتزلہ کا استدلال اور اسکا جواب: (کفارات لما بینهن ما لم یغش الکبائر) اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص گناہ کبیرہ کرلے تو اس کے گناہ بالکل معاف نہ ہونگے نہ کبائر نہ ہی صغائر (یہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ از مترجم) اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً یہ استدلال ان علماء کے مذہب کے مطابق ہے کہ جن کے نزدیک مفہوم مخالف حجت ہے۔ حنفیہ کے نزدیک چونکہ مفہوم مخالف معتبر نہیں لہٰذا اس حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں اس کے تمام گناہ معاف ہو جائینگے یا جب تک انسان گناہ کبیرہ نہیں کرتا اس کے تمام صغائر معاف قرار دیئے جائینگے لیکن جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو چکا ہے تو گناہ کبیرہ کرنے کے بعد اس کے صغائر معاف ہونگے کہ نہیں؟ تو حدیث اس کے حکم کے بیان سے ساکت ہے لہٰذا اس صورت حال کیلئے دوسری روایات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے

تو دوسری روایات میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ گناہِ کبیرہ کے صادر ہونے کے بعد بھی تمام گناہ معاف ہو جائینگے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان "ان تجتنبوا کبائرما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم" سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے اور وہ استدلال اس طرح ہے کہ سیئات سے تمام گناہ مراد لئے جائیں تو اب مطلب یہ ہوگا کہ اگر کبیرہ گناہوں سے بچو گے تو تمام گناہ معاف کر دیئے جائینگے لیکن اگر کبائر سے نہ بچو گے تو صرف صغائر معاف کیئے جائینگے۔ (تو یہ آیت ہمارے مذہب کے مطابق ہوئی)۔

اشکال: جب پانچوں نمازوں سے گناہ معاف ہو گئے تو اب جمعہ سے کون سے گناہ معاف ہونگے؟

جواب: نمازوں میں جو کمی کوتاہی رہ گئی اور جس طرح اسے پڑھنا چاہیئے تھا اس طرح نہ پڑھ سکے تو یہ کوتاہی جمعہ کی نماز سے معاف کر دی جائیگی۔

۲۔ یا اس سے رفع درجات ہونگے[۱] جو کہ تکفیر کے قائم مقام ہوگا۔

اصل اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ کفارات لما بینھن اس حدیث میں لفظ "ما" عام ہے ہر گناہ کبیرہ صغیرہ کو شامل ہے اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ان پانچوں نمازوں اور جمعہ کی نماز سے ہر قسم کے صغیرہ[۲] اور کبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائینگے جب تک کہ انسان کبیرہ گناہ نہ کرے لیکن جب انسان سے کبیرہ گناہ صادر ہو گیا تو یہ نمازیں صرف صغائر کو معاف کروائیں گی نہ کہ کبائر کو۔ اور جس شخص کے صرف کبیرہ گناہ ہی ہیں، صغیرہ گناہ ہے ہی نہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے کبیرہ گناہوں[۳] میں اتنی تخفیف فرمائینگے جتنی اس مدت میں صغائر ہوتے اللہ کے علم میں اس کے بقدر تخفیف فرمائینگے (یعنی جتنے اس مدت میں صغائر ہوتے اتنی ہی تخفیف کبائر میں ہوگی)۔ وھذا ظاہر والحمد للہ

---

۱ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پہلے سے گناہ معاف ہوں اب اس کی طرف کوئی مکفر فعل متوجہ ہو تو وہ اس کے رفع درجات کا سبب بنیگا

۲ لیکن یہ بات قابل اشکال ہے کہ کبیرہ گناہ اس وقت معاف ہونگے جب تک کہ انسان کبیرہ گناہ نہ کرے (جیسا کہ حضرتؒ کے کلام سے سمجھ میں آرہا ہے) البتہ یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہاں کبیرہ کے ذکر کرنے سے مقصود عموم کو بیان کرنا ہے قطع نظر اس سے کہ اس کے گناہ کبیرہ صادر ہوئے ہیں یا نہیں۔

۳ امام نووی رحمہ اللہ نے اس توجیہ کو اس طرح لکھا ہے کہ امید ہے کہ اس کے کبائر میں تخفیف کر دی جائے لیکن ابن سید الناس نے ان پر اعتراض کیا ہے۔ کما فی القوت

باب ماجاء فی فضل الجماعة

باب ہے جماعت کی فضیلت کے متعلق

☆حدثنا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا عبدة عن عبيد الله بن عمر عن نافع عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: صلاةُ الجماعةِ تَفضُلُ على صلاةِ الرجلِ وحدَهُ بسبعٍ وعشرينَ درجةً۔

قال: وفی الباب عن عبد الله بن مسعود وابی بن كعب ومعاذ بن جبل، وابی سعيد، وابی هريرة وانس بن مالك۔

قال ابو عيسى: حديثُ ابن عمر حديث حسن صحيح۔

وهكذا رَوَى نافع عن ابن عمر عن النبی صلّى الله عليه وسلم انه قال: تَفضُلُ صلاةُ الجميع على صلاة الرجل وحده بسبع وعشرين درجة۔قال ابو عيسى: وعامة من روى عن النبی صلّى الله عليه وسلم انما قالوا خمس وعشرين الا ابن عمر فانه قال: بسبع وعشرين۔

☆حدثنا اسحق بن موسى الانصاری حَدَّثَنَا معن حَدَّثَنَا مالك عن ابنِ شهاب عن سعيد بن المسيب عن ابی هريرة ان رسول الله صلّى الله عليه وسلم قال:اِنَّ صلاة الرجل فی الجماعة تزيد على صلاته وحدَهُ بخمس وعشرين جُزْئًا۔قال ابوعيسى: هذا حديث حسن صحيح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا آدمی کی اکیلے نماز (پڑھنے) پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے۔

اور اس باب میں عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوسعید، ابو ہریرہ، اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہے۔اسی طرح نافع نے بھی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اورانہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جماعت کی نماز آدمی کے اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ افضل ہے اکثر راویوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ پچیس درجہ سوائے ابن عمر رضی اللہ عنہما

کے کہ انہوں نے فرمایا ستائیس درجہ۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جماعت سے نماز پڑھنے والے شخص کی نماز اس کے اکیلے نماز پڑھنے سے پچیس درجہ افضل ہوتی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(از مترجم: حدیث باب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں باجماعت نماز پڑھنے پر ستائیس درجہ فضیلت کا ذکر ہے جبکہ دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ اور اکثر صحابہ کی روایت میں پچیس درجہ فضیلت کا ذکر ہے)۔

جماعت سے نماز پڑھنے میں ستائیس درجہ فضیلت ہے یا پچیس ان میں تطبیق: ان میں تطبیق[1] یہ ہے کہ (۱) پہلے پچیس والی فضیلت ذکر کی گئی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ثواب میں اضافہ فرما کر ستائیس درجہ فضیلت فرمادی۔ ستائیس درجہ فضیلت والی حدیث صرف ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہنچی تھی دوسرے صحابہ کو نہیں پہنچی۔

تطبیق نمبر۲: ہاں ان دونوں حدیثوں میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ (از مترجم: جماعت کے کم از کم دوفرد ہیں تو) ایک درجہ ثواب جو ثواب اصلی کہلاتا ہے وہ آدمی کی نماز پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا درجہ ثواب (از مترجم: یعنی ثواب فضل) باجماعت امام کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ (تو جس روایت میں ستائیس درجہ فضیلت کا ذکر ہے اس میں ان دونوں ثواب اصلی اور پچیس درجہ ثواب زائد سب کو شمار کیا گیا اور دوسری حدیث میں امام اور مقتدی کی نماز کا ثواب اصلی کو چھوڑ کر صرف ثواب زائد پچیس درجہ کو ذکر کیا گیا)۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر احسانات میں سے ایک احسان یہ ہے کہ وہ ہر تھوڑے سے عمل پر بہت زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے اس کی مثال انسان کی فرض نماز ہے کہ اس پر

---

[1] ان دونوں حدیثوں کی توجیہ میں شراح حدیث کا اختلاف ہے۔ بعض شراح نے ترجیح کا طریقہ اختیار کیا ہے اور بعض نے تطبیق کا: پہلے قول والوں میں سے بعض علماء نے پچیس درجہ والی حدیث کو ترجیح دی ہے کیونکہ اکثر راویوں نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے ستائیس درجہ والی روایت کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ ثقہ راوی کی زیادتی ہے جو کہ قابل قبول ہے۔ تطبیق والے علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں چنانچہ میں نے اوجز میں دس سے زیادہ اس کی توجیہات ذکر کی ہیں۔

اس قدر ثواب کثیر عطا کیا جاتا ہے چونکہ یہ وہم ہوسکتا ہے کہ فرض نماز پڑھنے پر انسان کو ثواب نہیں ملنا چاہئیے کیونکہ وہ تو ایک قرضہ کی مانند ہے اور مقروض جب اپنا قرضہ ادا کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا کمال ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے باب "باب فی فضل الصلوات الخمس" سے اس وہم کو دور فرمایا (کہ فرض نماز پڑھنے پر کیا فضیلتیں اور ثواب ہیں اور یہ مکفرات ہوتی ہیں) اسی طرح باجماعت نماز پڑھنے پر بھی بہت بڑے اجر عظیم کا وعدہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے پچیس نمازوں[۱] کا ثواب عطا فرمانیکا وعدہ فرمایا کیونکہ ایک جگہ جمع ہوکر نماز پڑھنے سے تعاکس انوارات ہوتے ہیں اور اس طرح ان کی نمازوں کا ثواب بڑھ جاتا ہے اسی طرح ایک شخص فرض نماز منفرداً پڑھتا تو اسے اکہرا ثواب ملتا لیکن اگر وہ امام کے ساتھ نماز پڑھے گا تو اسے منفرداً نماز پڑھنے کے مقابلہ میں دوگنا ثواب ملیگا۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ایکم یتجر علی ھذا سے اس کا ثبوت ملتا ہے اگر اس طرح امام اور مقتدی کو زیادہ ثواب نہ ملتا ہو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تجارت کے لفظ سے تعبیر[۲] نہ فرماتے جب یہ تمہید سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ راوی نے باجماعت نماز کے (پچیس درجہ) ثواب فضل اور امام اور مقتدی کی اپنی اپنی نمازوں[۳] کے ثواب اصلی (دو درجہ ثواب) دونوں کو جمع فرما کر ستائیس درجہ کو ذکر فرمایا لیکن اکثر راویوں نے باجماعت نماز پڑھنے پر پچیس درجہ زیادتی اور فضیلت کو تو ذکر فرمایا لیکن دونوں نمازوں کے ثواب اصلی کو ذکر نہیں فرمایا اسلئے کہ ثواب اصلی کا ملنا تو سبھوں کو معلوم تھا۔

وفی الباب کی تشریح: (وفی الباب عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان صحابہ سے ستائیس درجہ فضیلت والی حدیث مروی ہے کیونکہ یہ معنی غلط[۴] ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان صحابہ سے جماعت کی فضیلت کے متعلق احادیث مروی ہیں نہ کہ ان سے خاص ستائیس درجہ والی فضیلت مروی ہے۔ فافھم و تفکر و تشکر

---

[۱] ابن رسلان نے اللہ تعالیٰ کے انعامات کی کثرت کو مزید تفصیل سے لکھا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: کہ باجماعت نماز میں اللہ تعالیٰ دوگنا ثواب عطا فرماتے ہیں تو وہ دو نمازوں کے ثواب کے برابر ہوجاتا ہے پھر اس کا دوگنا ہوکر چار نمازوں کے ثواب پھر اس کا دوگنا آٹھ نمازوں کا ثواب عطا فرماتے ہیں اسی طرح نماز کے ثواب میں اضافہ کیا جاتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک نماز پر پچیس درجہ فضیلت عطا کی جاتی ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل عظیم کا اظہار فرماتے ہیں۔ کذا فی الاوجز

[۲] یعنی اس حدیث میں تجارت کے لفظ سے تعبیر اس کی دلیل ہے (کہ امام و مقتدی دونوں کو باجماعت نماز پڑھنے پر زیادہ ثواب ملتا ہے۔ از مترجم)

[۳] یعنی امام کی نماز کا ثواب اصل اور اس شخص کی نماز کا ثواب اصلی (دونوں کا ثواب فضل پچیس درجہ ثواب کیساتھ جمع کیا: از مترجم)

[۴] کیونکہ مصنفؒ نے خود ہی تصریح کی ہے کہ اکثر راوی اس حدیث کو خمس وعشرین درجہ کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں سوائے ابن عمر رضی اللہ عنہ کے۔ عینی رحمہ اللہ نے ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے خمس وعشرین درجۃ والی حدیث صحیح بخاری کی شرح میں نقل کی ہیں۔

باب ماجاء فيمن يسمع النداء فلا يجيب

باب ہے اس شخص کے متعلق جواذان سنے اور جواب نہ دے (اجابت بالقدم مراد ہے یعنی نماز کیلئے نہ پہنچے)

☆ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ اخبرنا وکیع عن جعفر بن بُرْقَانَ عن یزیدَ بن الاصَمِّ عن ابی هريرة عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لَقَدْ هَمَمْتُ ان آمُرَ فِتْيَتِي ان يجمعوا حُزَمَ الحَطَبِ، ثم آمُرَ بالصلاةِ فَتُقَامَ، ثم أُحَرِّقَ على اقوامٍ لايَشْهَدُونَ الصلاةَ۔

قال ابوعیسی: وفی الباب عن عبد اللّٰہ بن مسعودٍ وابی الدَّرْدَاءِ وابنِ عباسٍ، ومعاذ بن انسٍ وجابرٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی هريرة حدیث حسن صحیح۔

وقدرُوِیَ عن غير واحد من اصحاب النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم انهم قالوا: مَن سمعَ النداء فلم يُجِبْ فَلَا صَلَاةَ له۔ وقال بعضُ اهل العلم: هذا على التغليظِ والتشديدِ، ولا رخصةَ لاحدٍ فی تركِ الجماعة إلَّا مِن عذرٍ۔

☆ قال مجاهدٌ: وسُئِلَ ابنُ عباسٍ عن رجلٍ يصومُ النهارويقومُ الليل، لايَشْهَدُ جمعةً وَلَا جَمَاعَةً؟ فقال هو فی النارِ قال: حدثنا بذلك هَنَّادٌ اخبرنَا الْمُحَارِبِيُّ عن لَيْثٍ عن مجاهِدٍ۔

قال: ومعنى الحديث: ان لايشهدَ الجماعةَ والجمعةَ رغبةً عنها، واستخفافاً بحقها، وتهاونًا بها۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا البتہ تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے جوانوں کو حکم دوں کہ لکڑیوں کا ڈھیر (گٹھرا) جمع کریں پھر میں نماز کا حکم دوں پس تکبیر (اقامت) کہی جائے پھر میں ایسے لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے۔

اور اس باب میں ابن مسعود، ابودرداء، ابن عباس، معاذ بن انس اور جابر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ حسن صحیح ہے اور متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ جو شخص اذان سنے اور نماز کیلئے مسجد حاضر نہ ہو اس کی نماز نہیں ہوتی اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ تغلیظ اور تشدید پر محمول ہے اور کسی کے لئے جماعت کو چھوڑنے کی اجازت نہیں الا یہ کہ کوئی عذر ہو۔ مجاہد کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا

گیا جو دن بھر روزے رکھتا ہو اور رات بھر نماز پڑھتا ہو لیکن نہ جمعہ میں حاضر ہوتا ہو نہ جماعت میں؟ فرمایا کہ وہ جہنمی ہے، ہم سے اسے ھناد نے روایت کیا ہے وہ محاربی سے وہ لیث سے اور وہ مجاہد سے نقل کرتے ہیں اور معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ وہ شخص جمعہ اور جماعت میں قصداً حاضر نہ ہوتا تھا تکبر کی وجہ سے اور جماعت کو حقیر سمجھ کر۔

﴿تشریح﴾

اجابتِ اذان کا حکم: علماء کا اس پر اتفاق[1] ہے کہ موذن کی اذان کا زبان سے جواب دینا سنت ہے اور اجابت بالقدم (جماعت میں حاضر ہونا) واجب ہے۔

جماعتِ ثانیہ کرانا صحیح نہیں: (وَلَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ آمُرَ فِتْيَتِيْ) اس سے معلوم ہوا کہ جماعت ثانیہ کرانا صحیح نہیں کیونکہ اگر جماعت ثانیہ کا ثبوت ہوتا اور وہ صحیح ہوتی تو اس جلانے کی کیا وجہ؟ کیونکہ جو لوگ گھروں میں ہیں وہ یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم جماعت ثانیہ میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ جماعت میں حاضر ہونا واجب ہے۔

ہمارے کتب فقہ میں اس کو سنت موکدہ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ فقہاء کے یہاں واجب اسے کہتے ہیں جس کو نہ کرنے پر وعید ذکر کی گئی ہو (از مترجم: اور یہاں پر بھی وعید مذکور کیوجہ سے یہ واجب ہونی چاہئے)

اشکال: حدیث باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں ان تارکین جماعت کی وجہ سے دوسرا امام بناؤں اور خود جا کر ان کے گھروں کو جلا دوں تو اس طرح دوسروں کو جماعت ترک کرنے سے منع فرما رہے ہیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کا ارتکاب کر رہے ہیں؟ (کہ پھر آپ جماعت کے تارک ہو جائیں گے۔ از مترجم)

جواب: یہ اشکال تب ہو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مسجد میں آ کر منفرداً نماز ادا کریں جبکہ ہم کہتے ہیں کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جا کر لوگوں کے گھروں کو جلاتے تو اس وقت دوسری مسجد میں نماز ادا فرماتے اور ایسی جگہ میں نماز با جماعت فرماتے جہاں ابھی تک جماعت نہ ہوئی ہوتی۔

جماعتِ ثانیہ کی ممانعت پر ایک اور استدلال: (لا یشهدون الصلوٰة) لفظ الصلوٰۃ معرفہ ہے اور جب معرفہ کا

---

[1] ابن قدامہ وغیرہ نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے ہاں اس میں کچھ اختلاف بھی ہے جو کہ نا قابل التفات ہے یہاں تک کہ حنفیہ نے اس مسئلہ میں دو قول ہیں ایک قول میں اذان کا جواب دینا واجب ہے اور دوسرے قول میں مستحب ہے، جیسا کہ ابھی گزرا۔

اعادہ معرفہ کے ساتھ کیا جاتا ہے تو دونوں سے ایک ہی شئے مراد لی جاتی ہے لہٰذا یہاں پر بھی نماز سے مراد یہ ہے کہ جس نماز کی اذان دی گئی ہے اگر وہ لوگ اس نماز کیلئے حاضر نہ ہوں تو ان کے گھروں کو جلا دوں۔ نیز الف ولام کے اندر اصل یہ ہے کہ الف ولام عہدی ہوں تو اس سے بھی ہمارے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ یہ وعید اس شخص کیلئے ہے جو اذان ہوتے ہی جماعتِ اولیٰ کے لئے حاضر نہ ہو کیونکہ اگر عہد نبوی میں جماعت ثانیہ کا ثبوت ہوتا تو لا یشھدون صلاۃ کہا جاتا(کیونکہ معرفہ کا اعادہ نکرہ کے ساتھ ہو تو وہ پہلے لفظ کا غیر ہوتا ہے تو یہاں پر جماعت ثانیہ مراد ہوتی۔ لیکن لا یشھدون الصلوٰۃ کہا گیا اور معرفہ کا اعادہ معرفہ کے ساتھ کیا گیا تو اس سے مراد جماعتِ اولی ہوگی نہ کہ جماعت ثانیہ۔ ازمترجم)

(فقال ھو فی النار) یعنی یہ شخص فی الجملہ جہنم میں داخل ہوگا یہ مطلب نہیں کہ یہ شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیگا اور اس کی جو توجیہ کی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ (امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ وہ شخص جمعہ اور جماعت کے ساتھ استہزاء کرتا ہو لہٰذا کافر ہو کر ہمیشہ جہنم میں رہیگا۔ ازمترجم)

باب ماجاء فی الرجل یصلّی وحدَہٗ ثم یُدرکُ الجماعةَ

باب ہے اس شخص کے متعلق جو اکیلے نماز پڑھ چکا ہو پھر جماعت پالے

☆ حَدَّثَنَا احمدُ بنُ مَنِیعٍ اخبرنَا ھشیم اخبرنا یعلی بن عطاء حَدَّثَنَا جابر بن یزید بن الاسود العامری عن ابیه قال: شَهِدتُ مع النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم حَجَّتَهُ، فصلیتُ معه صلاةَ الصبح فی مسجدِ الخَیفِ، قال: فلما قَضَی صلاتَهُ وانحرفَ اذاھو برجلین فی أُخرَی القوم لم یُصَلِّیَامَعَهٗ، فقال:عَلَیَّ بِهِمَا، فَجِیءَ بِهِمَا تُرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فقال: مامَنَعَکُمَا اَن تُصَلِّیَا معنا؟ فقالا؟یارسول الله، اِنّاکُنَّا قد صلینا فی رحالنا، قال: فلا تَفْعَلَا، اذا صَلَّیْتُمَا فی رحالکما ثم اَتَیْتُمَا مسجدَ جماعةٍ فَصَلِّیَا مَعَهُمْ، فانها لکمانافِلَةٌ۔

قال: وفی الباب عن مِحْجَنٍ الدِّیلی ویزیدَ بن عامرٍ قال ابو عیسی:حدیثُ یزیدَ بن الاسود، حدیث حسن صحیح۔وھو قولُ غیر واحد من اھل العلم۔وبه یقول سفیان الثوریُّ، والشافعی، واحمدُ، واسحٰقُ۔

☆قالوا:اذا صلَّی الرجلُ وحده ثم ادرک الجماعة فانه یُعِیدُ الصلوٰتِ کلها فی الجماعة، واذا

صلّی الرجلُ المغرب وحده ثم ادرك الجماعة، قالوا: فانه یصلیها معهم ویشفع برکعة، والتی صَلّی وحده هی المکتوبةُ عندهم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن یزید بن الاسود اپنے والد سے نقل کرتے ہیں (ان کے والد) فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک تھا میں نے مسجد خیف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز ختم کر لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ اچانک دو آدمیوں کو دیکھا کہ انہوں نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں کو میرے پاس لاؤ! پس ان کو لایا گیا ان کی گردن کی رگیں خوف سے پھولنے لگیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم نے اپنی منزلوں (کجاؤں) میں نماز پڑھ لی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو اگر تم نے اپنی منزلوں میں نماز پڑھ بھی لی ہو اور پھر تم جماعت والی مسجد میں آؤ تو ان کے ساتھ نماز پڑھو وہ تمہارے لئے نفل ہوگی۔

اور اس باب میں محجن، یزید بن عامر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یزید بن اسود کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ متعدد اہل علم کا قول ہے۔ امام شافعی، سفیان ثوری، احمد اسحٰق بھی یہی فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص اکیلے نماز پڑھ چکا ہو پھر جماعت پالے تو تمام نمازوں کا جماعت میں اعادہ کر سکتا ہے اور اگر مغرب تنہا پڑھی ہو اور پھر جماعت کو پالیا تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے اور اس میں ایک رکعت ملا کر اسے جفت کر دے۔ اور جو نماز اس نے اکیلے میں پڑھی ہوگی ان کے (ان حضرات) نزدیک وہی فرض ہوگی۔

﴿تشریح﴾

(شَهِدتُّ مع النبی صلی الله علیه وسلم حجته) یعنی یہ صحابی یزید بن الاسود حجۃ الوداع کے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

نماز کے بعد امام مسجد کا مقتدیوں کی طرف رخ کر کے بیٹھنا سنت سے احتمالاً ثابت ہے: (انحرف) اس کا

مطلب یا تو یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقتدیوں کی طرف منہ پھیر کر اور اپنا رخ انکی طرف کر کے بیٹھ گئے تھے جیسا کہ فجر اور عصر کے بعد آج کل امام صاحب کے بیٹھنے کی عادت ہوتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے جا رہے تھے جیسا کہ فاذا ھو برجل الخ کے الفاظ کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے۔

جماعتِ ثانیہ کی ممانعت پر ایک اور دلیل: (فقالا یا رسول اللہ ! انا کنا صلینا فی رحالنا) غور کرنے کا مقام ہے کہ ان دونوں صحابیوں نے مسجد میں جماعت ثانیہ کے ساتھ نماز ادا نہیں کی اور نہ ہی اپنے گھر سے نکلتے وقت ان کی یہ نیت تھی۔

عہدِ نبوی میں جماعتِ ثانیہ کا وجود ہی نہ تھا: اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے عہد میں جماعت ثانیہ کا وجود ہی نہیں تھا کیونکہ اگر جماعتِ ثانیہ صحابہ کرام کی عادت ہوتی تو یہ دونوں صحابی اپنے گھر میں نماز نہ پڑھتے بلکہ یہ خیال کرتے کہ اگر مسجد میں جماعت ہو چکی ہوگی تو پھر ہم مسجد میں جا کر دوسری جماعت کر لیں گے اور اگر دیگر حضرات جماعت سے نماز پڑھ رہے ہوں گے تو ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جائیں گے (لیکن ان صحابہ نے اس طرح نہیں کیا)۔

اگر کسی نے منفرداً نماز پڑھ لی پھر اسی نماز کو با جماعت ہوتے ہوئے پالے اس میں اختلاف اور جانبین کے دلائل: بہر حال یہ حدیث احناف کے خلاف بظاہر شوافع کی دلیل ہے[1] کیونکہ حدیث کے ظاہری الفاظ ان کے موید ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس حدیث کے الفاظ فانھا لکما نافلۃ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ استدلال کرنا (کہ تمام نمازوں کے بعد فرض نماز کا اعادہ نفل کی نیت سے کیا جا سکتا ہے) صحیح نہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے علاوہ دیگر احادیث میں اوقات مکروہہ کو بیان فرما دیا تھا لہٰذا صحابہ کو معلوم تھا کہ ان خاص نمازوں کے بعد نفل پڑھنے کی اجازت یا کراہت ہے۔ اسلئے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ تم کن کن نمازوں کا اعادہ کر سکتے ہو (کیونکہ دوسری احادیث سے معلوم ہو گیا کہ صرف عشاء اور ظہر کے بعد نفل کی نیت سے اعادہ کیا جا سکتا ہے) نیز الزامی

---

[1] یعنی اگر کسی نے منفرداً نماز پڑھ لی تو حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دوبارہ با جماعت تمام نمازوں کا اعادہ کرے گا۔ یہ حدیث شوافع کی دلیل ہے حنفیہ کہتے ہیں کہ جن نمازوں کے بعد نفل پڑھنا صحیح ہے ان نمازوں کا اعادہ بنیت نفل کر سکتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان ائمہ نے تمام نمازوں کے اعادہ کی اجازت دی ہے تو پھر مغرب[۱] کی نماز کی یہ تخصیص کیوں کی کہ ایک رکعت مزید ملالیں کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک رکعت ملانے کا حکم دیا تھا؟ نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان نهی عن البتیراء کی وجہ سے انہوں نے یہ تخصیص کی تو جب دوسری حدیث کی وجہ سے نمازِ مغرب میں حدیث باب میں تخصیص کی گئی تو دیگر احادیث (نھی عن الصلوٰۃ بعد الفجر وبعد العصر) کی وجہ سے نماز فجر اور عصر کی نماز کو حدیث باب سے خاص[۲] کرنے (نکالنے) میں کیا اشکال ہے؟

نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان سے فانهما لكما نافلة سے خود ہی تخصیص کی علت پر تنبیہ فرمائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ تمام نوافل کا ایک ہی حکم ہونا چاہیئے تو اس حدیث سے خصم نے نفل نماز پڑھنے کا حکم عام نوافل کے حکم سے کیوں الگ کر دیا۔

اشکال: فجر کی نماز[۳] میں اس واقعے کا ہونا امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو فجر کی نماز دوبارہ باجماعت پڑھنے کی طرف راہنمائی فرمائی تھی؟

---

[۱] ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ جب مغرب کا اعادہ کریگا تو چوتھی رکعت ملا کر اسے شفعہ بنالے، امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے اور اسود بن یزید امام زہریؒ اور شافعیؒ اور اسحٰقؒ کا بھی یہی مذہب ہے کیونکہ یہ مغرب کی اعادہ کی جانے والی نماز نفل ہے اور وتر کے علاوہ کوئی بھی نفل نماز طاق مشروع نہیں لہٰذا ایک رکعت کا اضافہ کرنا زیادہ بہتر ہے اس کو چھوڑنے سے تاکہ اپنی نماز کو مکمل کرنے سے پہلے امام سے جدائی نہ ہو۔

[۲] ابو الطیب کہتے ہیں کہ فجر اور عصر کی تخصیص پر صریح حدیث موجود ہے جس کو دار قطنی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنے گھر میں نماز پڑھ چکو پھر مسجد میں کہیں نماز باجماعت ہوتے ہوئے پاؤ تو تم بھی اس نماز میں شریک ہو جاؤ سوائے فجر اور مغرب کے۔ عبد الحق کہتے ہیں کہ اس حدیث کو موصولاً نقل کرنے میں سہل بن صالح الانطا کیہ متفرد ہیں لیکن وہ ثقہ ہیں لہٰذا جن لوگوں نے اس کو موقوف نقل کیا ہے وہ بھی قابل اشکال نہیں کیونکہ ثقہ راوی کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے۔

[۳] قلت: اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات مروی ہیں صاحبِ بدائع نے بالجزم نقل کیا ہے کہ ان دونوں صحابہ کا یہ واقعہ ظہر کی نماز کا تھا چنانچہ اس کی تائید مسند ابی حنیفہ میں انہی دونوں صحابی کے قصے کی طرح یہ الفاظ ہیں ان رجلين صليا الظهر في بيوتهما الحديث۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں ایسے الفاظ نقل کیئے ہیں لہٰذا جب حنفیہ کے یہاں یہ قصہ ظہر کی نماز کا ہے تو اس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں۔

جواب: فجر کی نماز میں ان صحابہ کو اس حکم دینے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں یہ مسئلہ سکھانا تھا کہ فجر کے علاوہ بھی تمام نمازوں میں باجماعت شریک ہو جایا کرو (یہ مطلب نہیں کہ خاص فجر کی نماز کا اعادہ کیا کرو۔ از مترجم: یہ جواب علی تقدیر التسلیم ہے کہ یہ مذکورہ واقعہ نمازِ فجر میں پیش آیا ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ نمازِ ظہر کا تھا اور ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد بنیت نفل اعادہ کرنے میں کوئی اشکال ہے ہی نہیں)۔

باب ماجاء فی الجماعة فی مسجدٍ قد صُلِّیَ فیه مَرَّةً

باب ہے اس مسجد میں جماعت کرنے کے بارے میں جس میں ایک مرتبہ نماز باجماعت پڑھی جا چکی ہو

☆ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ حَدَّثَنَا عبدة عن سعید بن ابی عَرُوْبَةَ عن سلیمانَ النَّاجِیِّ البصری عن ابی المتوکل عن ابی سعید قال: جاء رجل وقد صلّٰی رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: اَیُّکُمْ یَتَّجِرُ علی هذا؟فقام رجلٌ فَصَلّٰی معه۔

قال: وفی الباب عن ابی اُمَامَةَ، وابی موسی، والحکمِ بنِ عُمَیْرٍ۔

قال ابو عیسی: وحدیث ابی سعید حدیث حسن۔ وهو قولُ غیر واحدٍمن اهل العلم من اصحاب النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم وغیر هم من التابعین۔قالوا: لابأس ان یصلیَ القومُ جماعةًفی مسجدٍ قد صُلِّیَ فیه جماعةٌ۔وبه یقول احمد واسحٰقُ۔ وقال آخرون من اهل العلم: یُصَلُّونَ فُرَادَی۔

وبه یقول سفیانُ، وابنُ المبارك، ومالكٌ، والشافعیُّ، یَخْتَارُونَ الصلاة فُرَادَی۔

وسلیمانُ النَّاجِیُّ بصریٌّ ، ویقال سلیمان بن الاسود وابو المتوکل اسمه، علی بن داود۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھ لینے کے بعد آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کے ساتھ کون تجارت کرے گا؟ پس ایک شخص (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کھڑا ہوا اور اس نے اس کے ساتھ نماز پڑھی؟ (یعنی اس کے ساتھ شریک ہو جائے تاکہ جماعت کا ثواب دونوں کو مل جائے ورنہ وہ شخص اس سے محروم رہتا) اور اس باب میں ابوامامہ، ابوموسی، اور حکیم بن عمیر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات منقول ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔ اور یہی قول صحابہ وتابعین میں سے متعدد اہل علم کا ہے کہ جس مسجد میں جماعت ہو چکی ہو اس میں دوبارہ جماعت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

احمد واسحٰق رحمہما اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی نماز پڑھیں گے۔ (یعنی جماعت نہیں کریں گے) یہ سفیان ثوری، ابن مبارک، مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ وہ انفرادی طور پر نماز پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

جماعتِ ثانیہ کو صحیح قرار دینے والوں کی دلیل: (ایکم یتجر علی ھذا) جاننا چاہئیے کہ اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو جماعتِ ثانیہ کے جواز کے قائل ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے استدلال[1] اس وقت تام ہوگا جب یہ دونوں صحابی فرض نماز پڑھ رہے ہوتے حالانکہ یہاں پر اقتداء کرنے والے کی نماز تو نفل تھی تو یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل نہیں بن سکتی (دلیل تو تب بنتی جب امام اور مقتدی دونوں مفترض ہوتے)

حدیث باب سے بھی جماعتِ ثانیہ کی ممانعت ثابت ہو رہی ہے: مگر اس حدیث میں غور کرنے سے مانعین جماعت ثانیہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے[2] کیونکہ اگر جماعت ثانیہ کرانا ٹھیک ہوتی تو یہ شخص جو جماعت نکلنے کے بعد آیا ہے وہ

---

[1] **جماعتِ ثانیہ کے بارے میں ائمہ کے مذاہب:** یعنی جس مسجد میں ایک مرتبہ باجماعت نماز ہو چکی ہو تو اس مسجد میں تکرار جماعت پر حدیث باب سے استدلال کیا جاتا ہے۔ حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں مکروہ ہے اور حنابلہ کے یہاں یہ جائز ہے۔ علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ۵۵۱ھ میں ائمہ اربعہ کے علماء نے اس پر اجماع واتفاق کیا کہ مسجد میں تکرار جماعت مکروہ ہے۔ نیز شیخ المشائخ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کا اسی مسئلہ میں فارسی زبان میں ایک عمدہ رسالہ ہے جس کا نام قطوف الدانیہ ہے۔

[2] **حنفیہ کے دلائل:** نیز عموم بلویٰ میں خبر واحد حنفیہ کے یہاں معتبر نہیں طبرانی نے ثقہ راویوں کے واسطے سے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مدینہ کے اطراف سے مسجد میں نماز پڑھنے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے اور گھر والوں کو جمع کر کے باجماعت نماز پڑھائی (تو یہ ہماری دلیل ہے) اسی طرح ابن ابی شیبہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ جب کسی مسجد میں جاتے اور وہاں نماز ہو چکی ہوتی تو وہ منفرداً نماز پڑھتے تھے۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام منفرداً نماز پڑھتے تھے۔

ایسے شخص کو ڈھونڈتا جس کی بھی جماعت نکل چکی ہوتی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے کہ کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تا کہ وہ اس کے ساتھ نماز پڑھ لے (لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا اور جماعتِ ثانیہ کی ترغیب نہیں دی۔ از مترجم) نیز اگر جماعت ثانیہ جائز ہوتی تو تمام صحابہ یا اکثر صحابہ جماعت میں شریک ہو جاتے حالانکہ یہاں پر معاملہ برعکس تھا کوئی صحابی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہو کیونکہ صحابہ کرام جماعتِ ثانیہ کو ناپسند کرتے تھے۔

اور یہ تجارت[1] کرنے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے آپ ان کے ساتھ اس لئے شریک نہیں ہوئے کہ اس نماز سے حاصل ہونے والے ثواب میں آپ کو رغبت تھی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنا اس سے افضل تھا بلکہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شئے میں رغبت کا اظہار فرمایا تھا تو انہوں نے بھی اس میں رغبت ظاہر کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل فرمائی۔

(لَا بَأْسَ اَن یُّصَلِّی القوم جماعة فی مسجد قَدْ صُلِّیَ فِیْهِ وبه یقول احمد واسحاق) یہاں لفظ لاباُس کو اس کے اصطلاحی معنی پر رکھنا ضروری ہے تا کہ دونوں قولوں میں فرق ظاہر ہو جائے (یعنی لاباس سے مراد یہ ہے کہ یہ فعل امام احمد واسحٰق کے نزدیک جائز خلاف اولیٰ ہے)......لیکن امام احمد واسحٰق کے اس مذہب سے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیئے کیونکہ فقہاء مجتہدین میں سے کسی نے بھی اس مذہب کو اختیار نہیں کیا کیونکہ اس طرح تو لوگ پہلی جماعت میں سستی کریں گے اور فعل مکروہ کا سبب بھی مکروہ ہوتا ہے۔ فافهم فان فيه دقة

باب ماجاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعة

باب ہے عشاء اور فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کی فضیلت کے متعلق

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ اخبرنَا بِشْرُ بنُ السَّرِی حَدَّثَنَا سفیانُ عن عثمانَ بِنِ حَکِیم عن عبد الرحمٰن بن ابی عَمْرَةَ عن عثمان بن عفانَ قال: قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم: مَن شَهِدَ العشاءَ فی جماعةٍ کان له قِیَامُ نصفِ لیلةٍ، ومَن صلّی العشاء والفجر فی جماعةٍ کان له کقیامِ لیلةٍ۔

---

[1] جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے مرسلاً نقل کیا کہ یہ شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ قالہ ابوالطیب

قال: وفي الباب عن ابن عمر وابي هريرة ، وانس، وعُمَارَةَ بن رُوَيبةَ وجُندبِ بن عبد اللّٰه بن سفيانَ البَجَلي ، وابي بن كعبٍ وابي موسى، وبُرَيْدَةَ۔قال ابو عيسى: هذا الحديثُ عن عبد الرحمٰن بن ابي عمرةَ عن عثمان موقوفاً، ورُوِى من غير وجهٍ عن عثمانَ مرفوعا۔

☆حدثنا محمد بن بَشَّارٍ حَدَّثَنَا يزيد بن هرونَ اخبرنا داود بن ابي هندٍ عن الحسنِ عن جُنْدُب بن سفيانَ عن النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلم قال: مَن صلّى الصبحَ فهو في ذِمّةِ اللّٰهِ، فلا تُخفِرُوا اللّٰهَ في ذِمّتِهِ۔ قال ابو عيسى: حديث عثمان حسنٌ صحيحٌ۔

☆حدثنا عباسٌ العَنبَرِيُّ حَدَّثَنَا يحيى بن كثير ابو غَسَّانَ العنبريُّ عن اسمٰعيلَ الكَحَّالِ عن عبد اللّٰه بن اَوسٍ الخُزَاعِيِّ عن بُرَيْدَةَ الاَسلَمِيِّ عن النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلم قال: بَشِّرِ المشّائِينَ في الظُّلَمِ اِلى المساجد بالنُّورِ التّامِّ يوم القيامة۔

قال ابو عيسى: هذا حديث غريب من هذا الوجه مرفوع هو صحيح مسند وموقوف الى اصحاب النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم ولم يُسْنَدُ الى النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص عشاء کی نماز باجماعت ادا کرے اس کیلئے آدھی رات کی عبادت کا ثواب ہے، اور جو عشاء اور فجر دونوں نمازیں باجماعت ادا کرے اس کیلئے ایسا ثواب ہے جیسا کہ پوری رات کی عبادت کا۔

باب میں حضرت ابن عمر، ابو ہریرہ، انس، عمارہ بن ابی رویبہ، جندب، ابی بن کعب، ابوموسیٰ، اور بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

☆ حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے فجر کی نماز باجماعت پڑھی تو وہ اللہ کے ذمے میں ہے سوتم اللہ کے ذمے (پناہ) کو نہ توڑو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ حدیث عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ کے واسطے سے عثمان رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے اور عثمان رضی اللہ عنہ سے دوسرے طرق سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔

☆ حضرت بریدہ اسلمی سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اندھیروں میں مساجد کی طرف چلنے والوں کو قیامت کے دن نورِ کامل کی بشارت دے دو۔ یہ حدیث غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

صبح صبح حاکم اعلیٰ کے دربار میں حاضری: (من صلی الصبح فی جماعة) چونکہ علی الصبح کسی بھی حاکم کے دربار میں حاضری اور اس سے التجاء کرنے والا اس کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے تو یہی حال اللہ رب العزت کے دربار کا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دربار میں صبح صبح حاضری دے گا تو وہ اللہ پاک کی جماعت میں داخل ہو جائیگا۔

(فلا تخفروا الله فی ذمته) میں ہمزہ سلب ماخذ کا ہے

(بشر المشائین فی الظلم) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اندھیروں اور بارش میں گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت ورخصت فرمائی تھی لہٰذا جو لوگ پھر بھی عزیمت پر عمل کرتے ہوئے مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں گے تو وہ مزید ثواب کے مستحق ہونگے۔

باب ماجاء فی فضل الصَّفِّ الاول

باب ہے پہلی صف کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا قُتَيبَةُ حَدَّثَنَا عبد العزيز بن محمد عن سُهَيلِ بن ابی صالح عن ابيه عن ابی هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلّى الله عليه وسلم: خيرُ صُفُوفِ الرجال اَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخرُهَا، وخيرُ صُفُوفِ النساء آخرُها، وشرُّها اَوَّلُها۔

قال: وفی الباب عن جابرٍ، وابن عباسٍ وابی سعيدٍ، واُبَیٍ، وعائشةَ، والعِربَاضِ بنِ سَارِيَةَ، وانسٍ۔

قال ابوعيسى: حديث ابی هريرة حديث حسن صحيح۔

وقدرُوی عن النبیِّ صلّى الله عليه وسلم: انه كان يَستَغفِرُ للصَّفِّ الاولِ ثلاثاً، وللثَّانی مَرَّةً۔

☆وقال النبیُّ صلّى اللّٰه عليه وسلم: لو اَنَّ الناس يعلمون مافی النِّدَاء والصَّفِّ الاولِ ثُم لم يَجِدُوا اِلَّا ان يَستَهِمُوا عليه لَاستَهَمُوا عليهِ۔

قال حَدَّثَنَا بذلك اسحٰق بن مُوسَى الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعنٌ حَدَّثَنَا مالكٌ عن سُمَیٍّ عن ابی صالحٍ عن ابی هريرة عن النبی صلّى الله عليه وسلم: مِثلَهُ۔وَحَدَّثَنَا قُتَيبَةُ عَن مَالِكٍ نَحوَهُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مردوں کی صفوں میں سب سے بہتر پہلی صف ہے اور مردوں کی صف میں آخری صف سب سے بُری ہے۔ عورتوں کی صفوں میں سب سے بہتر آخری صف ہے اور سب سے پہلی صف سب سے بدتر ہے۔

باب میں حضرت جابر، ابن عباس، ابوسعید، ابی، عائشہ، عرباض بن ساریہ، اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی صف والوں کے لئے تین مرتبہ استغفار فرماتے تھے اور دوسری صف والوں کیلئے ایک مرتبہ اور آپ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان کہنے اور پہلی صف میں نماز پڑھنے میں کیا اجر وثواب ہے پھر وہ اس فضیلت کو قرعہ اندازی کے بغیر نہ پا سکتے ہوں تو ضرور قرعہ اندازی کرنے لگیں۔

مصنف رحمہ اللہ کے استاذ اسحٰق بن موسیٰ انصاری، معن سے اور وہ امام مالک سے نقل کرتے ہیں اسی طرح امام ترمذی کے دوسرے استاذ قتیبہ اور وہ مالک سے نقل کرتے ہیں (دونوں سندوں کے مدارِ اسناد امام مالک رحمہ اللہ ہیں) اور امام مالک سمی سے اور وہ ابو صالح سے اور وہ ابو ہریرہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل نقل کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

(خیر صفوف الرجال اولھا) اسکی وجہ[1] یہ ہے کہ یہ صف اول کے نمازی نیکی کے کام میں سبقت کرنے والے ہیں

---

[1] **صفِ اول کے فضائل کی وجوہات:** ابن العربی نے اس کی چار علتیں لکھی ہیں:

۱۔ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنا باعثِ فضیلت کام ہے۔

۲۔ مسجد کا اگلا حصہ بقیہ حصہ کے مقابلہ میں افضل ہے۔

۳۔ امام کے قریب ہونا باعث فضیلت ہے اسی وجہ سے صرف عقلمند ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہوتے تھے۔

۴۔ نماز کیلئے اول وقت میں حاضر ہونا افضل ہے...... آخر صفوں کے شر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ فوائد اس میں نہیں پائے جاتے نیز اس میں ان عورتوں سے نزدیکی ہو جاتی ہے جو دلوں کو اللہ سے غافل کر دیتی ہیں بلکہ کبھی کبھار تو عبادت ہی خراب ہو جاتی ہے یا نیت اور خشوع میں کمی کوتاہی واقع ہو جاتی ہے۔ ابو الطیب ؒ کہتے ہیں: مردوں کو آگے بڑھنے کا حکم ہے لہٰذا جو مرد امام کے جتنے قریب ہوگا تو اس نے شریعت کے حکم کی اسی قدر تعظیم کی ہے۔ اسی طرح عورتوں کو پیچھے رہنے کا حکم ہے لہٰذا جو عورت جتنے آخر میں ہوگی اتنا ہی اس نے شرعی حکم

پورا کیا۔

اور عورتوں سے یہ لوگ دور اور اپنے امام کے قریب ہونگے۔

(شر صفوف النساء اولها) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے کاموں میں آگے بڑھ رہی ہیں جوان کیلئے بہتر نہیں نیز اس میں گھروں سے باہر نکلنے میں جلدی اور مردوں سے نزدیکی ہوتی ہے جو کہ منع ہیں اس لئے کہ عورت کیلئے تو مساجد میں حاضر ہونے کی صرف رخصت ہے ان کیلئے افضل یہ ہے کہ وہ مساجد نہ جائیں۔ پھر یہ بات یاد رکھیں کہ یہ خیر یا شر ہونا امور اضافیہ میں سے ہیں لہٰذا ان میں سے شر کا خیر ہونا اور خیر کا شر ہونا بھی ممکن ہے جبکہ دوسری اشیاء کے اعتبار سے اسے دیکھا جائے۔

باب ماجاء فی اقامة الصفوف

باب ہے صفیں سیدھی رکھنے کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا قتيبة اخبرنَا ابو عَوَانة عن سماك بن حرب عن النعمان بن بشير قال: كان رسول الله صلّى الله عليه وسلم يُسَوِّی صُفُوفَنا، فَخرجَ يوماً فرأى رجلاً خارجاً صدرُهُ عن القومِ، فقال: لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُم او لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بين وُجُوهِكُم۔

قال: وفی الباب عن جابر بن سَمُرَةَ، والبَرَاءِ، وجابر بن عبد الله، وانسٍ، وابی هريرةِ، وعائشةَ۔

قال ابو عيسى: حديث النعمان بن بشير حديث حسن صحيحٌ۔

وقد رُوی عن النبیّ صلّی اللّٰه عليه وسلم انه قال: مِنْ تَمَامِ الصلاةِ اقَامَةُ الصَّفِّ۔

ورُوی عن عُمرَ: انه كان يُوَكِّلُ رجلاً بِاِقامَةِ الصُّفُوفِ فلا يُكَبِّرُ حتى يُخبَرَ ان الصفوف قد استَوَت۔ ورُوی عن علی وعثمان: انهما كانا تعاهدانِ ذلك، ويقولان: اسْتَوُوا۔

وكان علیٌّ يقولُ: تَقَدَّمْ يافلانُ، تَأَخَّرْ يافلانُ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو سیدھا فرماتے چنانچہ ایک دن (صفوں کو درست کرنے) نکلے تو ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا سینہ صف سے (لوگوں سے) آگے نکلا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ ضرور اپنی صفوں کو سیدھا رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے آپس میں مخالفت ڈال دیں گے اور

باب میں جابر بن سمرہ، براء، جابر بن عبداللہ، انس، ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نعمان بن بشیر کی حدیث حسن صحیح ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا صفوف کا سیدھا کرنا نماز کے مکملات میں سے ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک شخص کو صفوں کے سیدھا کرنے پر مقرر کیا کرتے تھے اور اس وقت تک تکبیر نہ کہتے تھے جب تک وہ خبر نہ دے دے کہ صفیں سیدھی ہو چکیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اس (صفیں سیدھی کرنے) کا اہتمام کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ سیدھے ہو جاؤ (یعنی صفیں درست کرلو) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے اے فلاں! آگے بڑھو اور اے فلاں! پیچھے ہٹو!

﴿تشریح﴾

(فخرج یوما) یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سمجھ لیا کہ اب ہم (صحابہ) اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں لہٰذا صفوں کے صحیح کرنے کی تاکید و اہتمام کو چھوڑ دیا پھر ایک دن اچانک تشریف لائے۔

اس جملہ کی مختلف توجیہات: (اولیخالفن اللہ بین وجوھکم) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صفوں کے ظاہر کو ٹھیک نہ کرو گے تو تم آپس میں ایسا جھگڑا پیدا ہوگا کہ ایک دوسرے کا چہرہ بھی دیکھنا گوارا نہ کریگا اسی طرح دلوں میں بغض اور ناپسندیدگی بیٹھ جائیگی تو اس طرح ظاہر میں صفیں سیدھی نہ کرنے سے باطن میں اختلاف جھگڑا پیدا ہوگا۔ بعض علماء نے اس سے مراد لیا ہے کہ تمہارے چہروں کو مسخ کر دیا جائیگا لیکن اس معنی پر اشکال یہ ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افراد کے چہرے مسخ ہو جائیں ایسا نہ ہوگا لیکن اس معنی سے لازم آرہا ہے کہ تمام امت محمدیہ کے چہرے مسخ ہو جائیں گے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بین وجوھکم فرمایا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب جمع کا صیغہ مضاف ہو تو اس سے مراد تمام لوگ ہوتے ہیں۔

باب ماجاء لیلینی منکم اولو الاحلام والنہیٰ

باب اس بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں عقلمند و سمجھدار لوگ نماز میں میرے قریب رہا کریں

☆حدثنا نَصرُ بن علی الجَهضَمِیُّ حَدَّثَنَا یزیدُ بن زُرَیعٍ اخبرنَا خالدُ الحَذَّاء عن ابی مَعشَرٍ عن ابراھیم عَن عَلقَمَةَ عن عبد اللّٰه عن النبیِّ صلَّی اللّٰه علیه وسلم قال: لِیَلِیَنِی مِنکم اولو الا حلَامِ۔

والنُّھٰی ، ثم الذین یَلُونَھُمْ ، ثم الذین، یلونھم، ولاتختلفوا فَتَخْتَلِفَ قلوبُکم، وایا کم وھَیْشَاتِ الاسواقِ۔

قال: وفی الباب عن ابی بن کعبٍ، وابی مسعودٍ، وابی سعیدوالبرَاء، وانسٍ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابن مسعودٍ حدیث حسن غَرِیبٌ، وقد رُوی عن النبیؐ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: انہ کان یُعْجِبُہُ ان یَّلِیَہُ المھاجرُون والانصارُ، لِیَحْفَظُوا عنہ۔ قال: وخالدٌ ھو خالدُ بن مِھْرَانَ یُکْنَی ابا لمُنَازِلِ۔ قال : و سمعتُ محمدَ بن اسمٰعیل یقول: یقال :اِنَّ خالداً الحذاء ماحَذَا نعلاًقطُّ ، انما کان یجلسُ الی حذاء فنسب الیہ۔ قال:وابو مَعْشَرٍ اسمہ زیادُ بن کُلَیْبٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ تم میں سے جولوگ بالغ اور عقلمند ہیں وہ میرے قریب (کھڑے) ہوں پھر وہ لوگ جوعقل ودانائی میں ان کے قریب ہوں اور پھر تیسرے درجہ میں وہ لوگ جوان کے قریب ہوں اور آپس میں مت جھگڑو کہ کہیں تمہارے دلوں میں ہی اختلاف ہو جائے نیز بازاری شور وغل سے بچو۔

اور باب میں ابی بن کعب، ابن مسعود، ابوسعید، براء، انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن غریب ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین وانصار کا قریب رہنا پسند تھا تا کہ وہ آپ سے (دین کے مسائل) سیکھیں اور یاد رکھیں اور خالد الحذاء...... خالد بن مہران ہیں اور ان کی کنیت ابوالمنازل ہے میں نے محمد بن اسماعیل امام بخاری رحمہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ خالد الحذاء نے کبھی جوتے نہیں گانٹھے وہ تو جوتا گانٹھنے والے موچی کے پاس بیٹھا کرتے تھے تو ان کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا اور ابومعشر کا نام زیاد بن کلیب ہے۔

﴿تشریح﴾

(لیلنی منکم اولوا الاحلام والنھی) یعنی بالغ مرد میرے قریب کھڑے ہوں۔

(ثم الذین یلونھم) اس سے مراد بچے ہیں کیونکہ یہ مردوں کے قریب ہوتے ہیں اور ان میں بھی ان کی تمام صفات پائی

جاتی ہیں سوائے بلوغ کے۔

(ثم الذین یلو نھم) اس سے مراد خنثیٰ ہیں کیونکہ وہ ایک وصف کے اعتبار سے مردوں کے شریک ہیں کہ انہیں بھی من وجہٍ مرد تصور کیا جاتا ہے اور دوسرے وصف کے اعتبار سے وہ عورت ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب: بعض لوگوں نے عورت پر بچہ کو قیاس کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح عورت مرد کے محاذاۃ میں ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اسی طرح اگر نابالغ امرد صبی کسی مرد کے محاذاۃ میں ہو تو بھی مرد کی نماز فاسد ہو جانی چاہیئے[1] لیکن یہ قول بالکل غلط ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم (حضرت انسؓ کے بھائی) کو حضرت انس رضی اللہ کے ساتھ کھڑا کیا تو معلوم ہوا کہ اگر بچہ کسی مرد کے محاذاۃ میں آ جائے تو اس سے مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی......اور خنثیٰ کو بچوں کے بعد کھڑے کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اگر وہ مرد ہیں تو ان کی نماز صحیح ہونے میں کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر وہ واقع میں عورتیں ہیں اور بچوں کے بعد کھڑی ہوئی ہیں تو عورتوں کی جگہ بھی یہی ہے کہ بچوں کے بعد ہوں لہٰذا اگر خنثیٰ کو بچوں سے پہلے کھڑا کریں گے تو لامحالہ بچوں کی نماز کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان (والنھی) یہ لفظ نُھٰی جمع ہے نھیۃ کی جس کے معنی عقل کے ہیں اور عقل کو نھیۃ اسلئے کہتے ہیں کہ یہ بھی انسان کو نامناسب کام سے روکتی ہے......اس حدیث میں عقلمندوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریب کھڑے ہونے کا حکم اس لئے دیا کہ یہ لوگ امام کے قریب ہو کر اس سے نماز اور اس کے احکام سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں جیسا کہ امام کے قریب ہو کر اس سے نماز اور اس کے احکام سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ جیسا کہ امام ترمذی

---

[1] درمختار میں ہے کہ اگر ایسا بچہ جو کہ امرد اور خوبصورت ہو اور اسے شہوت بھی ہوتی ہو تو یہ مرد کے محاذاۃ میں آ جائے تو صحیح مذہب کے مطابق اس سے مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی تو اس قول سے جامع محبوبی اور دررُ البحار کے اس قول کو ضعیف قرار دینا مقصود ہے کہ جس میں اس کو مفسدِ صلاۃ کہا گیا ہے کیونکہ اس کی علت یہ نہیں کہ عورت میں شہوت ہوتی ہے اور امرد میں بھی یہی علت موجود ہے۔

محاذاۃ مرأۃ کے مفسد ہونے کی علت ترکِ فرض ہے: بلکہ ابن ہمام نے ثابت کیا ہے کہ محاذاۃ مرأۃ کے مفسدِ صلاۃ ہونے کی علت یہ ہے کہ مرد پر فرض تھا کہ عورت کو پیچھے کھڑا کرے اس نے وہ حکم چھوڑ دیا۔

قلت: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاذاۃ میں نماز پڑھی تھی اور ان کی عمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تیرہ سال کی تھی تو لامحالہ ابن عباس امرد ہی تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز فاسد نہ ہوئی تھی۔

رحمہ اللہ سے "وروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یعجبہ ان یلیہ المہاجرون والانصار" سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

(لِیَلِیَنِّی مِنْکُمْ[1] اولوا الاحلام والنہی) یہ لفظ لِیَلِیَنِّی نون مشدد کے ساتھ ہے لہٰذا یہ اشکال کہ لام امر کے بعد یاء کو حذف ہونا چاہیئے اور یہاں یاءِ ثانیہ کیسے موجود ہے؟ تو اس کا جواب ہوگیا (کہ یہ صیغہ صرف امر کا نہیں بلکہ صیغہ امر تاکید بانون ثقیلہ کا ہے۔ از مترجم)

(لاتختلفوا فیختلف قلوبکم) کیونکہ ظاہری اختلاف[2] لامحالہ باطنی اختلاف کیلئے اثر انداز ہوجاتا ہے۔

اس جملہ کی مختلف تشریحات: (وایاکم وھیشات الاسواق) یہ ایک وہم کا جواب[3] ہے کہ یہ وہم ہو کہ صفوں کو درست کرنے کا اہتمام تب ہی ہوسکتا ہے جب امام اور دیگر نمازی صفوں کو سیدھا کرنے کیلئے زور زور سے شور مچائیں اور آپس میں خوب دھکم پیل ہو جیسا کہ بازاروں میں ہوتا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح شور وغل کرنے سے منع فرمادیا اور اس حدیث سے یہ بیان فرمایا کہ مسجد قابل تعظیم وتکریم مقامات میں سے ہے اور اس میں شور وغل، ہنگامہ کرنا، نازیبا اور نامناسب حرکت ہے۔

---

[1] لِیَلِنِیْ: یہ لفظ امر کا صیغہ ہے اس میں دونوں لام مکسور ہیں اور نون مشدد اور اس سے پہلے یاء پر زیر ہے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کو اسی طرح ضبط کیا ہے لہٰذا یاءِ ثانیہ صحیح ہوئی اکثر علماء نے اسے یاءِ ثانیہ کے بغیر نون مخفف کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ (لِیَلِنِی) شراح کی ایک جماعت نے دونوں ہی طرح ضبط کیا ہے۔ ابن رسلان فرماتے ہیں کہ یہ لفظ نون مخففہ کے ساتھ ہوگا تو یاءِ ثانیہ کے بغیر ہوگا۔ (لِیَلِیَنِّیْ) اور اگر نون مشدد ہوگا جو کہ تاکید کیلئے ہے تو یٰ ثانیہ بھی ہوگی...... قلت: لہٰذا بعض علماء نے جو یہ فرمایا ہے کہ یہ لفظ نون خفیفہ کے ساتھ یاءِ ثانیہ بھی ہے تو یہ غلط ضبط کیا گیا ہے یا دوسری یاء کو یاء اشباع کہا جائے۔ قالہ القاری

[2] کیونکہ ظاہر کی ایک خاص تاثیر باطن پر ہوتی ہے اسی لئے مشائخ سلوک نے ہمیشہ طہارت کی صفت میں رہنے کی تاکید کی ہے تاکہ باطن (دل) پاکیزہ رہے اسی لئے شارع علیہ السلام نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے (کیونکہ دل اس سے متاثر ہوجائیگا)۔

[3] قلت: "ولا تختلفوا" اس جملہ سے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف سے منع فرمایا تو شاید لوگ بازار کی طرح صفوں میں مرد وعورت اکھٹے کھڑے ہونے شروع ہوجائیں کیونکہ اختلاف کی ممانعت فرمائی گئی ہے لہٰذا دوسرا جملہ ایاکم وھیشات الاسواق سے اس وہم کو دور فرمایا کہ بازار کی طرح صفوں میں مرد وعورت کا مخلوط اجتماع مت کرو اور عقلمند غیر عاقل ناسمجھ کیساتھ کھڑے مت ہوں جیسا کہ بازار میں ہوتا ہے۔ نیز یہ جملہ تاسیس بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مقصود بلاضرورت بازار جانے سے منع کرنا ہے کیونکہ سب جگہوں میں سب سے بُری جگہ بازار ہے لہٰذا یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔

باب ماجاء فی کراھیة الصَّفِّ بین السَّوَارِی

باب ہے ستونوں کے درمیان صف بندی کی ممانعت کے بیان میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وكيع عن سفيان عن يحيى بن هانىء بن عروة المرادى عن عبد الحميد بن محمودٍ قال: صَلَّيْنَا خلفَ اَميرٍ من الامراء فَاضْطَرَّنَا النَّاسُ فصلينا بين السَّارِيَتَيْنِ فلما صلينا قال انس بن مالك كُنَّا نَتَّقِي هذا على عهدِ رسول الله صلّى الله عليه وسلم۔ وفى الباب عن قُرَّةَ بن اِياسٍ المُزَنِيِّ۔ قال ابو عيسى: حديث انسٍ حسنٌ صحيحٌ۔

وقد كَرِه قوم من اهل العلم ان يُصَفَّ بين السوارى۔ وبه يقولُ احمد، واسحقُ۔ وقد رَخَّصَ قوم من اهل العلم فى ذلك۔

﴿ترجمہ﴾

عبدالحمید بن محمود فرماتے ہیں ہم نے حکمرانوں میں سے ایک حاکم کے پیچھے نماز پڑھی پس ہمیں لوگوں کی کثرت نے مجبور کیا تو ہم نے ستونوں کے درمیان نماز پڑھی پھر جب ہم نے نماز پڑھ لی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس چیز (ستونوں کے درمیان صف بنانے) سے بچا کرتے تھے۔

اس باب میں قرہ بن ایاس المزنی سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کی ایک جماعت نے ستونوں کے درمیان صف بنانے کو مکروہ قرار دیا اور یہ امام احمد و اسحٰق کا قول بھی ہے اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس بارے میں رخصت دی ہے (یعنی اسے جائز قرار دیا)۔

﴿تشریح﴾

صف بین السواری کی ممانعت کی علت: ستونوں کے درمیان صف بنانے کی ممانعت کی مشہور وجہ[1] یہ ہے کہ اس میں صفوں کے درمیان انقطاع[2] لازم آتا ہے (کہ ٹوٹ ٹوٹ کر صفیں بنتی ہیں) اور اس طرح ستونوں کے درمیان صف کے بنانے

---

[1] بعضوں نے کراہت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ جگہ عہد نبوی میں جوتوں کے رکھنے کی تھی اسلئے وہاں پر صفوں کے بنانے سے منع کیا گیا۔

[2] لیکن بوقتِ ضرورت صف کے ٹوٹنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ صفوں کا ٹیڑھا ہونا لازم نہ آئے۔

کے متعلق مشائخ میں اختلاف رہا ہے[1] اور بعضوں نے اس ممانعت کی یہ وجہ بتلائی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستونوں کے درمیان جنّات کے کھڑے[2] ہونیکی جگہ مقرر فرمائی تھی لہٰذا ہمارے حق میں کوئی کراہت نہیں کیونکہ ہمیں قطعی طور پر معلوم نہیں کہ وہ جنات ہماری اس جماعت میں حاضر ہیں یا نہیں؟ شاید کہ وہ جنات (عہدِ نبوی میں) انسانوں ہی کی صورت میں ہوتے ہونگے لیکن سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس ممانعت کی علت صفوں میں برابری کا نہ ہونا ہے[3] کہ کچھ لوگ آگے بڑھ جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائینگے نیز اس میں صف کا ٹوٹنا بھی لازم آتا ہے کیونکہ ہمارے زمانے کی طرح مسجد نبوی کے ستون بالکل ایک دوسرے مقابل نہیں تھے (بلکہ ٹیڑھے ٹیڑھے تھے) لہٰذا مسجد نبوی کے علاوہ دوسری مساجد میں یہ کراہت نہ ہوگی۔

---

[1] **ستونوں کے درمیان صف بنانے کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے:** ترمذی نے اہل علم کی ایک جماعت (جن میں امام احمد واسحٰق بھی ہیں) سے اس کو مکروہ ہونا نقل کیا ہے۔ سعید بن منصور نے ابن مسعود، ابن عباس، اور حذیفہ رضی اللہ عنہم سے اس کی ممانعت کو نقل کیا ہے ابن سید الناس فرماتے ہیں: صحابہ کرام میں ان کی مخالفت کرنے والے صحابہ کو ہم نہیں پہچانتے۔ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، ابن منذر رحمہم اللہ نے ستونوں کے درمیان صف بنانے کی اجازت دی ہے۔ ابن رسلان کہتے ہیں کہ حسن اور ابن سیرین سے بھی اس کی اجازت مروی ہے۔ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس وقت جگہ تنگ ہو تو اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر جگہ کشادہ ہو تو باجماعت نماز پڑھنے والوں کیلئے یہ مکروہ ہے اکیلے شخص کیلئے مکروہ نہیں۔ سرخسی رحمہ اللہ مبسوط میں لکھتے ہیں کہ دوستونوں کے درمیان صف بنانے میں کوئی کراہت نہیں کیونکہ ہر فریق کے حق میں یہ مستقل صف کی طرح ہے اگرچہ یہ صف زیادہ لمبی نہیں ہے۔ کذا فی البذل

[2] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے کہ لفظِ قیام کو بین السواری کی طرف مضاف کیا گیا ہے جبکہ مولانا رضی الحسن رحمہ اللہ نے اپنی تقریر میں اس کے بعد لکھا ہے کہ اب ستونوں کے درمیان والی جگہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے ساتھ جنات شریک ہیں یا نہیں؟ نیز اگر وہ شریک بھی ہیں تو وہ انسانوں کی صورت میں ہیں یا نہیں؟ ھکذا افاد الشاہ عبدالغنی رحمہ اللہ۔ انتھی

[3] مطلب یہ ہے کہ یہ کراہت خاص مسجد نبوی کے ستونوں میں تھی کیونکہ عہدِ نبوی میں مسجد نبوی کے ستون ٹیڑھے ٹیڑھے تھے ہمارے زمانے میں مسجد میں چونکہ ستون بالکل ایک سیدھ میں ہوتے ہیں (تو صف بھی سیدھی بنتی ہے) لہٰذا اس میں صف بنانے میں کوئی کراہت نہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃ خَلْفَ الصَّفِّ وحْدَهُ

باب ہے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو الاحْوَصِ عن حُصَيْنٍ عن هِلَالِ بن يِسَافٍ قال: اَخَذَ زِيَادُ بن ابی الجعْدِ بِيَدِی ونحنُ بالرَّقَّةِ، فقام بی علی شيخ يقالُ له وابصَةُ بنُ مَعْبَدٍ من بنی اَسَدٍ فقال زيادٌ:حدثنی هذا الشيخُ: ان رجلاً صلّی خلفَ الصف وحدَهُ۔ والشيخُ يسمعُ۔

فامره رسولُ اللّٰه صلّی اللّٰه عليه وسلم ان يُعِيدَ الصلاۃَ۔

قال ابو عيسی: وفی الباب عن علیِّ بنِ شَيْبَانَ وابنِ عباسٍ۔

قال ابو عيسی: و حديث وابصةَ حديثٌ حسن۔وقد كَرِهَ قوم من اهل العلم ان يصلی الرجل خلف الصف وحده وقالوا: يعيدُ اذا صلّی خلف الصف وحده۔ وبه يقول احمد، واسحق۔

وقد قال قوم من اهل العلم: يُجزئه اذا صلّی خلف الصفِّ وحده۔ وهو قولُ سفيانَ الثوری، وابن المبارك، والشافعی۔ وقد ذهب قوم من اهل الكوفة الی حديث وابصة بن مَعْبَدٍ ايضاً، قالوا: مَن صلّی خلف الصف وحده يعيدُ۔ منهم حَمَّادُ بن ابی سليمان، وابن ابی ليلی، ووكيعٌ۔ وروی حديثَ حُصين عن هلال بن يساف غيرُ واحد مثل رواية ابی الاحوص عن زياد بن ابی الجعد عن وابصة بن معبد۔ وفی حديث حُصين مايدلُّ علی ان هلا لًا قد ادرك وابصةَ۔ واختلف اهل الحديثُ فی هذا:فقال بعضهم: حديث عمرو بن مُرَّةَ عن هلال بن يِسافٍ عن عمرو بن راشدٍ عن وابصةَ بن معبدٍ : اَصَحُّ۔ وقال بعضهم: حديثُ حُصينٍ عن هلالُ بن يِسافٍ عن زياد بن ابی الجعد عن وابصة بن معبدٍ: اَصَحُّ۔

قال ابو عيسی: وهذا عندی اصحُّ من حديث عمرو بن مرة، لانه قد رَوَی مِن غير حديث هلال بن يِسافٍ عن زياد بن ابی الجعد عن وابصة۔

☆حدثنا محمد بن بشارٍحدثنا محمد بن جعفر حَدَّثَنَا شعبة عن عمرو بن مرة عن زياد بن ابی الجعد عن وابصة ح قال وانا محمد بن بشار وانا محمد بن جعد قال انا شعبه عن عمرو بن مرة

عن هلال بن يساف عن عمرو بن راشد عن وابصة بن معبد: وان رجلا صلّى خلف الصف وحده فامره النبيُّ صلّى اللّٰه عليه وسلم ان يُعيدَ الصلاةَ۔

قال ابو عيسى: و سمعتُ الجاروَ يقول: سمعت وكيعاً يقول: اذا صلّى الرجلُ خلفَ الصفِّ وحده فانه يُعيدُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ہلال بن یساف سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ زیاد بن ابی الجعد نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم مقام رقہ میں تھے پھر مجھے اپنے ساتھ ایک شیخ کے پاس لے گئے جن کو وابصہ بن معبد کہا جاتا تھا ان کا تعلق قبیلہ بنو اسد سے تھا پھر زیاد نے کہا کہ ہم سے اس شیخ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھی ......اور شیخ (بھی) یہ بات سن رہے تھے.....تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نماز کے اعادہ کا حکم فرمایا۔

اور باب میں علی بن شیبان اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وابصہ کی حدیث حدیثِ حسن ہے۔ اور اہل علم کی ایک جماعت نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے کو مکروہ فرمایا ہے اور فرمایا کہ جب صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی تو نماز کا اعادہ کرے اور یہی امام احمد اور اسحٰق کا قول ہے اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک اگر صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھ لی تو نماز ہو جائیگی اور یہ سفیان ثوری ابن مبارک اور شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اہل کوفہ میں علماء کی ایک جماعت نے بھی وابصہ بن معبد کی حدیث کو اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی تو وہ نماز کو دہرائے ان اہل کوفہ میں حماد بن سلیمان اور ابن ابی لیلی اور وکیع شامل ہیں......اور جس طرح ابوالاحوص نے حصین عن ہلال بن یساف کی سند سے حضرت زیاد بن ابی الجعد کی حدیث نقل کی ہے اسی طرح متعدد راویوں نے ابوالاحوص کی طرح حدیث نقل کی ہے۔ اور اس حصین کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہلال نے وابصہ رضی اللہ عنہ کو پایا ہے محدثین کا اس حدیث کی سند میں اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ عمرو بن مرہ عن ہلال بن یساف عن عمرو بن راشد عن وابصہ والی سند حدیث اصح ہے اور بعض محدثین فرماتے ہیں کہ حدیث حصین عن ہلال بن یساف عن زیاد بن ابی الجعد عن وابصہ بن معبد اصح ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے اور یہ حدیث حصین ہمارے نزدیک عمرو بن مرہ کی حدیث سے زیادہ اصح ہے اس لئے کہ

ہلال بن یساف سے کئی احادیث اسی سند کے ساتھ مروی ہیں کہ وہ زیاد بن ابی جعد سے اور وہ وابصہ سے روایت کرتے ہیں (تو حضرت وابصہ صحابی سے پہلے راوی زیاد بن ابی الجعد ہیں نہ کہ عمرو بن راشد)۔

وابصہ بن معبد سے روایت ہے کہ ایک شخص نے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھ لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نماز دہرانے کا حکم فرمایا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے جارود کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے وکیع سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھ لے تو وہ اسے دہرائے گا۔

﴿تشریح﴾

(فقال زیاد حدثنی ھذا الشیخ) اس روایت میں قراءت علی الاستاذ[1] کے طریقے پر حدیث کو بیان کیا گیا (اور یہ وابصہ بن معبد زیاد اور ہلال دونوں کے استاذ ہو گئے) لہٰذا اگر ہلال بن یساف اس روایت کو وابصہ بن معبد سے بلا واسطہ زیاد کے اس طرح نقل کریں کہ ہلال عن وابصہ تو بھی صحیح ہے۔

حدیث کی توجیہ: حدیثِ باب میں ان صحابی کو نماز کے اعادہ کا حکم[2] اس لئے دیا گیا کہ جماعت میں صف میں شریک ہو کر نماز پڑھنا ان پر ضروری تھا (اور وہ صحابی جماعت سے الگ تھلگ نماز پڑھ رہے تھے اسی امام کے پیچھے) یہ حکم اور مسئلہ

---

[1] **حدیثِ باب میں عرض علی الشیخ کا طریقہ مذکور ہے:** محدثین اس کو عرض علی الشیخ کہتے ہیں جمہور کے نزدیک اس طرح حدیث کو روایت کرنا صحیح ہے۔ بعض علماء نے عرض علی الشیخ کا اعتبار نہیں کیا۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ سماع من لفظ الشیخ زیادہ بہتر ہے یا قراءت علی الشیخ؟ اس میں تین مذہب ہیں: (از مترجم: یہ اختلاف کتاب الطہارۃ کی سب سے پہلی حدیث میں حدثنا کے عنوان کے تحت تفصیل سے گزر چکا ہے)۔ تیسرا اختلاف یہ ہے کہ اس طرح قراءت علی الشیخ کرنے کی صورت میں اس روایت کو حدثنا اور اخبرنا سے نقل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ والبسط فی الاصول۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ کا کلام کہ ہلال وابصہ سے اس روایت کو ہلال عن وابصہ کے ساتھ بھی ذکر سکتے ہیں تو ابن ماجہ میں بعینہ یہی روایت ہے (ہلال عن وابصہ) اس میں زیاد کا واسطہ مذکور نہیں۔

[2] صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنا امام احمد واسحٰق کے نزدیک باطل ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صحیح ہے اس مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو امام احمد واسحٰق کا مذہب اور اہل کوفہ کی ایک جماعت کا مذہب ذکر کیا ہے (اہل کوفہ سے مراد حنفیہ نہیں ہیں بلکہ اہل کوفہ سے یہاں مراد حماد بن ابی سلیمان، ابن ابی لیلی اور امام وکیع ہیں۔ کما صرح بہ المصنف۔ از مترجم) ان دونوں مذہبوں کا مآل ایک ہی ہے۔

اس وقت ہے جبکہ اس صف میں جگہ ہوتو پیچھے کھڑا ہونا منع ہے لیکن اگر اگلی صف میں جگہ نہ ہوتو اس آنے والے کو اگلی صف سے ایک نمازی کو کھینچ [1] کر اپنے ساتھ کھڑا کر دینا چاہیئے لیکن اگر اگلی صف سے نمازی کو نہ کھینچیں (فسادِ زمانہ کی وجہ سے) خود اکیلا ہی صف میں کھڑا ہو جائے تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اس پر اعادہ بھی نہیں [2] نہ وجوباً اور نہ ہی استحباباً۔

(قالوا من صلی خلف الصف وحده يعيده) یعنی یہ شخص وجوباً نماز کا اعادہ کرے گا کیونکہ اس نے حرام فعل کا ارتکاب کیا ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ اعادہ کا الحکم اس وقت ہے جبکہ اگلی صف میں گنجائش ہو۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (فقال بعضهم حديث عمرو بن مره عن هلال بن يساف عن عمرو بن راشد عن وابصه الخ) دونوں ہی سندیں [3] صحیح ہوسکتی ہیں کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ ہلال راوی نے زیاد بن ابی الجعد اور عمرو بن راشد دونوں ہی سے یہ روایت نقل کی ہو اور عمرو بن مرہ اور حصین دونوں نے ہلال راوی سے حدیث نقل کی ہے۔

---

[1] **حنفیہ اور شافعیہ کے ہاں اس کو اگلی صف سے ایک نمازی کھینچ لینا چاہیئے:** لیکن امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے ہاں اس طرح کھینچنا مکروہ ہے۔ کمافی الاوجز

[2] **اشکال اور اسکا جواب:** جب صف میں منفرداً کھڑا ہونا مکروہ ہے تو جب اس طرح کسی نے مکروہ فعل کے ساتھ نماز پڑھی اور یہ قاعدہ ہے کہ جو نماز کسی مکروہ فعل کے ساتھ پڑھی گئی ہو تو اس کا اعادہ کیا جاتا ہے لہٰذا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے کس طرح اعادہ کی نفی مطلقاً فرما دی ہے؟

جواب: یہ قاعدہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ فقہاء کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نماز اس مکروہ فعل کی وجہ سے لوٹائی جاتی ہے کہ وہ نماز کا ایسا واجب یا سنت ہو کہ اسے چھوڑنے کی وجہ سے نماز کی ماہیت اور اجزاء میں کسی جزء کا ترک لازم آتا ہو اسی وجہ سے علامہ شامی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ جماعت ایسا وصف نہیں کہ اسے چھوڑنے کی وجہ سے نماز کا اعادہ کیا جائے کیونکہ جماعت، نماز کا ایک ایسا وصف ہے جو اس کی ماہیت سے خارج ہے۔ فتامل (از مترجم: مختصر وضاحت یہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے لیکن منفرداً نماز پڑھنے والا اس واجب کا تارک ہے تو اس ضابطہ سے منفرداً مرد نمازی کی نماز بھی واجب الاعادہ ہونی چاہیئے؟

تو اس اشکال کا جواب علامہ شامی نے دیا ہے کہ ایسا واجب جس کے چھوٹنے سے نماز کی ماہیت اور حقیقت میں فرق آجائے تو اس سے نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے جبکہ جماعت سے نماز پڑھنا نماز کی ماہیت سے خارج ہے تو اس طرح نماز کا اعادہ کرنا لازم نہیں)۔

[3] زیلعی رحمہ اللہ نے ابن حبان سے یہی نقل کیا ہے کہ: ابن حبان نے اس حدیث کو دونوں سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے پھر فرمایا ہے کہ ہلال بن یساف نے اس حدیث کو عمرو بن راشد سے بھی سنا ہے اور زیاد سے عن وابصہ کی سند سے بھی لہٰذا دونوں سندیں صحیح ہیں پھر آگے اس کے طرق کو مفصلاً نقل کیا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی ومعه رجل

باب ہے اس شخص کے متعلق جس کے ساتھ نماز پڑھنے والا ایک ہی شخص ہو

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا داود بن عبد الرحمن العطارُ عن عمرو بن دینارٍ عن کُرَیْبٍ مولی ابن عباسٍ عن ابن عباسٍ قال: صلَّیتُ مع النبّی صلّی اللّٰه علیه وسلم ذاتَ لیلةٍ، فقمتُ عن یساره، فاخذ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم برأسی مِن ورائی فجعلنی عن یمینه۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن انس۔ قال ابو عیسی: و حدیث ابن عباس حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی هذا عند اهل العلم من اصحاب النبیِّ صلّی اللّٰه علیه وسلم ومَن بعدهم، قالوا: اِذا کان الرجل مع الامام یقومُ عن یمین الامام۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک رات نماز پڑھی تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنے دائیں جانب کرلیا۔

باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ، اہل علم اور ان کے بعد کے تمام علماء کا اسی پر عمل ہے کہ اگر ایک شخص اکیلا امام کے ساتھ ہو تو امام کے دائیں جانب کھڑا ہو۔

﴿تشریح﴾

(براسی من ورائی) خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گُدّی[1] سے پکڑا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کا فعل نماز میں جائز ہے۔

---

[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو گُدّی سے پکڑنا ان علماء کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ مقتدی کا امام سے آگے بڑھنا ناجائز ہے (کیونکہ اگر یہ جائز ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے آگے سے کھینچتے) کیونکہ وہ زیادہ آسان تھا۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مقتدی کے امام سے آگے بڑھنے سے نماز ٹوٹ جائیگی یا نہیں؟

باب ماجاء فی الرجل یصلی مع الرجلین

باب ہے اس شخص کے متعلق جس کے ساتھ دو آدمی نماز پڑھنے والے ہوں

☆حدثنا بندار محمد بن بشار حَدَّثَنَا محمد بن ابی عدی قال: انبانا اسمٰعیل بن مسلم عن الحسن عن سَمُرَةَ بنِ جُنُدبٍ قال: اَمَرَنَا رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم اِذَا کنّا ثلاثۃً ان یَّتَقَدَّمَنَا احدُنا۔قال ابو عیسی: وفی الباب عن ابن مسعود، وجابر۔

قال ابو عیسی: وحدیث سمرۃ حدیث غریب۔ والعمل علی ھذا عن اھل العلم، قالوا: اذا کانوا ثلاثۃً قام رجلان خلف الامام۔ ورُوِیَ عن ابن مسعود: انہ صلّی بِعَلْقَمَۃَ والا سودِ فاقام احدَھما عن یمینہ والآخرَ عن یسارہ، ورواہُ عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم۔

وقد تکلَّمَ بعضُ الناس فی اسمٰعیل بن مسلم المکی من قِبَلِ حفظہ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا جب ہم تین (نماز پڑھنے والے) ہوں تو ایک آگے بڑھ کر امامت کرے۔

اور باب میں ابن مسعود، جابر رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب (نماز پڑھنے والے) تین آدمی ہوں تو دو آدمی امام کے پیچھے کھڑے ہوں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے علقمہ اور اسود کو امامت کرائی تو ایک اپنے دائیں جانب کھڑا کیا اور دوسرے کو بائیں جانب کھڑا کیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا اور بعض حضرات نے اسماعیل بن مسلم کے حافظہ پر کلام کیا ہے (کہ انکا حافظہ اچھا نہیں)۔

﴿تشریح﴾

(ان یتقدم احدنا) اگر وہ لوگ جماعت شروع کرنے سے پہلے[1] ہی سے تین ہوں تب تو ظاہر ہے کہ اپنے امام کو آگے

---

[1] ائمہ اربعہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر دو مقتدی ہوں تو امام کو ان سے آگے بڑھ کر کھڑا ہونا چاہئیے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اتباع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام کو ان کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہئیے۔ کذا فی الاوجز

کر دیں لیکن اگر شروع میں کل دوافراد تھے پھر تیسرا ابھی آ کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا ہو تو یا تو آنے والا دوسرا مقتدی پہلے مقتدی کو پیچھے کھینچ لائے یا امام آگے بڑھ جائے۔آنے والا شخص نماز کے شروع کرنے سے پہلے بھی اپنے ساتھی نمازی کو پیچھے کھینچ سکتا ہے اور نماز شروع کرنے کے بعد بھی کھینچ[1] سکتا ہے۔

وفی الباب کی تشریح: (وفی الباب عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ) یعنی امام دومقتدیوں کے ساتھ ہو اس کے متعلق ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے یہ مطلب نہیں کہ جب تین افراد ہوں تو امام آگے بڑھ جائے یہ روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہو[2] کیونکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف ثابت ہے کہ تین افراد کی جماعت تھی تو انہوں نے ایک کو دائیں کھڑا کیا اور دوسرے کو بائیں) لہٰذا وہ اپنی حدیث کے خلاف کس طرح عمل کر سکتے ہیں لیکن اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے آنے والے فعل (کہ انہوں نے علقمہ اور اسود کو جماعت کرائی ایک کو دائیں کھڑا کیا اور دوسرے کو بائیں۔از مترجم) کو بیانِ جواز[3] پر محمول کریں کہ ان کا اس فعل سے مقصود یہ تھا کہ اس طرح بھی نماز صحیح ہو جاتی ہے تو اس توجیہ کے مطابق ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسی حدیث مروی ہو سکتی ہے جس میں تین افراد کی صورت میں امام کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اس طرح مروی ہے کہ آپ دومقتدیوں کے بیچ میں کھڑے ہو گئے تھے وہ بھی اسی بیانِ جواز پر محمول ہوگا۔

(قد روی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ انہ صلی بعلقمۃ والاسود فاقام احدھما عن یمینہ والآخر عن یسارہ) ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مشہور مذہب یہی ہے کہ دومقتدیوں کی صورت میں امام ان کے

---

[1] عالمگیریہ میں اس کی تصریح کی ہے کہ دونوں حالتوں میں یہ فعل جائز ہے۔

[2] از مترجم: چنانچہ صاحب تحفۃ الاحوذی نے وفی الباب عن ابن مسعود کے تحت لکھا ہے کہ مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں واقعہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسود اور انکے چچا علقمہ کو نماز پڑھائی تو ان دونوں میں سے ایک کو دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب کھڑا کر دیا اور فرمایا ھکذا یصنع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کانوا ثلثۃ۔ص ۱۹۵: تحفۃ الاحوذی

[3] یعنی ہم نے فعلِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا جو محمل بیان کیا کہ وہ بیانِ جواز پر محمول ہو جیسا کہ آگے آ رہا ہے لیکن پہلا معنیٰ ہی راجح ہے کیونکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور موقوفاً یہی ثابت ہے کہ تین افراد کی صورت میں وہ امام کو درمیان میں کھڑے کرنے کے قائل تھے نہ کہ آگے بڑھنے کے۔

درمیان[۱] میں کھڑا ہوگا لیکن ان کے اس فعل کی توجیہ ہوسکتی ہے کہ ان کا یہ فعل بیان جواز کی تعلیم کیلئے ہو لہٰذا اس جواب کی ضرورت نہیں رہی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی کیونکہ یہ جواب ایسے جلیل القدر صحابی کے شایانِ شان نہیں۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی ومعه الرجالُ والنساءُ

باب ہے اس شخص کے متعلق جس کے پیچھے نماز پڑھنے والے مرد اور عورتیں دونوں ہوں

☆حدثنا اسحق الانصاری اخبرنَا معن حَدَّثَنَا مالك بن انس عن اسحق بن عبد اللّٰه بن ابی طلحة عن انس بن مالك: ان جدَّته مُلیكة دَعَتْ رسولَ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم لطعام صَنَعَتْهُ۔ فاكل منه،ثم قال: قُومُوا فَلْنُصَلِّ بكم، قال انس: فقمتُ الی حصیرٍ لنا قداسْوَدَّ مِن طُولِ مالَبِسَ، فَنَضَحْتُهُ بالماء، فقام علیه رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم، وصَفَفْتُ علیه، انا والیتیمُ وراءَهُ والعَجوزُ من ورائِنَا، فصلّی بنا ركعتین ثم انصرفَ۔ قال ابو عیسی: حدیث انسٍ حدیثٌ حسن صحیحٌ۔

والعمل علیه عندَ اهل العلم ، قالوا:اِذا كان مع الامام رجل وامراة قام الرجل عن یمین الامام والمرأة خلفهما۔ وقد احتج بعض الناس بهذا الحدیث فی اجازة الصلاة اذا كان الرجل خلفَ الصفِّ وحدَهُ، وقالوا: ان الصبیَّ لم تكن له صلاةٌ وكانّ انساً كان خلف النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم وحدَه فی الصفِّ ولیس الامرُ علی ماذهبوا الیه، لان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم اَقَامَهُ مَع الیتیم خلفه، فلولا اَنَّ النبیَّ صلّی اللّٰه علیه وسلم جعل للیتیم صلاةً لما اقام الیتیم معه، وَلَاَقَامَهُ عن یمینه۔ وقد رُوِیَ عن مُوسی بن انس عن انسٍ: انه صلّی مع النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم فاقامه عن یمینه۔ وفی هذا الحدیث دلالة انه انما صلّی تطوعاً، اراد ادخال البركة علیهم۔

---

[۱] **ابن مسعودؓ کے فعل کی مختلف توجیہات:** ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فعل کی بہت سی توجیہات کی گئیں ہیں میرے نزدیک اس کی سب سے بہترین توجیہ وہ ہے جس کو عینی نے اس طرح لکھا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ مکان کی تنگی کی وجہ سے انہوں نے یہ فعل کیا جیسا کہ طحاوی نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فعل جگہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے تھا یا کسی اور عذر کی وجہ سے تھا۔ یہ فعل بطور سنت ہونے کے نہ تھا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی نانی ملیکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے تیار کئے ہوئے کھانے سے دعوت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کھانا تناول فرمایا پھر فرمایا کھڑے ہو جاؤ کہ تمہیں نماز پڑھائیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اور میری وہ چٹائی جو طویل عرصہ سے استعمال نہ ہونے کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھی۔ میں نے اس پر پانی چھڑکا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور میں نے اور یتیم (یتیم کا نام بعض روایت میں ضمیرہ آیا ہے۔از مترجم) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے صف بنا کر کھڑی ہوگئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھائی پھر تشریف لے گئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ہے اور اسی پر تمام اہل علم کا عمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں جب امام کے ساتھ (دو مقتدی ہوں) ایک مرد اور ایک عورت تو مرد امام کے دائیں جانب کھڑا ہو اور عورت ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو۔ اور بعض حضرات نے اس حدیث سے صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے کی اجازت پر استدلال کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ بچے کی نماز، نماز ہی نہیں ہوتی تو انس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھی لیکن یہ بات صحیح نہیں جو ان حضرات نے سمجھی اسلئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انس رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے یتیم کے ساتھ کھڑا کیا اور اگر (ایسا نہ ہوتا کہ) یتیم کی نماز کو آپ معتبر نہ سمجھتے تو یتیم کو انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑا نہ کرتے بلکہ انس رضی اللہ عنہ کو اپنے دائیں جانب کھڑا کرتے اور موسیٰ بن انس ...... انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے دائیں جانب کھڑا کیا...... اور اس حدیث میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ آپ نے نفل نماز ان کے لئے برکت کے ارادے سے پڑھی تھی۔

﴿تشریح﴾

اس حدیث سے صاحبین دلیل پکڑتے ہیں: (قد اسود من طول ما لبس) سے صاحبین کا مذہب ثابت ہو رہا ہے کہ ریشم کو بطور بچھونے اور بستر کے، استعمال کرنا حرام ہے[1] کیونکہ لباس کا اطلاق بستر پر بھی ہوتا ہے۔

---

[1] از مترجم: اس مسئلہ کا تعلق باب الحظر والاباحۃ سے ہے۔ علامہ حصفکی صاحب الدر المختار لکھتے ہیں: امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں ریشم کو بطور تکیہ اور بستر کے استعمال کرنا حلال ہے اسی طرح اس پر سونا بھی حلال ہے۔ صاحبین اور امام شافعی اور امام مالکؒ کے مذہب میں یہ سب حرام ہے اور صاحبین اور جمہور کا قول ہی صحیح ہے۔ فليحفظ هذا ولكنه خلاف المشهور ص ۳۵۵: ج ۶ فتاویٰ شامیہ۔ ایچ ایم سعید

(فَنَضَحتُهٗ) اسلئے اس پر پانی چھڑکا تا کہ اس چٹائی کی سختی ختم ہو اور میل کچیل دور ہو

امام مسجد کیلئے علیحدہ مصلے پر امامت کا ثبوت: (فقام علیه) بعض عوام یہ سمجھتے ہیں کہ امام کیلئے الگ سے کپڑا بچھانا مکروہ ہے (بلکہ جس کپڑے پر سب مقتدی نماز پڑھ رہے ہوں امام کیلئے بھی وہی کپڑا ہونا چاہئیے) لیکن اس حدیث سے اس خیال پر رد ہو جاتا ہے (کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور سے منفرداً اس چٹائی پر کھڑے تھے) کیونکہ بظاہر یہ چٹائی اتنی بڑی نہ تھی کہ اس میں امام اور اس کے پیچھے دو آدمی اور ان دونوں سے پچھلی صف میں بوڑھیا سب کو یہ چٹائی سما سکے کیونکہ ان کی چٹائیاں تین صفوں کے بقدر لمبی نہ ہوتی تھی البتہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت کرنا مسنون ہے اور اس کو قبول کرنا بھی سنت ہے اور میزبان کو دعا دینا بھی سنت ہے اور میزبان کے گھر میں برکت کی غرض سے ان کے یہاں نماز پڑھنا بھی سنت ہے۔ پھر یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نفل نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے جیسا کہ مصنف فرما رہے ہیں کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز گھر میں نہ پڑھتے تھے (لہٰذا یہ نماز نفل ہی ہوگی)۔

نفل باجماعت کی شرائط: لیکن حنفیہ کے مذہب میں نفل نماز باجماعت تب جائز ہے جبکہ اس جماعت کے کل تین افراد ہوں[1]۔ اگر اس سے زیادہ افراد ہوئے تو یہ نمازِ نفل باجماعت مکروہ ہوگی۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین افراد سے زیادہ کے ساتھ باجماعت نفل ادا کرنے کا ثبوت نہیں۔

(الیتیم) یہی ان کا نام تھا[2]۔ باقی ان کا نابالغ ہونا تو یہ دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] چنانچہ درمختار میں ہے کہ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں نہ وتر باجماعت پڑھ سکتے اور نہ ہی نوافل یعنی اگر یہ فعل بطور تداعی کے ہو تو مکروہ ہوگا بایں طور کہ چار آدمی نوافل میں ایک شخص کے پیچھے ہوں کما فی الدرر۔ لیکن ان کی اقتداء کے صحیح ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں کیونکہ اس میں کوئی مانع نہیں۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ تداعی کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نفل کی جماعت کیلئے دعوت دیں۔ کما فی المغرب۔ وافی نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس کے افراد زیادہ ہو جائیں یہ تفسیر اس کے معنی کا لازم ہے بہرحال اگر ایک شخص یا دو افراد ایک شخص کی نفل باجماعت میں اقتداء کریں تو یہ جماعت مکروہ نہیں اور اگر نفل میں تین افراد مقتدی بن جائیں تو اس میں اختلاف ہے۔ ساری بحث اس وقت ہے کہ جب سب افراد متنفل ہوں لیکن اگر فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل پڑھنے والے نماز پڑھیں تو اس نفل باجماعت میں کوئی کراہت نہیں۔

[2] ملا علی قاری نے مرقاۃ میں اسی قول کو بالجزم نقل کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ یتیم انس کے بھائی کا نام تھا۔ میرک وغیرہ نے اس کا نام ضمیرہ بتلایا ہے اور یہی دوسرا قول میرے نزدیک راجح ہے۔ کما حررته فی الاوجز مفصلاً

باب ماجاء من احق بالا مامة

باب ہے اس مسئلہ کے بیان میں کہ امامت کا زیادہ حقدار کون ہے

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو معاوية عن الاعمش قال: وحدثنا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا ابو معاوية و عبد اللّٰه بن نمير عن الاعمش عن اسمٰعيل بن رجاء الزبيدی عن اوس بن ضمعج قال: سمعتُ ابا مسعودِ الانصاریَّ يقول: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: يَؤُمُّ القَومَ اَقرَؤُهُم لكتاب اللّٰه، فإن كانوا فی القراءة سواءً فاَعْلَمُهُم بالسُّنَّة، فإن كانوا فی السنة سواءً فاقدمهم هجرة، فإن كانوا فی الهجرة سواءً فاَكْبَرُهُمْ سِنًّا، وَلَا يُؤَمُّ الرَّجُلُ فی سلطانه، ولا يجلس على تكرِمَتِهٖ، فی بيته الا باذنه قال محمود بن غيلان: قال ابن نمير فی حديثه اقدمهم سنا۔قال ابو عيسى: وفی الباب عن ابی سعيد، وانس بن مالك، ومالك بن الحويرث، وعمرو بن سلمة۔

قال ابو عيسى: و حديث ابی مسعود حديث حسن صحيحٌ۔ والعمل على هذا عند اهل العلم۔ قالوا: احق الناس بالامامة اقروهم لكتاب اللّٰه واعلمهم بالسنة۔ وقالوا صاحب المنزل اَحَقُّ بالامامة۔

وقال بعضهم: اذا اَذِنَ صاحبُ المنزل لغيره فلا باس اَن يُصَلِّیَ بِهِم و كرهه بعضهم ، وقالوا: السنة اَن يُصَلِّیَ صاحب البيت۔ قال احمد بن حنبل: وقول النبی صلّى اللّٰه على وسلم وَلَا يُؤَمُّ الرَّجُلُ فی سلطانه ولا يُجلَسُ على تكرمته فی بيته الا باذنه:فاذا اذن فارجو اَنَّ الاذن فی الكل، ولم ير به باسا اذا اَذِنَ لهٗ ان يصلی به۔

﴿ترجمه﴾

حضرت اوس بن ضمعج سے روایت ہے کہ میں نے ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قوم کی امامت ان میں سے جوسب سے بہتر کتاب اللہ کا قاری ہو وہ کرے پھر اگر وہ قراءت میں برابر ہوں تو جوشخص ان میں زیادہ سنت کا علم رکھنے والا ہو اور اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جوشخص ان میں ہجرت میں سب سے مقدم ہو پھر اگر وہ ہجرت میں برابر ہوں تو جوشخص ان میں زیادہ عمر والا ہو اور نہ امامت کرے کوئی شخص اس (امام) کی اس کی (امامت کی) جگہ میں اور نہ بیٹھے اس کی مسند پر اور اس کے گھر میں مگر اس کی اجازت کے ساتھ۔محمود کہتے ہیں کہ ابن

نمیر نے اپنی حدیث میں (اکبرھم سناً کی جگہ) اقدمھم سناً کہا ہے۔

اور باب میں ابوسعید اور انس بن مالک اور مالک بن حویرث اور عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابومسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر اہل علم کا عمل ہے وہ فرماتے ہیں لوگوں میں امامت کا زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو ان میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ بہتر پڑھنے والا ہو اور سنت سے سب سے زیادہ واقفیت رکھنے والا ہو اور فرماتے ہیں کہ گھر والا امامت کا زیادہ حقدار ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر گھر والا کسی دوسرے کو امامت کی اجازت دے دے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کو نماز پڑھائے اور بعض حضرات اس کو مکروہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سنت طریقہ یہی ہے کہ گھر والا نماز پڑھائے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ نہ امام بنے کوئی شخص کسی کی امامت کی جگہ میں اور نہ بیٹھے کوئی شخص کسی کی مسند پر اس کے گھر میں مگر اس کی اجازت سے۔ پھر جب وہ اجازت دے دے تو میں امید کرتا ہوں کہ دونوں صورتوں میں (اجازت ہوگی) اور (امام احمد) اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے جب امام راتب اور صاحبِ خانہ دوسرے کو اجازت دے دے تو وہ دوسرا شخص نماز پڑھا سکتا ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے امام ابو یوسف کا استدلال: (یوم القوم اَقرَأُھُم لکتاب الله) اس حدیث سے امام ابو یوسف کا مذہب[1] ثابت ہوتا ہے۔ باقی ائمہ کے نزدیک قرآن وحدیث کا زیادہ جاننے والا اقرأ سے مقدم ہوگا۔

جمہور کی دلیل اور حدیث باب کے جوابات: ان کی دلیل اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنایا تھا حالانکہ اس مجمع میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (جو اقرأ الصحابہ تھے) بھی موجود تھے لہٰذا حدیث باب منسوخ[2] ہوگی۔

---

[1] قلت: امام احمدؒ سے بھی یہی مذہب مروی ہے جیسا کہ فروع حنابلہ سے اس مذہب کی تائید ہوتی ہے چنانچہ الروض المربع میں ہے کہ امامت کا سب سے زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو کہ اقرأ بھی ہو اور اپنی نماز کے مسائل جانتا ہو پھر وہ شخص جو کہ افقہ ہو اگر قراءت میں سب برابر ہوں اور حدیث باب سے اس پر استدلال کیا گیا ہے۔

[2] محقق ابن الھمام کا فتح القدیر میں اسی توجیہ کی طرف میلان ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اس حدیث میں اقرا سے مراد عمدہ قرات کرنیوالا شخص نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مختلف قراءتوں کا جاننے والا اور قرآنی آیات کی تفسیر اور معانی کو سمجھنے والا شخص ہے تو ایسا شخص لامحالہ نماز کے مسائل کا بھی عالم ہوگا۔ اب فان تساؤوا فی ذلك فاعلمهم بسنة کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان مسائل صلاۃ کے جاننے میں سب برابر ہوئیں تو پھر اعلم بالسنۃ مقدم ہوگا یعنی ایسا شخص مقدم ہوگا جو کہ مسائل صلاۃ کے علاوہ[1] حلال وحرام کے مسائل اور ایسے مسائل زیادہ جانتا ہو جو سنت (حدیث) میں مذکور ہیں...... یہ مسائل قرآن کریم میں تو صراحۃً مذکور نہیں ہوں بلکہ کافی دقت کے بعد سمجھ میں آتے ہوں۔ اس طرح آپس کے معاملات اور جنگ کے احکام جو احادیث میں مذکور ہیں ان کا جاننے والا ہونا مراد ہے۔ لہٰذا اس توجیہ کے مطابق حدیث باب جمہور علماء (احناف وغیرہ) کے مذہب کے مخالف نہ رہیگی لہٰذا اس حدیث کو منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔

ہمارے اس جواب کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو حضرات اقرا ہوتے تھے وہ ہماری طرح صرف قرآن کو رٹنے والے نہ تھے کہ نہ انہیں الفاظ قرآن کے معانی معلوم ہوں نہ ہی مسائل (بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کے معانی و احکام کو سمجھ کر تلاوت کیا کرتے تھے)۔ یادرہیکہ قرآن کریم کو اس ترتیل و تجوید کے ساتھ پڑھنا جس کے بغیر نماز ہی صحیح نہیں ہوتی، ہر صحابی قرآن پاک کو اس لازمی تجوید کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اس نفس تجوید میں سب صحابہ برابر تھے۔ فافہم[2]

پھر فقہاء کرام نے امامت کے حقدار ہونے کی جو وجوہاتِ ترجیح ذکر کی ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ امام کو لوگ پسند کرتے ہوں اس سے متنفر نہ ہوں۔

---

[1] قلت: حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جو علت ذکر کی ہے تو اس معلوم ہوتا ہے کہ اعلم سے مراد وہ شخص ہے جو صرف نماز کے مسائل کو جانتا ہے چنانچہ ہدایہ میں ہیے کہ امامت کا سب سے زیادہ حقدار اعلم بالسنہ ہے۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ اقرا سب سے زیادہ حقدار ہے کیونکہ قراءت تو بہرحال ضروری ہے لیکن علم کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ قرأت کی ضرورت تو صرف ایک رکن (قیام) کیلئے ہے اور علم کی ضرورت تمام ارکان میں پڑتی ہے۔ انتہی اس سے معلوم ہوا کہ جس علم کی ضرورت تمام ارکان میں پڑتی ہے وہ نماز کے مسائل کا علم ہے نہ کہ دیگر مسائل کا علم۔

[2] شاید کہ اس سے اسطرف اشارہ ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے تو ابی بن کعبؓ کا اعلم الصحابہ ہونا لازم آئیگا کیونکہ وہ بالاتفاق اَقْـرَءُ تھے (تو اشکال اور اس کے جواب کی طرف فافہم سے تنبیہ فرمائی۔ از مترجم)

اور امام میں جب وہ اوصاف پائے جائینگے جن کا شارع نے اعتبار کیا ہے اور ان اوصاف کو فضیلت اور کمال سمجھا ہے..... عمر رسیدہ ہونا، شرافت، نسب وغیرہ۔ ان اوصاف کی موجودگی میں، امام کو لوگ پسند کرینگے اسلئے ان اوصاف کو فقہاء نے بیان کیا ہے۔

پھر یاد رکھیئے! کہ امامت کی ان وجوہاتِ ترجیح میں سے بعض وجوہات کو احادیث میں بیان کیا گیا ہے اور بعض وجوہاتِ ترجیح احادیث کی علت میں غور کرنے سے سمجھ[1] میں آتی ہیں لہٰذا دوسری وجوہات ترجیح میں بھی کوئی اشکال نہ ہونا چاہئیے کیونکہ یہ وجوہاتِ ترجیح جن الفاظ سے مستنبط ہیں وہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

استثناء صرف آخری جملے سے ہے یا دونوں جملوں سے: (الا باذنہ) علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جب قید اور ظرف وغیرہ کئی متعدد جملوں کے بعد مذکور ہو تو کیا یہ شرط اور ظرف ان جملوں میں سے ہر جملہ کی یہ قید بنیں گی یا صرف آخری جملہ کی قید بنے گی دونوں مذہبوں کو علماء کی الگ الگ[2] جماعت نے لیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ قید اور ظرف تمام جملوں کیلئے معتبر نہیں ہوتی (بلکہ صرف آخری جملہ کی قید بنتی ہیں)۔

امام ابوحنیفہؒ نے حدیثِ باب میں اپنا مذہب چھوڑ دیا: لیکن حدیث باب میں حنفیہ کا مذہب (اپنے اس قاعدے کے خلاف) ہے کہ الا باذنہ کا استثناء تمام جملوں سے ہے (لہٰذا اگر گھر والا مہمان کو اجازت دے دے تو اس آنے والے

---

[1] جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر سب لوگ عمر میں برابر ہوں تو وہ شخص امامت کا حقدار ہوگا جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں پھر وہ شخص زیادہ حقدار ہے جو سب سے خوبصورت ہو یعنی زیادہ تہجد گزار ہو پھر وہ شخص زیادہ حقدار ہوگا جو زیادہ سخاوت والا ہو (اسمح الرجل فیاض اور سخی ہونا۔ مصباح اللغات: ص ۳۹۴) پھر وہ شخص ہے جس کا نسب سب سے اعلیٰ ہو پھر جس کی آواز سب سے خوبصورت ہو پھر جس کی بیوی سب سے خوبصورت ہو پھر جو سب سے زیادہ مال والا ہو۔ پھر جو سب سے زیادہ وجاہت والا ہو۔ (الی آخر ما قالوا)

[2] نوالانوار میں ہے کہ جب بعض جملوں کا بعض پر عطف ہو۔ ان کئی جملوں کے بعد جب استثناء واقع ہو تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ تمام جملوں سے استثناء واقع ہوگا اور حنفیہ کے نزدیک یہ استثناء صرف آخری جملہ سے واقع ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسے شرط پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح اگر شرط واقع ہو تو وہ تمام جملوں کیلئے شرط ہوتی ہے تو استثناء بھی تمام جملوں سے واقع ہوگا۔ لیکن حنفیہ کہتے ہیں کہ شرط تو تمام جملوں کیلئے واقع ہوتی ہے لیکن استثناء صرف آخری جملہ سے واقع ہوگا (ان میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں)۔

مہمان کیلئے امامت کرنا بھی جائز ہے اوراس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی جائز ہے)۔اس مذہب پر دوسرا قرینہ موجود ہے وہ یہ ہے کہ مہمان کوامامت کرانے کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ امامت صاحب البیت کا حق ہے جب وہ اجازت دے دے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صلوا خلف کل بر وفاجر سے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔

باب ماجاء اذا ام احد کم الناس فلیخفف

باب ہے اگرتم میں سے کوئی شخص لوگوں کی امامت کرے تو چاہیئے کہ ہلکی نماز پڑھائے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا المغیرة بن عبد الرحمن عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرة ان النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قال: اذا اَمَّ احدُکم الناسَ فَلْیُخَفِّفْ ، فاِنَّ فیھمُ الصغیرَ والکبیرَ والضعیفَ والمریضَ، فاِذا صلّی وحدَہ فَلْیُصَلِّ کیفَ شاء۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن عَدِی بن حاتم، وانسٍ، وجابر بن سمرة، ومالك بن عبد اللّٰه، وابی واقدٍ، وعثمان بن ابی العاصِ، وابی مسعودٍ، وجابر بن عبد الله، وابن عباسٍ۔

قال ابو عیسی: وحدیث ابی ھریرة حدیث حسن صحیحٌ۔

---

[۱] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے میرے نزدیک بظاہر یہاں سبقتِ قلمی واقع ہوئی ہے یا لکھنے والے سے کچھ رہ گیا ہے۔حضرت گنگوہیؒ رحمہ اللہ علیہ کے کلام کی وضاحت اس طرح سمجھ میں آرہی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ استثناء کا تمام جملوں میں اعتبار نہیں کیا جاتا (بلکہ صرف آخری جملے کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے)۔کمابسط فی الاصول لیکن اس اصول کے باوجود حدیث باب میں الا باذنہ کا استثناء تمام جملوں سے ہے اس پر قرائن موجود ہیں جیسا کہ دوسری حدیث اس پر دلالت کرتی ہے مثلاً مالک بن حویرثؓ کی مرفوعا حدیث ہے کہ من زار قوما فلا یومھم الحدیث اسی طرح ابن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ سنت یہ ہے کہ صرف صاحب البیت امامت کرائے (اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کو امامت کرانا نہیں چاہیئے اور یہ خلافِ سنت ہے لہٰذا اگر میز بان اجازت دیدے تو جائز ہے)اس روایت کا ایک متابع بھی حافظ نے التلخیص الحبیر میں نقل کیا ہے لیکن اگر مہمان نے صاحب البیت (مالک مکان) کی اجازت کے بغیر نماز پڑھادی تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح ہے کیونکہ مہمان کو امامت کی ممانعت کی علت یہی تھی کہ امامت مالک مکان کا حق ہے تو زیادہ سے زیادہ بغیر اجازت نماز پڑھا کر مہمان نے اس کا حق غصب کرلیا ہے (عین نماز میں کوئی خرابی نہیں ہے لہٰذا اس کے پیچھے نماز صحیح ہے) کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہر نیک اور گناہ گار کے پیچھے نماز پڑھو۔فتامل

وھو قولُ اکثراھل العلم: اختاروا ان لایُطیل الامامُ الصلاۃَ، مخافۃَ المشقّۃِ علی الضعیف والکبیر والمریض،۔قال ابو عیسی: وابو الزناد اسمہ عبدُ اللّٰہ بن ذَکْوَانَ۔

والاعرجُ ھو عبد الرحمٰن بن ھُرْمُزَ المدینیُّ و یُکْنَی ابا داود۔

☆ حَدَّثَنَا قتیبۃ حَدَّثَنَا ابو عوانۃ عن قتادۃ عن انس بن مالك قال: کان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم مِنْ اَخَفِّ الناسِ صلاۃً فی تَمَامٍ۔

قال ابو عیسی: و ھذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔ واسم ابی عوانۃَ وَضَّاحٌ۔قال ابو عیسی:سالتُ قتیبۃ قلتُ:ابو عوانۃ ماسمہ؟ قال: وضَّاحٌ۔قلت:ابنُ مَنْ؟قال:لاادری، کان عبداً لامراۃٍ بالبصرۃ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کوامامت کرائے تو چاہئیے کہ قراءت میں تخفیف کرے اسلئے کہ ان (مقتدیوں) میں کم عمر بچے اورضعیف اور بیمارلوگ بھی ہیں۔ پھر جب کوئی اپنی تنہا نماز پڑھے تو جیسی چاہے (طویل قراءت وغیرہ) پڑھے۔

اور باب میں عدی بن حاتم، انس، جابر بن سمرہ، مالک بن عبداللہ، ابوواقد، عثمان بن ابی العاص، ابومسعود، جابر بن عبداللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ اکثر اہل علم حضرات کا قول ہے انہوں نے پسند کیا ہے کہ امام نماز کوطویل نہ کرے، بوڑھوں، سن رسیدہ اور بیماروں پر مشقت کے خوف سے۔اور ابوزناد کا نام عبداللہ بن ذکوان ہے اور اعرج عبدالرحمٰن بن ہرمز المدینی کی کنیت ابوداوٗد ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ خفیف اور مکمل نماز پڑھانے والے تھے۔

یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

ہلکی نماز پڑھانے کا مطلب: (اِذَا اَمَّ اَحَدُکُمُ النَّاسَ فَلْیُخَفِّفْ) اس تخفیف کا مطلب یہ نہیں کہ فجر اور ظہر میں

طوالِ مفصل سنت، قراءت بھی نہ کرے (کیونکہ طوالِ مفصل پڑھنا تخفیف کے منافی نہیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ) چونکہ طوالِ مفصل کی سورتیں مختلف قسم کی چھوٹی بڑی ہوا کرتی ہیں لہٰذا طوالِ مفصل کی چھوٹی سورتیں پڑھے۔ (مثلاً سورۃ التکویر، سورۃ الانفطار اور اس جیسی سورتیں نمازِ فجر میں پڑھے۔ از مترجم)

اس جملہ کی تشریح: (مِنْ اَخَفِّ النَّاسِ فِی تَمَامٍ) اس کا معنی مشہور تو یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی (ذاتِ گرامی لوگوں میں محبوب تھی اور آپ کی قراءت پر صحابہ رضی اللہ عنہم عاشق تھے لہٰذا وہ) نماز باوجود طویل ہونے کے لمبی معلوم نہ ہوتی تھی لیکن اس معنی پر اشکال یہ ہے کہ دوسری حدیث میں تصریح یہ ہے کہ مَخَافَةَ اَنْ تُفْتَتَنَ اُمُّهٗ اس افتتان کی علت کی وجہ سے میں نماز مختصر کر دیتا ہوں تو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز لمبی محسوس ہی نہ ہوتی تھی تو اس بچہ کی ماں کے مشقت میں پڑنے کا کیا مطلب؟ لہٰذا صحیح مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسنون سورتوں میں چھوٹی اور آسان سورتیں پڑھا کرتے تھے اس لئے نماز لمبی معلوم نہ ہوتی تھی۔

باب ماجاء فی تَحْرِيمِ الصلاةِ وتحليها

باب ہے نماز کی تحریم وتحلیل کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا سفيانُ بن وكيعٍ حَدَّثَنَا محمد بن الفُضَيْلِ عن ابی سفيانَ طَرِيفٍ السَّعْدِيِّ عن ابی نَضْرَةَ عن ابی سعيد قال: قال رسُول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: مِفْتَاحُ الصلاة الطُّهُورُ، وتحريمها التكبيرُ، وتحليلها التسليمُ، ولاصلاة لمن لم يقرأ بالحمدِ وسُورةٍ فی فريضةٍ او غيرِ ها۔

قال ابو عيسى: هذا حديث حسن۔ وفی الباب عن علی وعائشة۔قال: وحديث علی بنِ ابی طالبٍ فی هذا اجودُ اسناداً واصحُّ من حديث ابی سعيد، وقد كتبناهُ فی اول كتابِ الوضوء۔ والعملُ عليه عند اهل العلم من اصحاب النبی صلى اللّٰه عليه وسلم ومَن بعدَهم۔

وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ، وابنُ المباركِ، والشافعيُّ، واحمدُ، واسحٰقُ: اِنَّ تحريمَ الصلاةِ التكبيرُ، ولا يكونُ الرجلُ داخلاً فی الصلاة الا بالتكبير۔ قال ابو عيسى: وسمعتُ ابا بكرٍ محمدَ بنَ اَبَانَ مُسْتَمْلِيَ وكيع يقول: سمعتُ عبد الرحمن بن مهديٍّ يقول: لو افتتح الرجل الصلاةَ بتسْعِين اسماً من اسماء اللّٰه ولم يُكَبِّرْلم يُجْزِهِ، واِن اَحْدَثَ قبل ان يسلِّمَ اَمَرْتُهُ ان يتوضاثم يرجع الی مكانه

فیسلِّمَ، اِنَّمَا الامرُ علی وَجْهِهِ قال: وابو نَضْرَةَ اسمه المُنْذِرُ بن مالك بن قُطَعَةَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طہارت نماز کی کنجی ہے اور اس کی تحریم تکبیر ہے (یعنی نماز میں بات چیت، کھانہ پینا، وغیرہ مفسدات صلاۃ پر لفظ اللہ اکبر کہنے سے پابندی لگ جاتی ہے) اوراس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے (یعنی سلام سے وہ سب چیزیں جواللہ اکبر کہتے ہی نماز میں منع تھیں وہ حلال ہو جاتی ہیں)۔ اوراس شخص کی نماز ہی نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ اور (اس کے علاوہ) کوئی اور سورت فرض یا غیر فرض نماز میں نہ پڑھے۔

باب میں حضرت علی اور عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث باعتبار سند کے زیادہ عمدہ ہے اور ابوسعید کی حدیث سے زیادہ اصح ہے۔

اور ہم اس حدیثِ علی رضی اللہ عنہ کو کتاب الوضوء کی ابتداء میں لکھ چکے ہیں اور صحابہ اہل علم اوران کے بعد کے اہل علم حضرات کا اسی پر عمل ہے اور یہی سفیان ثوری، ابن مبارک اور امام شافعی، احمد واسحٰق رحمہم اللہ کا قول ہے کہ نماز کی تحریمہ تکبیر ہے اور آدمی نماز میں تکبیر ہی سے داخل ہوسکتا ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں میں نے ابی بکر محمد بن ابان سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی شخص اللہ کے نوے نام سے بھی نماز شروع کرے اور اللہ اکبر نہ کہے تو اس کو کافی نہیں (یعنی نماز میں داخل نہیں ہوگا اور اگر سلام پھیرنے سے پہلے حدث لاحق کر دے تو میں اس کو حکم دوں گا کہ وہ وضو کرے پھر اپنی جگہ لوٹے اور سلام پھیرے (یعنی بنا کرے اور ازسرِ نو نہ پڑھے) سو حدیث باب میں تحلیلها التسلیم کا حکم اپنے ظاہر پر ہے اور نماز کی صحت سلام پھیرنے پر ہی موقوف ہے اور ابونضرہ کا نام منذر بن مالک بن قطعہ ہے۔

﴿تشریح﴾

مفتاح الصلوٰۃ الطهور: ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نماز میں داخل ہونا اس کے دروازے کو کھولے بغیر ممکن نہیں تو طہارت کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوسکتی اور دوسرا جملہ وتحریمها التکبیر ہے۔

حنفیہ کا مذہب: یہ ہیکہ نماز میں تکبیر کے ذریعہ ہی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان وذکر اسم ربه فصلی

دلالت کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر نام [1] سے نماز شروع کرنا صحیح ہے لہٰذا اس قطعی الثبوت آیت اور ظنی الثبوت حدیث میں سے ہر ایک کو اس کے محل پر رکھنا چاہئیے ۔لہٰذا ہم نے خاص اللہ اکبر کے لفظ کو واجب قرار دیا اور مطلق اللہ کے ذکر کو فرض قرار دیا لہٰذا اگر کسی شخص نے لفظِ اللہ اکبر کے علاوہ کسی اور ذکر سے نماز شروع کی تو اس کی نماز تو صحیح ہو جائیگی لیکن اس پر واجب کو چھوڑنے کا گناہ ہوگا اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان و تحلیلھا التسلیم میں بھی کہا جائیگا کہ لفظ السلام علیکم سے نماز سے نکلنا واجب ہے اور نفسِ خروج یا خروج بصنعہ فرض ہے لہٰذا اگر کسی شخص نے تشہد پڑھنے کے بعد جان کر حدث لاحق کردیا تو اس کی فرض نماز تو ادا ہو گئی لیکن اس متروکہ واجب کو ادا کرنے کیلئے اس کو نماز کے اعادہ کی ضرورت ہے اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث الاعرابی نے فرمایا تھا اذا قلت ھذا او فعلت فقد تمت صلوٰتك تو اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قدرِ تشہد بیٹھ چکو یا اتنا پڑھ چکو تو تمہاری نماز مکمل ہو گئی تو اس سے معلوم ہوا کہ فرائض پورے ہو گئے اب سلام واجب ہے نہ کہ فرض کیونکہ اگر سلام فرض ہوتا تو اس کے بغیر نماز کے مکمل ہونے کا کیا مطلب؟ (معلوم ہوا کہ اس کے بغیر فرائض مکمل ہو گئے اور سلام واجب ہے)۔

لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بالفاتحة وسورة معھا: اللہ تعالیٰ کا فرمان فاقروا ما تیسر من القرآن مطلق ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی بھی سورت کی تلاوت کرنے سے نماز صحیح ہو جانی چاہئیے اور حدیث باب دلالت کررہی ہے کہ خاص سورت فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے (تو یہ حدیث آیت مطلقہ کیلئے مخصص بن رہی ہے) اس لئے ہم نے سورہ فاتحہ کے وجوب کا قول کیا (نہ کہ فرضیت کا) تاکہ آیت کا مقتضیٰ باطل نہ ہو لہٰذا حنفیہ کہتے ہیں کہ نمازی پر سورہ فاتحہ کی قراءت واجب

---

[1] اس اختلاف کی وضاحت اس طرح ہے کہ جمہور ائمہ اربعہ کے ہاں تکبیر تحریمہ فرض ہے۔

تکبیرِ تحریمہ رکن ہے یا شرط؟: پھر ان میں یہ اختلاف ہے کہ یہ رکن ہے جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے یا یہ شرط ہے جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں اور شافعیہ سے بھی ایک روایت ہے اور بعض سلف نے اسے سنت کہا ہے۔

تکبیرِ تحریمہ کیلئے خاص لفظ اللہ اکبر ضروری ہے یا نہیں؟: دوسرا اختلاف یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کن الفاظ سے منعقد ہوگی تو ابن قدامہ فرماتے ہیں ۔امام احمد و امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک نماز خاص لفظ اللہ ہی سے شروع ہوگی ۔امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک لفظ اللہ اکبر اور اللہ الاکبر کے ساتھ نماز شروع کرنا صحیح ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کے ہر اس نام سے نماز شروع کرسکتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم پر دلالت کرتا ہو۔ کذا فی الاوجز

ہے جیسا کہ اس پر ضمِ سورت واجب ہے۔[۱] ہاں مطلق (کہیں سے بھی) تلاوت کرنے سے قراءت کا فریضہ تو ادا ہو جاتا ہے (لیکن خاص سورت فاتحہ کا پڑھنا واجب اور ضروری ہے) نیز حدیث باب میں سورت فاتحہ اور سورت کو ایک ہی درجہ میں رکھا گیا ہے پھر مخالفین نے فاتحہ اور سورت کے حکم میں فرق کس طرح کیا (کہ فاتحہ کو فرض قرار دیا اور سورت کو واجب؟) بلکہ دونوں کا ایک ہی حکم ہونا چاہیئے اور حنفیہ کے مذہب میں اس پر عمل کیا گیا ہے کہ اگر اس نے فاتحہ نہ پڑھی یا سورت نہ پڑھی تو چونکہ دونوں ہی واجب ہیں تو اس کا فریضہ تو ادا ہو گیا لیکن ترکِ واجب کی وجہ سے نماز کا اعادہ ضروری ہے

---

[۱] **ضمِ سورت واجب ہے یا سنت؟ جانبین کے دلائل:** حنفیہ کے مذہب میں ضمِ سورت واجب ہے یہی امام احمد سے مروی ہے اور یہی ابن کنانہ مالکی کا بھی یہی مذہب ہے۔ قالہ العینی ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ ضمِ سورت سنت ہے اس کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورت فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت فرماتے تھے اسی طرح دیگر احادیث کا مضمون بھی ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدِ شہرت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہری نماز میں سورت فاتحہ کے ساتھ سورت بھی پڑھا کرتے تھے۔ نیز معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ والشمس وضحٰھا اور سبح اسم ربك الاعلٰی جیسی سورتیں عشاء میں پڑھا کرو۔ انتہی

حنفیہ کے دلائل کی تفصیل: عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمِ سورت کا واجب ہونا بہت سی احادیث سے ثابت ہے جن میں: ۱۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب و سورۃ معھا اس روایت کو ابن عدی نے الکامل میں نقل کیا ہے۔ اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نقرأ الفاتحة و ماتیسر اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے۔ امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان نقرأ الفاتحة وما تیسر۔ احمد و ابویعلی نے اس روایت کو اپنی مسند میں ذکر کیا ہے اور نیموی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عدی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے لا تجزی المکتوبة الا بفاتحة الکتاب وثلث آیات فصاعدا۔ اور ابونعیم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کیئے ہیں لا تجزی صلوٰۃ لا یقرا فیھا بفاتحة الکتاب وشیٔ معھا۔ اسی طرح صحابہ کی ایک جماعت سے صحیح سند سے مروی ہے کہ ضم سورت واجب ہے۔

قلت: ابوسعید رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو نیموی نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے کہ امرنا ان نقرأ بفاتحة الکتاب وما تیسر، پھر آگے فرماتے ہیں کہ ابوداؤد، احمد، ابویعلی، ابن حبان نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کی سند صحت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے نیز حاشیہ میں ابن سید الناس سے نقل کیا گیا ہے کہ اس کی سند صحت کے درجے پر ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور حافظ رحمہ اللہ کی تلخیص سے نقل کیا گیا ہے کہ اسنادہ صحیح اور فتح الباری میں اس حدیث کو حافظ نے سندِ قوی کے ساتھ نقل کیا ہے اور درایہ میں لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

لہٰذا حدیث باب سے یہ استدلال کرنا کہ سورت فاتحہ کے بغیر نماز باطل ہوتی ہے یہ استدلال صحیح نہیں بہر حال اس مسئلہ کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں کیونکہ کتب فقہ ایسے مسائل سے بھری پڑی ہیں۔

اس جملہ کی تشریح: (انما الامر علی وجھہ) اس جملہ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ امر سے امر اصطلاحی مراد ہوتو انما الامر علی وجھہ کا مطلب امر کا معنیٰ مشہور وجوب ہے۔ تو اب مطلب یہ ہوا کہ تحلیلھا التسلیم و تحریمھا التکبیر میں اگر چہ صراحۃً لفظِ امر موجود نہیں لیکن معنیً اس سے امر سمجھ میں آرہا ہے کیونکہ یہ خبر کے صیغے ہیں لیکن ان کے معنی (ایجاب) کے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان کتب علیکم الصیام میں ہے کہ (یہ جملہ خبر یہ ہے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ تم پر روزے فرض کیئے گئے ہیں)۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ انما الامر میں الامر سے مراد حکم ہے اب مطلب یہ ہوا کہ حدیث باب کے حکم کو اس کے ظاہر پر رکھنا چاہیئے اس میں تاویل[1] وغیرہ نہ کرنی چاہیئے۔

اور یہ بھی احتمال[2] ہے کہ انما الامر علی وجھہ مصنف کا مقولہ ہو (نہ کہ عبدالرحمٰن ابن ابی مہدی کا) مصنف رحمہ اللہ علیہ عبدالرحمٰن بن مہدی کے کلام کی توثیق فرمارہے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن ابی مہدی یہ کہتے ہیں کہ میں اسے اعادہ کا حکم دوں گا یہ قول بالکل صحیح ہے...

....

تو شاید مصنف اس قول سے حنفیہ پر تعریض کررہے ہیں جن کے نزدیک باب کی حدیث کے برعکس نہ تو سلام فرض ہے، نہ تکبیر تحریمہ اور نہ ہی سورتِ فاتحہ (حالانکہ باب کے اوامر سے ان کی فرضیت معلوم ہورہی ہے) احناف کی طرف سے اس اعتراض کے جواب دینے کی ضرورت نہیں[3] کیونکہ وہ اس میدان کے فاتح ہیں اور دلائل کے میدان میں ان کے گھوڑے سب سے سبقت لے جاچکے ہیں۔ واللہ اعلم

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح یہ لفظ مساغاً منصوب ہے لیکن بظاہر یہ لفظ مساغٌ مرفوع ہونا چاہیئے۔

[2] ابوالطیب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: انما الامر علی وجھہ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث تحلیلھا التسلیم میں تاویل نہ کی جائے بلکہ اس کے ظاہر کے اعتبار سے سلام کو فرض قرار دیا جائے کہ نماز میں حرام شدہ اشیاء صرف لفظ السلام سے ہی جائز ہوسکتی ہیں۔ اور وہ شئے کہ جس پر نماز سے نکلنا موقوف ہو وہ فرض کہلاتی ہے۔ جیسا کہ جس شئے پر نماز میں داخل ہونا موقوف ہو وہ بھی فرض ہے۔ انتہیٰ

[3] کہ حنفیہ نے بھی حدیث کے حکم کو اس کے ظاہر پر رکھا ہے البتہ انہوں نے نصِ قرآنی سے جو حکم ثابت ہوا اس میں اور جو حکم خبر واحد سے ثابت ہوا ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ وللہ درھم ما ادق نظرھم

باب ماجاء فی نَشْر الاصابع عندَ التکبیر

باب ہے تکبیرِ تحریمہ کے وقت انگلیاں کھلی رکھنے کے متعلق

☆حدثنا قتیبة وَابو سعیدِ الاَشجُّ قالا: حَدَّثَنَا یحیی بنُ الیمَان عن ابن ابی ذِئْبٍ عن سعید بن سِمْعَانَ عن ابی ھریرۃ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کَبَّرَ للصلاۃِ نَشَرَ اصابعہٗ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ ابی ھریرۃ حسن۔

و قَدْ رَوَی غیرُ واحد ھذا الحدیثَ عن ابن ابی ذئبٍ عن سعید بنِ سِمْعَانَ عن ابی ھریرۃ: ان النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان اذا دخل فی الصلاۃ رفع یدیہ مَدًّا۔۔وھذا اصحُّ من روایۃ یحیی بن الیمانِ ، واخطأ یحیی بنُ الیمان فی ھذا الحدیث۔

قال : و حَدَّثَنَا عبدُ اللّٰہ بنُ عبد الرحمٰن اخبرنا عبید اللّٰہِ بنُ عبد المجیدِ الحَنَفِیُّ حَدَّثَنَا ابنُ ابی ذئبٍ عن سعید بن سِمْعانَ قال: سمعتُ ابا ھریرۃ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا قام الی الصلاۃ رفع یدیہ مَدًّا۔

قال ابو عیسی : قال عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن وھذا اصحُّ من حدیث یحیی بن الیمان ، وحدیثُ یحیی بن الیمان خَطَأٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کیلئے تکبیر کہتے تو انگلیاں کھلی رکھتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو متعدد حضرات ابن ابی زئب عن سعید بن سمعان عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کر کے اوپر لے جاتے اور یہ روایت یحیٰی بن یمان کی روایت سے زیادہ اصح ہے اور ابن یمان نے اس حدیث میں غلطی کی ہے۔

سعید بن سمعان فرماتے ہیں کہ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو انگلیوں کو سیدھا کر کے ہاتھوں کو اٹھاتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ اس حدیث کو یحییٰ بن یمان کی حدیث سے زیادہ صحیح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یحییٰ بن یمان کی حدیث میں خطا ہے۔

«تشریح»

لفظِ نشر کے دو معنی: جاننا چاہیئے کہ لفظِ نشر کے دو معنی ہیں: نشر جو ضم اور جمع کے مقابلے میں[1] ہو تو ضم اور جمع کا مطلب دو انگلیوں کو ملانا اور نشر کا مطلب ان دو انگلیوں میں فاصلہ کرنا تو اس نشر کا تحقق کم از کم دو انگلیوں میں ہی ہوسکتا ہے اس سے کم میں نہیں۔

---

[1] خلاصہ یہ ہے کہ نشر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔عقد (مٹھی بند) کی ضد یعنی مٹھی بند نہ کیجائے۔۲۔ضم (دو انگلیوں کے ملانے) کی ضد یعنی دو انگلیوں کو نہ ملایا جائے بلکہ انگلیوں میں خوب کشادگی ہو تو حدیث میں نشر کا پہلا معنی مراد ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی مٹھی بند نہ رکھتے تھے بلکہ مٹھی کھلی رکھتے تھے تو نشر کے اس معنی کے اعتبار سے حدیث باب فقہاء کے اس قول کے منافی نہیں کہ رکوع اور سجدہ کی حالت کے علاوہ دوسری حالتوں میں ہاتھوں کی انگلیاں علی حالہٖ رہنی چاہیئے نہ انگلیاں ملا کر رکھے نہ ہی پھیلا کر (کیونکہ حدیث سے بھی تو یہی سمجھ میں آرہا ہے) اور رکوع میں انگلیوں کو خوب کشادہ کر کے رکھے اور سجدہ میں انگلیاں خوب ملا کر رکھے۔

حدیث کو ضعیف کہنے کی ضرورت نہیں: جب یہ بات واضح ہوگئی تو اس حدیث کو ضعیف کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس معنی کے اعتبار سے نَشَرَ والی حدیث اور مَدَّ اَصَابِعَہٗ والی حدیث میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اس صورت میں نشر الاصابع اور مد الاصابع کا ایک ہی معنی ہے۔ پھر اس کلام سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو حنفیہ کے مذہب میں علی حالہٖ چھوڑ دیا جائیگا نہ اس کی انگلیوں کو ملایا جائے گا اور نہ ہی انگلیاں کشادہ کی جائینگی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ہاتھوں کے اٹھاتے وقت ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا رہنا چاہیئے اور ایک انگلی کو دوسری انگلی سے ملا کر رکھے کیونکہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل فی الصلاۃ رفع یدیہ مدا۔ امام شافعی فرماتے ہیں: تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو کشادہ رکھنا چاہیئے ان کی دلیل ترمذی کی روایت نشر اصابعہ والی ہے اور ہماری دلیل ہم بیان کر چکے ہیں۔ شوافع کی دلیل (نشر اصابعہ والی حدیث) کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے غلط قرار دیا ہے لیکن اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب مد اصابعہ والی روایت والا ہی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل عرب انگلیوں کو ملا کر کہتے ہیں۔ ھذا الضم اور انگلیوں کو سیدھا کر کے کہتے ہیں ھذا النشر اور انگلیوں کو کشادہ کر کے ان میں فاصلہ دیکر کہتے ہیں ھذا التفریق تو نشر انگلیوں کو کشادہ کرنے کا تقاضا نہیں کرتا کہ جس طرح نشر الثوب کا مطلب ہوتا ہے کہ کپڑے کو پھیلا دیا جائے تو نشر الاصابع کا معنی پھیلانا نہیں بلکہ مٹھی کا بند نہ ہونا مراد ہے۔

۲۔نشر وہ ہوتا ہے جوضم اورعقد کے مقابلہ میں ہوتو ضم وعقد کا مطلب یہ ہے کہ انگلیوں سے مٹھی بند کرنا لہٰذا اس حدیث میں نشر کا پہلا معنی مرادنہیں بلکہ نشر کا دوسرا معنی مراد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو بند نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کی مٹھی کھلی ہوتی تھی۔لہٰذا فقہاء نے جو یہ مسئلہ لکھا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ہاتھوں کی انگلیاں ملی ہوئی ہونی چاہئیں تا کہ تمام انگلیوں کے سرے قبلہ رخ ہو جائیں اور رکوع کی حالت میں انگلیاں کشادہ ہونی چاہئیں تا کہ گھٹنے کوخوب اچھی طرح پکڑسکیں باقی تمام ارکان میں انگلیوں کواپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔الخ تو یہ حدیث باب اس مسئلہ کے مخالف نہیں کیونکہ اس حدیث میں نشر کا مطلب انگلیوں کوکشادہ کرنانہیں ہے بلکہ اس میں نَشَرَ اَصَابِعَہ کا مطلب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی مٹھی بند نہ ہوتی تھی (انگلیاں کھلی ہوئی ہوتی تھیں) تو یہ نشر ضم اورعقد کے مقابلے میں ہے۔

اخطأ ابن الیمان: امام ترمذی رحمہ اللہ نے چونکہ نشر اصابعہ اور رفع یدیہ مدا والی حدیثوں میں تعارض سمجھا اور یحییٰ بن الیمان والی روایت کوروایت بالمعنی پرمحمول نہ کیا لہٰذا ابن الیمان کی یہ روایت جس میں نشر اصابعہ ہے اس کو غلط قرار دیا[1] (حالانکہ ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ نشر کا معنی انگلیوں کوکھولنا ہے نہ کہ کشادہ کرنا)۔

(رَفَعَ یَدَیْهِ مَدًّا) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہوں اس طرح نہ تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پہلوؤں سے جدا تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپ لمبا کئے ہوئے تھے (مٹھی بند نہ تھی)۔

باب ماجاء فی فضل التکبیرۃ الاولی

باب ہے تکبیرِ اولیٰ کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا عُقْبَةُ بنُ مُکْرَمٍ ونَصْرُبنُ علی الجَهْضَمِیُّ قالا: حَدَّثَنَا ابو قتیبة سَلْمُ بنُ قُتَیْبَةَ عن طُعْمَةَ بنِ عمرو عن حَبِیبِ بنِ ابی ثابتٍ عن انس بنِ مالكٍ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: مَن صلّٰی لله اربعینَ یوماً فی جماعةٍ یُدْرِكُ التکبیرة الاولی کُتِبَتْ له بَرَاءَتَانِ: براءةٌ من النَّارِ، وبراءةٌ من النِّفَاقِ

---

[1] قلت: یہ روایت بالمعنی بھی ہوسکتی ہے کیونکہ امام احمد رحمہ اللہ کا ابھی کلام گزرا کہ نشر کی تفسیر انہوں نے مد الاصابع سے کی ہے لیکن محدثین نے نشر اصابعہ اور مد اصابعہ کوالگ الگ سمجھا تھا اسلئے انہوں نے نشر والی روایت کوضعیف کہہ دیا۔میرے نزدیک دونوں حدیثیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں جس کی تفصیل میری شذرات علی الترمذی میں ہے۔

قال ابو عیسی: وقد رُوِیَ هذا الحدیثُ عن انسٍ موقوفاً، ولا اعلمُ احداً رَفَعَهُ الا مارَوَی سَلْمُ بن قتیبة عن طُعْمَةَ بن عمرٍو عن حبیب بن ابی ثابت عن انس۔ وانما یُرْوَی هذا الحدیثُ عن حبیب بن ابی حبیب البَجَلِی عن انس بن مالك قوله۔

حَدَّثَنَا بذٰلك هناد حَدَّثَنَا وکیع عن خالد بن طَهْمَانَ عن حبیب بن ابی حبیب البَجَلِیِّ عن انس نَحْوَه ولم یَرْفَعْهُ۔ ورَوَی اسمٰعیلُ بنُ عَیَّاشٍ هذا الحدیث عن عُمَارَةَ بن غَزِیَّةَ عن انس بن مالك عن عمر بن الخطاب عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم نحوَ هذا۔

وهذا حدیث غیرُ محفوظٍ، وهو حدیثٌ مرسلٌ، وعُمَارةُ بنُ غَزِیَّةَ لم یُدْرِكْ انسَ بنَ مالكٍ۔

قال محمدُ بن اسمٰعیل: حبیبُ بن ابی حبیب یُکْنَی، ابا الکشُوثی ویقال: اَبو عُمَیْرَة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے چالیس دن تک جماعت سے تکبیرِ اولی کے ساتھ خالص اللہ کیلئے نماز پڑھی تو اس کیلئے دو براءتیں لکھی جاتی ہیں ایک جہنم سے آزادی کی، دوسری نفاق سے براءت کی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً منقول ہے اور میں نہیں جانتا کہ سلم بن قتیبہ کے علاوہ کسی نے مرفوعاً نقل کیا ہو۔ سلم بن قتیبہ طعمہ بن عمرو سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں لیکن اسے حبیب بن حبیب بجلی سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے موقوفاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ ھناد اس حدیث کو وکیع سے وہ خالد بن طہمان سے اور وہ حبیب بن حبیب بجلی سے اور وہ انس سے انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں اور اس کو مرفوعاً نقل نہیں کرتے اور اسماعیل بن عیاش یہ حدیث عمارہ بن غزیہ سے وہ انس بن مالک سے وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے مثل نقل کرتے ہیں اور یہ حدیث عمر غیر محفوظ اور مرسل ہے (اسلئے کہ) عمارہ بن غزیہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔

﴿تشریح﴾

تکبیر اولیٰ کی فضیلت کس وقت حاصل تک ہوسکتی ہے: راجح قول یہ ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ کہیگا تو

اسے یہ فضیلت حاصل ہو جائیگی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب تک قرأت شروع نہ ہو اس سے پہلے تک اس کا وقت ہے اور بعض نے قراءت ختم ہونے تک اس کا وقت بتلایا ہے۔ بعض علماء نے جو یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جس کو پہلی رکعت کا رکوع مل گیا اسے تکبیر اولیٰ بھی مل گئی (تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو تکبیر اولیٰ کی فضیلت حاصل ہوگئی) بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکبیر اولیٰ حکما اسے حاصل ہوگئی تو ادراک کا معنی ہے لحوق اور پالینا لیکن اس معنی کے اعتبار سے یہ خرابی لازم آئیگی کہ اگر امام نے سلام پھیرا اور اس پر سجدہ سہو لازم تھا تو اس حالت میں جو شخص امام کی اقتداء کریگا اسے بھی مدرك للتكبيرة الاولى کہیں گے اسلئے کہ یہاں بھی ادراک بمعنی لحوق پایا جا رہا ہے اور کیونکہ تکبیرہ اولیٰ کا حکم ابھی باقی ہے حالانکہ یہ قول بالکل غلط اور فاسد ہے۔ (از مترجم: علامہ ابن عابدین شامیؒ نے مطلب فی وقت ادراک فضیلۃ الافتتاح کے تحت لکھا ہے کہ ثمرہ اختلاف اس وقت ظاہر ہوگا کہ تکبیرہ اولیٰ کی فضیلت کس وقت تک حاصل ہوگی تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس مقتدی نے امام کی تکبیرہ اولیٰ سے متصل تکبیر تحریمہ کہی اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی اور صاحبین کے نزدیک اگر امام کی ثناء کے دوران تکبیر تحریمہ کہے تو یہ فضیلت حاصل ہوگی۔ ایک قول یہ ہے کہ جب تک امام نے تین آیات نہ پڑھی ہوں...... ایک قول میں جس مقتدی کو سورۃ فاتحہ مل گئی اسے تکبیرہ اولیٰ مل گئی، وھوالمختار خلاصہ...... اور ایک قول جس مقتدی کو پہلی رکعت مل گئی اسے تکبیرہ اولیٰ مل گئی اس کو علامہ شامیؒ نے وھذااوسع وھو الصحیح نقل کیا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس آخری قول ہی کی وضاحت فرمائی ہے۔ فتاویٰ شامیہ: ص ۵۲۶۔ ایچ ایم سعید)

چالیس دن کے عدد میں خاصیت: (کتب له براء تان) چونکہ ظاہر، باطن پر اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا اگر ظاہر جسم کی اصلاح کی جائے تو باطن بھی اس سے [1] متاثر ہوگا اور ظاہر کی خرابی سے باطن میں بھی خرابی واقع ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے چالیس دن کے عدد میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ چالیس دن نطفہ کے بعد مضغہ پھر ایک چلہ کے بعد علقہ بن جاتا ہے۔ الخ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی چالیس دن کا ذکر ہے اسی طرح بہت سی نظیریں ہیں تو چالیس دن تک تکبیرہ اولیٰ کی فضیلت مسلسل حاصل کرنے اور اس پر مداومت، لامحالہ باطن کی اصلاح میں انتہائی موثر ہے اور یہ فعل اس کے آگ میں داخلہ سے خلاصی پر علامت ہوگا...... یا مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص ہمیشہ آگ میں نہ رہیگا۔

---

[1] اس کا تو کوئی جاہل بھی انکار نہیں کریگا اسی لئے مشائخ فرماتے ہیں کہ انسان کو اپنا ظاہر درست رکھنا چاہئیے کہ اس کے کپڑے صاف پاک ہوں اور ہمیشہ باطہارت ہو اور اچھے اعمال اختیار کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے باطن کی بھی اصلاح فرماوے۔

تو اس سے یہ اصول نکالا جاسکتا ہے کہ چلہ کشی[1] ایک حالت کو بدلنے میں لامحالہ اثر انداز ہوتی ہے۔

چالیس روز تکبیر اولیٰ سے نماز پڑھنے کی فضیلت:

پہلے جملے کہ بعد اس جملہ کے لانے کی وجہ: (براء ۃ من النار) اگر چہ اس پہلے جملہ کا لازمی معنی یہ ہے کہ یہ شخص نفاق سے بھی بری ہوگا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ سے یہ تنبیہ فرمادی کہ جو شخص چالیس دن مداومت کیساتھ تکبیرہ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھیگا تو یہ فعل اس پر دلالت کررہا ہے کہ یہ شخص منافق نہیں ہے کیونکہ منافق سے ایسا فعل صادر نہیں ہوسکتا تو یہ فعل اس کے آگ سے خلاصی کی نشانی ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہنم سے خلاصی ہوگی یا نہیں یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو آخرت میں معلوم ہوگا اور موت کے بعد ہی یہ پتہ چل سکے گا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی علامت بیان فرمادی کہ جس سے دنیا ہی میں یہ پہچانا جاسکتا ہے کہ یہ شخص جہنم سے چھٹکارا حاصل کرلیگا اور اس نے یہ کام منافقت سے نہیں کیا۔

باب مایقول عندَ افتتاحِ الصلاۃ

باب ہے نماز کے شروع میں کونسی دعا پڑھی جائے؟

☆حدثنا محمد بن موسی البَصرِیُّ حَدَّثَنَا جعفرُ بن سُلیمانَ الضُّبَعِیُّ عن عَلِیِّ بنِ عَلِیٍّ الرِّفاعِیِّ عن ابی المتوَکِّلِ عن ابی سعید الخُدرِی قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا قام الی الصلاۃ باللیل کَبَّرَ، ثم یقول: سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ وبِحمدِکَ، وتبارک اسمُکَ، وَتَعَالٰی جَدُّکَ، ولا اِلٰہ غَیرُکِ، ثُمَّ یقول: اللّٰہُ اَکبَرُ کَبِیراً، ثم یقول: اعوذُ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرَّجیم، مِنْ ھَمزِہ وَنَفخِہِ وَنَفثِہِ۔

---

[1] ابوالطیبؒ فرماتے ہیں: چالیس کے عدد میں سالکین طریقت کیلئے ایک پوشیدہ راز اور بھید ہے کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز کا افشاء فرمایا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے چالیس دن فارغ کریگا تو اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہوجائینگے تو گویا اتنے معین زمانہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے کامل ہونے کیلئے معیار بنایا ہے کہ جس طرح چالیس، چالیس دن میں انسان کے نطفہ، علقہ، مضغہ، مختلف حالتوں میں گزار کر اس کے مختلف مراحل طے کیے گئے تھے۔ مصنف نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر موقوف قرار دیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ایسا اثر موقوف جو اپنی عقل وقیاس سے نہیں کہا جاسکتا وہ یہ حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔

قال ابو عیسی: وَفی الباب عن علی، وعائشة، وعبد اللّٰہ بن مسعود، وجابر، وجُبَیْرِ بنِ مُطْعِمٍ، وابن عمر۔ قال ابو عیسی: وحدیث اَبِی سعید اَشْهَرُ حدیثٍ فی هذا البابِ۔ وقد اَخَذَ قومٌ من اهل العلم بهذا الحدیث۔ واما اکثرُ اهل العلم فقالوا بما رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم انه کان یقولُ: سبحانكَ اللّٰهُمَّ وبحمدكَ، وتبارَكَ اسمك، وَتَعَالَی جَدُّكَ، وَلَااِلٰهَ غَیْرُكَ۔ وهکذا رُوِیَ عن عمر بن الخطاب وعبد اللّٰہ بن مسعودٍ۔

والعملُ علی هذاعند اکثر اهل العلم من التابعین وغیرهم وقد تُکُلِّمَ فی اسناد حدیث ابی سعیدٍ، کان یحیی بنُ سعیدٍ یَتکلَّمُ فی علی بن علی الرفاعی، وقال احمدُ: لایصحُّ هذا الحدیث۔

☆حدثنا الحسَنُ بن عَرَفَةَ ویحیی بن موسی قالا: حَدَّثَنَا ابو معاویة عن حارثة بن ابی الرجال عن عَمْرَةَ عن عائشة قالت: کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا افْتَتَحَ الصلاةَ قال: سبحانك اللّٰهُمَّ وبحمدك، وتبارك اسمُكَ، وتعالی جَدُّكَ، ولا اِلٰه غیرُكَ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث لانعرفُ من حدیث عائشة الا من هذا الوجه۔

وحارثةُ قد تُکُلِّمَ فیه مِن قِبَلِ حفظه۔ وابو الرِّجال اسمه محمد بن عبد الرحمٰن المَدِینِیُّ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کی نماز کیلئے کھڑے ہوتے تھے تو تکبیر کہتے پھر پڑھتے سبحانك اللهم وبحمدك......غیرك۔ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہم تیری پاکی، تیری تعریف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تیرا نام بابرکت ہے تیری شان بلندو برتر ہے اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ پھر فرماتے اللہ اکبر کبیرا پھر پڑھتے اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من همزه ونفحه ونفثه۔ یعنی میں پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود کے وسوسے، اوراس کے پھونکنے (تکبر میں مبتلا کرنے) اوراس کے سحر سے اللہ رب العزت کی جو سننے والا جاننے والا ہے۔

اور باب میں حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، عائشہ، جابر، جبیر بن مطعم اورابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوسعید کی حدیث اس باب کی سب سے مشہور حدیث ہے اوراہل علم کی ایک جماعت

نے اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے۔ جبکہ اکثر اہل علم فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا بھی منقول ہے "سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا اله غيرك" اور یہی دعا عمر بن خطاب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی پر اکثر تابعین اور غیر تابعین اہل علم کا عمل ہے اور ابوسعید کی حدیث کی سند میں کلام ہے۔ یحییٰ بن سعید نے علی بن علی پر کلام کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو پڑھتے "سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا اله غيرك"

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ہم صرف اسی طریق سے پہچانتے ہیں اور حارثہ کے حفظ پر کلام ہے اور ابوالرجال کا نام محمد بن عبدالرحمٰن ہے۔

﴿تشریح﴾

یہ دعائیں[1] فرض ونفل دونوں طرح کی نماز کی ابتداء میں مشروع ہیں اسلئے مصنف نے اس باب کو قائم کیا۔

---

[1] **امام مالکؒ کے علاوہ تمام ائمہ ابتدائے نماز میں حمد وثنا کے قائل ہیں:** ابن قدامہ کہتے ہیں: اکثر علماء کے نزدیک نماز کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا نماز کی سنتوں میں سے ہے امام مالکؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے فوراً بعد قراءت شروع کر دینی چاہیے وہ ادعیہ کے مسنون ہونے کے قائل نہیں۔ ان کی دلیل انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العٰلمین سے شروع فرماتے تھے (ترمذی: ص ۵۹) ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو ان اذکار سے شروع فرماتے تھے جو ہم آگے ذکر کر رہے ہیں نیز صحابہ کا اس پر تعامل بھی تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز میں تکبیر تحریمہ کے بعد سبحانك اللهم وبحمدك الخ جہراً پڑھی تاکہ لوگ ان سے سن کر اس پر عمل کریں۔ ایسے ہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر بھی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کے شروع میں پہلے سورہ فاتحہ سے افتتاح فرماتے (اس میں اذکار کی نفی نہیں پھر ائمہ میں۔

اختلاف ثانی کونسا ذکر افضل ہے: دوسرا اختلاف یہ ہے کہ کون سے ذکر کو اختیار کیا جائے تو) امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک سبحانک اللھم الخ سے نماز شروع کرنی چاہیے نیز وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اذکار میں سے کسی بھی ذکر سے نماز شروع کرے تو بھی جائز اور بہتر ہے۔ اکثر اہل علم سفیان ثوری، امام اسحٰق رحمہما اللہ کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی اور ابن المنذر کے مذہب میں نماز کے شروع میں وہ ذکر/ دعا پڑھنی چاہیے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مصنف رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ فرض نماز کی ابتداء میں کونسے کلمات پڑھنے چاہئیں لیکن حدیث وہ ذکر کی ہے جو نفل نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ جن احادیث میں نماز شروع کرنے کے بعد قراءت سے پہلے یا رکوع اور سجود میں جو بہت سی دعائیں ثابت ہیں وہ سب دعائیں نفل نماز میں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز بہت مختصر ادا فرماتے لیکن اس کے تمام ارکان مکمل ہوا کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے لہٰذا ایک آدمی جب فرض نماز پڑھ رہا ہے اسی طرح باجماعت نماز ادا کر رہا ہے تو اس کو ان دعاؤں میں سے سب سے مختصر دعا پر اکتفا کرنا چاہئیے۔ ہاں جب منفرداً نفل پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے لیکن اس سب کے باوجود اگر کوئی شخص فرض نماز میں یہ مسنون دعائیں پڑھتا ہے تو اس کی نماز بلا کراہت صحیح ہوگی۔

بعض علماء کا قول: فرض نماز میں اذکار وادعیہ مسنونہ پڑھنے کی صورت میں سجدہ سہو لازم ہوگا: بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا کیونکہ اس نے دوسرے فرض میں تاخیر کی ہے۔

اس قول پر رد: لیکن یہ قول ناقابل اعتبار ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک صرف اس علت کی وجہ سے سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا ورنہ قیام کو لمبا کرنے کی وجہ سے بھی سجدہ سہو لازم ہونا چاہئیے ہمارا خیال یہ تھا کہ چونکہ حاشیہ میں همزہ، نفثہ، نفخہ کی تفسیر موجود ہے اسلئے ہم نے اس کی وضاحت نہ کی تھی[1] لیکن اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ذکر کی جائے کہ یہ دعاء تعلیم امت کیلئے پڑھا کرتے تھے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ فرمایا تھا کہ شیطان آپ میں وسوسہ ڈالے اور نفث کا معنی یہ ہے کہ سحر یا شعر کی رغبت آپ کے دل میں بٹھلا دے اور همز وسوسہ کو کہتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کے بعد وجهت وجهي الخ پڑھا کرتے۔ ہماری دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبحانك اللهم سے نماز شروع فرماتے تھے اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ نیز ابو سعید رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ رواہ النسائی والترمذی۔ نیز دارقطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں سلف کا اس پر تعامل بھی ہے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کی موجودگی میں سبحانك اللهم سے نماز شروع فرماتے تھے اسی لئے امام احمد نے اس ذکر کو اختیار کیا ہے۔ انتہی

قلت: حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے عینی نے ان احادیث کی سندوں کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ فارجع الیہ

[1] یہاں سے آخر تک حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا کلام ہے جو انکی تقریر کے حاشیہ سے ملحق کی گئی ہے۔

(ابو الرجال اسمه محمد بن عبدالرحمن) ان راوی کے بہت سارے بیٹے[1] تھے اسلئے یہ (ابوالرجال) کنیت رکھی گئی ۔(از مترجم: یہ راوی محمد بن عبدالرحمٰن بن حارثہ بن النعمان ابوالرجال المدنی ہیں۔ انکی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے اور ابوالرجال انکا لقب ہے اور یہ لقب انکے بیٹوں کی وجہ سے پڑا کہ ان کے دس بیٹے تھے۔ انکے دادا حارثہ بن نعمان بدری صحابی تھے۔ اس راوی کو ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، ابن سعد نے ثقہ قرار دیا ہے۔ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ نے ان ابی الرجال سے احادیث نقل کی ہیں۔ ص ۶۰۴ جلد نمبر ۲۵ تہذیب الکمال۔ نیز حافظؒ نے تہذیب التہذیب جلد ۹: ص ۲۹۵ پر ان کے حالات نقل کئے ہیں۔ آخر میں حافظ فرماتے ہیں: قال البخاری هو ثبت، و ابنه حارثه منکر الحدیث ص ۲۹۶۔ از مترجم: یہاں پر امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی ان ابوالرجال کے صاحبزادے حارثہ پر کلام نقل کیا ہے و حارثه قد تکلم فیه من قبل حفظه الخ)۔

باب ماجاء فی تَرْکِ الجهر ببسم اللّٰه الرحمن الرحیم

باب ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہ پڑھنے کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا اسمٰعیلُ بن ابراهیم حَدَّثَنَا سعیدُ بن ابی ایاسٍ الجُرَیْرِیُّ عن قَیْس بنِ عَبَایَةَ عن ابن عبد اللّٰه بن مُغَفَّلٍ قال: سمعنی ابی و انا فی الصلاةِ اقول: بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم: فقال لی اَیْ بُنَیَّ! مُحْدَثٌ اِیَّاكَ وَالحَدَثَ،

قـال: ولـم اَرَاحـداً مـن اصحـاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان اَبْغَضَ الیه الحدثُ فی الاسـلام، یـعـنـی: منهُ، قال: وقد صلیت مع النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ومع ابی بکرٍ ومع عُمَرَ ومع عثمانَ فلم اسمعْ احداً منهم یقولُهَا، فلا تَقُلْهَا، اذا اَنْتَ صلیتَ فقل: الحمدُ للّٰه رَبِّ العالَمِینَ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ عبد اللّٰه بنِ مُغَفَّلٍ حدیث حسن۔

والـعـمـلُ علیهِ عند اکثر اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، منهم: ابو بکرٍ، وعمرُ، وعثـمـانُ، وعلیٌّ وغیرُهم، ومَن بعدهم من التابعین۔ وبه یقولُ سفیانُ الثوریُّ، وابنُ المبارك، واحمدُ، واسحٰقُ: لایَرَوْنَ ان یَجْهَرَ ببسم الرحمٰنِ الرحیم قالوا: ویقولها فی نفسه۔

---

[1] چنانچہ خلاصہ میں ہے کہ ان کے دس لڑکے تھے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بیٹے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے نماز میں بسم اللہ زور سے پڑھتے ہوئے سنا تو مجھ سے فرمایا بیٹا! (یہ نماز میں بسم اللہ جہرا) پڑھنا تو بدعت ہے اس سے بچو! وہ (عبداللہ بن مغفل کے بیٹے) فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی کو بدعات کے معاملے میں ان (عبداللہ بن مغفل) سے زیادہ سخت نہیں دیکھا اور وہ (عبداللہ بن مغفل) فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی تو کسی سے بھی نماز میں جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ سو تم بھی اس طرح نہ پڑھو...... جب تم نماز پڑھو پس الحمد للہ رب العالمین (سے جہراً) پڑھنا شروع کیا کرو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور اسی پر اکثر صحابہ اہل علم جن میں ابو بکر، عمر، عثمان، وعلی رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں اور ان کے بعد تابعین کا عمل ہے اور یہی سفیان ثوری، ابن مبارک، امام احمد و اسحٰق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ وہ بسم اللہ کو جہراً پڑھنے کے قائل نہیں ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کو سراً پڑھے۔

﴿تشریح﴾

اس مسئلہ میں فقہاء محدثین کے متعدد اقوال ہیں:

اختلاف کا دوسرا سبب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے قرآن کریم کی کسی سورۃ کے جزء ہونے یا نہ ہونے کے اختلاف کی وجہ سے ہے: اس اختلاف کا مبنی قراء[1] کے اختلاف پر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں تین قول ہیں:

پہلا قول: بعض علماء کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ اور ہر ہر سورت کا جزو ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے لہٰذا ان کے نزدیک جب سورت کو جہراً پڑھے تو بسم اللہ جہراً پڑھنا ضروری ہے۔

---

[1] یعنی عموماً یہ مذکورہ بالا اختلاف قراء کے اختلاف کے سبب ہے، ورنہ حنفیہ کے یہاں اس طرح نہیں کیونکہ احناف امام حفص کی قرأت کے متبع ہیں اور امام حفص کے یہاں ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ جہراً پڑھی جائیگی لیکن احناف کے نزدیک ہر سورت میں بسم اللہ جہراً نہیں پڑھی جائیگی۔

دوسرا قول[1]: امام مالک رحمہ اللہ کا ہے کہ بسم اللہ نہ کسی سورت کا جزو ہے اور نہ ہی مستقل آیت لہٰذا ان کے نزدیک جس طرح ثناء، تعوذ، وغیرہ سراً پڑھی جاتی ہے اسی طرح بسم اللہ بھی سراً پڑھنا ضروری ہے۔

تیسرا مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا[2] ہے کہ ان کے نزدیک تسمیہ نہ ہی سورہ فاتحہ کا جزء ہے اور نہ ہی کسی بھی سورت کا بلکہ یہ قرآن کی ایک آیت ہے جو کہ سورتوں کے درمیان فصل کیلئے نازل کی گئی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص پورا قرآن پڑھے

---

[1] **مالکیہ کا مشہور قول بسملہ کی جہراً وسراً نفی ہے:** حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے مالکیہ کا جو مذہب نقل کیا ہے یہ مذہب دسوقی نے مالکیہ سے بطور ایک روایت کے ذکر کیا ہے لیکن مالکیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تسمیہ بالکل نہ پڑھی جائے نہ سراً نہ ہی جہراً۔ چنانچہ الشرح الکبیر میں ہے کہ نفل نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے اور سورت سے پہلے تعوذ اور بسملہ پڑھنا جائز ہے اور فرض نماز میں مکروہ ہے۔ دسوقی فرماتے ہیں: کہ امام اور مقتدی میں سے ہر ایک کیلئے فرض نماز میں بسملہ وغیرہ مکروہ ہے چاہے بسملہ سری ہو یا جہری۔ فاتحہ سے پہلے بھی مکروہ اور سورت سے پہلے بھی۔ ابن عبدالبر...... مالکیہ کا مشہور مذہب یہی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سورہ نمل کے علاوہ بسملہ قرآن کی ایک آیت نہیں ہے۔ انتہی

[2] **امام احمدؒ بسم اللہ سراً پڑھنے کی مشروعیت میں احناف کے ساتھ ہیں: انکے مضبوط دلائل:** یہی مذہب امام احمدؒ کا ہے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نماز میں سورہ فاتحہ اور ہر سورت کے شروع میں پڑھنا مشروع ہے۔ اکثر علماء کا یہی مذہب ہے اور امام احمد سے ایک ہی روایت مروی ہے کہ بسم اللہ جہراً پڑھنا خلافِ سنت ہے۔ الشرح الکبیر میں ہے کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ نعیم المجمر کی روایت ہے کہ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی۔ پھر سورہ فاتحہ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ خدا کی قسم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے سب سے زیادہ مشابہ ہوں۔ اس روایت کو نسائی نے نقل کیا ہے۔ شعبہ اور شبان نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی ہے لیکن میں نے کبھی بھی ان سے بسم اللہ جہراً نہیں سنی اور بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں یہ سب بسملہ سراً پڑھتے تھے اور ابن شاہین نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سراً پڑھتے تھے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں جن احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنے کا ذکر ہے وہ تمام کی تمام ضعیف ہیں کیونکہ جو راوی بسم اللہ جہراً نقل کر رہے ہیں وہی راوی تسمیہ سراً بھی نقل کر رہے ہیں اور بسم اللہ سراً والی روایات کی سندیں صحیح اور ثابت ہیں جس میں کسی کو کلام نہیں اس سے معلوم ہوا کہ جہر والی روایات ضعیف ہیں اور ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ دارقطنی فرماتے تھے کہ جہر بالبسملہ کے باب میں کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت نہیں۔ انتہی

اور تسمیہ بالکل ہی نہ پڑھے تو اس کے قرآن میں کمی اور نقص رہ گیا کیونکہ اسے ایک دفعہ پڑھنا ضروری ہے تا کہ قرآن کریم مکمل ہو جائے جب سورہ فاتحہ جہراً پڑھی جائے تو بسملہ کو جہراً پڑھنا صحیح نہیں کیونکہ بسملہ، فاتحہ کا جزو نہیں ہے کہ فاتحہ کے جہر کی وجہ سے اسے بھی جہر پڑھنا صحیح ہو۔ حنفیہ اور شافعیہ میں سے ہر ایک کے اس مسئلہ میں ایسے مضبوط دلائل ہیں جو نا قابل انکار ہیں۔ ہاں بعض دلائل، دوسرے دلائل کے مقابلہ میں قوی اور مضبوط ہیں تو ان دونوں ائمہ میں سے ہر ایک نے اس مذہب کو اختیار کیا جو ان کے یہاں راجح معلوم ہو رہا تھا۔

متقدمین ومتاخرین محدثین کرام نے تسمیہ جہراً پڑھنے پر جو دلائل پیش کئے ہیں تو ان دلائل میں سے ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے اسلئے صاحب سفر السعادۃ نے اعتراف کیا ہے کہ تسمیہ جہراً پڑھنے کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں (ازمترجم: حافظ جمال الدین زیلعیؒ نے نصب الرایۃ میں اس مسئلے میں بہت تحقیقی کلام کیا ہے وہاں پر یہ لکھتے ہیں: جہر بالبسملہ کی احادیث میں کوئی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں اور اس کے روایت کرنے والے راوی کذاب، ضعفاء اور مجاہیل ہیں مثلاً عمرو بن شمر، جابر جعفی، عبدالکریم بن ابی المخارق وغیرہ لہٰذا ایسی روایات حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو بخاری ومسلم نقل کیا ہے کا کس طرح مقابلہ کرسکتی ہیں...... امام بخاری رحمہ اللہ جن کو امام ابوحنیفہ کے مذہب سے انتہائی درجہ کا تعصب ہے اور وہ مذہبِ ابوحنیفہؒ پر سب سے زیادہ ظلم کرنے والوں میں ہیں انہوں نے بھی اپنی صحیح بخاری میں کوئی ایک حدیث جہر بالبسملہ کے متعلق ذکر نہیں کی اور نہ ہی امام مسلمؒ نے بلکہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اخفاء بالبسملہ پر دلالت کرتی ہے...... امام بخاری تو امام ابوحنیفہ کے خلاف احادیث کی تلاش میں رہتے ہیں جیسا کہ قال بعض الناس وَقال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذا و کذا اس صنیع سے معلوم ہو رہا ہے...... اور میں قسم کھاتا ہوں باللہ وتاللہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ کو جہر بالبسملہ کی کوئی حدیث اپنی شرط کے مطابق یا شرط کے قریب مل جاتی تو امام بخاریؒ کی کتاب اس سے خالی نہ ہوتی۔ یہی حال امام مسلمؒ کا ہے پھر یہ بتائیں کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ باوجود اس کے کہ ضعیف احادیث بھی ان کتابوں میں موجود ہیں انہوں نے ایک حدیث بھی جہر بالبسملہ کی ذکر نہیں کی اس لئے کہ جہر بالبسملہ کی احادیث ان کے ہاں بالکل ضعیف اور کمزور تھیں۔ صرف امام نسائیؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے جس کا ضعف ہم بیان کر چکے ہیں ص ۳۵۶۔ آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے مشائخ نے بیان کیا کہ دارقطنی جب مصر پہنچے تو کسی نے ان سے جہر بالبسملہ کے مسئلہ میں رسالہ لکھنے کی درخواست کی اس پر امام دارقطنی نے ایک رسالہ

تصنیف فرمایا تو ایک مالکی عالم نے ان سے قسم دیکر پوچھا کہ اس میں صحیح احادیث کے بارے میں بتلائیں تو امام دار قطنی نے جواب دیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر بالبسملہ کے متعلق مروی احادیث میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے ہاں صحابہ کے آثار میں سے بعض آثار صحیح ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔۳۵۹) شاید کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو ایسی حدیث پہنچی ہو جو بالکل صحیح ہو وہ ہم تک نہیں پہنچی کہ احناف اس کے متعلق کلام کرسکیں۔

(سمعنی ابی وانا فی الصلوٰۃ اقول) یعنی میں نماز[1] میں جہراً بسم اللہ پڑھ رہا تھا تو اس پر میرے والد صاحب نے مجھے ٹوکا اور فرمایا کہ یہ بدعت ہے۔

اقول کا مطلب جہراً بسملہ پڑھنا ہے: کیونکہ کوئی بھی امام[2] بسملہ کے جہراً وسراً دونوں طرح مکروہ ہونے کا قائل نہیں نیز اگر اقول سے جہراً پڑھنا مراد نہ لیں تو اس حدیث کو باب[3] میں ذکر کرنا صحیح نہ ہوتا نیز سمعنی ابی کا کلمہ بتا رہا ہے کہ یہ زور سے بسملہ اور قراءت کررہے تھے کیونکہ سراً تسمیہ پڑھنے کی صورت میں والد صاحب کا سننا ذرا بعید معلوم ہوتا ہے اگرچہ یہ ممکن بھی ہے۔

(یعنی منه) چونکہ حدیث باب میں ابغض اسم تفضیل استعمال ہوا ہے "کان ابغض الیہ الحدث" الخ میں۔

اسمِ تفضیل کے استعمال کے تین طریقے: اور یہ اسم تفضیل کا صیغہ بغیر الف لام، اضافت اور مِن کے استعمال ہوا ہے

---

[1] اقول کا مطلب جہراً پڑھنا ہے۔ مقدسی نے الشرح الکبیر میں اس کا یہی معنی بیان کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مغفل کی حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ جہراً بسملہ پڑھ رہے تھے اس طرح تمام روایات میں تطبیق ہو جائیگی۔ یہ ٹکڑا اس بات کی علت ہے کہ حدیث میں اقول کی تفسیر اجہر کے ساتھ کی گئی ہے یعنی چونکہ کسی کے نزدیک بھی بسم اللہ پڑھنا مطلقاً مکروہ ہوا ایسا نہیں۔ لہٰذا عبداللہ بن مغفلؓ مطلقاً بسم اللہ کو ناپسند نہیں کررہے تھے بلکہ بسم اللہ جہراً پڑھنے کو ناپسند کررہے تھے ھٰذا ما افادہ الشیخ۔

[2] یہ بات اس پر مبنی ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے مالکیہ کا یہ مذہب ذکر کیا تھا کہ بسم اللہ سراً پڑھنا مستحب ہے اسلئے حضرت فرمارہے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی امام نماز میں عدم تسمیہ کا قائل نہیں لیکن درحقیقت یہ امام مالک کی ایک روایت ہے کیونکہ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ فرض نماز میں تسمیہ جہراً وسراً مطلقاً مکروہ ہے۔ جیسا کہ الشرح الکبیر سے اس کا بیان گزر چکا ہے۔

[3] یعنی مصنف کو یہ حدیث باب ترک الجہر میں ذکر کرنا صحیح نہ ہوتی (تو اس باب ترک الجہر میں مصنف نے اس حدیث کو ذکر کیا معلوم یہ ہوا کہ صحابی جہراً پڑھنے پر نکیر فرمارہے تھے)۔

حالانکہ اسم تفضیل ان تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر مستعمل ہوتا ہے لہٰذا لفظ منہ سے اشارہ کیا کہ یہاں اسم تفضیل من کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور یہی ظاہر کلام سے سمجھ میں آرہا ہے اب مطلب یہ ہوا کہ تمام صحابہ کرام کو اسلام میں کوئی نئی چیز ایجاد کرنا مبغوض تھا لیکن میرے والد صاحب سب[1] صحابہ میں اسلام میں کسی بدعت کے ایجاد ہونے پر اس کو انتہائی سختی سے مبغوض رکھتے تھے۔

باب مَنْ رَاَی الجهرَ ببسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم

باب ہے جہراً بسم اللہ کے قائلین کی روایات کے بارے میں

☆حدثنا احمدُ بن عَبْدَةَ الضَّبِّيُّ حَدَّثَنَا المعْتَمِرُ بن سليمانَ قال: حدثني اسمٰعيل بن حَمَّادٍ عن ابي خالد عن ابن عباس قال: كان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم يَفْتَتِحُ صلا تَهُ ببسم اللّٰه الرحمن الرحيم۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث ليس اسناده بذاكَ۔

وقد قال بهٰذا عِدَّةٌ من اهل العلم من اصحاب النبى صلى اللّٰه عليه وسلم، منهم، ابو هريرة، وابنُ عُمَرَ وابنُ عباسٍ وابنُ الزُّبيرِ،ومَن بعدهم من التابعين: رَأَوُا الجهر بسم اللّٰه الرحمن الرحيم۔ وبه يقولُ الشافعى۔ واسمٰعيلُ بنُ حَمَّادٍهو ابن ابى سليمانَ وابو خالد : هو ابو خالد الوالبى ، واسمه هرمز وهو كرفى۔

---

[1] **منہ کی ضمیر کا مرجع**: یہ بھی ممکن ہے کہ منہ کی ضمیر کا مرجع الحدث فی الاسلام ہو اب مطلب یہ ہوگا کہ کسی بدعت کے ایجاد کرنے کو ظاہر کرنا یعنی میرے والد صاحب کو سب سے ناپسندیدہ شئی یہ تھی کہ اسلام میں کسی بدعت کو جاری کیا جائے۔ بہر حال اس کا مقصود یہ ہے کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بیٹے کا کلام بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ صحابہ کو اسلام میں سب سے مبغوض شئے یہ تھی کہ کسی بدعت کو جاری کیا جائے لیکن کلام سے اس کا عکس معلوم ہورہا ہے کیونکہ ان کا کلام دلالت کررہا ہے کہ صحابہ کرام کو اسلام میں کسی بدعت کا ایجاد کرنا مبغوض نہ تھا لہٰذا لفظ منہ نکال کر راوی نے یہ بتایا کہ حدث یہاں مفضل علیہ ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ صحابہ کو اسلام میں بدعت ایجاد کرنے سے زیادہ کوئی شئی مبغوض نہ تھی تو اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے والد صاحب کو اسلام میں بدعت جاری کرنا سب سے زیادہ مبغوض تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تمام اشیاء کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مبغوض اسلام میں بدعت کو جاری کرنا ہے۔ افادہ الشیخ الجلیل والحبر النبیل مولانا السید الخلیل۔

قلت: یہ عبارت ابوداؤد کی تقریر کے حاشیہ میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری شارح ابوداؤد نے لکھی ہے ابتدائی تقریر حضرت نے خود لکھی ہے اور آخری جملہ میرے والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ نور اللہ مرقدہما

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع فرماتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی سند قوی نہیں اور اسی پر گنتی کے بعض صحابہ اور تابعین اہل علم کا عمل ہے صحابہ میں ابو ہریرہ، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہراً پڑھا جائیگا۔ اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔ سند میں اسماعیل بن حماد ابن ابی سلیمان ہیں اور سند میں مذکور ابو خالد والبی ہیں ان کا نام ہرمز ہے اور وہ کوفی ہیں۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب بسم اللہ بالجہر پر دلیل نہیں بن سکتی: (یفتتح صلاتہ ببسم اللہ الرحمن الرحیم) لیکن یہ بات بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ حدیث باب سے تسمیہ بالجہر کے دعویٰ[1] پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم کی قرأت اور دعاؤں کو سن لیا کرتے تھے۔ اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آواز سے ہی پڑھ رہے ہوں۔

نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دو کلمات بلند آواز سے بھی سری نماز میں پڑھ دیا کرتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بتایا ہو کہ میں تسمیہ سے نماز کو شروع کرتا ہوں تو صحابہ کرام کو اس طرح معلوم ہوا ہو۔ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انہوں نے جہراً تسمیہ سنی بھی ہو بلکہ حدیث باب سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قراءت کے شروع کرتے وقت تسمیہ پڑھتے تھے اور ہم بھی تسمیہ پڑھنے کے منکر نہیں۔

نیز الزامی جواب یہ بھی ہیکہ اگر اس حدیث سے تسمیہ بالجہر کو ثابت کیا جائے تو اس سے یہ بھی لازم آئیگا کہ ثناء اور تعوذ بھی جہراً پڑھنی چاہیئے حالانکہ خود خصم بھی اس کا قائل نہیں۔

---

[1] اس حدیث سے جہر پر استدلال ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ ایک دوسری حدیث میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع فرماتے تھے تو تکبیر تحریمہ کہکر ان صلاتی ونسکی الخ دعا پڑھتے اسی طرح حدیث عائشہ میں سبحانک اللہم کیساتھ نماز شروع کرنے کا ذکر ہے اور حدیث علیؓ میں انی وجہت کیساتھ اسی طرح احادیث میں رکوع اور سجدے کی دعاؤں کا ذکر ہے لہٰذا سب اذکار اور ادعیہ جہراً مسنون ہونے چاہئیں حالانکہ کوئی ان سے جہر پر استدلال نہیں کرتا۔

باب ماجاء فی افْتِتَاح القراء ة باالحمدُ للّٰہ ربِّ العالمینَ

باب ہے الحمدللہ سے قراءت شروع کرنے کے بارے میں

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن قتادةَ عن انس قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وابو بکر وعمرُ وعثمانُ یَفْتَتِحُونَ القراء ةَ باالحمدُ للّٰہ ربِّ العالمینَ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیح۔

والعمل علی هذا عند اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم والتابعین ومن بعدهم: کانوا یفتتحون القراء ة بالحمدُ لله رب العالمین۔

قال الشافعیُّ: انما معنی هذا الحدیث ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وابا بکر وعمرَ وعثمان کانوا یفتتحون القراء ة بالحمدُ للّٰہ رب العالمین معناه: انهم کانوا یبدء ونَ بقراء ة فاتحة الکتاب قبل السورة، ولیس معناه انهم کانوا لایقرء ونَ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔

وکان الشافعیُّ یری ان یبدَأ ببسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم وَاَن یُجْهَرَ بها اذا جَهَرِ بالقراء ة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین قراءت الحمدللہ رب العالمین سے شروع فرماتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر جمہور اہلِ علم صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے علماء کا عمل ہے کہ وہ قراءت الحمدللہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث باب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر، عمر وعثمان رضی اللہ عنہم (سورہ فاتحہ) الحمدللہ رب العالمین سے قراءت شروع فرماتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرات سورت کی قراءت سے پہلے سورہ فاتحہ کی قراءت سے ابتداء فرماتے تھے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے تھے اور امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے (قراءت کی) ابتداء کی جائے اور اس کو جہراً پڑھا جائے جبکہ (امام) جہراً قراءت کررہا ہو۔

﴿تشریح﴾

امام ترمذی رحمہ اللہ کی غرض: اس باب سے یہ بتلانا ہے کہ نماز میں سورت کی تلاوت سے قبل، فاتحہ کی تلاوت کرنا سنت ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ بسم اللہ جہراً نہیں پڑھتے تھے۔

امام شافعیؒ کی طرف سے کیجانی والی تاویل اور اس پر تفصیلی رد: امام شافعی رحمہ اللہ نے اس میں جو تاویل کی ہے وہ ایسی[1] ہی تاویل ہے جیسا کہ باب الاسفار فی الفجر کے مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ نے تاویل فرمائی تھی (از مترجم: شاید کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے باب الاسفار میں امام شافعی رحمہ اللہ کی تاویل: قال الشافعی وا حمد، واسحق معنی الاسفار ان یضح الفجر فلا یشك فیه الخ اس طرف اشارہ فرمایا ہے) لیکن ہم شوافع اور ان کے متبعین کی جانب سے یہ کہتے ہیں کہ یہ تاویل ایسی ہی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

(اذا قالت حزام فصدقوها......فان القول ما قالت حزام) یعنی جب حزام کچھ کہے تو اس کی تصدیق کرو کیونکہ اس کی بات معتبر ہوتی ہے۔ اور میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں نے یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ پر بطور طعن کے کہی ہو اور نہ ہی انکی شان کی تنقیص کی ہے بلکہ یہ بات مجھ سے دین کی حفاظت کرنے والوں اور علم ویقین کے جھنڈے لہرانے والوں کی محبت کے غلبہ میں صادر ہوئی ہے کیونکہ تسمیہ اگر سورہ فاتحہ کا جزء ہو تو الحمد للہ رب العالمین سورہ فاتحہ کا درمیانی جزء ہوگا اور کسی سورت کی طرف جب اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس سورت کا پہلا جزء بولکر اس سورت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے یہی طریقہ رائج ہے لیکن یہاں پر سورہ فاتحہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اس کا درمیانی جزء الحمد للہ رب العالمین کو ذکر کیا جا رہا ہے حالانکہ ایسی صورت میں سورہ کا ابتدائی جزو ذکر کیا جاتا ہے نہ کہ درمیانی جزو۔

شوافع کی طرف سے جواب: لیکن شوافع[2] یہ عذر کر سکتے ہیں کہ چونکہ تسمیہ ہر سورت سے پہلے پڑھی جاتی ہے کسی

---

[1] یحکی کے معنی مشابہ ہونے کے ہیں مجد الدین فرماتے ہیں فلانا حاکیتہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس کی مشابہت اختیار کی اور اس کے فعل اور قول کی طرح اس کی نقل اتاری۔ انتہی

[2] **شوافع کے جواب پر رد:** لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ ایسے مواقع میں اس سورت کا پہلا جزو اور وہ جزء جس سے یہ سورت ممتاز ہو جائے دونوں ہی ذکر کئے جاتے ہیں جیسے حم سجدہ۔ نہ کہ صرف دوسرا جزو ذکر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے (لہذا یہاں پر کان یفتتح الصلوٰۃ بالبسملة والحمد لله رب العالمین ہونا چاہئے تھا: از مترجم)۔

سورت کے ساتھ خاص نہیں لہذا تسمیہ کو ذکر کرنے سے یہ مقصود حاصل نہ ہوتا، کہ کونسی سورت سے نماز کی قراءت شروع کرتے تھے لہذا یہ بتلانے کیلئے کہ نماز کی قراءت سورۃ فاتحہ سے شروع فرماتے تھے حدیث میں ایسے جز و کو ذکر کیا گیا جس سے معلوم ہو جائے کہ اس سے سورت فاتحہ مراد ہے اگر چہ وہ سورت کا درمیانی جز و تھا اور یہ وہ پہلا جملہ تھا جس سے اس سورت اور بقیہ سورتوں میں فرق واضح ہو گیا۔

باب ماجاء انه لاصلاة الا بفاتحة الكتاب

باب ہے اس بارے میں کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی

☆ حَدَّثَنَا محمد بن يحيى بن اَبى عُمَرَ المكِّىُّ ابو عبد الله العَدَنِىُّ وعلىُّ بن حُجرٍ قالا: حَدَّثَنَا سفيانُ بن عيينة عن الزُّهرِىِّ عن محمود بن الرَّبِيعِ عن عُبَادَةَ بن الصَّامِتِ عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: لاصلاةَ لمن لم يَقرأْ بفاتحة الكتاب۔

قال : وفى الباب عن ابى هريرة ، وعائشة، وانسٍ، وابى قَتَادَةَ، وعبدِ الله بن عمرٍو۔

قال ابو عيسى: حديث عُبَادَةَ حديث حسن صحيح۔ والعملُ عليه عند اكثر اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم، منهم: عمرُ بن الخطّاب، وجابرُ بن عبد الله، وعِمْرَانُ بن حُصَيْنٍ، وغيرهم، قالوا، لاتُجزِئُ صلاة الا بقراءة فاتحة الكتاب۔

وبه يقول ابن المبارك، والشافعىُّ، واحمد واسحٰق۔ سمعتُ ابن ابى عمرَ يقولُ: اختَلَفْتُ الى ابن عيينة ثمانيةَ عَشَرَ سنةً، وكان الحُمَيْدِىُّ اكبرَ مِنِّى بسنةٍ۔ وسمعتُ ابن ابى عمر يقولُ: حججتُ سبعين حَجَّةً ماشياً۔ على قَدَمَىَّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔

باب میں ابو ہریرہ، عائشہ، انس، ابو قتادہ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم صحابہ جن میں عمر بن خطاب،

جابر بن عبداللہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں ان سب کا عمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کوئی نماز سورہ فاتحہ کی قراءت کے بغیر نہیں ہوتی اور یہی امام شافعی، ابن مبارک، امام احمد واسحق کا قول ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی عمر نے فرمایا میں اٹھارہ سال تک سفیان بن عیینہ کی خدمت میں علم حاصل کرنے کیلئے جاتا رہا اور ابن ابی عمر نے یہ بھی فرمایا کہ حمیدی مجھ سے ایک سال بڑے تھے اور ابن ابی عمر نے فرمایا کہ میں نے ستر حج اپنے پاؤں پر پیدل چل کر کئے ہیں۔

﴿تشریح﴾

فاقرا و ما تیسر من القرآن میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی سورۃ کی قرأت کے وجوب میں احناف و شوافع کا اختلاف ہے:

ایک اہم اختلافی مسئلہ: جاننا چاہیئے کہ یہ مسئلہ احناف اور شوافع کے درمیان کے بڑے اختلافی مسائل میں سے ایک ہے ہم عنقریب اپنے مذہب پر مضبوط دلائل پیش کریں گے پس یہ بات جان لیں کہ اس حدیث کے آخر میں ایک ٹکڑا مزید موجود ہے جس کو حضرات شوافع نے چھوڑ دیا ہے یہ کہتے ہوئے کہ یہ راوی کی جانب سے سہو ہوا ہے کیونکہ وہ جزو انکے مذہب کے مخالف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بفاتحۃ الکتاب کے بعد حدیث میں فصاعدا[۲] کی زیادتی موجود ہے اور بعض روایات میں "وسورۃ" کی زیادتی اور بعض روایت میں "وزیادۃ" کی زیادتی موجود ہے۔

حنفیہ کے دلائل: امام ترمذی رحمہ اللہ اس سے پہلے باب ما جاء فی تحریم الصلوۃ و تحلیلہا میں یہ حدیث

---

[۱] **رکن قرأت کی تعیین میں ائمہ کا اختلاف:** اسی طرح تمام ائمہ کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ رکن قراءت سورۃ فاتحہ پر موقوف ہے یا سورۃ فاتحہ کے بغیر بھی حاصل ہو جائیگا علماء کے حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ مطلقا ما تیسر من القرآن رکن ہے امام شافعی سورۃ فاتحہ کو رکن قرار دیتے ہیں اور امام مالک فاتحہ اور سورہ دونوں کو رکن قرار دیتے ہیں (یہ صاحب ہدایہ کی نقل کے موافق صحیح بات یہ ہے کہ امام مالک کے ہاں فاتحہ کا پڑھنا رکن ہے اور سورہ کو ملانا سنت ہے جیسا کہ دردیر میں اس کی تصریح ہے)۔ امام احمد رحمہ اللہ مشہور روایت میں امام شافعی رحمہ اللہ کے موافق ہیں اور ان کی دوسری روایت حنفیہ کے ساتھ ہے اور حنفیہ کے ساتھ امام ثوری اوزاعی بھی ہیں جیسا کہ اوجز میں ہے۔

[۲] جیسا کہ امام مسلم، ابوداؤد اور ابن حبان نے اس زیادتی کو نقل کیا ہے جیسا کہ بذل میں ہے۔

نقل کر چکے ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں لا صلوٰۃ لمن لم یقرا بالحمد و سورۃ فی فریضۃ او غیرھا پس ہم کہتے ہیں کہ اس زیادتی کو تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ ثقہ راوی کی زیادتی معتبر ہوتی ہے لہٰذا جس طرح سورۃ فاتحہ کا نماز میں ہونا ضروری ہے اسی طرح سورۃ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ پایا جائے تو نماز کامل نہ ہوگی (تو سورہ فاتحہ اور سورۃ دونوں کا ایک ہی حکم ہے یعنی دونوں ضروری ہیں) اور یہی ہمارا مذہب ہے۔

تسلیمی جواب: اگر ہم اس زیادتی سے قطع نظر بھی کریں تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "فاقرأو ما تیسر من القرآن" سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی اللہ الصمد پر اکتفاء کرے تو نماز جائز ہو جانی چاہیے جبکہ صحیح حدیث اس کو ناجائز قرار دیتی ہے لہٰذا قرآن و حدیث میں سے ہر ایک کے مقتضیٰ پر اس طرح عمل کیا جائے کہ دوسرے کا مفہوم باطل نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" میں نفی کمال ہے نہ کے ذات کی نفی کیونکہ یہاں پر قرینہ موجود ہے اور اسی قرینہ پر مدار ہے کہ لا کو نفی کمال پر محمول کیا جائے نہ کہ نفی ذات پر وہ قرینہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "فاقروا ما تیسرا من القرآن" نبوت کے چند مہینوں کے بعد مکہ میں نازل ہوا اور اس قدر مشہور ہو گیا کہ گویا امور بدیہیہ میں سے ہے جو کہ ناقابل انکار ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو دیکھتے ہوئے حدیث شریف میں لفظ لا صلوٰۃ سے نماز کی نفی کی ہے اور یہ لا نفی ذات کیلئے وضع کیا گیا ہے لیکن آیت اس کے خلاف قرینہ موجود ہے پس معلوم ہوا کہ حدیث شریف میں لا صلوٰۃ کی خبر افعالِ عامہ (از مترجم: افعال عموم نزد ارباب عقول:::::: کون است و ثبوت است و وجود است و حصول۔ تو یہ چار ہوئے۔ کائن، ثابت، موجود، حاصل) سے نہیں ہے (بلکہ کاملۃ ہے) نیز نفی کمال پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں فھی خداج غیر تمام کے الفاظ ہیں پس اس حدیث میں تصریح[1] ہے کہ نماز میں نقصان کی خرابی واقع ہوئی ہے نماز باطل نہیں ہوئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا فصاعدا کی زیادتی کا انکار کرنا اور اس کا جواب: اور تعجب خیز امور میں سے ایک عجیب تر بات یہ ہے کہ امام بخاری نے اس زیادتی کا انکار کیا ہے[2] جس کو ابھی ہم نے ذکر کیا اور انہوں نے اس غلطی کی

---

[1] الا التصریحا اصل تقریر میں یہی لفظ ہے قواعد کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لفظ الا التصریحُ مرفوع ہو۔

[2] **معمر راوی کے چار متابعات:** یعنی فصاعدا کی زیادتی حدیث عبادہ میں ہے اسکے متعلق امام بخاری کتاب القراۃ خلف الامام میں فرماتے ہیں کہ معمر نے زہری سے فصاعدا کی زیادتی نقل کی ہے حالانکہ اکثر راوی معمر کے قول فصاعداً میں ان کی اتباع نہیں کرتے۔ ہمارے شیخ نے بذل میں اس کا تعقب کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے اس لفظ میں معمر کی متابعت کی ہے اسی طرح صالح، اوزاعی، عبدالرحمٰن بن اسحٰق سب نے معمر کی طرح زہری سے اس زیادتی کو نقل کیا ہے۔ انتھی

نسبت معمر راوی کی طرف کی ہے حالانکہ معمر کی علوشان اور بلندی مرتبہ نا قابل انکار ہے اور نہ ہی اس کو بھلایا جاسکتا ہے اور یہ ایک ایسا کلام ہے کہ میں اس کی خرابی بیان کرنے پر قادر نہیں۔

امام نووی کا ما تیسر سے سورۃ فاتحہ مراد لینا بالکل تعصب ہے: اور اس سے زیادہ عجیب تر بات یہ ہے کہ امام نووی شارح مسلم نے اللہ تعالیٰ کا فرمان فاقرو اما تیسر کو سورہ فاتحہ پر محمول کیا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ اس لفظ عام کو سورہ فاتحہ کے ساتھ کس طرح خاص کیا جاسکتا ہے حالانکہ سورہ فاتحہ قرآن کی بہت سی سورتوں[1] سے چھوٹی نہیں ہے۔ تو ان سورتوں کے مقابلے میں سورۃ فاتحہ کو آسان کہنا کیسے صحیح ہے یہ تو بالکل تعصب والی بات ہے۔

باب ماجاء فی التامین

باب ہے آمین کہنے کے بیان میں

☆حدثنا بُنْدَارٌ محمد بن بَشَّارٍ حَدَّثَنَا يحيى بنُ سعيدٍ وعبد الرحمن بن مَهْدِيٌّ قالا: **سفيانُ عن** سَلَمَةَ بن كُهَيْلٍ عن حجر بن عنبس عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قال: سمعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم **قرأ** غَيْرِ المَغْضُوبِ عليهم ولا الضَّالِّينَ فقال: آمِينَ، ومدَّ بها صَوْتَهُ۔ قال : وفى الباب عن على، **وابى** هريرة۔ قال ابو عيسى: حديث وائِلِ بنِ حُجْرٍ حديث حسن۔

وبه يقُولُ غيرُ واحد من اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتابعين **ومَن بعدَهم** يَرَوْنَ ان الرجلَ يرفعُ صوتهُ بالتامين ولا يُخفِيهَا۔ وبه يقول الشافعيُّ، وَاحْمَدُ، وَإسحٰقُ۔ **وروَى شعبةُ** هذا الحديث عن سَلَمَةَ بنِ كُهَيْلٍ عن حُجْرٍ ابى العنبَسِ عن علقمةَ بن وائلٍ عن ابيه: ان النبيَّ **صلى الله** عليه وسلم قَرَأَ غَيْرِ المَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فقال: آمِينَ، وخَفَضَ بها صوتهُ۔

قال ابو عيسى: و سمعت محمداً يقولُ: حديث سفيان اصحُّ من حديثِ شعبةَ **فى هذا**، واخطأ شعبةُ فى مواضعَ من هذا الحديث، فقال:عن حُجْرٍ اَبِى الْعَنْبَسِ وانما هو حُجْرُبْنُ عَنْبَسٍ

---

[1] یہاں لفظ اکثر سے اسم تفضیل کا صیغہ مراد نہیں بلکہ بمعنی کثیر ہے اور اس میں شک نہیں کہ سورہ فاتحہ قرآن کی چند سورتوں سے لمبی ہے۔

ويُكنى ابا السَّكَنِ وزادفيه عن علقمةَ بن وائلٍ وليس فيهِ عن علقمةَ، وانما هو: عن حُجرِ بنِ عَنبسٍ عن وائل بنِ حُجر، وقال: وخفضَ بها صوتَهُ وانما هُو مَدَّ بِهَا صَوتَهُ۔

قال ابو عيسى: وسالتُ ابا زُرعَةَ عن هذا الحديث؟ فقال: حديث سفيانَ فى هذا اصحُّ من حديث شعبة، قال: ورَوَى العلاءِ بنُ صالحِ الاسَدِى عن سلمةَ بن كُهَيل نحوَ روايَةِ سفيانَ

☆ قال ابو عيسى: حَدَّثَنَا ابو بكر محمد بنُ اَبانَ حَدَّثَنا عَبدُ اللّٰه بن نُمَيرٍ حَدَّثَنَا العلاء بن صالحِ الاسدى عن سلمة بن كُهَيلٍ عن حُجر بن عَنبَسٍ عن وائِلِ بن حُجرٍ عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم نحوَ حديث سفيانَ عن سلمةَ بن كُهَيل۔

﴿ترجمه﴾

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ نے پڑھا غیر المغضوب علیہم و لا الضالین اور آمین کہا اور اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچا۔

باب میں حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وائل بن حجر کی حدیث حسن ہے اور اسی پر بے شمار اہل علم صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے علماء کا عمل ہے ان کی رائے یہ ہے کہ آدمی آمین کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کرے اور اس کو سرا نہ کہے اور یہی امام شافعی، احمد واسحٰق کا قول ہے اور شعبہ نے اس حدیث کو سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حجر ابی العنبس سے انہوں نے علقمہ بن وائل سے انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر المغضوب علیہم و لا الضالین پڑھا اور پھر آمین کہا اور اس کے ساتھ اپنی آواز کو پست رکھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے محمد (امام بخاری) سے سنا وہ کہتے ہیں کہ سفیان کی حدیث شعبہ کی حدیث سے اصح ہے اور شعبہ نے اس حدیث میں کئی جگہوں میں غلطی کی ہے چنانچہ انہوں نے کہا (پہلی غلطی) عن حجر ابی العنبس حالانکہ وہ حجر بن العنبس ہے اور ان کی کنیت ابو السکن ہے۔

اور (دوسری غلطی یہ کی کہ) اس میں اضافہ کر دیا اور کہا عن علقمہ بن وائل حالانکہ اس میں علقمہ کے واسطے سے روایت نہیں ہے اور وہ تو اس طرح ہے کہ حجر بن عنبس عن وائل بن حجر (بلا واسطہ علقمہ کی روایت ہے)۔

اور (تیسری غلطی) کہا کہ آمین کے ساتھ اپنی آواز کو پست فرمایا حالانکہ حدیث میں ہے کہ اپنی آواز کو کھینچا آمین کے ساتھ۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوزرعہ سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ سفیان کی حدیث اس مسئلہ میں اصح ہے اور علاء بن صالح الاسدی نے سلمہ بن کہیل سے سفیان کے مثل روایت کی ہے۔

(ازمترجم: یہاں سے چوتھا اعتراض ہے کہ سفیان عن سلمۃ بن کہیل کا ایک متابع موجود ہے علا بن صالح الاسدی یہ بھی عن سلمۃ بن کھیل و مد بھا صوتہ نقل کرتا ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں خبر دی ابوبکر محمد بن ابان نے انہوں نے عبداللہ بن نمیر سے نقل کیا انہوں نے علاء بن صالح الاسدی سے (مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ راوی متکلم فیہ ہے۔ ابوحاتم رازی اور ابن المدینی نے اس کی تضعیف کی ہے اور حافظ ابوحاتم نے لکھا ہے کہ کان من عتق الشیعۃ اور تقریب میں لکھا ہے کہ صدوق لہ اوھام اور علی بن مدینی نے روی احادیث مناکیر فرمایا ہے۔ ص ۴۱۰: جلد ثانی معارف السنن۔ اس لئے یہ راوی متابعت کے قابل نہیں ہے۔ ازمترجم) انہوں نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حجر بن عنبس سے انہوں نے وائل بن حجر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفیان عن سلمہ بن کہیل کی حدیث کی طرح بیان کیا۔

﴿تشریح﴾

آمین بالجہر اور آمین بالسر کا اختلاف افضلیت کا ہے: آمین کے متعلق افضل کو اختیار کرنے میں اختلاف ہے[1] (یعنی آمین بالجہر اولی ہے یا بالسر)۔

حدیثِ باب کے جوابات۔ جواب نمبر ۱: اور آپ کو معلوم ہے کہ مد بھا صوتہ فریق مخالف کے مدعی پر صریح نہیں کیونکہ آمین کو کھینچنا جس طرح زور سے کہنے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہلکے کہنے کی صورت میں بھی اس کو کھینچ سکتے ہیں۔

جواب نمبر ۲: اس مقام میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ سفیان راوی دوسری روایت[2] میں خود خفض بھا صوتہ کی تصریح

---

[1] فروع اور شروع میں اس کی تصریح ہے کہ یہ اختلاف افضل اور غیر افضل میں ہے چنانچہ درمختار میں آمین کہنے کو اور اس کے سری ہونے کو سنتوں میں شمار کیا ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مصنف نے یہ اشارہ کیا ہے کہ آمین کو سرا کہنا الگ سنت ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس آمین کہنا یہ مستقل سنت ہے جو کہ جہر کی صورت میں بھی حاصل ہو جائیگی۔

[2] اس پر عنقریب کلام آئیگا اور مجھے سفیان کی یہ روایت ابھی تک نہیں ملی۔

کر رہے ہیں لہٰذا ان کی دونوں روایتوں کو ایسے معنی پرمحمول [1] کیا جائے کہ دونوں روایتوں میں تعارض نہ رہے۔ بعض راوی رفع بھا صوتہ اور جھر بھا صوتہ کوذکر کرتے ہیں تو شاید ان کو مد بھا صوتہ اس لفظ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہو ئی (تو انہوں نے مدبھا صوتہ کو روایت بالمعنی نقل کر کے جھر بھا صوتہ سے تعبیر کر دیا)۔

امام ترمذیؒ کا اعتراض نمبرا: امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ اعتراض کہ اس سند میں شعبہ نے عن حجر ابی العنبس ذکر کیا ہے حالانکہ صحیح حجر ابن العنبس ہے؟

جواب: اس کا جواب صاحب الجوہر النقی [2] نے دیا ہے کہ حجر کے بیٹے کا نام اور ان کے باپ کا نام [3] ایک ہی تھا (دادا پوتے دونوں ہی کا نام عنبس تھا) پس یہ حجر ابو العنبس بھی ہوئے اور ابن العنبس بھی اور اس کی تفصیل علم اسماء الرجال میں ہے جہاں پر دیکھا جا سکتا ہے اور بہت سے راویوں کے ناموں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کا دوسرا اعتراض: کہ شعبہ نے سند میں علقمہ بن وائل کا اضافہ کیا ہے (حالانکہ یہاں علقمہ کی زیادتی غلط ہے)۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلت علم کی وجہ سے پیدا ہوا کیونکہ حجر راوی جس طرح اس روایت کو وائل سے

---

[1] یعنی ایک ایسا محمل تلاش کیا جائے جس کے اختیار کرنے کی صورت میں تعارض نہ رہے وہ یہ ہے کہ لفظِ آمین کو کھینچا جائے مگر سری آواز کے ساتھ۔

[2] میں نے یہ جواب الجوہر النقی میں نہیں پایا لیکن یہ جواب بہت عمدہ ہے محققین کی ایک جماعت نے اس کو اختیار کیا ہے۔ نیز ثوری کی حدیث میں ابو العنبس کا لفظ موجود ہے جس کا بیہقی نے باوجود متعصب ہونے کے اقرار کیا ہے لہٰذا شعبہ پر کوئی اعتراض نہیں (کیونکہ ثوری بھی تو عن حجر ابی العنبس ذکر کرتے ہیں) امام ابوداؤد، دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ سفیان ثوری سے عن حجر ابی العنبس کو نقل کیا ہے۔

[3] حافظ نے اپنی تہذیب میں اس کی تصریح کی ہے (کہ دادا اور پوتے کا ایک ہی نام ہے) اور ابن حبان سے نقل کیا ہے کہ حجر ابن العنبس ابو العنبس ہی ہیں اس کی تفصیل حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ نے بذل میں کی ہے۔ رہا یہ اشکال کہ ان کی کنیت تو ابو السکن ہے تو اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو اس سے ابو العنبس کنیت ہونے کی نفی نہیں کیونکہ کتنے ہی راوی ہیں کہ انکی دو دو کنیتیں ہوتی ہیں۔

نقل کر رہے ہیں جو کہ علقمہ کے والد ہیں اسی طرح وہ اس روایت کو علقمہ بن وائل[1] سے بھی نقل کر رہے ہیں لہٰذا کبھی انہوں نے واسطہ کو ذکر کیا اور کبھی نہیں۔

(وخفض بها صوته انما هو مدبها صوته: یہ تیسرا اعتراض ہے) آپ کو اس اعتراض کا وزن گذشتہ کلام سے سمجھ میں آ گیا کہ سفیان جن کی روایت پر محدثین نے بھروسہ کیا ہے اور شعبہ کو غلطیوں کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ شعبہ سفیان کی مخالفت کر رہے ہیں اس سب کے باوجود سفیان راوی خود ہی اس روایت میں اس سند کے ساتھ خفض بها صوته کا لفظ ذکر کر رہے ہیں جیسا کہ شرح وقایہ[2] کے مترجم نے مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے۔

چوتھا اعتراض: یہاں پر ایک چوتھا اعتراض ہے کہ شعبہ کی روایت میں ایک اور غلطی بھی ہے اس کو ابن ہمام نے نقل کیا ہے پس وہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی ''العلل الکبیر'' سے استدلال کرتے ہیں کہ علقمہ کا لقاء اپنے والد وائل سے نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دادا کی وفات کے چھ مہینے بعد پیدا ہوئے۔ یہ یا تو امام ترمذی رحمہ اللہ کی غلطی ہے یا ابن ہمام کی کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع ترمذی کی کتاب الحدود (ص ۲۶۹) میں تصریح کی ہے کہ علقمہ کو اپنے والد وائل سے شرف تلمذ[3] حاصل ہے

---

[1] پس بیہقی امام ترمذی رحمہ اللہ پر رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انکا یہ قول کہ اس میں علقمہ کی زیادتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ شعبہ نے اپنی روایت میں یہ بیان کیا ہے کہ حجر نے اس حدیث کو علقمہ سے بھی سنا ہے اور علقمہ کے واسطے کے بغیر وائل سے بھی سنا ہے۔ انتہی۔ بذل میں طیالسی سے ان کی سند کے ساتھ منقول ہے کہ حجر راوی کہتے ہیں کہ میں نے علقمہ سے سنا کہ وہ وائل سے نقل کر رہے ہیں اور حجر نے کہا میں نے خود وائل سے بھی سنا۔ الحدیث۔ ابو مسلم نے اپنی سند کے ساتھ عن حجر عن علقمہ عن وائل نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ علقمہ نے اس حدیث کو وائل سے سنا ہے۔ انتہی

[2] پس وہ ابن ابی شیبہ سے نقل کرتے ہیں حدثنا وكيع ثنا سفيان عن سلمة بن كهيل عن حجر بن العنبس عن وائل بن حجر رضي الله عنه قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم قَرَأَ وَلَا الضالين فقال آمين وخفض بها صوته انتهى۔ قلت: لیکن ہمارے سامنے جو مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ ہے اس میں اس سند کے بعد فقال آمین یمد بھا صوتہ کے الفاظ ہیں لہٰذا صحیح نسخہ کو دیکھا جائے۔

[3] نسائی کے حاشیہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ علقمہ کا اپنے والد سے سماع ہے اور جن صاحبزادے کا سماع نہیں ہے وہ عبد الجبار ہیں اسی طرح امام ترمذی رحمہ اللہ نے بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے جس کو میرک نے نقل کیا ہے حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ نے بذل میں اس کو خوب ثابت کیا ہے۔ (از مترجم: کتاب الحدود: باب ما جاء في المراة اذا استكرهت على الزنا ص ۲۶۹ پر امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں سمعت محمدا يقول عبدالجبار بن وائل بن حجر لم يسمع من ابيه وَلَا اَدْرَكَهٗ۔ يقال انه وُلِدَ بَعْدَ مَوْتِ اَبِيْهِ بِاَشْهُرٍ۔ اس کے بعد اگلی حدیث کے آخر میں لکھتے ہیں وعلقمة بن وائل بن حجر سمع من ابيه وهو اكبر من عبدالجبار بن وائل، وعبدالجبار بن وائل لم يسمع من ابيه)

اور والد صاحب کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے ان کے ان کے بھائی عبدالجبار تھے (نہ علقمہ) اور یہ علقمہ کا وائل سے عدم لقاء کس طرح ممکن ہے۔

وائل کی اپنے والد سے سماع پر واضح قرائن: حالانکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں علقمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں سمعت وائلا اسی طرح قزوینی (ابن ماجہ) اور نسائی نے علقمہ کی روایت کو وائل سے حدثنا کی تصریح کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تعارض احادیث کی صورت میں رجوع الی القرآن: اس سب سے معلوم ہوا کہ دونوں مذہبوں کی روایات صحیح ہیں ان میں سے کسی میں نقص نہیں ہے اگر کوئی نقص ہے تو اسی کے مثل یا اس سے مضبوط روایت اس کو راجح کر دیتی ہے لہٰذا احادیث کے علاوہ کسی اور دلیل کی طرف رجوع کیا جانا ضروری ہے کیونکہ کثرت طرق کا اعتبار نہیں ہے پس ہم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "ادعوا ربکم تضرعا و خفیة" میں غور کیا تو اس نے ہمارے مذہب کو ترجیح دی کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آمین ایک دعا ہے جس کے معنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما جیسا کہ مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "قال قد اجیبت دعوتکما" میں تصریح کی ہے کہ وہاں پر خطاب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے ہے۔ دعا کرنے والے موسیٰ علیہ السلام تھے اور ہارون علیہ السلام ان کی دعا پر آمین کہنے والے تھے (تو آمین کہنے والے کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعا کرنے والا فرمایا ہے۔ از مترجم) ان سب دلائل کے باوجود اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آمین بالجہر ثابت بھی ہو جائے تو یہ بیان جواز اور ابتداء اسلام پر محمول ہوگا۔

شافعیہ کا ایک اور استدلال اور اس کا جواب: اگلے باب میں اذا امن الامام فامنوا والی روایت امام کے جہراً آمین کہنے پر نص نہیں کیونکہ مقتدی کا امام کی آمین کو جاننا امام کے جہراً کہنے پر محمول نہیں بلکہ امام کے سورہ فاتحہ ختم ہونے سے مقتدی کو امام کا آمین کہنا معلوم ہو جائیگا اور یہی امام اور مقتدی کے حال کے لائق بھی ہے تا کہ آپس میں منازعہ لازم نہ آئے کیونکہ آہستہ آمین کہنے میں کوئی جھگڑا لازم نہیں آتا اور تکبیرات انتقال کا یہ حکم نہیں کہ ان کو سرا کہا جائے کیونکہ ان سے مقصود لوگوں کو ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کی خبر دینا ہے جو کہ سراً کہنے میں حاصل نہیں ہوتا۔

باب ماجاء فی فضلِ التّامین

باب ہے آمین کہنے کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا ابو کُرَیب محمدُ بن العلاء حَدَّثَنَا زیدُ بن حُبَابٍ حدثنی مالك بن انس حَدَّثَنَا الزُّهریُّ عن سعیدِ بن المُسیَّبِ وابی سلمة عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: اِذا

اَمَّنَ الامَامُ فَاَمِّنُوا، فَاِنَّہُ مَنْ وَافَقَ تأمینُہُ تامینَ الملائکۃ غُفِرَلہ ما تقدَّمَ مِن ذَنبِہٖ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی ہریرۃ حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے تو اس کے سب پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

باب ماجاء فی السَّکتتین فی الصلاۃ

باب ہے ہر رکعت میں دو سکتوں کے بیان میں

☆حدثنا ابو موسی محمد بن المُثَنّٰی حَدَّثَنَا عبدُ الاعلٰی عن سعیدٍ عن قتادۃَ عن الحسنِ عن سَمُرَۃَ قال: سکْتَتَانِ حَفِظْتُهُمَا عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فَاَنْکَرَ ذٰلك عِمرانُ بنُ حُصَیْنٍ وقالَ: حَفِظْنَا سکْتَۃً۔ فکتبنا الی اُبَی بنِ کَعْبٍ بالمَدینۃِ، فَکَتَبَ اُبَیٌّ:ان حفظ سمرۃ قال سعید فقلنا لقتادۃ ماھاتان السکتتان قال: اذا دَخَلَ فی صَلاتِہ، واِذا فَرَغَ من القِراءَۃِ، ثُمَّ قال بعدَ ذلك: واذا قَرَاَ وَلَا الضَّالِّینَ قال: وکان یُعجِبُہُ اذا فَرَغ من القراءۃ ان یَسکُتَ حتی یَترَادَّ الیہ نَفَسُہُ۔

قال : وفی الباب عن ابی ہریرۃ۔ قال ابو عیسی: حدیث سَمُرَۃَ حدیث حسن۔ وھو قولُ غیر واحد من اھلِ العلم: یَستَحِبُّونَ للاِءِ مام ان یسکتَ بعدَ مایَفْتَتِحُ الصلاۃَ، وبعدَ الفراغ مِن القراءۃِ۔ وبہ یقول احمدُ، واسحٰقُ، واصحابُنَا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سکتے یاد ہیں (یعنی آپ ہر رکعت میں دو جگہ خاموشی اختیار فرماتے ایک تکبیر تحریمہ کے بعد دوسرے فاتحہ کے بعد) حضرت عمران بن حصین نے انکار کیا کہ ہمیں تو ایک ہی سکتہ یاد ہے۔ (یعنی تکبیر تحریمہ کے بعد والا) پھر ہم دونوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو

مدینہ خط لکھا (استصوابِ رائے کیلئے) تو انہوں نے (جواب) لکھا کہ سمرہ کو ٹھیک یاد ہے۔ سعید فرماتے ہیں کہ ہم نے قتادہ سے پوچھا کہ وہ دو سکتے کون سے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب نماز میں داخل ہو اور جب قراءت سے فارغ ہو اور اس کے بعد (دوسرے موقع پر) فرمایا اور جب ولا الضالین پڑھے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قراءت سے فارغ ہونے کے بعد سکتہ کرنا پسند تھا تاکہ سانس بحال ہو جائے۔

باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سمرہ کی حدیث حسن ہے اور بے شمار اہل علم کا یہی قول ہے وہ پسند کرتے ہیں کہ امام نماز شروع کرنے کے بعد سکتہ کرے اور قراءت پوری کرنے کے بعد سکتہ کرے اور یہی امام احمد و اسحٰق اور ہمارے علماء شافعیہ رحمہم اللہ کی رائے ہے۔

﴿تشریح﴾

سماع الحسن عن سمرة وعن عمران بن حصين الخ: (عن الحسن عن سمرة قال سكتتان حفظتهما عن رسول الله صلى الله عليه وسلم) اس سے حسن کا لقاء سمرہ[1] اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے ثابت ہو رہا ہے جیسا کہ کتاب میں غور کرنے سے ظاہر ہے کیونکہ "فكتبنا" کے قائل حسن اور سمرۃ ہیں اور انکے شاگرد ہیں نہ کے صرف سمرہ ورنہ وہ جواباً حفظت کہتے لیکن مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا متکلم سمرہ اور ان کے شاگرد ہیں پھر بعد میں سمرہ رضی اللہ عنہ نے اس قصہ کو حسن سے نقل کیا تھا لیکن ہمارا مقصود تو پھر بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ حسن کی سمرہ سے ملاقات ثابت ہے۔

(سکتتان) اس میں ایک تو ثناء پڑھنے کیلئے سکتہ کرنا ہے اور دوسرا سکتہ آمین سراً کہنے کیلئے ہے۔

حدیث میں اذا قرأ و لا الضالین یہ اذا فرغ من القراءة کا بیان[2] ہے۔ تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ یہ دوسرا سکتہ سورہ کی

---

[1] امام ابوداؤد نے حسن کی سمرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کو بالجزم نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بخاری سے انکی ملاقات کو ثابت کیا ہے جیسا کہ بذل ہے۔

[2] **نماز کے شروع کرنے کے بعد قبل القرأة سکتہ کرنا متفق علیہ ہے۔ دوسرے سکتہ کی تعیین میں اختلاف ہے:** بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ سکتہ ثانیہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ کے بعد رکوع سے پہلے ہوگا کیونکہ اس پر تو اتفاق ہے کہ سکتہ اولیٰ نماز کے شروع میں ہوگا لیکن دوسرے سکتہ کے متعلق روایات میں اضطراب ہے کہ وہ سورہ فاتحہ کے بعد ہے یا سورۃ کے بعد اس کی تفصیل بذل المجہود میں ملاحظہ ہو۔

قراۃ کے بعد ہے (بلکہ یہ سکتہ قراۃ فاتحہ کے بعد ہے) اور یہ دونوں سکتے جو حدیث میں مذکور ہیں حنفیہ کے ہاں اس سے مراد ثناء اور آمین کیلئے خاموشی اختیار کرنا ہے اور اس آہستہ پڑھنے کو سکتہ سے تعبیر کیا گیا ہے سامع کے اعتبار سے نہ کہ پڑھنے والے کے اعتبار سے کیونکہ پڑھنے والا تو خاموش نہیں رہتا۔

باب ماجاء فی وضعِ الیمین علی الشّمالِ فی الصلاۃ

باب ہے نماز میں (دورانِ قیام) داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر باندھنے کے بیان میں

☆حدثنا قتیبة اخبرنَا ابو الاَحْوَصِ عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ عن قبِیصَةَ بنِ هُلْبٍ عن ابیهِ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یَؤُمُّنَا فَیَاْخُذُ شِمَالَهٗ بِیمینِهٖ۔

قال: وفی الباب عن وَائِلِ بنِ حُجْرٍ، وغُطَیْفِ بنِ الحٰرِثِ، وابنِ عباسٍ، وابنِ مسعودٍ، وسهلِ بنِ سعدٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث هُلْبٍ حدیث حسن۔ والعملُ علی هٰذا عند اهل العلم من اصحابِ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم والتابعین ومَن بعدَهم: یَرَوْنَ اَنْ یَضَعَ الرجل یمینَهٗ علی شِماله فی الصلاۃ۔ ورای بعضُهم ان یَضَعَهُمَا فوقَ السُّرَّةِ، ورَاَی بعضهم ان یَضَعَهُمَا تحتَ السُّرَةِ و کلُّ ذٰلك واسعٌ عندهم: واسمُ هُلْبٍ: یَزِیدُ بنُ قُنَافَةَ الطَّائیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

قبیصہ بن ھلب اپنے والد ھلب سے روایت کرتے ہیں ھلب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری امامت فرماتے تو دائیں ہاتھ سے اپنا بایاں ہاتھ پکڑا کرتے تھے۔

باب میں وائل بن حجر، غطیف بن الحارث، ابن عباس، ابن مسعود، اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ھلب حدیث حسن ہے اور اسی پر تمام اہل علم صحابہ تابعین اور ان کے بعد علماء حضرات کا عمل ہے ان کی رائے یہ ہے کہ آدمی نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے گا۔ اور بعض علماء کی رائے ہے کہ ہاتھ کو ناف سے اوپر رکھے گا اور بعض کی رائے ناف سے نیچے رکھنے کی ہے اور اس مسئلے میں ان علماء کے نزدیک گنجائش ہے اور ھلب کا نام یزید بن قنافہ الطائی ہے۔

تشریح

ارسال کے قائل امام مالکؒ پر رد: یہ حدیث امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے خلاف حجت ہے جو کہ ارسال کے قائل ہیں۔

مسئلہ ثانیہ: ہاتھ کو کس طرح رکھا جائیگا اس کی کیفیت فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور ناف کے اوپر[2] ہاتھ باندھنا یا اس وجہ سے ہے کہ اس میں تعظیم زیادہ ہے اور احادیث ناف کے اوپر اور نیچے دونوں طرح ہاتھ باندھنے کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

باب ماجاء فی التکبیر عند الرکوع والسجود

باب ہے رکوع اور سجدہ کرتے وقت تکبیر کہنے کے بیان میں

☆حدثنا قتیبة اخبرنا ابو الاحوَصِ عن ابی اسحٰقَ عن عبد الرحمٰن بن الاَسْوَدِ عن عَلْقَمَةَ والْاَسْوَدِ عن عبد اللّٰہ بن مسعودٍ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُکَبِّرُ فی کُلِّ خَفْضٍ ورَفْعٍ، وقیَامٍ وقُعُودٍ، وابو بکر وعُمَرُ۔

قال : وفی الباب عن ابی ھریرۃَ ، وانسٍ، وابنِ عمرَ ، وابی مالكٍ الاَشْعَرِیِّ، وابی موسی ، وعِمْرَانَ

---

[1] اور وہ کیفیت یہ ہے کہ چھوٹی انگلی اور انگوٹھے سے گٹے کے اوپر حلقہ بنایا جائے اور باقی تین انگلیوں کو کلائی پر پھیلا دیا جائے اور ہتھیلی سے متصل بیچ میں ہتھیلی آ جائے تاکہ وہ احادیث جن میں ہاتھ کو ہاتھ سے پکڑنے کا ذکر ہے اور جن احادیث میں ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنے کا ذکر ہے ان سب میں تطبیق ہو جائے۔

[2] اصل مخطوطہ میں یہی عبارت ہے مقصود یہ ہے کہ احادیث ناف کے اوپر اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے پر دلالت کرتی ہیں شوافع نے ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کو اختیار کیا ہے اور حنفیہ نے ناف کے۔ نیچے ائمہ کے اختلاف کی وضاحت اس مسئلہ میں جیسا کہ اوجز میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام مالک کی چار روایتوں میں سے راجح روایت ارسال کی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ کی تین روایتوں میں سے راجح روایت ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی ہے جو کہ حنفیہ کا مذہب ہے۔ حنفیہ سے صرف یہی ایک روایت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کی تین روایتوں میں سے راجح روایت ناف کے اوپر سینے کے نیچے ہاتھ باندھنے کی ہے دوسری روایت ان کی حنفیہ کی طرح ہے اور تیسری روایت یہ ہے کہ سینے کے اوپر ہاتھ باندھے جائیں۔ پس سینے کے اوپر ہاتھ باندھنا امام شافعی کی تین روایتوں میں سے ایک مرجوح روایت ہے لہٰذا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا قول زیادہ راجح ہے کیونکہ ائمہ کا اس قول پر دوسری روایتوں کے مقابلہ میں زیادہ توافق ہے۔

بنِ حُصَيْنٍ ، ووَائِلِ بنِ حُجْرٍ، وابنِ عباسٍ۔

قال ابو عيسى: حديث عبد الله بن مسعودٍ حديث حسن صحيح۔ والعملُ عليه عند اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ، منهم : ابو بكر، وعمرُ، وعثمانُ، وعليٌّ، وغيرُهم، ومَنْ بعدَهم من التابعين، وعليه عامّةُ الفقهاء والعلماءِ

☆ حدثنا علي بن منير قال سمعت علي بن الحسن قال: اخبرنا عبد الله بن المبارك عن ابنِ جُرَيْجٍ عن الزُّهْرِيِّ عن ابي بكر بن عبد الرحمٰن عن ابي هريرة: انَّ النبي صلى الله عليه وسلم كان يُكَبِّرُ وهُوَ يَهْوِي۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيح۔ وهو قولُ اهل العلم من اصحاب صلى الله عليه وسلم ومَن بعدهم من التابعين ، قالوا: يكبِّرُ الرجل وهو يَهْوِي للركوع والسجودِ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جھکنے اور اٹھنے میں اور کھڑے ہونے اور بیٹھنے میں تکبیر کہا کرتے تھے اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی معمول تھا۔

اور باب میں ابو ہریرہ، انس، ابن عمر، ابو مالک اشعری، ابوموسیٰ، عمران بن حصین، وائل بن حجر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن مسعود کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر تمام صحابہ کرام (جن میں ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں) اور ان کے بعد آنے والے تابعین کا اور عام علماء وفقہاء کا عمل ہے۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجود کیلئے جھکتے ہوئے تکبیر فرمایا کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور یہی صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے اہل علم کا قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ آدمی تکبیر کہے گا جس وقت کہ وہ رکوع اور سجدہ کیلئے جھک رہا ہو۔

﴿تشریح﴾

(کان یکبر فی کل خفض ورفع) یہ تغلیباً کہہ دیا (کیونکہ رکوع سے اٹھکر تو تسمیع ہوتی ہے نہ کہ تکبیر۔ از مترجم) اس باب کا مقصد رد کرنا ہے مروانیوں پر جو تکبیرات انتقال نہیں کہتے تھے انہیں یہ دھوکہ ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آہستہ

آواز سے کہتے تھے تو انہوں نے سمجھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تکبیر نہیں کہتے۔

(ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یکبر وھو یھوی) واو حالیہ ہے اس سے اشارہ ہے کہ جس وقت جھکنے[1] لگیں اس وقت تکبیر شروع کر دیں پس ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کے وقت تکبیر کہنا سنت ہے نہ کہ منتقل ہونے سے پہلے تکبیر کہی جائے اور نہ ہی اس کے بعد۔

باب ماجاء فی رَفْعِ الْیَدَیْنِ عِنْدَ الرُّکوع

باب ہے رکوع کرتے وقت رفع یدین کے بارے میں

☆حدثنا قتیبۃ وابن ابی عُمَرَ قالا: حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینۃَ عن الزُّھْرِیِّ عن سالمٍ عن ابیہ قال: رایتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا افْتَتَحَ الصلاۃ یرفُع یدیہ حتّٰی یُحَاذِیَ مَنْکِبَیْہِ، واذا رکعَ، واذا رفع راسَہ من الرکوع وزاد ابنُ ابی عمر فی حدیثہ: وکان لایرفعُ بَیْنَ السجدتین۔

☆ قال ابو عیسی: حَدَّثَنَا الفضلُ بنُ الصَّبَّاح البغدادیُّ حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینۃ حَدَّثَنَا الزھریُّ بھذا الاسناد، نحوَ حدیثِ ابْن ابی عمر۔ قال: وفی الباب عن عمرَ، وعلی، ووائلِ بن حُجْرٍ، ومالکِ بن الحُوَیْرِثِ، وانَسٍ، وابی ھریرۃَ وابی حُمَیْدٍ وابی اُسَیْدٍ، وسَھْلِ بن سعدٍ، ومحمدِ بن مَسْلَمَۃَ، وابی قتادَۃَ، وابی موسی الاَشْعَرِیِّ، وجابرٍ، وعُمَیْرِ اللَّیْثِیِّ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابنِ عمرَ حدیث حسن صحیح۔ وبھذا یقولُ بعضُ اھل العلم مِن اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم منھم ابن عمرَ، وجَابِرُ بن عبد اللّٰہ، وابو ھریرۃ، وانس، وابنُ عباسٍ، وعبد اللّٰہ بنُ الزبیرِ، وغیرُھم ومِن التابعین: الحسنُ البصریُّ، وعطاء، وطاوس ومجاھِدٌ، ونافعٌ، وسالمُ بنُ عبد اللّٰہِ وسعیدُ بنُ جُبَیْرٍ، وغیرُھم۔ وبہ یقولُ عبدُ اللّٰہ بنُ المبارکِ، والشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰق۔

---

[1] پس درمختار میں ہے کہ رکوع کیلئے جھکتے ہوئے تکبیر کہنی چاہیئے۔علامہ شامی فرماتے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تکبیر میں سنت یہ ہے کہ جھکتے ہوئے اس کی ابتداء کرنی چاہیئے اور کمر کے سیدھے ہونے سے پہلے اس کو ختم ہو جانا چاہیئے، ایک قول یہ ہے کہ کھڑے ہونے کی حالت میں تکبیر کہنی چاہیئے۔پہلا قول صحیح ہے کما فی المضمرات وتمامہ فی القہستانی

وقال عبد اللّٰهِ بن المبارك : قد ثَبَتَ حديثُ مَنْ يَرْفَعُ يديه، وذَكَرَ حديثَ الزهريِّ عن سالمٍ عن ابيه، ولم يَثْبُتْ حديثُ ابنِ مسعودٍ: ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم لم یرفع یدیه الا فی اول مرّةٍ۔

☆حدثنا بذلك احمدُ بن عَبْدَةَ الآمُلِيُّ حَدَّثَنَا وَهْبُ بن زَمْعَةَ عن سفيانَ بنِ عبد الملكِ عن عبد اللّٰه بنِ المبارك۔

قال: وحدثنا يحيى بن موسى قال: حَدَّثَنَا اسمعيلُ بن ابی اُوَيْسٍ قال: كان مالكُ بن انسٍ يَرَى رفعَ اليدين فی الصلاة۔ وقال يحيى: وحدثنا عبد الرزاق قال: كان مَعْمَرٌ يَرَى رفعَ اليد ين فی الصلاةَ ۔ وسمعتُ الجارُودَ بنَ معاذٍ يقول: كانَ سفيانُ بن عُيينةَ بن هرونَ۔

والنُّضُرُ بن شُمَيْلٍ يرفعون ايديَهم اذا فتتحوا الصلاة، واذا ركعوا، واذا رَفَعوا رُؤوسَهم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت سالم اپنے والد (ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع فرماتے تو دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے پھر رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے بھی اسی طرح ہاتھ اٹھاتے اور ابن ابی عمر نے اپنی حدیث میں "وكان لا يرفع من السجدتين (اور دونوں سجدوں کے درمیان ہاتھ نہ اٹھاتے تھے) کے الفاظ زیادہ فرمائے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فضل بن صباح بغدادی سفیان بن عیینہ سے اور وہ زہری سے اسی سند سے ابن ابی عمر کی حدیث کے مثل روایت نقل کرتے ہیں۔

باب میں حضرت عمر، علی، وائل بن حجر، مالک بن الحویرث، انس، ابو ہریرہ، ابوحمید، ابواسید، سہل بن سعد، محمد بن مسلمہ، ابوقتادہ، ابوموسی اشعری، جابر اور عمیر لیثی رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض اہل علم جن میں ابن عمر، جابر بن عبداللہ، ابو ہریرہ، انس، ابن عباس، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ اور تابعین میں سے حسن بصری، عطاء، طاؤس، مجاہد، نافع، سالم بن عبداللہ، سعید بن جبیر رحمہم اللہ اور ائمہ کرام میں سے عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد، امام اسحق رحمہم اللہ ان سب کا یہی قول ہے (یعنی رفع یدین کا)۔

اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ جو شخص رفع یدین کرتا ہے اس کی حدیث ثابت ہے اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے زہری کی حدیث کو بواسطہ سالم ان کے والد سے روایت کیا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ثابت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف پہلی مرتبہ رفع یدین کیا (یعنی صرف تکبیر اولیٰ کے وقت ہاتھ اٹھائے)۔

ہم سے بیان کیا اسی کے مثل احمد بن عبدہ آملی نے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا وہب بن زمعہ نے ان سے سفیان بن عبدالملک نے اور ان سے عبداللہ بن مبارک نے۔

﴿تشریح﴾

رفع الیدین عندالرکوع میں اختلاف اولویت کا ہے: ہمارے اور شوافع کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رفع الیدین اور عدم رفع الیدین دونوں ہی جائز ہیں پس اگر کوئی نمازی تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع الیدین کسی بھی رکن میں نہ کرے تو امام شافعی رحمہ اللہ اس کی نماز کو فاسد نہیں کہتے اور اگر کوئی نمازی رکوع میں بلکہ سجدے میں بھی رفع الیدین کرے تو ہم حنفیہ اس کی نماز کو فاسد نہیں کہتے۔ اختلاف اس میں ہے کہ رفع الیدین کرنا اولیٰ ہے یا نہ کرنا۔ حنفیہ نے عدم رفع کو اور جمہور نے رفع الیدین کو اختیار کیا ہے۔ اور اختلاف رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین میں ہے البتہ تکبیر افتتاح کے وقت رفع الیدین کا ہم بھی انکار نہیں کرتے، اسی طرح دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین کرنے کو شوافع بھی نہیں کہتے۔

احادیث رفع الیدین منسوخ ہیں: پس ہم یہ کہتے ہیں کہ جس روایت کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب میں ذکر کیا ہے اس سے مخالفین کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ یہ روایت تو اس وقت ان کے لئے فائدہ مند ہوتی اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع الیدین کے ثبوت کا انکار کرتے حالانکہ بات اس طرح نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ رفع الیدین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک عمل برقرار نہیں رہا (بلکہ اس سے پہلے ہی منسوخ ہو چکا تھا) پس اگر مخالفین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری ادا کردہ نماز میں رفع الیدین ثابت کر دیں تو ہمیں بسر وچشم قبول ہے اور ہم یہ کہیں گے کہ بغیر رفع الیدین کے نماز ناقص اور عیب دار ہوتی ہے اور جب یہ بات مخالفین ثابت نہیں کر سکتے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ کے مذہب کو تسلیم کرنے میں ہمیں کلام ہے اور عدم رفع الیدین کی روایات کو ترجیح کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ رفع الیدین کو ثابت کرنے والا راوی اپنے کلام کی بناء اس مشاہدہ پر کرتا ہے جو اس نے گذشتہ زمانے میں کیا تھا۔

استصحابِ حال احناف کے نزدیک حجت نہیں ہے: نیز استصحاب حال (یعنی شروع میں رفع یدین کرتے ہونگے

تو وفات تک اس کا ثبوت ہوگا) ہمارے ہاں حجت نہیں ہے خصوصاً جبکہ احادیث اس مسئلہ میں آپس میں متعارض ہیں۔

ابن مسعودؓ سے رفع الیدین عندالرکوع والی حدیث مروی ہے؟ بر سبیل تسلیم اسکا جواب: پس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو لے لیجئے انہوں نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ دکھلاؤں؟ پس اس نماز میں صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا حالانکہ غیر مقلدین کے بقول[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے رفع الیدین کی روایت نقل کی ہے اگر واقعی ابن مسعود رضی اللہ عنہ رفع الیدین کی حدیث کے ناقل ہیں اور جامع ترمذی میں الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر عدم رفع والی نماز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز قرار دے رہے ہیں تو یہ بالکل واضح قرینہ ہے کہ ان کو نسخ والی روایت پہنچ چکی ہے ورنہ ان سے کس طرح یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس سنت کو چھوڑ دیا ہو حالانکہ وہ تصریح کر رہے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ رہا ہوں۔

غیر مقلدین کا کہنا: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو رفع الیدین والی حدیث کا علم نہ ہوسکا، اس پر مفصل رد: اور بعض جہلاء تو یہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو رفع یدین کی حدیث نہیں پہنچی تھی جیسا کہ ان کو تطبیق کے منسوخ ہونے کی روایت نہیں پہنچی تو امام بخاری رحمہ اللہ کی ان سے نقل کردہ روایت (بقولِ خصم) اس قول کو صراحۃ رد کر رہی ہے اور بآواز بلند پکار رہی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو رفع الیدین کی حدیث پہنچی ہے اور رفع الیدین کا منسوخ ہونا بھی پہنچا ہے جبھی تو انہوں نے رفع الیدین کو چھوڑ دیا۔

---

[1] مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے رفع الیدین کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ کی اس حدیث کے ڈھونڈنے میں کامیابی حاصل نہ ہوئی جو اس پر مطلع ہو وہ ہمیں بتائے ہم اس کے شکر گذار ہونگے۔ الارشاد الرضی (حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی دوسری تقریر ترمذی) سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے غیر مقلدین کے اس دعویٰ پر کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بخاری میں رفع الیدین کی روایت ہے اس کا تسلیمی جواب دیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "اور یہ جو بد مذہب اسماعیل کوبلی نے لکھا ہے کہ بخاری میں خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت رفع میں موجود ہے تو یہ نہ سمجھا کہ یہ خود حنفیہ کی موید ہے کہ جب رفع یدین بھی روایت کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں "لم یرفع الا فی اول" تو معلوم ہوا کہ حدیث رفع منسوخ ہوگئی۔ الخ۔ بظاہر اس اسماعیل نامی شخص کو یہ وہم ہوا ہے کہ امام بخاریؒ نے جزء رفع الیدین میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے جس میں قنوت وتر کیلئے رفع کا ذکر ہے۔ نماز میں مطلقاً رفع الیدین کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ اس سے اسماعیل نامی شخص کو وہم ہوا ہے۔ اور اس اسماعیل نامی شخص کے کلام کو دیکھنے کے بعد ہی اس کی وضاحت ہو سکتی ہے جو کہ مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ اس مقام کے تتبع اور تلاش کی ضرورت ہے شاید کہ اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی بات سمجھا دے۔

فضائل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو رفع الیدین کی حدیث نہ پہنچے حالانکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی ہیں (یعنی اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ جملہ امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی سے مناظرہ کے دوران فرمایا تھا اما عبداللہ فعبداللہ۔ از مترجم) نیز ان کا اور ان کی والدہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں اس کثرت سے آنا جانا تھا کہ لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے فرد ہیں، کیا ابن مسعود رضی اللہ عنہ وہی نہیں ہیں جن کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے امیر بناتا تو ابن ام عبد کو امیر بنا دیتا۔ کیا یہ وہی ذات نہیں کہ جن کے متعلق حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، انداز، طور وطریقہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مشابہ صحابی کے بارے میں بتایئے تا کہ ہم ان سے احادیث حاصل کریں تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب زیادہ قریب سیرت، انداز، طور طریق میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز صحابہ کرام جانتے تھے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، اللہ کے ہاں ان سب سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔ الحدیث بلفظ الترمذی۔[1]

پس ان ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق ہمارے اس زمانے کے جہلاء اور پنج قسم کے لوگ اور اس زمانے کے گھٹیا، رذیل ترین لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نماز صحیح طریقہ سے نہیں پڑھتے تھے اور ان کو نماز کا صحیح طریقہ معلوم نہ تھا تو نماز کے علاوہ اور چیزوں کا حال ان کو کیا معلوم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول پر ان کو بدترین سزا دے۔ اور ان کو ان معزز اور برگزیدہ صحابہ سے دور کردے اس دن جس دن ہر نفس اپنے اعمال کو لے کر حاضر ہوگا اور اس وقت قیامت والے دن کے احوال اور ہولناکیوں میں مبتلا ہوگا اور ان کے پاس کیا دلیل ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو تطبیق کی حدیث نہیں پہنچی شاید کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تطبیق اس لئے کی ہو تا کہ ان جیسے جہلاء تطبیق کو حرام نہ سمجھیں۔

غیر مقلدین کا نسخ التطبیق فی الرکوع کے عدم علم پر رفع الیدین کے عدم علم کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے:

غیر مقلدین کا یہ کہنا جس طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو رکوع میں تطبیق کا منسوخ ہونا معلوم نہ ہوا اسی طرح ان کو رفع الیدین

---

[1] اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے مناقب ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ذکر کر کے حسن صحیح کہا ہے۔

کا علم بھی نہ ہوا یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ رفع الیدین کے مسئلہ میں نسخ کی دلیل واضح موجود ہے نہ کے تطبیق کے مسئلہ میں اور وہ اس طرح کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ (بقول خصم) رفع اور عدم رفع دونوں روایتوں کے ناقل ہیں لیکن ان کا عمل[1] عدم رفع پر ہے جبکہ تطبیق کے مسئلہ میں اس طرح نہیں۔

رفع الیدین کی احادیث کے جوابات

مخالفین جس حدیث سے بھی اپنے مقصود پر استدلال کرتے ہیں وہ ہمارے لئے نقصان دہ نہیں اور علماء حنفیہ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں مخالفین اس کا جواب نہیں دے سکتے کیونکہ (حدیثِ باب) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مآلاً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے پہلے اور اس کے بعد رفع الیدین کیا ہے اور یہ بات تو معلوم ہے کہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے پس یہ روایت ہمارے مذہب کے خلاف نہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے جو رفع الیدین کی حدیثیں ذکر کی ہیں[2] ان کا صحیح ہونا تو مسلم ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معمول بہا بھی ہوں، مثال کے

---

[1] ھکذا فی الاصل والصواب فی الرفع وعدمہ ثم عملہ الخ۔

[2] از مترجم: امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں رفع الیدین عندالرکوع کے متعلق دو صحابہ سے احادیث نقل کی ہیں: ۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث، ۲۔ حضرت مالک بن حویرثؓ سے مروی حدیث۔ باب رفع الیدین اذا کبر واذا رکع واذا رفع میں۔ ص ۱۰۲۔ تو حضرت مالک بن حویرثؓ تو قلیل الملازمۃ صحابی ہیں لہٰذا کثیر الملازمۃ صحابہ کی روایت کو انکی روایت پر ترجیح ہوگی۔ رہی حدیث ابن عمرؓ تو بخاری ص ۱۰۲ ہی پر باب رفع الیدین اذا قام من الرکعتین میں امام بخاریؒ نے انہی ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا کہ آپ دو رکعتوں کے بعد بھی رفع الیدین کیا کرتے تھے یہ بھی بخاری کی حدیث ہے اور اس پر شوافع کا عمل نہیں فما ھو جوابکم لھذا الحدیث فھو جوابنا للحدیث الاول۔ نیز امام ابوداؤد نے ص ۱۱۲ پر حضرت وائلؓ سے رفع الیدین عندالرکوع کی حدیث نقل کی ہے اس کا جواب ابراہیم نخعیؒ نے یہ دیا ہے کہ اگر وائلؓ نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع میں جاتے ہوئے رفع الیدین کرتے ہوئے دیکھا ہے تو ابن مسعودؓ نے پچاس مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع میں جاتے ہوئے رفع الیدین کے بغیر دیکھا ہے کیونکہ ابن مسعودؓ صف اول کے نمازی تھے۔ اسلام میں چھٹے نمبر پر مسلمان ہوئے تھے (نصب الرایۃ مع تحقیق الاستاذ عوامۃ جلد اول) نیز امام ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی رفع الیدین کی حدیث نقل کی ہے ص ۱۱۵ ابوداؤد۔ امدادیہ ملتان۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے امام ابوداؤد نے اس کے برعکس باب من لم یذکر الرفع عندالرکوع میں بھی روایت نقل کی ہے ص ۱۱۷: ابوداؤد فتعارضا فتساقطا۔ اس کے بعد عبداللہ بن الزبیر کے رفع الیدین کو امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے جس کو ابن عباسؓ نے سنت قرار دیا ہے تو اسکا جواب بھی واضح ہے کہ ابن الزبیر صحابی صغیر ہیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طور پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدت حیات (عمر مبارک) کے متعلق تین روایتیں ذکر فرمائی ہیں: ا۔ساٹھ سال والی ۲۔پینسٹھ سال والی ۳۔تریسٹھ سال والی، تینوں روایتیں صحیح ہیں لیکن اس سے تینوں روایتوں کا سچا ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ واقع کے مطابق تو ایک ہی روایت ہوگی۔

احناف کے دلائل وجودی ہیں: پس اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ رکوع وغیرہ میں ہاتھ چھوڑنے کو ثابت کرتے ہیں شافعیہ اس کا انکار کرتے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ مثبت نافی پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ ہماری اس تقریر سے یہ اعتراض ختم ہوگیا کہ رفع الیدین ایک وجودی فعل ہے اور عدم رفع الیدین عدمی محض ہے پس وجودی فعل کس طرح منسوخ ہوسکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ رفع الیدین اگرچہ وجودی فعل ہے اور عدم رفع الیدین فعل عدمی ہے لیکن رفع الیدین نہ کرنا عدم محض نہیں ہے بلکہ وہ ایسا عدم ہے جس کو دلائل سے ثابت کیا گیا کہ پس وہ وجودی فعل کی طرح ہے فقہاء اور محدثین کرام نے جن صحابہ کرام کو عدم رفع الیدین کا قائل شمار کیا ہے (جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علی، ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ یہ احناف کے مقتدی اور پیرو ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نسخ والی حدیث پہنچ گئی تھی ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفع الیدین کے متعلق کسی انکار کرنے والے نے انکار کیوں کیا۔ (کبار صحابہ حضرت عمر، علی، ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے اس رفع الیدین کا انکار کیوں کیا۔ معلوم ہوا کہ رفع والی حدیث تھی بعد میں منسوخ ہوگئی) پس منکرین رفع کے رفع الیدین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے (تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ حدیث رفع الیدین منسوخ ہے) پس جو صحابہ کرام عدم رفع کے قائل یا اس کے راوی ہیں وہ ایک امر زائد کو ثابت کررہے ہیں کیونکہ سب صحابہ رفع الیدین کے ثبوت پر متفق تھے پھر اختلاف اس میں تھا کہ رفع الیدین باقی رہا یا منسوخ ہوگیا پس جنھوں نے رفع الیدین کے منسوخ ہونے کو ثابت کیا انہوں نے اس بنیاد پر امر زائد کو ثابت کیا لہذا ان کا قول قابل قبول ہوگا۔ جیسا کہ یہ امر مسلم ہے (کہ مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے)۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت اسماءؓ کے یہاں ہجرت الی المدینہ کے بعد پیدا ہونے والے بچہ کا نام عبداللہ رکھا گیا تھا کـــان اول مولود وُلد فی المدینہ۔ تو اس صغیر صحابی کے مقابلے میں کبار صحابہ کی روایت راجح ہوگی خاصکر جب کہ عبداللہ بن الزبیر نے جمہور کے برخلاف آمین بالجہر اور بسملہ بالجہر اور عیدین میں اذان واقامت جیسے مسائل اختیار کرکے کبار صحابہ سے تفرد اختیار کیا ہوا تھا۔ اس موقع پر نصب الرایۃ ص ۳۹۷ مع التحقیق استاذ عوامہ طبع موسسۃ الریان جدہ۔ ابن مسعودؓ پر اعتراضات۔ نمبر ۱: وہ معوذتین بھول گئے تھے نمبر ۲۔ تطبیق بھول گئے تھے، نمبر ۳۔ قیام الاثنین خلف الامام وغیرہ بھول گئے۔ ان تمام اعتراضات کے تفصیلی جواب نصب الرایۃ کے حاشیہ میں شیخ محمد عوامہ کی تحقیق میں قابل مطالعہ ہیں۔

۱

رفع بین السجدتین کا جو حکم ہے وہی حکم رفع الیدین عند الرکوع کا بھی ہے: حنفیہ اور شافعیہ اس پر متفق ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان رفع الیدین بالاتفاق منسوخ ہے۔ مخالفین یہ کہتے ہیں کہ دونوں سجدوں کے درمیان رفع الیدین والی حدیث ہی ضعیف ہے تو یہ بات صحیح نہیں کیونکہ طاؤس کے صاحبزادے دونوں سجدوں کے درمیان رفع الیدین کرتے تھے اور اس کو اپنے والد طاؤس کی طرف منسوب کرتے تھے کہ وہ بھی رفع الیدین بین السجدتین کرتے تھے پس اس میں کیا بعد ہے کہ جس طرح طاؤس[1] اور ان کے صاحبزادے کو رفع الیدین بین السجدتین کے نسخ کا علم نہیں ہوا حالانکہ اس کا منسوخ ہونا مسلم ہے تو اسی طرح باقی دو رفع الیدین کا منسوخ ہونا بھی ان صحابہ کو نہیں پہنچا تھا جن صحابہ کی روایات اور ان کے عمل سے آپ نے استدلال کیا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں کتنے ایسے افعال تھے جو وہ کرتے تھے اور ان کو اس کا منسوخ ہونا نہیں پہنچا تھا پھر جب ان کے ساتھیوں میں سے ایک چھوٹا صحابی اس کا منسوخ ہونا بتاتا ہے تو وہ اس میں تتبع اور تفتیش کے بعد اپنے سے کم عمر صحابی کی بات مان کر اس سنت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ (قال عبد الله بن مبارك ثبت حديث من يرفع و ذكر حديث الزهري عن سالم عن ابيه......ولم يثبت حديث ابن مسعود رضي الله عنه ان النبي صلى الله عليه وسلم لم يرفع الا في اول مرة)۔

ابن مبارکؒ کا اعتراض اور اسکا جواب: رہا ابن مبارک کا یہ اعتراض کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت[2]

---

[1] اور ان کے علاوہ دوسرے راویوں کو بھی یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی، علامہ نیموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مذہب کو بعض صحابہ نے اور تابعین میں سے بعض اہل علم نے اختیار کیا ہے کہ مابین السجدتین بھی رفع الیدین ہوگا جمہور اس کے قائل نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے حسن اور ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ وہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع الیدین کرتے تھے نیز انہوں نے نافع اور طاؤس سے بھی سجدتین کے درمیان رفع الیدین نقل کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی جزء رفع الیدین میں ربیع سے منقول ہے کہ میں نے حسن، مجاہد، عطاء، طاؤس، قیس بن سعد، حسن بن مسلم رحمہم اللہ تعالیٰ کو رکوع اور سجدے میں جاتے ہوئے رفع الیدین کرتے ہوئے دیکھا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ یہ فعل سنت ہے۔ انتہی

[2] **ابن مبارک کے اعتراض کا تفصیلی جواب:** امام نیموی رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دو حدیثیں مروی ہیں: ۱۔ یہ والی حدیث جو انکا اپنا فعل ہے۔ ۲۔ حدیث مرفوع ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پہلی مرتبہ رفع الیدین کرتے تھے تو ابن مبارکؒ نے دوسری حدیث مرفوع کا انکار کیا ہے نہ کہ پہلی کا، ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ ابن مبارکؒ کے نزدیک حدیث کا ثابت نہ ہونا حدیث کے قابل استدلال ہونے سے مانع نہیں کیونکہ اس حدیث ضعیف ہونے کا مدار عاصم بن کلیب راوی پر ہے اور ابن معین نے انکی توثیق کی ہے۔

نہیں تو ابن مبارکؒ کا یہ قول کسی دلیل اور ٹھوس بنیاد پر مبنی نہیں بلکہ یہ صرف اٹکل اور اندازہ ہے کوئی یقینی بات نہیں کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ جرح مبہم ناقابلِ قبول ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا آگے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن کہنے سے معلوم ہو رہا ہے۔

عاصم بن کلیب ثقہ ہے یا ضعیف: نیز ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے تمام راوی صحیح حدیث کے راویوں میں سے ہیں۔ سوائے عاصم ابن کلیب کے جن پر بعضوں نے کلام کیا ہے لیکن اکثر ائمہ نے ان کے ضعیف راوی ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور یہ ضعیف ہوں بھی کیسے حالانکہ خود امام بخاری نے ان سے جو جزء القرأۃ میں[1] اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور باقی چار ائمہ حدیث نے اپنی سُنن میں ان سے روایت کو نقل کیا ہے۔ پس اگر ہم اعلیٰ درجہ کو چھوڑ دیں تب بھی ان کی حدیث کو حسن کہیں گے ورنہ ان کی حدیث بلا کسی تردد کے اور بغیر اٹکل کے بالکل صحیح حدیث ہے، اور ابن عدی نے اپنی ''الکامل''[2] میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

فما زالت تلک صلوته حتی لقی الله کا جواب: ان حضرات کی مضبوط دلیل رفع الیدین پر ابن عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع الیدین کے متعلق حدیث نقل کی ہے اس میں آخر میں[3] یہ جملہ "ما زالت تلك صلوته حتى مات" (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک یہ رفع الیدین والی نماز برقرار رہی)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو اگر صحیح مانا جائے تو یہ استصحاب حال پر مبنی ہوگا جس کی دلیل وہ روایت ہے جس کو مجاہد[4] نے نقل کیا ہے۔

---

[1] نیز امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں بھی ان سے تعلیقاً حدیث نقل کی ہے۔ نسائی اور ابن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ عاصم بن کلیب کوفہ والوں میں افضل ترین لوگوں میں سے تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی ہیں جنکی روایت سے استدلال کیا جا سکتا ہے اسی طرح اصول حدیث کے بہت سے ائمہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

[2] اور ابن حزم نے اپنی ''محلی'' میں اور بہت سے ائمہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ اوجز اور آثار السنن میں اس کی تفصیل ہے

[3] **یہ زیادتی موضوع ہے:** امام نیموی نے ثابت کیا ہے کہ حدیث میں یہ زیادتی ضعیف بلکہ موضوع ہے نیز ہم بیہقی کے کسی نسخہ میں نہ مطبوعہ نہ غیر مطبوعہ میں اس زیادتی کو نہیں پاتے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ یہ نقل کرنے والے کا وہم ہے اس طرح کہ یہ زیادتی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں نماز کی تکبیر کے متعلق تھی (فما زالت تلك صلوته تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز پڑھنے پر آپ کا دوام تھا) تو بعض علماء نے غلطی سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں رفع الیدین کے متعلق اس جملہ کو نقل کر دیا۔

[4] امام نیموی نے مجاہد کے اثر کے صحیح ہونے کو مفصلاً ثابت کیا ہے فارجع الیہ۔

جیسا کہ عینیؒ نے ان سے صحیح بخاری کی شرح میں نقل کیا ہے کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک زمانے تک خدمت کرتا رہا میں نے انہیں رفع الیدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا پس اگر رفع الیدین ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک غیر منسوخ حکم تھا تو وہ اس کو نہ چھوڑتے۔ کیا خصم کو نہیں معلوم کہ انکی یہ دلیل تو ہمارے مذہب کیلئے مؤید[2] ہے۔

مذہب حنفی مبنی براحتیاط ہے: نیز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں احتیاط بھی ہے کیونکہ اگر رفع الیدین کو منسوخ مانا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو ایک منسوخ فعل کا کرنا لازم آتا ہے اور اگر رفع الیدین مستحب ہے تو اس کو نہ کرنا ایک مستحب کام کو چھوڑنا ہے اور یہ ضابطہ ہے کہ کسی بدعت کا ایجاد کرنا مستحب کے چھوڑنے سے زیادہ برا ہے (یعنی شافعیہ کے ہاں رفع الیدین زیادہ سے زیادہ مستحب ہے تو اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو ایک مستحب کام کا ترک لازم آئیگا اور ہمارے ہاں یہ منسوخ ہے تو رفع الیدین کرنے میں نسخ پر عمل لازم آئیگا۔ از مترجم)

باب ماجاء ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم لم یرفع الا فی اول مرۃٍ

باب ہے اس بارے میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تکبیر تحریمہ کیلئے رفع یدین کیا کرتے تھے

☆ حَدَّثَنَا هناد حَدَّثَنَا وكيع عن سفيان عن عاصم بنِ كُلَيْبٍ عن عبد الرحمٰن بن الْاَسْوَدِ عن عَلْقَمَةَ قال قال عبد الله بن مسعودٍ: اَلَا اُصَلِّي بِكُمْ صلاةَ رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فَصَلّٰى، فلم يرفع يديه اِلَّا فِي اَوَّلِ مَرَّةٍ۔ قال: وفي الباب عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ۔

قال ابو عيسى: حديث ابنِ مسعودٍ حديث حسنٌ۔ وبه يقولُ غيرُ واحدٍ من اهل العلم من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعينَ۔ وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ واهلِ الكوفةِ۔

---

[1] عینی نے ابن ابی شیبہ کی روایت سے جو الفاظ نقل کیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو صرف تکبیرۃ الافتتاح میں رفع الیدین کرتے ہوئے دیکھا۔ انتہی۔ پس حضرت گنگوہی نے جو قصہ نقل کیا ہے وہ روایت بالمعنی ہے نیز اس میں مجاہد کا ابن عمرؓ کے ساتھ طویل ملازمت کا بیان ہے۔

[2] یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ مرفوع حدیث ہماری دلیل ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور خود ان کا عمل اس کے خلاف ہے (معلوم ہوا کہ یہ حدیث منسوخ ہے یا مؤول۔ مترجم)

﴿ترجمه﴾

حضرت علقمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کرنہ دکھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی اور تکبیرۂ تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔

اس باب میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ حسن ہے اور یہی قول ہے صحابہ وتابعین میں سے بے شمار اہل علم کا اور سفیان ثوری اور اہل کوفہ (یعنی احناف) کا بھی یہی قول ہے۔

باب ماجاء في وَضعِ اليَدَيْن على الرُّكبتين في الركوعِ

باب ہے رکوع میں دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھنے کے بیان میں

☆ حَدَّثَنا احمد بن مَنِيعٍ حَدَّثَنَا ابو بكرِ بن عَيَّاشٍ حَدَّثَنَا ابُو حَصِينٍ عن ابي عبد الرحمٰن السُّلَمِيِّ قال: قال لنا عمر بن الخطابِ رضي الله عنه : اِنَّ الرُّكَبَ سُنَّتْ لكم، فَخُذُوا بِالرُّكَبِ۔

قال: وفي الباب عن سعدٍ، وانسٍ، وابي حُمَيْدٍ، وابي اُسَيْدٍ، وسَهْلِ بنِ سعدٍ، ومحمدِ بنِ مَسْلَمَةَ، وابي مسعودٍ۔

قال ابو عيسى: حديثُ عمرَ حديث حسن صحيح۔ والعملُ على هذا عِند اهل العلم من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعين ومَن بعدَهم، لااختلافَ بينهم في ذلك، اِلَّا ماروِيَ عن ابن مسعودٍ و بعضِ اصحابه: انهم كانوا يُطَبِّقُونَ۔ والتطبيقُ منسوخٌ عند اهل العلم۔

☆قال سعدُ بن ابي وَقَّاصٍ: كُنَّا نفعلُ ذلك، فَنُهِينَا عنهُ، وامِرْنَا ان نَضَعَ الاكُفَّ على الرُّكَبِ قال :حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن ابي يَعْفُورٍ عن مُصْعَب بن سعد عن ابيه سَعْدٍ بِهٰذَا۔

(وابو حُمَيْدٍ السَّاعِدِيُّ اسمه عبدُ الرحمٰن بن سعد بن المُنْذر۔ وابو اُسَيْدٍ السَّاعِدِيُّ اسمه مالك بن رَبِيعَةَ۔ وابو حُصَينٍ اسمه عثمانُ بن عاصمٍ الاسَدِيُّ۔وابو عبد الرحمٰن السُّلَمِيُّ اسمه عبد الله بنَ حَبِيبٍ۔ وابو يَعْفُورٍ عبد الرحمٰن بن عُبَيْد بن نِسْطَاس وابو يعفورٍ العَبْدِيُّ اسمه وَاقِدٌ ويقال وَقْدَانُ وهو الذي رَوَى عن عبد الله بن ابي اَوْفَى و كلاهما من اهلِ الكوفة)۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارے لئے گھٹنوں کو پکڑنا سنت قرار دیا گیا ہے لہٰذا تم گھٹنوں کو پکڑو (رکوع میں)۔

اس باب میں حضرت سعد، انس، ابوحمید، ابواسید، سہل بن سعد، محمد بن مسلمہ، اور ابومسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث عمر رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اسی پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے بعض شاگردوں کے متعلق مروی ہے کہ وہ تطبیق کرتے تھے (یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر رانوں کے درمیان چھپا لیتے) تطبیق منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم تطبیق کیا کرتے تھے پھر ہمیں اس سے روک دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ ہم ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھیں۔

ہم سے روایت کی قتیبہ نے وہ ابوعوانہ سے وہ ابویعفور سے وہ مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے وہ اپنے والد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

باب ماجاء اَنَّهٗ يُجَافِي يديهِ عن جنبيهِ في الركوع

باب ہے رکوع میں دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے علیحدہ رکھے گا

☆حدثنا محمد بن بَشَّارٍ بُنْدَارٌ حَدَّثَنَا ابو عامرٍ العَقَدِيُّ حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بن سليمانَ حَدَّثَنَا عَبَّاسُ بن سهلِ بن سعدٍ قال: اجتمَعَ ابو حُمَيْدٍ وابو اُسَيْدٍ وسهلُ بن سعدٍ ومحمدُ بن مَسْلَمَةَ، فذكَرُوا صلاةَ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فقال ابو حُمَيْدٍ: انا اَعْلَمُكُمْ بصلاةِ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: اِنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ركَعَ فوضَعَ يديه عَلٰى رُكْبَتَيْهِ كَاَنَّهٗ قابضٌ عليهما، ووَتَّرَ يديه فنَحَّاهُمَا عن جَنْبَيْهِ۔ قال: وفي الباب عن انسٍ۔ قال ابو عيسى: حديث ابي حميد حديث حسن صحيح۔ وهو الذي اختارهُ اهلُ العلم: ان يُجافِيَ الرجلُ يديه عن جنبيهِ في الركوع والسجودِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عباس بن سہل فرماتے ہیں کہ ابوحمید، ابواسید، سہل بن سعد اور محمد بن مسلمہ ایک جگہ جمع ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا تذکرہ شروع کیا۔ ابوحمید نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا تو ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھا گویا کہ آپ نے ان کو پکڑا ہوا ہے اور انہیں کمان کی تانت کی طرح سیدھا رکھے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے علیحدہ رکھا۔

اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابوحمید حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے کہ مرد رکوع وسجود میں اپنے ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھے۔

باب ماجاء فی التَّسبِیح فِی الرکوع والسجودِ

باب ہے رکوع اور سجود میں تسبیح پڑھنے کا بیان

☆حدثنا عليُّ بن حُجْرٍ اخبرنا عيسى بن يونس عَن ابن ابى ذئبٍ عن اسحٰقَ بن يزيدَ الهُذَليِّ عـن عَوْنِ بن عبد اللّٰه بن عُتْبَةَ عن ابن مسعودٍ: ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال: اذا ركع احدُ كم فقال فى ركوعه: سبحانَ رَبِّيَ العَظيم: ثَلَاثَ مَرَّاتٍ: فقد تَمَّ ركوعُه، وذٰلك اَدْناهُ۔ واذا سَجَدَ فقال فى سجوده: سُبْحَانَ رَبِّيَ الاَعْلَى: ثَلَاثَ مَرَّاتٍ: فقد تَمَّ سجودُه، وذٰلك اَدْنَاهُ۔ قال: وفى الباب عن حُذَيْفَةَ، وعُقْبَةَ بن عامرٍ۔قال ابوعيسى:حديث ابنِ مسعودٍ ليس اسنادُه بِمُتَّصِلٍ عَوْنُ بن عبد اللّٰه بن عُتْبَةَ لم يَلْقَ ابنَ مسعودٍ۔ والعملُ على هذا عند اهل العلم: يَسْتَحِبُّونَ ان لايَنْقُصَ الرجلُ فى الركوع والسجودِمِن ثلاث تسبيحاتٍ۔ورُوِى عن عبد اللّٰه بن المُبَارَكِ انه قال: اَسْتَحِبُّ للاِءِمامِ ان يُسَبِّحَ خَمْسَ تسبيحاتٍ، لِكَيْ يُدْرِكَ مَن خَلْفَهُ ثلاثَ تسبيحاتٍ۔ وهكذا قال اسحٰقُ بنُ ابراهيم۔

☆حدثنا محمودُ بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود قال: انبأنا شعبةُ عن الاعمش قال: سمعتُ سَعْدَ بن عُبَيْدَةَ يُحَدِّثُ عن المُسْتَوْرِدِ عن صِلَةَ بن زُفَرَ عن حُذَيْفَةَ انه صَلَّى مع النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم،

فکان یقولُ فی رکوعه: سُبْحَانَ رَبِّيَ العظِيمِ ، وفی سجوده : سُبْحَان رَبِّيَ الاَعْلَى ، وما اَتَى على آيَةِ رَحْمَةٍ اِلَّا وَقَفَ وَسَأَلَ ، وما اَتَى على آيَةِ عَذَابٍ اِلَّا وَقَفَ وَتَعَوَّذَ۔

قال ابو عیسی: وهذا حديث حسن صحيح۔

☆قال: و حَدَّثَنَا محمد بن بشّارٍ حَدَّثَنَا عبد الرحمٰن بن مَهْدِيٍّ عن شعبة نَحْوَهُ۔(وقد رُوِیَ عن حذیفةَ هٰذا الحدیثُ مِن غیر هذا الوجهِ وانه صلّى بالليل من مع النبى صلى الله عليه وسلم فذکَرَ الحديثَ)۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو تین مرتبہ ''سبحان ربی العظیم'' پڑھے تو اس کا رکوع مکمل ہو گیا اور یہ اس کی کم سے کم مقدار ہے (زیادہ کہنا بہتر ہے) اور جب سجدہ کرے تو تین مرتبہ ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہے۔ اس کا سجدہ پورا ہو گیا اور یہ اس کی کم سے کم مقدار ہے (زیادہ کہنا بہتر ہے)۔

اس باب میں حذیفہ، اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند متصل نہیں (منقطع ہے) اس لئے کہ عون بن عبداللہ بن عتبہ کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ سے لقاء ثابت نہیں ہے اور اس پر تمام اہل علم کا عمل ہے کہ رکوع اور سجدے میں تین تسبیحات سے کم نہ پڑھی جائیں اور ابن مبارک رحمہ اللہ سے مروی ہے مجھے پسند ہے کہ امام کم از کم پانچ مرتبہ تسبیحات پڑھے تاکہ مقتدی تین تسبیحات پڑھ سکیں اور اسی طرح کہا ہے اسحٰق بن ابراہیم نے بھی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجود میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتے اور جب کسی (رحمت کی) آیت پر پہنچتے جس میں رحمت کا مضمون ہوتا تو ٹھہرتے اور اللہ تعالیٰ سے (رحمت کی دعا) مانگتے اور جب عذاب والے مضمون کی آیت پر پہنچتے تو ٹھہرتے اور عذاب سے پناہ مانگتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس کے مثل حدیث محمد بن بشار نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے اور انہوں نے شعبہ سے روایت کی ہے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فقد تمّ رکوعُہٗ فقد تمّ سجودُہٗ) یعنی تسبیح کی فرض اور سنت مقدار پوری ہوگئی تو یہ پورا ہونا کافی ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ مراد نہیں کہ تین مرتبہ تسبیح پڑھنا وہ آخری مقدار ہے کہ جس پر زیادتی جائز نہیں اور نہ یہ مراد ہے کہ یہ فرض کی کم از کم مقدار ہے کہ تین سے کم تسبیح ناکافی ہے اور تین تسبیح سے کم پڑھنے سے نماز نہ ہو۔

ابن مبارکؒ کے اس قول کی تشریح: (لیدرك من خلفه ثلاث تسبیحات) یعنی امام مسجد پانچ دفعہ تسبیح اس لئے پڑھے تاکہ مقتدی تین تسبیح پڑھ سکیں اس سے مراد یہ نہیں کہ مقتدی رکوع اور سجود میں امام کے بعد جاتے ہیں تو دو تسبیح کی مقدار کا وقت ان سے نکل جاتا ہے لہٰذا اب اگر امام پانچ دفعہ تسبیح پڑھے گا تو مقتدی تین دفعہ تسبیح کہہ سکیں گے یہ مطلب مراد نہیں کیونکہ اس پر اشکال ہے کہ جس طرح مقتدی امام کے بعد رکوع میں جائیں گے اسی طرح رکوع سے بھی بعد میں اٹھیں گے۔ تو انہیں پانچ تسبیح پڑھنے کا وقت مل جائے گا۔

ابن مبارکؒ کے قول کا صحیح مطلب: بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ مقتدی تسبیح پڑھنے میں مختلف قسموں کے ہوتے ہیں بعض مقتدی تو اتنی تیز پڑھتے ہیں کہ وہ اپنی تسبیح پڑھ لیتے ہیں اور امام اپنی تسبیح پوری نہیں کر پاتا اور بعض مقتدی اس کے برعکس ہوتے ہیں کہ وہ ایک تسبیح اتنی دیر میں پڑھتے ہیں کہ امام دو دفعہ پڑھ لیتا ہے لہٰذا اگر امام پانچ تسبیحات پڑھ لے تو تمام مقتدی تین تسبیحات کو مکمل کر چکے ہونگے کوئی بھی مقتدی ایسا نہیں بچا ہوگا کہ اس کی تسبیح عدد مسنون اقل کے درجہ (یعنی تین) کو پورا نہ کر چکی ہو اور اس توجیہ کی باریک بینی اور عمدگی مخفی نہیں۔ لیکن پہلے قول کی بھی توجیہ ممکن ہے جو کہ ذکر کرنے کے لائق نہیں ہے کہ وہ یہ ہے کہ جب امام نے رکوع سجدے کیلئے اپنی کمر کو جھکایا تو قیام کو چھوڑ کر اس کی تکبیر سنتے ہی اس کی اتباع ضروری ہوگئی لیکن رکوع او رسجدے کی حالت کی طرف پہنچنا امام کے پہنچنے کے تھوڑے وقت کے بعد ہوتا ہے خصوصاً کمزور، بیمار اور جو لوگ رش اور ازدحام کی وجہ سے دیر سے سجدے تک پہنچتے ہیں تو یہ سب امام کے پہنچنے کے بعد متصل وقت میں ایک لمحہ کے بعد اس رکن میں پہنچتے ہیں۔ جب وہ لوگ اس رکن میں ایک لمحہ کے بعد پہنچتے ہیں تو امام ایک یا اس سے زیادہ تسبیح اتنی دیر میں کہہ چکا ہوتا ہے اسی طرح سجدے سے کھڑے ہوتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی بعض مقتدی دیر سے پہنچتے ہیں، سجدے اور رکوع سے سر اٹھانا یہ تو امام کی تکبیر سنتے ہی بغیر دیر کیئے ہونا چاہئے لہٰذا سر اٹھانے کے بعد مقتدیوں کیلئے گنجائش نہیں ہے کہ وہ رکوع یا سجدے کی اس وقت میں تسبیح کہیں اگرچہ وہ ابھی پورے کھڑے نہیں ہوئے۔ واللہ الھادی الی سواء السبیل وھو حسبی ونعم الوکیل

(وما اتی علی آیۃ رحمۃ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مختصر اور ہلکی نماز پڑھنے والا ہونا جماعت کی نماز کے ساتھ خاص ہے، نوافل[1] میں اور منفرداً نماز پڑھنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت لمبی نماز پڑھتے تھے۔

(اِلّا وَقَفَ وَسَأَلَ) یہ آیتِ رحمت یا آیتِ عذاب پڑھکر دعائیں مانگنا ہمارے ہاں نوافل پر محمول ہے ان دلائل کی وجہ سے جن سے پتہ چلتا ہے کہ فرض نمازوں میں تخفیف ہوتی ہے مثلاً یہ حدیث گزری کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے ہلکی نماز پڑھنے والے تھے مگر ارکان پورے پورے ادا کرتے تھے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ " اذا ام احدکم الناس فلیخفف فان فیھم الصغیر والکبیر والضعیف والمریض فاذا صلی وحدہ فلیصل کیف شاء "اس سب کے باوجود اگر امام صاحب بھی لمبی نماز پڑھنا چاہتے ہوں اور تمام مقتدی بھی لمبی نماز کے خواہشمند ہوں تو فرض نماز میں دعا کرنا جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ مانگنا یہ سب جائز ہو جائیگا۔

باب ماجاء فی النَّھیِ عن القراء ۃ فی الرکوع والسجودِ

باب ہے رکوع اور سجدے میں تلاوت قرآن کی ممانعت کے بیان میں

☆حدثنا اسحٰقُ بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالکُ بن انسٍ ح وحدثنا قتیبۃ عن مالک عن نافعٍ عن ابراھیم بنِ عبد اللّٰہ بنِ حُنَیْنٍ عن ابیہ عن علیٍّ بن ابی طالبٍ: ان النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نَھَی عن لُبْسِ القَسِّیِّ والمُعَصْفَرِ وعن تَخَتُّمِ الذَّھَبِ، وعن قراءۃِ القرآنِ فی الرکوعِ۔

قال وفی الباب عنِ ابن عباسٍ۔

قال ابو عیسی: حدیث علیٍّ حدیث حسن صحیح۔ وھو قولُ اھل العلم مِن اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم والتابعینَ ومَن بعدَھم: کرھوا القراءۃَ فی الرکوعِ والسجودِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے اور سونے کی انگوٹھی (مرد کیلئے) پہننے اور رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔

---

[1] قیام اللیل کی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان کا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں عشاء کے بعد سے فجر کی نماز تک چار رکعت طویلہ ادا فرمائی۔

اس باب میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث علی رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین میں سے تمام اہل علم کا یہی قول ہے کہ وہ رکوع اور سجدے میں قرآن پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

﴿تشریح﴾

رکوع میں قرآن شریف پڑھنے کی ممانعت کی وجہ: یہ ہے کہ رکوع اور سجدے کی حالت میں بندہ جھک کر اللہ تعالیٰ رب العزت کے سامنے اپنی ذلت اور بندگی کا اظہار کرتا ہے اسلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس حالت میں تلاوت سے منع فرمادیا۔ اگر چہ یہ (تلاوتِ قرآن) بھی ذکر ہے لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت میں اللہ رب العزت کے ساتھ شرفِ کلام حاصل ہوتا ہے لہٰذا یہ کلام کرنا ایسی حالت میں مناسب نہیں ہے کہ جب نماز میں بندہ ایک عاجزی کی حالت میں ہو۔ اسی وجہ سے فقہاء کہتے ہیں کہ قیام کو لمبا کرنا کثرت سجود سے زیادہ افضل اور پسندیدہ ہے۔

باب ماجاء فیمن لایُقیمُ صُلْبَهُ فی الرکوعِ والسجودِ

باب ہے اس شخص کے متعلق جو شخص رکوع اور سجود میں اپنی کمر کو اطمینان سے نہ ٹھہرائے

☆حدثنا احمد بن مَنِیعٍ، حدثنا ابو معاویةَ عن الاعمشِ عن عُمَارَةَبنِ عُمَیرٍ عن ابی مَعْمَرٍ عن ابی مسعودٍ الاَنْصَارِیِّ البَدْرِیِّ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لاتُجْزِئُ صلاةٌ یُقِیمُ فیها الرجلُ یَعْنِی صلْبَهُ فی الرکوع والسجودِ۔

قال: وفی الباب عن علیِّ بن شَیْبَانَ، وانسٍ، وابی هریرةَ، ورِفَاعَةَ الزُّرَقِیِّ۔قال ابو عیسی: حدیثُ ابی مسعودٍ الانصاریِّ حدیث حسن صحیح۔

والعملُ علی هذا اهل العلم مِن اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم ومَن بعدَهم: یَرَوْنَ ان یُقِیمَ الرجلُ صُلْبَهُ فی الرکوع والسجودِ۔ و قال الشافعیُّ واحمدُ واسحٰقُ: مَنْ لَمْ یُقِمْ صُلْبَهُ فی الرکوع والسجودِ فَصَلَاتُهُ فاسدةٌ، لحدیثِ النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم: لاتُجْزِئُ صَلَاةٌ لایُقِیمُ الرجلُ فیها صُلْبَهُ فی الرکوع والسجودِ۔ وابو معمرٍ اسمه عبدُ اللّٰه بن سَخْبَرَةَ۔ وابو مسعودٍ الانصاریُّ البَدْرِیُّ اسمه عُقْبَةُ بن عَمْرٍو۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی نماز نہیں ہوتی جو شخص رکوع اور سجود میں اپنی کمر کو سیدھا نہیں کرتا۔

اس باب میں حضرت علی بن شیبان، انس، ابوہریرہ، اور رفاعہ زرقی رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد کے تمام اہل علم کا عمل ہے اور ان کی رائے یہ ہے کہ آدمی رکوع اور سجدہ میں کمر کو سیدھا رکھے۔ امام شافعی، احمد اور اسحق رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جو آدمی رکوع اور سجود میں اپنی کمر کو سیدھی نہیں کرتا اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنا پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رکوع اور سجدے میں اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا اس کی نماز نہیں ہوتی اور ابومعمر کا نام عبداللہ بن سخبرہ ہے اور ابومسعود انصاری بدری رضی اللہ عنہ کا نام عقبہ بن عمرو ہے۔

﴿تشریح﴾

تعدیل ارکان کا شرعی حکم: بعض ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ رکوع اور سجدے میں طمانینت فرض ہے جسے تعدیل ارکان[1] کا نام دیا جاتا ہے۔

حنفیہ کی طرف سے جواب: امام صاحب رحمہ اللہ کا جواب بالکل ظاہر ہے وہ یہ کہ اس طرح تو کتاب اللہ پر زیادتی لازم آئیگی کیونکہ کتاب اللہ میں صرف رکوع کو فرض قرار دیا گیا ہے اس کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں اسی طرح مطلق سجدے کو فرض قرار دیا گیا اس کے معنی صرف پیشانی کو زمین پر رکھنا (لہٰذا خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں)۔

(لا تجزی صلوۃ لا یقیم الرجل فیھا) یعنی جو شخص رکوع میں اپنی کمر کو اطمینان سے نہیں سیدھا کرتا تو اس کی نماز نہیں ہوگی، اس روایت سے ان ائمہ کا استدلال ہے جو کہتے ہیں کہ تعدیل ارکان فرض ہے لہٰذا تعدیل ارکان کے بغیر

---

[1] **مذاہب ائمہ:** امام شافعی، احمد، ابو یوسف رحمہم اللہ کے ہاں تعدیل ارکان فرض ہے اور طرفین رحمہما اللہ کے ہاں واجب ہے اور ایک قول میں طرفین کے ہاں سنت ہے۔ ابن رشد فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ سے چونکہ کوئی روایت صراحۃ منقول نہیں لہٰذا ان کے تلامذہ کا اختلاف ہے کہ ان کے مذہب میں تعدیل ارکان سنت ہے یا واجب۔ انتہی

جن روایات سے جمہور نے تعدیل ارکان کے فرض ہونے پر استدلال کیا ہے انہی روایات سے حنفیہ نے وجوب پر استدلال کیا ہے کیونکہ یہ اخبار آحاد ہے۔ پس حنفیہ کے دلائل ان کے مخالفین کے خلاف حجت ہیں لیکن جمہور کے دلائل حنفیہ کے خلاف حجت نہیں کیونکہ یہ اخبار آحاد ہیں اور رکوع اور سجدے کی آیتیں مجمل نہیں ہیں (کہ اخبار آحاد کو انکی تفسیر کہا جا سکے)۔ کذا فی الاوجز

نماز صحیح نہ ہوگی۔ حنفیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ خبر واحد سے قطعی حکم ثابت نہیں ہوسکتا اور آیتِ کریمہ مطلق ہے۔

رکوع اور سجود کا مفہوم حقیقی: مطلق رکوع کا معنی جھکنا اور سجدے کا معنی پیشانی کو زمین پر رکھنا ہے۔ لیکن پیشانی رکھنے کی بعض حالتوں میں تعظیم کا معنی نہیں پایا جارہا تو وہ آیت کے مفہوم سے خارج سمجھی جائیگی لہٰذا نص ان کو شامل نہ ہوگی (از مترجم: مثلاً کوئی شخص سجدے میں جا کر دونوں پاؤں اس طرح اٹھالیتا ہے جس میں استہزاء اور مذاق کا پہلو ہو تو اسکا سجدہ ادا نہ ہوگا......اسی لئے فقہاء نے سجدہ کی تعریف میں وضع الجبهة علی الارض ممالا سخرية فيه کا اضافہ فرمایا)۔ اور سجدے کی وہ حالت جس میں تعظیم کی کیفیت پائی جائے تو وہ نص کے مفہوم میں داخل ہوگی۔ پس رکوع سجدہ بغیر تعدیل ارکان کے بھی حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا نماز کا صحیح ہونا تعدیل ارکان پر موقوف نہیں لیکن چونکہ خبر واحد کے سچے ہونے کا بھی گمان موجود ہے لہٰذا اس سے وجوب ثابت ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ واجب کے چھوڑنے پر نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے نہ کہ یہ کہ واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے نماز ہی صحیح نہ ہو۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ حدیث جمہور کے مسلک پر صراحۃً دلالت نہیں کر رہی کیونکہ "لاتجزی صلوة" میں جو نفی ہے تو اس کے کئی مراتب ہیں پہلا مرتبہ یہ ہے کہ کافی نہ ہونے کا مطلب فرض ساقط نہ ہوا اور انسان اپنے ذمہ سے فارغ نہ ہو دوسرا معنی کافی نہ ہونے کا یہ ہے کہ ایسی بغیر تعدیل ارکان والی نماز پڑھنے سے گناہ ختم ہو کر بلند درجات نہیں ملیں گے۔ بظاہر اس نفی سے تمام درجات کی نفی ہونی چاہیئے لیکن ہماری ذکر کردہ آیت "ارکعوا واسجدوا" نے اس نفی کو ایک خاص نوع کے ساتھ مخصوص کر دیا وہ یہ ہے کہ ایسی نماز سے گناہوں کی معافی اور رفع درجات نہ ہونگے۔

باب مایقولُ الرجلُ اذا رفع راسه مِن الرکوع

باب ہے کہ جب رکوع سے سر اٹھائے تو کیا دعا پڑھے؟

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود الطیالسیُّ حَدَّثَنَا عبد العزیز بن عبد اللّٰه بن ابی سَلَمَةَ المَاجِشُونُ حدثنی عَمِّی عن عبد الرحمٰن الاَعْرَجِ عن عُبید اللّٰه بن ابی رافعٍ عن علیٍّ بن ابی طالبٍ قال: کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا رفع راسه من الرکوع قال: سمعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، رَبَّنَا ولك الحمدُ، مِلْءَ السمٰوات و مِلْءَ الارضِ، ومِلْءَ مابینهما، ومِلْءَ ماشِئْتَ مِن شیءٍ بَعْدُ۔

قال: وفی البابِ عن ابْنِ عمرَ، وابن عباسٍ، وابن ابی اَوْفٰی، وابی جُحَیْفَةَ، وابی سعیدٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث علیٍّ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی هذا عندَ بعض اهل العلم۔ وبه یقولُ

الشافعیُّ، قال: یقولُ ھذا فی المکتوبۃِ والتطوُّعِ وقال بعضُ اھل الکوفۃ: یقولُ ھذا فی صلاۃ التطوعِ، ولا یقولُھا فی صلاۃ المکتوبۃِ۔ (قال ابو عیسی: وانما یقالُ، الماجِشُونیُّ: لانہ مِنْ وَلَدِ الماجِشُونِ۔)

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو فرماتے "سمع اللہ لمن حمدہ" سے ......من شیء بعد" تک۔ (ترجمہ: اللہ نے اس کی بات سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔ اے اللہ! اس زمین وآسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور اس کے بعد جس قدر تو چاہے ان تمام چیزوں کی مقدار تیرے ہی لئے تعریفیں ہیں)۔

اس باب میں ابن عمر، ابن عباس، ابن ابی اوفی، ابو جحیفہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث علی رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ فرض اور نفل دونوں میں اس دعا کو پڑھے جبکہ اہل کوفہ (احناف) فرماتے ہیں کہ یہ کلمات نفل نماز میں پڑھے فرضوں میں نہ پڑھے۔

﴿تشریح﴾

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل: (اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا) یہ حدیث امام ابوحنیفہ کے مذہب کی دلیل ہیکہ[1] جماعت میں امام صرف تسمیع پر اکتفاء کریگا اور مقتدی تحمید پر......اور منفرد دونوں کو جمع کریگا اسی کی دلیل یہ ہے کہ اگر

---

[1] **مسئلۃ الباب میں ائمہ کا اختلاف اور منفرد کے متعلق تین روایتیں:** اوجز المسالک میں اس اختلاف کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ جمہور کے ہاں منفرد دونوں کو جمع کریگا اور اس کو اجماعی حکم نہیں کہنا چاہئے جیسا کہ امام طحاوی اور ابن عبدالبر وغیرہ نے نقل کیا ہے کیونکہ اس مسئلہ میں احناف کے درمیان اختلاف ہے جو کہ مشہور ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منفرد کے متعلق تین روایتیں ہیں:۱۔ دونوں کو جمع کرے یہی روایت قابل اعتماد ہے۔ ۲۔ یہ مقتدی کی طرح صرف تحمید کہے ۳۔ امام کی طرح صرف تسمیع پر اکتفاء کرے۔ حنابلہ میں سے صاحب المغنی نے اپنے مذہب میں اسی طرح دو روایتیں ذکر کی ہیں اور زرقانی مالکی رحمہ اللہ نے اس کی طرف لفظ اصح کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ امام شافعی، احمد اور صاحبین کے ہاں امام دونوں کو جمع کریگا اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ہاں صرف تسمیع پر اکتفاء کریگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں مقتدی بھی دونوں کو جمع کریگا اور باقی پانچ ائمہ کے ہاں مقتدی صرف تحمید پر اکتفاء کریگا۔ ابن منذر کہتے ہیں امام شافعی رحمہ اللہ اس مسئلہ میں جمہور سے الگ ہو گئے ہیں۔ انتہی

مقتدی تسمیع اور تحمید دونوں کو جمع کرے تو فقولوا میں فاء کا مقتضی فوت ہو جائیگا کیونکہ اس میں امام کا وظیفہ تسمیع اور مقتدی کا وظیفہ تحمید بیان کیا گیا ہے اس طرح اس الگ الگ وظیفہ کی تقسیم سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ امام یا مقتدی میں سے کوئی بھی دونوں کو جمع نہیں کریگا کیونکہ حدیث شریف میں یہ حکم کی تقسیم شرکت کے منافی ہے۔ نیز فاء تعقیب دلالت کرتی ہے کہ مقتدی امام کی تسمیع کے فوراً بعد بغیر مہلت کے تحمید کہے تو تسمیع کہنے کا وقت کہاں ہے؟ تو اگر مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ کہے گا تو تحمید سے پہلے کہے گا تو اس صورت میں فاء کا مقتضی تراخی مع الوصل باطل ہو جائیگا۔ جیسے جزاء شرط کے فوراً بعد آتی ہے اسی طرح فاء کا مابعد، ماقبل کے فوراً بعد آتا ہے اور یہ بات طبیعت کی لطافت سے معلوم ہو جاتی ہے۔

ربنا لك الحمد اور ربنا ولك الحمد میں فرق یہ ہے کہ دوسرا جملہ پہلے سے زائد اور زیادہ موکد ہے کیونکہ واؤ عطف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھ دوسرا بھی شریک ہو لہٰذا یہ دو مستقل جملے ہونگے۔ (ربنا ورب الناس لک الحمد)

باب منه آخَرُ

باب ہے اسی مسئلہ سے متعلق

☆حدثنا اسحٰقُ بن موسى الانصارى حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكٌ عن سُمَيٍّ عن ابى صالحٍ عن ابى هريرةَ انَّ رسولَ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم قال: اذا قال الامامُ: سمعَ اللّٰه لمن حَمِدَهُ، فقولُوا: رَبَّنَا ولك الحمدُ ، فإنه من وَافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ الملائكةِ غُفِرَله ماتَقَدَّمَ من ذَنْبِهِ۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيحٌ۔

والعملُ عليه عند بعض اهل العلم من اصحاب النبىِّ صلى اللّٰه عليه وسلم ومَن بعدهم: اَنْ يقولَ الإمامُ سمعَ اللّٰهُ لِمَنْ حمدهُ، ربَّنا ولك الحمدُ ـ ويقولَ مَن خَلْفَ الإمام، رَبَّنا ولك الحمدُ۔ وبه يقول احمدُ۔ وقال ابن سيرينَ وغيرُه: يقولُ مَن خَلْفَ الإمام سمع اللّٰهُ لمن حَمِدهُ رَبَّنا ولك الحمدُ مِثْلَ مايقولُ الإمامُ۔ وبه يقولُ الشافعيُّ،واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا ولک الحمد کہو! کیونکہ جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہو جائے اس کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور صحابہ وتابعین میں سے بعض اہل علم کا اس پر عمل ہے کہ امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی ربنا ولك الحمد کہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ مقتدی بھی امام کی طرح سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد کہے! اور امام شافعی اور اسحٰق رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

باب ماجاء في وضع الركبتين قبلَ اليدين في السجودِ

باب ہے سجدے میں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے کے بیان میں

☆حدثنا سَلَمَةُ بن شَبِيبٍ واحمدُ بن ابراهيمَ الدَّوْرَقِيُّ والحسنُ بن عليٍّ الحُلْوَانِيُّ وعبد الله بن مُنِيرٍ وغيرُ واحدٍ، قالوا: حَدَّثَنَا يزيدُ بن هرونَ اخبرنا شَرِيكٌ عن عاصمِ بنِ كُلَيْبٍ عن ابيه عن وَائِلِ بنِ حُجْرٍ قال: رايتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم اذا سَجَدَ يَضَعُ ركبتيهِ قبلَ يديهِ، واذا نَهَضَ رَفَع يديه قبلَ ركبتيه۔ قال: زادَ الحسنُ بن عليٍّ في حديثه: قال يزيدُ بن هرونَ: ولم يَرْوِ شريكٌ عن عاصم بن كُلَيْبٍ اِلّا هذا الحديثَ۔

قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريب لانعرفُ احداً رواهُ مثلَ هذا عن شَرِيكٍ۔

والعملُ عليه عندَا كثر اهل العلم: يَرَوْنَ ان يضعَ الرجلُ ركبتيهِ قبل يديهِ، واذا نهضَ رَفَعَ يديهِ قبلَ ركبتيه۔ ورَوَى هَمَّامٌ عن عاصِمٍ هذا مُرْسَلاً، ولم يَذْكُرْفيه وائلَ بنَ بنَ حُجْرٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نماز پڑھتے ہوئے) دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدے میں جاتے تو گھٹنے ہاتھوں سے پہلے (زمین پر) رکھتے اور جب (سجدے سے) اٹھتے تو ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔ حسن بن علی نے اپنی روایت میں یزید بن ہارون کے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں کہ شریک نے عاصم بن کلیب سے صرف یہی حدیث روایت کی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب حسن ہے ہم نہیں پہچانتے کہ اس کو شریک کے علاوہ کسی دوسرے نے روایت کیا ہو اور اکثر اہل علم کا اس حدیث پر عمل ہے ان کی رائے یہ ہے کہ آدمی اپنے دونوں گھٹنوں کو ہاتھ سے پہلے رکھے اور (سجدے سے) اٹھتے وقت ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھائے۔ ہمام نے یہ حدیث عاصم سے مرسلاً روایت کی اور اس میں وائل بن حجر کا ذکر نہیں کیا

باب آخَرُ منه

باب ہے اسی مسئلہ سے متعلق

☆حدثنا قتيبةُ حَدَّثَنَا عبدُ اللّٰه بنُ نافعٍ عن محمد بن عبد اللّٰه بن حسنٍ عن ابی الزِّنَادِ عن الاعرجِ عن ابی هريرةَ انَّ النبیَّ صلی اللّٰه عليه وسلم قال: يَعْمِدُ احدُكم فيبرك فی صلاته برك الجمل۔

قال ابو عيسى: حديث ابی هريرة حديث غريب ، لانعرفه من حديث ابی الزنادِ اِلَّا من هذا الوجه۔ وقد رُوِیَ هذا الحديث عن عبد اللّٰه بن سعيدٍ المَقْبُرِیِّ عن ابيه عن ابِی هريرة عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم۔وعبد اللّٰه بن سعيدٍ المقبریُّ ضَعَّفَهٗ يحيى بن سعيدٍ القَطَّانُ وغيرهُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی نماز میں اونٹ کے بیٹھنے کی طرح بیٹھتا ہے؟ (یعنی ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھنے کو اونٹ کی طرح بیٹھنے سے مشابہت دی ہے)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غریب ہے ہم اسے ابوزناد کی سند کے علاوہ نہیں جانتے۔ اس حدیث کو عبداللہ بن سعید مقبری نے اپنے والد سے روایت کیا انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ عبداللہ بن سعید مقبری کو ضعیف کہتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

مالکیہ کا مستدل:(يعمد احدكم فيبرك فی صلوته برك الجمل) یہ حدیث مالکیہ کا مستدل[1] ہے جن کا مذہب یہ

---

[1] ابن قدامہ فرماتے ہیں حنابلہ کے مشہور مذہب کے مطابق زمین پر پہلے دونوں گھٹنے رکھنے چاہیئے پھر دونوں ہاتھ پھر پیشانی اور ناک یہی مستحب ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول مروی ہے، اسی قول کو امام ابوحنیفہ، ثوری اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور یہی امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب اور امام احمد کی ایک دوسری روایت یہ ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے پھر گھٹنے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ان حضرات کا استدلال ہے جمہور کی دلیل حضرت وائل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ سجدے میں جاتے ہوئے گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھتے تھے۔ یہ حدیث ابوداؤد، نسائی اور ترمذی میں موجود ہے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اصح ہے۔

ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے ہاتھ رکھے پھر گھٹنے۔ جمہور یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس فعل سے منع فرمارہے ہیں لیکن اس پر اعتراض یہ ہے کہ اونٹ کے گھٹنے تو اس کے اگلے پاؤں میں ہوتے ہیں نہ کہ پچھلے پاؤں میں تو استفہام انکاری کی صورت میں یہ لازم آئیگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنوں کو ہاتھ کے رکھنے سے پہلے رکھنے سے[1] منع فرمارہے ہیں (سجدہ کی حالت میں) جو کہ جمہور کے مذہب کے خلاف ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ حدیث میں گھٹنوں کا کوئی ذکر نہیں بلکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے ایک آدمی اونٹ کی طرح جھکتا ہے کہ پہلے اپنے اگلے دھڑ کو زمین پر رکھتا ہے پھر پچھلے دھڑ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا یہ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب پر انکار ہوا نہ کہ جمہور کے مذہب پر۔ معتمد[2] جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مصعب بن سعد عن ابیہ کی حدیث سے منسوخ ہے جس میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سجدے میں جاتے ہوئے پہلے ہاتھ رکھتے تھے پھر گھٹنے تو ہمیں پہلے گھٹنے کے رکھنے کا حکم دیا گیا اس کے بعد ہاتھوں کا...... رواہ ابن خزیمہ۔[3]

اس حدیث باب کی توجیہ اور تاویل کی ضرورت اسلئے پڑی تا کہ سجدے میں جانے کی حالت کے متعلق مختلف قسم کی روایات میں تطبیق ہو جائے کیونکہ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھٹنے پہلے رکھتے تھے اس کے بعد ہاتھوں کو رکھتے تھے اور مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اس پر دلالت کر رہی ہے جبکہ حدیث باب اس کے برعکس ہے۔

باب ماجاء فی السجودِ علی الجبهةِ والانفِ

باب سجدہ پیشانی اور ناک پر کرنے کے بیان میں

☆ حَـدَّثَـنَا محمدُ بن بَشَّارٍ بُنْدَارٌ حَدَّثَنَا ابو عامِرٍ العَقَدِيُّ حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بن سليمانَ حدثنی عَبَّاسُ بنُ سَهْلٍ عن ابی حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم کان اذا سجدَ اَمْکَنَ انفَه وجبهتَه

---

[1] عبارت کا صحیح مطلب یہی ہے چونکہ اونٹ کے گھٹنے اگلے پاؤں میں ہوتے ہیں اور یہاں استفہام انکاری ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی طرح سجدے میں جاتے ہوئے گھٹنے پہلے رکھنے سے منع فرمایا اس طرح یہ حدیث مالکیہ کے مذہب کی دلیل ہو گئی۔ (حاشیہ میں ذکر کردہ عبارت کا یہی خلاصہ ہے)۔

[2] ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ جواب دیا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں قلب ہو گیا ہے اس کی تفصیل بذل میں ہے۔

[3] اس حدیث کو ابن حبان وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے جیسا کہ ابن رسلان نے اس کو ذکر کیا ہے۔

مِنَ الْأَرضِ، ونَحّٰی یدیه عن جَنْبَیْهِ، ووضع کفیهِ حَذْوَ مَنْکِبَیْهِ۔قال: وفی الباب عن ابن عباسٍ، ووائِلِ بن حُجْرٍ، وابی سعیدٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی حُمَیدٍ حدیث حسن صحیح۔ والعملُ علیه عند اھل العلم: ان یسجدَ الرجلُ علی جبھته وانفه۔ فِان سجد علی جبھتِهِ دونَ انفه:

فقد قال قومٌ من اھل العلم: یُجزِئُهُ، وقال غیرھم: لایُجزِئُهُ حتی یسجدَ علی الجبھةِ والأنفِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو ناک اور پیشانی کو زمین پر جما کر رکھتے اور بازوؤں کو پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے اور ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے تھے۔

اس باب میں حضرت ابن عباس، وائل بن حجر، اور ابوسعید رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابی حمید حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ آدمی سجدہ ناک اور پیشانی پر کرے۔ اگر کوئی شخص سجدہ صرف پیشانی پر کرے یعنی ناک کو زمین پر نہ رکھے تو بعض اہل علم کے نزدیک یہ جائز ہے اور بعض دوسرے اہل علم کا قول ہے اس کی نماز صحیح نہ ہوگی جب تک کہ پیشانی اور ناک دونوں زمین پر نہ رکھے۔

﴿تشریح﴾

صرف پیشانی پر اکتفاء کرنے میں اختلاف: حنفیہ کے ائمہ ثلاثہ میں کوئی اختلاف نہیں[1] ہے۔ کہ صرف پیشانی پر اکتفاء کرنے سے نماز ہو جائیگی کیونکہ سجدہ لغت میں کہتے ہیں پیشانی زمین پر رکھنے کو اور یہ معنی صرف پیشانی زمین پر رکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے اگر چہ ناک زمین پر نہ بھی رکھے۔ باقی چھ اعضاء[2] جن کا اس حدیث میں بیان ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ سنت طریقہ پر سجدہ جب ادا ہوگا جب کہ ان ساتوں اعضاء کو سجدہ میں رکھے۔

---

[1] **سجدہ میں سات اعضاء کے رکھنے کے حکم میں مذاہب ائمہ:** حدیث شریف میں ان سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا ذکر ہے تو امام شافعی کے راجح قول کے مطابق اور امام زفر کا مذہب، امام محمد کی ایک روایت یہ ہے کہ ساتوں اعضاء کو سجدے میں رکھنا واجب ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ سجدے میں صرف چہرے کا رکھنا ضروری ہے اس کی تفصیل میرے رسالے "اختلاف الائمہ فی الصلوٰۃ" میں موجود ہے۔ پھر دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام احمد کی ایک روایت، بعض مالکیہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق پیشانی اور ناک دونوں کا رکھنا ضروری ہے جبکہ ان تمام ائمہ کی دوسری روایت میں صرف پیشانی پر اکتفاء بھی جائز ہے۔ بذل المجہود میں منیۃ المصلی سے حنفیہ کا مذہب لکھا ہے کہ امام صاحب کے ہاں ناک پر اکتفاء کرنا جائز ہے مگر بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ اور صاحبین کے ہاں بغیر عذر کے ناک پر اکتفاء کرنا جائز نہیں۔

[2] حدیث میں اعضاء سبعہ میں سے صرف چہرے کا رکھنا واجب ہے اور باقی چھ اعضاء کا رکھنا سنت ہے۔

اختلافی صورت: کیا صرف ناک پر اکتفاء کرنا جائز ہے؟: امام صاحب کے ہاں جائز اور صاحبین کے ہاں ناجائز ہے

امام صاحب کے دلائل اور انکے مذہب کی تفصیل: امام صاحب کی دلیل: بعض روایات میں لفظ وجہ آیا ہے (جس طرح پیشانی چہرے کا ایک جزء ہے تو ناک بھی اس کا ایک جزء ہے) اور سجدے سے مقصود اپنی عاجزی کا اظہار ہے جو صرف ناک رگڑنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا صرف ناک رکھنے کی صورت میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بلا عذر ایسا کیا تو نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہو جائیگی اور اگر ایسا عذر تھا کہ اس سے بچنا ممکن ہو اور پھر بھی ناک پر اکتفاء کرتا ہے تو نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اور اگر اس عذر سے بچنا ممکن ہی نہ ہو تو پھر نماز بلا کراہت جائز ہو جائیگی لہٰذا امام صاحب پر یہ اشکال نہ ہو کہ اس طرح تو صرف تھوڑی یا رخسار پر اکتفاء کرنے سے بھی سجدہ ادا ہو جانا چاہئیے، کیونکہ مطلق لفظ وجہ ان اعضاء پر بھی صادق آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح چہرہ رکھنے سے ذلت کا اظہار نہیں ہوتا جو کہ سجدہ سے مقصود ہے بلکہ یہ کیفیت تو مسخرہ پن[1] اور مذاق والی کیفیت ہے۔

(ووضع کفیه حذو منکبیه) دوسری روایت[2] میں اس کا ذکر ہے کہ انسان اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے درمیان میں لے آئے اور اس حدیث باب میں ہتھیلی کو کندھوں کے بالمقابل فرمایا ان دو حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ لفظ کف کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ۱۔ پورا ہاتھ گٹے تک، ۲۔ ہتھیلی (ہاتھوں کا اندرونی حصہ)۔

احناف کے مذہب میں تطبیق بین الروایتین: پس حدیث باب میں جہاں ہاتھوں کے کندھوں کے بالمقابل ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد ہتھیلیاں ہیں کہ ہتھیلیاں کندھوں کے بالمقابل ہوتی تھیں اور دوسری حدیث میں سائل نے پوچھا تھا

---

۱ اگر کوئی آدمی اس طرح سجدہ کرے کہ دونوں پاؤں یا ایک پاؤں اٹھالیتا ہے تو سجدہ کافی نہ ہوگا اس وجہ سے نہیں کہ پاؤں کا رکھنا فرض ہے بلکہ یہ فعل مسخرہ پن کے مشابہ ہے۔ کما بسطه فی حاشیة البحر

۲ **سجدہ میں ہاتھوں کو کیسے رکھے گا اسمیں اختلاف:** احادیث میں اختلاف کی وجہ سے ائمہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں ہاتھوں کو کندھے کے مقابلہ میں رکھنا (حالت سجدہ میں) یہ مستحب ہے انکی دلیل حدیث ابی حمیدؓ ہے۔ اثرم کہتے ہیں میں نے ابوعبداللہ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا انکے ہاتھ ان کے کانوں کے مقابلہ میں تھے اور یہی فعل ابن عمر، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اسکی دلیل وائل بن حجرؓ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ فرمایا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو کانوں کے بالمقابل کیا۔ رواہ اثرم وابوداؤد۔ لہٰذا دونوں طرح کرنا صحیح ہے۔

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا چہرہ کہاں رکھتے تھے تو جواب میں صحابی نے کہا کہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تو اس دوسری حدیث میں بین کفیہ سے مراد ہتھیلی کا ایک جزو یعنی انگلیاں مراد ہیں۔ خلاصہ یہ نکلا کہ سجدہ کرنے والا اپنا چہرہ اس طرح رکھے کہ انگلیوں کے سرے اس کے کانوں کی لو کے مقابلہ میں آجائیں اور ہتھیلی کا ابتدائی حصہ اس کے کندھوں کے مقابلہ میں اس طرح ان تمام روایات میں تطبیق ہو جائیگی۔

باب ماجاء اَيْنَ يَضَعُ الرجلُ وَجْهَهُ اذا سجدَ؟

باب جب آدمی سجدہ کرے تو چہرہ کہاں رکھے

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا حَفْصُ بن غِيَاثٍ عن الحجّاجِ عن ابی اسحٰق قال: قلتُ لِلْبَرَاءِ بن عَازِبٍ: اَيـنَ كـان النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم يَضَعُ وجهه اِذا سجد؟ فقال : بَيْنَ كَفَّيْهِ۔ قال: وفی الباب عن وائل بن حُجْرٍ، وابی حُمَيْدٍ۔

قال ابو عيسى: حديثُ البَرَاءِ حديث حسن صحيح غريبٌ۔وهو الذی اخْتَارَهُ بعضُ اهل العلم: اَنْ تكونَ يداه قريباً من اذنيه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابواسحاق کہتے ہیں میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں چہرہ کہاں رکھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان۔

اس باب میں وائل بن حجر اور ابوحمید رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن غریب ہے اور اس کو بعض علماء نے اختیار کیا ہے کہ سجدہ میں ہاتھ کانوں کے قریب ہونے چاہئیں۔

باب ماجاء فی السجود علی سبعةِ اعضاء

باب ہے سجدہ سات اعضاء پر کرنے کے بیان میں

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا بَكْرُبْنُ مُضَرَ عن ابن الْهَادِ عن محمدِ بن ابراهيم عن عامر بن سعدٍ بن ابی

وَقَّاصٍ عن العبّاس بن عبد المُطَّلِبِ انه سَمِع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: اذا سجد العبدُ سَجَدَ معه سَبْعَةُ آرابٍ: وجهُه وکفّاهُ ور کبتاهُ وقدماهُ۔ قال: وفی الباب عن ابن عباسٍ، وابی هریرةَ، وَجَابِرٍ، وابی سعیدٍ۔قال ابو عیسی: حدیث العباسِ حدیث حسن صحیح۔ وعلیه العملُ عند اهل العلم۔

☆حدثنا قتیبهُ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بن زیدٍ عن عَمْرِوبنِ دینارٍ عن طاوُسٍ عن ابن عباسٍ قال: اُمِرَ النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم ان یسجدَ علی سبعة اَعْظُمٍ، ولا یَکُفَّ شَعْرَهُ ولا ثیابَه۔

قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے سات اعضاء بھی سجدہ کرتے ہیں۔ چہرہ دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔

اس باب میں حضرت ابن عباس، ابو ہریرہ، جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث عباس حسن صحیح ہے اور تمام اہل علم کا اس پر عمل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوحکم دیا گیا سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا اور آپ نہ سمیٹیں بال اور کپڑوں کو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

سجدہ میں کتنے اعضاء کا رکھنا فرض ہے: یہ بات مسلم ہے کہ نفسِ سجدہ فرض ہے لہٰذا وہ تمام امور بھی فرض قرار دیئے جائینگے جن کے اوپر سجدہ موقوف ہے جیسے پیشانی یا ناک کا رکھنا اور دونوں گھٹنوں یا دونوں پاؤں کا رکھنا اور جو اعضاء سجدے کے تحقق کیلئے موقوف علیہ نہیں ہوں ان کو فرض قرار نہیں دیا جائیگا جیسا کہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کا رکھنا یہ فرض نہیں ہے۔ پس ہم نے غور کیا کہ دونوں ٹانگوں کے بحالتِ سجدہ اٹھانے کی صورت میں چہرہ زمین پر رکھنا ناممکن ہے۔

لہٰذا ٹانگوں[1] کا رکھنا تو فرض ہوا لیکن سجدے میں دونوں پاؤں کو اٹھانا ممکن ہے (لہٰذا دونوں پیروں کا رکھنا سجدے میں فرض نہیں ہونا چاہیئے۔ ازمترجم) البتہ چونکہ یہ مذاق اور مسخرہ پن کی صورت ہے (لہٰذا اس صورت میں بھی سجدہ ادا نہیں ہوگا)۔

دونوں پاؤں کے اٹھانے سے نماز باطل ہوجائیگی: علماء فرماتے ہیں کہ اگر دونوں پاؤں کو مکمل اٹھالیگا تو نماز باطل[2] ہوجائیگی اور اگر گھٹنوں کو اٹھالے جبکہ پاؤں زمین پر لگے ہوں تو یہ خشوع اور عاجزی کی حالت کے خلاف نہیں لہٰذا اس صورت میں نماز جائز ہے۔ فتفکر فیہ

اس ممانعت کی علت: (ولا یکف شعرہ ولا ثیابہ) کیونکہ بال اور کپڑوں کو نماز میں سمیٹنا[3] عبادات میں ایک تکبر[4]

---

[1] لغت میں رِجل کہتے ہیں قدم سے لے کر ران تک جیسا کہ یہاں پر لفظ رجل کے مقابلہ میں لفظ قدم آرہا ہے اس سے یہی سمجھ میں آرہا ہے، لغت کے اعتبار سے لفظ رجل صرف قدم کو بھی کہتے ہیں اور ران کی جڑ سے قدم تک کے حصہ کو بھی (یعنی ٹانگ)۔ انتہی

[2] حنفیہ کے ہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے یہاں تین روایتیں نقل کی ہیں: ۱۔ دونوں قدموں کا رکھنا فرض ہے، ۲۔ صرف ایک پاؤں کا رکھنا فرض ہے، ۳۔ ایک پاؤں کا رکھنا بھی فرض نہیں بلکہ سنت ہے پھر حنفیہ کے مذہب میں روایت کو مفصل ذکر کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے مذہب میں مشہور اور قابل اعتماد قول یہ ہے کہ دونوں پاؤں کا رکھنا فرض ہے اور دلیل اور قواعد کے اعتبار سے زیادہ راجح قول عدم فرضیت کا ہے۔ (حنفیہ کے مفتی بہ قول کے مطابق بحالتِ سجدہ پاؤں کی ایک انگلی کا کم از کم رکھنا فرض ہے۔ معارف السنن ص ۴۳۴: جلد سوم۔ بحوالہ بحر الرائق۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دونوں پاؤں کی تمام انگلیوں کو بحالتِ سجدہ اٹھالیتا ہے اور ایک رکن کی مقدار اس کے دونوں پاؤں اکٹھے رہے تو اس کی نماز فاسد ہوجائیگی۔ فتاویٰ محمودیہ: جلد نمبر ۱۰: ص ۲۷۰۔ ویکفیہ وضع اصبع واحدۃ۔ فتح القدیر (فتاویٰ محمودیہ ایضاً)۔ نیز خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین شامی نے بحث الرکوع والسجود ص ۴۴۷۔ ایچ ایم سعید پر اسکی تصریح کی ہے۔ (قولہ قدمیہ) یجب اسقاطہ لان وضع اصبع واحدۃ منھما یکفی (فتاویٰ شامیہ)

[3] ابن رسلان فرماتے ہیں کہ بالوں اور کپڑوں کو سمیٹنے کی ممانعت داخل صلوٰۃ میں ہے دراوردی کا رجحان اسی طرف ہے کیونکہ یہ نماز میں ایک عبث کام ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ احادیث اور صحابہ کا فعل اس کے مخالف ہے کیونکہ جمہور کے مذہب میں یہ فعل مطلقاً مکروہ ہے چاہے داخل صلوٰۃ میں ہو یا نماز سے پہلے۔ بذل المجہود میں حافظ ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ بالوں اور کپڑوں کے سمیٹنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، لیکن ابن منذر نے حسن بصریؒ سے نماز کے لوٹانے کا قول نقل کیا ہے۔ اس ممانعت کی حکمت یہ بتلائی جاتی ہے کہ بالوں اور کپڑوں کو سمیٹنے کی صورت میں متکبرین کے ساتھ مشابہت لازم آئیگی۔ انتہی

ابن العربی کے بقول کپڑوں میں مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز اور دیگر عبادات میں ان کو عاجزی کی صورت میں رکھا جائے (اور کپڑے سمیٹنا اس مقصود کے خلاف ہے)۔

[4] لفظ استنکاف تنوین کے ساتھ نکرہ ہے بظاہر یہ تقلیل کے معنی کیلئے ہے۔

کی سی صورت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کپڑے اور بال بھی سجدہ کرتے ہیں تو ان کو سمیٹنے سے ان کا سجدہ ادا نہ ہوا تو اس ثواب میں کمی ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تابع کی نیکیاں اور نیک اعمال متبوع کی نیکیوں اور ثواب اور فضائل میں زیادتی کا سبب بنتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ متبوع، تابع کو نیک کام پر ابھار رہا ہو کیونکہ حدیث کے لفظ سے یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اگر کپڑوں کو نہیں سمیٹے گا تو اس پر بھی ثواب ملیگا۔

باب ماجاء فی التَّجَافِی فی السجودِ

باب ہے سجدے میں اعضاء ایک دوسرے سے علیحدہ رہنے چاہئیں

☆حدثنا ابو کُرَیْبٍ حَدَّثَنَا ابو خالدٍ الاَحْمَرُ عن داود بن قیسٍ عن عبید اللّٰہ بن عبد اللّٰہ بن الاقرَم الخُزَاعِیِّ عن ابیه قال: کُنْتُ مَعَ اَبِی بِالْقَاعِ مِنْ نَمِرةَ، فَمَرَّتْ رَکَبَةٌ، فاِذا رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قائِمٌ یصلی، قال: فکنتُ اَنظُر الی عُفْرَتَیْ اِبْطَیهِ اذا سَجَدَ، اَیْ بَیَاضِهِ۔(اُرَیٰ بیاضه)

قال: وفی الباب عن ابن عباسٍ، وابنِ بُحَیْنَةَ، وجابرٍ، واحْمَرَ بنِ جَزْءٍ، ومیمونةَ، وابی حُمیدٍ، وابی مسعودٍ، وابی اسیدٍ، وسهل بن سعدٍ، ومحمد بن مَسْلَمَةَ، والبَرَاء بن عازبٍ، وعدی بن عَمِیرَةَ، وعائشةَ۔

قال ابو عیسی: واحمرُ بنُ جَزْءٍ هذا رجلٌ من اصحابِ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم، له حدیث واحدٌ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ عبد اللّٰہ بن اَقْرَمَ حدیث حسن، لانَعْرِفُهُ اِلَّا من حدیث داودَ بن قیسٍ۔ ولانَعْرِفُ لعبد اللّٰہ بن اَقْرَمَ الخُزَاعِیِّ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم غیرَهٰذا الحدیثِ۔ والعملُ علیه عند اکثر اهل العلم۔من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم

قال: وعبدُ اللّٰہ بن اَقْرَمَ الخُزَاعِیُّ اِنَّمَاله هذا الحدیثُ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وعبد اللّٰہ بن اَرْقَمَ الزُّهْرِیُّ(صاحِبُ النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم) وهو کاتبُ ابی بکرٍ الصِّدِّیقِ۔

﴿ترجمہ﴾

عبید اللہ بن اقرم خزاعی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ میدان نمرہ میں چٹیل میدان میں تھا کہ ایک قافلہ گزرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تھے تو میں

ان کے بغلوں کے مٹیالے رنگ کو دیکھتا اور اس میں سفیدی کو دیکھتا۔

اس باب میں ابن عباس، ابن بحسینہ، جابر، احمر بن جزء، میمونہ، ابوحمید، ابواسید، ابومسعود، سہل بن سعد، محمد بن مسلمہ، براء بن عازب، عدی بن عمیرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن اقرم کی حدیث حسن ہے۔ ہم اسے داؤد بن قیس کی روایت کے علاوہ کسی اور روایت سے نہیں جانتے اور نہ ہی ہم عبداللہ بن اقرم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے علاوہ کوئی روایت جانتے ہیں اور اسی پر عمل ہے اہل علم کا۔ احمر بن جزء صحابی ہیں اور ان سے ایک حدیث منقول ہے اور عبداللہ بن ارقم حضرت ابوبکر کے کاتب ہیں اور عبداللہ بن اقرم خزاعی اسی حدیث باب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

اس مقام کی تعیین اور اسمیں وقوفِ عرفہ کرنے کا حکم: (قولہ من نمرۃ) یہ لفظ نون[1] کے زبر میم کے زیر پھر راء کے زبر کے ساتھ ہے۔ عرفات کے متصل اس کے قریب ایک کھلا میدان ہے اس طرح کہ اگر عرفہ کی مسجد کی دیوار گر جائے تو مقام نمرہ میں گرے گی اور اس اتصال کی وجہ سے عرفہ کی مسجد کا نام نمرۃ ہے۔ پس اگر کوئی شخص مسجد نمرۃ میں وقوف عرفہ کرتا ہے تو اس کا حج ادا ہو گیا اور اگر مسجد سے باہر وقوف کرے نمرۃ نامی جگہ میں وقوف کرتا ہے اگرچہ وہ جگہ مسجد سے ملی ہے تو اس کا وقوف عرفہ ادا نہ ہوگا۔

(فمرت رکبۃ) یہ سواری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری تھی۔

(فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قائم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نماز مسجد نمرہ میں بطور نفل کے ادا فرما رہے تھے اور بعض روایتوں[2] میں مزید اضافہ بھی ہے جس میں یہ ہے کہ ایک سواری گزری اور میرے والد نے مجھے اپنی سواریوں کی حفاظت کیلئے کھڑا کیا ہوا تھا جن سے ہم اترے ہوئے تھے اور والد صاحب اس سواری کو دیکھنے گئے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں بغلوں کی خاکی رنگت کو دیکھا۔

---

[1] نمرہ نون کے زبر کے ساتھ ہے جیسے صاحبِ مجمع وغیرہ نے اس کو ضبط کیا ہے۔

[2] ابن ماجہ نے اس واقعہ کو مفصلاً ذکر نقل کیا ہے۔

یہ بغلوں کی خاکی رنگت اسلئے ظاہر ہو رہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف چادر ڈالے ہوئے سجدے کی حالت میں تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ اس طرح فرماتے تھے کہ اپنے اعضاء کو بغلوں سے جدا کر دیتے تھے۔

صحیح تشریح: (قولہ فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ) مطلب یہ ہے کہ سواری کے گزرنے کے تھوڑے وقت کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا یہ مراد نہیں کہ سواری کے گزرنے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے تھے جیسا کہ اذا مفاجاتیہ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے اب معنی یہ ہوا کہ جب مجھے سواری کے گزرنے کا علم ہوا تو میں اس سواری کے پاس پہنچا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام کی چادر[2] اوڑھے ہوئے تھے تو جب آپ سجدے میں تشریف لے گئے تو بغلوں کی خاکی رنگت نظر آنے لگی۔

ترجمۃ الباب کا ثبوت: یہیں سے ترجمۃ الباب ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ بغلوں کی خاکستر رنگ کا ظاہر ہو جانا جبھی ممکن ہے جبکہ سجدہ میں ہاتھ پہلوؤں سے بالکل جدا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سجدہ فرماتے تھے کہ اعضاء آپس میں الگ الگ ہوتے تھے۔ بغلوں کا خاکستر رنگ ہونا حالانکہ یہ جگہ بالوں کے جمع ہونے کی وجہ سے سیاہ ہوتی ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ وہ جگہ خاکستر تھی

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں میں بال تھے: اور دونوں بغلوں میں بال بھی تھے۔ لفظ عفرۃ[3] کہتے ہیں ہلکی سی سفیدی جس میں کچھ مٹیالہ رنگ ملا ہو۔

---

[1] یعنی دونوں بغلوں کا ظاہر ہونا اس لئے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام کی حالت میں تھے۔ لفظ ابط مذکر بھی ہے اور مونث بھی جیسا کہ کتب لغت میں ہے۔

[2] یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ لغت میں تردت الجاریۃ کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے کہ اس نے چادر اوڑھ لی اس کا معنی اور ارتدت کا معنی ایک ہی ہے۔

[3] عفرۃ کہتے ہیں ایسی سفیدی جو خالص نہ ہو بلکہ اس کا رنگ زمین کے رنگ جیسا ہو اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں بغلوں میں بالوں کے اگنے کی جگہ خاکی رنگ کی تھی کیونکہ کھال کی سفیدی کالے بالوں کے ساتھ ملے ہوئی تھی۔ (از مترجم: علامہ قرطبی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلیں بالوں سے خالی تھیں لیکن حافظؒ نے اس پر رد کیا ہے۔ نیز علامہ عراقی نے بھی تصریح کی ہے کہ علامہ قرطبی کی بات کسی معتمد کتاب سے ثابت نہیں۔ والخصائص لاتثبت بالاحتمال۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں عفرۃ کا معنی یہ ہے کہ بالوں کی موجودگی میں یہ رنگ ہوتا تھا اور بال صاف کرنے کے وقت بیاض ہوتا تھا۔ ص ۴۳ معارف السنن۔ جلد سوم)

دو ملتے جلتے ناموں کی وضاحت: (قوله وعبدالله بن ارقم الخ) مصنف نے عبداللہ بن ارقم کو اس لئے ذکر کیا کہ یہ دو الگ الگ راوی ہیں دونوں کا نام عبداللہ ہے لیکن ایک کے والد کا نام اقرم ہے اور دوسرے کے والد کا نام ارقم ہے کہیں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں کیونکہ دونوں کا نام ایک ہی ہے اور دونوں کے والد کا نام ملتا جلتا ہے۔ لیکن مصنف فرما رہے ہیں کہ عبداللہ بن اقرم جس میں قاف پہلے ہے اور راء بعد میں یہ صحابی ہیں اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایک حدیث کے نقل کرنے والے راویوں میں سے ہیں اور یہ خزاعی ہیں اور عبداللہ بن ارقم جس میں راء قاف پر مقدم ہے یہ صحابی نہیں ہیں[1] بلکہ یہ کاتب ہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اور یہ زہری ہیں۔

(واحمر بن جزء الخ) چونکہ ان احمر بن جزء کا تذکرہ وفی الباب کے ماتحت آیا ہے اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ یہ صحابی ہیں۔

باب ماجاء فی الاعتدال فی السجود

باب سجدہ مسنون طریقہ سے کرنے کے بیان میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو معاوية عن الاعمشِ عن ابی سفيانَ عن جابرٍ اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه عليه وسلم قال: اذا سجدَ احدكم فَلْيَعْتَدِلْ، ولا يَفْتَرِشْ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ الكلبِ۔

قال: وفی الباب عن عبد الرحمٰن بن شِبْلٍ، وانسٍ، والبَرَاءِ، وابی حُمَيْدٍ، وعائشةَ۔ قال ابو عيسى: حديث جابرٍ حديث حسن صحيح۔ والعملُ عليه عند اهل العلم: يَخْتَارُونَ الاعتدالَ فی السجودِ، ويَكرهونَ الافتراشَ كافتراشِ السَّبُعِ۔

☆حدثنا محمودُ بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داودَ اخبرنا شعبةُ عن قتادةَ قال: سمعتُ اَنَساً يقول اِنَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: اعْتَدِلُوا فی السجودِ، ولا يَبْسُطَنَّ احدُكم ذراعيه فی الصلاة بَسْطَ الكلبِ۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيح۔

---

[1] **مصنف کے کلام میں مسامحہ:** یہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے کلام سے وہم پیدا ہوا ہے ورنہ یہ عبداللہ بن ارقم جو کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کاتب ہیں یہ بھی صحابی ہیں۔ اور یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین کے کاتب رہے ہیں۔ فتح مکہ کے سال مشرف باسلام ہوئے۔ کذا فی تہذیب الحافظ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ ان عبداللہ بن اقرم سے صرف ایک حدیث مروی ہے حافظ نے اس کا رد کیا ہے کہ ابوالقاسم بغوی نے اپنی معجم میں ولید بن سعید کے واسطے سے عبداللہ بن اقرم سے دوسری حدیث بھی نقل کی ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اعتدال کے ساتھ کرے اور اپنی کلائیوں کو کتے کی طرح نہ بچھائے۔

اس باب میں عبدالرحمٰن بن شبل، براء، انس، ابوحمید اور عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث جابر حسن صحیح اور تمام اہل علم کا اسی پر عمل ہے اور وہ پسند کرتے ہیں کہ سجدہ میں اعتدال کرے اور درندوں کی طرح ہاتھ بچھانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سجدہ ٹھیک سے کیا کرو تم میں سے کوئی بھی نماز میں اپنی کلائیاں کتے کی طرح نہ پھیلائے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

باب ماجاء فی وضعِ الیدین و نصْبِ القدمین فی السجود

باب سجدے میں دونوں ہاتھ زمین پر رکھنے اور دونوں پاؤں کھڑے رکھنے کے بیان میں

☆حدثنا عبدُ اللّٰہ بن عبد الرَّحْمٰن اخبرنا مُعَلی بن اَسَدٍ حَدَّثَنَا وُھَیْبٌ عن محمدِ بن عَجْلَانَ عن محمد بن ابراھیم عن عامر بن سعدٍ بن ابی وَقَّاصٍ عن ابیہ: ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَمَرَ بوضعِ الیدین ونَصْبِ القدمین۔

☆قال عبد اللّٰہ و قال مُعَلّی بن اَسَدٍ : حَدَّثَنَا حَمَّادُ بن مَسْعَدَۃَ عن محمد بن عَجْلَانَ عن محمد بن ابراھیم عن عامر بن سعدٍ:اَن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم امر بوضع الیدین فذَکر نحوہٗ، ولم یذکرفیہ: عن ابیہ۔ قال ابو عیسی: ورَوَی یحیی بن سعیدٍ القَطَّانُ وغیرُ واحدٍ عن محمد بنِ عجلانَ عن محمد بن ابراھیم عن عامرِ بنِ سعدٍ: ان النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم امر بوضع الیدین ونصبِ القدمین: مُرْسَلٌ۔ وھذا اصحُّ من حدیث وُھَیْبٍ۔ وھو الذی اَجْمَعَ علیہ اھلُ العلم واخْتَارُوہٗ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عامر بن سعد اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں ہاتھوں کو زمین پر رکھنے اور دونوں پاؤں کو کھڑا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ عبداللہ دارمی نے کہا کہ معلٰی نے حماد بن مسعدہ سے انہوں نے محمد بن عجلان سے انہوں نے محمد بن ابراہیم سے اور انہوں نے عامر بن سعد سے اسی حدیث کے مثل روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ زمین پر رکھنے کا حکم دیا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یحیٰی بن سعید قطان اور متعدد حضرات محمد بن عجلان سے وہ محمد بن ابراہیم سے اور وہ عامر بن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہاتھوں کو زمین پر رکھنے اور پاؤں کو کھڑا رکھنے کا۔ یہ حدیث مرسل ہے اور یہ حدیث وہیب کی حدیث سے اصح ہے اسی پر اہل علم کا اجماع ہے اور انہوں نے اسی کو پسند کیا ہے کہ سجدے میں دونوں ہاتھ زمین پر رکھے جائیں گے اور پاؤں کو کھڑا کیا جائیگا۔

﴿تشریح﴾

سجدہ میں پاؤں کی انگلیوں کا قبلہ رخ کرنے کا حکم: سجدے میں دونوں پاؤں کو کھڑے کر کے سجدہ کرنا ضروری ہے اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ پاؤں کی انگلیوں کا قبلہ رخ کرنا بھی ضروری ہے[۱] چاہے ایک ہی انگلی قبلہ رخ کی جائے اس سے بھی وجوب ادا ہو جائیگا لیکن یہ قول صحیح نہیں۔

مسئلہ: اس مسئلہ سے عورتیں مستثنٰی ہیں (عورتیں پاؤں کو بحالتِ سجدہ کھڑا کرنے سے مستثنٰی ہیں) کیونکہ ان کیلئے مستحب وہ کام ہے جس میں ستر زیادہ ہو جیسا کہ دوسری روایات مثلاً ابوداؤد کی مرسل نقل کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ فقہاء میں سے کسی فقیہ نے عورتوں کے حق میں سجدہ کی حالت میں دونوں پاؤں کھڑا نہ کرنے کی تصریح نہیں[۲] کی لیکن فقہاء یہ تو کہتے ہیں کہ عورت اس صورت کو اختیار کرے جس میں پردہ زیادہ ہو تو یہ حکم سجدہ کی حالت کو بھی شامل ہوگا۔

---

[۱] جیسا کہ درمختار میں ہے کہ پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ کرنا فرض ہے اور یہ فرض ایک انگلی کو قبلہ رخ کرنے سے ادا ہو جائیگا ورنہ فرض ادا نہ ہوگا اور لوگ اس مسئلہ سے غافل ہیں۔ انتہی۔ قلت: علامہ شامی نے یہ ثابت فرمایا ہے کہ پاؤں کی انگلیوں کا قبلہ رخ کرنا سنت ہے۔

[۲] **عورتوں کے مستثنٰی ہونے کی دلیل:** مولانا رضی الحسن مرحوم کی تقریر میں ہے کہ شیخ مقری عبدالرحمٰن پانی پتی کہتے تھے کہ عورتوں کو بھی سجدے میں پاؤں کھڑے رکھنے چاہئیے۔ اور مفتاح الجنۃ سے نقل کیا ہے کہ پاؤں کھڑے نہیں رکھنے چاہئیے اسی کو حضرت گنگوہیؒ نے ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں عورتوں کیلئے زیادہ پردہ ہے۔ قلت: صاحب بحرالرائق اور ان کی اتباع کرتے ہوئے علامہ شامیؒ نے بھی اس پر تصریح کی ہے کہ عورت اپنے دونوں پاؤں سجدے میں کھڑے نہیں رکھے گی جیسا کہ مجتبٰی میں اس کو ذکر کیا ہے۔

(قولہ اصح من حدیث وھیب) یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کی یہ مرسل روایت وھیب کی روایت سے اصح اسلئے ہے کہ وہیب نے اپنی سند میں عامر بن سعد کے بعد عن ابیہ کے واسطے سے حدیث کو مرفوع قرار دیا ہے حالانکہ صحیح روایت وہ ہے جس کو عامر بن سعد نے مرسلاً نقل کیا ہے۔

باب ماجاء فی اقامة الصُّلْبِ اذا رفع راسَه من الركوع والسجود

باب ہے رکوع اور سجدے سے سر اٹھائے تو کمر سیدھی رکھنے کے بیان میں

☆حدثنا احمدُ بن محمد بن موسی المَرْوَزِیُّ اخبرنا عبدُ اللّٰه بن المُبارکِ اخبرنا شُعْبَةُ عن الحَکَمِ عن عبد الرحمٰن بن ابی لَیْلَی عن البَرَاءِ بن عازبٍ قال: کانت صلاةُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا رکع واذا رفع راسَهُ من الرکوع واذا سجد واذا رفع راسَهُ من السجود: قَرِیباً مِنَ السَّوَاءِ۔ قال : وفی الباب عن انسٍ۔

☆حدثنا محمدُ بن بَشَّارٍ حَدَّثَنَا محمد بن جعفر حَدَّثَنَا شعبةُ عن الحکم: نحوَهُ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ البَرَاءِ حدیث حسن صحیح۔ والعملُ علیه عندَ اهل العلم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ایسی ہوتی کہ جب رکوع کرتے یا رکوع سے سر اٹھاتے اور جب سجدہ کرتے یا سجدے سے سر اٹھاتے تو (یہ تمام افعال، رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ) تقریباً ایک دوسرے کے برابر ہوتے۔

اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ محمد بن بشار نے بیان کیا ان سے محمد بن جعفر نے اور ان کو شعبہ نے حکم کے واسطے سے اسی حدیث کے مثل روایت کی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ قریبا من السواء) اس جملہ سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع اور سجدہ کرنا

سب کومعلوم تھا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع اور سجدہ قومے اور جلسے کے برابر ہوتا تھا تو اس سے معلوم ہوا کہ قومے اور جلسے میں اپنی کمر کو اطمینان کے ساتھ ٹھہراتے تھے اور یہی مقصود ہے۔

بابُ ماجاء فی کراهیة ان یُبَادرَ الاِمَامُ بالرکوعِ والسجودِ

رکوع اور سجدہ میں امام سے پہلے جانے کی ناپسندیدگی کا بیان

☆حدثنا محمدُ بن بَشّارٍ حَدَّثَنَا عبدُ الرحمٰن بن مَهْدِیٌّ حَدَّثَنَا سفیانُ عن ابی اسحٰق عن عبد اللّٰہ بن یَزِیدَ حَدَّثَنَا البَرَاء۔ وهُوَ غیرُ کَذُوب قال: کُنَّااِذا صلَّینا خلفَ رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فرفع راسه مِن الرکوعِ لم یَحْنِ رجلٌ مِنّا ظهرَہ حتّٰی یسجدَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فَنَسْجُدَ۔

قال : وفی البابِ عن انسٍ، ومعاویَةَ، وابنِ مَسْعَدَةَ صاحبِ الجُیوشِ ، وابی هریرةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث البَرَاءِ حدیث حسن صحیح۔

وبه یقولُ اهلُ العلم: اِنَّ مَن خلفَ الاِمامِ انما یَتْبَعُونَ الاِمامَ فیما یصنعُ : لایرکعونَ اِلّا بعدَ رکوعِه، ولا یرفعونَ اِلّا بعدَ رفعه۔ لانعلُم بینهم فی ذٰلک اختلافاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن یزید سے روایت ہے کہ ہم سے براء نے نقل کیا (اور وہ جھوٹے نہیں ہیں) کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے سر اٹھاتے تو ہم میں سے کوئی شخص اپنی کمر کو نہ جھکاتا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کر لیتے پھر ہم سجدہ کرتے۔

اس باب میں حضرت انس، معاویہ، ابن مسعدہ، صاحب الجیوش اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو وہ امام کی ہر فعل میں اتباع کرے اور امام کے رکوع کے بعد ہی رکوع کرے اور اس کے سر اٹھانے کے بعد ہی سر اٹھائے اور ہم اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف کا علم نہیں رکھتے (یعنی اس مسئلہ میں تمام اہل علم متفق ہیں)۔

﴿تشریح﴾

اس جملہ کا مقصد: (حدثنا البراء وهو غیر کذوب الخ) رواۃ حدیث کی یہ عادت ہے کہ جب راوی کے سچا

ہونے کو بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ راوی اپنی اس روایت میں سچا ہے تو اس جملے کو لیکر آتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ یہ حدیث اگر چہ مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن اے حاضرین! تم جانتے ہو فلانا راوی جھوٹا نہیں ہے۔ یا اے مخاطبین! میں جانتا ہوں کہ اس راوی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کہ ہم حدیث کو صرف[1] ان پر ڈال دیں بلکہ اس حدیث پر یقین لانا ضروری ہے۔

لم یحن رجل منا کی توضیح: یہاں پر آنے والی حدیث اس لئے عقل وسمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ "لَمْ یَحْنِ رَجُلٌ مِنَّا" یہ قول مستلزم ہے کہ امام مقتدی کے سجدے میں پہنچنے سے پہلے تسبیحات کر چکا ہوگا اور یہی بات ذہنوں میں الجھن پیدا کر رہی تھی لیکن یہ حدیث کوئی مستبعد نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھاری ہوگیا تھا تو جوان صحابہ کرام جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سجدے کیلئے جھکتے جب بھی آپ سے پہلے پہنچ جاتے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی سجدے کیلئے جھک جائیں تو بطریق اولیٰ جلدی پہنچیں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمایا کہ جب تک میں سجدے میں نہ پہنچ جاؤں اپنی کمر کومت جھکانا۔

تکبیراتِ انتقال کا صحیح وقت: اس تقریر یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ امام کی تحریمہ اور ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے میں امام کے بعد جانا مسنون نہیں بلکہ امام کے ساتھ ساتھ جانا مسنون ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ جانے سے منع فرما دینا اس عذر کی وجہ سے تھا جس کو ہم بتلا چکے ہیں اور حنفیہ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس جیسے عذر کی صورت میں مقتدی کو امام کے بعد جانا چاہیئے لیکن جہاں امام کو کوئی عذر نہ ہو تو مقتدی ساتھ ساتھ منتقل ہوں اور یہ گمان نہ کرو کہ اس طرح ساتھ رہنے سے تو اقتداء باطل[2] ہو جائیگی بلکہ یہاں پر معیت سے معیتِ عرفیہ مراد ہے جو کہ امام اور مقتدی کے حال کے مناسب ہے یعنی مقتدی کچھ تھوڑے لمحے بعد (اتنا لمحہ جو کہ غیر محسوس ہو) امام کا اتباع کرے۔

---

[1] یہ لفظ تحتمل مجہول کا صیغہ ہے۔ حَمَلَ یَحْمِلُ اور احتملہ کے معنی اٹھانے کے ہیں۔ مجہول کی صورت میں ڈال دیا جانا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث جھوٹے نہیں تھے کہ اس خبر کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے بلکہ وہ سچے تھے تو انکی خبر پر یقین کرنا ضروری ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ اگر تکبیر تحریمہ میں مقتدی امام کے بالکل ساتھ ساتھ تکبیر کہے گا تو نماز باطل ہو جائیگی دوسرے ارکان میں امام کے بالکل ساتھ منتقل ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

تکبیرِ تحریمہ کے مسئلہ میں اختلاف: تکبیر تحریمہ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے برہان شرح مواہب الرحمٰن میں ہے کہ اگر مقتدی امام کی تحریمہ کے متصل تکبیر تحریمہ کہے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ تحریمہ منعقد ہو جائیگی اور صاحبین کے نزدیک یہ تحریمہ صحیح نہ ہوگی اور بعض علماء نے یہ اختلاف افضلیت کا لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک متصلاً تکبیر تحریمہ کہنا مقتدی کیلئے افضل ہے اور صاحبین کے ہاں امام کے بعد تکبیر تحریمہ کہنا مقتدی کیلئے افضل ہے نفسِ جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ انتہی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ماجاء فی کراهیة الاِقْعَاءِ فی السجودِ

باب سجدوں کے درمیان اقعاء کرنا مکروہ ہے۔

☆حدثنا عبدُ اللّٰہِ بن عبد الرحمٰنِ اخبرنا عبیدُ اللّٰہِ بن موسی حَدَّثَنَا اسرائیل عن ابی اسحٰق عنِ الحٰرِثِ عن علیٍّ قال: قال لی رَسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یاعلیُّ، اُحِبُّ لکَ مااُحِبُّ لنفسی، واَکْرَہُ لکَ مااَکْرَہُ لنفسی، لاتُقْعِ بین السجدَ تینِ۔

قال ابو عیسی: ھٰذا حدیث لانعرفہُ مِن حدیثِ علیٍّ اِلّا مِن حدیثِ ابی اسحٰق عن الحٰرِثِ عن علیٍّ۔ وقد ضَعَّفَ بعضُ اھل العلم الحٰرِثَ الاَعْوَرَ۔ والعملُ علی ھٰذا الحدیثِ عند اکثر اھل العلم: یَکرھونَ الاِقعاءَ۔ قال: وفی البابِ عن عائشۃَ، وانسٍ، وابی ھریرۃَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے علی! میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جس چیز کو اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں۔ تم اقعاء نہ کرو دونوں سجدوں کے درمیان۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو ہمیں ابو اسحٰق کے علاوہ کسی اور کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے کا علم نہیں۔ ابو اسحٰق حارث سے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور بعض اہل علم نے حارث اعور کو ضعیف کہا ہے اور اس حدیث پر اکثر اہل علم کا عمل ہے وہ اقعاء کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

اس باب میں حضرت عائشہ، انس، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) حلبی نے بھی یہ اختلاف افضلیت کے متعلق لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ تکبیر تحریمہ مقتدی کیلئے متصلاً اور متراخیاً بالاجماع دونوں طرح جائز ہے۔ ہاں امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر امام کی تکبیر کے متصل تکبیر تحریمہ کہے گا تو یہ نماز میں داخل ہونا نہیں سمجھا جائیگا۔ انتہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا کلام امام ابو حنیفہ کے قول پر مبنی ہے جیسا کہ سیاق کلام سے پتہ چل رہا ہے لیکن یہ بات قابلِ اشکال ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک اس طرح نماز باطل نہیں ہوتی نیز معیت عرفیہ اور معیت حقیقیہ میں فرق میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

﴿تشریح﴾

اقعاء کے دو مطلب: لفظ اقعاء دو معنوں کیلئے مشترک نہیں بلکہ اقعاء کہتے ہیں کہ سرین پر اس طرح سہارا لگائے کہ پنڈلیوں کو ان کے ساتھ ملا لے چاہے اپنے دونوں گھٹنے کھڑے رکھے اور سرین کو زمین پر رکھے یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح تشہد پڑھنے والا بیٹھتا ہے اس طرح بیٹھے بایں طور کہ اپنی سرین کو اپنے پاؤں پر رکھے اور دونوں پاؤں کھڑے ہوں۔ جیسا کہ تشہد پڑھنے والے کی وہ کیفیت ہوتی ہے جب وہ اطمینان سے نہیں بیٹھا ہوتا بلکہ وہ جلدی میں ہوتا ہے۔

اقعاء کی دونوں صورتوں کا الگ الگ حکم: یہ دونوں صورتیں مکروہ ہیں لیکن پہلی صورت نماز میں اختیار کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس میں کوئی حدیث جواز کی منقول نہیں اور دوسری صورت [1] مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ اس کے متعلق جواز کی بھی حدیث مروی ہے۔ یہ تو حنفیہ کا مذہب ہے دوسرے ائمہ ان دونوں قسموں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

لفظ اقعاء کوئی مشترک لفظ نہیں کیونکہ اگر ہم لفظ اقعاء کو اقعاء کی دونوں قسموں میں مشترک مانیں تو اقعاء کی ایک قسم کے اوپر نہی وارد ہوگی وہ قسم مکروہ ہوگی اور اقعاء کی قسم ثانی پر نہی وارد نہ ہونے کی وجہ سے یہ قسم مباح غیر مکروہ ہوگی جبکہ حنفیہ کے ہاں یہ لفظ اقعاء لفظ مشترک نہیں لہٰذا یہ نہی اقعاء کی دونوں قسموں کو شامل ہے۔

باب ماجاء فی الرُّخصَة فی الاِقعاءِ

باب ہے سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے کے جائز ہونے کے بیان میں

☆حدثنا یحیی بن موسی حَدَّثَنَا عبدُ الرَّزّاق اخبرنا ابن جُرَیْجٍ اخبرنی ابو الزُّبَیْرِ انه سمعَ طاوُساً یقولُ: قُلْنَا لابن عباسٍ فی الاِقْعَاءِ علی القدمین؟ قال: هی السُّنَّةُ، فقلنا، اِنَّا لَنَرَاهُ جَفَاءً بِالرَّجُلِ ؟ قال: بل هی سُنَّةُ نبیِّکم صلی اللّٰه علیه وسلم۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیح۔

---

[1] یعنی ہمارے مذہب میں یہ قسم ثانی مکروہ ہے ورنہ شوافع نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اس کو مستحب کہا ہے جیسا کہ بذل المجہود میں اس کی تفصیل ہے۔ یہ توجیہ اس لئے کی گئی تا کہ احادیث میں جو بظاہر تعارض سمجھ میں آرہا ہے کہ حدیث باب میں اقعاء کو سنت کہا گیا ہے اور حضرت علی، انس، سمرہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی احادیث میں اقعاء سے منع کیا گیا ہے اس طرح یہ تعارض ختم ہو جائیگا جیسا کہ بذل میں ہے:

وقد ذهب بعضُ اهل العلم الی هذا الحدیث، مِن اصحاب النبیؐ صلی اللّٰہ علیه وسلم: لایَرَوْنَ بِـالْاِءِ قـعـاءِ بـاْساً۔ وهو قولُ بعضِ اهلِ مکۃَ مِن اهل الفقهِ والعلم۔ قال: واکثرُ اهل العلم یَکرهونَ الإقعاءَ بین السجد تین۔

﴿ترجمه﴾

ابن جریج ابوالزبیر سے اور وہ طاؤس سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جلسہ میں ایڑھیوں پر بیٹھنے کا حکم دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: یہ سنت ہے۔ ہم نے کہا ہم اسے آدمی کے گنوار پن کی علامت سمجھتے ہیں۔ تو (ابن عباس رضی اللہ عنہما) نے فرمایا بلکہ یہ تمہارے نبی کی سنت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ بعض اہل علم صحابہ میں سے اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقعاء میں کوئی حرج نہیں۔ یہ اہل مکہ میں سے بعض علماء وفقہاء کا قول ہے اور اکثر اہل علم سجدوں کے درمیان اقعاء کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

اس قول کی تشریح: (قلنا لابن عباس فی الاقعاء علی القدمین قال هی السنة) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس مشہور کہاوت کی قبیل سے ہے کہ کہا جاتا ہے "خذه بالموت حتی یرضی بالحمی" (اس کو موت جیسی بڑی سزا سناؤ تاکہ وہ بخار (چھوٹی سزا) پر راضی ہو جائے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ اقعاء کو حرام سمجھ رہے ہیں تو ان پر رد کرنے کیلئے اس کو سنت فرمایا تاکہ ان کے اس برے خیال کا اچھی طرح رد ہو جائے۔ یہاں پر سنت سے مراد یہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور شرعی حکم کے اس کو سنت قرار دیا ہو بلکہ ایک آدھ دفعہ شاید اس کا صدور آپ سے ہوا ہو اور اس ھیئت میں بیٹھنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موزے پہنے ہوئے تھے اور وہ موزے ایسے تھے کہ ان کے پہننے کی صورت میں بوجہ موٹے ہونے کے اور وہ پنڈلی تک پہنچے ہوئے تھے اس لئے سنت ھیئت کے اوپر بیٹھنا مشکل ہو گیا کہ آپ بایاں پاؤں بچھاتے اور سیدھے پاؤں کو کھڑا رکھتے۔ (اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کولہے قدمین پر رکھے اور قدمین کھڑے ہوئے تھے)۔

(انا لنراہ جفاء بالرجل) یہ لفظ راء کے زبر کے ساتھ بھی ضبط ہے، ۲۔ راء کے زیر کے ساتھ بھی اور راء کے زیر ہونے کی صورت میں اقعاء کی قسم ثانی مراد ہوگی کیونکہ اس قسم ثانی میں پاؤں پر تکلیف ہوتی ہے پہلی قسم میں سہولت ہے لہٰذا پہلی قسم اپنی ممانعت کی حالت پر برقرار ہے۔

باب مایقول بین السجدتین

باب اس بارے میں کہ جلسہ میں کیا پڑھے؟

☆حدثنا سَلَمَةُ بن شَبِیبٍ حَدَّثَنَا زیدُ بن حُبَابٍ عن کاملٍ ابی العَلَاءِ عن حَبیبِ بن ابی ثابتٍ عن سعید بن جُبَیْرٍ عن ابن عباسٍ: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یقولُ بین السجد تینِ: اللّٰھُمَّ اغْفِرْلی وار حمنی واجبُرْنی واھْدِنی وارزُقْنی۔

☆حدثنا الحسنُ بن علیٍّ الخَلَّالُ الحُلْوَانیُّ حَدَّثَنَا یزیدُ بن ھرونَ عن زیدِ بنِ حُبَابٍ عن کاملٍ ابی العَلَاءِ: نحوَہ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث غریبٌ۔ و ھکذا رُوِیَ عن علیٍّ۔ وبہ یقولُ الشّافعیُّ، واحمدُ، واسحٰقُ: یَرَوْنَ ھذا جائزاً فی المکتوبۃِ والتطوُّعِ۔ ورَوَی بعضھم ھذا الحدیثَ عن کاملٍ ابی العلاءِ مُرْسَلاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے "اللھم اغفر لی وارحمنی واجبرنی واھدنی وارزقنی" (ترجمہ: اے اللہ میری مغفرت فرما مجھ پر رحم فرما، میری مصیبت اور نقصان کی تلافی فرما مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما)۔

---

[۱] ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جفاء بالرجل اس کا ایک معنی قدم کا ہے اور بعض روایات میں رجل لفظ ہے جس کے معنی انسان کے ہیں۔ احادیث میں دونوں طرح اس کی تفسیر آتی ہے مسند احمد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ راء کے زیر اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے کیونکہ اس میں انا لنراہ جفاء بالقدم کے الفاظ ہیں۔ ابن خیثمہ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ راء کے زبر اور جیم کے پیش کے ساتھ ہے کیونکہ اس میں انا لنراہ جفاء بالمرء کے الفاظ ہیں۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ راویوں نے اس لفظ کو نہیں سمجھا اور اس میں تصحیف کر کے اپنے گمان کے مطابق روایت کے الفاظ نقل کر دیئے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

حسن بن علی الخلال، یزید بن ہارون سے انہوں نے زید بن حباب سے اور انہوں نے کامل ابو العلاء سے اسی کے مثل روایت کی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث (ابن عباس رضی اللہ عنہما) غریب ہے اور یہ ذکر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور امام شافعی، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے کہ یہ دعا فرائض ونوافل تمام نمازوں میں پڑھنا جائز ہے اور بعض راوی حضرات نے یہ حدیث ابو العلاء کامل سے مرسل روایت کی ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب میں مذکور دعا پڑھنا حنفیہ کے مذہب کے خلاف ہے۔ اس کا جواب پہلے تفصیل سے گزر چکا لیکن اگر کوئی شخص یہ دعا یا اس جیسی ماثور دعا پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہ ہوگا جیسا کہ بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے اسی طرح یہ دعا پڑھنے سے نماز فاسد بھی نہ ہوگی جیسا کہ بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس طرح نماز باطل ہو جائیگی۔

باب ماجاء فی الاعتماد فی السجود

باب سجدے میں کہنیاں ٹیکنے سے متعلق روایت کے بیان میں

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللَّیثُ عن ابن عَجْلَانَ عن سُمَیٍّ عن ابی صالحٍ عن ابی ھریرةَ قال: اشْتَکٰی بعضُ اصحابِ النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم الی النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم مَشَقَّةَ السجود علیهم اذا تَفَرَّجُوا فقال: اسْتَعِینُوا بِالرُّکَبِ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث غریب لانعرِفه مِن حدیثِ ابی صالح عن ابی ھریرة عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم اِلّا من ھذا الوجهِ، مِن حدیثِ اللَّیثِ عن ابن عَجْلَانَ۔

وقدرَوَی ھذا الحدیثَ سفیانُ بن عُیینة وغیر واحدٍ عن سُمَیٍّ عن النُّعمَانِ بن ابی عَیَّاشٍ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم : نحوَ ھذا۔ وَکَاَنَّ روایةَ ھؤلاءِ اصحُّ مِن روایة اللَّیثِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ انہیں سجدے کی حالت میں اعضاء کو علیحدہ علیحدہ رکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھٹنوں سے

مدد لے لیا کرو! (یعنی کہنیوں کو گھٹنوں کے ساتھ ٹکا لیا کرو)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم اس حدیث کو ابو صالح کی روایت سے اس سند کے علاوہ نہیں جانتے جو ابو صالح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ یہ مذکورہ سند لیث ابو العجلان سے روایت کرتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ اور کئی حضرات سمی سے وہ نعمان بن ابو عیاش سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی حدیث کے مثل روایات کرتے ہیں گویا ان کی روایت لیث کی روایت سے اصح ہے۔

﴿تشریح﴾

گھٹنوں کے پکڑنے کا حکم سجدہ سے اٹھتے ہوئے ہے یا دوران سجدہ: (اشتکی اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم مشقة السجود علیهم اذا تفرجوا) جب صحابہ کرام کو یہ حکم ہوا کہ سجدے میں اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھیں تو کمزور صحابہ پر یہ حکم بوجہ مشقت کے شاق گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ضعیف صحابہ کرام کو اجازت دی کہ کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر مدد طلب کر سکتے ہیں کہ جب سجدے سے اٹھنے لگیں[1] یا سجدے میں جانے لگیں اور ایک سجدے سے دوسرے سجدہ کی طرف منتقل ہونے لگیں تو کہنیوں کا سہارا لے سکتے ہیں تاکہ آسانی ہو جائے۔

قال ابو عیسیٰ کی تشریح: (وکان روایة هولاء اصح من روية لیث) یعنی لیث راوی نے سمی کے بعد ابو صالح کو ذکر کیا تھا[2] لیکن دوسرے راویوں نے سمی کے بعد نعمان بن ابی عیاش کو ذکر کیا ہے اور یہی اصح ہے۔ اصح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ پر بہت سے راویوں نے اس سند کو نقل کیا ہے۔

---

[1] حافظ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ کی مراد کی یہی تفسیر ذکر کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہاں ترجمۃ الباب "باب ما جاء فی الاعتماد" اذا قام من السجود قائم کیا ہے تو یہ ترجمہ شارحہ ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی سجدے سے کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ گھٹنے سے مدد لے سکتا ہے۔ انتہی

حافظ کا نقل کردہ جملہ تو عام نسخوں کے مطابق نہیں ہے: قلت: ہمارے سامنے جو ترمذی کے نسخے ہیں اس میں حافظ کا نقل کردہ اذا قام من السجود کا جملہ نہیں ہے بلکہ یہاں باب ما جاء فی الاعتماد فی السجود کا لفظ ہے حدیث کا مشہور معنی جیسا کہ بذل وغیرہ میں ہے کہ کہنیوں کو گھٹنے پر رکھ کر سجدے میں ان سے سہولت حاصل کی جا سکتی ہے۔ (اس حدیث میں سجدے سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتے ہوئے گھٹنے پکڑنا مقصود نہیں۔ از مترجم)

[2] امام ترمذی نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو اس کے متصل ہونے پر ترجیح دی ہے اور حدیث کے متصل ہونے کو شاذ کہا ہے حضرت سہارنپوری نے بذل میں طحاوی کی روایت نقل کر کے لیث راوی کا متابع حیوۃ بن شریح نقل کیا ہے اس طرح امام ترمذی کے اس کلام کا تعقب فرمایا ہے جو وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

باب ماجاء كيف النُّهُوضُ من السجودِ

باب سجدے سے اگلی رکعت کیلئے کیسے اٹھا جائے

☆حدثنا عليُّ بنُ حُجرٍ اخبرنا هُشَيمٌ عن خالد الحَذّاءِ عن ابی قِلَابَةَ عن مالكِ بن الحُوَيْرِثِ اللَّيْثِیِّ: أنّهُ رَأى النبیَّ صلى اللّٰه عليه وسلم يصلّی، فكانَ اذا كانَ فی وِتْرٍ مِن صلاتِهِ لم يَنْهَضْ حتّی يَسْتوِیَ جالساً۔ قال ابو عيسی: حديث مالكِ بنِ الحُوَيْرِثِ حديث حسن صحيح۔ والعملُ عليه عندَ بعضِ اهل العلم۔ وبه يقولُ اسحق وبعضُ اصحابنا۔ ومالكٌ يُكْنَى۔ ابا سليمان۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت مالک بن حویرث لیثی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے دوران طاق (پہلی اور تیسری) رکعات میں اس وقت تک کھڑے نہ ہوتے جب تک اچھی طرح بیٹھ نہ جاتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مالک بن حویرث کی حدیث حسن صحیح ہے اور بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے اور ہمارے ائمہ بھی اس کے قائل ہیں۔

باب منه ايضاً

باب اسی کے متعلق

☆حدثنا يحيى بن موسى حَدَّثَنَا ابو معاوية حَدَّثَنَا خالد بن اِلْيَاسَ عن صالحٍ مولى التَّوْأمَةِ عن ابی هريرة قال: كان النبیُّ صلى اللّٰه عليه وسلم يَنْهَضُ فی الصلاة على صُدُورِ قَدَمَيْهِ۔

قال ابو عيسى: حديث ابی هريرة عليهِ العملُ عند اهل العلم: يَختَارون ان ينهضَ الرجلُ فی الصلاة على صدور قدميه۔ وخالدُ بن اِلْيَاسَ هو ضعيفٌ عند اهل الحديث قال: ويقال خالدُ بن اِيَاسٍ ايضاً۔ وصالحٌ مولَى التَّوْأمَةَ هو صالحُ بن ابی صالحٍ۔ وابو صالحٍ اسمُه نَبْهَانُ وهُوَ مدنیٌّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پنجوں پر زور دے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر ہی اہل علم کا عمل ہے کہ (پنجوں کے بل زور

دے کر) کھڑا ہوا جائے (یعنی بیٹھے نہیں) اور وہ اسی کو پسند کرتے تھے۔ خالد بن ایاس محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں اور انہیں خالد بن الیاس بھی کہا جاتا ہے صالح مولی توامۃ سے مراد صالح بن ابو صالح ہے اور ابو صالح کا نام نبھان مدنی ہے۔

﴿تشریح﴾

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جلسۂ استراحت بطور رخصت صادر ہوا تھا اسپر حنفیہ شافعیہ کا اتفاق ہے:

(لم ینھض حتی یستوی جالسا) اس پر حنفیہ، شافعیہ کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث باب میں مذکور فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زندگی میں فرمایا ہے لیکن پہلے فعل کو چھوڑنا اگر اس وجہ سے ہو کہ وہ منسوخ ہو گیا تھا ہوتو ہم بھی اس کو چھوڑ دیں گے لیکن دوسری احادیث سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر بھاری ہو گیا تھا تو بطور رخصت کے جلسہ استراحت فرمایا ہے تو عزیمت، جلسۂ استراحت نہ کرنے ہی میں ہے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام نے جلسہ استراحت پر عمل کیا پس اگر یہ جلسۂ استراحت والی حدیث حکم شرعی ہوتی اور ماقبل کے لئے ناسخ ہوتی تو صحابہ اس حدیث کو نہ چھوڑتے اور منسوخ فعل پر عمل نہ کرتے۔[1]

حنفیہ پر اعتراض اور اسکا جواب: (خالد بن ابی ایاس ضعیف) اس خالد راوی کی دوسرے ائمہ نے توثیق کی ہے امام ابوداؤد نے [2] ان سے روایت کو نقل کیا ہے اگر ان کو ضعیف مان بھی لیں تو بھی ان کی راویت کی تائید اس طور پر ہوتی ہے کہ فقہاء نے اس حدیث پر اپنا عمل برقرار رکھا ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اقرار کیا ہے کہ تمام اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ (از مترجم: یہ تسلیمی جواب ہوا۔ ورنہ ابن عدی نے لکھا ہیکہ مع ضعفہ یکتب حدیثہ معارف السنن ج ص ۸۲: جلد ثالث۔ از تہذیب الحافظ)

---

[1] **مذاہب ائمہ:** یہ بات صحابہ کرام سے مروی ہے کہ جلسہ استراحت نہ کرنے پر ان کا اجماع تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اکثر احادیث جلسہ استراحت کے نہ کرنے پر دلالت کرتی ہیں اس جلسہ کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس جلسہ استراحت کو مستحب کہتے ہیں۔ امام مالک، اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ رحمہم اللہ اور ان کے شاگرد جلسہ استراحت کے ترک کے قائل ہیں۔ امام احمد سے دو روایتیں دونوں مذہبوں کی طرح منقول ہیں۔

[2] مولانا رضی الحسن مرحوم کی تقریر میں ہے کہ خالد بن ایاس راوی سے ابوداؤد میں مذکور ہے لیکن اصحاب رجال نے انکی روایت کو ابو داؤد کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اس کو ترمذی اور ابن ماجہ کی طرف منسوب کیا ہے ہاں حافظ نے اپنی تہذیب میں اس کو ذکر کیا ہے۔ امام ابوداؤد...... ابن عدی فرماتے ہیں کہ انکی تمام حدیثیں غرائب اور افراد کے قبیل سے ہیں لیکن ان کے ضعیف ہونے کے باوجود ان کی حدیث قابلِ قبول ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ضعیف ہونے کے باوجود انکی حدیث قابلِ قبول ہے کیونکہ صحابہ کرام کا اس حدیث پر عمل ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ماجاء فی التشهد

تشہد پڑھنے کا بیان

☆حدثنا یعقوبُ بن ابراهیم الدَّوْرَقِیُّ حَدَّثَنَا عبیدُ اللّٰهِ الاَشْجَعِیُّ عن سفیانَ الثَّوْرِیِّ عن ابی اسحٰق عن الاَسْوَدِبن یزیدَ عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ قال: عَلَّمَنَا رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا قَعَدْنَا فی الرکعتینِ ان نقولَ: التَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ، والصَّلَوَاتُ والطَّیِّبَاتُ، السَّلَامُ علیك اَیُّهَا النَّبِیُّ ورحمةُ اللّٰهِ وَبرکاتُه، السلامُ علینا وعلی عبادِ اللّٰهِ الصَّالِحِینَ، اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰه اِلَّا اللّٰهُ، وَاَشْهَدُ ان محمداً عبده ورسولُه۔

قال: وفی الباب عن ابنِ عُمَرَ، وجابرٍ، وابی موسی، وعائشة۔

قال ابو عیسی: حدیث ابنِ مسعودٍ قدروِیَ عنه من غیر وجْهٍ۔ وهو اصحُّ حدیث رُوِیَ عن النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی التشهدِ۔ والعملُ علیه عندا کثر اهل العلم من اصحاب النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم ومَنْ بعدَ هم مِن التابعین۔ وهو قولُ سفیانَ الثَّوْرِیِّ، وابنِ المبارکِ، واحمدَ، واسحٰق۔

☆حدثنا احمدُ بن محمد بن موسی اخبرنا عبد اللّٰه بن المبارك عن مَعْمَرٍ عن خُصَیْفٍ قال: رَاَیتُ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی المنامِ، فقلتُ یارسولَ اللّٰهِ، اِنَّ الناسَ قد اخْتَلَفُوا فی التشهدِ؟ فقال علیكَ بِتَشَهُّدِ ابْنِ مسعودٍ۔ (مصری نسخہ میں یہ اثر موجود ہے)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) از مترجم: حافظ نے تہذیب التہذیب ص ۸۰: جلد سوم میں خالد بن الیاس یقال، ایاس بن صخر بن ابی الجہم، عبید بن حذیفہ العدوی المدنی کے الفاظ سے انکا تذکرہ کیا ہے اور اس پر ت، ق کی علامت لگائی ہے۔ امام احمدؒ نے انکو متروک الحدیث اور ابن معین نے لیس بشیء ولا یکتب حدیثه اور ابوحاتم نے ضعیف الحدیث اور ابونعیم نے فرمایا کہ اس کی حدیث دو پیسوں کے برابر بھی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے منکر الحدیث لیس بشیء فرمایا۔ امام ابوداؤد نے فرمایا کہ خالد راوی تیس سال تک مسجد نبوی میں امامت کرتے رہے۔ نسائی نے متروک الحدیث اور ابن عدی نے فرمایا احادیثه غرائب وافراد ومع ضعفه تکتب حدیثه۔ اس کے بعد آخر تک اس کے ضعیف الحدیث ہونے کے اقوال لکھے ہیں اور ابن عبدالبر کے قول ضعیف عند جمیعهم پر کلام کا اختتام فرمایا ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا کہ جب ہم دوسری رکعت میں بیٹھیں تو یہ پڑھیں "التحیات للہ و الصلوٰت و الطیبات " الخ (ترجمہ: تمام تعریفیں (قولی عبادات) اور بدنی عبادات (نماز وغیرہ) اور مالی عبادات (زکوٰۃ وغیرہ) اللہ ہی کیلئے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلام ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اس باب میں ابن عمر، جابر، ابوموسیٰ اور عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ان سے (یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے) متعدد طرق سے مروی ہے۔ یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تشہد کے باب میں مروی تمام احادیث سے اصح ہے اور اسی پر اکثر علماء، صحابہ و تابعین کا اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔

☆ خصیف کہتے ہیں میں نے خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو میں نے عرض کیا کہ لوگ تشہد کے متعلق کافی اختلاف کر رہے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کو اختیار کرو۔

بابٌ مِنْهُ ایضاً

اسی تشہد کے مسئلہ سے متعلق باب

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عن ابی الزُّبَیْرِ عن سعید بن جبیر وطاوُسٍ عن ابن عباسٍ قال: کان رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُعَلِّمُنَا التشهدَ، کمایُعَلِّمُنَا القرآنَ، فکان یقولُ: التَّحِیَّاتُ المُبَارَکَاتُ الصَّلوَاتُ الطَّیِّبَات لِلّٰهِ، سَلَامٌ علیك اَیُّهَاالنَّبِیُّ ورحمةُ اللّٰهِ وبرکاتُه، سَلَامٌ علینا وعلی عِبادِ اللّٰه الصَّالِحِینَ، اَشْهَدُ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَشْهَدُ ان محمداً رسولُ اللّٰهِ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ ابن عباسٍ حدیثٌ حسن غریبٌ صحیحٌ۔ وقد رَوَی عبدُ الرحمٰن بنُ حُمَیدٍ الرُّؤَاسِیُّ هذا الحدیثَ عن ابی الزُّبیرِ، نَحْوَ حدیثِ اللَّیْثِ بن سعدٍ۔

وَرَوَی اَیْمَنُ بْنُ نَابِلٍ الْمَکِّیُّ ھذا الحدیثَ عن ابی الزُّبَیْرِ عن جابرٍ، وھو غیرُ مَحْفُوظٍ۔

وذَھَبَ الشافعیُّ الی حدیثِ ابن عباسٍ فی التشھدِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآن سکھاتے اور فرماتے التحیات المبارکات الخ (ترجمہ: تمام بابرکت تعریفات اور تمام مالی و بدنی عبادات اللہ ہی کیلئے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن صحیح غریب ہے۔ عبدالرحمٰن بن حمید رواسی نے بھی یہ حدیث ابوزبیر سے لیث بن سعد کی روایت کے مثل بیان کی ہے اور ایمن بن نابل مکی نے بھی یہ حدیث ابوزبیر سے جابر کے واسطے سے روایت کی ہے لیکن یہ غیر محفوظ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تشہد میں اس حدیث کی طرف گئے ہیں (یعنی اس حدیث میں مذکور دعا تشہد میں پڑھتے ہیں)۔

﴿تشریح﴾

(التحیات للہ والطیبات الخ) التحیات[1] کہتے ہیں زبانی عبادتوں کو والصلوات کہتے ہیں زبان کے علاوہ باقی اعضاء کی عبادتوں کو الطیبات کہتے ہیں عبادات مالیہ کو حدیث شریف میں زبانی طاعات کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ بندے کے افعال میں زبان کا خاص دخل ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابن آدم جب صبح کرتا ہے تو جسم کے تمام اعضاء زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور اس سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ ایسی بات نہ کہنا جس کے سبب دنیا و آخرت کی مشقتیں جھیلنی پڑیں شاعر نے بھی اپنے شعر میں اسطرح کہا ہے: "انّ اللسان صغیرٌ جرمُہٗ ولہٗ:: جُرْمٌ کبیرٌ کما قد قیل فی المثل" (ترجمہ: یعنی زبان کا جثہ تو چھوٹا ہے اور اس کا جُرم بڑا ہے بڑے بڑے جرموں کا ارتکاب کرتی ہے جیسا کہ

---

[1] علامہ ابن نجیم اس حدیث کے الفاظ کی تفسیر سے متعلق لکھتے ہیں کہ یہاں متعدد اقوال ہیں سب سے بہترین قول یہ ہے کہ التحیات سے مراد عبادات قولیہ، صلوات سے مراد عبادات بدنیہ اور طیبات سے مراد عبادات مالیہ ہیں تمام عبادات صرف ایک اللہ کیلئے ہیں اس کے علاوہ کوئی بھی مستحق عبادت نہیں۔

مشہور کہاوت ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے زبان میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ اس سے کتنے ہی کام لئے جائیں نہ یہ تھکتی ہے نہ کمزور پڑتی ہے بخلاف دوسرے اعضاء کے کہ وہ تھک جاتے ہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے متعلق مباحث حاشیہ میں موجود ہیں اسلئے ہم ان کو چھوڑ رہے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی فراست کا ایک واقعہ: یہاں ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے سوال کیا "بواو ام بواوین" تو[1] امام صاحب نے جواب دیا بواوین تو سائل نے کہا بارک اللہ فیک کما بارک فی لا و لا[2]۔ حاضرین مجلس کو سوال اور جواب سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے امام صاحب سے اس کے متعلق پوچھا تو امام صاحب نے تشریح فرمائی کہ اس شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ تم کس تشہد کو اختیار کرتے ہو تو میں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا تو سائل نے مجھے یہ دعا دی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے زیتون کے درخت میں برکت دی ہے اسی طرح میرے علم میں بھی برکت عطا فرمائے۔ فافہم

باب ماجاء انه يُخفِي التشهدَ

باب تشہد آہستہ آواز سے پڑھنا مسنون ہے

☆ حَدَّثَنَا ابو سعيدِ الاشَجُّ حَدَّثَنَا يونسُ بن بُكَيرٍ عن محمد بن اسحٰقَ عن عبد الرحمٰن بن الاَسْوَدِ عن ابيه عن عبد الله بن مسعود قال: من السُّنَّةِ ان يُخفِيَ التَّشَهُّدَ۔ قا ابو عيسى: حديث ابنِ مسعودٍ حديث حسن غريب و العملُ عليه عند اهل العلم۔

---

[1] اصل نسخہ میں یونہی ہے صحیح لفظ بلا واو ام بواوین ہے۔ جیسا کہ صاحب سعایہ نے ذکر کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ (بواوین سے اشارہ تشہد ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف ہے اور) پہلے جملہ بلا واو سے اشارہ تشہد ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تشہد میری تلاش کے مطابق بغیر واؤ کے ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر لکھنے والے سے غلطی ہوئی ہے پھر مجھے میرے بعض ساتھیوں نے بتایا کہ جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے واقعہ ذکر کیا ہے بواو۔ یہی صحیح ہے اسی طرح صاحب بدائع نے بھی نقل کیا ہے وہ یہ لکھتے ہیں کہ بعض ائمہ ابو موسیٰ کے تشہد کو اختیار کرتے ہیں جس میں التحيات لله الطيبات و الصلوات لله (تو اس تشہد ابی موسیٰ میں صرف ایک واؤ مذکور ہے اور بواو سے اسی تشہد کی طرف اشارہ ہو۔ از مترجم) اور باقی تشہد ابن مسعودؓ کے تشہد کی طرح ہے اس میں یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک اعرابی نے امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا تھا۔ بواو ام بواوین الخ تو اس سے حضرت گنگوہیؒ کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔ فللہ الحمد

[2] اس سے زیتون کے درخت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے شجرة مباركة زيتونة لا شرقية و لا غربية (اس میں لا و لا مذکور ہے)۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تشہد میں اخفاء سنت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن غریب ہے اور اس پر تمام اہل علم کا عمل ہے۔

﴿تشریح﴾

(من السنة ان یخفی التشهد) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص تشہد بلند آواز سے پڑھے تو یہ سنت طریقے کے خلاف ہے اور مکروہ ہے لیکن نماز میں فساد یا نقص نہیں آئیگا۔

باب ماجاء کیفَ الجلوس فی التشهد

باب تشہد میں کیسے بیٹھا جائے

☆حدثنا ابو کُرَیْبٍ حَدَّثَنَا عبدُ اللّٰهِ بن اِدریسَ حدثناعاصم بن کُلَیْبٍ الجَرْمِیُّ عن ابیه عن وائلِ بن حُجرٍ قال: قَدِمْتُ المدینةَ، قُلْتُ لَاَنْظُرَنَّ الی صلاة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فلمّا جلسَ یَعْنِی لِلتشهدِ افْتَرَشَ رِجله الیسرَی، ووضع یدهُ الیسرَی یَعْنِی علی فِخَذِهِ الیسرَی ونَصَبَ رجلَه الیمنَی۔

قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیح۔ والعملُ علیه عند اکثرِ اهل العلم وهو قولُ سفیانَ الثوری، واهل الکوفةِ وابن المبارکِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں مدینہ آیا تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ضرور دیکھوں گا۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کیلئے بیٹھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بایاں پاؤں بچھایا اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور داہنا پاؤں کھڑا کیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، اور اہل کوفہ (احناف رحمہم اللہ) کا بھی یہی قول ہے۔

باب منه ایضاً

باب اسی سے متعلق

☆حدثنا بندارٌ محمد بن بَشّارٍ حَدَّثَنَا ابو عامرٍ العَقَدِيُّ حَدَّثَنَا فُلَيح بن سليمانَ المدنيُّ حدثني عباسُ بن سهلٍ السّاعِدِيُّ قال: اجتمعَ ابو حُمَيْدٍ وابو أُسَيْدٍ وسهلُ بن سعدٍ ومحمد بن مَسْلَمَةَ فَذَكَرُوا صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم،

فقال ابو حُمَيْدٍ: اَنَا اعلمُكم بصلاةِ رسول الله صلى الله عليه وسلم، اِنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم جلسَ يَعْنِي للتشهد فافْتَرَشَ رجلَه اليسرىَ، وَاَقْبَلَ بِصَدْرِ اليمنى على قِبْلَتِهِ، ووضَعَ كفّه اليمنىَ على ركبتهِ اليمنىَ، وكفَّه اليسرَى على ركبتِه اليسرىَ، واشار بِاِصْبَعِهِ، يعني السَّبَّابَةَ۔

قال ابو عيسى: وهذا حديث حسن صحيح۔ وبه يقولُ بعضُ اهلِ العلم۔ وهو قولُ الشافعي، واحمدَ واسحٰق۔

قالو: يَقْعُدُ في التشهدِ الآخِرِ على وَرِكِهِ واحتَجُّوابحديث ابي حُمَيْدٍ۔وقالوا يقعد في التشهد الاول على رجله اليسرىٰ وينصب اليمنىٰ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عباس بن سہل ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوحمید، ابواسید، سہل بن سعد، اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم ایک جگہ جمع ہوئے اورانہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا تذکرہ شروع کردیا۔ پس ابوحمید نے فرمایا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے متعلق تم سب سے زیادہ جانتا ہوں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کیلئے بیٹھے تو بایاں پاؤں بچھایا اور سیدھے پاؤں کے پنجے کو قبلہ کی طرف کیا اور اپنا دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھا اور اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور یہ بعض علماء کا قول ہے۔ امام شافعی، احمد، اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ آخری تشہد میں سرین پر بیٹھے اور ابوحمید کی حدیث سے انہوں نے استدلال کیا اور یہ بھی کہا کہ پہلے تشہد میں بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھے۔

﴿تشریح﴾

اس باب کا مقصد آخری تشہد میں تورک کے سنت ہونے کو بتانا ہے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: رہا یہ اشکال کہ اس حدیث میں تورک کا ذکر نہیں تو جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے میں تورک کا ذکر ہے مصنف نے ایک جزء کو ذکر کر کے پوری حدیث کی طرف اشارہ کر دیا۔

تورک کے مسئلہ میں مذاہب ائمہ: تورک کے مسئلہ میں کل چار مذاہب ہیں: ۱۔امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب میں دونوں تشہدوں میں تورک ہوگا ۲۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں دونوں تشہدوں میں تورک نہیں ہوگا ۳۔امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں صرف تشہد ثانی میں تورک ہے اور پہلے تشہد میں افتراش ہے اور بعض ائمہ کے ہاں اس کے برعکس ہے[1]۔

حدیث باب کا جواب: حدیث باب کا جواب گزر چکا ہے کہ[2] یہ تورک عذر کی وجہ سے تھا اور اس عذر کا بیان بھی گزر چکا ہے۔

---

[1] اصل نسخہ میں یہاں بیاض ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس امام کا مذہب ہو۔ مولانا رضی الحسن مرحوم کی تقریر میں اس کو امام احمد کی ایک روایت شمار کیا ہے لیکن مجھے حنابلہ کی فروع میں یہ روایت نہیں ملی اگر اس کا نہ ہونا تسلیم کیا جائے تب تو ٹھیک ہے اور اگر یہ حنابلہ سے واقعی روایت ہے تو ابن قدامہ نے حنابلہ کی فروع میں ایک روایت جلسہ استراحت کی اس طرح نقل کی ہے کہ آدمی اپنے کولہے پر بیٹھے اور ران کو زمین کے ساتھ لگائے تاکہ جلسہ بین السجدتین کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ پس ممکن ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہو۔

یہاں یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام شافعی، امام احمد کا ایک ہی مذہب ذکر کیا ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کے مذاہب میں فرق ہے۔

مذہب شافعی اور مذہب حنبلی میں فرق اور ثمرۂ اختلاف: اس کی تفصیل اوجز میں ہے خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعی کے ہاں ہر وہ تشہد کہ جس کے بعد سلام ہو اسمیں تورک سنت ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں دو تشہدوں میں سے آخری تشہد میں تورک سنت ہے ثمرہ اختلاف یہ نکلے گا کہ فجر کی اور جمعہ کی نماز میں امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں تورک کریگا اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں افتراش۔

[2] مجھے نہیں معلوم کہ حدیثِ تورک کا جواب کہاں گزرا ہے شاید جلسہ استراحت کی حدیث کے جواب کی طرف اشارہ ہو کیونکہ دونوں کا مبنی ایک ہی ہے کہ دونوں میں جسم کے بڑھ جانے کے عذر کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فعل فرمایا۔

باب ماجاء فی الاِشارة فی التَّشَهدِ

باب تشہد میں اشارہ کرنے کا بیان

☆حدثنا محمودُ بن غَيْلَانَ ويحيى بن موسى وغيرُ واحدٍ قالوا: حَدَّثَنَا عبدُ الرَّزَّاقِ عن مَعْمَرٍ عن عبيد الله بن عمر عن نافع عن ابنِ عمر: اَنَّ النبي صلى الله عليه وسلم كان اذا جلس في الصلاةِ وضع يده اليمنى على ركبته، ورفع اصْبُعَهُ التي تلي الابهام اليمنى يدْعُو بهَا ، ويدُه اليسرَى على ركبته باسِطَهَا عليه۔ قال : وفي الباب عن عبد الله بن الزُّبَيْرِ، وَنُمَيْرِ الخُزَاعِيِّ، وابي هريرةَ ، وابي حميد، وَوَائِلِ بنِ حُجْرٍ۔

قال ابو عيسى: حديث ابنِ عُمَرَ حديث حسن غريب ، لانعرِفه مِن حديث عبيد الله بن عمرَ اِلَّا مِن هٰذا الوجهِ۔ والعملُ عليه عند بعضِ اهل العلم من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعين: يَخْتَارُونَ الاِ شارة في التشهدِ۔ وهو قولُ اصحابنا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تو دایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھتے اور انگوٹھے کے متصل جو انگلی ہے اس کو اٹھاتے اور اس کے ذریعہ اشارہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بایاں ہاتھ گھٹنے پر ہوتا اور اس کی انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتیں۔

اس باب میں عبداللہ بن زبیر، نمیر خزاعی، ابوہریرہ، ابوحمید، اور وائل بن حجر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن غریب ہے کہ ہم اس حدیث کو عبیداللہ بن عمر سے اس سند کے علاوہ نہیں جانتے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کا اسی پر عمل ہے وہ تشہد میں اشارہ کرنا پسند کرتے ہیں اور ہمارے اصحاب کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حنفیہ کا صحیح مذہب: اشارہ کے متعلق حنفیہ کے جو مختلف اقوال ہیں[1] وہ سب ناقابل اعتبار ہیں[2] کیونکہ اشارہ صحیح روایات سے ثابت ہے لہٰذا یہ سنت ہوگا۔

روایاتِ مختلفہ میں تطبیق: یہ اشکال کہ اشارہ کے متعلق مختلف متعارض روایات ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ان تمام روایتوں میں لفظ وضع اور عقد کے الفاظ ہیں اور ان میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ گذشتہ باب میں یہ الفاظ ہیں "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا جلس فی الصلوٰۃ وضع یدہ الیمنی علی رکبتہ ورفع اصبعہ" الخ تو یہ حدیث تقاضہ نہیں کرتی کہ سیدھا ہاتھ کھلا ہوا ہوگا[3] لہٰذا یہ روایت عقد والی روایت کے منافی نہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جسطرح ہاتھ کے کھلے ہوئے ہونے کی حالت کو وضع کہتے ہیں اسی طرح جب مٹھی بند ہو تو اسے بھی وضع کہتے ہیں۔

---

[1] لفظ توہم بمعنی ظن۔ یعنی اشارہ بالسبابۃ کی نفی کے متعلق جو اقوال مذکور ہیں وہ صحیح نہیں ہیں بلکہ اشارہ بالسبابۃ احادیث سے ثابت ہے۔

[2] حنفیہ اور دیگر بہت سے علماء نے اشارہ کا انکار کیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ تمام ائمہ کے ہاں اشارہ بالسبابۃ متفق علیہ سنت ہے جیسا کہ حضرت سہارنپوریؒ نے بذل میں ثابت فرمایا ہے۔ امام محمدؒ اپنی موطا میں اشارہ کی حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وبصنیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناخذ وھو قول ابی حنیفہ" موطا کے محشی نے تصریح کی ہے کہ امام ابو یوسف سے بھی اشارہ کے ثبوت کا قول ملتا ہے لہٰذا احناف کے تینوں ائمہ سے یہ قول صراحۃ ثابت ہے تو اس کے منکرین سے غلطی ہوئی۔

[3] ان احادیث میں اس طرح بھی تطبیق ہوسکتی ہے کہ ابتداء تشہد میں ہاتھ کھلا ہوا ہوتا ہے پھر اشارہ کے وقت اس کو بند کر دیا جاتا ہے۔ مولانا رضی الحسن رحمہ اللہ کی تقریر میں یہ زیادتی ہے کہ صاحب درمختار کا یہ قول کہ ہاتھ کے کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں اشارہ کرنا چاہیئے حدیث کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں اشارہ کی حالت میں قبضہ (مٹھی بند ہونے) کا ذکر ہے۔ بعض فقہاء جو کہتے ہیں کہ نفی کے وقت انگلی اٹھائے اور اثبات پر رکھ دے تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آخر تک انگلی اٹھائے رکھے۔

قلت: حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب الدعوات میں عاصم بن کلیب عن ابیہ عن جدہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے "وقبض اصابعہ وبسط سبابہ وھو یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک" اس پر یہ اشکال ہے کہ یہ حدیث فقہاء کے اختیار کردہ قول کے مخالف نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اثبات کے وقت انگلی رکھ دے کیونکہ انگلی کا رکھ دینا ہاتھ کے کھلے ہوئے ہونے کے منافی نہیں۔ نیز فقہاء کا یہ قول صاحب مذہب سے بھی مروی ہے پس شامی میں محیط سے نقل کیا ہے کہ نفی کے وقت انگلی اٹھائے اور اثبات کے وقت رکھ دے یہی امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔

باب ماجاء فی التَّسْلیم فی الصلاۃِ

باب ہے نماز میں سلام پھیرنے کے طریقہ کے بیان میں

☆حدثنا محمدُ بن بَشّارٍ حَدَّثَنا عبدُ الرحمٰنِ بن مَهْدِیٍّ حَدَّثَنا سفیانُ عن ابی اسحٰقَ عن ابی الاَحْوَصِ عن عبد اللّٰہِ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : اَنَّہُ کان یُسَلِّمُ عن یمینہِ وعن یسارہ: السلامُ علیکم ورحمۃُ اللّٰہِ، السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ۔

قال: وفی الباب عن سعد بن ابی وَقَّاصٍ وابن عمرَ، وجابر بنِ سَمُرَۃَ، والبَرَاءِ، وابی سعید، وعَمّارٍ، ووائلِ بن حُجْرٍ، وعَدیٍّ بنِ عَمِیرَۃَ، وجابربن عبد اللّٰہِ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ ابن مسعودٍ حدیث حسن صحیح۔

والعملُ علیہ عند اکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومَن بعدھم۔ وھو قولُ سفیانَ الثَّوْرِیِّ، وابنِ المبارکِ، واحمدَ، واسحٰقَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں اور بائیں سلام پھیرتے اور ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا کرتے تھے۔ یعنی تم پر سلام اور اللہ کی رحمت ہو۔

اس باب میں سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، جابر بن سمرہ، براء، عمار، وائل بن حجر، عدی بن عمیرہ، اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد کے اکثر اہل علم کا عمل ہے۔ یہ قول سفیان ثوری، ابن مبارک، احمد واسحٰق رحمہم اللہ کا بھی ہے۔

باب منه ایضاً

باب ہے اسی مسئلہ (سلام پھیرنے کے مسئلہ) سے متعلق

☆حدثنا محمد بن یحیی النَّیْسَابُورِیُّ حَدَّثَنا عَمْرُو بن ابی سَلَمَۃَ ابو حفصٍ التِّنِّیسِیُّ عن زُھَیْر

بن محمدٍ عن هشامِ بنِ عُرْوَةَ عن ابيه عن عائشة: اَنّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم كان يُسَلِّمُ فی الصلاۃ تَسْلِيمَةً واحدةً تِلْقَاءَ وجهه،ثُمَّ يَميلُ الى الشّقِّ الاَيمَنِ شَيْئاً۔ قال: وفی الباب عن سهل بن سعدٍ۔

قال ابو عيسی: وحديث عائشةَ لانعرفهُ مرفوعاً اِلّا من هذا الوجهِ۔ قال محمد بن اِسمٰعيل: زُهَيْرُ بن محمدٍاهل الشام يرون عنه مناكير۔ ورواية اهل العراق عنه اشبه قال محمد: وقال احمد بن حنبل كان زهير بن محمد الذی كان وقع عندَهم ليس هو هذا الذی يُرْوَى عنه بالعراقِ، كانّه رجلٌ آخرُ، قَلَبُوا اسْمَهُ۔قال ابو عيسی: وقد قال به بعضُ اهل العلم فی التّسْليم فی الصلاةِ۔

واصَحُّ الرواياتِ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم تَسْلِيمَتَيْنِ۔ وعليه اكثرُ اهل العلم من اصحابِ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم والتابعين ومَن بعدَهم۔

ورَاٰی قومٌ من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وغيرِ هم تسليمةً واحدةً فی المكتوبةِ۔

قال الشافعیُّ: اِن شاءَ سَلَّمَ تسليمةً واحدةً، وان شاءَ سَلَّمَ تسليمتينِ۔

ترجمہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ایک سلام چہرے کے سامنے کی طرف پھیرتے پھر آپ دائیں جانب تھوڑا چہرہ پھیرا کرتے تھے۔

اس باب میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اس سند کے علاوہ سے مرفوع نہیں جانتے۔

زہیر بن محمد کے حالاتِ زندگی از تہذیب التہذیب: امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل شام زہیر بن محمد سے منکر (غیر معتبر) احادیث روایت کرتے اور اہل عراق ان سے معتبر روایات نقل کرتے ہیں۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ زہیر بن محمد جو ملک شام کے راویوں کے ضمن میں آئے ہیں شاید وہ یہ نہیں ہیں جن سے اہل عراق روایت کرتے ہیں شاید وہ کوئی اور ہیں جن کا نام تبدیل کر دیا گیا ہے (از مترجم: گویا امام احمد کے نزدیک زہیر بن محمد دو ہیں:

۱۔وہ جن سے اہل شام نقل کرتے ہیں ان کی روایات غیر معتبر ہیں یہ کوئی اور صاحب ہونگے زہیر ان کا نام نہیں۔

۲۔وہ جن سے اہل عراق نقل کرتے ہیں ان کی روایات معتبر ہیں۔ حافظؒ نے تہذیب التہذیب میں انکا تذکرہ اس طرح کیا ہے زهير بن محمد التميمي ابو المنذر الخراساني المروزی ۔مرو کی بستیوں میں سے ایک بستی کے رہنے والے ہیں بعض حضرات نے انکو اہل ہرات اور بعضوں نے اہل نیشا پور میں سے شمار کیا ہے۔ یہ راوی ملک شام بھی تشریف لے گئے پھر حجاز میں رہائش اختیار کی۔ ہشام بن عروہ، موسیٰ بن عقبہ وغیرہ حضرات سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔امام احمد اور ایک جماعت نے انکو ثقہ کہا ہے اور امام احمد بن حنبل نے یہ بھی فرمایا کہ جن زہیر سے اہل شام نقل کرتے ہیں وہ دوسرے زہیر ہیں۔امام بخاریؒ نے فرمایا اہل شام ان سے منکر حدیثیں نقل کرتے ہیں اور اہل بصرۃ ان سے جو احادیث نقل کرتے وہ صحیح ہیں۔ابو حاتم نے فرمایا کہ یہ راوی سچا ہے لیکن اسکے حافظے پر کلام ہے۔لہٰذا انکے سوء حافظے کی وجہ سے میں انکی اہل شام سے ذکر کردہ روایات کو قابل قبول نہیں سمجھتا۔لہٰذا جو احادیث وہ اپنی کتابوں سے نقل کریں وہ صالح ہیں اور جن احادیث کو وہ اپنے حافظہ سے نقل کریں اس میں غلطیاں ہیں۔ابن عدی نے فرمایا کہ شاید اہل شام نے ان سے روایت کرنے میں غلطی کی ہے۔ جب ان سے اہل عراق نقل کریں تو انکی روایت صحیح ہے۔انکی وفات ۱۶۲ھ میں ہوئی۔ابن حبان نے انکو ثقہ کہا ہے اور فرمایا يخطی و يخالف۔تہذیب التہذیب ص ۳۵۰: جلد ۳)

بعض اہل علم نماز میں ایک سلام پھیرنے کے قائل ہیں جبکہ دو سلام پھیرنے کی روایات اصح ہیں اور اسی پر اہل علم کی اکثریت کا عمل ہے جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وتابعین رحمہم اللہ اور بعد کے علماء شامل ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ وغیرہ کی ایک جماعت فرض نماز میں ایک سلام پھیرنے کی قائل ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر چاہے تو ایک سلام پھیر لے اگر چاہے تو دو سلام پھیر لے۔

﴿تشریح﴾

(كان يسلم تسليمة واحدة) یعنی چہرے کی طرف (سامنے کی جانب) سے سلام کی ابتداء ہوتی تھی اور دائیں طرف تھوڑا سا مائل ہونے کے بعد اس کا اختتام ہو جاتا تھا۔اسی طرح دوسرے سلام کی ابتداء اپنے چہرے کی جانب سے کرے (اور بائیں کندھے پر جا کر اس کو ختم کر دے)۔

حدیث باب میں تسلیمۃ واحدۃ [1] کہنے کی توجیہ: حدیث شریف میں صرف ایک سلام کا ذکر اس لئے کیا کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ سلام کی ابتداء کہاں سے ہوگی اور اس کی کیفیت کیا ہوگی۔

تسلیمۃ واحدۃ کہنے کی مزید توجیہات: توجیہ نمبر۱: راوی کو دوسرے سلام کی آواز نہیں پہنچی ہوگی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلا سلام دوسرے سلام کے مقابلہ میں زور سے فرماتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف پہلا سلام سنا تھا لیکن یہ جواب بعید ہے کیونکہ بائیں جانب سلام پھیرتے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ سامنے ہے تو اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہلے سلام کے مقابلے میں دوسرے سلام کی آواز زیادہ صاف آنی چاہئے (کیونکہ پہلا سلام بیتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب مخالف کی طرف منہ کر کے کیا کرتے تھے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے سلام کے آہستہ کہنے کے بھی کوئی معنی نہیں کہ یہ گزشتہ والی توجیہ کی جائے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ احادیث سے تو یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرا سلام پہلے سلام کی طرح بہت زور سے نہیں فرماتے تھے۔

---

[1] **سلام کے متعلق دو اختلافات:** فقہاء کا سلام کے متعلق دو مقامات میں اختلاف ہے جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ پہلا مقام کہ کونسا سلام ضروری ہے۔ امام احمد سے دو روایتیں ہیں ایک روایت میں دونوں سلام رکن ہیں اور دوسری روایت میں کوئی ایک سلام رکن ہے۔ حنفیہ سے دو قول مروی ہیں ایک قول میں دوسرا سلام واجب ہے اور دوسرے قول میں سلام ثانی سنت ہے۔ باقی ائمہ کے ہاں ایک سلام واجب ہے یہاں تک کہ نووی اور ابن منذر نے اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ اختلافِ ثانی یہ ہے کہ کتنے سلام کرنے سنت ہیں۔ امام مالک اور بعض سلف کے ہاں مقتدی تین سلام پھیرے گا یہی امام مالک کا مشہور قول ہے تیسرا سلام امام کو جواب دینے کیلئے ہے مقتدی کے علاوہ امام یا منفرد صرف ایک سلام پھیرے گا سامنے کی جانب رخ کر کے...... باقی ائمہ ثلاثہ حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ کے ہاں دو سلام سنت ہیں۔ ملخص من اوجز۔ جب یہ بات سمجھ میں آ چکی تو اب یہ سمجھئے کہ حدیث باب مالکیہ کی دلیل ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے جمہور کے مذہب کے مطابق اس حدیث کی توجیہ فرمائی ہے اس توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث میں سلام کی تعداد کا بیان کرنا مقصود نہیں کہ ایک ہونگے یا دو۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سلام کی ابتداء کہاں سے ہوگی۔ چنانچہ حدیث باب میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ چہرے کی جانب سے سلام کی ابتداء فرماتے تھے دائیں اور بائیں اس کو ختم فرماتے تھے۔ میرے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ یہ حدیث پہلے مسئلہ میں (کہ ایک سلام فرض ہے) جمہور کی دلیل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک سلام پر بیان جواز کیلئے اکتفاء فرمایا ہے۔

باب ماجاء اَنَّ حَذْفَ السلامِ سُنَّةٌ

باب ہے سلام کو حذف کرنا سنت ہے

☆حدثنا عليٌّ بن حُجْرٍ اخبرنا عبد الله بن المباركِ وهِقْلُ بْنُ زِيَادٍ عن الاوزاعِيِّ عن قُرَّةَ بنِ عبد الرحمٰنِ عن الزُّهْرِيِّ عن ابى سَلَمَةَ عن ابى هريرةَ قال: حَذْفُ السلامِ سُنَّةٌ۔

قال عليُّ بن حُجْر: قَال عبد الله بن المبارك: يَعْنِى اَن لا تَمُدَّهُ مَدًّا۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح۔وهو الذى يَسْتَحِبُّهُ اهلُ العلم۔

ورُوِيَ عن ابراهيم النَّخَعِيِّ انه قال: التكبيرُ جَزْمٌ، والسلامُ جَزْمٌ وهِقْلٌ: يُقَالُ كان كاتبَ الاوزاعيِّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سلام کو حذف کرنا سنت ہے۔علی بن حجر کہتے ہیں کہ ابن مبارک رحمہ اللہ نے حذف کی تفسیر یہ کی کہ سلام کو بہت زیادہ نہیں کھینچنا چاہیے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اہل علم اسی کو مستحب کہتے ہیں۔ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا تکبیر اور سلام دونوں میں جزم کیا جائے اور ہقل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امام اوزاعی رحمہ اللہ کے کاتب تھے۔

﴿تشریح﴾

حدیث میں حذف سے مراد حذف اصطلاحی نہیں: حذف سے یہ معنی مراد لینا کہ حروف گرادیئے جائیں یہ جدید اصطلاح ہے[1] حدیث باب میں حذف سے مراد یہ ہے کہ ورحمۃ اللہ کی حاء میں حرکت نہ ہونا سنت ہے۔(حدیث مبارک

---

[1] حدیث کا معنی حادث ہے۔مجد الدین فرماتے ہیں کہ حدیث کے معنی نئے کے بھی آتے ہیں اور خبر (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی حدیث کہتے ہیں۔

اس اصطلاحی حذف سے پہلے زمانہ کی ہے) یعنی لفظ اللہ کی ھاء کی حرکت حذف [1] ہونی چاہیئے۔

(وقال ابن مبارك۔ يعني ان لا تمده مدا) حدیث شریف حذف السلام سنة یہ مجمل ہے:

ابن مبارک نے اپنے اس قول سے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ سلام کے آخری حرف ھاء کو حرکت مت دو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ لفظ اللہ کو کھینچنے سے منع کیا جارہا ہے صحیح بات یہ ہے کہ (ورحمة الله) کو اتفاقاً کھینچا جاسکتا ہے۔ یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ابن مبارک رحمہ اللہ کے قول کا یہ معنی ہے کہ ورحمة اللہ کی ھاء کو کھینچنا منع ہے حرکت دینا منع نہیں ہے (کیونکہ ابن مبارک رحمہ اللہ کھینچنے کو منع فرمارہے ہیں حرکت دینے سے منع نہیں کررہے)۔

جواب: جب ھاء کو حرکت دی جائیگی تو کھینچنا بھی لازم آئیگا کیونکہ حرکت میں جزم کے اعتبار سے کھینچنا پایا جاتا ہے۔ ابن مبارک رحمہ اللہ کی تفسیر میں بھی ایک طرح کا ابہام تھا تو ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول "التكبير جزم والسلام جزم" سے اس کی تفسیر کردی گئی (کہ اس کا مطلب حرکت نہ ہونا ہے)۔

باب مايقول اذا سَلَّمَ من الصلاة

باب ہے سلام پھیرنے کے بعد کونسے اذکار پڑھے؟

☆حدثنا احمد بن مَنِيعٍ حَدَّثَنَا ابو معاويةَ عن عاصمٍ الاحُوَلِ عن عبد الله بن الحرث عن عائشةَ قالت: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اذا سَلَّمَ لايَقْعُدُ اِلَّا مقدارَ مايقول: اللّٰهُمَّ انت السلامُ، ومِنكَ السلامُ، تَبَارَكْتَ ذا الجَلَالِ والاِ كرَامِ۔

☆حدثنا هناد بن السَّرِيِّ حَدَّثَنَا مروانُ بن معاويةَ الفزاريُّ وابو معاويةَ عن عاصمٍ الاحول بهذا

---

[1] **حافظؒ کی توجیہ اور ابن اثیر پر رد:** حافظؒ التلخيص الحبير میں لکھتے ہیں حذف السلام کا مطلب سلام کا کلمہ روانی کے ساتھ کہنا ہے اور ابراہیم نخعی کے قول "السلام جزم" کا یہی معنی ہے۔ ابن اثیر نے نہایہ میں اس حدیث کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ تکبیر اور سلام کو کھینچا نہیں جائیگا اور نہ ہی تکبیر کے اوپر اعراب پڑھا جائیگا بلکہ اس کا آخری حرف ساکن ہوگا۔ محب طبری اور امام رافعی نے بھی یہی معنی مراد لئے ہیں لیکن یہ معنی محل نظر ہے کیونکہ لفظ جزم سے مراد اعراب کا نہ ہونا یہ معنی ایک نئی اصطلاح ہے لہٰذا حدیث شریف میں جزم سے مراد اعراب کا نہ ہونا نہیں ہے۔ انتہی کلام الحافظ

علامہ شامی نے حافظ کا تعقب کیا ہے: چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ نحویین کی نئی اصطلاح میں جزم اسے کہتے ہیں کہ عامل جازم کے اعراب حرکتی کو حذف کردیا جائے مطلقاً حرکت کا حذف جزم نہیں ہے۔ الخ

الإسنادِ: نحوَهُ، وقال: تَبَارَكْتَ ياذالجلالِ والإ كرامِ۔

قال: وفي الباب عن ثَوْبانَ، وابن عُمَرَ، وابنِ عباسٍ، وابي سعيدٍ، وابي هريرة، والمغيرة بن شعبة

قال ابو عيسى: حديث عائشةَ حديث حسن صحيح۔ وقد رَوَى خالدٌ الحذّاءُ، هذا الحديث مِن حديثِ عائشة عن عبد الله بن الحرثِ: نَحْوَ حديث عاصمٍ۔

وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم انه كان يقول بعدَ التسليم لا اِلٰهَ اِلّا اللّٰهُ وحدَهُ، لاشريكَ لَهُ، له المُلْكُ وله الحمدُ، يُحْيِي ويُمِيتُ، وهو على كلِّ شيءٍ قديرٌ، اللّٰهُمَّ لا مانعَ لِمَا اَعْطَيْتَ، ولا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، ولا يَنْفَعُ ذا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ۔

ورُوِيَ عنه انه كان يقول: سبحانَ ربِّكَ ربِّ العِزَّةِ عمَّا يَصِفُونَ، وسلامٌ على المرسلينَ، والحمدُ لله ربِّ العالَمِينَ۔

☆حدثنا احمد بن محمد بن موسى حَدَّثَنَا عبد الله بن المباركِ اخبرنا الاوزاعيُّ حدثني شَدَّادُ ابو عَمَّارٍ حدثني ابو اَسْمَاءَ الرَّحَبِيُّ قال: حدثني ثَوْبَانُ مَوْلى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اذا اراد ان يَنْصَرِفَ مِن صلاتِه اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ ثلاثَ مرّاتٍ، ثم قال: اللّٰهُمَّ انت السلامُ، ومنكَ السلامُ، تَبَارَكْتَ ياذالجلالِ والإ كرامِ۔

قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح۔ وابو عَمَّارٍ اسمُه شَدَّادُ بن عبد اللّٰهِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو صرف اتنی دیر بیٹھتے جتنی دیر میں یہ دعا پڑھتے "اللھم انت السلام" آخر تک (ترجمہ: اے اللہ تو ہی سلام ہے اور سلامتی تجھ ہی سے ہے تو بڑی برکت والا، عزت والا اور بزرگی والا ہے۔

ہناد، مروان بن معاویہ اور ابو معاویہ سے اور وہ عاصم احول سے اسی سند سے اسی کے مثل روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں "تبارکت یا ذا لجلال والاکرام"۔

اس باب میں ثوبان، ابن عمر، ابن عباس، ابو سعید، ابو ہریرہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث عائشہ حسن صحیح ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ سلام پھیرنے کے بعد فرماتے ''لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ'' ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں بادشاہت اور تعریفیں اسی کیلئے ہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اے اللہ! جو تو عنایت کرنا چاہے اسے روکنے والا کوئی نہیں اور جو تو روک دے کوئی دینے والا نہیں اور مالدار کو مالداری نفع نہیں پہنچاتی آپ کے سوا اور یہ بھی پڑھتے: "سبحان ربك رب "الخ (ترجمہ: آپ کے رب کی ذات، جو عزت والے، بڑے عظمت والے ہیں پاک ہیں ان باتوں سے جن کو مشرکین بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور تمام خوبیاں اللہ ہی کیلئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر لوٹنے کا ارادہ فرماتے تو تین مرتبہ استغفار کرتے اور پھر کہتے "انت السلام و منك السلام تبارکت یا ذاالجلال و الاکرام"۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابو عمار کا نام شداد بن عبد اللہ ہے۔

﴿تشریح﴾

احادیثِ مختلفہ میں تطبیق: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیثِ باب میں اس کا ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرض کا سلام پھیرنے کے بعد اللھم انت السلام الخ پڑھنے کی مقدار بیٹھتے تھے حالانکہ دوسری احادیث میں تسبیحاتِ فاطمی آیۃ الکرسی کا بھی ذکر ہے لہٰذا علماء نے حضرت عائشہ کی اس حدیث میں مختلف تاویلات کی ہیں۔ بعض علماء تو کہتے ہیں کہ فرائض کے بعد انت السلام ومنک السلام الخ اس دعا کی مقدار سے زائد ٹھہرنا ناجائز ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کی منفرد توجیہ: اور بعض ائمہ نے جب یہ غور کیا کہ اتنی مقدار[1] سے زیادہ بیٹھنے کی روایات صحیح ہیں تو انہوں نے یہ مذہب اختیار کیا کہ دو رکعتوں کی مقدار سے زیادہ بیٹھنا جائز نہیں اور یہی صحیح مذہب ہے کیونکہ حضرت

---

[1] دو رکعتوں کی مقدار ٹھیرنے کی اجازت یہ بات مجھے کہیں نہیں ملی لہٰذا قدماء (سلف) کے کلام میں اس کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ (از مترجم: حضرت گنگوہیؒ کی رائے عالی یہ ہیکہ فرض نمازوں کے بعد سنتوں سے پہلے نمازی کو دو رکعت کی مقدار دعاؤں اوراذکار و اوراد میں مصروف ہونے کی اجازت ہے اس دو رکعت کی مقدار سے زائد ٹھہرنا (اس فصل) کی اجازت سنتوں سے پہلے نہیں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث باب کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ بعض اوقات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات پر اکتفاء فرماتے تھے اور دوسری احادیث میں نماز کے بعد جو اذکار و اوراد منقول ہیں وہ دو رکعتوں کی مقدار سے زیادہ نہیں ہیں ظاہر یہ ہے کہ سنتیں فرائض کی مکملات [1] اور اس میں کمی کے لئے جبیرہ واقع ہوتی ہیں لہٰذا سنتوں میں اور دیگر اذکار میں کوئی منافات نہیں کیونکہ یہ دیگر اذکارِ مسنونہ بھی نماز کے متمات میں سے ہیں جیسے کہ سنتیں۔ ہاں فرض نمازوں اور سنتوں کے درمیان صرف ان اذکار کی اجازت ہوگی جو احادیث سے ثابت ہیں غیر ثابت اذکار کی اجازت نہ ہوگی۔

(قوله لا ينفع ذا الجد الخ) جد کے کئی معنی ہیں:

۱۔ مالداری ۲۔ کوشش و محنت ۳۔ دادا۔

اور تینوں معنی یہاں پر مراد ہو سکتے ہیں اس حدیث میں نفع دینے سے مراد اللہ کے عذاب سے پناہ دینا ہے [2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علامہ ابن ہمام نے باب النوافل: فتح القدیر ص ۳۱۳ بیروت کے شروع میں اسی حدیث باب اللهم انت السلام ومنك السلام الى آخره سے ثابت کیا ہے کہ سنتیں فرض سے متصل ہونی چاہئیں اور جن احادیث میں تسبیحات فاطمی اور طویل دعاؤں کا ثبوت ہے اس سے مراد سنتوں کے پڑھ لینے کے بعد ان اذکار اور دعاؤں کا پڑھنا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں: والذي ثبت عنه انه كان يوخر السنة من الاذكار وهو ما روى عن عائشة رضي الله عنها قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سلم لم يقعد الا مقدار ما يقول اللهم انت السلام ومنك السلام تبركت يا ذا الجلال والاكرام۔ فهذا نص صريح في المراد

اس کے بعد پانچ سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ "فيجوز كونه صلى الله عليه وسلم كان يقوله ومرة يقول غيره" "من قول لا اله الا الله وحده لا شريك له الخ" ومقتضى العبارة حينئذ ان السنة ان يفصل بقدر ذلك ويكون ذلك تقريبا وقد يزيد قليلا وينقص قليلا وقد يدرج وقد يرتل فاما ما يكون زيادة غير مقاربة مثل العدد السابق من التسبيحات والتحميدات والتكبيرات فبقى استنان تاخيره عن السنة البتة وكذا آية الكرسي الى آخر ما قال۔

[1] **ایک اشکال اور اسکا جواب:** یہ ایک اشکال کا جواب ہے کہ سنتیں تو فرائض کی مکملات ہوتی ہیں لہٰذا ان کو فرائض سے متصل پڑھنا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اذکار بھی نماز کے اذکار کیلئے مکملات ہیں لہٰذا ان اذکار کو پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

[2] یعنی یہ تینوں چیزیں آگ کے عذاب سے پناہ نہیں دے سکتیں یہاں چوتھا معنی شراح حدیث نے لکھا کہ لاینفع کا عطف گذشتہ جملہ لا معطی لما منعت پر ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ آپ جس چیز سے روک دیں وہ کوئی نہیں دے سکتا۔ نہ ہی اس کا دینا نفع مند ہے آگے ذالجد منادیٰ ہے اس کا حرف ندا محذوف ہے اے مالداری اور عظمت والی ذات...... لفظ منك الجد کا معنی یہ ہے کہ بزرگی اور غنا صرف آپ کی ذات ہی عطا کرنے والی ہے آپ کے علاوہ کوئی بھی بزرگی اور غنا نہیں دے سکتا۔ کذا فی حاشیۃ الحصن الحصین

(اذا اراد ان ینصرف من صلوته استغفر ثلاث مرات ثم قال اللهم انت السلام الخ") یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فرض نماز کی جگہ سے جب اپنے گھر جانے کا ارادہ فرماتے تو پہلے یہ اذکار پڑھ لیتے تھے۔ یہاں استغفار کرنا:

۱۔ یا تو یہ امت کی تعلیم کیلئے ہے۔

۲۔ یا ازواج مطہرات اور گھریلو دیگر مشاغل اور مباح کاموں میں مشغول ہونے پر استغفار فرماتے تھے کیونکہ یہ افعال اگر چہ گناہ کے قبیل سے نہیں مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گناہ سمجھ کر اس سے استغفار فرماتے تھے۔

۳۔ یا آپ کے ہر لمحے اونچے درجات کی طرف ترقی ہوتی تھی لہٰذا گذشتہ نچلے درجہ کو کم تر سمجھتے ہوئے معافی طلب فرماتے تھے کیونکہ آپ کے شایانِ شان تو اوپر والا درجہ ہے اور اسی کی طرف حدیث پاک "انه ليغان على قلبي " سے اشارہ ہے۔

۴۔ استغفار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے جو مشہور ہے کہ "حسنات الابرار سيئات المقربين" یعنی نیکوکاروں کی نیکیاں اللہ تعالیٰ کے مقربین کے گناہ شمار ہوتے ہیں لہٰذا جن طاعات پر امتیوں کو بڑے بڑے درجات ملیں گے وہ طاعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں گناہ شمار ہونگی ان تمام وجوہات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے الّا یہ کہ دقیق نگاہ سے ان میں فرق کیا جائے۔

۵۔ استغفار کی ایک عمدہ توجیہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسے افعال کیا کرتے تھے جو کہ غیر افضل ہوا کرتے تھے اور اس سے مقصد امت کے سامنے اس کے جائز ہونے کو بتلانا اور اس کے حرام ہونے کی نفی ہوتی تھی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے افعال اسی مقصد کیلئے صادر ہوئے تھے۔

اس آخری توجیہ پر اعتراض اور اسکا جواب: لیکن اس توجیہ پر یہ اعتراض ہے کہ یہ افعال تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی صادر ہوتے تھے تو وہ نبوت کے ان افعال میں سے ہیں جن کا ہونا ضروری ہے تو استغفار کی کیا وجہ ہے لیکن اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے[1]۔ فتدبر

---

[1] وہ جواب یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس فعل کو کرنا بیان جواز کی غرض سے ہے یہ ایک الگ بات ہے اور اس فعل کا غیر مستحسن ہونا یہ الگ بات ہے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ جہتیں ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ لو لا الاعتبارات لبطلت الحكمة شریعت میں اس کی بہت سی نظائر ہیں مثلاً گھر کا مسجد سے دور ہونا ایک جہت سے اس میں نحوست کا ہونا مذکور ہے لیکن دوسری جہت سے یہ باعث ثواب ہے کہ زیادہ قدم چلنے پر زیادہ نیکیاں لکھی جائینگی اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو ڈوبنے اور جلنے سے پناہ مانگی ہے اور دوسری طرف اس کو اسباب شہادت میں شمار کیا ہے۔

باب ماجاء فی الانصرافِ عن یمینه وعن شِمَالِهِ

باب ہے نماز کے بعد (امام کے) دائیں بائیں گھومنے کا بیان

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو الاحْوَصِ عن سِمَاكِ بن حَرْبٍ عن قَبِیصَةَ بن هُلْبٍ عن ابیه قال: کان رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یَؤُمُّنَا، فَیَنْصَرِفُ علی جانِبَیْهِ: علی یمینه وعلی شماله۔ وفی الباب عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ، وانسٍ، وعبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وابی هریرة۔

قال ابو عیسی: حدیث هُلْبٍ حدیث حسن۔ وعلیه العملُ عندَ اهل العلم: انه یَنْصَرِفُ علی اَیِّ جانبیه شاءَ، انْ شاء عن یمینه وان شاء عن یساره وقد صَحَّ الاَمْرَانِ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم۔

ویُرْوَی عن علیٍّ بن ابی طالبٍ انه قال: ان کانت حاجتُه عن یمینِه اخَذَ عن یمینِه، وان کانت حاجتُه عن یسارِه اخذ عن یساره۔

﴿ترجمه﴾

قبیصہ بن ہلب اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری امامت کرتے تھے پس دونوں جانب پھرتے دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی۔

اس باب میں عبداللہ بن مسعود، انس، عبداللہ بن عمرو اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہلب کی حدیث حسن ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ جس طرف چاہے پھرے چاہے تو دائیں جانب سے اور چاہے تو بائیں جانب سے یہ دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو داہنی طرف کوئی حاجت ہوتی تو دائیں جانب سے اور اگر بائیں طرف کوئی حاجت ہوتی تو بائیں جانب کو اختیار فرماتے۔

باب ماجاء فی وصف الصَّلاة

باب ہے نماز کی تفصیلی کیفیت کا بیان

☆حدثنا علیُّ بن حُجْرٍ اخبرنا اسمٰعیلُ بن جعفر عن یحیی بن علی بنِ یحیی بن خَلَّادِ بنِ رَافِعٍ

الزُّرَقِيِّ عن ابيه عن جَدِّهِ عن رِفاعَةَ بنِ رَافِعٍ اَنَّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بَيْنَما هو جالسٌ فى المسجدِ يوماً، قال رفاعةُ: ونحنُ معَه: اِذْ جاءَه رجلٌ كالبَدَوِيِّ، فصلّى، فَاَخَف صلاته ثم انصرفَ فَسَلَّمَ على النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم، فقال النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم: وعَلَيْكَ، فارْجِعْ فَصَلِّ فاِنَّكَ لم تُصَلِّ، فرجَع فصلى ، ثم جاءَ فسلَّم عليه، فقال: وعليك، فارجعْ فصلِّ فاِنك لم تصلِّ، ففعل ذٰلك مرتينِ او ثلاثاً ، كُلُّ ذٰلك يَأْتِي النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم فَيُسَلِّمُ على النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم، فيقولُ النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم:وَعليك: فارجعْ فصلِّ فاِنك لم تصلِّ، فخافَ الناسُ و كَبُرَ عليهم اَنْ يكون مَنْ اَخَفَّ صلاتَهُ لم يُصَلِّ، فقال الرجلُ فى آخِرِ ذٰلك: فَاَرِنى وعَلِّمْنى، فاِنَّما انا بَشَرٌ اُصِيبُ واُخطِئُ، فقال: اَجَلْ، اذا قُمْتَ الى الصلاةِ فتوضَّأْ كاامَرَكَ اللّٰهُ، ثم تَشَهَّدْ واَقِمْ ، فَاِنْ كان معكَ قُرْآنٌ فاقْرَاْ، واِلّا فَاحْمَدِ اللّٰهَ و كَبِّرْهُ وهَلِّلْهُ، ثُمَّ ارْكَعْ فاطْمَئِنَّ راكعاً،ثم اعتَدِلْ قائماً، ثم اسجدْ فاعْتَدِلْ ساجداً، ثم اجلِسْ فاطْمَئِنَّ جالساً، ثم قُمْ، فاِذا فَعَلْتَ ذٰلك فقد تَمَّتْ صلاتُك، وان انْتَقَصْتَ منه شيئاً انْتَقَصْتَ مِن صلاتِكَ، قال: وكان هٰذا اَهْوَنَ عليهم من الاَوَّلِ : اَنَّهُ مَنِ انْتَقَصَ مِن ذٰلكَ شيئاً انْتَقَصَ مِن صلا تِه، ولم تَذْهَبْ كلُّها۔

قال: وفى الباب عن ابى هريرة وعَمَّارِ بنِ يَاسِرٍ۔

قال ابو عيسى: حديث رِفاعَةَ بن رافعٍ حديث حسن۔ وقد رُوِيَ رفاعةَ هٰذا الحديث مِن غير وجهٍ۔

☆حدثنا محمد بن بشارٍ حَدَّثَنا يحيى بن سعيدٍ القَطَّانُ حَدَّثَنا عبيد اللّٰه بن عُمَرَ اخبرنى سعيدُ بن ابى سعيدٍ عن ابيه عن ابى هريرة: اَنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم دَخَلَ المسجدَ، فدخلَ رجلٌ فَصَلى، ثم جاء فَسَلَّمَ على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم، فَرَدَّ عليه السلامَ، فقال: ارْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ، فرجَعَ الرجل فصلّى كما كان صَلى، ثم جاء الى النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم، فسلَّمَ عليه فَرَدَّ عليه السلامَ فقال له رسول صلى اللّٰه عليه وسلم ارجِعْ فصلِّ فاِنك لم تُصَلِّ، حتى فعلَ ذٰلك ثلاثَ مِرَارٍ، فقال له الرجلُ: والذى بَعَثَكَ بالحقِّ مااُحْسِنُ غيرَ هٰذا، فَعَلِّمْنى، فقال: اذا قُمْتَ

اِلی الصلاۃِ فکَبّرْ، ثم اقرَا بِما تَیَسّرَ معكَ من القرآنِ ، ثم ارْکَعْ حتی تَطْمَئِنَّ راکعاً، ثم ارْفَعْ حتی تَعْتَدِلَ قائماً، ثم اسجُدْ حتی تَطْمَئِنَّ ساجداً، ثم ارفع حتی تَطْمَئِنَّ جالساً، وافْعَلْ ذٰلِكَ فی صلاتك کُلِّهَا۔

قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیح۔ قال: وقد رَوَی ابنُ نمَیْرٍ هٰذا الحدیث عن عبید اللّٰه بن عمر عن سعید المقبُرِیِّ عن ابی هریرةَ، ولم یَذْکُرْ فیه عن ابیه عن ابی هریرةَ۔

وروایةُ یحیی بن سعیدٍ عن عبید اللّٰه بن عُمَرَ: اَصَحُّ۔ وسعید المقبُرِیُّ قد سمعَ مِن ابی هریرة، وَرَوَی عن ابیه عن ابی هریرة۔ وابو سعیدٍ المقبُرِیُّ اسمُه کَیْسَانُ۔

وسعید المقبُرِیُّ یُکْنَی اباسَعْدٍ۔ وکیسانُ عَبْدٌ کان مکاتَباً لبعضِهم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور ہم آپ کے ساتھ تھے کہ ایک بدوی شخص آیات اور ہلکی نماز پڑھ کر فارغ ہوا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وعلیک واپس جاؤ! اور نماز پڑھو تو نے نماز نہیں پڑھی یعنی تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ وہ شخص واپس ہوا اور دوبارہ نماز پڑھ کر آیا اور سلام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا جاؤ! اور نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی۔ دو یا تین مرتبہ اسے لوٹایا ہر مرتبہ وہ آتا اور سلام کرتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دینے کے بعد یہی کہتے کہ جاؤ! اور نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی اس پر صحابہ سہم گئے اور ان پر یہ بات شاق گزری کہ جس نے تعدیل ارکان نہ کیا گویا اس نے نماز پڑھی ہی نہیں۔

چنانچہ اس شخص نے آخر میں عرض کیا کہ مجھے دکھلایئے اور مجھے نماز سکھلایئے۔ میں تو انسان ہوں میرا عمل صحیح بھی ہوسکتا ہے اور مجھ سے اس میں چوک بھی ہوسکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اسی طرح وضو کرو پھر اذان دو اور اقامت کہو پھر اگر تمہیں قرآن میں سے کچھ یاد ہو تو پڑھو ورنہ اللہ کی تعریف (الحمد للہ) اس کی بڑائی (اللہ اکبر) اور لا الٰہ الا اللہ پڑھو! پھر رکوع کرو اور اطمینان کے ساتھ کرو پھر سیدھے کھڑے ہو جاؤ! پھر سجدہ کرو اور تعدیل ارکان کی ادائیگی کے ساتھ سجدہ کرو پھر جلسہ میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ پھر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر تم نے اس طرح نماز پڑھی تو تمہاری نماز ہوگئی اور اگر اس میں کچھ کمی کی تو آپ نے اپنی نماز میں کمی کی۔

رفاعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد نبوی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے پہلے ارشاد سے آسان تھا کہ جو تعدیل ارکان میں کمی کرے گا تو اس سے نماز میں نقص ہوگا اور پوری کی پوری نماز بےکار نہیں ہوگی۔

اس باب میں ابوہریرہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت رفاعہ کی حدیث حسن ہے اور یہ حدیث انہی (حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ) سے متعدد طرق سے مروی ہے۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک آدمی اور بھی داخل ہوئے اور اس نے نماز پڑھی پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور فرمایا واپس جاؤ اور نماز پھر پڑھو اسلئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی (یعنی تمہاری نماز نہیں ہوئی) وہ شخص واپس گیا اور اسی طرح نماز پڑھی جس طرح پہلے نماز پڑھی تھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور اس سے فرمایا جاؤ اور نماز پھر پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ تین مرتبہ اسی طرح ہوتا رہا۔ اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا دین دیکر بھیجا ہے میں اس سے بہتر نہیں پڑھ سکتا۔ مجھے سکھایئے! چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو (تکبیرِ تحریمہ) پھر قرآن پاک میں سے جو تم آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہو وہ پڑھو! پھر اطمینان کے ساتھ رکوع کرو پھر اٹھو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر جب سجدہ کر چکو تو اٹھو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھو اور پوری نماز میں اسی طرح کرو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اس حدیث کو ابن نمیر نے عبید اللہ بن عمر سے انہوں نے سعید مقبری سے اور انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس روایت میں سعید مقبری کے والد کا ذکر نہیں کیا۔

یحییٰ بن سعید کی روایت عبید اللہ بن عمر سے اصح ہے۔ سعید مقبری نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں اور وہ اپنے والد سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بھی روایت کرتے ہیں۔ اور ابوسعید مقبری کا نام کیسان ہے اور سعید مقبری کی کنیت ابوسعد ہے۔

﴿تشریح﴾

اس باب کا مقصد[1]: یہ ہے کہ گذشتہ صفحات میں جو نماز کے مختلف مسائل بیان ہوئے اس حدیث باب میں ان متفرق مسائل کو جمع کر کے ایک ہی لڑی میں جمع کر دیا گیا ہے۔

ایک اشکال کا جواب: (اذا جاء ہ رجل کالبدوی) اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرف صحبت حاصل تھی اور وہ اکثر اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے تھے تو اشکال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ ان صحابہ کرام کو نماز جیسی عبادت جو کہ دین کا ستون ہے ایسی عبادت کا صحیح طریقہ کیسے معلوم نہ ہو سکا اس جملہ سے اس اعتراض کا جواب ہے کہ ہم اس صحابی سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی اس صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اور نماز میں کثرت آمد و رفت کا شرف حاصل تھا گویا وہ ایک دیہاتی شخص تھا اور وہ نماز کے شرعی طریقے سے ناواقف تھا اسی لئے اس نے اپنے گمان کے مطابق نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "صل فانك لم تصل" کا مطلب اس بدوی صحابی نے یہ سمجھا کہ ان ارکان میں سے کوئی رکن رہ گیا ہے اور اسے نماز کو طریقہ معلوم نہ تھا اسی وجہ سے دوبارہ جا کر اس نے پہلی جیسی نماز پڑھی اور یہ کوشش کی کہ اپنی ان معلومات کے مطابق نماز کے کسی رکن اور آداب کو نہ چھوڑے۔ پس اس نے دوبارہ نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اپنے فرمان کا اعادہ فرمایا پھر تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، تین مرتبہ نماز پڑھنے کے بعد اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے نماز کا سنت طریقہ سکھلا یئے کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے جو طریقہ معلوم ہے وہ نماز کا حقیقی اور صحیح طریقہ نہیں تو اس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "صل فانك لم تصل" سے میری نماز کے ہونے کی نفی فرمائی ہے گویا کہ صحابہ نے نفی سے مراد نفی ذات لی ہے کہ نماز ہی نہ ہوئی پس صحابہ نے یہ بات اوپری[2] اور ناپسندیدہ سمجھی کہ جو شخص اپنی نماز میں تعدیل ارکان نہیں کرتا اس کی نماز ہی نہ ہو گی۔

---

[1] **حدیثِ باب کی سند پر کلام**: اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے جیسا کہ کتب حدیث ابو داؤد، طحاوی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور ہمارے شیخ نے بذل المجہود میں اس کے متعلق کچھ وضاحت نقل فرمائی ہے۔

[2] یعنی صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں نفی سے اصل صلوٰۃ کی نفی (اور نفی ذات) مراد لی اور نماز کو بغیر تعدیل ارکان کے پڑھنا ناپسند سمجھا اور یہ گمان کیا کہ جو شخص بغیر تعدیل ارکان کے نماز پڑھتا ہے اس کی نماز ہی نہ ہو گی۔

نماز میں تخفیف کی ایک قسم ممنوع ہے اور دوسری قسم مطلوب: حدیث باب میں " اخف صلاته الخ" سے معلوم ہورہا ہے کہ نماز میں تخفیف ممنوع ہے جبکہ دوسری حدیث میں "اذا امکم[1] الناس فلیخفف" سے معلوم ہوا کہ نماز میں تخفیف مطلوب ہے اس میں تطبیق یہ ہے کہ: حدیث باب میں جہاں تخفیف سے ممانعت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ واجبات اور سنتوں کی ادائیگی کے بغیر نماز پڑھی جائے اور دوسری حدیث میں اذا امکم الناس فلیخفف اور اس جیسی جو فعلی حدیث یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہلکی نماز پڑھایا کرتے تھے اس سے مقصود یہ ہے کہ سنتوں کو پورا کرنے کے ساتھ نماز ہلکی ہوتی تھی پس تخفیف کی قسم اول مکروہ اور ممنوع ہوئی اور تخفیف کی قسم ثانی مستحب بلکہ عند الضرورۃ مامور بہ ہوئی۔

حدیث المسئی فی الصلوٰۃ میں وارد ہونے والے امر کے صیغے بعض سنیت کے بیان کے لیئے ہیں اور بعض فرضیت کے بیان کے لیئے ہیں اور بعض وجوب کے بیان کیلئے ہیں: پھر اس پوری حدیث میں امر کے صیغے وارد ہوئے ہیں تو جہاں خارجی قرینہ دلالت کررہا ہو کہ یہ امر وجوب کیلئے نہیں ہے اس کا مقتضی وجوب نہ ہوگا اور جہاں پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو وہاں پر امر وجوب کے معنی میں ہوگا مثلاً حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا "تشهد فاقم" یہاں پر تشہد سے مراد اذان ہے۔ تو یہاں قرینہ خارجی موجود ہے کہ یہ حکم لازمی نہیں لہٰذا اذان اور اقامت[2] سنت ہوگی۔ اسی طرح[3] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "توضا كما امرك الله" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "فان كان معك قرآن فاقرا" تو اس حدیث باب میں یہ دونوں حکم قطعی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "اذا قمتم الی الصلوٰة" اور "فاقرأ وما تيسر من القرآن" ان کے قطعی ہونے پر دلالت کررہا ہے اسی طرح حدیث باب میں رکوع سجدے کا حکم "فاركع فاسجد" یہ فرضیت کیلئے ہوگا۔

---

[1] کذا فی الاصل، جمع الفوائد میں صحاح ستہ سے حدیث شریف کے یہ الفاظ نقل کیئے ہیں "اذا صلّی احدكم الناس فليخفف"۔ الحدیث

[2] اسی طرح حدیث باب میں تکبیرات انتقال اور تسمیع کا حکم ہے نیز ہاتھوں کو گھٹنے پر رکھنے کا حکم ہے نیز جلسہ میں افتراش کا حکم ہے، اسی طرح ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں اس حدیث میں دیگر احکامات بھی ہیں (یہ سب اوامرِ سنیت کے بیان کے لئے ہیں)۔

[3] یہاں پر دونوں امر کے صیغوں میں وجوب سے وجوبِ اصطلاحی مراد نہیں بلکہ وجوب سے مراد فرض ہے کیونکہ اس پر خارجی قرائن موجود ہیں۔

اب رہا ارکان کو اطمینان[1] کے ساتھ ادا کرنا اس کیلئے حکم "فاطمان راکعا"، "فاطمئن جالسا" (ان الفاظِ حدیث میں ارکان رکوع، سجود، جلسہ کو اطمینان سے ادا کرنے کا حکم ہے) تو اس حکم میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جو اس کو وجوب سے نکال دے بلکہ یہاں پر ایک قرینہ موجود ہے جو دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم واجب ہے۔ وہ قرینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "وان انتقصت شیئا انتقصت من صلوتك" ہے تو معلوم ہوا کہ یہ طمانینت کا حکم فرض نہیں ہے اور نہ ہی سنت بلکہ یہ حکم واجب ہے اس میں کمی سے نماز میں کمی واقع ہو جائیگی لیکن نماز باطل نہ ہوگی کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ طمانینت کے بغیر نماز باطل ہو جائیگی تو اس صورت میں مطلق کتاب اللہ کو حدیث کے ساتھ مقید کرنا لازم آئیگا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث مشہور ہونے کے باوجود خصم کے دعویٰ کو ثابت نہیں کرسکتی۔

امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث کے آخر سے وہی بات سمجھی ہے جو صحابہ نے سمجھی تھی: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس آخری فرمان سے وہی بات سمجھی ہے جو صحابہ نے سمجھی ہے[2] یعنی "وکان هذا اهون علیهم من الاولیٰ الخ" سے صحابہ نے یہ سمجھا تھا کہ "صل فانك لم تصل" میں نفی ذات نہیں بلکہ نفی کمال ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے سمجھا ہے۔

(قال بلی قالوا فاعرض) یعنی ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ میں تم لوگوں سے

---

[1] **نماز میں طمانینت کا حکم:** یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے جیسا کہ اوجز میں اس کی تفصیل ہے کہ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام احمد، کے ہاں طمانینت فرض ہے طرفین کے مذہب میں واجب ہے، مالکیہ کے علماء کی مختلف آراء ہیں کہ ان کے ظاہری مذہب کے مطابق اس کو سنت ہونا چاہیئے یا واجب کیونکہ ابن رشد کے بقول امام مالک سے صراحۃً کوئی حکم منقول نہیں۔ قلت: علامہ شامی کی تحقیق کے مطابق ہمارے ہاں طمانینت واجب ہے۔ قومہ اور جلسہ میں طمانینت (اعتدال) کو سنت کہنا حنفیہ کے نزدیک مرجوح قول ہے۔

[2] یعنی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے وہی مفہوم سمجھا ہے جو مفہوم کبارِ صحابہ کرام نے سمجھا ہے جیسا کہ حدیث شریف کا یہ جملہ "هذا اهون علیهم من الاولیٰ" اس پر صراحۃً دلالت کر رہا ہے پس ابتدائے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "صل فانك لم تصل" اس سے یہ وہم پیدا ہوا تھا کہ بغیر طمانینت کے نماز بالکل ہی نہیں ہوتی۔ اور اخیر حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان "ان انتقصت شیئا" الخ دلالت کر رہا ہے کہ طمانینت کے بغیر نماز ناقص ہوگی نماز بالکل ہی نہ ہوا ایسا نہ ہوگا۔

زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا اور نہ ہی تم سے پہلے سے آپ کی صحبت کا شرف مجھے حاصل ہوا لیکن میرا دعویٰ اپنی جگہ ہے[1] کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ آپ لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ معلوم ہے کیونکہ بسا اوقات ایک شخص اپنے شیخ کی خدمت میں زیادہ حاضر نہیں ہوتا اور نہ ہی کثیر الملازمۃ ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان لوگوں کے مقابلہ میں جن کو بہت طویل شرفِ صحبت حاصل ہے یہ شخص بہت ساری معلومات زیادہ رکھتا ہے کیونکہ یہ شخص شیخ کی خدمت میں حاضری کے دوران اپنے دل و دماغ سے غور و فکر کرنے میں مشغول ہوتا ہے اور اس طریقہ کو اپنے پاس حتی الامکان محفوظ رکھتا ہے۔

"فتخ" لفظ فا پھر تاء پھر خا معجمہ کے ساتھ ہے اس کا معنی لٹکانے کے ہیں یعنی انگلیوں کو کھڑا کر کے موڑ دیا تا کہ ان کو قبلہ رخ کر دیا جائے۔

کلام میں تقدیم و تاخیر: (ثم صنع فی الرکعۃ الثانیۃ) یہ جملہ " حتی اذا قام من السجدتین کبر ورفع یدیہ حتی یحاذی بھما منکبیہ" اس پورے جملے کے بعد آنا چاہیئے تھا۔ کلام عرب میں اس طرح تقدیم تاخیر ہوتی رہتی ہے۔

امام ترمذیؒ کی توجیہ: امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ تاویل کی ہے کہ حدیث میں "اذا قام من السجدتین" سے مراد" اذا قام من الرکعتین" ہے لہٰذا اب کلام میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں ہماری تشریح کے مطابق، امام ترمذی رحمہ اللہ والی توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ کو یہ تاویل کی ضرورت[2] اس لئے پیش آئی کہ عبارت کے ظاہر کا تقاضہ یہ ہے کہ دو رکعتوں میں دو سجدے ہیں حالانکہ دو رکعتوں میں تو چار سجدے ہوتے ہیں۔ لہٰذا امام ترمذی فرماتے ہیں کہ سجدے سے مراد رکعت ہے[3] اور رکعت کو رکعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں رکوع ہوتا ہے لہٰذا سجدے سے ذریعہ رکعت

---

[1] امجد الدین فرماتے ہیں کہ ادعی کذا کا معنی ہے اپنے لئے حق کا دعویٰ کرنا اس کا اسم دعوۃ اور دعاوۃ ہے یہ دونوں کسرہ کے ساتھ آتے ہیں۔

[2] **مصنف کی اس توجیہ کی صحت پر قرائن:** یہ ایک احتمالی پہلو ہے بظاہر مصنف نے سجدتین کی تفسیر رکعتین سے اس لئے فرمائی کیونکہ بعض روایتوں میں سجدتین کی جگہ رکعتین کا لفظ موجود ہے چنانچہ ابوداؤد میں ہے "ثم یصنع فی الاخری مثل ذلک ثم اذا قام من الرکعتین کبر ورفع یدیہ" الحدیث اسی طرح ابن ماجہ اور طحاوی وغیرہ میں بھی ہے تو یہ سب روایات دلالت کرتی ہیں کہ حدیث میں تقدیم اور تاخیر کہنے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔

[3] اس لفظ کی جزا موجود نہیں اس کی جزا "فلما حمل السجدۃ علی الرکعۃ فلا اشکال اذا" ہے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آگے "فلا غرو" کا لفظ جزاء کے اوپر دلالت کر رہا ہے اور اس کے قائم مقام ہے۔

مراد لینے میں کوئی حرج نہیں اور یہ تسمیۃ الکل باسم الجزؤ کی قبیل سے ہوگا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہوتی رہتی ہے اسلئے اس تاویل کی ضرورت نہیں۔

شافعیہ کا رفع الیدین کے مسئلہ پر استدلال اور اسکا جواب: پھر یہ جان لیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے حدیث باب سے رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین پر استدلال کیا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک تیسرا رفع الیدین [1] بھی آتا ہے۔ (یعنی دو رکعتوں کے بعد رفع الیدین کرنا) اور امام شافعی رحمہ اللہ دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کی طرف کھڑے ہوتے وقت رفع الیدین کے قائل نہیں لہٰذا جو حدیث اس تیسرے رفع الیدین کیلئے ناسخ ہے وہ حدیث پہلے دو رفع الیدین کیلئے بھی ناسخ بنے گی۔ باب رفع الیدین کی گذشتہ مباحث دوبارہ ملاحظہ کر لینی چاہیئے۔

حدیثِ باب سے جلسہ استراحت اور تورک پر استدلال اور اسکا جواب: امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے جلسہ استراحت اور قعدہ اخیرہ میں تورک پر استدلال کیا ہے ان دونوں کا جواب گذر چکا ہے کہ یہ حکم شرعی بطور عزیمت کے نہیں فرمایا تھا بلکہ جسم کے بھاری ہونے کے عذر کی وجہ سے اس فعل کے جائز ہونے کو بتلایا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ جلسہ استراحت و تورک والی حدیث تاریخ کے اعتبار سے متاخر ہے تو یہ ہمیں تسلیم ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فعل عذر کی بنا پر کیا۔ ہاں رفع الیدین والی حدیث کو متاخر کہنا یہ تسلیم نہیں کیونکہ شوافع کوئی ایسی حدیث نہیں لا سکے جو اس پر دلالت کرے کہ دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے رفع الیدین کرنا منسوخ ہوگیا ہو اور وہ خود حدیث باب کے موخر ہونے کو نہیں مان رہے ورنہ یہ حدیث تو خود ان کے خلاف حجت ہوگی کہ تیسرے رکعت کی طرف کھڑے ہوتے ہوئے رفع الیدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری فعل بن جائیگا۔

حدیث باب میں یہ قول "صدقت هكذا صلى النبی صلى الله عليه و سلم" سے شوافع نے جلسہ استراحت، تورک، اور رفع الیدین جیسے مسائل پر استدلال کیا ہے؟

پہلا جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کر رہی کہ حکم شرعی اسی طریقہ پر متعین ہوگیا تھا بلکہ زندگی میں بسا اوقات اس طرح نماز پڑھنے کا بھی ثبوت ہے۔

---

[1] یعنی امام ترمذی رحمہ اللہ کی توجیہ کے بقول یہ جواب ہوگا۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے چونکہ کلام میں تقدیم اور تاخیر فرض کی ہے لہٰذا اس توجیہ کے مطابق یہ حدیث دو رکعتوں کے بعد رفع الیدین پر دلالت نہیں کریگی بلکہ دوسری رکعت کیلئے اٹھتے ہوئے رفع الیدین کا اس سے ثبوت ملیگا۔

دوسرا جواب: محمد بن عمرو کا ابوحمید الساعدی سے لقاء ثابت نہیں تو روایت منقطع ہوئی اور منقطع روایت شوافع کے ہاں نا قابل اعتبار ہے۔(امام طحاویؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ محمد بن عمرو بن عطاء کا اس روایت میں ابوحمید ساعدی سے سماع نہیں ہے اور یہ روایت منقطع ہے چنانچہ بعض راویوں نے محمد بن عمرو اور صحابی کے درمیان عباس بن سہل کا واسطہ ذکر کیا ہے ......اس کے علاوہ ترمذی کی سند میں احدھم ابو قتادۃ بن ربعی یہ جملہ بھی قابلِ اشکال ہے کیونکہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ قدیم الموت ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت میں شہید ہوئے تھے اور راجح قول کے مطابق ۳۸ھ میں انکی وفات ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر جنازہ پڑھی ہے۔جبکہ محمد بن عمرو کی ولادت سنہ ۴۰ھ کی ہے اور انکی وفات ۱۲۰ھ کی بعمر ۸۰ سال تقریباً ہے۔لہٰذا یہ بات محال ہے کہ محمد بن عمرو کا سماع ابوقتادہ سے ممکن ہو۔حافظؒ نے فتح الباری میں طحاوی کے کلام کا یہ جواب دیا ہے کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے سن وفات میں اختلاف ہے ایک قول میں ان کی وفات کا سال سن ۵۴ھ ہے اس طرح محمد بن عمرو کا ان سے لقاء ممکن ہے۔علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حافظ نے التلخیص الحبیر میں خود تصریح کی ہے کہ راجح قول میں ابوقتادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں انتقال فرما گئے تھے.....ترمذی کی روایت میں وھو فی عشرۃ من اصحاب بھی محلِ نظر ہے۔تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں موجود صحابہ کرام کی تعداد پانچ تھی:۱۔ابو ہریرہؓ،۲۔ابوحمیدؓ،۳۔ابواسیدؓ،۴۔سہل بن سعدؓ،۵۔محمد بن مسلمہ۔باقی پانچ کا تعلق انصار غیر صحابہ سے تھا۔امام بخاری نے باب سنۃ الجلوس فی التشھد میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کی سند میں عبدالحمید بن جعفر ضعیف راوی کو چھوڑ کر دوسرا راوی محمد بن عمرو بن حلحلہ عن محمد بن عمرو بن عطاء ذکر کیا ہے۔نیز اس حدیث کے متن میں نہ تو ابوقتادہ کا ذکر ہے نہ ہی دس صحابہ کرام کا اور نہ ہی رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع الیدین کا ذکر ہے اور نہ مابعد الرکعتین رفع الیدین کا ذکر ہے۔(اس سے معلوم ہوا کہ ترمذی کی روایت میں عبدالحمید بن جعفر راوی منکر الحدیث ہے نیز اس کے متن میں بھی تین غلطیاں ہیں:۱۔احدھم ابو قتادۃ بن ربعی، یہ صحیح نہیں ہے، ۲۔فی عشرۃ من اصحاب النبی ﷺ، یہ جملہ بھی امام بخاری کے نزدیک صحیح سند سے ثابت نہیں چنانچہ بخاری میں جالسا مع نفر من اصحاب النبی ﷺ کے الفاظ ہیں، ۳۔ابوحمید ساعدی نے ان صحابہ کی موجودگی میں رکوع میں جاتے ہوئے اور اٹھتے ہوئے رفع الیدین نہیں کیا لہٰذا ترمذی کی روایت نا قابل استدلال ہے۔(معارف السنن:ص ۱۴۹......۱۵۵۔جلد سوم، نیز صحیح بخاری جلد اول ص ۱۱۴ باب سنۃ الجلوس فی التشھد اور شرح معانی الآثار جلد ا صفحہ ۱۶۴۔اضافہ از مترجم)

باب منه

باب اسی سے متعلق

☆حدثنا محمدُ بن بَشّارٍ ومحمدُ بن المُثَنّی قالا: حَدَّثَنَا یحیی بن سعیدٍ القَطّانُ حَدَّثَنَا عبد الحمید بن جعفر حَدَّثَنَا محمد بن عمرو بن عطاء عن ابی حُمَیْدٍ السَّاعِدِیِّ، قال سمعته: وَهُوَ فی عَشَرَةٍ من اَصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، احدُهم ابو قَتَادَةَ بنُ رِبْعِی ، یقولُ: انا اَعْلَمُکُمْ بصلاۃِ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، قالوا: ماکُنتَ اَقْدَمَنَا له صُحْبَةً،ولا اَکْثَرَنَا له اِتْیاناً؟ قال: بَلَی، قالوا: فَاعْرِضْ ؟ فقال: کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اذا قامَ اِلی الصلاۃِ اعْتَدَلَ قائما ورَفَعَ یدیهِ حتی یُحَاذِیَ بهما مَنْکِبَیْهِ، فاِذا اراد ان یرکع رفع یدیه حتی یُحَاذِیَ بهما مَنْکِبَیْهِ، ثم قال: اللّٰهُ اکبرُ ، ورکع، ثم اعْتَدَلَ، فلم یُصَوِّبْ راسَهُ ولم یُقْنِعْ ، ووضع یدیهِ عَلَی رکبتیهِ، ثم قال: سمعَ اللّٰه لمن حَمِدَهُ، ورفع یدیه واعتدل، حتی یَرْجِعَ کُلُّ عَظْمٍ فی موضِعه مُعْتَدِلاً، ثم اَهْوَی اِلی الارض ساجداً، ثم قال: اللّٰهُ اکبرُ، ثم جَافَی عَضُدَیْهِ عن اِبْطَیْهِ، وفَتَخَ اصابعَ رجلیهِ ، ثم ثنی رجلَه الیسریَ وقعدَعلیها، ثم اعتدلَ، حتی یَرْجِعَ کُلُّ عظم فی موضعه مُعْتَدِلاً، ثم اَهْوَی ساجداً، ثم قال: اللّٰهُ اکبرُ، ثم ثَنَی رِجْلَهُ وقعدَ، واعتدَلَ حتی یَرْجِعَ کُلُّ عظمٍ فی موضِعه ، ثم نَهَضَ ، ثم صَنَعَ فی الرکعة الثانیةِ مِثلَ ذلك، حتی اذا قام من السجدتینِ کَبَّرَ ورفعَ یدیهِ حَتی یُحَاذِیَ بهما مَنْکِبَیْهِ، کماصنع حین افتتحَ الصلاۃَ، ثم صَنَعَ کذلك، حتی کانتِ الرکعةُ التی تَنْقَضِی فیها صلاتُه اَخَّرَ رِجْلَهُ الیسرَی وقعدَ علی شِقِّهِ مُتَوَرِّکاً، ثم سَلَّمَ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیح۔

قال: ومعنی قوله: ورفع یدیه اذا قام من السجدتین یعنی قام من الرکعتین۔

☆حدثنا محمد بن بَشّارٍ والحسنُ بن علی الخَلّالُ الحُلْوَانِیُّ وسَلَمَةُ بن شَبِیبٍ وغیرُ واحدٍ قالوا: حَدَّثَنَا ابو عاصمٍ النَّبِیلُ حَدَّثَنَا عبدُ الحمید بن جعفر حَدَّثَنَا محمد بن عَمْرو بن عطاء قال:سمعتُ اَبَا حُمَیْدٍ السَّاعِدِیَّ فی عشرةٍ من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم منهم ابو قتادة بنُ رِبْعِیٍّ، فذکر نحوَ حدیثِ یحیی بن سعید بمعناه، وزاد فیه ابو عاصمٍ عن عبد الحمید بن جعفر

هذا الحرف : قالوا: صدقتَ، هکذا صلی النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ و سلم۔

قال ابو عیسی: زادَ ابو عاصمٍ الضحّاکُ بنُ مَخْلَدٍ فی هذا الحدیثِ عن عبد الحمید بن جعفر هذا الحرفَ: قالوا: صدقتَ ، هکذا صلّی النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ و سلم۔

﴿ترجمہ﴾

محمد بن عمرو بن عطاء، ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے ابوحمید کو کہتے ہوئے سنا اس وقت جبکہ وہ دس صحابہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے جن میں ابوقتادہ بن ربعی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز، تم سب سے زیادہ مجھے محفوظ ہے۔ صحابہ نے فرمایا کہ تم نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہم سے مقدم تھے (یعنی آپ ہم سے قدیم الاسلام تو نہ تھے) اور نہ ہی تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زیادہ حاضر باش تھے۔ ابوحمید نے کہا بات تو بیشک یہی ہے (کہ نہ تو میں تم لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم الاسلام ہوں اور نہ ہی خدمت نبوی میں تم لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ آنے جانے والا ہوں) اس کے باوجود میرا دعویٰ وہی ہے۔ صحابہ نے فرمایا اچھا بیان کرو! ابوحمید نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے اور دونوں ہاتھ کندھوں کی سیدھ میں لے جاتے پھر جب آپ رکوع میں جانے کا ارادہ کرتے اسی طرح دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابلہ میں لے جاتے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع کرتے اور اعتدال کے ساتھ رکوع کرتے نہ سر کو جھکاتے اور نہ ہی اٹھاتے اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے پھر تسمیع (سمع اللہ لمن حمدہ) کہتے اور دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ لوٹ آتی پھر سجدے کیلئے زمین کی طرف جھکتے اور ''اللہ اکبر'' کہتے اور بازوؤں کو دونوں پہلوؤں سے علیحدہ رکھتے اور پاؤں کی انگلیاں موڑ کر قبلہ رخ کر دیتے پھر بایاں پاؤں بچھا کر اس پر اعتدال کے ساتھ بیٹھ جاتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ پر لوٹ جاتی پھر دوسرے سجدے کیلئے سر جھکاتے اور اللہ اکبر کہتے پھر جلسہ استراحت کیلئے پاؤں بچھا کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ لوٹ آتی تھی پھر کھڑے ہو جاتے اور دوسری رکعت میں اسی طرح کرتے یہاں تک کہ جب دونوں سجدوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے جیسا کہ نماز کے شروع میں کیا تھا پھر اسی طرح بقیہ رکعتیں پڑھتے یہاں تک کہ ان کی نماز کی آخری حالت آجاتی چنانچہ بائیں پاؤں کو آگے کی طرف نکال دیتے تھے اور بائیں جانب کی سرین پر بیٹھ جاتے تھے اور پھر سلام پھیر دیتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور فرمایا کہ ان کے قول اذا قام من السجدتین سے مراد یہ ہے کہ جب دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے۔

محمد بن عمرو بن عطاء کہتے ہیں کہ میں نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن میں ابوقتادہ بن ربعی بھی تھے، کی موجودگی میں ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے سنا اس کے بعد یحییٰ بن سعید کی روایت کی مثل حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ابو عاصم نے عبدالحمید بن جعفر کے حوالے سے یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں کہ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا ''صدقت'' تم نے سچ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح نماز پڑھی۔

باب ماجاء فی القراءۃِ فی صلاۃِ الصبحِ

باب فجر کی نماز میں مسنون قراءت کے بیان میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وكيع عن مِسْعَرٍ وسفيانَ عن زيادِ بنِ علاقَةَ عن عَمِّهِ قُطْبَةَ بنِ مالكٍ قال: سَمِعْتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يَقْرَأُ في الفجرِ والنَّخْلَ بَاسِقاتٍ في الركعة الأولَى۔ قال: وفي الباب عن عَمْرِوبنِ حُرَيْثٍ، وجابرِ بن سَمُرَةَ، وعبد اللّٰه بن السَّائِبِ، وابي بَرْزَةَ، وأُمِّ سَلَمَةَ

قال ابو عيسى: حديث قُطْبَةَ بن مالك حديث حسن صحيح۔ ورُوِيَ عن النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم: انه قرأَفي الصبحِ بِالوَاقعَةِ۔ ورُوِيَ عنه: انه كان يقرأفي الفجرِ مِن سِتِّينَ آيَةً إِلى مِائَةٍ۔ ورُوِيَ عنه: انه قرأَ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔

ورُوِيَ عن عمرَ: أنَّهُ كَتَبَ إِلى ابي موسى: أنِ اقْرَأْفي الصبحِ بِطِوَالِ المُفَصَّلِ۔ قال ابو عيسى: وعلى هذا العملُ عِنْدَ اهْلِ العلم۔ وبه قال سفيانُ الثَّوْرِيُّ، وابنُ المبارَكِ، والشافعيُّ۔

﴿ترجمہ﴾

زیاد بن علاقہ اپنے چچا قطبہ بن مالک سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں والنخل باسقات پڑھتے ہوئے سنا (یعنی سورہ ق)

اس باب میں عمرو بن حریث، جابر بن سمرہ، عبداللہ بن سائب، ابو برزہ، اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی نماز میں سورہ واقعہ کا پڑھنا بھی مروی ہے اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اذا الشمس کورت" (سورہ تکویر) پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ فجر کی نماز میں طوالِ مفصل پڑھا کرو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کا اسی حدیث پر عمل ہے اور سفیان ثوری، ابن مبارک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

(یقرا فی الفجر : والنخل بسقت) اس لفظ سے مراد وہ سورت ہے[۱] جس میں یہ آیت موجود ہے یعنی سورہ ق...... صرف اس آیت کا پڑھنا مراد نہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الْقِرَاءَ ةِ فِی الظُّهْرِ وَالْعَصَرِ

باب ظہر اور عصر میں (مسنون) قراءت کا بیان

☆ حدثنا احمدُ بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا یزیدُ بن هرونَ اخبرنا حَمَّادُ بنُ سَلَمَةَ عنِ سِمَاكِ بن حَرْبٍ عن جابر بن سَمُرةَ: اَنَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان یَقْرَأُ فی الظهرِ والعصرِ بالسَّمَاءِ ذَاتِ البُرُوجِ والسَّماءِ والطَّارِقِ وشِبْهِهِمَا۔

قال : وفی الباب عن خَبَّابٍ، وابِی سعیدٍ، وابی قتادةَ، وزیدِ بن ثابتٍ، وَالبَرَاءِ بن عازبٍ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ جابرِ بن سَمُرَةَ حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم: انَّه قرأَ فی الظهر قَدْرَ تَنْزِیل السَّجْدَةَ۔

ورُوِیَ عنه: انه کانَ یقرا فی الرکعة الاولٰی مِن الظهر قَدْرَ ثلاثین آیةً، وفی الرکعةِ الثانیةِ خَمْسَ عَشْرَةَ آیةً۔ ورُوِیَ عن عمرَ: انه کَتب اِلی ابی موسی: انِ اقرأ فی الظهرِ بِاَوْسَاطِ المُفَصَّلِ۔

---

[۱] اس سے مراد سورۃ ق ہے، جیسا کہ مسلم کی بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ق والقرآن المجید کی تلاوت فرمائی اس سے حضرت گنگوہی کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔

ورَأی بعضُ اهل العلم: اَنَّ القراءۃَ فی صلاۃِ العصرِ کَنَحْوِ القراءۃِ فی صلاۃِ المغربِ: یَقْرأُ بقِصارِ المُفَصَّلِ۔ورُوِیَ عن ابراهیم النَّخَعِیِّ انه قال: تَعْدِلُ صلاۃُ العصرِ بصلاۃِ المغرب فی القراءۃِ۔ وقال ابراهیم : تُضَاعَفُ صلاۃُ الظهرِ علی صلاۃِ العصرِ فی القراءۃِ اَرْبَعَ مِرَارٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر کی نماز میں سورۃ بروج اور والسماء والطارق اور اسی کی مانند پڑھا کرتے تھے۔

اس باب میں خباب، ابوسعید، ابوقتادہ، زید بن ثابت اور براء رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر بن سمرہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز میں سورۃ الم سجدہ کے برابر قرأت کی اور ایک اور جگہ مروی ہے کہ ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر قرأت کی اور دوسری رکعت میں پندرہ آیات کی بقدر قرأت فرمائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ ظہر کی نماز میں اوساطِ مفصل پڑھا کرو۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ عصر کی قراءت مغرب کی قراءت کی طرح ہے اس میں قصار مفصل پڑھے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا عصر کی نماز قراءت میں مغرب کی نماز کے برابر رکھی جائے اور ابراہیم کہتے ہیں کہ ظہر میں عصر سے چار گنا زیادہ قراءت کی جائے۔

﴿تشریح﴾

(کان یقرا فی الظهر والعصر والسماء ذات البروج، والسماء والطارق) یہ لف ونشر مرتب ہے یعنی ظہر میں سورۃ بروج جیسی سورتیں اور عصر میں طارق جیسی سورتیں پڑھتے تھے۔ اگر لف ونشر مرتب نہ ہو تو بیان جواز کیلئے اس طرح بھی ثابت ہے کہ ظہر میں سورۃ بروج اور طارق پڑھ لی ہوں یا عصر میں یہ دونوں سورتیں پڑھ لی ہوں۔

پہلی اور دوسری رکعت کی قرأت میں ائمہ احناف کا مذہب: (وفی الرکعه الثانیة قدر خمس عشر آیة) یہ حدیث امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں بیان جواز کیلئے ہے تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں فجر کی نماز میں پہلی رکعت[1] دوسری رکعت سے لمبی ہوگی اور باقی نمازوں میں دونوں رکعتوں کی قرأت برابر سرابر ہوگی بخلاف امام محمد رحمہ اللہ کے

[1] ہدایہ میں ہے کہ شیخین کے مذہب میں فجر کی پہلی رکعت دوسری رکعت کے مقابلہ میں لمبی ہوگی تاکہ لوگ جماعت میں شریک ہوسکیں اور ظہر کی دونوں رکعتیں برابر ہونگی۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ تمام نمازوں کی پہلی رکعتیں دوسری رکعتوں سے لمبی ہوں

کے ہاں تمام نمازوں کی پہلی رکعت کی قرأت دوسری رکعت کے مقابلہ میں لمبی ہوگی۔

امام محمدؒ کی دلیل: ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں پہلی رکعت کو دوسری رکعت پر لمبا ہونا صحابہ نے نقل کیا ہے جیسا کہ یہاں پر ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے جواب اور اس پر رد: امام صاحب کی طرف سے جواب یہ ہے کہ پہلی رکعت ادعیہ[1] کی وجہ سے لمبی ہوتی تھیں قراءۃ میں دونوں رکعتیں برابر ہوتی تھیں لیکن یہ تاویل اس روایت میں کیسے ممکن ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی رکعت پندرہ آیتوں کی مقدار لمبی ہوتی تھی تو اس سے دعاؤں کے اعتبار سے لمبا ہونا پہلی رکعت کا یہ مراد نہیں[2] ہوسکتا خصوصاً اس لئے بھی کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرائض میں ثناء، تعوذ اور تسمیہ کے علاوہ اذکار اور اوراد کے قائل نہیں۔

طوالِ مفصل، اوساطِ مفصل، قصارِ مفصل کی تعیین: فرائض کی پانچوں نمازوں میں ان سورتوں کی تعیین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سے ہوئی ہے لہٰذا جس امام[3] کے ہاں جو حدیث ثابت ہوگئی اس نے اس کے مطابق ان سورتوں کی قراءت کو نماز میں مسنون قرار دیا اور مسنون سورتوں کے علاوہ کی قراءت کو بیان جواز پر یا کسی عذر پر محمول کیا، بہرحال اصل ضابطہ یہی ہے جو ہم نے بیان کیا اسی ضابطہ کے پیشِ نظر حنفیہ فجر اور ظہر میں طوالِ مفصل[4] مغرب میں قصارِ مفصل اور عصر اور عشاء میں اوساطِ مفصل کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔

---

[1] صاحب ہدایہ نے بھی اس تطویل سے ثناء، تعوذ، تسمیہ کے اعتبار سے تطویل مراد لی ہے۔

[2] **دوسرا جواب:** لہٰذا وہی توجیہ ہوگی کہ یہ حدیث بیان جواز کیلئے ہے اسی کو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔

[3] ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ فجر کی نماز میں طوالِ مفصل اور مغرب میں قصارِ مفصل پڑھی جائیگی۔ باقی نمازوں کے متعلق اختلاف ہے جیسا کہ اوجز میں ہے۔

[4] علامہ قسطلانی نے طوالِ مفصل، اوساط، قصار کی اس تقسیم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ صبح اور ظہر کی نماز کے اوقات نیند کے اوقات ہیں لہٰذا نماز کے اوقات کو لمبا کرنا مناسب ہے۔ تاکہ دیر سے آنے والا شخص ان نمازوں میں شریک ہو سکے اور عصر کا وقت مشغولیت کا وقت ہے لوگ کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں اور عشاء کا وقت آرام کا ہے اس لئے ان دونوں نمازوں کے مناسب اوساطِ مفصل ہیں تاکہ لوگ نمازوں سے فارغ ہوکر اپنے کام کاج اور آرام میں مشغول ہو جائیں، مغرب کا وقت تھکان اور روزہ دار کی افطاری کا وقت ہے اس لئے اس میں قصارِ مفصل ہی مناسب ہے۔

باب ماجاء فی القراء ۃِ فی المغرب

باب نمازِ مغرب کی قراءت کا بیان

☆حدثنا هناد حدثنا عبدة بن سليمان عن محمد بن اسحق عن الزهريّ عن عبيدة الله بن عَبْد اللّٰه بن عُتبَةَ عن ابن عباسٍ عن اُمِّهِ اُمِّ الفضلِ قالت: خَرَجَ اِلينا رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ عاصبٌ رَأسَهُ فى مرضِهٖ، فصلى المغرِبَ، فَقرَاَ بِالمُرسَلاتِ، قالت: فما صلاّها بَعْدُ حتى لَقِيَ اللّٰهَ۔

قال: وفى الباب عن جُبَيْرِ بن مُطْعِمٍ، وابنِ عمرَ، وابى اَيُّوبَ، وزيد بن ثابتٍ۔

قال ابو عيسى: حديث اُمِّ الفضلِ حديث حسن صحيح۔ وقد رُوىَ عن النبى صلى الله عليه وسلم: اَنَّهُ قرأَفى المغربِ بالأَ عْرافِ ، فى الركعتين، كِلْتَيْهِمَا۔

ورُوى عن النبيّ صلى الله عليه وسلم۔ اَنَّهُ قرأَ فى المغرابِ بالطُّورِ۔ ورُوىَ عن عمرَ: انه كتب الى ابى موسى: اَنِ اقْرَأْفى المغربِ بِقِصَارِ المُفَصَّلِ۔ ورُوىَ عن ابى بَكْرٍ الصدِّيقِ : انه قرأَفى المغربِ بِقِصَارِ المُفَصَّلِ۔ قال : وعلى هذا العملُ عندَ اهل العلم۔ وبه يقول ابن المبارك، واحمدُ، واسحٰق۔ وقال الشافعيُّ: وذَكَرَ عن مالكٍ انه كَرِهَ ان يُقرَاَ فى صلاة المغرب بالسُّوَرِ الطِّوَالِ، نحو الطُّورِ والمُرسَلات۔: قال الشافعيُّ: لا اَكرَهُ ذلك، بل اَستَحِبُّ ان يُقرَاَ بهذهِ السُّور فى صلاة المغربِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی والدہ ام فضل سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں ہماری طرف تشریف لائے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر پر پٹی باندھے ہوئے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں سورہ مرسلات پڑھی اور اس کے بعد وفات تک آپ نے باجماعت نماز نہ پڑھائی۔ (از مترجم: ترمذی کی یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں مسجد میں باجماعت جو سب سے آخری نماز ادا فرمائی تھی وہ نماز مغرب کی تھی، اس کے برعکس بخاری میں حدیثِ عائشہؓ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں باجماعت سب سے آخری نماز نمازِ ظہر ادا فرمائی تھی۔ (بخاری باب وانما جعل الامام ليؤ تم به) حافظ عینیؒ اور حافظ عسقلانیؒ نے اس کو اختیار فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا واقعہ مسجد نبوی کا تھا اور ام الفضل والا واقعہ باب گھر کا تھا

تھا چنانچہ نسائی کی روایت میں ام الفضل کی حدیث میں صلی بنا فی بیتہ کے الفاظ ہیں چنانچہ حافظان نے ترمذی کی روایت خرج الینا کی یہ تاویل فرمائی کہ جس کمرے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرماتے تھے اس کمرہ سے صحن میں تشریف لائے اور وہاں امامت فرمائی۔ص ۱۷۵: معارف السنن: جلد ثالث۔ اگر چہ علامہ انور شاہؒ کی رائے عالی یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں اور دونوں واقعات مسجد نبوی ہی کے ہیں۔ علامہ نے حافظان پر رد کیا ہے۔ص ۱۷۸ ایضا)۔

اس باب میں جبیر بن مطعم، ابن عمر، ابوایوب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ام فضل حسن صحیح ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورہ اعراف پڑھی اور یہ بھی مروی ہے کہ مغرب میں سورہ طور پڑھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل پڑھا کرو اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے مغرب میں قصارِ مفصل پڑھی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی پر اہل علم کا عمل ہے اور ابن مبارک، احمد، اور اسحٰق کا قول بھی یہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مالک کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ مغرب میں لمبی سورتوں کو مکروہ سمجھتے تھے جیسے کہ ''سورہ طور'' اور ''مرسلات''۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا بلکہ میں مستحب سمجھتا ہوں کہ یہ سورتیں مغرب کی نماز میں پڑھی جائیں۔

﴿تشریح﴾

مغرب کی نماز کا وقت گنجائش والا ہے: (ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم قرأ فی المغرب بالاعراف فی الرکعتین کلتیھما) یہ حدیث شریف ان حضرات کے خلاف صراحۃً رد کر رہی ہے جو اس کے قائل ہیں کہ مغرب کا وقت مستحب مختصر سا ہوتا ہے[1]۔ دوسرا یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ہر ہر نماز میں چھوٹی یا بڑی ہر طرح کی سورۃ کا پڑھنا جائز ہے۔ یہاں تک کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ گذشتہ تفصیل سے نمازوں میں ان خاص خاص سورتوں کا پڑھنا ضروری معلوم ہوتا ہے[2] یا کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ نمازوں میں ان خاص سورتوں کے علاوہ سورتوں کا پڑھنا جائز ہی نہیں۔

---

[1] اس حدیث سے حافظ رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں مغرب کے وقت کے طویل ہونے پر استدلال کیا ہے۔

[2] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے بظاہر یہ عبارت ''کماعینت'' ہونی چاہئے کیونکہ ضمیر کا مرجع سورتیں ہیں۔ یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ضمیر کا مرجع قراءت ہو لہٰذا اس کو مذکر لانا صحیح ہے۔ بہر حال وجوبھا کا لفظ لایظن کا نائب فاعل ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ ان سورتوں کے متعین کرنے سے اور نمازوں میں ان کو تقسیم کرنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ نمازوں میں ان سورتوں کا پڑھنا ضروری ہے جیسا کہ یہاں پر بیان کیا گیا ہے کہ فجر میں طوال اور مغرب میں قصار ہوگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے علاوہ جائز ہی نہیں۔

(وذکر عن مالك انه یکره فی صلوٰۃ المغرب بالسور الطوال) امام مالکؒ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ان سورتوں پر مداومت اختیار کرنا مکروہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ سمجھا کہ امام مالک رحمہ اللہ ان سورتوں کے نفس پڑھنے ہی کو مکروہ سمجھ رہے ہیں اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی[۳]۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الْقِرَاءَ ةِ فِی صَلَاةِ الْعِشَاءِ

باب عشاء کی نماز میں قراءت کا بیان

☆حدثنا عَبْدَۃُ بن عبد اللّٰه الخُزاعیُّ البصریُّ حَدَّثَنَا زید بن الحُباب حَدَّثَنَا حسین بن واقدٍ عن عبد اللّٰه بن بُرَیْدَۃَ عن ابیه قال: کان رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یَقْرَأُ فی العشاءِ الآخِرَۃِ بِالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ونحوها من السُّوَرِ۔

قال: وفی الباب عن البراء بن عَازِبٍ، وانسٍ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ بُرَیْدَۃَ حدیث حسن۔ وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم: انه قرأ فی العِشاء الآخِرَۃِ بِالتِّینِ وَالزَّیْتُونِ۔

ورُوِیَ عن عثمانَ بن عَفَّانَ: انه کان یَقْرَأُ فی العشاءِ بِسُوَرٍ مِن اَوْسَاطِ الْمُفَصَّلِ، نحوِ سُورَۃِ الْمُنَافِقِینَ وَاَشْبَاهِهَا۔ ورُوِیَ عن اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم والتابعینَ: انهم قَرَؤا باکثرَ مِن هذا واَقَلَّ، فکَاَنَّ الاَمْرَ عندَهم واسعٌ فی هذا۔

---

[۳] **حافظ کا ترمذی کی نقل پر رد:** حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں امام ترمذیؒ کے اس کلام کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بغوی نے شرح السنۃ میں اسی طرح نقل کیا ہے لیکن شافعیہ کے ہاں مشہور یہ ہے کہ مغرب میں لمبی سورتوں کا پڑھنا نہ مکروہ ہے نہ مستحب، امام مالکؒ نے عمل اہل مدینہ اور دوسرے شہروں کے علماء کے عمل سے استدلال کیا ہے ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز میں قراءت کے لمبا کرنے پر اور مغرب کی نماز میں مختصر قراءت پر شروع زمانے سے متواتر عمل چلا آ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح مذہب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جن سورتوں کا پڑھنا ثابت ہے اور ان پر آپ نے مواظبت بھی فرمائی ہے تو ان کا پڑھنا مستحب ہے اور جن سورتوں کے پڑھنے پر مواظبت نہیں ہے تو انکا پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ انتہی۔ قلت: شافعیہ کے فروع میں مشہور مسئلہ یہ ہے کہ مغرب میں قصارِ مفصل پڑھنا مستحب ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے امام مالکؒ کے کلام کی جو توجیہ فرمائی ہے وہ بہت اچھی توجیہ ہے کیونکہ مجھے مالکیہ کی فروع میں لمبی سورتوں کا مکروہ ہونا نہیں ملا بلکہ اس میں صرف یہ ہے کہ مغرب میں چھوٹی سورتوں کا پڑھنا مستحب ہے۔

واحسن شیءٍ فی ذلك ماروِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم:انه قرأ بِالشَّمْسِ وضُحَاهَا، والتِّینِ وَالزَّیْتُونِ۔

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو معاویة عن یحیی بن سعید الانصاریِّ عن عَدِیِّ بْن ثابتٍ عن البَرَاءِ بن عازبٍ: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم قرأفی العشاءِ الآخِرَةِ بالتین والزیتون۔

قال ابو عیسی:هذا حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز میں ''سورۃ الشمس'' اور اسی کی مانند سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

اس باب میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث بریدہ رضی اللہ عنہ حسن ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء میں ''والتین والزیتون'' پڑھی۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ عشاء میں اوساط مفصل پڑھتے تھے جیسے سورہ منافقون اور اسی کے مثل کی سورتیں۔ صحابہ وتابعین کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اس سے کم اور زیادہ دونوں طرح پڑھا ہے ان کے نزدیک اس باب میں وسعت ہے۔ اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث میں سب سے بہتر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''والشمس وضحٰھا'' اور ''والتین والزیتون'' پڑھی۔

☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں ''والتین والزیتون'' پڑھی یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

باب ماجاء فی القراءۃ خَلْفَ الاِمامِ

باب امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بیان میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا عبدة بن سلیمانَ عن محمد بن اِسحٰقَ عن مَکْحُولٍ عن محمود بن الرَّبِیعِ

عـن عُبَـادَةَ بن الصَّامِتِ قال: صلّى رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الصبحَ، فَثَقُلَتْ عليه القراءةُ، فلمّا انـصـرفَ قـال: اِنّـي اراكم تقرؤن وراءَ اِمامِكم؟ قلنا: يارسولَ اللّٰهِ، اِى وَاللّٰهِ قال: فلا تَفعَلُوا اِلّا بِاُمِّ القرآنِ، فاِنَّهُ لاصلاةَ لمن لم يقرأ بها۔

قال: وفي الباب عن ابي هريرة، وعائشةَ وانسٍ، وابي قتادةَ، وعبد اللّٰه بن عَمرٍو۔

قال ابو عيسى: حديث عبادةَ حديث حسن۔

وَرَوَى هذا الحديث الزُّهرِيُّ عن محمود الرَّبيعِ عن عُبَادَةَ بن الصَّامتِ عن النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم قال: لاصلاةِ لِمَنْ لم يقرأ بفاتحةِ الكتابِ۔ قال وهذا اصحُّ۔والعملُ على هذا الحديث۔ في القـراء خـلفَ الاِمامِ۔ عندَ اكثر اهل العلم من اصحاب النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم والتابعينَ۔ وهو قولُ مالكُ بن انسٍ، وابنِ المباركِ، والشافعيِّ، واحمدَ، واسحق: يَرَوْنَ القراءةَ خلف الاِمام۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھی اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قراءت کرنا بھاری ہوگیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو فرمایا میرا خیال ہے کہ تم لوگ امام کے پیچھے قراءت کرتے ہو۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نے کہا جی ہاں یارسول اللہ! اللہ کی قسم (ہم قرات کرتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو مگر صرف سورہ فاتحہ مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کے پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

اس باب میں ابوہریرہ، عائشہ، انس، ابوقتادہ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبادہ کی حدیث حسن ہے۔ اس حدیث کو زہری نے محمود بن ربیع سے انہوں نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی اور یہ اصح ہے۔ اکثر صحابہ وتابعین کا قراۃ خلف الامام (امام کے پیچھے قراءت کرنے) کے بارے میں اس حدیث پر عمل ہے اور مالک بن انس، ابن مبارک، شافعی، احمد بن حنبل اور اسحٰق بھی اسی کے قائل ہیں کہ قراءت خلف الامام (امام کے پیچھے قراءت کرنا) جائز ہے۔

﴿تشریح﴾

قرأت خلف الامام مسائل فرعیہ میں معرکۃ الآراء مسئلہ ہے: جان لینا چاہیئے کہ قراءت خلف الامام کا مسئلہ فروعی مسائل میں سے سب سے زیادہ نازک مسئلہ ہے اور فقہائے مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل میں سے اہم ترین بھی۔ یہاں پر اس مسئلہ کو ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ اس بات کو ثابت کیا جائے جو بالکل حق ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہاں کوئی متعصب (ضدی) جس کا مقصد صرف لڑائی جھگڑا ہے، اپنے تکبر اور دشمنی کی وجہ سے یا کوئی بے وقوف اپنی بے وقوفی کی وجہ سے قبول نہ کرے تو بات اور ہے۔

پہلی تمہید: یہ ہے کہ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ جس وقت امام قراءت کر رہا ہو تو مقتدی امام کے پیچھے قراءت نہ کرے

دوسری تمہید: اسی طرح اس پر بھی جمہور[1] کا اتفاق ہے کہ مقتدی سورۃ کی قراءت نہیں کریگا۔ قراءت فاتحہ مختلف فیہ ہے ہاں تھوڑی سی جماعت جن کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی وہ فقہاء کے زمرہ میں آتے ہیں وہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ کی قرات کا بھی حکم دیتے ہیں۔

---

[1] جمہور کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے ورنہ بعض علماء کا کچھ اختلاف بھی ہے۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ مقتدی جب امام کی قراءت سن رہا ہو تو وہ نہ سورۃ فاتحہ کی قراءت کر سکتا ہے نہ ہی کسی آیت کی قراءت کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "واذا قری القرآن فاستمعوا له" نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "مالی انازع القرآن فانتهی الناس عن القراة فیما جهر" بہرحال جب مقتدی امام کی قراۃ سن رہا ہو تو اس پر نہ قراۃ واجب ہے اور نہ مستحب۔ یہی ہمارے امام احمد، زہری، ثوری، مالک، ابن عیینہ، ابن مبارک، اسحٰق کا مذہب اور امام شافعیؒ کا ایک قول ہے۔

قرأت خلف الامام کے عموم پر ابن العربی کا امام شافعی پر مضبوط اعتراض واستفسار: امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ جہری نمازوں میں جب امام قرات کر رہا ہو تو مقتدی قرات کر سکتا ہے۔ ابن العربی نے قرات خلف الامام کے عموم پر اعتراض کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ سے یہ پوچھا جائیگا کہ جہری نماز میں مقتدی کس طرح قرات کر سکے گا کیا وہ امام کے ساتھ ساتھ پڑیگا تو اس سے منازعہ پیدا ہوگا جو کہ ممنوع ہے یا امام کی قرات سننے سے اعراض کریگا یا جب امام خاموش ہوگا جب پڑھیگا اگر کوئی شافعی یہ کہے کہ امام جب سکتہ کریگا تب مقتدی قرات کریگا تو اس سے یہ پوچھا جائیگا کہ امام نے سکتہ کیا ہی نہیں تو مقتدی کب پڑھیگا اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ امام پر سکتہ کرنا واجب نہیں ہے اور ان سے یہ بھی پوچھا جائیگا کہ امام کی قرات کو سننے سے مقتدی کی قرات ادا نہیں ہوتی۔ بہرحال یہ بات ہر منصف اور سمجھدار کیلئے کافی ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما قرات خلف الامام نہیں کرتے تھے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ اتباع کرنے والے تھے۔

مختلف فیھا صورت مسئلہ: اختلافی صورت یہ ہے کہ امام کے سکتہ کے اوقات میں قراءت کرنے کا کیا حکم ہے۔

چار مذاہب: اس مسئلہ میں چار مذاہب ہیں: ا۔امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے کہ مقتدی کیلئے سورۃ فاتحہ کی قرات کرنا سری اور جہری نماز (دونوں) میں ناجائز ہے۔

۲۔امام شافعی رحمہ اللہ شافع العصاۃ کے ہاں سری اور جہری دونوں نمازوں میں قراۃ فاتحہ واجب ہے۔

۳۔امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جہری نماز میں سورۃ فاتحہ واجب نہیں[1] سری نماز میں واجب ہے۔

۴۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سری اور جہری دونوں نمازوں میں قراۃ فاتحہ کو واجب نہیں کہتے ہاں ان کے ہاں مقتدی کیلئے قراۃ فاتحہ جائز ہے۔

۵۔اگر ہم اس چھوٹی سی جماعت کا مذہب بھی ملالیں جو نا قابل اعتبار ہیں تو مذاہب پانچ ہو جائینگے (کہ ان کے ہاں مقتدی کیلئے فاتحہ اور سورہ دونوں کی قرات ضروری ہے)۔

امام محمد کی ایک روایت اور شیخین کا مذہب:

۶۔امام محمد رحمہ اللہ سے ایک روایت ہے کہ قراۃ فاتحہ خلف الامام کو انہوں نے اچھا سمجھا ہے۔[2]

بہرحال شیخین کے ہاں مقتدی کیلئے قرات خلف الامام حرام[3] ہے کیونکہ اس پر وعید وارد ہوئی ہے۔[4]

---

[1] حضرت گنگوہیؒ نے سری نماز میں امام مالکؒ کے ہاں قرات خلف الامام کے واجب ہونے کا جو قول نقل کیا ہے شاید یہ بعض مالکیہ کے کلام سے ماخوذ ہو کیونکہ بعض مالکیہ کا یہی مذہب ہے ورنہ امام مالکؒ کا راجح مذہب جیسا کہ اوجز میں ہے سری اور جہری دونوں نمازوں میں فاتحہ کے عدم وجوب کا قول ہے ہاں سری نماز میں فاتحہ پڑھنا مستحب اور جہری نماز میں مکروہ ہے اسی طرح حنابلہ سے جو حضرت گنگوہیؒ نے نقل کیا ہے کہ مطلقا خلف الامام قرات جائز ہے یہ مذہب ان کی فروع کے خلاف ہے بلکہ حنابلہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جہری نماز میں قرات کے وقت جب امام زور سے قرات کر رہا ہو تو مقتدی کو قرات منع ہے ہاں کوئی عذر ہو تو جائز ہے۔

[2] صاحب ہدایہ وغیرہ نے شیخین رحمہما اللہ سے یہی مذہب نقل کیا ہے کہ ان کے ہاں قراۃ خلف الامام حرام ہے۔ درّ مختار میں ہے کہ امام محمد کی طرف جو نسبت ہے وہ صحیح نہیں۔

[3] شیخین کے ہاں قراۃ مکروہ تحریمی ہے، درّ مختار میں ہے کہ مقتدی مطلقاً قرات نہ کرے اگر قرات کریگا تو اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی ہاں اصح قول کے مطابق نماز صحیح ہو جائیگی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "واذا قری القرآن فاستعموا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون" اس آیت کی وجہ سے بھی مقتدی کو خاموش رہنا ضروری ہے۔

خصم کے دلائل کے جوابات: علمائے متقدمین نے یہاں پہ یہ جواب دیا ہے کہ اگر ہم مقتدی کو قراءتِ فاتحہ کی اجازت دیں تو اس صورت میں آیتِ مبارکہ کو خبرِ واحد کے ساتھ خاص کرنا لازم آیگا۔ یہ جواب بالکل مشہور ہے اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہیں۔

انوکھا جواب: یہاں پر مقصود خصم کے دلائل کا ایسا انوکھا جواب دینا ہے جو کسی نے بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی حسنِ توفیق سے ہم اس کو ذکر کرتے ہیں ہمارے اس کلام کی ہر وہ شخص تعریف کرے گا جو فہم مستقیم رکھتا ہو اور اس کا مقصد حق بات کو غور وفکر کر کے سننا ہو اور خواہ مخواہ کا جھگڑا مقصود نہ ہو۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

شیخین کے دلائل: علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کو قرات سے روکنے کے متعلق تقریباً اسی کبار صحابہ سے ان کے اقوال منقول ہیں جس میں حضرت علی، عبادلہ اربعہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں، اور محدثین نے ان کے نام تفصیل سے ذکر کیئے ہیں۔

کبارِ صحابہ نے قرأت خلف الامام کی شدید مخالفت فرمائی ہے: التنسیق عن کشف الاسرار میں عبداللہ بن زید بن اسلم عن ابیہ کی سند سے مروی ہے کہ دس صحابہ کرام قرات خلف الامام سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے جن کے نام یہ ہیں: (۱) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، (۲) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، (۳) عثمان رضی اللہ عنہ، (۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ، (۵) عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، (۶) سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، (۷) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، (۸) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، (۹) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، (۱۰) زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ انتہی

اوجز میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مختلف الفاظ منقول ہیں ایک روایت میں ہے "انصت فان فی الصلوۃ شغلا سیکفیک الامام" دوسری روایت میں ان سے یہ الفاظ مروی ہیں "لیت الذی یقرا خلف الامام ملئ فوہ ترابا" ۔ علقمہ بن قیس سے مروی ہے کہ میں کسی انگارے کو منہ میں چباؤں یہ زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں قرات خلف الامام کروں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو شخص قرات خلف الامام کرتا ہے اسکے منہ میں انگارہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قرأت خلف الامام کرنے والے شخص کے منہ میں کاش کہ پتھر ہو۔ صاحب تنسیق فرماتے ہیں کہ ان آثار کی سند جید ہے جس پر کوئی کلام نہیں پھر آگے چل کے اس باب میں مخالفین کے آثار کو نقل کر کے ان پر رد کیا ہے۔

محمد بن اسحٰق پر کلام: چنانچہ غور کیجئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب کی جو حدیث بیان کی ہے اس کی سند اس طرح ہے "حدثنا هناد قال حدثنا عبدة بن سليمان عن محمد بن اسحق الخ" احناف کہتے ہیں کہ یہ محمد بن اسحٰق وہی راوی ہے جس کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ نے کذاب کا جملہ فرمایا ہے اس طرح دوسرے ائمہ حدیث نے اس کو مطعون قرار دیا ہے لہٰذا ان کی حدیث پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: یہ اشکال کہ اس کا متابع موجود ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا متابع نافع بن محمود ہے جو کہ ایک مجہول شخص ہے[1]۔

محمد بن اسحٰق راوی کی روایت بالکل نا قابل قبول نہیں ہے: یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ محمد بن اسحٰق راوی کو مطعون قرار دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ان سے بعض روایات نقل کی ہیں اور دوسرے ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے صحیح بات یہ ہے کہ حدیث باب اس جرح کی وجہ سے صحت کے درجہ تک تو نہیں پہنچ سکی مگر اس کا حسن ہونا نا قابل انکار ہے جیسا کہ بعض شافعیہ نے جن میں دارقطنی وغیرہ شامل ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو مطعون کہا ہے اور ان کی وہ روایت جس میں انصات کا ذکر ہے اس کو ضعیف قرار دیا ہے...... یہ سب لغو ہے۔

شوافع کی توجیہ اور اس پر رد: (فثقلت عليه القراءة) شوافع کہتے ہیں کہ یہ ثقل اس لئے پیدا ہوا تھا کہ اس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جہراً قرات شروع کر دی تھی اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی قرات گراں گزری تھی۔ (اگر یہ سراً قرأت کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں نہ گزرتا)۔ یہ توجیہ بالکل بعید ہے جس کو ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کی علمِ حدیث میں تھوڑی بہت نظر ہو تو محققین نقادِ حدیث کس طرح اس کو قبول کریں گے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی نماز میں جہراً قرات فرما رہے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ آہستہ بھی قرأت کریں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت نہ سنیں جن پر قرآن اترا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ صحابہ کرام تو نماز کے باہر بھی اپنی آواز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہیں کرتے تھے اور آپ کی

---

[1] ابن عبدالبر نے بالجزم انکو رجل مجہول کہا اگر چہ ابن حبان نے ان کو ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔ حافظ نے تقریب میں ان کو مستور الحال قرار دیا ہے۔

خاموشی کے وقت زبان کوجنبش نہیں دیتے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد فرمایا "انی اراکم تقروون وراء امامکم" اور بعض روایت میں "ھل قرا منکم احد" ہے تو کیا اس جملہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مقتدی کے نفسِ قرأت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تردد کا اظہار فرما رہے تھے؟ کیا کوئی شخص اس جملہ کو دیکھتے ہوئے مقتدی کیلئے جہری قرأت ثابت کرسکتا ہے۔

حدیث کی صحیح تشریح: بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز کی سنتوں اور فرائض میں جو کوتاہی صادر ہوتی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر وہ اثر انداز ہو جاتی تھی جیسا کہ دوسرے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید کہ تم لوگ اچھی طرح طہارت حاصل نہیں کرتے[1] الخ۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چونکہ اس فجر کی نماز میں ممنوع قرأت کا ارتکاب کیا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر اس کی تاثیر ظاہر ہوئی یا صحابہ کرام[2] آیت کے پورا کرنے کیلئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری آیت کے شروع ہونے سے پہلے، تیز روانی کے ساتھ[3] پڑھ رہے تھے۔ جیسا کہ اس حدیث کی دوسری سند میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کلام کی ہلکی آواز کو محسوس فرمایا تو آپ پر اپنی تلاوت مشتبہ ہوگئی۔

---

[1] یہاں پر اصل مخطوطہ میں بیاض ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ مشکوۃ شریف میں اس طرح موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھی اور اس میں سورۃ روم تلاوت فرمائی تو دورانِ تلاوت آپ پر بعض کلمات مشتبہ ہو گئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا جو ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اچھی طرح طہارت حاصل نہیں کرتے، یہی لوگ تو ہم پر قرآن میں اشتباہ ڈال دیتے ہیں۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں لوگوں کے احوال منکشف ہو جاتے تھے اور یہ بات مشائخ سلوک کے بارے میں لوگ سنتے رہتے ہیں جو کہ نا قابل انکار ہے کہ صوفیاء کے دلوں پر لوگوں کے احوال منکشف ہوتے ہیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف ہونا کیسے بعید ہے۔

[2] یعنی صحابہ قرأت میں جلدی کرتے تھے جس سے ہلکی سے گونج پیدا ہو جاتی تھی۔

[3] یعنی صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سکتات میں تلاوت فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلی آیت شروع کرنے سے پہلے پچھلی آیت کو پورا کرنے کیلئے جلدی کرتے تھے۔

دوسرا احتمال: یا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی تلاوت کی ہلکی آواز کو محسوس فرمایا تو آپ غصہ اور ناراض ہو گئے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرأت خلف الامام سے ممانعت والے حکم کی مخالفت کی تھی پس صحابہ پر اس غصہ کی شدت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت بھولنے لگے۔

تیسرا احتمال: یا یہ معنی ہو کہ جب صحابہ کی اپنی قرأت کرنے کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا کہ صحابہ میری تلاوت سننے سے اعراض کر رہے ہیں اور خود ہی تلاوت کر رہے ہیں تو اس وجہ سے ثقل پیدا ہو گیا (یعنی آپ پر گراں گزرا) کیونکہ امام اور قرأت کرنے والے کی قرأت میں سامعین کی رغبت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر سامعین اعراض کرتے ہیں تو قرأت میں وہ لطف نہیں رہتا۔

باب ماجاء فی ترکِ القراءَ ةِ خلفَ الامام اذا جَهَرَ الاِمامُ بالقراء ةِ

باب جہری نمازوں میں قراءت خلف الامام کی ممانعت

☆حدثنا الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكُ بن انَسٍ عن ابن شهاب عن ابنِ اُكَيْمَةَ اللَّيْثِيِّ عن ابی هريرةَ: اَنَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انْصَرَفَ من صلاةٍ جَهَرَ فيها بالقراء ةِ، فقال: هل قَرَأَ مِعی احدٌ منكم آنِفاً؟ فقال رجلٌ: نعم، یارسولَ اللّٰه ، قال: اِنِّی اقولُ مَالِی اُنَازَعُ القرآن ؟ قال: فَانْتَهَی الناسُ عن القراةِ مع رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه عل یه وسلم فیما جَهَرَ فیه رسول اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم من الصلوات بالقراء ةِ ، حین سمعوا ذلك من رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ قال : وفی الباب عن ابنِ مسعودٍ، وعِمْرَانَ بنِ حُصَيْنٍ، وجابر بن عبد اللّٰه۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن۔

وابْنُ اُكَيْمَةَ اللَّيْثِيُّ اسمه عُمَارَةُ ويقال: عَمْرُوبن اُكَيْمَةَ۔ ورَوَی بعضُ اصحاب الزهری هذا الحدیث وذَكروا هٰذَا الحرفَ: قال قال الزهريُّ: فَانْتَهَی الناسُ عن القراء ةِ حینَ سمعوا ذلك من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔

ولیس فی هٰذا الحدیثِ مایَدْخُلُ علی مَنْ رَاَی القراءَ ةَ خلفَ الإمامِ، لانَّ اباهريرةَ هو الذی رَوَی عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم هذا الحدیث، ورَوَی ابو هريرةَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال: مَنْ صلّی صلاةً لَمْ یقْرَأْ فیها بِاُمِّ الْقُرْآنِ فهیَ خِدَاجٌ، غَیْرُ تَمَامٍ، فقال لَهُ حاملُ الحدیثِ : اِنِّی

أكونُ احياناً وراءَ الإمامِ؟ قال: اقْرَأْ بها في نفسكَ ورَوَى ابو عثمانَ النَّهْدِيُّ عن ابي هريرةَ قال: اَمَرَنِي النبيُّ صلى الله عليه وسلم ان اُنادِيَ ان: لاَّ صلاةَ اِلاَّ بقراءةِ فاتحةِ الكتابِ۔ واخْتَارَ اكثرُ اصحاب الحديث ان لاَّ يقرأَ الرجلُ اذا جهر الإمامُ بالقراءةِ وقالُوا يَتَتَبَّعُ سكتاتِ الامامِ۔ وقد اختلف اهلُ العلم في القراءةِ خلف الامام۔ فرأَىٰ اكثرُ اهل العلم من اصحابِ النبي صلى الله عليه وسلم والتابِعِين ومَنْ بعدهم القراءةَ خلف الإمامِ۔ وبه يقولُ مالكُ بن انسٍ، و عبدا للّٰه بن المبارك، والشافعيُّ، واحمدُ، واِسْحٰقُ۔

ورُوِيَ عن عبد اللّٰه بن المبارك انه قال: انا اقرأُ خلف الإمام، والنَّاسُ يقرَؤُنَ اِلاَّ قوماً من الكوفيينَ، وأَرَى اَنَّ مَن لم يقرأْ صلاتُهُ جائزة۔ وشدَّدَ قومٌ من اهل العلم من تَرْك قراءة فاتحة الكتاب، وان كان خلفَ الإمامِ، فقالوا: لاتُجزِئُ صلاةٌ اِلاَّ بقراءة فاتحة الكتاب، وحْدَهُ كان او خلفَ الإمامِ۔ وَذَهَبُوا الى مارَوَى عبادةُ بن الصامت عن النبي صلى الله عليه وسلم۔

وقَرَأَ عبادةُ بن الصامت بعدَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم خلفَ الإمامِ، وَتَاوَّلَ قولَ النبي صلى الله عليه وسلم: لاصلاةَ اِلاَّ بقراءةِ فاتحة الكتابِ۔ وبه يقولُ الشافعيُّ، واسحٰقُ، وغيرُهما۔

واما احمدُ بن حنبلٍ فقال: معنى قول النبي صلى الله عليه وسلم: لاصلاة لمن لم يقرَأْ بفاتحة الكتاب: اذا كان وحدَه۔ واحتَجَّ بحديث جابر بن عبد الله حيثُ قالَ: مَن صلَّى رَكعةً لم يقرأْ فيها بِامِّ القرآنِ فلم يُصَلِّ، اِلاَّ اَنْ يكون وراءَ الامامِ۔

قال احمدُ بن حنبلٍ: فهذا رجلٌ من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم تَاَوَّلَ قولَ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لاصلاةَ لمن لم يقرأْ بفاتحة الكتاب: اَنَّ هذا اذا كان وحدَه۔ واخْتَارَ احمدُ مع هذا القراءةَ خلفَ الإمامِ، وان لاَّ يَترِكَ الرجلُ فاتحة الكتاب، وان كان خلفَ الإمامِ۔

☆حدثنا اسحٰقُ بن موسى الانصاريُّ۔ حدثنا: مَعْنٌ حدثنا: مالكٌ عن ابي نُعَيْمٍ وَهْبِ بنِ كَيْسَانَ: اَنَّهُ سمع جابر بن عبد الله يقولُ: مَن صلَّى ركعةً لم يقرأْ فيها بامِّ القرآنِ فَلَمْ يُصَلِّ، اِلاَّ ان يكونَ وراءَ الإمامِ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ جہری نماز کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قراءت کی ہے؟ ایک شخص نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تب ہی تو میں سوچ رہا تھا کہ کیا بات ہے مجھ سے قران میں جھگڑا کیا جاتا ہے؟ راوی کہتے ہیں پھر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہری نمازوں میں قراءت کرنے سے رک گئے جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا۔

اس باب میں ابن مسعود، عمران بن حصین، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ ابن اکیمہ لیثی کا نام عمارہ ہے اور انہیں عمرو بن اکیمہ بھی کہا جاتا ہے۔ زہری کے بعض شاگردوں نے اس حدیث کو روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں کہ زہری نے کہا پھر لوگ رک گئے جب انہوں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے قراءت خلف الامام کے قائلین پر فساد وارد نہیں ہوتا اس لئے کہ اس حدیث کو بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ناقص ہے اور نامکمل ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کرنے والے (شاگرد نے) کہا کہ میں کبھی کبھی مقتدی بھی ہوتا ہوں تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا دل میں پڑھ لیا کرو (یعنی سورہ فاتحہ کو)۔

ابوعثمان نہدی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں اعلان کروں کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ محدثین نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اگر امام جہراً قرات کرے تو پھر مقتدی قراءت نہ کرے اور انہوں نے کہا کہ سکتوں کے درمیان پڑھ لے (یعنی امام کے سکتوں کے درمیان فاتحہ پڑھ لے) اہل علم کا امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

اکثر صحابہ وتابعین اور بعد کے اہل علم کے نزدیک امام کے پیچھے قراءت کرنا جائز ہے۔ امام مالک، ابن مبارک، امام شافعی، امام احمد، اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

عبداللہ بن مبارک سے مروی ہے انہوں نے فرمایا میں امام کے پیچھے قراءت کرتا ہوں اور دوسرے لوگ بھی امام کے پیچھے قراءت کرتے ہیں سوائے اہل کوفہ کی ایک جماعت کے لیکن جو شخص امام کے پیچھے قراءت نہ کرے میں اس کی نماز کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔

اہل علم کی ایک جماعت نے سورہ فاتحہ کے ترک کرنے کے مسئلہ مین سختی سے کام لیا اور کہا کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی چاہے اکیلا ہو یا امام کے پیچھے ہو انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرأت خلف الامام کی ہے تو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر عمل کیا کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز (کامل) نہیں ہوتی۔ امام شافعی، اسحٰق وغیرہ کا یہی قول ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی کا معنی یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والا اکیلا ہو۔ ان کا استدلال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے کہ انہوں نے فرمایا جس شخص نے کسی رکعت میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی گویا کہ اس نے نماز پڑھی ہی نہیں مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی یہ وضاحت کرتے ہیں ''لاصلوٰۃ'' الخ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی اس سے مراد وہ ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہو لیکن اس کے باوجود امام احمد بن حنبلؒ نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ کوئی آدمی سورہ فاتحہ نہ چھوڑے خواہ امام کے پیچھے ہی ہو۔

☆ جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک رکعت پڑھے اور اسمیں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اسکی نماز نہیں ہوئی مگر یہ کہ وہ مقتدی ہو۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(فانتهى الناس عن القراءة) یعنی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے انہوں نے قرأت کرنی چھوڑ دی۔

نمازوں میں قرأت کے احکام میں تدریجاً تبدیلی ہوئی ہے: یہاں یہ بات جان لینی چاہیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کے صحابہ کرام پر سب سے پہلے تہجد کی نماز فرض ہوئی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے "یا ایھا المزمل [1] قم اللیل الا قلیلا" سے حکم فرمایا۔ ایک زمانے تک یہی حکم برقرار رہا اس کے بعد سورۃ مزمل کی آخری آیتیں نازل ہوئیں اور ان آیات نے تہجد کی نماز میں لمبی قراۃ کو منسوخ کر دیا جیسا کہ یہ حکم "فاقروا ما تیسر من القرآن" سے معلوم ہو رہا ہے لیکن تہجد ابھی بھی فرض تھی اگرچہ اس میں ایک آیت [2] یا کوئی چھوٹی سورۃ یا بڑی سورۃ پڑھی جائے اور اسی دوران صحابہ میں پانچ نمازوں کے ادا کرنے کا طریقہ مشہور ہوا۔ پھر جب پانچوں نمازیں فرض ہوگئیں اور صحابہ کرام پہلے سے یہ نمازیں منفرداً پڑھتے تھے لیکن اب انکی فرضیت جماعت کے ساتھ ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "واذا قُرِئَ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون" نازل ہوا لہٰذا اس حکم کی وجہ سے صحابہ کرام کو تہجد کی نماز میں جو خود تلاوت کرنے کی عادت پڑی ہوئی تھی تو صحابہ کرام اپنی تلاوت کرنے سے رک گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کو اپنے لئے کافی سمجھنے لگے اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بھی ان کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم دیا اور اسی پر حکمِ شرعی قائم ہوگیا۔

لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القرآن اور اس جیسی روایتوں کا مصداق امام اور منفرد ہیں اس پر قرائن: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القرآن" اور "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے ذریعہ جو حکم فرمایا تھا اس کا مصداق منفرد اور امام ہے نہ کہ مقتدی کیونکہ صحیح حدیث میں "الا بفاتحۃ الکتاب و سورۃ" اور دوسری

---

[1] سورۃ مزمل کی ابتدائی آیات وحی کی ابتداء میں نازل ہوئیں جس وقت ان آیات کی وحی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف لوٹے آپ کا دل گھبرا رہا تھا اور "زملونی زملونی" فرماتے جاتے تھے پھر سورۃ کے آخری حصے سے اس کا اول حصہ منسوخ ہوگیا اس سورۃ کی آخری آیت اور ابتدائی آیات کے درمیان ایک سال کا فرق ہے جیسا کہ حضرت عائشہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایتیں ابوداؤد میں موجود ہیں۔ پس صرف تہجد کی نماز مطلقاً بغیر تطویل قرأت کے فرض باقی رہیں پھر جب معراج کے واقعہ میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں تو تہجد کی فرضیت بالکل منسوخ ہوگئی جیسا کہ جلالین اور قسطلانی وغیرہ میں ہے۔

[2] یعنی اگر کوئی صحابی اب اس آیت کے نازل ہونے کے بعد تہجد میں ایک آیت یا چھوٹی سورۃ پڑھ لیتا تو بھی فرض ادا ہو جاتا جبکہ شروع میں تہجد کے اندر طویل قرأت فرض تھی۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اب تہجد میں سو آیتیں پڑھنی چاہئیں اور ایک قول میں ۵۰ آیات اور بعض علماء کے مطابق چھوٹی سورتیں بھی پڑھ لے تو کافی ہیں کیونکہ تہجد کی نماز کو دفعِ حرج کیلئے ساقط کیا گیا ہے اور لمبی قرأت میں حرج واقع ہوتا ہے اسلئے اس کا اعتبار نہیں۔

حدیث میں "وزیادۃ وغیرہ" کے الفاظ ہیں اور یہ زیادتی معمر اور شعبہ[1] نے نقل کی ہے کیا ان دونوں ائمہ کی فن حدیث میں جلالت شان مشہور نہیں؟ تو مخالفین نے جو ان کے اوپر سہو کا عیب اور نسیان کی تہمت لگا کر انکو حقیر جانا ہے یہ ان حضرات کے شایانِ شان نہیں، اور یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ کون سا محرک ہے جس نے ان مخالفین کو مسلم قاعدے کی مخالفت پر مجبور کیا اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ ثقہ راوی کی زیادتی قابل اعتبار ہوتی ہے جب تک کہ یہ ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت نہ کرے اور یہاں پر بھی یہی بات ہے کیونکہ "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب اور دوسری حدیث: لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب و سورۃ معھا اور تیسری حدیث: لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب فصاعدا" اور چوتھی حدیث "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب و قرآن" ان سب میں کوئی مخالفت نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ ان احادیث میں اصل صلوٰۃ کی نفی نہیں اور سورۃ فاتحہ اور سورۃ دونوں ہی واجب ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان احادیث میں منفرد کو حکم ہے نہ کہ مقتدی کو۔ لہٰذا جن روایات میں یہ زیادتی موجود نہیں ہے ان سے مراد یہی معنی ہوگا کہ فاتحہ کے ساتھ سورۃ بھی ضروری ہے کیونکہ بہت دفعہ ایک راوی ایک حدیث کو مختصر کر دیتا ہے اور دوسرا اس کو مکمل ذکر کرتا ہے۔ کیا ہمارے مخالفین ہماری موافقت کے بغیر ان احادیث پر عمل کر سکتے ہیں اس طرح کہ صحیح اور صریح روایات کے آپس میں تعارض سے بچ جائیں۔

فریقِ مخالف کی تخصیص سے ہماری تخصیص کا جواز نکلتا ہے: مخالفین نے "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے عموم[2] سے اس شخص کو نکال دیا ہے جو امام کو رکوع کی حالت میں پاتا ہے لہٰذا ہمیں بھی یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ ہم اس حدیث

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے اور حضرت والد صاحبؒ نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں اس لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کیلئے حاشیہ کا نشان ڈالا تھا لیکن دوسرے لفظ کو ذکر نہیں کیا بلکہ بیاض چھوڑ دیا۔ میرے نزدیک بظاہر یہ لفظ شعبہ کی جگہ سفیان بن عیینہ ہونا چاہیئے کیونکہ شروح میں مشہور تو یہی ہے کہ سفیان بن عیینہ نے معمر کی متابعت کی ہے اور سفیان بھی حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ پس حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا آنے والا کلام اسی پر مبنی ہوگا۔

فصاعداً کی زیادتی پر معمر راوی متفرد نہیں بلکہ انکے چار متابعات ہیں: معمر اور سفیان کے متابعات میں اس زیادتی کو صالح، اوزاعی اور عبدالرحمٰن بن اسحٰق وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ نے بذل میں یہی ذکر کیا ہے۔

[2] کیونکہ مخالفین کا اس پر اتفاق ہے کہ جو آدمی رکوع کو پالے اسے رکعت مل گئی اگر چہ اس نے فاتحہ کی تلاوت نہیں کی۔ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ رحمہم اللہ اور ان کے تلامذہ سفیان ثوری، اوزاعی، ابوثور، امام احمد اور امام اسحٰق رحمہم اللہ سب کا یہی مذہب ہے لہٰذا ان کے مخالفین کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو کہ اس فن کے شہسواروں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

میں قیاس یا دوسری حدیث کیوجہ سے یا قرآنی آیت کی وجہ سے مزید تخصیص پیدا کریں۔(کہ اس حدیث کو امام یا منفرد پر محمول کریں)۔

تسلیمی جواب: تسلیمی جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے عموم کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن قراءت کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی دوسری حکمی، اور مقتدی حکماً اپنے امام کی قرأت کی وجہ سے قرآن پڑھنے والا کہلاتا ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو کے قرأت فاتحہ کی حدیث کے راوی ہیں انہی [1] سے دوسری حدیث مروی ہے "من کان لہ امام فقرأۃ الامام قرأۃ لہ"(اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت مقتدی کے حق میں حکماً قرأت سمجھی جائیگی)۔ رہی وہ احادیث جن میں سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز کو خداج غیر تمام کہا گیا ہے تو اس سے مراد وہ نماز ہے جس میں قرأت نہ حقیقتاً ہو نہ حکماً۔

قرآن پاک میں قرأت خلف الامام کی ممانعت کے بعد صحابہ کرام کئی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے:

بہر حال جب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے امام کے پیچھے پڑھنے سے منع فرما دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کئی جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض صحابہ نے قرأت خلف الامام بالکل چھوڑ دی جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے [2] اور بعض صحابہ نے اجتہاد کیا کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ قرأت امام کی تلاوت

---

[1] دارقطنی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ محمد بن عباد رازی اس روایت کے نقل کرنے میں متفرد ہیں جو کہ ضعیف راوی ہے۔ صاحب تنسیق فرماتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ محمد بن عباد پر جرح کی گئی ہے لیکن یہ قاعدہ ہے کہ اگر صرف ضعیف احادیث جمع ہو جائیں تو بعض کو بعض سے تقویت مل جاتی ہے جبکہ یہاں تو بعض احادیث صحت کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں اور بعض ضعیف ہیں تو ان صحیح احادیث سے ضعیف احادیث کو کس طرح تقویت نہیں ملے گی؟ انتہی۔ قلت: اس حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نقل کردہ صحیح اور مرفوع حدیث کی تائید "واذا قرأ فانصتوا" سے بھی ہوتی ہے۔

[2] طحاوی اور طبرانی نے عن ابی الاحوص عن عبد اللہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت فاتحہ کیا کرتے تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے میری قرأت میں اشتباہ پیدا کر دیا۔ سیوطیؒ نے درّ منثور میں لکھا ہے کہ ابن ابی شیبہ طبرانی اور ابن مردویہ نے ابو وائل سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ قرأت خلف الامام کے بجائے قرآن کو خاموشی سے سنو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے کیونکہ نماز میں ہمارے لئے خاص افعال مقرر ہیں اور امام کی قرأت تمہارے لئے کافی ہے۔

کے سننے سے مانع ہو جاتی ہے لہٰذا ہم امام کی تلاوت سنیں گے بھی اور امام کے سکتات میں سورہ فاتحہ کی تلاوت بھی کرلیں گے۔

قرأت سے مراد صرف قرأۃ فاتحہ ہے نہ کہ قرأۃِ سورۃ: لیکن احادیث میں تتبع اور تلاش اور اس قصہ کی روایات میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قرأت سے مراد صرف سورہ فاتحہ کی قرأت کرنی ہے سورۃ کی قرأت مراد نہیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امام کے سکتات میں قرأت خلف الامام کرتے رہے جیسا کہ دوسری حدیث میں صحابہ کا یہ قول کہ ہم تیزی کے ساتھ تلاوت پوری کرلیا کرتے تھے مروی ہے اس سے مراد سکتاتِ امام میں پڑھنا ہے ورنہ امام کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ تیز پڑھنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہری نماز میں قرأت کے دوران صحابہ کی آواز کس طرح محسوس ہوئی؟ کیونکہ یہ واقعہ تو صبح کی نماز کا ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اجتہاد سے امام کے سکتات میں قرأت کیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نماز میں قرأت کے عادی ہو گئے تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا لیکن جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیث کے مضمون میں غور وفکر اور تعمق سے کام لیا تو ان کی رائے میں امام کی قرأت کے دوران اور اس کے سکتات کے دوران بہرحال ہر صورت میں ممانعت عام تھی جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حدیث ابن اکیمہ اللیثی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے اس اجتہاد پر نکیر فرمائی: پھر (حدیث ابن اکیمہ اللیثی عن ابی ہریرہ والی حدیث میں۔ از مترجم) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے سوال فرمایا "ایکم قرأ" یا "ھل قرأ خلفی منکم احد"، تو صحابہ کرام نے خاموشی اختیار کی پس اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ تلاوت اپنے اجتہاد سے نہیں کی ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ آپ ہی نے تو ہمیں قرأت خلف الامام کا حکم دیا ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال کرنا بھی صحیح نہ ہوتا کہ تم لوگ کیوں تلاوت کر رہے ہو کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی تو اس کا حکم فرمایا تھا نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سکوت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قرأت خلف الامام انہوں نے اپنے اجتہاد سے شروع کی تھی بہرحال معلوم ہوا کہ صحابہ کرام امام کے سکتات میں تلاوت کرتے تھے اور یہ ان کا اجتہادی فعل تھا کہ اس طرح ہم امام کی قرأت بھی سن لیں گے اور از خود تلاوتِ فاتحہ بھی کرلیں گے امام کے سکتوں کے درمیان اس طرح دونوں فضیلتیں جمع ہو جائینگی۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ان کے اس اجتہاد پر نکیر فرمائی کہ تم لوگ اپنی

طرف سے قیاس کر کے قرأت خلف الامام کر رہے ہو حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تم میں موجود ہیں تو تمہیں قیاس کے بجائے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہیئے۔

(لاتفعلوا الا بام القرآن) اس حدیث شریف سے سورۃ فاتحہ کے وجوب پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

نہی سے استثناء صرف اباحت کیلئے ہے: کیونکہ ائمہ لغت اور نحاۃ اور ائمہ بیان میں سے کوئی اس کا قائل نہیں کہ امر سے استثناء نہی شمار ہوتا ہے اور نہی سے استثناء امر شمار ہوتا ہے بلکہ سب کتابوں میں تصریح ہے کہ نفی سے استثناءِ اثبات ہوتا ہے اور اثبات سے استثناء نفی۔ اگر نہی سے استثناء امر ہو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "لا تشدو الرحال الا الی ثلثة مساجد"۔ اس حدیث میں ان مساجد کی طرف سفر کرنا واجب ہو جائیگا حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں پس حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ قرأت خلف الامام نہ صحیح ہے اور نہ ہی جائز ہے لیکن سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرنے میں رخصت ہے۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: یہاں یہ اشکال ہے کہ امام کے پیچھے جب قرأت حرام ہے تو سورۃ فاتحہ کی رخصت کی کیا وجہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اشکال کو ختم فرمایا "فانه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها" سے یعنی چونکہ سورۃ فاتحہ بڑی اہمیت کی حامل ہے اس طرح کہ مقتدی کے علاوہ دوسرے لوگوں کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے صحیح نہیں ہوتی لہٰذا اس کی عظمت شان اور مقدار کی کمی کی وجہ سے اور سورۃ فاتحہ سے پہلے اور بعد امام کے سکتات کی کثرت کی وجہ سے مقتدیوں کیلئے بھی اس کی تلاوت میں رخصت ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "فانه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها" اسی سوال مقدر کا جواب ہے اور اس فرمان نے سورۃ فاتحہ اور دوسری سورتوں میں فرق کی وجہ بھی بیان کردی ہے کہ (سورۃ فاتحہ تو بہت اہم سورت ہے کہ مقتدیوں کے علاوہ دوسرے نمازیوں کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے ہوتی ہی نہیں جبکہ کسی اور سورۃ کا یہ حکم نہیں)۔

لا صلوٰة لمن يقرأ الخ میں استثناء کی علت کا بیان ہے: ہمارے استاذ محترم ادام اللہ علوہ ومجدہ وافاض علی العالمین برہ ورفدہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "فانه لا صلوٰة الخ" یہ تنبیہ ہے رخصت کی علت پر اور اس میں استثناء کی علت کا بیان ہے وہ اس طرح کہ سورۃ فاتحہ تمام قرآن مجید سے بایں طور ممتاز ہے کہ زبانوں پر کثرت سے اس کی تلاوت جاری رہتی ہے اور ہر نماز میں چاہے فرض ہو یا نفل اس کی قرأت ضرور ہوتی ہے لہٰذا سورۃ فاتحہ کی تلاوت اگر مقتدی کریں گے تو اس میں اشتباہ اور امام کے ساتھ منازعہ لازم نہیں آئیگا بخلاف دوسری سورتوں اور آیات کے کیونکہ وہ سورۃ فاتحہ کی طرح نہیں ہیں۔ فافهم واغتنم

واذا قُرِئ سے استدلال پر ایک اشکال اور اسکے جوابات: رہا یہ اشکال "واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا" یہ آیت تو خطبے کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

پہلا جواب: اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ ہمیں تسلیم نہیں کیونکہ یہ آیت سورۃ اعراف میں ہے اور سورۃ اعراف سوائے ایک آیت کے "واسئلهم عن القرية التي "الاية کے پوری کی پوری سورۃ مکی ہے جبکہ خطبہ مدینہ منورہ میں فرض ہوا لہٰذا یہ آیت خطبہ کے متعلق کیسے نازل ہوسکتی ہے؟

دوسرا جواب: یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خطبہ مکہ مکرمہ میں فرض ہوا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جمعہ کا خطبہ نہیں دیا کیونکہ احادیث میں تصریح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خطبہ..............[1]

پس مکہ مکرمہ میں کوئی خطبہ ہی نہیں ہوا تھا کہ صحابہ کرام نے اس میں باتیں کی ہوں[2] اور اللہ تعالیٰ انہیں خاموش رہنے کا حکم فرماتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ دونوں کے متعلق نازل ہوئی اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آیت دونوں واقعات میں باقاعدہ اتری تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت کا حکم خطبہ اور نماز دونوں کو عام ہے اگرچہ آیت کا نزول صرف نماز کے متعلق ہوا ہے نہ کہ خطبہ کے[3]۔

علت کے ختم ہونے سے حکم بھی ختم ہو جائیگا: خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے قرأتِ فاتحہ خلف الامام کی[4] رخصت معلوم ہو رہی ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ یہ رخصت جس علت پر مبنی ہے اس علت کے اٹھ جانے سے رخصت بھی

---

[1] یہاں اصل مخطوطہ میں بیاض ہے بظاہر حضرتؒ کی مراد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا سے کوچ کرنے کے بعد سب سے پہلا جمعہ قبیلہ بنی سالم میں ادا کیا جیسا کہ بہت سے اہل سیر نے اس کی تصریح کی ہے۔ خمیس میں ہے کہ یہ اسلام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد یہ پہلا جمعہ تھا اس دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلیغ خطبہ دیا اور یہ اسلام کا پہلا خطبہ تھا۔ آگے خطبہ کا ذکر ہے۔

[2] سیوطی رحمہ اللہ نے درّ منثور میں صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت خلف الامام کی ممانعت کیلئے نازل ہوئی۔

[3] یعنی ہجرت سے پہلے خطبہ کا وجود ہی نہیں تھا کہ کسی صحابی نے اس میں باتیں کی ہوں اور اسے اس آیت سے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہو

[4] اگر نہی سے استثناء امر ہوتا تو تین مساجد کی طرف سفر فرض ہونا چاہیئے تھا۔

ختم ہو جائیگی۔[1] تو یہاں پر قرأت فاتحہ کی رخصت کا سبب یہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی قرأت کو امام کی قرأت کے ساتھ نہیں ملاتے تھے اوراس طرح تلاوت نہیں کرتے تھے کہ قرآن کا حکم "وانصتوا" کی سانعت ہوتی ۔ لہٰذا صحابہ کو تو قراتِ فاتحہ خلف الامام کی اجازت تھی۔

صحابہ کرامؓ نے غور وخوض کے بعد قرأت خلف الامام سے منع فرمایا تھا: پس جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ غور کیا کہ عوام اس طرح قرأت فاتحہ خلف الامام کرتے ہیں کہ اپنی تلاوت کو امام کی تلاوت کے ساتھ ملا کر تے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تلاوتِ فاتحہ خلف الامام سے منع فرمادیا[2] تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک مباح فعل یا مستحب فعل میں مشغول ہونے کی وجہ سے ایک فرض (استماع اور انصات) کا ترک لازم آئے۔

ایک مجتہد بھی ان خرابیوں کی موجودگی میں قرأت خلف الامام سے منع کرسکتا ہے: اور اگر ہم تسلیم کریں کہ صحابہ کرام نے اس رخصت کو ختم نہیں فرمایا تھا تو ایک مجتہد کو یہ اختیار ہے کہ اس رخصت کو منسوخ قرار دے جب اس میں ایسی قباحتیں نظر آنے لگیں۔

قرأت خلف الامام کی ممانعت حدیثِ مرفوع میں بھی ہے: یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازخود قرأت فاتحہ خلف الامام کی رخصت کو اپنی وفات سے پہلے منسوخ فرمادیا تھا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس واقعہ میں ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے گر گئے تھے اور آپ کا گھٹنا مبارک زخمی ہوگیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور صحابہ کرام نے اقتداء میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی تو آپ نے اپنی نماز سے سلام پھیرنے کے بعد فرمایا "انما جعل الامام لیؤتم بہ۔ واذا قرا فانصتوا" تو اس جملہ سے قرأت خلف الامام کی رخصت منسوخ ہوگئی۔

امام بخاریؒ کا اعتراض اور اسکے جوابات: امام بخاری رحمہ اللہ نے "واذا قرا فانصتوا" کی زیادتی پر اعتراض کیا ہے وہ فرماتے ہیں[3] کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صرف سلیمان تیمی اس جملہ کے نقل کرنے میں متفرد ہیں۔

---

[1] یعنی صحابہ کرام کو قرأت خلف الامام کی اس لئے اجازت دی گئی تھی کیونکہ وہ اپنی تلاوت کو امام کی تلاوت کے ساتھ خلط نہیں کرتے تھے

[2] اگر ہم تسلیم کریں کہ ممانعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں تھی تب یہ جواب ہوگا کہ صحابہؓ نے قرأت خلف الامام سے منع فرمادیا تھا یا صحابہ کے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے سختی سے منع کرتے یہاں تک کہ ان سے منقول ہے کہ قرأت خلف الامام کرنے والے کے منہ میں مٹی چلی جائے۔

[3] حضرت سہارنپوریؒ نے بذل میں ان تمام روایات کے صحیح ہونے کو مفصلا ثابت کیا ہے اور سلیمان تیمی کے بہت سے متابعات ذکر کیے ہیں۔ نیز امام بخاریؒ کے شیخ امام احمد بن حنبلؒ نے جب اس حدیث کو صحیح قرار دیدیا تو امام بخاری کا کلام ناقابلِ التفات ہے۔

۱)اس کا جواب یہ ہے اولاً سلیمان اس روایت کے نقل کرنے میں متفرد نہیں بلکہ ان کے بہت سے متابعات ہیں۔

۲)اگر یہ تسلیم کریں کہ سلیمان التیمی متفرد ہیں[۱] تو یہ ثقہ راوی ہیں جن کی توثیق امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی کی ہے[۲] لہٰذا سلیمان کا تفرد مضر نہیں۔ بہر حال یہ حدیث گذشتہ رخصت کیلئے نہی ثابت ہوئی۔ اس مسئلہ میں ہمارے استاذ العلام قدوۃ العلماء الاعلام ادام اللہ علوہ ومجدہ وافاض علی العالمین برہ ورفدہ کا ایک رسالہ ہے ہم نے اسی رسالے[۳] کے اوپر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اس تقریر میں اختصار سے کام لیا ہے۔

(فقال لہ حامل الحدیث) یعنی وہ شخص جو کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کا سماع کر رہا تھا اور انکا شاگرد تھا اس نے یہ سوال کیا کہ "انی اکون احیانا وراء الامام" یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ صحابہ وتابعین کا عمل یہ تھا کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے ورنہ ان کے استبعاد اور سوال کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

جمہور کا استدلال اور اسکا جواب: (اقرأ بھا فی نفسك) اس ٹکڑے سے جمہور کا استدلال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرأت فی النفس۔ سے مراد زبان سے پڑھنا نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ امام کی تلاوت کردہ آیات میں غور وفکر کیا جائے[۴]۔

اس پر سائل نے یہ اشکال کیا تھا کہ جب مقتدی بنوں تو کس طرح پڑھوں تو معلوم یہ ہوا کہ یہاں پر" اقرأبھا فی نفسك" سے مراد سری قرأت نہیں ہے بلکہ معانی میں غور کرنا ہے ورنہ تکرار لازم آئیگا۔ بہر حال اس جملہ سے خصم کا استدلال صحیح نہیں کیونکہ قرأت سری مراد لینے کی صورت میں سوال وجواب میں کوئی مطابقت نہیں رہتی۔

---

[۱] یعنی اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ سلیمان تیمی راوی متفرد ہے تب بھی اس کا تفرد کچھ نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ یہ ثقہ راوی ہے لیکن حضرت نے بذل میں مفصلاً ذکر کیا ہے کہ سلیمان راوی اس روایت میں متفرد نہیں ہے نیز سلیمان التیمی کی محدثین کی ایک جماعت نے توثیق بھی کی ہے اور یہ صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہے۔ ابن معین، نسائی، عجلی، ابن سعد وابن حبان وغیرہ نے اس کی توثیق کی ہے اور سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں تین حفاظ حدیث ہیں ان میں ابن علیہ اور سلیمان التیمی بھی شامل ہیں۔

[۲] امام مسلم رحمہ اللہ نے اس شخص سے جو حدیث میں کلام کر رہا تھا یہ فرمایا تھا کہ کیا تمہیں سلیمان التیمی سے زیادہ حافظ راوی چاہیئے۔ قالہ النیموی

[۳] یہ رسالہ اردو زبان میں ہے جس کا نام "ھدایۃ المعتدی فی قراۃ المقتدی" ہے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ بہت عمدہ بحث فرمائی ہے۔ حدیث سے شغل رکھنے والے ہر طالب علم کو ضرور یہ رسالہ پڑھنا چاہیئے۔

[۴] عیسیٰ اور ابن نافع راوی نے قرأت فی النفس کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن میں غور وفکر کرنا ہے اوجز میں اسی طرح ہے۔ اس حدیث کی شرح کے متعلق ابواب التفسیر میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا کلام تفصیل سے آرہا ہے۔

تسلیمی جواب: تسلیمی جواب یہ ہے کہ ہم مان لیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مقتدی سراً قرأت کرے تب بھی ایک صحابی کا اجتہاد ہے خصوصاً ایسے صحابی جن کا شمار فقہائے صحابہ[۱] میں سے نہیں ہے تو ان کے اجتہاد تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ دوسرے فقہائے صحابہ کا اجتہاد اور صحیح احادیث اس اجتہاد کے معارض ہے چنانچہ بعض روایات[۲] میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مقتدی کیلئے قرأت کے متعلق جب استفسار کیا گیا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مقتدی بھی قرأت کریگا اور اپنے اس جواب پر صحیح روایت حدیث قدسی کو ذکر کیا جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین" الحدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے اس طرح استدلال کیا کہ صلوٰۃ کا لفظ سورۃ فاتحہ پر بولا گیا ہے تو اس سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ فاتحہ نماز کی بنیاد ہے اس کے پڑھے بغیر نہ امام کی نماز مکمل ہوتی ہے نہ مقتدی کی یہ تو ہوا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا استدلال۔ اس استدلال کے کئی جوابات ہو سکتے ہیں ان سے قطع نظر کر کے یہ حدیث صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی نصِ صریح[۳] موجود نہیں تھی جو دلالت کرے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے استدلال کرنے کی طرف مجبور ہوئے حالانکہ اس حدیث سے اُن کے مذہب پر استدلال تام نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ حدیث ہمارے مسلک کے خلاف ہے لہٰذا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مجتہدین صحابہ کرام اور فقہائے ائمہ اعلام کے قول کے مخالف ہونے کی وجہ سے واجب العمل نہیں۔

---

۱ بعض علماء کی رائے یہی ہیکہ حضرت ابو ہریرہؓ فقیہ صحابی نہیں تھے اگر چہ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ احادیث کو محفوظ رکھنے والے تھے اور پیٹ بھرنے پر گزارہ کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ کے مصاحبین میں سے تھے اور یہ ثقہ، عادل، سمجھدار صحابی تھے۔ روزہ، تہجد، ذکر اذکار، تسبیح اور تہلیل کا بہت اہتمام کرنے والے تھے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

۲ امام ابوداؤد وغیرہ نے اس روایت کو مفصلاً ذکر کیا ہے۔

۳ **حضرت ابو ہریرہؓ کے شخصی اجتہاد پر حدیث مرفوع سے کوئی دلیل موجود نہیں:** یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب سائل کو قرأت فی النفس کا حکم دیا تو اس پر حدیث قدسی سے استدلال کیا جس میں قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی الخ ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دلیل مدعیٰ کے موافق نہیں ہے۔ نیز اپنے اس حکم کی کوئی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ذکر نہیں کی معلوم یہ ہوا کہ قرأت فی النفس کا حکم ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ لہٰذا کوئی مرفوع محکم حدیث دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت کی اجازت ہو صرف ایک صحابی کا اجتہاد اس کی اجازت دیتا ہے جو کہ کثیر صحابہ کے اقوال اور احادیث مرفوعہ کے خلاف ہے۔

یہ پوری حدیث حنفیہ کی دلیل اور شافعیہ کے خلاف ہے:(انادی ان لا صلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب) اس حدیث میں روایت کے پورے[1] الفاظ مذکور نہیں چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں "الا بفاتحۃ الکتاب" کے ساتھ "وما زاد" کے الفاظ ہیں لہٰذا یہ حدیث ہمارے مذہب کے خلاف نہیں بلکہ ہمارے موافق ہے اور شوافع کیلئے اس سے استدلال کے بجائے یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ اس حدیث سے حنفیہ کا مذہب اس طرح ثابت ہو رہا ہے کہ سورۃ فاتحہ اور ضمِّ سورۃ دونوں کا ایک ہی حکم ہے جبکہ شوافع کے ہاں سورۃ فاتحہ فرض ہے اور سورۃ فرض نہیں تو دونوں کا حکم ایک نہیں رہا جو کہ حدیث کے مقصود کے خلاف ہے۔

(واما احمد بن حنبل فاحتج بحدیث جابر بن عبداللہ) (امام احمد بن حنبل نے حدیث کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یہ حدیث باب منفرد پر محمول ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ کا اثر منفرد کی نماز کے متعلق ہے کہ منفرد کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ اضافہ از مترجم) اور یہ بات تو سبھوں کو معلوم ہے کہ یہ اثر غیر مدرک بالقیاس ہے تو یہ ہر طرح مرفوع کا حکم رکھتا ہے خصوصاً جبکہ قرآن پاک کی نص اس کے موافق ہے احادیث صحیحہ اور صحابہ کرام کا عمل اس کے متابعات میں سے ہے نیز یہ حدیث جیسا کہ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ مرفوعاً بھی مروی ہے[2]۔

---

[1] لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ جیسے شخص سے یہ بہت بعید ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا ذکر نہ کریں اگرچہ اس کے کئی جوابات ہو سکتے ہیں۔ پھر اس ترمذی کی روایت کو امام ابوداؤد نے دو سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے: ا۔ ایک سند کے الفاظ یہ ہیں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُخرُج فناد فی المدینۃ انہ لا صلوٰۃ الا بالقرآن ولو بفاتحۃ الکتاب فما زاد"۔

۲۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں "امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انادی انہ لا صلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب فما زاد"۔

[2] یعنی امام طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اس اثر موقوف کو بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جو مرفوعاً مشہور ہے وہ الگ ہے اس کے الفاظ "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ" ہیں اس روایت کو حافظ احمد بن منیع نے اپنی مسند میں، محمد بن حسن نے موطا میں اور طحاوی، ودار قطنی نے بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ نیموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے پھر اس کی صحت کو بیان فرمایا ہے اور یہ حدیث مشہور ہے صحابہ کی ایک جماعت (جس میں ابوسعید خدری، ابوہریرہ، ابن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم شامل ہیں) سب سے مروی ہے اس کے طرق مفصل کتابوں میں موجود ہیں۔

باب ماجاء مایقولُ عند دخول المسجد

باب اس بارے میں کہ جب مسجد میں داخل ہوتو کیا دعا پڑھے؟

☆حدثنا علی بن حُجرٍ حَدَّثَنَا اسمٰعیلُ بن ابراهیم عن لیثٍ عن عبد اللّٰہ بن الحسن عن اُمِّہ فاطمۃَ بنتِ الحسینِ عن جَدَّتِہَا فاطمۃَ الکُبرَی قالت: کان رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذادخلَ المسجدَ صَلّٰی عَلَی محمدٍ وسلَّمَ: وقال: رَبِّ اغْفِرلی ذنوبِی وافتحْ لی ابوابَ رحمتك، واذا خرجَ صَلّٰی علی محمدٍ وسلَّمَ:وقال رَبِّ اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابوابَ فضلك۔

☆ وقال علی بن حجرٍ: قال اسمٰعیلُ بن ابراهیمَ: فلقِیتُ عبدَ اللّٰہ بن الحسن بمکۃ، فسألتُہ عن هذا الحدیث فحدَّثنی بہ قال: کان اذا دخل قال: رَبِّ افتح لی بابَ رحمتك، واذا خرج قال: رَبِّ افتح لی بابَ فضلك۔

قال ابوعیسٰی: وفی الباب عن ابی حُمَیْدٍ، وابی اُسَیْدٍ، وابی هریرۃَ۔ قال ابو عیسی: حدیث فاطمۃَ حدیث حسن، ولیس اسنادُہ بمُتَّصِلٍ۔ وفاطِمۃُ بنت الحسینِ لم تدرك فاطمۃ الکبرَی، انما عاشت فاطمۃ بعدَ النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اَشْهُراً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن حسن اپنی والدہ فاطمہ بنت حسین سے اور وہ اپنی دادی فاطمہ کبریٰ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں داخل ہوتے تو درود وسلام پڑھتے اور یہ دعا پڑھتے "رب اغفر لی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك" (ترجمہ: اے اللہ! میری مغفرت فرما اور میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب مسجد سے باہر تشریف لاتے تو درود وسلام پڑھتے اور فرماتے "رب اغفرلی" الخ (ترجمہ: اے اللہ! میری بخشش فرما اور میرے لئے اپنے فضل کے دروازے کھول دے) علی بن حجر فرماتے ہیں کہ اسماعیل بن ابراہیم نے مجھ سے کہا کہ میں نے عبداللہ بن حسن سے مکہ میں ملاقات کی اور ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے "رب افتح لی ابواب رحمتك" اور جب مسجد سے باہر نکلتے تو فرماتے "رب افتح لی ابواب فضلك" اس دعا کے شروع میں "رب اغفرلی ذنوبی" والا جملہ نہیں ہے)۔

اس باب میں ابوحمید، ابواسید اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔
امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث فاطمہ حسن ہے اور اس کی سند متصل نہیں کیونکہ فاطمہ بنت حسین، فاطمہ کبریٰ رضی اللہ عنہا کو نہ پاسکیں اسلئے کہ فاطمہ الزہراء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف چند ماہ تک زندہ رہیں۔

﴿تشریح﴾

ایک اشکال اور اسکا جواب: (کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا دخل المسجد صلی علی محمد) یہاں پر صلی علی محمد فرمایا حالانکہ صلی علی نفسہ کہنا چاہیئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ضمیر متکلم کی جگہ علم کو ذکر کیا گیا ہے اس میں تفاؤل بھی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محمود ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے۔
مسئلہ: امتیوں کے لئے مسجد میں داخلہ کے وقت درود شریف پڑھنا مستحب ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی نے فضل اور رحمت کے دروازے کھولے ہیں اور امت کیلئے یہ راہ ہموار کی ہے امت کیلئے اس طریقہ کو جاری کیا ہے کہ مسجد میں داخل ہونے والے کو یہ دعا پڑھنی چاہیئے۔

غیرِ نبی پر لفظِ صلوٰۃ کا اطلاق: لفظ صلوٰۃ رحمتِ خاصہ کو کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "اولئك علیهم صلوات من ربهم ورحمة" میں عطف دال ہے کہ صلوٰۃ خاص رحمت ہے لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق جائز نہیں ہے الا یہ کہ تبعاً ہو۔ جس روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے "اللهم صل علی آل ابی اوفیٰ" وغیرہ کے الفاظ مروی ہیں اس میں تو غیر نبی پر لفظ صلوٰۃ بولا گیا ہے تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے فقہاء کے نزدیک مسئلہ اسی طرح ہے جبکہ محدثین نے اس لفظ میں مزید رخصت دی ہے کہ اس لفظ کا اطلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ پر بھی ہوسکتا ہے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت کی الگ الگ دعائیں اور اسکے ساتھ درود شریف ملا کر پڑھنے کی حکمت: (رب اغفر لی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں مغفرت اور رحمت کی دعا فرمائی کہ یہ جملہ تعمیم بعد التخصیص کی قبیل سے ہے اس طرح کہ مغفرت خاص ہے اور وافتح لی ابواب رحمتک میں مطلق رحمتِ عام ہے یا یہ کہا جائے کہ رب اغفر لی ذنوبی سے اشارہ ہے تخلی عن الرذائل کی طرف اور وافتح لی الخ سے تحلی بالفضائل کی طرف۔

(واذا خرج ابواب فضلك) مسجد سے نکلتے وقت ابواب فضل کا ذکر اس لئے مناسب ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قرآن میں ہے "فاذا قضیت الصلوٰۃ ......وابتغوا من فضل الله" تو اس آیت میں نمازِ جمعہ کے بعد فضل (روزی) تلاش کرنے کا حکم ہے...... چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنا دعا کی قبولیت کیلئے ضروری ہے یہ پروں کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح پرندہ بغیر پروں کے نہیں اڑ سکتا تو دعا بھی بغیر درود شریف کے پڑھے اللہ کی بارگاہ میں نہیں پہنچ سکتی لہٰذا مسجد میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت دونوں وقتوں میں درود شریف کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ دونوں دعائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز اہم ترین عبادات میں سے ہے اور مسجد سے نکلنے کے بعد عموماً آدمی معاملاتِ دنیویہ میں مشغول ہو جاتا ہے اگرچہ ان معاملات میں بھی عبادات اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی طرح ثواب ملتا ہے جبکہ اس میں اچھی نیت کرے لیکن مسجد میں عبادت کرنا اور مسجد سے باہر رہنا ان دونوں حالتوں کے اچھے یا برے ہونے کی کیفیت اور ان حالتوں میں بندہ کامیابی کے راستہ پر چل رہا ہے اور اس طریقہ کو اختیار کیا ہوا ہے جس سے خالق اور مخلوق دونوں ہی راضی ہیں تو اس صحیح طریقہ کو اختیار کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمدہ تعلیمات آپ کے بہترین قواعد اور شرعی احکام کی روشنی ہی میں ممکن ہے لہٰذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اور نکلتے ہوئے دونوں حالتوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دعا اس لئے سکھلائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر محنت کے ساتھ ہمیں عبادات اور معاملات کے صحیح طریقہ کی تعلیم دی تو یہ درود شریف آپ کے اس عظیم کارنامہ پر شکرانہ اور تعریف ہے تاکہ آپ کی خوشنودی نصیب ہو اور آپ کا قلب اطہر اپنے اس امتی سے خوش ہو جائے۔

(قوله فلقيت عبدالله بن الحسن بمكة فسألته عن هذا الحديث) یعنی اسماعیل بن ابراہیم کہہ رہے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو لیث کے واسطہ سے سننے کے بعد ارادہ کیا کہ عبداللہ بن الحسن سے بالمشافہہ اس حدیث کو بلا واسطہ سن لوں تاکہ سند عالی ہو جائے۔

(وانما عاشت فاطمة بعد النبی صلی الله علیه وسلم اشهرا) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سات سال کی تھی تو ان کی بیٹی فاطمۃ الصغراء، فاطمۃ الزہرۃ رضی اللہ عنہا سے کس طرح روایت نقل کرسکتی ہیں۔

احناف کی منقطع روایات پر طعن کا جواب: یہاں یہ بات جان لیں کہ حدیث کے منقطع ہونے کے باوجود امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس پر حسن کا حکم لگایا ہے کیونکہ یہ حدیث دوسری سند کے ساتھ متصلاً مروی ہے اس سے معلوم ہوا کہ

جب حدیث منقطع کا دوسری سند سے متصل ہونا معلوم ہو جائے تو یہ منقطع[1] حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ جائیگی۔ یہ بہت بڑا قاعدہ ہے جس سے مخالفین احناف کے بہت سے طعنوں کا جواب مل جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اکثر احادیث منقطع ہوا کرتی ہیں اس کا جواب یہی ہے کہ اس کا انقطاع نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ دوسری روایات میں یہ احادیث متصل ہیں۔

باب ماجاء اذادخل احدُ کم المسجدَ فلیر کع رکعتینِ

باب اس بارے میں کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت (تحیۃ المسجد) پڑھے

☆حدثنا قتیبةَ بن سعیدٍ حَدَّثَنا مالك بن انسٍ عن عامر بن عبد اللّٰه بن الزُّبَیْر عن عَمْرِ و بن سُلَیْمٍ الزُّرَقِیّ عن ابی قتادةَ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اذا جاء احد کم المسجدَ فلیر کع رکعتین قبلَ ان یجلسَ۔

قال: وفی الباب عن جابرٍ، وابی اُمامةَ، وابی هریرةَ، وابی ذرٍّ، وکعبِ بن مالكٍ۔

قال ابو عیسی: و حدیثُ ابی قتادةَ حسن صحیح۔وقد رَوَی هذا الحدیث محمدُ بن عَجْلَانَ وغیرُ واحدٍ عن عامرِ بن عبد اللّٰه بن الزُّبَیْرِ، نحوَ روایة مالك بُن انسٍ۔

ورَوَی سُهیلُ بن ابی صالحٍ هذا الحدیثَ عن عامر بن عبد اللّٰه بن الزُّبَیْرِ عن عَمْرِو بن سُلَیْمٍ الزُّرَقِیّ عن جابر عبد اللّٰه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم۔ وهذا حدیث غیرُ محفوظٍ، والصحیحُ حدیث ابی قتادة۔ والعملُ علی هذا الحدیث عند اصحابنا: اسْتَحَبُّوا اذا دخل الرجلُ المسجدَ ان لّا یجلسَ حتی یصلّی رکعتین، اِلّا ان یکون له عذر۔

قال علیُّ بن المَدِینی: و حدیث سهیل بن ابی صالحٍ خَطَأٌ، اخبرنی بذلك اسحقُ بن ابراهیم عن علی بن المدینی۔

---

[1] اگر منقطع روایت کا کوئی شاہد یا متابع موجود ہو تو وہ منقطع روایت درجہ حسن تک پہنچ جاتی ہے بلکہ کثرت طرق کی وجہ سے یہ منقطع روایت صحیح کے درجہ تک بھی پہنچ جاتی ہے جیسا کہ اصولِ حدیث میں مفصلاً مذکور ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہوتو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔

اس باب میں حضرت جابر، ابوامامہ، ابوہریرہ، ابوذر اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ محمد بن عجلان اور متعدد راویوں نے اس حدیث کو مالک بن انس کی مثل عامر بن عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے۔ سہیل بن ابی صالح نے اس حدیث کو عامر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے اور وہ عمرو بن سلیم وہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور یہ حدیث جابر بن عبداللہ غیر محفوظ ہے اور صحیح حدیث ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمارے ائمہ (شوافع) کا اس حدیث پر عمل ہے کہ آدمی مسجد میں داخل ہوتو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے یہ مستحب ہے بشرطیکہ اسے کوئی عذر نہ ہو۔ علی بن مدینی نے کہاہیکہ سہیل بن ابوصالح کی حدیث غلط ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی خبر اسحٰق بن ابراہیم نے علی بن مدینی کے حوالے سے دی ہے۔

﴿تشریح﴾

حنفیہ شافعیہ دونوں جماعتوں[1] کے درمیان اس پر اتفاق ہے کہ اوقاتِ ممنوعہ میں ان دو رکعتوں کا پڑھنا ناجائز ہے لیکن شوافع کے ہاں جمعہ کے دن زوال کے وقت دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں اس پر عنقریب کلام آئیگا۔

---

[1] **مذہب شافعیہ میں اوقاتِ ممنوعہ میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم:** اس مسئلہ میں حنفیہ شافعیہ کا اتفاق ہے جیسا کہ سیاقِ کلام سے معلوم ہو رہا ہے اور یہ اتفاق امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق ہے لیکن شوافع کے ہاں راجح یہ ہے کہ اوقاتِ ممنوعہ میں بھی تحیۃ المسجد جائز ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں بالاجماع سنت ہیں اگر وقتِ مکروہ داخل ہوگیا تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور انکے تلامذہ کے ایک قول کے مطابق تحیۃ المسجد مکروہ ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وقتِ مکروہ میں بھی تحیۃ المسجد بلا کراہت جائز ہے۔ انتہی

حنفیہ شافعیہ میں وجہِ اختلاف: حافظ فرماتے ہیں کہ یہاں دو عام احادیث میں تعارض ہے:

ا۔ وہ حدیث عام جو تقاضہ کررہی ہے کہ ہر مسجد میں داخل ہونے والے شخص کو تحیۃ المسجد پڑھنی چاہیئے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (هذا حديث غير محفوظ) غیر محفوظ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس دوسری سند میں سہیل بن ابی صالح نے ابوقتادہ صحابی کی جگہ جابر رضی اللہ عنہ کو ذکر کیا ہے اور یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ اس کی سند میں عمرو بن سلیم کا لقاء حضرت جابر رضی اللہ عنہ[1] سے نہیں ہے نیز اس حدیث کے اکثر راوی[2] اس سند کے ساتھ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ صحابی کو ذکر کرتے ہیں نہ کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو۔

باب ماجاء ان الارضَ كُلَّهَا مسجدٌ اِلَّا المَقْبرة والحمَّام

باب قبرستان اور حمام کے علاوہ ساری کی ساری زمین مسجد ہے

☆حدثنا ابن ابی عُمَرَ وابو عمارٍ الحسينُ بن حُرَيْثٍ المَرْوَزِيُّ قالا: حَدَّثَنَا عبدُ العزيز بن محمد عن عَمْرو بن يحيى عن ابيه عن ابی سعيدٍ الخدريّ قال: قال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: الارضُ كُلُّهَا مسجدٌ اِلَّا المقْبَرَةَ والحَمَّامَ۔

قال ابو عيسى: وفی الباب عن عليٍّ، وعبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وابی هريرة، وجابرٍ، وابن عباسٍ، وحذَيْفَةَ، وانس، وابی اُمَامَةَ، وابی ذَرٍّ، قالوا: اِنَّ النبیَّ صلى اللّٰه عليه وسلم قال: جُعِلَتْ لِیَ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۲۔ وہ احادیث جو کہ اوقاتِ ممنوعہ میں ہر شخص کو ہر نماز پڑھنے سے منع کر رہی ہیں لہٰذا دونوں میں سے ایک عام حکم کو خاص کیا جائیگا علماء کی ایک جماعت نے نہی والی حدیث کو خاص کر دیا ہے اور تحیۃ المسجد والی حدیث کو اس کے عموم پر رکھا ہے اور یہی شوافع کا اصح مذہب ہے جبکہ مالکیہ اور حنفیہ نے اس کے برعکس کیا ہے۔ انتہی۔ قلت: حنابلہ کا مذہب بھی اوجز میں نیل المآرب سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ نیز شوافع کے ہاں بھی تحیۃ المسجد والی حدیث میں تخصیص کی جائیگی کیونکہ جو آدمی مسجد میں اس حالت میں داخل ہوا کہ امام فرض نماز پڑھا رہا ہے تو کسی امام کے نزدیک بھی یہ تحیۃ المسجد نہیں پڑھے گا اسی طرح وہ شخص جو کے خطبہ کے بالکل آخر میں جمعہ والے دن مسجد میں داخل ہوا یہ بھی تحیۃ المسجد نہیں پڑھیگا اسی طرح خطیب صاحب جب خطبہ کیلئے مسجد میں داخل ہوں تو شوافع کے ہاں یہ بھی تحیۃ المسجد نہیں پڑھینگے۔

[1] نیز حافظ رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو عمرو بن سلیم کے اساتذہ میں شمار نہیں کیا اور نہ ہی عمرو کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں۔

[2] یعنی اس سند میں اکثر راوی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ صحابی کو ذکر کرتے ہیں اگر چہ دوسری سند سے اس موجودہ سند کے علاوہ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

الْأرضُ مَسْجِداً وطَهُوراً۔ قال ابُو عيسى: حديث ابى سعيد قد رُوِىَ عن عبد العزيز بن محمدٍ روايتين: منهم مَن ذَكَرَهُ عن ابى سعيدٍ، ومنهم مَن لم يذكره۔ وهذا حديث فيه اضطرابٌ۔ رَوَى سفيانُ الثَّوْرِىُّ عن عمرِو بن يحيى عن أبيه عن النبى صلى الله عليه وسلم:مرسلٌ۔ ورواهُ حَمَّادُ بن سلمةَ عن عمرو بن يحيى عن ابيه عن ابى سعيد عن النبى صلى الله عليه وسلم۔ ورواهُ محمد بن اسحٰق عن عمرو بن يحيى عن ابيه قال: وكان عَامَّةُ روايته عن ابى سعيد عن النبى صلى الله عليه وسلم۔ وَلَمْ يَذْكُرْ فيه عن ابى سعيد عن النبى صلى الله عليه وسلم۔ وكأَنَّ رِوايةَ الثورِىِّ عن عمرو بن يحيى عن ابيه عن النبى صلى الله عليه وسلم أَثْبَتُ واصحُّ مرسلاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ساری زمین نماز پڑھنے کی جگہ ہے سوائے قبرستان اور حمام کے۔

اس باب میں علی، عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ، جابر، ابن عباس، حذیفہ، انس، ابوامامہ اور ابوذر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں یہ سب فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لئے تمام روئے زمین مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوسعید کی حدیث عبدالعزیز بن محمد سے دوطریق سے مروی ہے۔ بعض نے اس کو ابوسعید کے واسطے سے ذکر کیا ہے اور بعض نے ان کا واسطہ ذکر نہیں کیا اور اس حدیث میں اضطراب ہے۔ سفیان ثوری نے عمرو بن یحییٰ سے انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور حماد بن سلمہ نے عمرو بن یحییٰ عن ابیہ کی سند سے حضرت ابوسعید کے واسطے سے مسنداً روایت مرفوع نقل کی ہے۔ محمد بن اسحٰق اسے عمرو بن یحییٰ سے اور وہ اپنے والد سے مرسلا روایت کرتے ہیں اور محمد بن اسحٰق نے فرمایا عمرو بن یحییٰ کی اکثر روایات ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مروی ہیں لیکن انہوں نے اس سند میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا۔ گویا کہ سفیان ثوری کی روایت بواسطہ عمرو بن یحییٰ ان کے والد سے اور ان کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی مرسل حدیث زیادہ ثابت اور اصح ہے۔

﴿تشریح﴾

ان دو مقامات پر نماز ممنوع ہونے کی علتیں: (الا المقبرة والحمام) ان دونوں جگہوں پر نماز پڑھنا اس لئے منع

ہے کیونکہ حمام میں تو کشف عورت پایا جاتا ہے اور قبرستان میں نماز پڑھنا اس لئے ممنوع ہے کیونکہ جس طرح تصاویر کی موجودگی میں ان کے سامنے نماز پڑھنے میں صورۃً عبادت لغیر اللہ لازم آتی ہے قبرستان میں بھی ظاہر میں غیر اللہ کی عبادت ہو رہی ہے پھر ان جگہوں پر گندگی کا پایا جانا اور دلجمعی کا مفقود ہونا وغیرہ علتیں بھی ہیں ان سب کے باوجود اگر کوئی شخص شرائط کی موجودگی میں ان جگہوں پر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز ہو جائیگی۔ یہاں یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر وہ مقام کہ جس میں عبادت کرنے سے غیر اللہ کی عبادت کا شائبہ ہو یا گندگی میں پڑ جانے کا شبہ ہو یا حقیقتاً واقع میں گندگی پائی جائے ان سب مقامات میں نماز پڑھنا منع ہوگا جیسا کہ بہت سی روایات میں ان مقامات کی نشاندھی کی گئی ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قوله ورواه محمد بن اسحق عن عمرو بن يحيىٰ عن ابيه) یعنی محمد بن اسحٰق نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو اس سند میں ذکر نہیں فرمایا۔

(و كان عامة روايته عن ابى سعيد) یعنی عمرو بن یحییٰ اکثر دیگر احادیث میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے حدیث کو نقل کرتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ جن راویوں نے عمرو بن یحییٰ عن ابیہ کے بعد ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے یہ غلطی ان سے اس لئے ہوئی کہ عمرو بن یحییٰ عموماً (اپنے والد کے بعد) اکثر روایات کو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں تو یہاں پر بھی بعض راویوں نے عمرو بن یحییٰ (عن ابیہ) کے بعد ابوسعید رضی اللہ عنہ کو غلطی سے داخل کر دیا حالانکہ یہاں پر صحیح روایت عمرو بن یحییٰ عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ (حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا واسطہ نہیں ہے۔ از مترجم)

باب ماجاء في فضل بنيان المسجدِ

باب مسجد بنانے کی فضیلت کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا بُنْدَارٌ حَدَّثَنَا ابو بكرٍ الحَنفيُّ حَدَّثَنَا عبد الحميد بن جعفر عن ابيه عن محمود بن لَبيدٍ عن عثمانَ بن عفان قال: سمعتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يقولُ: مَن بَنَى الله مسجداً بَنَى اللّٰهُ له مِثلَهُ في الجنةِ۔

قال : وفي الباب عن ابى بكرٍ، وعمرَ، وعليٍّ، وعبد الله بن عَمْرٍو، وانسٍ، وابنِ عباسٍ، وعائشةَ، وام حَبِيبَةَ، وابى ذرٍّ، وعَمْرِو بن عَبَسَةَ، وواثِلَةَ بنِ الأَسْقَعِ، وابى هريرة، وجابر بن عبد الله۔ قال ابو عيسى: حديث عثمانَ حديث حسن صحيح۔

و محمود بن لَبِيدٍ قد أدْرَكَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم ومحمود بن الرَّبيع قد راى النبيَّ صلى

اللّٰه علیه وسلم، وهما غلامانِ صغيرانِ مَدَنِيَّان۔

☆وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال: مَن بَنَی لِلّٰهِ مسجداً، صغيراً كان او كبيراً:بَنَی اللّٰه لهُ بيتاً فی الجنةِ۔

حَدَّثَنَا بذلك قتيبةُ حَدَّثَنَا نوحُ بن قيسٍ عن عبد الرحمٰنِ مولَی قيسٍ عن زيادٍ النُّمَيْرِیِّ عن انس عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم: بهٰذَا۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ کیلئے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کیلئے اسی کی مثل گھر بنائے گا۔

اس باب میں حضرت ابوبکر، عمر، علی عبداللہ بن عمر، انس، ابن عباس، عائشہ، ام حبیبہ، ابوذر، عمرو بن عبسہ، واثلہ بن اسقع، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث عثمان رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے جس نے اللہ کیلئے مسجد بنائی وہ چھوٹی ہو یا بڑی اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

☆ ہم سے روایت کی یہ حدیث قتیبہ بن سعید نے انہوں نے نوح بن قیس ان سے عبدالرحمٰن مولی قیس نے ان سے زیاد نمیری نے انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ محمود بن لبید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور محمود بن ربیع نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے یہ مدینہ کے دو چھوٹے بچے تھے۔

﴿تشریح﴾

مثله فی الجنة کی مختلف تشریحات: (من بنی للّٰه مسجدا بنی اللّٰه له مثله[1] فی الجنة) یہاں پر مراد یہ ہے کہ

---

[1] **جنت کی تعمیرات تاحال مکمل نہیں ہوئیں:** صاحب الیواقیت والجواہر وغیرہ نے مفصلاً نقل کیا ہے کہ اس حدیث سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کی تعمیرات ابھی تک مکمل نہیں ہوئی اس کی تائید مشکوٰۃ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ حدیث مرفوع سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ معراج کی رات میری حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا اے محمد! اپنی امت کو میری طرف سے سلام دے دیجئے۔ اور ان کو بتلایئے کہ جنت عمدہ زمین اور شیریں پانی والی جگہ ہے اور یہ چٹیل میدان ہے اور اس کے پودے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کا کلمہ ہے۔ انتہی۔

جس قدر اخلاص سے مسجد بنائیگا اسی اخلاص کے بقدر اس کو جنت میں عمدہ اور عالیشان گھر ملیگا۔ تو جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا تو اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ اگر چہ اس نے خرچ تھوڑا ہی کیا ہو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جس طرح مسجد[1] کو ان دنیوی گھروں پر برتری حاصل ہے اسی طرح آخرت میں اس کو ایسا گھر ملیگا کہ اس گھر کو آخرت کے گھروں پر اتنی ہی برتری حاصل ہوگی جتنی کے مسجد کو دنیوی گھروں پر۔

اس حدیث کا سببِ ورود: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حدیث کے روایت کرنے کا سبب یہ تھا کہ حضراتِ شیخین نے مسجد نبوی میں تھوڑا سا تصرف کیا تھا اس طرح کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے بوسیدہ حصہ کی کچھ مرمت کروائی تھی اور عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں توسیع کی تھی لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد جس ھیت پر تھی اسی ھیت کو برقرار رکھا گیا اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں مسجد کو مضبوط بنانے کیلئے عمدہ قسم کے مضبوط پتھر منگوائے تو صحابہؓ نے ان کے اس فعل پر اعتراض کیا کہ ایسا کام کیوں کر رہے ہیں جو حضراتِ شیخین نے نہیں کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ جوب دیا کہ شیخین نے مضبوط مسجد اس لئے نہیں بنائی تھی کہ ان کے پاس اس کے وسائل میسر نہ تھے۔ الحمد للہ اللہ رب العزت نے مجھے اتنا مال و دولت اور ایسے وسائل عطا کئے ہیں کہ میں اس مسجد کو عمدہ اور مضبوط بنا سکتا ہوں اور اپنے اس مقصد کیلئے حدیث باب کو پیش فرمایا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مسجد کی تعمیر ذاتی مال سے تھی: یہ بات یاد رکھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی تعمیر نہیں کی تھی بلکہ اپنے خاص ذاتی مال میں سے اس کی تعمیر فرمائی تھی۔

مسجد کو مزین بنانے کا حکم: مسئلہ کی رو سے مسجد کو مضبوط اور مزین بنانا جائز ہی نہیں بلکہ باعثِ اجر ہے جبکہ نیت اچھی ہو اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو نماز سے غافل کر دے۔

(محمود بن لبید قد ادرك النبي صلى الله عليه وسلم) ادرک اور رائی دونوں کا ایک ہی معنی ہے البتہ جو شخص نابینا ہے اس میں ادراک تو پایا جائیگا لیکن رویت کی صفت نہیں پائی جائیگی۔

---

[1] یعنی مسجد کے بنانے والے کو اس قدر ثواب ملے گا کہ اس ثواب کو آخرت اور جنت کے گھروں پر اس طرح برتری حاصل ہوگی جس طرح مسجد کو دنیا کے گھروں پر برتری حاصل ہے یا یہ مطلب ہے کہ مسجد کے بنانے پر جو ثواب ملیگا تو وہ ثواب آخرت کے گھروں کے مقابلہ میں اتنا زائد ہوگا جتنا کہ مسجد کی تعمیر کی خوبصورتی دنیا کے گھروں کی خوبصورتی پر زیادہ ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة ان یَتَّخِذَ علی القبرِ مسجداً

باب قبر پر مسجد بنانا مکروہ ہے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا عبد الوارث بن سعیدٍ عن محمد بن جُحَادَةَ عن ابی صالحٍ عن ابن عباسٍ قال: لَعَنَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم زَائِرَاتِ القُبُورِ والمُتَّخِذِینَ علیها المساجِدَ والسُّرُجَ۔ قال وفی الباب عن ابی هریرة، وعائشةَ۔قال ابو عیسی: حدیث بن عباسٍ حدیث حسن۔

وابو صالحٍ هذا: هو مَوْلَی اُمِّ هانیءٍ بنت ابی طالبٍ، واسمُهُ بَاذَانُ ویقال بَاذَامُ ایضاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مسجد بنانے والوں اور چراغاں کرنے والوں پر۔

اس باب میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن ہے۔

﴿تشریح﴾

عورتوں کے قبرستان جانے کے جواز اور عدمِ جواز کی روایات:(قوله لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج) عورتوں کے لئے زیارتِ قبور کے مسئلہ میں احناف کا مذہب یہ ہے[1]

---

[1] درمختار میں ہے کہ زیارتِ قبور میں کوئی حرج نہیں ہے اگر چہ عورتوں کے لئے ہو اسکی دلیل حدیث شریف "کنت نهیتکم عن زیارة القبور الا فزورها" ہے۔علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مصنف کا قول "لاباس بزیارة القبور" قبرستان جانا صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب بھی ہے جیسا کہ بحر الرائق وغیرہ میں لکھا ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ چونکہ حدیث میں قبرستان جانے کا حکم وارد ہوا ہے اس لئے مصنفؒ کو اسے مستحب کہنا چاہیئے۔

(قوله ولو للنساء) عورتوں کے لئے ایک قول میں زیارۃ قبور حرام ہے۔اصح قول کے مطابق عورتوں کیلئے بھی جائز ہے۔شرح منیة المصلی میں مکروہ ہونے کو اختیار کیا ہے۔علامہ خیر الرملی رحمہ اللہ نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ اگر عورتوں کے قبرستان جانے میں ان کا غم تازہ ہو جائے اور اپنی عادت کے مطابق عورتیں رونا اور واویلا کرنا شروع کر دیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ یہ ممانعت والی حدیث جس طرح مردوں کے حق میں منسوخ ہے[1] عورتوں کے حق میں بھی یہ ممانعت منسوخ ہوگئی کیونکہ احکام شرع میں عورتیں مردوں کے تابع ہوتی ہیں۔ حدیث باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ زیارت قبور کرنے والی عورتوں پر اللہ کی لعنت ہو یہ حدیث اسی زمانہ کی ہے جس زمانے میں زیارت قبور کی ممانعت مطلقاً تھی۔ پھر جب قبروں کے پاس جانے کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمان "کنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزورها" سے اجازت مرحمت فرمادی تو مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی قبرستان جانے کی اجازت ہوگئی۔ زیارت قبور کے متعلق جو احادیث آنے والی ہیں اس میں مزید تشریح آئیگی مسئلہ تو اسی طرح ہے۔

ہمارے زمانے میں عورتوں کو قبرستان جانا منع ہے: لیکن ہمارے زمانے میں عورتوں نے جونئی رسومات نکالی ہیں ان کی وجہ سے آج کل ان کو قبرستان جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے خصوصاً جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں پر گھر سے نکلنے اور قبرستان جانے پر پابندی لگ گئی تھی۔ یہ ممانعت اس لئے نہیں کہ عورتوں کو قبرستان جانے سے حدیث میں منع فرمایا گیا بلکہ دوسری خرابیوں کے پیشِ نظر عورتوں کو منع کیا جائیگا چنانچہ خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی عورتوں کے قبرستان جانے پر پابندی تھی۔

احناف کے اصل مذہب میں اسکی اجازت اور اسپر دلیل: احناف کے مذہب کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی قبر پر حاضری[2] دی تھی۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو ان کیلئے قبرستان جانا ناجائز ہوگا۔ حدیث "لعن الله زائرات القبور" میں انہی عورتوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ اگر عورتیں قبرستان اس لئے جارہی ہیں کہ اس سے عبرت لینا مقصود ہے اور میت کیلئے رحمت کی دعا کرنا ہے رونا دھونا نہ ہو...... اسی طرح اولیاء کی قبروں پر حصول تبرک کیلئے جارہی ہیں تو اس صورت میں اگر یہ عورتیں بوڑھی ہیں تو ان کیلئے قبرستان جانے میں کوئی حرج نہیں لیکن جوان عورتوں کو مکروہ ہے جس طرح کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے میں بوڑھیوں کو اجازت ہے اور جوان عورتوں کو منع ہے۔ انتہی (یہ بہترین تطبیق ہے)۔

[1] اصل مخطوطہ میں لفظ نسخت ہے جبکہ یہ لفظ نسخ مذکر ہونا چاہیئے۔

[2] بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیارت قبور کی روایت بھی موجود ہے انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں قبرستان میں جاکر کس طرح سلام کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعلیم دی کہ یوں کہنا "السلام علی اہل الدیار من المومنین" الحدیث۔ جمع الفوائد عن مسلم والنسائی۔

ممانعت کرنے والے علماء کی دلیل اور حضرت عائشہؓ کے فعل کی توجیہات: جو علماء عورتوں کو قبرستان جانے سے منع کرتے ہیں ان کی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اللہ کی لعنت ہو قبرستان جانے والیوں پر۔ ان کے بقول یہ حدیث منسوخ نہیں ہے۔ رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی کی قبر پر جانا یا تو اس وجہ سے تھا کہ عبدالرحمٰن ان کے بھائی اور محرم تھے اور حدیث میں غیر محرم کی قبر پر جانے سے ممانعت ہے اور یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قبرستان ایک آدھ بار گئی تھیں اور احادیث میں عورتوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ بکثرت قبرستان[1] جاتی رہیں۔ بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا اجتہاد تھا اور ان کے اپنے فعل سے استدلال ممکن نہیں ہے کیونکہ اس پر کوئی حدیث مرفوع دلالت نہیں کرتی لیکن یہ توجیہات ضعیف ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اپنے بھائی کی قبر پر جانے کی مذکورہ بالا توجیہات کے جوابات:

پہلی توجیہ اور اسکا جواب: (۱) پہلی توجیہ ان علماء کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی محرم تھیں اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قبرستان میں مدفون ہر ہر شخص کی محرم تو نہیں تھیں اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی قبر الگ سے کسی بیابان میں نہیں بنی ہوئی تھی بلکہ اور قبروں کے ساتھ ہی تھی۔

دوسری توجیہ اور اسکا جواب: (۲) دوسری توجیہ جو کی گئی کہ یہ ممانعت صرف زیارتِ قبور سے نہیں تھی بلکہ عورتوں کو کثرت سے جانے کی ممانعت ہے تو یہ تاویل ترجیح[2] بلا مرجح ہے۔ نیز اس تاویل کی صورت میں حنفیہ کا مذہب ہی ثابت ہوتا ہے کہ نفسِ زیارت قبور عورتوں کیلئے ممنوع نہیں ہے بلکہ عورتوں کیلئے خارجی فتنوں کے اسباب کی وجہ سے زیارت قبور منع ہے پس جہاں پر یہ فتنے اور علتیں پائی جائیں گی تو عورتوں کیلئے قبرستان جانا مکروہ ہوگا اور جہاں نہیں پائی جائینگی تو وہاں کوئی ممانعت نہ ہوگی تو اصل مسئلہ کے اعتبار سے عورتوں کیلئے قبرستان جانا جائز ہوا۔

تیسری توجیہ اور اسکا جواب: (۳) رہا ان علماء کی تیسری توجیہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے اجتہاد سے قبرستان گئی تھیں ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں تھی یہ تیسری تاویل بھی صحیح نہیں کیونکہ اس میں صحابہ کرامؓ کو ان کے رتبہ سے گرایا جا رہا ہے اور یہ تاویل صحابہ کرامؓ کے شایانِ شان نہیں خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو کہ تمام عورتوں سے زیادہ فقیہ ہیں

---

[1] جیسا کہ حدیث زوارات القبور میں صیغہ دلالت کر رہا ہے کہ کثرت سے جانا منع ہے۔

[2] کیونکہ بعض روایتوں میں بغیر مبالغہ کے صیغہ مبالغہ کے نفسِ زیارتِ قبور کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔

بلکہ اکثر مردوں سے تفقہ میں آگے بڑھی ہوئی ہیں ان کے بارے میں یہ کیسے گمان ہوسکتا ہے کہ وہ بغیر کسی دلیل کے ایک ممنوع فعل کیلئے چلی گئی ہوں کیونکہ اگر اس بات کو تسلیم کیا جائے تو صحابہ کرام پر سے اعتماد اٹھ جائیگا حالانکہ ان مذاہب میں یہ صحابہ کرام ہی تو ہمارے لئے اسوہ ہیں اور ان کی اقتداء نہ کرنے کی صورت میں انسان مقصد سے دور بیابان اور ہلاکت خیز جگہوں میں سرگرداں پھریگا۔ پھر زیارتِ قبور کا مسئلہ کوئی ایسا نادر الوقوع مسئلہ نہیں ہے کہ یہ خیال ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے حرام ہونے کے بعد اس کی اجازت ہی معلوم نہ ہوئی ہو۔ بعض علماء نے یہ تاویل کی ہے کہ "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم زائرات القبور" یہ جملہ خبریہ ہے اس سے ممانعت ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ بھی غلط ہے کیونکہ یہ حدیث لفظاً خبر ہے لیکن معنی انشاء ہے اور شریعت کے بہت سے اوامر اور نواہی خبر کی صورت میں نازل ہوئے ہیں کیونکہ اس میں مختلف فائدے اور بہت سے بلیغ نکتے تھے لیکن پھر بھی ان کا نسخ ممکن تھا اور جو اوامر انشاء کی صورت میں نازل ہوئے اور جو احکام خبر کی صورت میں نازل ہوئے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا کہ انشاء والے احکام کا تو نسخ جائز ہو خبر والے احکام منسوخ نہ ہو سکتے ہوں بلکہ دونوں احکام نسخ کو قبول کرتے ہیں نیز اس حدیث لعن زوارات القبور کو لفظاً و معنی خبر تسلیم کیا جائے تو بھی ہمارے مذہب کے خلاف نہیں کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ کسی وجودی یا عدمی شئی کے بارے میں خبر دینا جبکہ اس کا وجود یا عدم دوسری شئی کے ہونے نہ ہونے پر موقوف ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخبر عنہ خارج میں موجود بھی ہو بلکہ یہ شئی تو اسی وقت موجود ہوگی جبکہ دوسری موقوف علیہ شئی کا وجود ہو۔ تو یہاں حدیثِ باب میں بھی اسی طرح سمجھئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں پر لعنت کے متعلق خبر دی اور یہ لعنت موقوف ہے ان کے غیر شرعی کام کرنے پر پس جب ممانعت ختم ہوگئی اور شریعت نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی کیونکہ علت "یعنی عورتوں کا غیر شرعی کام کرنا" نہیں پائی جا رہی تو لعنت بھی نہیں پائی جائیگی۔ لہٰذا اس خبر کو جھوٹا نہیں کہیں گے تو جن علماء نے اس خبر لعن زوارات القبور الخ کو خبر کی وجہ سے منسوخ ہونے کا انکار کیا انکا یہ انکار درست نہیں۔

قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت کی علتیں: حدیث میں دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ قبروں پر مساجد بنانے پر لعنت فرمائی ہے (۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یہود کے ساتھ مشابہت ہے کہ انہوں نے اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبروں پر مساجد تعمیر کروائی تھیں (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں میت کی تعظیم ہے اور (۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر قبر جانب قبلہ میں ہے تو بت پرستوں کی مشابہت لازم آتی ہے اگر قبر قبلہ کی جانب میں نہیں بلکہ نمازی کے دائیں یا بائیں جانب ہے تو اس صورت میں کراہت کم ہوتی ہے اور اگر قبر نماز پڑھنے والے کے پیچھے ہے تو اس صورت میں کراہت بہت ہی کم ہوگی لیکن یہ کام

کراہت[1] سے خالی نہیں۔ اگر قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیا جائے کہ اس کا کوئی نام ونشان نہ رہے تو اس صورت میں بالکل کراہت نہ رہیگی۔ اسی طرح قبر نمازی کے پاؤں کے نیچے ہو یا نمازی اور قبر کے درمیان کوئی حائل موجود ہو تو اس صورت میں کوئی کراہت نہیں۔

قبروں پر چراغاں کی ممانعت کی علتیں: تیسرا جملہ قبروں پر چراغ رکھنے والوں پر لعنت ہے اس کی علت:

ا۔اس میں اسراف ہے اور اپنے مال کا ضیاع ہے اللہ تعالیٰ نے "ولا تبذر تبذیرا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین" میں اس سے منع فرمایا ہے۔

۲۔اس میں یہود کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ وہ اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبروں پر چراغ جلاتے تھے۔

۳۔اس میں قبروں کی تعظیم ہے۔

۴۔اگر اس کا یہ اعتقاد ہے کہ مُردوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی ان کو اس کی ضرورت ہے تب تو یہ ایک لایعنی فعل ہے اور اگر اس کا گمان یہ ہے جیسا کہ بعض جاہل سمجھتے ہیں کہ جب قبرستان کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے یا جب لوگ قبروں کے پاس سے چلے جاتے ہیں تب مُردے اپنی قبروں سے نکلتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے ہیں تو اس صورت میں ایک غلط عقیدے پر عمل کرنا لازم آتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ان جہلاء کو دیکھیں گے کہ جب یہ لوگ کسی ایسے گھر میں داخل ہونا چاہتے ہیں جس میں کسی بڑے شخص کی قبر ہوتی ہے تو پہلے تالی بجا کر باہر سے اس کو خبر کرتے ہیں تاکہ وہ میت سن لے...... یہ بالکل جہالت والا خیال ہے۔ کیا یہ مُردے عورتیں ہیں یا ننگے ہیں کہ ان سے پردہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے سچ فرمایا ہے "ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا"۔

---

[1] **قبرستان میں نماز پڑھنے کا حکم:** پس اہل متون نے تصریح کی ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی بہت سی علتیں بتلائی جاسکتی ہیں بعض نے یہ علت بتائی ہے کہ قبرستان میں مُردوں کی ہڈیاں اور خون اور پیپ ہوتا ہے جو کہ نجس ہے لیکن یہ علت محلِ نظر ہے۔ اور بعض نے یہ علت بتائی ہے کہ بت پرستی کی ابتداء اسی طرح ہوئی کہ نیک لوگوں کی قبروں کو مساجد بنا دیا گیا تھا اور بعض نے اس کی علت تشبہ بالیہود بتلائی ہے فتاویٰ قاضی خان میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اگر قبرستان میں نماز کیلئے الگ سے جگہ ہو اس میں نہ کوئی قبر ہو اور نہ کوئی گندگی اور نہ ہی جانب قبلہ میں کوئی قبر ہو تو وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ انتہی

اوجز المسالک میں یہ مسئلہ تفصیل سے مذکور ہے کہ ائمہ اربعہ کے درمیان اس میں بہت اختلاف ہے بعض علماء قبرستان میں نماز کو فاسد، بعض مکروہ اور بعض مباح کہتے ہیں پھر جو قبر کھلی ہوئی ہو اس میں اور بند قبر کے درمیان فرق ہے کہ نہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ پھر مسلمانوں اور کافروں کے قبرستان میں بھی اختلاف ہے۔

باب ماجاء فی النَّوْمِ فی المسجدِ

باب مسجد میں سونے کا حکم

☆حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ حَدَّثنَا عبدُ الرَّزّاق اخبرنا مَعْمَرٌ عن الزُّھْرِیِّ عن سالمٍ عن ابن عُمَرَ قال: کُنّا نَنَامُ علی عھدِ رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی المسجد ونحنُ شَبَابٌ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابنِ عمر حدیث حسن صحیح۔ وقد رَخَّصَ قومٌ من اھل العلم فی النومِ فی المسجدِ۔ قال ابنُ عباسٍ: لا یَتَّخِذُہُ مَبِیتاً ولا مَقِیلاً۔ وقومٌ من اھل العلمِ ذھبوا الی قول ابن عباسٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد میں سو جایا کرتے تھے درآنحالیکہ ہم جوان تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک مسجد میں سونے کی اجازت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مسجد کو رات سونے کی جگہ بنانا اور دن میں قیلولہ کرنے کی جگہ بنانا جائز نہیں ہے بعض اہل علم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اختیار کیا ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے مسجد میں سونے کا اثبات: (کنا ننام علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد و نحن شباب) اس حدیث سے مسجد میں سونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

اسکا جواب: لیکن افضل[1] یہ ہے کہ مسجد میں نہ سویا جائے الا یہ کہ انسان انتہائی سخت مجبور ہو جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مسجد میں صفہ (چبوترا) بننے کے بعد اپنے آرام اور سونے کو صفہ کے اندر کرلیا تھا مسجد میں سونا چھوڑ دیا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول ضرورت پر مبنی ہے کیونکہ ان کے پاس رات گزارنے کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ نیز صحابہ کے پاس

---

[1] صاحبِ درّ مختار نے مسجد کے اندر غیر معتکف کے سونے کو مکروہات میں شمار کیا ہے۔

کوئی زیادہ ساز وسامان اور کھانے پینے کی چیزیں نہیں تھیں جس سے مسجد آلودہ ہو، کیونکہ صحابہ کے پاس کھانے پینے کی اشیاء تھوڑی اور ان کی عبادات اور ریاضات بہت زیادہ تھیں۔ ہمارے زمانے میں یہ ناممکن ہے کہ ایک آدمی مسجد میں تھوڑی دیر ٹھہرے اور اس کا وضو برقرار رہے جبکہ احادیث میں ریح کے خارج ہونے پر ملائکہ کی تکلیف کا ذکر ہے، اسی طرح ایسا کلام جن میں کوئی دینی مصلحت نہ ہو یہ بھی ضرور مسجد میں ہو جائیگا اگر چہ یہ باتیں حرام تو نہیں ہیں لیکن مسجد کے شایانِ شان نہیں۔ نیز مسجد میں ٹھہرنے والے کیلئے جو وجوہات اور اسباب تھے وہ نہیں پائے جا رہے اور اب تو زمانہ بھی بدل چکا ہے عہدِ نبوی جیسا وقت بھی نہیں رہا۔

(قال ابن عباس رضی الله عنهما وغیرہ لا یتخذ ہ مبیتا و مقیلا) ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مستقل طور پر مسجد کو اپنا گھر بنالینا منع ہے کیونکہ "لا یتخذہ" کا لفظ اسی پر دال ہے۔

امام ترمذی کے نقلِ مذاہب کی وضاحت: لہٰذا امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو دونوں قول ذکر کئے ان دونوں قولوں میں کوئی فرق نہیں[1]۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے ذکر کردہ دونوں قولوں سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ کبھی کبھار اور ضرورت کی وجہ سے مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے لیکن مسجد کو مستقل قیام گاہ (دوپہر کے قیلولہ کی جگہ یا رات کے سونے اور آرام کی جگہ) بنانا جائز نہیں ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "ان هذه المساجد لا تصلح لشئ من امور الناس" او کما قال اس پر دال ہے۔

(قوله ونحن شباب) اس سے معلوم ہوا کہ جب جوانوں کیلئے ضرورت کے وقت مسجد میں سونا جائز ہے تو بوڑھوں کیلئے ضرورت کے وقت بطریق اولیٰ مسجد میں ٹھہرنا جائز ہوگا کیونکہ بوڑھوں کے مقابلہ میں جوان حضرات کسی دوسری جگہ کیلئے زیادہ کوشش کر سکتے ہیں۔

---

[1] لیکن عام شراح حدیث اور ناقلین مذہب جیسے کہ ابن حجر اور عینی رحمہما اللہ نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کئے ہیں:
۱۔ مسجد میں سونا مباح ہے، ۲۔ مکروہ ہے، ۳۔ جس کے پاس ٹھکانہ نہ ہو اس کے لئے مباح ہے ورنہ نہیں اس لئے بظاہر امام ترمذی رحمہ اللہ کے دونوں قولوں میں واقعہ میں فرق موجود ہے۔ اگر چہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی وہ تاویل ہو سکتی ہے جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے کی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة البیع والشراء وانشاد الضالة والشعر فی المسجد

باب مسجد میں خرید وفروخت کرنا، گمشدہ چیزوں کا اعلان کرنا اور بیت بازی کرنا مکروہ ہے

☆ حَدَّثَنَا قتیبة حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عن ابن عَجْلَانَ عن عَمْرِو بن شُعَیْبٍ عن ابیه عن جده عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: انه نَهَی عن تَنَاشُدِ الاشْعَارِ فی المسجدِ، وعنِ البیعِ والشِّرَاءِ فیه، واَنْ یَتَحَلَّقَ الناسُ فیه یومَ الجمعةِ قبلَ الصلاة۔ قال: وفی الباب عن بُرَیْدَةَ، وجابرٍ، وانسٍ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ عبد اللّٰه بن عَمْرِو بن العَاصِ حدیث حسن۔ وعمْرو بنُ شُعَیْبٍ هو: ابن محمد بن عبد اللّٰه بن عَمْرِو بن العاصِ۔ قال محمد بن اسمٰعیل: رَاَیْتُ احمدَ واسحٰقَ، وذَکَرَغَیْرَهُمَا۔ یَحْتَجُّون بحدیثِ عمرو بن شعیبٍ۔

قال محمدٌ: وقد سمعَ شعیبُ بن محمدٍ من جَدِّهِ عبد اللّٰه بن عمرٍو۔ قال ابو عیسی: ومَنْ تکلَّم فی حدیث عمرو بن شعیبٍ اِنَّمَا ضَعَّفَهُ لانه یُحَدِّثُ عن صحیفةِ جدِّه، کانهم رَاَوْانه لم یَسمعْ هذه الاحادیثَ من جَدِّهِ۔ قال علیُّ بن عبد اللّٰه: وذَکَرَ عن یحیی بن سعیدٍ انه قال: حدیثُ عمرو بن شعیبٍ عندنا وَاهٍ۔ وقد کَرِهَ قومٌ من اهل العلمِ البیعَ والشراءَ فی المسجدِ۔ وبه یقولُ احمدُ واسحٰقُ۔

وقد رُوِیَ عن بعض اهل العلمِ من التابعین رُخْصَةٌ فی البیع والشراء فی المسجدِ۔ وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی غیر حدیث رخصةٌ فی انشادِ الشِّعرِ فی المسجد۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا مسجد میں شعر پڑھنے، خرید وفروخت کرنے اور جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے حلقہ بنا کر بیٹھنے سے۔

اس باب میں بریدہ، جابر اور انس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور عمرو بن شعیب وہ عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد، اور اسحٰق کو دیکھا اور ان کے علاوہ کو کہ وہ عمرو بن شعیب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور شعیب بن محمد کا عبداللہ

بن عمرو رضی اللہ عنہ سے سماع ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے عمرو بن شعیب کی اس حدیث میں کلام کیا اس نے ان کو ضعیف صرف اس وجہ سے قرار دیا کہ عمرو بن شعیب اپنے دادا کے صحیفہ سے روایت کرتے ہیں گویا کہ ان لوگوں کے نزدیک عمرو بن شعیب نے یہ احادیث اپنے دادا سے نہیں سنیں۔ علی بن عبداللہ، یحییٰ بن سعید کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے مسجد میں خرید وفروخت کو مکروہ فرمایا ہے۔ امام احمد اور اسحٰق کا قول بھی یہی ہے۔ بعض تابعین سے مسجد میں خرید وفروخت کی اجازت کا قول مروی ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کئی احادیث سے مسجد میں (اچھے) شعر کہنے کی اجازت ثابت ہے۔

﴿تشریح﴾

مسجد میں خرید وفروخت کرنے کا حکم: مسجد میں خرید وفروخت کے متعلق مسئلہ[1] یہ ہے کہ معتکف آدمی کیلئے یہ خرید و فروخت جائز ہے جبکہ سامان مسجد میں نہ لائے کیونکہ اس کو ان معاملات کی مسجد میں کرنے کی ضرورت ہے غیر معتکف کیلئے مسجد میں ان معاملات کی ضرورت نہیں ہے اس لئے ناجائز ہے اسی طرح مسجد میں سامان تجارت لانا بھی منع ہے کیونکہ نہ تو اس کی ضرورت ہے، نیز مسجد میں سامان رکھنے کی صورت میں نمازیوں کو تکلیف ہوگی کیونکہ جگہ کم پڑ جائیگی نیز اگر کوئی لہو ولعب والی چیز ہوئی تو نمازی اس میں مشغول ہو جائیں گے حالانکہ مسجد ان امور کیلئے نہیں بنائی گئی۔ لہٰذا ایسی اشیاء کا مسجد میں لانا صحیح نہیں۔

● **مسجد میں گمشدہ چیزوں کا اعلان لگانا:** مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان لگانا اس وقت منع ہے جبکہ بلند آواز سے اس کا اعلان کرے کیونکہ اس میں نمازیوں کو تکلیف پہنچانا ہے ورنہ منع نہیں ہے نیز اس طرح اعلان کرنے میں مسجد کی بے ادبی ہے

---

[1] **مسجد میں بیع کا حکم:** جمہور کی رائے یہ ہے کہ مسجد میں بیع صحیح ہو جائیگی لیکن مکروہ ہوگی امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مسجد میں خرید وفروخت جائز ہے جبکہ زیادہ سوال جواب نہ ہو مثلاً کوئی کپڑا یا سامان پہلے سے دیکھا ہوا ہے تو اس کی بیع مسجد میں جائز ہے اسی طرح امام طحاوی رحمہ اللہ نے حنفیہ کا مذہب نقل کیا ہے کہ اگر مسجد میں خرید وفروخت کی ایسی فضا نہ بنے جیسی فضا بازار میں ہوتی ہے تو جائز ہے لیکن احناف کے اکثر اہل فروع اس کو مکروہ کہتے ہیں اور یہی صحیح مذہب ہے۔

کیونکہ مسجد میں ذکر کی آواز بہت زور سے بلند کرنے کو قبیح سمجھا جاتا ہے تو گمشدہ چیز کا اعلان کرنے والے کی آواز کیوں قبیح نہ ہوگی۔

مسجد میں اشعار پڑھنا: مسجد میں شعر پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ بُرے شعروں کا پڑھنا مسجد میں بُرا فعل ہے اچھے اشعار پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کیلئے مسجد میں منبر بچھوایا کرتے تھے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ مسجد میں باتیں کرنے کا کیا حکم ہے تو مسجد میں بُری باتیں کرنا بُرا فعل ہے اور اچھی باتیں اچھا فعل ہے۔

(ان یتحلق النا س فیہ یوم الجمعۃ) جمعہ کی نماز سے پہلے لوگوں کا حلقہ لگانا منع ہے اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز کے بعد حلقہ لگانا جائز ہے اس کی تفصیل حاشیہ میں موجود ہے۔

عن ابیہ عن جدہ کا مصداق: (عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ) جو روایات عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہیں ان کی سند میں ابیہ وجدہ دونوں ضمیروں کا مرجع پہلا راوی ہوتا ہے جبکہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ اس قبیل[1] سے نہیں دوسرے لفظوں میں اس سند کے علاوہ عن ابیہ عن جدہ والی سندوں میں ہر راوی اپنے والد سے روایت کو نقل کر رہا ہے جبکہ یہاں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں عمرو تو اپنے والد شعیب ہی سے نقل کر رہے ہیں مگر شعیب اپنے دادا عبداللہ سے ناقل ہیں عمرو کے دادا (جو شعیب کے والد ہیں) سے نقل نہیں کر رہے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کیونکہ کئی لوگوں سے اس میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر یہاں پر یہ مطلب ہو کہ عمرو اپنے والد شعیب سے اور شعیب عمرو کے دادا (اپنے والد) سے نقل کر رہے ہیں تو اس صورت میں یہ عنوان ہوتا عمرو بن شعیب عن ابیہ عن ابیہ یا اس طرح سند ہوتی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن ابیہ محمد۔

حدیث میں جو عمرو بن شعیب راوی ہے ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما۔

---

[1] یعنی جن روایات میں عن ابیہ عن جدہ کے الفاظ آتے ہیں ان سندوں میں ابیہ اور جدہ کا مرجع پہلا راوی ہوتا ہے تو گویا ہر راوی اپنے والد سے روایت کر رہا ہوتا ہے اور دادا سے مراد بیٹے کا دادا ہوتا ہے نہ کہ باپ کا دادا بخلاف عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کہ اس میں ابیہ کی ضمیر کا مرجع عمرو ہے اور اس سے مراد شعیب ہے لیکن جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں ہے بلکہ شعیب ہے اور جدہ سے مراد عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہیں۔ عمرو کے دادا (یعنی محمد) مراد نہیں۔

باب ماجاء فی المسجد الذی أُسِّسَ عَلَی التَّقْوَی

باب ہے اس مسجد کے بارے میں جو ''المسجد اسس علی التقویٰ'' کا مصداق ہو

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا حاتمُ بن اسمٰعیل عن أُنَیْسِ بنِ ابی یحیی عن ابیه عن ابی سعیدٍ الخُدْرِیِّ قال: امْتَرَی رجلٌ مِن بَنِی خُدْرَةَ ورجلٌ مِن بَنِی عَمْرٍو بن عَوْفٍ فی المسجد الذی أُسِّس عَلَی التَّقْوَی، فقال الخُدْرِیُّ: هو مسجدُ رسولِ صلی اللّٰه علیه وسلم، وقال الآخَرُ: هو مسجدُ قُباء فأَتَیَا رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی ذٰلك، فقال: هُوَ هذا، یعنی مسجدَهُ وفی ذٰلك خَیرٌ کَثیرٌ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیح۔

☆قال: حدثنا ابو بکرٍ عن علیٍّ بن عبد اللّٰه قال: سالتُ یحیی بنَ سعید عن محمد بن ابی یحیی الاسْلَمِیِّ؟ فقال: لم یکنْ بِهِ بأسٌ، واخوهُ أُنَیْسُ بن ابی یحیی أَثْبَتُ منه۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی خدرہ اور بنی عمرو بن عوف کے دو آدمیوں کا اس مسجد کے بارے میں جھگڑا ہوا جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

قبیلہ خدرہ والے صحابی نے کہا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد (مسجد نبوی) ہے اور دوسرے نے کہا وہ مسجد قباء ہے پھر وہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: وہ یہی ہے (مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس مسجد قباء میں بہت خیر ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں ابوبکر، علی بن عبداللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے یحییٰ بن سعید سے محمد بن ابی یحییٰ اسلمی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا ان میں کوئی حرج نہیں اور ان کے بھائی انیس بن ابی یحییٰ ان سے مضبوط راوی ہیں۔

﴿تشریح﴾

آیت کا مصداق مسجد قبا ہے: اس پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ ''لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَی التقویٰ من اول یوم احق ان

تقوم فیه فیه رجال الایۃ" یہ پوری آیت مسجد قبا اور اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے[۱] جیسا کہ کتب تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے نیز دوسری احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے۔

حدیث باب میں اشکال

یہ ہے کہ صحابی سے یہ بہت بعید ہے کہ اس پر یہ امر مخفی ہو کہ یہ آیت قبا کے متعلق نازل ہوئی تھی نیز صحابی کا دوسرے صحابی سے جھگڑنا بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔

اس کا جواب[۲] یہ ہے کہ دونوں صحابہ کا اتفاق تھا کہ اس آیت لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ علی التقویٰ کا مصداق مسجد قباء ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ جھگڑا اس چیز میں ہوا تھا کہ اسس علی التقویٰ کی جو علت ہے آیا اس وصف میں مسجد نبوی بھی مسجد قبا کے ساتھ شریک ہے؟ تو ایک صحابی اس کو ثابت کر رہے تھے کیونکہ مسجد نبوی کی بنیاد بھی مسجد قباء کی طرح تقویٰ پر رکھی گئی ہے بلکہ مسجد نبوی قبا سے بڑھی ہوئی ہے فضیلت میں، دوسرے صحابی نے یہ سمجھا کہ آیت خاص مسجد قبا کے متعلق نازل ہوئی ہے اس لئے اس کی نفی کر دی کہ لمسجد اسس علی التقویٰ کے عموم میں مسجد نبوی داخل نہیں اس طرح احادیث میں جو اختلاف ہوا وہ ختم ہو جائیگا۔ حدیثِ پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان[۳] هو مسجدی هذا یعنی مسجدہ اس سے مراد حصر نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ میری مسجد بھی مسجد قباء کی طرح اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔

---

[۱] ابن العربی فرماتے ہیں کہ اس پر اتفاق ہے کہ فیہ رجال یحبون ان یتطھروا سے مراد اہل قبا ہیں اور یہ بات بہت مشہور اور صحیح ہے صحابہ کی ایک جماعت سے منقول ہے لہٰذا ترمذی کی اس حدیث باب کے مقابلہ میں صحابہ کی جماعتِ کثیرہ سے منقول بات زیادہ راجح ہوگی نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے باب هجرة النبی ﷺ میں روایت کی ہے کہ أَسَّسَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَسْجِدُ الَّذِي أُسِّسَ عَلَى التقویٰ وفضل مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم اعظم من هذا اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ آیت کا مصداق مسجد قباء ہی ہے۔

[۲] یہ جواب توجیہ کرنے والوں کے قواعد کے مطابق ہے محدثین کے اصول کے مطابق یہ جواب ہے جیسا کہ ابن عربی کے کلام میں گزرا کہ جو رواۃ کہتے ہیں کہ اس مسجد سے مراد مسجد قبا ہے تو وہ زیادہ ثقہ اور زیادہ تعداد میں ہیں۔

[۳] امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر میں هو مسجدی هذا کے الفاظ نقل کئے ہیں، حدیث باب میں هو هذا کے الفاظ ہیں یعنی مسجدہ نے راوی کی تفسیر ہے۔

باب ماجاء فی الصلاة فی مسجد قُبَاء

باب مسجد قباء میں نماز پڑھنے کی فضیلت

☆حدثنا محمدُ بن العَلاءِ ابو كُرَيْبٍ وسفيانُ بن وَكيعٍ قالا: حَدَّثَنَا ابو أُسامَةَ عن عبد الحميد بن جعفرٍ قال: حَدَّثَنَا ابو الابْرَدِ مَوْلَى بنى خَطْمَةَ انه سمع أُسَيْدَ بنَ ظُهَيْرٍ الانصاريَّ، وكان من أصحاب النبيِّ صلى الله عليه وسلم يُحَدِّثُ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: الصلاةُ في مسجد قُبَاء كَعُمْرَةٍ۔قال : وفي الباب عن سَهْل بن حُنَيْفٍ۔ قال ابو عيسى : حديث أُسَيْدٍ حديث حسن غريب۔ ولا نَعْرِفُ لأُسَيْدِ بن ظُهيرٍ شيئاً يَصِحُّ غيرَ هذا الحديثِ، ولانعرفه اِلَّا من حديث ابى أُسامةَ عن عبد الحميد بن جعفر۔ وأبو الا بْرَدِ اسمه زِيادٌ مدينيٌّ۔

﴿ترجمه﴾

ابوابرد مولی بن خطمہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسید بن ظہیر انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا اور وہ صحابہ میں سے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد قباء میں نماز پڑھنا (ثواب میں) عمرہ ادا کرنے کی طرح ہے۔

اس باب میں سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث اسید رضی اللہ عنہ حسن غریب ہے اور ہمیں علم نہیں کہ اسید بن ظہیر کی اس کے علاوہ بھی کوئی حدیث صحیح ہو۔ اور ہم اس حدیث کو صرف ابواسامہ سے بواسطہ عبدالحمید بن جعفر کی روایت سے جانتے ہیں اور ابوالابرد کا نام زیاد مدینی ہے۔

باب ماجاء في أيِّ المسَاجدِ اَفضلُ

باب کونسی مسجد سب سے افضل ہے

☆حدثنا الانصاريُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكٌ ح وحدثنا قتيبة عن مالكٍ عن زيدِ بنِ رَبَاحٍ وعُبيد الله بن ابى عَبد الله الاغَرِّ عن ابى عبد الله الأغَرِّ عن ابى هريرةَ ان رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: صلاةٌ في مسجدى هذا خَيرٌ من ألف صلاةٍ فيما سواهُ اِلَّا المسجدَ الحرامَ۔ قال ابو عيسى:

ولم يذكرُ قتيبةُ في حديثه عن عبيد الله انما ذكر عن زيد بن رباحٍ عن ابی عبد الله الاغر عن ابی هريرة۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ وابو عبد الله الاَغَرُّ اسمه سَلْمَانُ۔

و قدرُوی عن ابی هريرة من غير وَجْهٍ عن النبی صلی الله عليه وسلم۔ قال : وفی البابِ عن عليٍّ، ومَيْمُونَةَ، وابی سعيدٍ، وجُبَيرِ بن مُطْعِمٍ، وابنِ عُمَرَ، وعبد الله بن الزُّبَيْرِ وابی ذر۔

☆حدثنا ابنُ ابی عمرَ حَدَّثَنَا سفيانُ بن عيينة عن عبد الملك بن عُمَيْرٍ عن قَزَعَةَ عن ابی سعيدٍ الخدریِّ قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم لاتُشَدُّ الرِّحالُ اِلَّا اِلی ثلاثةِ مساجدَ: مسجدِ الحَرَامِ، ومسجدِی هذا ومسجدِ الاَقْصَیٰ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھنا دیگر مساجد میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے (یعنی بیت اللہ کے)۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قتیبہ نے اپنی حدیث میں عبید اللہ کی بجائے صرف زید بن رباح کا ذکر کیا ہے (جب کہ مصنف کے پہلے استاذ انصاری کی سند میں امام مالک کے بعد زید بن رباح اور عبید اللہ دونوں ہی استاذ مذکور ہیں) اور وہ ابوعبداللہ اغر سے روایت کرتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث حسن صحیح ہے اور ابوعبداللہ اغر کا نام سلمان ہے۔ یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے متعدد طرق سے مروی ہے اور اس باب میں حضرت علی، میمونہ، ابو سعید، جبیر بن مطعم، عبداللہ بن زبیر، ابن عمر اور ابوذر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین مسجدوں کے علاوہ (کسی اور مسجد کیلئے) سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام (بیت اللہ) میری مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

شدِ رحال کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے: (قوله لا تشدوا الرحال الا الی ثلثة مساجد مسجد الحرام و مسجدی هذا والمسجد الاقصیٰ) دوردراز کے علاقوں اور ملکوں کی طرف سفر کرنے کے مسئلہ میں ائمہ کے درمیان

اختلاف ہے اس مسئلہ کو شدّ رحال کا مسئلہ کہتے ہیں۔

امام نووی اور ملاعلی قاری کی شرح حدیث: امام نووی، ملاعلی قاری، وغیرہ نے حدیث باب کی یہ شرح کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر بطور شفقت کے یہ حکم فرمایا کہ تین مسجدوں کے علاوہ کی طرف سفر نہ کیا کرو کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے محلّہ کی مسجد سے کسی دور دراز شہر کی مسجد کی طرف سفر کرے تو وہ اپنے سفر میں مشقتیں اور تکلیفیں اٹھائیگا لیکن اس مسجد میں اتنا ثواب بھی نہیں ہے بلکہ جتنا ثواب محلّہ کی مسجد میں ملا اتنا ہی ثواب اس مسجد میں بھی مل رہا ہے اسی وجہ سے حدیث باب میں مسجد قبا کا ذکر نہیں کیونکہ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک عمرہ کے بقدر ہے اور یہ عمرہ کا ثواب[1] تو اپنی مسجد میں فجر کے بعد طلوع شمس تک ذکر اللہ میں مشغول رہنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جامع مسجد میں جو کثرتِ ثواب ہے وہ جماعت کے افراد کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ملتا ہے۔ نفسِ مسجد کے اندر کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی وجہ سے ثواب زیادہ ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص ان تین مسجدوں کی طرف سفر کرے جن کا ذکر حدیث باب میں ہے تو ان میں اس قدر ثواب ہے کہ اس کو سفر میں جو مشقتیں پیش آئی تھیں ان سب مشقتوں کا جبیرہ ہو جائیگا بلکہ ان تین مسجدوں کی طرف سفر...... اس کے اندر ایسے اوصاف پیدا کریگا کہ اس سے اللہ کے احکام میں جو کوتاہی ہو رہی ہے ان کوتاہیوں کو ختم کرنے پر اس کا نفس ابھاریگا اور نافرمانیوں سے اس کا نفس اس کو روک دے گا۔

تین مسجدوں کیلئے سفر کا استثناء ہے دیگر اسفار کے حکم میں حرمت ورخصت کی تفصیل: حدیث باب میں الا الی ثلاثۃ مساجد میں صرف تین مسجدوں کی طرف سفر کرنے کا استثناء مذکور ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی مسجد یا مزار[2] یا کسی گھر وغیرہ کی زیارت کیلئے سفر کرے تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔

---

[1] قلت: بلکہ اشراق تک ذکر کرنے سے حج کے ساتھ عمرہ کا بھی ثواب ملیگا چنانچہ جمع الفوائد میں روایت ہے کہ جو آدمی صبح کی نماز جماعت سے پڑھے پھر اپنی جگہ بیٹھا رہے یہاں تک کہ اشراق کی نماز پڑھ لے تو اس کو حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے شخص کا ثواب ملیگا پورا پورا حج اور عمرہ کا ثواب ملیگا۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بھی ابوداؤد میں مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص اپنے گھر سے باوضو فرض نماز کیلئے نکلے تو اس کو اس حاجی کی طرح ثواب ملے گا جو احرام باندھ کر نکلا ہے اور جو شخص چاشت کی نماز پڑھنے کیلئے نکلے اور اس کی نیت صرف چاشت کی نماز پڑھنے ہی کی ہے تو اس کو عمرہ کرنے والے شخص کا سا ثواب ملیگا۔

[2] لفظ مزار ظرف ہے بمعنی موضع زیارت جیسا کہ لسان العرب وغیرہ میں ہے اور اس سے مراد مقبرہ ہے۔

اگر کوئی شخص کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مان لے؟: اسی طرح اگر ایک آدمی کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانے پھر اس کی طرف سفر نہ کرے بلکہ کسی دوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے تو اس کی نذر ادا ہوگئی۔

مسئلہ: اگر ان تین مساجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانے: لیکن اگر کوئی شخص ان مذکورہ تین مساجد میں سے کسی ایک مسجد میں نماز کی نذر مانے تو اسے اپنی متعین کی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنی چاہیئے اگر چہ متعینہ مسجد کے علاوہ دوسری مسجد میں نماز پڑھنے سے بھی نذر ادا[1] ہو جائیگی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شرح حدیث: اس کے مطابق کسی بزرگ کے مقبرے اور سیر تفریح کیلئے سفر نا جائز ہوگا: شراحِ حدیث کی دوسری جماعت جن میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ بھی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں جو نہی ہے وہ نہی تحریمی ہے اس صورت میں شارع علیہ السلام نے جن صورتوں کا استثناء کیا ہے ان کو مستثنیٰ قرار دیا جائیگا مثلاً حج کا سفر، جہاد کیلئے سفر، طلبِ علم کیلئے اور اپنے بھائی سے ملاقات کرنے کیلئے، یہ سب سفر جائز قرار دیئے جائیں گے اور باقی سفر نہی کے تحت داخل ہو کر ممنوع ہونگے۔

اس قول کے مطابق کسی بڑے شخص کے مقبرے[2] پر حاضری کیلئے سفر کرنا اور سیر و تفریح کیلئے[3] دور دراز سفر کرنا نا جائز ہے کیونکہ شدِ رحال سے یہی مراد ہے اور شدِ رحال سفر سے کنایہ ہے کیونکہ عموماً لوگ جب سفر کرتے ہیں تو اپنی سواریوں پر کجاوے کو کس دیتے ہیں تو یہ شدِ رحال سفر کے شروع ہونے کا سبب بنتا ہے۔ یہ دوسرا معنی ہمارے اس زمانے کے[4] اعتبار

---

[1] مراقی الفلاح وغیرہ میں ہے کہ اگر کسی شخص نے زمان اور مکان کی تعیین کے ساتھ نذر مانی مثلاً اس نے یہ نذر مانی کہ دو رکعتیں مکہ مکرمہ یا مسجد نبوی میں ادا کرونگا تو ملکِ مصر میں دو رکعتیں پڑھ لے تو نذر ادا ہو جائیگی کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کی طاعت ہے اور اس میں طاعت کے اعتبار سے یہ نماز صحیح ہے نماز کی صحت کیلئے مکان شرط نہیں کیونکہ نماز نام ہے اللہ تعالیٰ کی تمام بدن کے ساتھ تعظیم کرنے کا اور یہ معنی تمام مقامات میں ادا ہو جائیگا۔

[2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اسی کو صراحۃً بیان فرمایا ہے۔

[3] لفظ نظارہ بغیرہ تشدید کے سیر و تفریح کے معنی میں ہے لغت کے اعتبار سے یہ تلفظ غلط ہے جس کو بعض فقہاء استعمال کرتے ہیں۔

[4] **روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کیلئے سفر کا حکم:** قلت: لیکن جمہور ائمہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور دیگر علماء کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کی زیارت کیلئے سفر کرنا منع نہیں ہے چنانچہ موطا کی دونوں شروح "المصفیٰ اور المسویٰ" میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کی زیارت حج سے فارغ ہونے کے بعد کرنا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ ہمارے زمانے میں شرک و بدعات پھیل چکی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان الا فزوروھا یہ حکم وجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ حکم رخصت اور استحباب کیلئے ہے اور اس آخری معنی کے اعتبار سے کسی بڑے شخص کے مقبرے پر حاضری کیلئے سفر کرنا حرام ہوگا کیونکہ قبرستان جانے کے متعلق دو حدیثیں ہیں فزوروھا اس کے مباح ہونے پر دال ہے اور حدیث باب اس کو حرام کہہ رہی ہے یا زیادہ سے زیادہ قبرستان جانا مستحب ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی فعل مباح اور حرام ہونے کے درمیان درمیان ہو یا اس کے مستحب یا حرام ہونے میں تردد ہو تو حرمت کو غلبہ ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی المشیِ الی المسجدِ

باب مسجد کی طرف سکون سے چل کر جانے کے بیان میں

☆حدثنا محمدُ بن عبد الملك بن ابی الشَّوَارِبِ حَدَّثَنَا یزیدُ بنُ زُرَیْعٍ حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ عن الزُّهْرِیِّ عن ابی سلمةَ عن ابی هریرة قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم: اِذَااُقِیمَتِ الصلاةُ، فلا تَأْتُوهَا وانتم تَسْعَوْنَ، ولکنِ ائْتُوها وانتم تَمْشُونَ، وعَلَیکمُ السَّکِینةَ فَما اَدرکتم فصلُّوا۔ وما فاتکم فأَتِمُّوا۔

وفی الباب عن ابی قتادةَ، واُبَیِّ بنِ کعبٍ، وابی سعیدٍ، وزید بن ثابتٍ، وجابرٍ، وانس۔

قال ابو عیسی: اختلف اَهلُ العلم فی المشی الی السجدِ۔ فمنهم مَن رای الاسراعَ اِذا خافَ فوتَ التکبیرةِ الاولَی، حتی ذُکِرَ عن بعضهم: انه کان یُهَرْوِلُ الی الصلاةِ۔ومنهم مَن کرهَ الاسراعَ، واخْتارَ ان یمشیَ علی تُؤَدَةٍ ووقارٍ۔وبهِ یقولُ احمدُ واِسحٰقُ، وقالا:العملُ علی حدیث ابی هریرة۔ وقال اسحٰقُ :ان خَافَ فوتَ التکبیرَةِ الاولَی فلاباس ان یسرعَ فی المشی۔

☆حدثنا الحسنُ بنُ علیٍّ الخلاّلُ حَدَّثَنَا عبد الرزّاق اخبرنا مَعْمَرٌ عن الزُّهریِّ عن سعید بن المُسَیَّبِ عن ابی هریرةَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم نحوَ حدیثِ ابی سلمة عن ابی هریرة بمعناه۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالاجماع سنت ہے۔امام نووی اور ابن ہمام وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے،بعض علماء کے ہاں قبر اطہر کی زیارت کیلئے سفر کرنا واجب ہے اور اجماع کیسے نہ ہو جبکہ بہت سی قولی احادیث اس مسئلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت قبر کیلئے سفر کرنے کے متعلق وارد ہوئی ہیں یہ بھی شارع علیہ السلام کی مستحسنہ صورتوں میں داخل ہے زیادہ تفصیل کیلئے بذل المجہود اور اوجز المسالک کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

هکذا قال عبد الرزّاق عن سعیدِ بن المسیّب عن ابی هریرۃَ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔

وهٰذا اَصَحُّ من حدیث یزیدَبن زُرَیع۔

☆حدثنا ابن ابی عمرَ حَدَّثَنَا سفیانُ عن الزُّهری عن سعید بن المسیّب عن ابی هریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: نحوَه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جماعت کھڑی ہو جائے تو (مسجد کی طرف) دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ (درمیانی چال چلتے ہوئے) سکون کے ساتھ آؤ۔ پس (جماعت میں) جو حصہ مل جائے پڑھ لو جو حصہ رہ جائے اسے پورا کرو۔

اس باب میں ابوقتادہ، ابی بن کعب، ابوسعید، زید بن ثابت، جابر اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسجد کی طرف دوڑ کر جانے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر تکبیر اولیٰ کے فوت ہو جانے کا خوف ہو تو جلدی چلے بلکہ بعض علماء سے دوڑ کر آنا بھی منقول ہے اور بعض حضرات کے نزدیک تیز چلنا مکروہ ہے۔ ان کے نزدیک آہستہ اور وقار کے ساتھ جانا پسندیدہ ہے۔ یہ احمد اور اسحٰق کا قول ہے ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کیا جائے۔ اسحٰق کہتے ہیں کہ اگر تکبیر اولیٰ کے فوت ہو جانے کا خوف ہو تو تیز چلنے میں کوئی حرج نہیں۔

حسن بن علی خلال، عبدالرزاق سے وہ معمر سے وہ زہری سے وہ سعید بن میتب سے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ہم معنی حدیث نقل کرتے ہیں اسی طرح عبدالرزاق سعید بن میتب سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ عبدالرزاق کی سند یزید بن زریع کی حدیث سے اصح ہے۔ (از مترجم: یعنی زہری راوی کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے سعید بن میتب کا واسطہ ہے نہ کہ ابوسلمہ کا)۔

ابن ابی عمر سفیان سے وہ زہری سے وہ سعید بن میتب سے وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں۔ (اس سند میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے سعید بن میتب روایت کر رہے ہیں نہ کہ ابوسلمہ)۔

﴿تشریح﴾

نماز کیلئے جاتے وقت تیز دوڑنے کی ممانعت مطلقاً ہے خواہ تکبیر اولیٰ کیلئے ہو: (قولہ ولکن ائتوھا وانتم تمشون) ممکن تھا کہ صحابہ کرام اس حدیث شریف سے یہ سمجھتے کہ لمبے لمبے قدم اٹھا کر چل سکتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعلیکم السکینۃ فرما کر اس پر رد کر دیا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ فعل جو سکون اور وقار کے خلاف ہو نماز کیلئے جانے والے شخص کیلئے وہ منع ہے کیونکہ یہ مسجد کے آداب میں سے ہے اور تیز دوڑنا آدابِ مسجد کے خلاف ہے۔ دوسری وجہ جب یہ شخص گھر سے نماز پڑھنے کی نیت سے نکلا تو وہ حکماً نماز ہی میں شمار ہوگا اور اسے نماز ہی کا ثواب مل رہا ہے لہٰذا وہ جو کوئی سا بھی ایسا کام کرے جو نماز کی ہیئت کے منافی ہو اس فعل کے سبب اس کے ثواب میں کمی ہو جائیگی۔

نیز اسطرح دوڑنے کی وجہ سے گر جانے کا اندیشہ بھی ہے جس سے جماعت کی نماز بالکل ہی فوت ہو جائیگی: اور بسا اوقات دوڑنے سے سانس چڑھ جاتا ہے جس کے سبب تکبیر ثناء وغیرہ صحیح طور پر کہنے کے قابل نہیں ہوتا اس کے علاوہ اور بہت سی خرابیاں ہیں حدیث میں مطلقاً دوڑنے کی ممانعت ہے۔

امام ترمذیؒ کے ذکر کردہ مذاہب: امام ترمذی رحمہ اللہ نے علماء کے جو مختلف اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے اس مطلق کو خاص کر دیا ہے ان اقوال کی بنیاد یہ ہے کہ دیگر احادیث میں تکبیرۂ اولیٰ کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ان علماء نے فی الجملہ تیز چلنے کی اجازت دی تا کہ دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں تکبیرۂ اولیٰ بھی مل جائے اور تیز دوڑے بھی نہیں گویا کہ ان کے خیال میں تیز چلنے کی وجہ سے جو ثواب میں کمی ہوگی تکبیر اولیٰ کے ملنے سے وہ پوری ہو جائیگی۔ بلکہ اس سے زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے[1] تیز چلنے اور دوڑنے کو منع فرمایا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی فعل ممنوع اور مستحب ہونے کے درمیان متردد ہو تو اس فعل کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے تو اگر کوئی فعل مامور بہ اور منہی عنہ ہونے کے درمیان درمیان ہو وہاں پر اس کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے تو حدیث باب میں تیز چلنے کا فعل نہی اور استحباب کے درمیان متردد ہے لہٰذا اس کو بطریق اولیٰ ممنوع قرار دیا جائیگا کیونکہ یہاں پر کوئی امر صراحۃً اس کے کرنے پر دلالت نہیں کر رہا بلکہ تکبیر اولیٰ کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے تیز چلا جا رہا ہے لہٰذا نمازی پر لازم ہے کہ وہ تکبیر اولیٰ کی فضیلت اس طرح حاصل کرے کہ کسی شرعاً ناپسندیدہ فعل کا ارتکاب لازم نہ آئے۔ بہرحال اگر کوئی شخص تکبیر اولیٰ کیلئے جلدی کرتا ہے تب بھی اس کو تکبیر اولیٰ کا پورا ثواب تو ملیگا ہاں اس فعل کے ساتھ کراہت بھی جمع ہو جائیگی۔

---

[1] اس سے مراد سراج الامۃ ابو حنیفہ النعمان ہیں جیسا کہ ارشاد الرضی تقریر میں ہے۔

باب ماجاء فی القعود فی المسجدِ وانتظارِ الصلاۃ من الفضلِ

باب نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنے کی فضیلت کا بیان

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا عبد الرزّاق اخبرنا مَعْمَرٌ عن هَمّامِ بن مُنَبِّهٍ عن ابی هریرۃَ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لایزالُ احدُ کم فی صلاۃٍ مادامَ یَنْتَظِرُ ها، ولا تزالُ الملائکۃُ تُصَلِّی علی احدکم مادام فی المسجد: اللّٰھُمَّ اغْفِرْله؟ اللّٰھُمَّ ارحمه، مالم یُحْدِثْ، فقال رجلٌ من حَضْرَ مَوْتَ: وما الحَدَثُ یَاَ باھریرۃَ؟ قال: فُسَاءٌ او ضُرَاطٌ۔

قال : وفی الباب عن علیٍّ ، وابی سعیدٍ، وانسٍ، وعبد اللّٰه بن مسعودٍ ، وسَھْلِ بن سعْدٍ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی ھریرۃ حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص جب تک کسی نماز کا انتظار کرتا ہے گویا کہ وہ مسلسل نماز ہی میں (مشغول رہتا) ہے اور ملائکہ اس کیلئے دعا میں لگے رہتے ہیں جب تک وہ مسجد میں رہتا ہے۔ اور جب تک وہ کوئی نئی بات پیدا نہ کرے۔ (وہ کہتے ہیں) ''اللھم اغفرلہ'' (اے اللہ! اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما) پس حضرت موت کے ایک آدمی (طالب علم) نے عرض کیا اے ابو ہریرہ! نئی بات پیدا کرنا کیا ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہوا کا خارج ہونا خواہ آواز سے ہو یا بغیر آواز سے۔

اس باب میں حضرت علی، ابوسعید، انس، عبداللہ بن مسعود اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

﴿تشریح﴾

منتظرِ صلوۃ حکماً نماز ہی میں ہے اسلئے اس حالت میں بھی خلافِ ادب کام نہ کرے: (لا یزال احدکم فی صلوٰۃ ما دام ینتظرھا) اس حدیث شریف سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نماز کا انتظار کرنے والا شخص کوئی بھی ایسا کام نہ کرے جو نماز کے آداب کے خلاف ہو مثلاً انگلیوں کا چٹخانا، ہنسنا، قہقہہ لگانا۔ حدیث کے اس ٹکڑے سے اس شخص کا حکم معلوم نہیں ہو رہا تھا جو مسجد میں بیٹھا ہے لیکن وہ کسی نماز کا منتظر نہیں ہے بلکہ اس کا مسجد میں بیٹھنا ذکر اور تلاوت قرآن کیلئے ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے جملہ ''ولا تزال الملائکۃ تصلی علی احدکم ما دام فی المسجد اللھم

اغفر له اللهم ارحمه ما لم یحدث" سے اس شخص کا حکم بھی بیان فرمادیا کہ ایسے شخص کیلئے ملائکہ دعائیں کرتے ہیں۔

مالم یحدث کے معنی میں تردد کی وضاحت: مالم یحدث کا معنی میں بعض حاضرین مجلس کو تردد ہوا کہ اس کے کیا معنی ہیں کیا اس سے مراد دین میں کوئی نئی بات نکالنا ہے یا اس حدث سے مراد ایک حالت کو چھوڑ کر دوسری حالت میں مشغول ہونا ہے؟ مثلاً کوئی شخص بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا یا لیٹا ہوا تھا اور اس نے کھانسنا[1] شروع کر دیا تو کیا حدث سے یہ مراد ہے؟ اگر حدث سے پہلا معنی مراد ہے تو واقعی وہ بالکل ممنوع فعل ہے اور اگر حدث سے دوسرا معنی مراد ہے تو یہ تو ناگزیر فعل ہے تو اس فعل کے سبب ملائکہ کی دعاؤں سے یہ شخص کیوں محروم ہو رہا ہے؟ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فساء اور ضراط کہکر حدث کی تفسیر فرمائی کہ حدیث میں حدث سے مراد ریح خارج کرنا ہے کیونکہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ دعا دینا بند کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کو نکسیر آجائے یا اس سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جس سے ملائکہ کو تکلیف نہیں پہنچتی تو وہ ملائکہ کی دعاؤں سے محروم نہیں رہے گا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد میں یہ شخص کوئی بیہودہ بات کرے جس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے مثلاً غیبت چغلخوری[2] وغیرہ کرتا ہے تو ملائکہ اس کو دعائیں دینا چھوڑ دیتے ہیں۔

محدثین اور فقہاء کا لفظِ صلوٰۃ کے اطلاق میں اختلاف: جان لینا چاہیئے کہ محدثین کے مذہب[3] میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق کرنا جائز ہے کیونکہ بہت سی احادیث میں غیر نبی کیلئے بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن فقہاء کرام نے غیر نبی پر لفظ صلوٰۃ کے اطلاق کو منع کیا ہے کیونکہ لفظ صلوٰۃ نام ہے رحمت کاملہ کے اس حصہ کا جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے لہٰذا کسی بھی غیر نبی کو لفظ صلوٰۃ کے ساتھ دعا دینا صحیح نہیں ہے[4] جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے "اولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة" یہاں پر خاص انبیاء علیہم السلام مراد ہیں۔ جس روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "اللهم صل على آل ابى اوفى" وغیرہ کے الفاظ ہیں۔ تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

---

[1] "لینخنم" نخم نخما فرح فرحاً کی طرح ہے اور نخم کے معنی کسی چیز کو اپنے سینہ سے پھینکنا (بلغم وغیرہ)۔

[2] اصل نسخہ میں اسی طرح ہے بظاہر عبارت اس طرح ہونی چاہیئے "تتاذى منه الملائكة من الغيبة والنميمة او فعل شيئا من هذا القبيل"

[3] اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیاء کیلئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ بھی اختلاف ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی امتی کیلئے لفظ صلوٰۃ استعمال ہو سکتا ہے یا نہیں اور انبیاء کرام کے علاوہ کسی امتی کیلئے لفظ سلام کا استعمال کیسا ہے؟ اور صحابہ کے علاوہ کسی کیلئے رضی اللہ عنہ کا جملہ استعمال کرنا کیسا ہے؟ اس سب کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

[4] میری ناقص سمجھ اس کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس آیت سے دعویٰ کس طرح ثابت ہوگا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب ماجاء فی الصلاۃ عَلَی الخُمْرَۃِ

باب چٹائی پر نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو الاَحْوَصِ عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ عن عکرمةَ عن ابن عباسٍ قال: کان رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلّی علی الخُمْرَۃِ۔

قال: وفی الباب عن اُمِّ حَبِیبَةَ، وابن عمرَ، واُمِّ سلَمة، وعائشةَ، ومَیْمُونَةَ، واُمِّ کُلْثُومِ بنتِ ابی سلَمَةَ بن عبد الاَسَدِ ولم تَسْمَعْ من النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عباسٍ حدیث حسن صحیحٌ۔ وبهِ یقولُ بعضُ اهلِ العلمِ۔

وقال احمدُ واسحٰق: قد ثَبَتَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم الصلاۃُ علی الخُمْرَۃِ۔قال ابو عیسی: والخمرۃ هو حصیرٌ قصیرٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے چٹائی پر۔

اس باب میں ام حبیبہ، ابن عمر، ام سلمہ، عائشہ، میمونہ، ام کلثوم، بنت ابی سلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایت ہے اور بنت ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہے اور یہی قول ہے بعض اہل علم کا۔ امام احمد اور اسحٰق کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چٹائی پر نماز پڑھنا ثابت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''خمرہ'' چھوٹی چٹائی کو کہتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کیونکہ اس آیت کا مقتضیٰ مطلقاً صلحاء کیلئے اللہ کی طرف سے صلوات اور رحمت کا اعلان ہے۔ ہاں اگر اس آیت کے بجائے ''ان اللہ وملئکته یصلون علی النبی'' والی آیت کو ذکر کرتے تو زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے لفظ صلوٰۃ استعمال ہوا ہے اور سب سے زیادہ واضح استدلال اللہ تعالیٰ کا فرمان ''لا تجعلوا دعا الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا'' سے ہے۔ یہ مسئلہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ غیر نبی کیلئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال تبعاً جائز ہے اصالۃً جائز نہیں اور یہی امام مالک اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے امام احمدؒ کا اس میں اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

﴿تشریح﴾

اس باب کی غرض: اس باب کا مقصد[1] یہ ہے کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ کسی کپڑے پر نماز پڑھنا خلافِ اولیٰ ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجدوں میں کوئی کپڑا نہیں بچھایا جاتا تھا اور صحابہ کرام زمین پر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ تو اس حدیث باب سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کپڑے وغیرہ پر نماز پڑھنا خلافِ اولیٰ نہیں ہے ورنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثِ باب میں اس کا صدور کیوں ہوتا۔

باب ماجاء فی الصلاۃ علی الحصیرِ

باب بڑی چٹائی پر نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا نَصْرُ بن عليٍّ حَدَّثَنَا عيسى بن يونسَ عن الاعمشِ عن ابی سفیانَ عن جابرٍ عن ابی سعیدٍ: اَنَّ النبیَّ صلى الله علیه وسلم صَلّٰی علٰی حصیرٍ۔ قال: وفی الباب عن انسٍ، والمغیرۃِ بن شُعْبَۃَ۔ قال ابو عیسی: و حدیث ابی سعیدٍ حدیث حسن۔ والعملُ علی هذا عند اکثر اهل العلم۔ اِلَّا اَنَّ قوماً من اهل العلم اختاروا الصلاۃ علی الارضِ استحباباً۔ وابو سفیانَ اسمه طَلْحَۃُ بن نافعٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی بڑی چٹائی پر۔

اس باب میں حضرت انس، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو سعید حسن ہے اور اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے جبکہ اہل علم کی ایک جماعت نے زمین پر نماز پڑھنے کو مستحب کہا ہے۔

---

[1] حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بالکل واضح ہے لیکن میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ محدثین اس باب کو اس لئے قائم کرتے ہیں کیونکہ سلف صالحین کا صلوٰۃ علی الخمرۃ میں اختلاف تھا۔ ابن رسلان فرماتے ہیں کہ بقول ابن بطال رحمہ اللہ کے صلوٰۃ علی الخمرۃ کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ مٹی منگواتے تھے اور اپنے سجدہ کی جگہ پر چٹائی پر اسکو رکھ دیتے تھے اور اس پر سجدہ کرتے تھے اسی طرح عروہؒ سے مروی ہے کہ وہ زمین کے علاوہ کسی بھی شئی پر سجدہ کرنا ناپسند کرتے تھے۔

﴿تشریح﴾

حصیر خمرۃ سے بڑی چٹائی ہوتی ہے یا خمرۃ خاص کپڑے کا نام ہے اور حصیر مطلق چٹائی کو کہتے ہیں۔

غرضِ مصنف اور حضرت شیخ کی منفرد توجیہ: اس باب کا مقصد[1] یہ ہے کہ چھوٹا کپڑا ہو یا بڑی چٹائی ہر ایک بچھونے پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگرچہ زمین پر نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے کیونکہ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ علی البُسُطِ

باب بچھونوں پر نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وكيع عن شُعْبَةَ عن ابى التَّيَّاح الضُّبَعِيِّ قال: سمعتُ انس بن مالكٍ يقولُ: كان رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم يُخالطُنَا حتى كان يقولُ لِاخٍ لى صغيرٍ: يا ابا عُمَيْرٍ! مَافَعَلَ النُّغَيْرُ؟ قال: ونُضِحَ بِسَاطٌ لنا فصلّٰى عليه۔ قال ابو عيسى: حديث انسٍ حديث حسن صحيح۔ والعملُ على هذا عند اكثر اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ومَن بعدهم: لم يَرَوْا بالصلاة على البساطِ والطُّنْفِسَةِ بأساً۔ وبه يقولُ احمدُ، واسحٰقُ۔ واسمُ ابى التَّيَّاح، يزيدُ بن حُمَيْد۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے دل لگی فرمایا کرتے یہاں تک کہ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا اس سے فرماتے اے ابوعمیر! تمہاری بلبل کو کیا ہوا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پھر

---

[1] حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی تقریر بالکل واضح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں ایسا ہی باب قائم کیا ہے۔ حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترجمۃ الباب میں نکتہ یہ ہے کہ اس سے ابن ابی شیبہ وغیرہ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر بھی نماز ادا فرماتے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وجعلنا جهنم للكافرين حصيرا" تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر نماز نہیں پڑھتے تھے، تو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ابن ابی شیبہ کی یہ روایت یا تو ان کے ہاں صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے، یا شاذ ہے اور نا قابل قبول روایت ہے۔

ہمارا بچھونا دھویا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز پڑھی۔

اس باب میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی پر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے کہ بچھونے یا قالین وغیرہ پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور امام احمد اور اسحٰق رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابو تیاح کا نام یزید بن حمید ہے۔

﴿تشریح﴾

کپڑے پر نماز پڑھنے کے حکم میں ائمہ کا اختلاف: جان لینا چاہیئے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے علاوہ باقی سب ائمہ کے ہاں اس بچھونے پر نماز جائز ہے جو کہ پاک ہو اور اس پر سجدہ کرنا ممکن ہو۔

امام مالکؒ کے مذہب کی وضاحت: امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں صرف اس بچھونے پر نماز جائز ہے جو زمین[1] کی جنس سے ہو جیسا کہ چٹائی، لہٰذا امام مالکؒ کے نزدیک چمڑے کی بنی ہوئی جائے نماز، اونی کپڑے پر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے[2]۔

حدیث میں مطلق اور مقید دو لفظ الگ الگ مذکور ہوں تو محدثین ان دونوں سے الگ الگ حکم ثابت کرتے ہیں: جان لینا چاہیئے کہ محدثین کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ جہاں حدیث میں دو لفظ وارد ہوں ایک مطلق ایک مقید تو وہ مقید کو مطلق پر محمول نہیں کرتے۔ چنانچہ یہاں پر لفظ بساط مطلق ہے اور دوسری روایت میں لفظِ حصیر ہے اس لئے محدثین کرام

---

[1] مالکیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ جنس الارض کے علاوہ بنے ہوئے بچھونے پر نماز پڑھنا مکروہ ہے ابن رشد نے اسی طرح کہا ہے جیسا کہ ابن العربی کا کلام تفصیل سے آرہا ہے۔

[2] **جو کپڑا غیر جنس الارض سے ہو اس پر نماز کے ہونے میں اختلاف ہے:** یعنی اس صورت میں نماز مکروہ ہے۔ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کے علاوہ کسی بچھونے پر نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ وہ کپڑا زمین کی جنس سے ہو۔ اور اگر وہ کپڑا زمین کی جنس سے نہ ہو جیسا کہ اونی کپڑا تو اس پر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اسی طرح اگر کپڑا زمین کی جنس سے ہو لیکن اس میں غیر جنس الارض سے ملا کر کپڑے کو تیار کیا گیا ہو جیسے کہ السی کا کپڑا تو یہ بھی مکروہ ہے۔ اونی کپڑوں پر نماز پڑھنے کو بعض علماء نے مکروہ کہا ہے اور بعض علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور السی اور روئی کے کپڑوں پر نماز پڑھنے کو امام مالک رحمہ اللہ نے مکروہ قرار دیا ہے جبکہ ابن مسلمہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس لئے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس میں ایک طرح سے آسائش کا پہلو ہے۔ انتہی۔ پھر ابن العربی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف بچھونوں پر نماز پڑھنے کے جائز ہونے کے دلائل کو تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

اس سے مطلقاً کپڑے پر نماز کے جائز ہونے کا حکم نکالتے ہیں اگر چہ یہاں متعدد واقعات ہونا بھی ممکن ہے لیکن اگر ایک واقعہ میں بھی حصیر اور بساط دونوں لفظ ہوں تب بھی مطلق بچھونے پر نماز کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔ جیسا کہ محدثین کرام مقید حدیث سے خاص مقید حکم ثابت کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر میں نماز ادا فرمائی تھی بظاہر یہ ایک ہی دفعہ کا واقعہ ہے اگر چہ متعدد بار بھی ہو سکتا ہے لیکن راوی نے کبھی یہ بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بساط پر نماز ادا فرمائی ہے اور کبھی حصیر پر نماز پڑھنے کو ذکر کیا ہے۔ لفظ بساط عام ہے مطلق بچھونے کو کہتے ہیں اور حصیر خاص چٹائی کو کہتے ہیں تو ان دونوں حدیثوں سے دو الگ الگ مسئلے معلوم ہو گئے کہ خاص چٹائی اور مطلق بچھونے دونوں پر نماز جائز ہوگی۔

مدینہ کا شکار مکہ کے شکار کی طرح ممنوع نہیں: (یا ابا عمیر ما فعل النغیر) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدینہ کا شکار اس طرح ممنوع نہیں جس طرح مکہ کا شکار ممنوع ہے ورنہ یہ صحابی مدینہ منورہ میں اپنے پاس پرندہ نہ رکھتے۔

شوافع کی تاویل اور اسکے جوابات: حضرات شوافع کو یہ تاویل کرنا ممکن ہے[1] کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ حرم کے باہر سے شکار لائے ہوں تو اس تاویل کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جب ابو عمیر اس شکار کو لیکر حرم میں داخل ہو گئے تو وہ[2] شکار بھی اسی طرح واجب التعظیم ہو گیا جیسا کہ حرم کا شکار لہذا اس کو چھوڑ دینا اور اس سے تعرض نہ کرنا ضروری ہے اگر چہ اس کو حرم کے باہر سے پکڑ کر لایا گیا ہو۔

---

[1] یہ شوافع کی جانب سے حدیث شریف کی تاویل ہے وہ تاویل یہ کرتے ہیں کہ صحابی اس نغیر پرندے کو خارج حرم سے پکڑ لائے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ روایت سے پہلے تو یہ ثابت کیا جائے کہ پرندہ خارج حرم سے پکڑ کر لائے تھے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم بھی کر لیں تو جب اس پرندے کو حرم میں داخل کر دیا گیا تو اس کا حکم حرم کے جانوروں کا سا ہو گیا اور صید الحرم کا عموم اس کو بھی شامل ہے جیسا کہ حرم مکہ کے شکار کے متعلق شوافع کا یہی مذہب ہے۔

[2] وار سالہ کا عطف حرمۃ التعارض پر ہے یعنی اس کا حکم حرم کے شکار کی طرح ہے کہ اس کو بھی چھوڑ دیا جائے لہذا جس جانور کو حل سے پکڑا ہو اس کو بھی چھوڑنا ضروری ہے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: حنفیہ کے مذہب میں خارج حرم سے پکڑے ہوئے جانور کو چھوڑنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جبکہ اس شخص کے ہاتھوں میں وہ جانور رہا ہو اور اسکا ثبوت نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ جانور پنجرے میں ہو لہذا اسکا چھوڑنا ضروری نہیں ہے؟

جواب: اس پرندے کا پنجرے میں ہونا ایک امر زائد ہے جس کو ثابت کرنے کیلئے دلیل کی ضرورت ہے بلکہ حدیث شریف میں صحابہ کا یہ قول کہ "اس پرندے کے ساتھ کھیلا جاتا تھا" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرندہ ان صحابی کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ کھیلتے تھے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ بچے پرندہ ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلتے ہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃ فی الحیطانِ

باب باغوں میں نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود حَدَّثَنَا الحسنُ بنُ ابی جعفر عن ابی الزُّبَیْرِ عن اَبِی الطُّفَیْلِ عن مُعَاذ بن جَبَلٍ: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یَسْتَحِبُّ الصلاۃَ فی الحیطانِ۔ قال ابو داود: یعنی البَسَاتِینَ۔

قال ابو عیسی: حدیث معاذٍ حدیث غریبٌ، لانعرفه اِلَّا مِن حدیثِ الحسن بن ابی جعفر۔

والحسن بن ابی جعفرٍ قد ضَعَّفه یحیی بن سعیدٍ وغیرُہ وابو الزُّبَیْرِ اسمه محمد بن مُسْلم بن تَدْرُسَ وابو الطُّفَیْلِ اسمه عامرُ بن وَاثِلَةَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ ابو داؤد کہتے ہیں حیطان سے مراد باغ ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث معاذ رضی اللہ عنہ غریب ہے اور ہم اسے حسن بن ابوجعفر کی روایت کے علاوہ کسی اور سے نہیں جانتے اور ان (حسن بن ابوجعفر) کو یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ ابوزبیر کا نام محمد بن مسلم بن تدرس ہے اور ابوطفیل کا نام عامر بن واثلہ ہے۔

﴿تشریح﴾

تبدل ماہیت سے تبدل حکم ہوجاتا ہے: ''حائط'' لغت میں اس باغیچے کو کہتے ہیں جس کے گرد دیوار کے ساتھ احاطہ ہو۔ یہاں حائط سے مرادِ عام باغیچہ ہے چاہے دیوار ہو یا نہ ہو۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ باغیچے میں گندگی وغیرہ پڑی ہوتی ہے تو شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہاں پر نماز پڑھنا ناجائز ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر اس وہم کو دور فرمادیا۔ یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ماہیت[1] کو بدلنے سے وہ شئی ناپاکی سے پاکی کی حالت کیطرف منتقل ہوجاتی ہے۔

---

[1] **تبدل ماہیت سے تبدل حکم کے نظائر:** اس کی تائید جمع الفوائد کی روایت سے ہے جس میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس باغیچے میں نماز کے متعلق پوچھا گیا جس باغیچے میں گندگیاں ڈالی جاتی ہوں تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس مسئلہ کی حقیقت: جان لینا چاہیئے کہ تبدل ماہیت کے مسئلہ میں عقلیں حیران ہیں اور کئی لوگوں سے یہاں پر لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شئی کی ماہیت اور صورت دونوں بدل جائیں تو اس شئی کا حکم بھی تبدیل ہوجاتا ہے بعض لوگ یہ سمجھے کہ صرف صورت کے بدل جانے سے حکم تبدیل ہوجائیگا یہ بات غلط ہے کیونکہ اگر صرف شئی کی صورت کے تبدیل ہونے سے حکم تبدیل ہوجاتا تو جس خمیر کے اندر پیشاب ملا ہوا اس سے جو روٹی تیار ہو وہ روٹی پاک ہونی چاہیئے کیونکہ یہاں پر پیشاب کی صورت بدل چکی ہے حالانکہ کوئی اس روٹی کی پاکی کا قائل نہیں۔ اسی طرح بعض نادانوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ ناپاک شئی اگر کسی پاک شئی کے ساتھ مل جائے تو وہ پاک ہوجائیگی کیونکہ ماہیت اس کی تبدیل ہوگئی۔ اپنے اس فتویٰ پر انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ کا فتویٰ بخاری کی کیچڑ کے پاک ہونے والا فتویٰ بطور دلیل ذکر کیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کے مذہب[1] میں گھوڑے کی لید اور گائے کا گوبر وغیرہ ناپاک ہیں۔

امام محمد کے طین بخاری کو پاک قرار دینے کی علت عمومِ بلویٰ ہے: اسی طرح اس مذکورہ فتویٰ میں غلطی بھی ہوئی کہ انہوں نے طینِ بخاریٰ کے مسئلہ میں کیچڑ کے پاک ہونے کی علت یہ سمجھی کہ ناپاک پانی پاک مٹی کے ساتھ مل گیا ہے حالانکہ یہ علت نہیں ہے بلکہ اس کیچڑ کے پاک ہونے کی علت ابتلاءِ عام ہے تو اس فتویٰ میں ایک پاک شئی کا ناپاک شئی کے ساتھ ملنے کے حکم اور انقلابِ ماہیت کے حکم میں فرق نہیں کیا گیا ایک مسئلہ کو دوسرے کے ساتھ ملا لیا گیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) جب اس باغ کو کئی دفعہ سیراب کردیا جائے تو اس میں نماز پڑھ سکتے ہو۔ اس حدیث کو انہوں نے مرفوع ذکر کیا ہے یہ حدیث ابن ماجہ میں محمد بن اسحٰق کے عنعنہ کے ساتھ مروی ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شریعت میں اس کی نظیر نطفہ ہے کہ شروع میں ناپاک ہوتا ہے پھر وہ جمع ہوا خون بن جاتا ہے اس حالت میں بھی ناپاک ہوتا ہے پھر وہ گوشت کی بوٹی کی صورت اختیار کرلیتا ہے اس حالت میں وہ پاک ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انگور کا شیرہ پاک ہوتا ہے پھر اس سے شراب بنائی جاتی ہے تو وہ ناپاک ہوجاتا ہے پھر اس کا سرکہ بنایا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے پس معلوم ہوا کہ کسی شئی کے خاص اوصاف کو زائل کرنے سے اس شئی کا عین اور ماہیت تبدیل ہوجاتی ہے۔

[1] ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ نے آخر میں رجوع کرلیا تھا کہ گھوڑے کی لید نماز سے مانع نہیں اگرچہ بہت زیادہ ہو، جب امام محمدؒ خلیفہ وقت کے ساتھ مقام رے میں داخل ہوئے اور لوگوں کا ابتلائے عام دیکھا کہ راستے اور دکانیں گندگی اور ناپاکی سے بھرے ہوئے ہیں تو مشائخ نے بخاریٰ کی کیچڑ کو امام محمد کے اس قول پر قیاس کیا۔

حالانکہ ان دونوں مسئلوں میں بہت بڑا فرق ہے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے۔ تو بخاری کی کیچڑ کے ساتھ نماز کے جائز ہونے کی علت عموم بلویٰ ہے نا کہ یہ جو انہوں نے ذکر کی۔

عمومِ بلویٰ کا اعتبار مجتہد فیہ مسائل میں ہی ہوتا ہے: یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عموم بلویٰ کا اعتبار ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں اجتہاد کی گنجائش ہو مثلاً امام محمد رحمہ اللہ نے اپنے شہر والوں اور اہل زمانہ کو دیکھا کہ ان کے لئے اس کیچڑ سے بچنا مشکل ہے تو کیچڑ کے معاف ہونے کا حکم فرما دیا اور امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب پر فتویٰ دے دیا اگر چہ یہ مسئلہ امام محمد رحمہ اللہ کے مذہب کے خلاف تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جب لوگ کسی فعل کو کرنے لگیں اور اس پر انکا ابتلاء عام ہو جائے چاہے وہ بالکل حرام ہو تو عمومِ بلویٰ کی وجہ سے اس کے جائز ہونے کا حکم دیا جائے، یہ صحیح نہیں۔ اس طرح احکامِ شرعیہ میں عموم بلویٰ کی وجہ سے حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

باب ماجاء فی سُتْرَةِ المُصَلّٰی

باب نمازی کے سترہ کا بیان

☆حدثنا قتیبة وهناد قالا: حَدَّثَنا ابوالاحُوَصِ عن سِمَاك بن حَرْبٍ عن موسی بن طَلْحَة عن ابیه قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: إذا وَضَعَ احدُكم بين يديهِ مِثْلَ مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ فَلْيُصَلِّ، ولا يُبَالِي مَنْ مرّمن وراء ذٰلك۔

قال: وفی الباب عن ابی هريرةَ، وسَهْلِ بن ابی حَثْمَةَ، وابن عمر، وسَبْرَةَ بن معبدِ الجُهَنِيِّ، وابی جُحَيْفَةَ، وعائشةَ۔قال ابو عيسی: حديث طلحةَ حديث حسن صحيح۔ والعملُ علی هذا عند اهل العلم۔ وقالوا: سُتْرَةُ الإمامِ سُتْرَةٌ لِمَنْ خَلْفَه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے

---

[1] قال المجد لفظ بین اس کے معنی جدائی کے بھی آتے ہیں اور ملانے کے بھی اور یہ اسم ہے اور ظرف متمکن ہے اور اس کا معنی دوری کے بھی آتے ہیں۔ اگر ب کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کنارے اور دو زمینوں کے درمیان حد فاصل کے آتے ہیں۔

کوئی اپنے سامنے کجاوے کی پچھلی لکڑی کی مانند کوئی چیز رکھ لے تو نماز پڑھ لیا کرے اور ان لوگوں کی پروانہ کرے جو اس سترہ کے آگے سے گزرتے ہوں۔

اس باب میں حضرت ابو ہریرہ، سہل بن ابوحثمہ، ابن عمر، سبرہ بن معبد، ابوجحیفہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث طلحہ حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اسی پر عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ امام کا سترہ اس کے پیچھے مقتدیوں کیلئے بھی کافی ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة المرُورِ بین یَدِی المصلّی

باب نمازی کے آگے سے گزرنے کے مکروہ ہونے کے بیان میں

☆حدثنا اسحٰق بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكُ بن انَسٍ عن ابی النَّضرِ عن بُسْرِ بن سعیدٍ انَّ زیدَ بن خالد الجُهَنِیَّ اَرْسَلَهُ الی ابی جُهَیْمٍ یساله ماذا سمع من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی المَارِّ بین یدَیِ المصلّی؟فقال ابو جُهَیْمٍ: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لو یَعْلَمُ المارُّ بین یدَیِ المصلّی ماذَا علیه لکانَ اَنْ یَقِفَ اربعینَ خَیْرٌ له من ان یَمُرَّ بین یَدَیْه۔ قال ابو النَّضرِ: لا اَدْرِی قال اربعین یوماً او شهراً او سَنَةً؟۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن ابی سعیدٍ الخدریِّ، وابی هریرةَ ، وابن عُمَرَ، وعبد اللّٰه بن عَمْرٍو

قال ابو عیسی: و حدیثُ ابی جُهَیْمٍ حدیث حسن صحیح۔

وقد رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انهُ قال: لَاَنْ یَقِفَ احَدُکم مِائةَ عامٍ خَیْرٌ له مِن ان یَمُرَّ بین یَدیْ اخیهِ وهو یصلّی۔ والعملُ علیه عند اهل العلم: کَرِهُوا المُرورَبین یَدَیِ المصلّی، ولم یَرَوْا اَنَّ ذلك یَقْطَعُ صلاةَ الرجلِ۔ واسمُ ابی النَّضرِ سالمٌ مولی عمر بنُ عبید اللّٰه المدینیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

بسر بن سعید کہتے ہیں کہ زید بن خالد جہنی نے ایک شخص کو ابوجہیم کے پاس بھیجا یہ بات پوچھنے کیلئے کہ انہوں نے نمازی کے آگے گزرنے والے کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا حدیث سنی ہے؟ ابوجہیم نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ کتنا بڑا گناہ ہے تو وہ چالیس..... کھڑا رہے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کے سامنے سے گزر جائے۔ ابوالنضر کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں انہوں نے چالیس دن فرمایا یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔

اس باب میں ابوسعید خدری، ابوہریرہ، اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوجہیم حسن صحیح ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی ایک کا سو سال کھڑا رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نمازی بھائی کے آگے سے گزرے اسکی نماز پڑھنے کے دوران۔ اہل علم کا اس پر عمل ہے گو نمازی کے آگے سے گزرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

﴿تشریح﴾

لکان ان یقف اربعین خیر له من ان یمر بین یدیه: اور یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ جب آدمی چالیس سال تک کھڑا رہیگا تو وہ کس قدر تکلیفوں میں وقت گزارے گا بھوک، پیاس، بارشیں، تیز ہوائیں[1]، رات کی ٹھنڈک، دن کی دھوپ کی تپش، اہل وعیال کا مرنا وغیرہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ جب نمازی کے سامنے سے یہ شخص گزرتا ہے تو اس کو اس قدر عذاب اور گناہ ہوگا کہ اسے یہ ساری مشقتیں آسان لگیں گی اور وہ عذاب مشکل لگے گا وہ سوچے گا کہ کاش وہ چالیس سالہ مشقتیں مجھ پر آجاتیں مگر میں نمازی کے سامنے سے نہ گزرتا۔ دوسری روایت نے یہ تفسیر کردی ہے کہ اربعین سے مراد چالیس سال ہیں۔

باب ماجاء لایَقْطَعُ الصلاۃ شیءٌ

باب اس بارے میں کہ نماز کو کوئی بھی چیز نہیں توڑتی

☆حدثنا محمدُ بنُ عبد الملك بن ابی الشَّوَارِبِ حَدَّثَنَا یزیدُ بنُ زُرَیْعٍ حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ عن الزهریِّ عن عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عتبة عن ابنِ عباسٍ قال: كنتُ رَدِیفَ الفضلِ علی اَتَانٍ فَجِئْنَا والنبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم یصلّی باصحابه بمنیً، قال: فنزلنا عنها فَوَصَلْنَا الصَّفَّ، فَمَرَّتْ بین ایدیهم فلم

---

[1] قال المجد ''الهوجاء'' کہتے ہیں تیز آندھی کو جو کے گھروں کی بیخ کنی کردے اس کی جمع هوج آتی ہے۔

تَقْطَعُ صلاتَهم۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن عائشةَ، والفضل بن عباسٍ، وابن عمر۔ قال ابو عیسی: و حدیث ابن عباسٍ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علیه اکثر اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ومَن بعدهم مِن التابعین، قالوا: لایقطعُ الصلاةَ شئٌ۔ وبه یقولُ سفیانُ الثّوریُّ، والشافعیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں اپنے بڑے بھائی فضل کے ساتھ گدھی پر پیچھے سوار ہوکر (منیٰ میں) پہنچا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو (منی میں) نماز پڑھا رہے تھے ہم اترے اور صف میں مل گئے۔ گدھی ان کے (نمازیوں کے) سامنے سے گزرتی تھی۔ اور اس سے ان کی نماز فاسد نہیں ہوئی اس باب میں حضرت عائشہ، فضل بن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین میں سے اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ نماز کو کوئی (گزرنے والی) چیز نہیں توڑتی۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

صحابہ میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اگر نمازی کے سامنے سے گدھا اور کتا اور عورت گزر جائے تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے کیونکہ بعض روایات میں اس کی تصریح بھی موجود ہے اب ائمہ میں یہ اختلاف واقع ہوا کہ بعض ائمہ کے نزدیک یہ تینوں چیزیں نماز کو توڑ دیتی ہیں اور بعض ائمہ کے ہاں[1] ان میں سے کسی بھی ایک کا گزرنا نماز کو نہیں ٹوٹتا۔

ترجمۃ الباب اور مافی الباب میں مطابقت: لہٰذا اگر ان تینوں شئی میں سے کسی ایک شئی کا گزرنا نماز کو توڑ دیگا

---

[1] یعنی جمہور کے مذہب میں تفریق ثابت نہیں البتہ امام احمدؒ کے ہاں ان تینوں اشیاء کے حکم میں فرق ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے امام احمد و اسحٰق سے ذکر کیا ہے۔ جمہور فقہاء کے ہاں ان تینوں اشیاء کے حکم میں کوئی فرق نہیں لہٰذا ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک ان تینوں چیزوں میں سے کسی شئی کے گزرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اور ظاہریہ کے مذہب میں ان تینوں اشیاء میں سے ہر ایک کے گزرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اس کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

تو باقی دو چیزوں کا گزرنا بھی نماز کو توڑ دیگا اور اگر کسی بھی ایک شئی کا گزرنا نماز کو نہیں توڑے گا[1] تو یہ تینوں کی تینوں چیزیں نماز کو نہیں توڑیں گی لہٰذا حدیث باب میں جب اتان (گدھی) کا ذکر ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جب اتان (گدھی) کا گزرنا نماز کو نہیں توڑتا تو باقی دو چیزوں کا گزرنا بھی نماز کو نہیں توڑے گا اس طرح ترجمۃ الباب کے ساتھ باب کی حدیث کی مطابقت ظاہر ہو جاتی ہے اور اس دعویٰ کی دلیل ظاہر ہو جاتی ہے۔

(فمرت بین ایدیھم) مطلب یہ ہے کہ یہ گدھی امام کے سترے کے اندر[2] سے گزر گئی تھی۔ پہلا قرینہ: کیونکہ اگر یہ سترے کے باہر سے گزری تھی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما جس مقصد کو ثابت کر رہے ہیں وہ ثابت نہیں ہوتا۔ دوسرا قرینہ: یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھے اور سترہ آپ کے سامنے تو اگر یہ گدھی سترے کے سامنے سے گزری ہوتی تو وہ صحابہ سے بہت دور سے گزری ہوتی اور صحابہ کو اس کا علم بھی مشکل سے ہوتا ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ گدھی سترے اور صحابہ کے درمیان سے گزری۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ بین ایدیھم کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ وہ گدھی ان کے قریب سے گزری تھی اسی طرح اس گدھی کے اوپر سوار شخص (یعنی عبداللہ بن عباس اور فضل) کا مقصد نماز کی جماعت میں شامل ہونا تھا تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس گدھی کو صف کے قریب جلدی میں چھوڑ دیا جائے تا کہ رکعت فوت نہ ہو۔

باب ماجاء انهُ لايقطعُ الصلاةَ اِلَّا الكَلبُ والحمارُ والمراةُ

باب کتے، گدھے اور عورت کے گزرنے کے علاوہ کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی

☆حدثنا احمدُ بن مَنيعٍ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ اخبرنا يونسُ بنُ عبيد ومنصورُ بن زَاذَانَ عن حُمَيْد بن هِلَالٍ عن عبد الله بن الصَّامِتِ قال سمعتُ ابا ذَرٍّ يقول: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: اذَا

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے بظاہر یہاں لکھنے والے سے یہ غلطی ہوگئی ہے صحیح عبارت عدم القطع ہونی چاہیئے۔

[2] **حدیث باب والے واقعہ میں سترہ تھا یا نہیں؟**: حدیث کے ماہرین کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز میں سترہ تھا یا نہیں؟ تو امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمۃ الباب "سترة الامام سترة لمن خلفه" سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اس نماز میں سترہ تھا اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس مقام پر اس کی شرح میں بہت تحقیق سے سترہ کے ہونے کو ثابت فرمایا ہے اور یہی حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام سے بھی سمجھ میں آ رہا ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر "باب من صلی الی غیر سترة" کا باب قائم کیا ہے، اس سے ان کا میلان سترہ نہ ہونے کی طرف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے جیسا کہ حافظ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے تفصیل کیلئے فتح الباری اور عمدۃ القاری ملاحظہ ہو۔

صلّی الرجلُ ولیس بین یدیه کآخِرَۃ الرَّحلِ، او کَوَاسِطَۃِ الرَّحْلِ: قَطَعَ صلا تَه الکلبُ الاسودُ والمرأۃُ والحمارُ فقلتُ لابی ذَرٍّ: مابالُ الاسودِ من الاحمرِ وَمن الابیض؟ فقال: یا ابنَ اَخِی! سألتَنِی کماسألتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم؟ فقال: الکلبُ الاسودُ شیطانٌ۔قال: وفی الباب عن ابی سعیدٍ، والحَکَمِ بن عمرٍو الغِفَارِیِّ، وابی هریرۃَ، وانسٍ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی ذَرٍّ حدیث حسن صحیحٌ۔

وقد ذهب بعضُ اهل العلم الیه، قالوا: یَقْطَعُ الصَّلاۃَ الحمارُ والمراۃُ والکلبُ الاسودُ۔ قال احمدُ: الَّذِی لااَشُکُّ فیه: اَنَّ الکلبَ الاسودَ یقطعُ الصلاۃَ، وفی نفسی من الحمارِ والمراۃِ شئ۔ قال اِسحٰقُ: لایقطعها شئ اِلَّا الکلبُ الاسودُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص نماز پڑھے اوراس کے سامنے کجاوے کی پچھلی لکڑی کی مانند یا فرمایا درمیانی لکڑی کے مانند کوئی چیز نہ ہوتو اس کی نماز کالے کتے، گدھے یا عورت کے گزرنے سے فاسد ہو جائے گی۔حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کالے کتے کی سفید یا سرخ کتے سے تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا اے بھتیجے تو نے مجھ سے ایسا سوال کیا ہے جس طرح میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کالا کتا شیطان ہے۔

اس باب میں ابوسعید، حکم غفاری، ابو ہریرہ اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابوذر حسن صحیح ہے اور بعض اہل علم کا یہی خیال ہے کہ گدھے عورت اور کالے کتے کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیاہ کتے کے گزرنے سے نماز ٹوٹنے میں تو مجھے شک نہیں البتہ گدھے اور عورت کے بارے میں مجھے شک اور تردد ہے۔امام اسحٰق فرماتے ہیں سوائے کالے کتے کے کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

﴿تشریح﴾

قطعِ صلوٰۃ سے مراد کیفیتِ صلوۃ کا ٹوٹنا ہے نہ کہ نفسِ صلوٰۃ کا: ("قطع صلاته" الکلب الاسود

والمرأۃ والحمار) حدیث شریف میں قطع سے مراد نمازی کے خشوع وخضوع کو ختم کرنا ہے کلب اسود کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ جب نمازی حرکت کرتا ہے یا رکوع سجدے میں جاتا ہے تو یہ کالا کتا بوجہ اپنی بے وقوفی اور عدم تیقظ کے وہاں سے بھاگتا نہیں ہے بخلاف دوسرے کتے کہ وہ نمازی کی ذراسی حرکت سے وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں "الکلب[1] الاسود شیطان" کہا گیا ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے تو کالے کتے سے شکار کرنے کو حرام کہا ہے اور گدھے میں چونکہ حماقت ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہ نمازی سے ٹکرا جائے یا اس کے سامنے آجائے اور عورت کی تخصیص کی وجہ ظاہر ہے (یعنی شہوانی خیالات پیدا ہوسکتے ہیں)۔

(قال احمد وفی نفسی من الحمار والمراۃ شئی) امام احمد کو یہ تردد[2] اس لئے ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ابھی گزرا کہ صف کے سامنے سے گدھی گزر گئی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور میں آپ کے اور قبلہ کے درمیان ایسے لیٹی ہوئی تھی جیسا جنازہ رکھا ہوتا ہے پس ان دونوں چیزوں (حمار اور مرأہ) میں تردد کی وجہ یہی ہے کہ دو متعارض حدیثیں موجود ہیں[3] اسلئے تطبیق یوں ہوگی کہ حدیث باب میں قطع سے مراد نماز کی کیفیت کا ختم ہوجانا ہے بالکلیہ ختم ہوجانا نہیں البتہ کتے کے متعلق حدیث باب کے معارض کوئی حدیث موجود نہیں لہٰذا اس کو اس کے ظاہر پر رکھا جائیگا کہ کتے کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے (یہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہوا)۔

---

[1] بذل المجہود میں لکھا ہے کہ بعض حضرات نے اس حدیث کو اس کے ظاہر پر رکھا ہے کہ شیطان کتے کی شکل میں آجاتا ہے اور بعض حضرات نے یہ معنی کیا ہے کہ اس کالے کتے کو شیطان اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دوسرے کتے کے مقابلے میں زیادہ ضرررساں ہے۔

[2] اسی وجہ سے امام احمد کی مختلف روایتیں ہیں کہ عورت اور گدھے کے گزرنے سے نماز ٹوٹتی ہے یا نہیں لیکن کلب اسود میں ایک ہی قول ہے کہ نماز اس کے گزرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ شرح الکبیر میں ہے اگر نمازی کے سامنے سترہ نہ ہو تو حنابلہ کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کالے سیاہ کتے کے گزرنے سے نماز فاسد ہوجائیگی۔ اگر عورت یا گدھا گزر جائے تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ انتہی کذا فی الاوجز

[3] کیونکہ دونوں روایتوں میں تطبیق دینا زیادہ بہتر ہے اس بات سے کہ ایک روایت کو چھوڑ دیا جائے۔ جمہور ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ جب مراۃ اور حمار میں قطع سے مراد قطع خشوع ہے تو کلب میں بھی قطع سے یہی مراد ہوگا کیونکہ تینوں کے حکم میں کوئی وجہ فرق نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ حدیث شریف میں "لا یقطع الصلوٰۃ شئی" کے الفاظ موجود ہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃ فی الثوب الواحد

باب ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا قتیبة بن سعید حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عن هشام بن عروةَ عن ابیه عن عمرَ بنِ ابی سَلَمَةَ: انه رَاَی رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یُصَلِّی فی بَیْت ام سلمةَ مُشْتَمِلاً فی ثوبٍ واحد۔

قال وفی الباب عن ابی هریرةَ، وجابرٍ، وسَلَمَةَ بن الاَکْوَعِ، وانسٍ، وعَمْرو بن ابی اُسَیدٍ، وعُبَادَةَ بن الصَّامتِ، وابی سعیدٍ، وکَیْسَانَ، وابن عباسٍ، وعائشةَ، وامِّ هانیٍ، وعَمَّارِ بن یاسرٍ، وطَلْق بن علیٍّ، وعبادة بن صَامِت الانصاریِّ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ عمرَ بن ابی سلمة حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی هذا عندا کثر اهل العلم من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم ومَن بعدهم من التابعین وغیرهم، قالوا: لاباسَ بالصلاةِ فی الثوبِ الواحدِ۔ وقد قال بعض اهل العلم: یُصَلِّی الرجلُ فی ثَوْبَیْنِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر نماز پڑھتے دیکھا اس حال میں کہ ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔

اس باب میں ابو ہریرہ، جابر، سلمہ بن اکوع، انس، عمرو بن ابو اسید، ابوسعید کیسان، ابن عباس، عائشہ، ام ہانی، عمار بن یاسر، طلق بن علی اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث عمر بن ابوسلمہ حسن صحیح ہے اور صحابہ وتابعین وغیرہ، اکثر علماء کا اسی پر عمل ہے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آدمی دو کپڑوں میں نماز پڑھے۔

﴿تشریح﴾

(قالوا لا باس بالصلوٰۃ فی ثوب واحد وقد قال بعضهم یصلی الرجل فی ثوبین) ان دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور نہ ان کے درمیان کوئی اختلاف ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان علماء سے

جو الفاظ منقول ہوئے تھے[1] ان کو بعینہ نقل کر دیا بہر حال دونوں قولوں کے مجموعہ کو دیکھتے ہوئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھنا افضل ہے اور صرف ایک کپڑے پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے ہاں جس شخص کے پاس دو کپڑے ہی نہ ہوں تو اس کیلئے ایک کپڑے میں نماز پڑھنا خلافِ اولیٰ نہیں ہے۔

متقدمین سے ایک کپڑے میں نماز کے ثبوت کی توجیہات: متقدمین سے جو یہ منقول ہے کہ انہوں نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی تو یہ اس لئے کیا تھا کہ ان کے پاس دو کپڑے[2] موجود نہیں تھے یا بیانِ جواز کیلئے اس طرح کیا تھا۔

باب ماجاء فی ابتداء القِبلة

باب قبلے کی ابتداء کا بیان

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وكيع عن اسرائيل عن ابی اسحق عن البَرَاءِ بن عازِبٍ قال: لَمَّا قَدِمَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم المدينةَ صَلّٰى نحوَ بيتِ المقدِسِ سِتَّةَ او سبعَةَ عَشَرَ شهراً، وكان رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يُحِبُّ ان يُوَجَّهَ الى الكعبةِ، فانزلَ اللّٰهُ تعالى: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَوَجَّهَ نحوَ الكعبةِ، وكان يُحِبُّ ذٰلِكَ۔ فصلّٰى رجلٌ معه العصرَ، ثم مَرَّ على قومٍ مِن الانصارِ وهم ركوعٌ فی صلاةِ العصر نحوَ بيتِ المقدِسِ، فقال: هو يَشْهَدُ انه صلى مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وانه قد وَجَّهَ الى الكعبةِ، قال: فانْحَرَفُوا وهم ركوعٌ۔

---

[1] سلفِ صالحین میں اس مسئلہ کے متعلق اختلاف ہے جیسا کہ ابن مسعود، ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے لیکن بعض حضرات کہتے ہیں جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ صحابہ کا یہ اختلاف جواز اور عدم جواز میں نہیں تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی ممانعت مروی ہے اگر چہ وہ کپڑا آسمان سے بھی زیادہ کشادہ ہو اور ان سے یہ بھی مروی ہے کہ دو کپڑوں میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے اس کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کو خلافِ اولیٰ ہونے کی وجہ سے منع کرتے تھے۔

[2] یعنی متقدمین ایک کپڑے میں نماز اس لئے پڑھتے تھے کہ ان کے پاس دوسرا کپڑا نہیں تھا یا بیان جواز کیلئے اس طرح کرتے تھے۔ قلت: یا اس مسئلہ کا بیان مقصود تھا کہ نفل نمازوں میں گنجائش ہوتی ہے جیسا کہ مرقاۃ میں ہے۔

قال : وفی الباب عن ابنِ عمرَ، وابنِ عباسٍ، وعُمَارَةَ بنِ اَوْسٍ، وعمرو بن عَوْفٍ الْمُزَنِیِّ، وانسٍ۔

قال ابو عیسی: و حدیث البَرَاءِ حدیث حسن صحیح۔ وقد رواہ سفیانُ الثوریُّ عن ابی اسحٰق۔

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وکیعٌ عن سفیانَ عن عبد اللّٰہ بن دِینَارٍ عن ابن عمرَ قال: کانوا رکوعاً فی صلاۃِ الصبحِ۔قال ابو عیسی: وحدیث ابنِ عمرَ حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی طرف منہ کرنا پسند کرتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "قد نری تقلب وجھك" الایة (بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا آپ کے منہ کا آسمان کی طرف سوالبتہ پھیریں گے ہم آپ کو جس قبلہ سے آپ راضی ہیں اب پھیرلیں آپ اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف) لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی طرف رخ کرلیا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے تھے۔ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی پھر وہ انصار کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا جو عصر کی نماز کے رکوع میں تھے ان کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا اسی صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی طرف منہ پھیرلیا۔راوی کہتے ہیں تو ان لوگوں نے رکوع ہی میں کعبے کی طرف رخ پھیر لئے۔

اس باب میں ابن عمر، ابن عباس، عمارہ بن اوس، عمرو بن عوف مزنی اور انس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث براء رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اسے سفیانِ ثوری رحمہ اللہ نے بھی ابواسحٰق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ ہناد وکیع سے وہ سفیان سے اور وہ عبداللہ بن دینار سے نقل کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ لوگ فجر کی نماز کے رکوع میں تھے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

ترجمۃ الباب کا مقصد: اس باب کا مقصد[1] مدینہ منورہ میں قبلہ کی ابتداء کس طرح ہوئی اس کا بیان کرنا ہے یا اس

---

[1] **استقبالِ قبلہ کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں:** ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قبلہ کے متعلق (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باب کا یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ مطلقا نبوت ملنے کے بعد قبلہ کی ابتداء کس طرح ہوئی جیسا کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں مکی زندگی میں اس طرح نماز ادا فرماتے کہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں کا استقبال ہوجاتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شدید اختلاف پایا جاتا ہے (۱) بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ سے اپنے نبی کو اجازت مرحمت فرمائی کہ جس جہت کی طرف چاہیں نماز پڑھیں اب لوگوں نے یہود کی اتباع کرتے ہوئے بیت المقدس کو قبلہ بنالیا پھر یہود اپنی سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا کہ آپ اپنا قبلہ کعبہ بنائیں چنانچہ اللہ رب العزت نے فول وجھك شطر المسجد الحرام سے آپ کا قبلہ کعبہ مقرر فرمادیا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلی نماز ظہر کی اس طرح پڑھائی تھی کہ کعبہ قبلہ تھا اور بیت المقدس کے سامنے ہونے کی رعایت کی گئی تھی پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرمانے کے بعد بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کے مطابق کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ انتہی۔

قلت: جبرائیل علیہ السلام نے لیلۃ الاسراء کے بعد سب سے پہلی ظہر کی نماز بیت اللہ کے دروازے کے سامنے پڑھائی ہے جیسا کہ بہت سی روایات اس پر دال ہیں اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ بیت اللہ کے دروازے کے سامنے نماز پڑھنے والا کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف رخ نہیں کرسکتا لہٰذا دونوں قبلوں کی طرف رخ کرنے کی صورت یہی ہے جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ رکن یمانی کے سامنے نماز پڑھنے سے کعبہ اور بیت المقدس دونوں کا استقبال ہوجاتا ہے۔

مکی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلے میں اختلاف: اوجز المسالک میں ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں آپ کا قبلہ کیا تھا؟ بعض علماء کے نزدیک مکہ میں قبلہ کعبہ تھا پھر جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس کو قبلہ بنایا پھر وہ منسوخ ہوگیا اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں صرف بیت المقدس قبلہ تھا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں آپ کا قبلہ بیت المقدس تھا لیکن آپ اپنے اور بیت المقدس کے درمیان کعبہ شریف کو بیچ میں کردیتے تھے۔ علامہ قسطلانی، ابن حجر، عینی وغیرہ نے اسی آخری قول کو ترجیح دی ہے تاکہ تکرار نسخ کا قول لازم نہ آئے۔ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اس پر امت کا اتفاق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے اور یہی حال ہجرت کے کچھ عرصہ بعد تک رہا اب اختلاف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کو قبلہ بنانا کیا یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا یا اختیاری حکم تھا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلے قول کو اور ربیع بن انس نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کو اور نکاح متعہ کو اور لحوم حمر الاہلیہ کو دو دو بار منسوخ فرمایا ہے۔ اوجز المسالک۔ ابن العربی کہتے ہیں کہ مجھے چوتھی چیز یاد نہیں جس میں دو مرتبہ نسخ ہوا ہو۔ ابو العباس الغرفی کہتے ہیں کہ چوتھی چیز وضوء مما مست النار ہے اس کو بھی دو مرتبہ منسوخ فرمایا ہے۔ کذا فی قوت المغتذی

اور جس جگہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرماتے تھے وہ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیانی جگہ ہے وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے دونوں قبلوں کا استقبال ہو جاتا ہے پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے بیت اللہ کے استقبال کو چھوڑ دیا اور بیت المقدس کو قبلہ بنایا پھر اللہ تعالیٰ نے فول وجھك شطر المسجد الحرام سے بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا اس طرح ایک ہی مرتبہ نسخ لازم آتا ہے اور اس قول کے قائل ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں انہوں نے یہ قول اس لئے اختیار فرمایا تا کہ نسخ کا تکرار نہ ہو۔ اصح قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ صرف بیت اللہ تھا پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو مدینہ میں یہ قبلہ منسوخ ہو گیا اور بیت المقدس قبلہ بنا دیا گیا اس کے بعد نسخ ثانی ہوا اور بیت اللہ قبلہ بنا۔ تکرار نسخ سے اس وقت بچا جائیگا جبکہ وہ ثابت نہ ہو یہاں پر نسخ کا تکرار ثابت ہے اب معنی یہ ہوگا کہ مصنف کے ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ بیت اللہ کو بطور قبلہ منسوخ کرنے کے بعد دوبارہ بیت اللہ کو قبلہ کس طرح بنایا گیا اس کی ابتداء کیسے ہوئی ہے؟ اس طرح حدیث باب کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت بالکل ظاہر ہے یا امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارا جو قبلہ ہے اس کی طرف رخ کرنے کے حکم کی ابتداء کس طرح ہوئی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ قبلہ منسوخ ہوا ہے یا نہیں۔

(فصلی قوم معه العصر ثم مر علی قوم من الانصار) یہ تحویل قبلہ کا حکم عصر کی نماز میں نہیں ہوا تھا یہ شخص نسخ والے دن یا اگلے دن اس انصاری جماعت کے پاس سے گزرا۔

محض خبرِ واحد سے نسخ ثابت نہیں ہوتا بلکہ کسی قرینہ کا ہونا ضروری ہے: (فانحرفوا وھم رکوع) اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خبر واحد سے نسخ ثابت ہو سکتا ہے بلکہ نسخ ایسی خبر سے ثابت ہو سکتا ہے جو علم قطعی یقینی کا فائدہ دے حدیث باب میں خبر واحد کے ذریعہ نسخ ثابت ہونے کی توجیہ یہ ہے کہ یہاں پر چونکہ یہ خبر علم قطعی یقینی کا فائدہ دے رہی ہے کیونکہ صحابہ کرام پہلے ہی سے تحویل قبلہ کے منتظر تھے تو اگر کوئی عام سا آدمی ان کو تحویل قبلہ کا بتاتا تو وہ اس کی بات کا یقین کر لیتے تو ایک صحابی کی خبر پر وہ کیسے یقین نہ کرتے[1]۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحابی انتہائی اعلیٰ درجہ کے ثقہ اور عادل تھے اگر یہ توجیہ نہ بھی کی جائے تب بھی یہ حدیث ہمارے مذہب کے خلاف نہیں۔

---

[1] مشہور قول کے مطابق یہ صحابی عباد بن بشر رضی اللہ عنہ ہیں شروح بخاری میں دوسرے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔

اشکال: فقہاء نے نماز میں تعلیم وتعلم کو مفسداتِ صلوٰۃ میں شمار کیا ہے اوراس پر بہت سے مسائل کی تفریع کی ہے حالانکہ حدیث باب سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے؟

جواب: تعلیم اور تعلم اس وقت نماز کو فاسد کریگا جبکہ نمازی اس شخص کے لقمہ اور تعلیم کو فوراً قبول کرلے۔ اگر نمازی اس شخص کی تعلیم کے بعد غور کرے اوراس کی رائے اور سمجھ میں یہی صحیح ہو پھراس نے اپنی رائے پر عمل کیا تو یہ نماز کو فاسد نہیں کریگا۔ یہاں پر بھی اسی طرح ہوا کہ صحابہ نے دورانِ صلوٰۃ مخبر کی خبر دینے کے بعد اپنے علم اور رائے پر عمل کیا۔

یہاں یہ بات جاننی چاہیئے کہ یہاں پر اس مسئلہ میں ایک اور شرط بھی ہے جو علماء ذکر نہیں کرتے وہ یہ ہے کہ یہ تلقین کرنے والا شخص نماز پڑھنے والے کی نماز سے باہر نہ ہو بایں طور کہ دونوں کسی امام کے پیچھے ہیں یا ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو اگر دونوں کی نمازوں میں شرکت نہ ہو تو نماز فاسد ہو جائیگی ورنہ نماز فاسد نہ ہوگی۔ اس طرح ان تمام روایات کا معنی واضح ہو جاتا ہے جن میں تعلیم وتعلم پایا جاتا ہے جیسا کہ تتبع اور تلاش سے ظاہر ہوگا۔

حدیثِ باب والے واقعہ سے ایک اور مسئلہ کا استنباط: صحابہ کرام اپنی نماز میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے تھے اور اس واقعہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز کے اعادہ کا بھی حکم نہیں دیا اس سے فقہاء نے یہ حکم نکالا ہے کہ ایک شخص پر قبلہ مشتبہ ہو گیا ہو اور وہ تحری کرنے کے بعد غیر قبلہ کی طرف نماز کا کچھ حصہ پڑھ لے پھر کوئی شخص اس کو قبلہ کے بارے میں بتائے تو وہ نماز ہی میں قبلہ کی طرف پھر جائے تو اس صورت میں اس پر نماز کا اعادہ واجب نہیں کیونکہ اس واقعہ میں مسجد (بنی عبدالاشہل) کے نمازیوں کو عصر میں دوران صلوٰۃ قبلہ کا منسوخ ہونا معلوم ہوا تھا حالانکہ قبلہ تو اس سے پہلے منسوخ ہو چکا تھا اور یہ صحابہ کرام اپنی نماز کے اول حصہ میں غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے۔

(عن ابن عمر رضی اللہ عنهما قال كانوا ركوعاً فی صلوٰۃ الصبح) یہ ایک الگ واقعہ ہے ایک واقعہ مسجد قبا والوں کے ساتھ پیش آیا تھا اور دوسرا واقعہ مسجد بنی عبدالاشہل والے عصر کی نماز کے رکوع میں تھے جب انہیں اس کی خبر دی گئی اور مسجد قبا والوں کو فجر کی نماز میں قبلہ کی طرف تحویل کا علم ہوا تو وہ نماز فجر میں کعبہ کی طرف مڑ گئے تھے۔

باب ماجاء انَّ بين المَشْرِقِ والمغرِب قِبلةٌ

باب مشرق اور مغرب کے درمیان (جنوب میں) قبلہ ہے

☆حدثنا محمد بن ابی مَعْشَرٍ حَدَّثَنَا اَبِی عن محمد بن عَمْرٍو عن ابی سَلَمَةَ عن ابی هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم : مَابَيْنَ المشرقِ والمغربِ قِبْلَةٌ۔

☆حدثنا يحيى بن موسى حَدَّثَنَا محمد بن ابى مَعْشَرٍ: مثلَه۔

قال ابو عيسى: حديثُ ابى هريرة قد رُوِىَ عنه من غير هذا الوجهِ۔ وقد تكلم بعضُ اهل العلم فى ابى معشرٍ من قِبَلِ حفظهٖ، واسمه نَجِيحٌ، مولَى بَنِى هاشمٍ۔ قال محمدٌ: لاأَرْوِى عنه شيئاً، وقد رَوَى عنه الناسُ۔

قال محمدٌ: وحديث عبد الله بن جعفر المَخْرَمِىِّ عن عثمانَ بن محمدٍ الاَخْنَسِىِّ عن سعيدٍ المَقْبُرِى عن ابى هريرةَ: اَقْوَى من حديث ابى معشرٍ واصحُّ۔

☆حدثنا الحسنُ بن ابى بكرٍ المَرْوَزِىُّ حَدَّثَنَا المُعَلّٰى بن منصورٍ حَدَّثَنَا عبد الله بن جعفرٍ المَخْرَمِىُّ عن عثمانَ بن محمدٍ الاَخْنَسِىِّ عن سعيدٍ المَقْبُرِىِّ عن ابى هريرةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم قال: مابَيْنَ المشرقِ والمغربِ قِبْلَةٌ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔وانّما قيل عبد الله بن جعفر المَخْرَمِىُّ لانه مِن ولد المِسْوَرِ بن مَخْرَمَةَ۔

وقد رُوِىَ عن غير واحدٍ من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم: مابين المشرق والمغرب قِبْلَةٌ منهم عمرُ بن الخطابِ، وعلىُّ بن ابى طالبٍ، وابنُ عباسٍ۔

وقال ابنُ عمرَ: اذا جَعَلْتَ المغربَ عن يمينِكَ والمشرقَ عن يسارِكَ فَمَا بينهما قِبْلَةٌ، اذا استقبَلْتَ القبلةَ۔وقال ابنُ المباركِ، مابين المشرقِ والمغربِ قِبْلَةٌ:هذالِاَهْلِ المشرقِ۔ واختارَ عبدُ اللهِ بن المباركِ التَّيَاسُرَ لاهلِ مَروٍ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔

ہم سے روایت کی یحیٰی بن موسیٰ نے انہوں نے محمد بن ابومعشر سے اوپر کی روایت کے مثل۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کئی سندوں سے مروی ہے اور بعض علماء نے ابومعشر کے حافظے کے بارے میں کلام کیا ہے ان کا نام نجیح مولیٰ بنی ہاشم ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ

نے کہا میں ان سے کوئی روایت نہیں کرتا جبکہ کچھ حضرات ان سے روایت کرتے ہیں۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے کہا عبداللہ بن جعفر مخرمی عثمان بن محمد اخنثی سے جو روایت کرتے ہیں "عن سعید مقبری عن ابی هریرہ "وہ روایت ابو معشر کی حدیث سے زیادہ قوی اور اصح ہے (یہ روایت متصلاً اگلی سند میں ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔

عبداللہ بن جعفر کو مخرمی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مسور بن مخرمہ صحابی کی اولاد سے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ان میں سے عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر مغرب تمہارے دائیں جانب اور مشرق بائیں جانب ہو تو اگر تم قبلہ کی طرف منہ کرو تو ان دونوں کے درمیان میں قبلہ ہے۔ابن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ کا حکم اہلِ مشرق کیلئے ہے انکے نزدیک اہل مرو (ایک شہر کا نام) کو بائیں طرف مڑنا چاہیئے۔

﴿تشریح﴾

حدیث شریف کا یہ حکم یا تو اہل مدینہ کے ساتھ خاص ہے تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان اہل مدینہ کے لئے جنوبی قبلہ ہے۔

حدیثِ باب کا مقصد:

۱) اب اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص یہ وہم نہ کرے کہ عین قبلہ کی طرف رخ کرنا فرض ہے بلکہ جہتِ قبلہ کی طرف رخ کرنا کافی ہے جیسا کہ فقہاء کہتے ہیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ بیان فرمایا کہ یہ جہت پوری کی پوری تمہارے لئے قبلہ ہے اس میں سے کسی طرف بھی رخ کر لینا تمہارے لئے کافی ہے۔عینِ قبلہ کا رخ تو اس کیلئے ضروری ہے جو قبلہ کو دیکھ رہا ہو۔

۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان اسی دنیا میں موجود ہے اس سے خارج نہیں ہے لہٰذا ہر جگہ کے رہنے والوں پر اپنے قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے۔ پس اہل مشرق کا قبلہ مغرب ہے اور اہل مغرب کا مشرق اور اہل جنوب کا قبلہ شمال ہے اور اہل شمال کا قبلہ جنوب ہے لیکن اس دوسری توجیہ میں زیادہ فائدہ نہیں

ہے[1]۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی تشریح: (قال ابن عمر رضی الله عنهما اذا جعلت المغرب عن يمينك) ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ حدیث سے یہ وہم پیدا ہوسکتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان کھڑے ہوکر اگر کوئی آدمی اپنی پیٹھ قبلہ کی طرف کرلے تو اس نے بھی قبلہ کا استقبال کرلیا ہے (کیونکہ حدیث میں عام فرمایا گیا ہے "ما بین المشرق و المغرب قبلة" یہ نہیں فرمایا کہ اہل مدینہ جنوب کی طرف منہ کریں بلکہ چاہے جنوب کی طرف منہ ہو یا پیٹھ دونوں صورتوں میں "ما بين المشرق و المغرب" صادق آرہا ہے۔ازمترجم) اسلئے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کی تشریح فرمائی ہے "ما بين المشرق و المغرب" کا مطلب یہ ہے کہ مغرب تمہارے دائیں طرف ہو اور مشرق بائیں طرف اب تم جس طرف منہ کروگے تو وہ جہت تمہارا قبلہ ہے (لہٰذا استدبار قبلہ کی صورت اس سے خارج ہوگئی۔ازمترجم)۔

---

[1] اس حدیث میں دوسری بہت سی توجیہات ہیں جن کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

بین المشرق والمغرب قبلۃ کی چھ توجیہات: از اوجز المسالک: (ازمترجم: اوجز المسالک میں باب ماجاء فی القبلۃ کے تحت مذکورہ بالا حدیث باب بھی موجود ہے۔ اس کی شرح میں مختلف اقوال ہیں:

۱۔ اس سے مراد خاص اہل مدینہ کا قبلہ ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی شرح یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں تو عین قبلہ کا استقبال ضروری ہے جبکہ نمازی بیت اللہ کے سامنے ہو اور اس حدیث میں مکہ مکرمہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں قبلہ کا بیان ہے کہ بیت اللہ کی جہت ان کیلئے قبلہ ہے جس کو حدیث میں مابین المشرق والمغرب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ امام زیلعی نے اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا کہ مشرق مغرب سے مراد پوری زمین ہے یعنی ساری زمین میں نماز پڑھنا صحیح ہے۔

۴۔ امام شافعی نے اس حدیث کی یہ تشریح کی ہے کہ یہاں مراد ما بین المشرق والمغرب سے مشرق شتوی اور مغرب صیفی کے درمیان میں قبلہ ہے۔ وہ اس طرح کہ مشرق شتوی جنوبی ہوتا ہے جو کہ خط استواء سے ایک میل کے بقدر دور ہوتا ہے اور مغرب صیفی شمالی ہوتا ہے یہ بھی خط استواء سے ایک میل کے بقدر دور ہوتا ہے تو ان دونوں کے درمیان مکہ مکرمہ کی سمت ہے۔

۵۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس مسافر پر قبلہ مشتبہ ہوجائے تو وہ تحری کرکے بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے۔

۶۔ اس حدیث سے مراد سفر میں نفل پڑھنے والا نمازی ہے جب یہ نمازی نماز شروع کرتے ہوئے بیت اللہ کی طرف رخ کرے تو اب وہ اپنی سواری پر جدھر چاہے رخ کرکے نماز نفل پڑھ سکتا ہے۔ انتہی

(قال عبدالله بن المبارك هذا لاهل امشرق واختار التياسر لاهل المرو).................[۱]

باب ماجاء فی الرجل یصلّی لغیرِ القبلةِ فی الغَیْمِ

باب جوشخص ابراور بادل کی وجہ سے قبلہ کی طرف رخ کئے بغیر نماز پڑھ لے

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیعٌ حَدَّثَنَا اَشعَثُ بن سعیدِ السَّمَّانُ عن عاصم بن عبید اللّٰه عن عبد اللّٰه بن عامرِ بن ربیعةَ عن ابیهِ قال: کُنَّا مع النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی سَفَرٍ فی

---

[۱] اصل مخطوطہ میں یہاں بیاض ہے بظاہر حضرت گنگوہی، ابن مبارک رحمہما اللہ کے کلام کی توجیہ فرمانا چاہ رہے ہیں کیونکہ ان کے کلام کے ظاہری معنی میں اشکال ہے اس لئے کہ ان کے قول کے مطابق اہل مشرق کا قبلہ تو جنوبی ہے حالانکہ نفس الامر اور واقع میں اہل مشرق کا قبلہ مغرب ہے نہ کہ مابین المشرق والمغرب۔

ابن مبارک رحمہ اللہ کے کلام کی توجیہ: اہل مشرق سے مراد تمام اہل مشرق نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد اہل بخاری، سمرقند، بلخ وغیرہ کے رہنے والے ہیں ان کا قبلہ مغرب الصیف اور مشرق الشتاء کے درمیان ہے کیونکہ یہ شہر مشرق الصیف میں ہے اس طرح ابن مبارک رحمہ اللہ کا قول "واختار التیاسر لاهل مرو" کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کیونکہ مرو بلخ کے مغرب میں واقع ہے۔ قال المظہر اہل مشرق میں سے جو شخص مغرب الصیف کو اپنے دائیں طرف کرے اور مشرق الشتاء کو اپنے بائیں طرف کرے تو اس کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائیگا لہٰذا اہل مشرق سے مراد یہاں پر اہل کوفہ وخورستان، فارس، اور عراق وغیرہ کے علاقے ہیں ان کا نقشہ اس طرح ہے۔
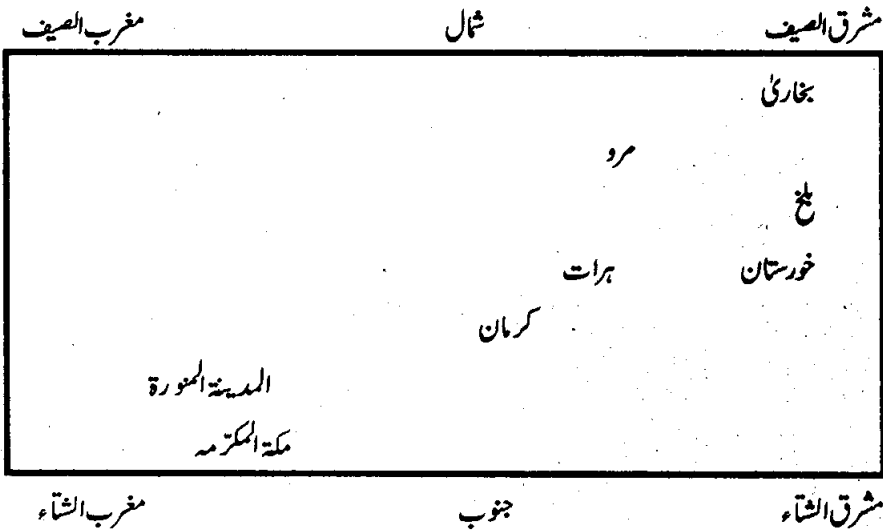
مغرب الصیف	شمال	مشرق الصیف
		بخاریٰ
	مرو	
		بلخ
	ہرات	خورستان
	کرمان	
المدینۃ المنورۃ		
مکۃ المکرمہ		
مغرب الشتاء	جنوب	مشرق الشتاء

لیلۃٍ مُظْلِمَۃٍ، فَلَمْ نَدْرِ اینَ القِبلۃُ، فصلّٰی کُلُّ رجلٍ مِنّا علی حِیَالِہٖ، فلمّا اَصْبَحْنا ذکرنا ذلك للنبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فنزلَ: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ۔

قال ابو عیسی: ھذا حدیث لیس اسنادُہٗ بذاك، لانعرفہ اِلّا من حدیث اَشْعَثَ السَّمَّانِ۔

واَشْعَثُ بن سعیدٍ ابو الرَّبیعِ السَّمّانُ یُضَعَّفُ فی الحدیث۔

وقد ذھب اکثر اھل العلم الی ھذا۔ قالوا: اذا صلّٰی فی الغیم لغیر القِبلۃِ ثم استبان لہ بعدَ ماصلّٰی انہ صلّٰی لغیر القبلۃفاِن صلا تَہ جائزۃٌ۔

وبہ یقولُ سفیانُ الثوریُّ وابنُ المبارکِ، واحمدُ، واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اندھیری رات میں سفر میں تھے اور قبلہ ہمیں معلوم نہ تھا پس ہر شخص نے اپنے سامنے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ"، تم جس طرف بھی منہ کرو اسی طرف اللہ کا چہرہ ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کی سند قوی نہیں ہم اس حدیث کو صرف اشعث ثمان کی روایت سے جانتے ہیں اور اشعث بن سعید ابوالربیع ثمان کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے اکثر اہل علم کا یہی مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص بادل کی وجہ سے قبلہ کی طرف منہ کیئے بغیر نماز پڑھ لے پھر نماز پڑھنے کے بعد اس پر ظاہر ہوا کہ اس نے قبلہ رخ کے علاوہ نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز درست ہے (جبکہ اس نے تحری کر کے نماز شروع کی ہو) اور سفیان ثوری، ابن مبارک، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب کی مختلف توجیہات: (فَصَلّٰی کُلُّ رَجُلٍ مِنَّا عَلَی حَیَالِہٖ) یہ حکم نوافل اور تہجد کی نماز کیلئے ہے کیونکہ صحابہ کرام فرض نماز تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کر چکے تھے یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ عذر کی وجہ سے صحابہ نے اپنی اپنی جگہوں پر فرض نماز ادا کی ہے جس طرف بھی قبلہ رخ ہو گئے لیکن یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ فرض نماز اس قدر

آسان فریضہ نہیں ہے کہ اس میں اپنی رائے پر اکتفاء کیا جائے اور صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھیں نیز صحابہ کرام سفر میں جب کسی مسجد میں پڑاؤ ڈالتے تھے تو ساتھ ہی ایک جگہ جمع ہوتے تھے تو صحابہ کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس قدر فاصلہ نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا مشکل نہ ہو۔ یہاں پر یہ بات ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے آتے اس میں وقت نکلنے کا اندیشہ ہوتا تو یہ احتمال بھی صحیح نہیں کیونکہ عشاء کی نماز کا وقت بہت کشادہ ہوتا ہے۔

حدیث مبارکہ سے تحری کے مسئلہ کا ثبوت: بہرحال حدیث پاک سے تحری کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے اور جو شخص کسی ظالم بادشاہ سے خائف ہو کر بھاگے یا معذور ہو تو جس طرف اس کی قدرت ہو تو تحری کرنے کے بعد اپنی رائے کے مطابق وہ نماز میں رخ کر سکتا ہے۔ آیت[1] مبارکہ "اینما تولوا فثم وجه الله" میں انہی افراد کا بیان ہوا ہے اگر یہ آیت نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة مایُصَلّٰی الیه وفیه

باب اس چیز کے متعلق جس کی طرف یا جس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا المُقْرِئُ حدثنایحیی بن ایوبَ عن زید بن جَبِیرَةَ عن داودَ بن الحُصَیْنِ عن نافعٍ عن ابن عمرَ: اَنَّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم نَهٰی ان یُصَلّٰی فی سبعةِ مَوَاطِنَ: فی المَزْبَلَةِ، والمَجْزَرَةِ، والمَقْبَرَةِ، وقارِعَةِ الطَّرِیقِ، وفی الحمامِ، وفی مَعَاطِنِ الإبِلِ، وفوقَ ظَهْرِ بیتِ اللّٰہ۔

☆حدثنا علیُّ بن حُجْرٍ نا سُوَیْدُ بن عبد العزیز عن زید بن جَبِیرَةَ عن داودَ بن حُصَیْنٍ عن نافعٍ عن ابن عمرعن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: نحوَهٗ بمعناه۔

قال: وفی الباب عن ابی مَرْثَدٍ، وجابرٍ، وانسٍ۔ ابو مَرْثَدٍ:اسمُه کَنَّازُ بن حُصَیْنٍ۔

---

[1] **اینما تولوا فثم وجه الله کے شانِ نزول میں اقوال اربعہ:** اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ ایک قول کے مطابق یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب یہود نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے پر اعتراض کیا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت نجاشی کے متعلق نازل ہوئی۔ تیسرا قول یہ آیت سفر میں نفل نماز سے متعلق ہے۔ انتہی۔ یہ سارے قول ضعیف ہیں۔ اصح قول یہ ہے کہ آیت مسجد اقصی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ قلت: اس میں دوسرے بہت سے اقوال بھی ہیں جو کہ اپنے مقام پر موجود ہیں۔

قال ابو عیسی: وحدیث ابن عمرَ اسنادُه لیس بذاك القویِّ، وقد تُکُلِّمَ فی زید بن جَبیرَة من قِبَل حفظه۔ (قال ابو عیسی: وزید بن جُبَیْرِ الکوفیُّ اثبتُ من هذا وقدمُ، وقد سمعَ من ابنِ عمر)۔ وقد رَوَی اللَّیثُ بن سعدٍ هذا الحَدِیث عن عَبد اللّٰه بن عمرَ العُمَرِیِّ عن نافع عن ابن عمرَ عن عمرَ عَنِ النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم: مثلَه۔

وحدیث داودَ عن نافعٍ عن ابن عمرَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم اشبهُ واصحُّ من حدیثِ اللیثِ بن سعدٍ۔ وعبدُ اللّٰهِ بن عمرَ العُمَرِیُّ ضعَّفه بعضُ اهل الحدیثِ من قِبَل حفظه، منهم یحیی بن سعیدِ القَطّانُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا: گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں، مذبح خانے میں، قبرستان میں، راستے کے بیچ میں، حمام میں، اونٹ باندھنے کی جگہ میں اور بیت اللہ کی چھت پر۔ ہم سے روایت کی علی بن حجر نے، انہوں نے سوید بن عبدالعزیز سے اور انہوں نے زید بن جبیرہ سے انہوں نے داؤد بن حصین سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل اور ہم معنی۔

اس باب میں ابومرثد، جابر اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند قوی نہیں۔ زید بن جبیرہ کے حفظ میں کلام ہے۔ لیث بن سعد بھی اس حدیث کو عبداللہ بن عمر العمری سے روایت کرتے ہیں۔ وہ نافع سے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ عمر رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے مثل روایت کرتے ہیں۔ (تو لیث کی سند میں یہ حدیث مسنداتِ عمر بن الخطاب میں ہوئی)۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث لیث بن سعد کی حدیث سے اشبہ ہے اور اصح ہے۔ محدثین عبداللہ بن عمر العمری کو حافظہ کی بنا پر ضعیف کہتے ہیں جن میں یحییٰ بن سعید قطان بھی شامل ہیں (لہٰذا لیث کی سند میں چونکہ عبداللہ بن عمر العمری راوی ضعیف ہے اس لئے اس روایت کا مسندات عمر رضی اللہ عنہ میں ہونا غلط ہوا)۔

﴿تشریح﴾

حدیث پر مذکور مقامات پر نماز پڑھنے کی ممانعت کی علتیں: (فی المزبلة والمجزرة) (۱) ان دونوں مقامات میں گندگی آلودگی اور خون ہونے کی وجہ سے نماز منع ہے۔ (۲) ''والمقبرۃ'' اس میں علت تشبہ بالیہود ہے اور تشبہ بعبادۃ غیر اللہ بھی اور ممکن ہے کہ کوئی درندہ میت کی لاش کو قبر سے نکال دے تو اس جگہ کے ناپاک اور گندے ہونے کا امکان بھی ہے۔ (۳) ''قارعۃ الطریق'' اس سے مراد وہ راستہ ہے جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہے وہاں پر نماز پڑھنے میں یہ شخص لوگوں کو تکلیف پہنچائے گا تو ایذائے مسلم حرام ہے لہٰذا ایذاء کی وجہ سے نماز پڑھنا حرام ہے یا لوگ اس کو تکلیف پہنچائیں گے۔ بایں طور ممکن ہے کہ کوئی چیز اس سے ٹکرا جائے اور نمازی گر پڑے تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی یا لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے اس کے خشوع وخضوع اور نماز میں دھیان میں کمی واقع ہو جائیگی۔ (۴) ''وفی الحمام'' اس کی ایک علت تو گندگی ہے دوسری علت تصاویر ہوتی ہیں نیز کشف عورت پایا جاتا ہے۔ اگر حمام میں یا قبرستان میں کوئی صاف اور پاک جگہ ہو[1] تو اس میں نماز بلا کراہت جائز ہے۔

(۵) ''معاطن الابل'' اس میں کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ کے اندر[2] خبث باطنی اور شرارت[3] پائی جاتی ہے نیز اگر یہ کسی انسان سے نماز میں تعرض کرے تو اپنا طویل الجثہ ہونے کی وجہ سے انسان اس کو برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا نماز یا تو بالکلیہ فاسد ہو جائیگی یا خشوع اور خضوع ختم ہو جائیگا۔

(۶) (وفوق ظهر بيت الله) اس میں علت ترک تعظیم (بے ادبی) ہے۔ ''وكذالك المسجد'' یعنی تمام مسجدوں کا حکم[4] بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس کی چھت پر نماز پڑھنا بے ادبی سے خالی نہیں۔

---

[1] لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ اس جگہ پر نہ کوئی قبر ہو نہ گندگی ہو اور نہ جانب قبلہ میں کوئی قبر پائی جائے جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہو رہا ہے اور علامہ شامی اور دیگر فقہاء نے ان قیود کو ذکر کیا ہے۔

[2] یہاں پر مونث ضمیر آنی چاہیئے اگر چہ مذکر ضمیر کی بھی تاویل ہو سکتی ہے۔ شاید حضرت نے مذکر ضمیر اس لئے ذکر کی کہ مونث ضمیر لانے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس کا مرجع معاطن ہے حالانکہ مقصود اونٹ کے متعلق بتلانا ہے۔

[3] لفظ شر خیر کی ضد ہے اس کی جمع شرور آتی ہے۔ شرّ یشرّ باب ضرب یضرب سے شرًا و شرارۃً مصدر آتا ہے اور شررت یا رجل کے معنی شریر ہونا ہے۔

[4] علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مسجد کی چھت پر چڑھنا مکروہ نہیں ہے البتہ کعبہ شریف کی چھت پر چڑھنا بغیر عذر کے مکروہ ہے کیونکہ علماء نے کعبہ کی چھت پر نماز کو مکروہ کہا ہے۔ پھر میں نے قہستانی میں یہ بات دیکھی کہ مسجد کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا بھی مکروہ ہے۔

بیت اللہ کے اوپر اور اندر نماز پڑھنے میں علماء کے اقوال ثلاثہ: یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ بیت اللہ کے اوپر اور اس کے اندر نماز پڑھنے سے متعلق علماء کے تین قول[1] ہیں: (۱)۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بیت اللہ کے اوپر اور اندر فرض اور نفل سب نمازوں کو جائز کہتے ہیں اگر چہ بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنا ایک قسم کی بے ادبی سے خالی نہیں۔ (۲) امام شافعی رحمہ اللہ نے فرض اور نفل دونوں کو دونوں جگہوں پر منع کیا ہے۔ یہ ہمارے فقہاء[2] نے شوافع کی طرف نسبت کی ہے حالانکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا صحیح مذہب حنفیہ کی طرح ہے کہ دونوں جگہوں میں فرض ونفل سب جائز ہیں۔ (۳) امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں صرف نفل نماز جائز ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہے فرض پڑھنے کا ثبوت نہیں۔

حدیث مسندات ابن عمرؓ میں سے ہے نہ کہ مسنداتِ عمرؓ میں: (وحدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما اصح واشبہ من حدیث لیث بن سعد) یعنی یہ حدیث، ابن عمر رضی اللہ عنہما کے مسندات میں سے ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واسطہ صحیح نہیں ہے اور لیث راوی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو ذکر کر کے غلطی[3] کی ہے۔ (از مترجم: ہمارے ترمذی کے نسخے میں شاید غلطی ہوئی ہے کیونکہ یہاں پر لیث کی روایت میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واسطہ مذکور ہے۔ حالانکہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ لیث کی روایت میں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مسندات میں سے ہے۔ فلیفتش)

---

[1] علامہ عینی رحمہ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوٰۃ فی الکعبہ والی حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ابن جریر طبری کے خلاف حجت ہے جن کے نزدیک کعبہ میں فرض اور نفل مطلقاً ناجائز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں کعبہ میں فرض نماز، طواف کی دو واجب رکعتیں نہیں پڑھیگا اگر کسی نے پڑھ لیں تو وقت کے اندر اعادہ کریگا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں کعبہ کے اندر فرض اور نفل سب نمازیں جائز ہیں۔ انتہی

[2] صاحب ہدایہ وغیرہ نے یہ نسبت کی ہے جبکہ ہدایہ کے شارحین نے شوافع سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کعبہ میں فرض ونفل سب نمازیں جائز ہیں۔

[3] **امام ترمذیؒ کے نزدیک حدیث کا ابن عمرؓ کی مسندات میں سے ہونا راجح ہے:** آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ امام ترمذی پہلے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بھی تضعیف کر چکے ہیں اب حدیث عمر کی تضعیف کر رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ دونوں ہی حدیثیں ضعیف ہیں لیکن اس حدیث کا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مسندات میں سے ہونا کم درجہ کا ضعیف ہے۔ حافظؒ درایہ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ نیز یہ روایت عن ابن عمر عن عمر کی سند سے بھی مروی ہے۔ لیکن پہلی روایت مسند ابن عمر والی زیادہ صحیح ہے۔ ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ دونوں سندیں بالکل ضعیف ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث کا مسند ابن عمرؓ میں ہونا راجح ہے لہٰذا شوکانی نے انکے کلام کی جو تاویل کی ہے وہ ان کے سیاق وسباق کے خلاف ہے۔

باب ماجاء فِی الصلاۃِ فی مَرَابِضِ الغنَمِ وَاعْطَانِ الاِبِلِ

باب بکریوں اور اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا بیان

☆حدثنا ابو کُرَیْبٍ حَدَّثَنَا یحیی بن آدمَ عن ابی بکر بن عَیَّاشٍ عن هشامٍ عن ابن سِیرینَ عن ابی هریرة قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: صَلُّوا فی مَرَابِضِ الغَنَمِ، ولا تُصَلُّوا فی اَعْطَانِ الإبِلِ۔

☆حدثنا ابو کریب اخبرنا یحییٰ بن آدم عن ابی بکر بن عیاش عن ابی حَصِینٍ عن ابی صالحٍ عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: بمثله او بنحوه۔

قال: وفی الباب عن جابر بن سَمُرَةَ، والبَرَاءِ، وسَبْرَةَ، بن مَعْبَدِ الجُهَنیِّ، وعبد اللّٰه بن مُغَفَّلٍ، وابن عمرَ، وانسٍ۔قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیح۔ وعلیهِ العملُ عند اصحابنا، وبه یقولُ احمدُ واسحٰقُ۔ وحدیث ابی حَصِینَ عن ابی صالحٍ عن ابی هریرةَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم حدیث غریب۔

ورواهُ اسرائیلُ عن ابی حَصِینٍ عن ابی صالحٍ عن ابی هریرةَ موقُوفاً ولم یَرْفعهُ۔

واسم ابی حَصِینٍ عثمانُ بن عاصمٍ الأَسَدِیُّ۔

☆حدثنا محمدُ بن بشَّارٍ حَدَّثَنَا یحیی بن سعیدٍ عن شُعْبَةَ عن ابی التَّیَّاحِ الضُّبَعِیِّ عن انس بن مالكٍ: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم کان یُصَلِّی فِی مَرَابِضِ الغَنَمِ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیثٌ حسن صحیحٌ۔ وابو التَّیَّاحِ الضُّبَعِیُّ اسمه یزیدُ بن حُمَیْدٍ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیا کرو اور اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں نماز مت پڑھا کرو۔

روایت کی ہم سے ابو کریب نے انہوں نے یحییٰ بن آدم سے انہوں نے ابو بکر بن عیاش سے انہوں نے ابو حصین سے انہوں نے ابو صالح سے انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل۔

اس باب میں جابر بن سمرہ، براء، سبرہ بن معبد جہنی، عبداللہ بن مغفل، ابن عمر اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی

روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور ہمارے اصحاب کا اسی پر عمل ہے۔ امام احمد و اسحٰق رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابو حصین کی ابو صالح سے بواسطہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث غریب ہے اور اسے اسرائیل نے ابو حصین سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کیا ہے نہ کہ مرفوع اور ابو حصین کا نام عثمان بن عاصم اسدی ہے۔

روایت کیا ہم سے محمد بن بشار نے انہوں نے یحیٰی بن سعید سے انہوں نے شعبہ سے انہوں نے ابو التیاح ضبعی سے انہوں نے انس رضی اللہ عنہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے اور ابو التیاح کا نام یزید بن حمید ہے۔

﴿تشریح﴾

مرابض الغنم اور اعطان الابل میں نماز کے حکم میں فرق کی وجہ: (صلوا فی مرابض الغنم ولا تصلوا فی اعطان الابل) اس فرق کی وجہ ظاہر ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کی کہ اونٹ کے اندر خباثت ہوتی ہے اور وہ بڑی جسامت والا ہے۔ پس اگر یہ اونٹ پیشاب کردے تو نمازی کا چہرہ مکمل ناپاک ہو جائیگا۔ لہٰذا اگر نمازی اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ اس طرح نماز پڑھے کہ اس کو بالکل اطمینان قلبی حاصل ہو جائے تو نماز بلا کراہت جائز ہوگی۔ مثلاً اونٹ کو باندھ لے یا یہ شخص کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔

اس کے برعکس حدیث باب میں بکریوں کے باڑے میں نماز منع نہیں ہے کیونکہ اگر یہ بکریاں نمازی سے تعرض کریں گی تو ان کی وجہ سے نماز پڑھنے والا اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا اور اگر بکری پیشاب کردے گی تو وہ زمین کی طرف[1] چلا جائیگا۔ اور اگر زمین میں جذب نہ بھی ہو تب بھی اس کے قد و قامت[2] کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے اتنا نقصان نہیں ہوگا۔ بہر حال یہاں پر نماز پڑھنے کی ممانعت نجاست کی وجہ سے نہیں کیونکہ اگر یہ نجاست علت ہوتی تو اونٹ اور بکری دونوں کا حکم ایک ہی ہوتا اور دونوں جگہوں پر نماز پڑھنا ممنوع ہوتا۔

---

[1] بخلاف اونٹ کے کہ اس کا پیشاب پیچھے سے دور تک دھار کی شکل میں جاتا ہے۔

[2] کیونکہ بکری کے پیشاب میں زیادہ چھینٹیں نہیں پڑتیں بوجہ اس کے زمین کے قریب ہونے کے۔

باب ماجاء فی الصلاةِ علی الدَّابَّةِ حیثُ ماتوَجَّهتْ به

باب سواری (جانور کی پیٹھ) پر نماز پڑھنا خواہ اس کا رخ جدھر بھی ہو

☆حدثنا محمودُ بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیعٌ ویحیی بن آدمَ قالا: حَدَّثَنَا سفیانُ عن ابی الزُّبَیْرِ عن جابرٍ قال: بَعَثَنی النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی حاجةٍ، فَجِئْتُ وهُوَ یصلّی علی راحلته نَحْوَ المشرقِ، والسجودُ اَخْفَضُ من الرکوعِ۔ قال: وفی البابِ عن انسٍ، وابن، عمرَ، وابی سَعیدٍ، وعامر بن رَبیعَةَ۔

قال ابو عیسی: حدیثُ جابرٍ حدیث حسن صحیح۔ وقد رُوی هذا الحدیثُ من غیر وجهٍ عن جابرٍ۔ والعملُ علی هذا عندَ عامّةاهل العلم، لانعلُم بینهم اختلافاً: لایَرَوْنَ بأساً ان یصلِّیَ الرجلُ علی راحلته تَطَوُّعاً حیثُ ماکان وجهُه، الی القبلة او غیرِه۔

﴿ترجمه﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی ضرورت سے بھیجا جب میں آپ کے پاس لوٹا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کا رخ مشرق کی سمت تھا اور سجدہ کا اشارہ رکوع سے زیادہ جھکتا ہوا فرما رہے تھے۔

اس باب میں انس، ابن عمر، ابوسعید اور عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ متعدد طرق سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی پر تمام اہل علم کا عمل ہے، ہمیں ان کے درمیان اختلاف کا علم نہیں اور ان کی رائے ہے کہ نفل نماز سواری پر پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں خواہ قبلہ رخ ہو یا نہ ہو۔

﴿تشریح﴾

سواری پر نفل نماز کے جواز کی علت: سواری کے جانور کے اوپر نفل نماز اس لئے جائز ہے کہ اگر نوافل سواری کے جانور پر پڑھنے سے روک دیا جائے تو اس میں حرج لازم آئیگا بخلاف فرض نمازوں کے کہ اس میں حرج نہیں ہے کیونکہ دن رات میں فرائض زیادہ نہیں ہے جبکہ نفل نمازیں بہت زیادہ ہیں۔ نیز فرض نماز میں زیادہ اہتمام شان کیا جاتا ہے نوافل میں یہ بات نہیں۔

سواری پر نماز کے جواز میں ایک اشکال اور اسکا جواب: اب سواری میں سجدہ نہ ہونے کا اشکال جو پیدا ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سر کو جھکا لینا یہ سجدہ سے مقصود[1] ہے لہٰذا اشارہ سے سر کو جھکا لینا سجدہ کے قائم مقام ہو جائیگا چہرے کو زمین پر رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اسی دابہ (سواری کے جانور) کے حکم میں وہ گاڑی بھی ہے جس کو جانور اپنے اوپر اٹھایا ہوا ہو۔ جس گاڑی کو جانور کھینچ رہا ہے وہ دابہ کے حکم میں نہیں ہے[2] لہٰذا ہماری معتاد سواریوں میں سے دو پہیوں والی سواری کے جانور پر نفل پڑھنا جائز ہے یعنی وہ بیل گاڑی، گدھا گاڑی جس کا پھٹہ اس کے ساتھ

---

[1] یعنی سواری میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں قیام کا نائب تو قعود ہے اسی طرح رکوع بھی بلا تکلف ادا ہو جاتا ہے اب سجدے کی ضرورت باقی رہ گئی تو اس میں جھکنا کافی ہے۔

[2] **مختلف فیہ مسئلہ:** اس مسئلہ میں اختلاف ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ جو فرق نقل کیا ہے کہ جانور جس سامان لادنے کی گاڑی کو اپنے اوپر اٹھائے اس پر تو نماز جائز ہے اور جس گاڑی کو کھینچے اس پر ناجائز۔ صاحبِ درمختار نے بھی اسی طرح تصریح کی ہے کہ حمولہ بار برداری کے جانور پر اشارہ سے نماز جائز ہے اور ایسی سواری جس کو جانور کھینچے اس پر اشارۃً نماز ناجائز ہے بلکہ رکوع، سجود و قیام شرط ہے، لیکن علامہ شامی نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ فارجع الیہما

سواری پر نماز پڑھنے کی بعض مختلف فیہا صورتیں صاحبِ الدر المختار اور علامہ شامی کے درمیان اختلاف کی وضاحت: (از مترجم: علامہ حصکفی فرماتے ہیں کہ عجلۃ (سامان لادنے کی گاڑی) اگر زمین پر ہو اور اس کا کوئی حصہ جانور کے اوپر نہ ہو تو اس عجلہ پر نماز پڑھنا اس کے ٹھہرے ہونے کی حالت میں جائز ہے کیونکہ اس عجلہ کی مثال سریر (چارپائی) کی طرح ہے جس طرح چارپائی پر نماز جائز ہے اس پر بھی فرض نماز جائز ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مصنف کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر عجلہ زمین پر ہو اور اس کا کوئی حصہ جانور پر نہ ہو بلکہ رسّی کے ذریعے جانور اس عجلہ کو کھینچ رہا ہو تو اس صورت میں اس پر فرض نماز جائز ہے کیونکہ اس کی مثال اس چارپائی کی طرح ہے جس کو زمین میں رکھا گیا ہے لیکن اس کلام پر اعتراض یہ ہے مصنف کے کلام کے مفہوم مخالف سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگر یہ عجلہ اس حالت میں چل رہا ہو تو اس پر بغیر عذر نماز پڑھنا صحیح نہیں تو اس عجلہ کا جانور کے ساتھ ملا ہوا ہونا بشرطیکہ جانور کھڑا ہو چل نہ رہا ہو تو جانور کے نہ چلنے کی شرط محل نظر ہے۔ (ملخصہ) تاتارخانیہ میں اس طرح ہے کہ اگر عجلہ پر نماز پڑھی اور اس کا ایک حصہ جانور پر ہے اور جانور چل رہا ہے تو حالتِ عذر میں اس عجلہ پر نماز جائز ہے اور اگر عجلہ کا کوئی حصہ جانور پر نہیں تو اس عجلہ پر مطلقاً نماز جائز ہے اور یہ صلوٰۃ علی السریر کی طرح ہے۔ الخ (فتاوی شامیہ: ص ۴۲: الجزء الثانی: ایچ ایم سعید)

از مترجم: خلاصہ کلام یہ ہوا کہ صاحبِ درمختار کے نزدیک اگر عجلہ کا کوئی حصہ جانور پر نہ ہو تو اس عجلہ کے ٹھہرے ہوئے ہونے کی صورت میں اس عجلہ (سامان لادنے کی سواری) پر نماز جائز ہے جبکہ علامہ شامیؒ کی تحقیق میں جب عجلہ کا کوئی حصہ جانور پر نہ ہو تو چاہے جانور چل رہا ہو یا رکا ہو دونوں صورتوں میں اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔

مضبوطی سے لگا ہوا گولائی میں۔ چار پہیوں[2] والی سواری پر اشارے سے نوافل جائز نہیں بلکہ اس میں کھڑے ہوکر رکوع اور سجود ضروری ہے کیونکہ پہلی گاڑی کو سواری اٹھائی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری گاڑی جانور کے کھینچنے کی وجہ سے چل رہی ہوتی ہے اس عموم کے اندر وہ تمام گاڑیاں داخل ہو جائیں گی جن کو گھوڑے، بھینس اور گائیں[3] کھینچتی ہیں اسی طرح وہ گاڑیاں بھی جو بغیر جانور کے کھینچی جاتی ہیں ان سب میں نماز کھڑے ہوکر رکوع سجود کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے اور ہمارے شہروں میں یہی سواریاں رائج ہیں۔

(والسجود اخفض من رکوعه) اور اپنے چہرے کو کسی چیز پر رکھنے کی ضرورت نہیں صرف جھکانا کافی ہے اگر کسی چیز کو اٹھائے اور اس پر اپنی پیشانی رکھے تو اس طرح کرنا بھی صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الصَّلَاۃِ اِلَی الرَّاحِلَۃ

باب ہے جانور کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا بیان

☆حدثنا سفیانُ بن وَکیعٌ حَدَّثَنَا ابو خالدِ الاَحْمَرُ عن عبیداللّٰه بن عُمرَ عن نافعٍ عن ابن عمرَ:اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم الی بعیرہ، او راحلتهِ، وکان یصلّی علی راحلتهِ حیثُ ماتَوَجَّهَتْ به۔قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیح۔

وهو قولُ بعض اهل العلم، لایَرَوْنَ بالصلاۃِ اِلَی البعیرِ باساً ان یَسْتَتِرَبهِ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اپنے اونٹ کی طرف یا اپنی سواری

---

[1] الحاتیہ: (باب نصر) تیز دوڑنا: بٹنا۔ص ۱۳۶ مصباح اللغات۔

[2] شاید یہ مطلب ہے کہ اس سواری میں اشارہ سے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سواری کے جانور اور بیل گاڑی پر سفر کی حالت میں (وہ گاڑی جس کو جانور اٹھایا ہوا ہو) اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ اس چار پہیوں والی گاڑی کی مثال اس تخت کی سی ہے جس کو کھینچا جا رہا ہے اور یہ کشتی کی طرح ہوگئی لہٰذا اس پر اشارے سے نماز صحیح نہیں ہے بلکہ اس چار پہیوں والی گاڑی پر رکوع سجدے کے ساتھ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر نماز پڑھے۔

[3] الابقار: بقرۃ کی جمع ہے۔اگرچہ قاموس میں بقرۃ کی جمع ابقار نہیں لکھی۔

کی طرف رخ فرمایااورآپ اپنی سواری پرنماز پڑھ لیا کرتے تھے خواہ اس کا رخ کسی بھی طرف ہو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور بعض اہل علم کا یہی قول ہے کہ اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اس طور پر کہ اس کو سترہ بنایا جائے۔

﴿تشریح﴾

اس حدیث سے اونٹوں کی جگہ نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے اور ممانعت معلول بالعلۃ ہے: (صلی الی بعیرہ او راحلتہ) یہ راوی کوشک ہے کہ کون سالفظ مجھ سے میرے استاذ نے فرمایا تھا یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا[1] کہ اونٹوں کی جگہ پر نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اونٹ کے کھڑے ہونے سے اور تکلیف پہنچانے سے مامون ہو۔ یہاں حدیث میں بعیر سے مراد سواری ہے کیونکہ اس کی اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوئی ہے اور یہ بات بدیہی ہے اس کے اوپر سامان نہیں لادا جاتا تھا اور نہ اس کو حاملہ کہتے اور نہ اس سے کام کاج لیا جاتا تھا کہ اس کو عاملہ اونٹ کہا جاتا اور نہ ہی اس سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا اور نہ ان کو سانیہ کہتے۔ اونٹ کی طرف (اونٹ کو سترہ بنا کر) نماز پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شرارت اور فتنہ سے حفاظت تھی کیونکہ بعض سواریوں میں بہت سی ایسی صفتیں ہوتی ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں لہٰذا اس پر اس صورت کو بھی قیاس کیا جائیگا جہاں جانور کی تکلیف سے انسان مامون ہو کیونکہ نہی کی علت موجود نہ ہونے[2] یا ہونے پر فعل کا مدار ہوتا ہے نیز جانور کی طرف نماز پڑھنے کا سبب یہ بھی ہے کہ جانور ایک ذی روح شئے ہے لیکن اس میں بت پرستی کی مشابہت نہیں ہے کیونکہ باطل مذاہب میں سے کسی نے بھی اونٹوں کی پرستش نہیں کی۔

بابُ ماجاء اذا حَضَرَ العَشاءُ واُقیمَتِ الصلاۃُ فابْدَءُوا بِالعَشَاءِ

باب شام کا کھانا حاضر ہو اور نماز کیلئے جماعت کھڑی ہو جائے تو کھانا پہلے کھایا جائے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینة عن الزُّهْریِّ عن انسٍ یَبْلُغُ به النَّبِیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: اِذا حَضَرَ العَشَاءُ واُقیمَتِ الصلاۃُ فابْدَءُوا بِالعَشَاءِ۔

---

[1] یعنی جس جگہ پر اونٹوں کو بٹھایا جاتا ہے اور جہاں اونٹ پائے جاتے ہیں ایسی جگہ پر نماز جائز ہے جبکہ شرائط موجود ہوں۔

[2] اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں ممانعت کی علت اونٹوں کا بدکنا ہے اور نماز پڑھنے کی علت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے کہ آپ نے اونٹوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی" الآیۃ

قال : وفی الباب عن عائشة، وابن عمرَ، وسَلَمَةَ بن الاکوَعِ، وامّ سَلَمَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث حسن صحیح۔ وعلیه العملُ عند بعض اهل العلم من اصحابِ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، منهم ابو بکرٍ، وعمرُ، وابنُ عمرَ۔

وبه یَقُولُ احمدُ واسحٰقُ، یقولانِ۔ یَبْدَأُ بِالعَشَاءِ وإن فَاتَتْهُ الصلاةُ فی الجماعةِ۔

قال ابو عیسی: سمعتُ الجارُودَ یقولَ: سمعتُ وَکِیعاً یقول فی هذا الحدیث : یَبْدَأُ بالعَشَاءِ اذَا کَانَ طَعَاماً یُخَافُ فَسَادُهُ۔ والذی ذَهَبَ إلیه بعضُ اهل العلم من اصحاب النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم وغیرِهِمْ اَشْبَهُ بالاتِّبَاعِ۔ وانما ارادوا ان لّا یقومَ الرجلُ إلی الصلاةِ وقلبهُ مشغولٌ بسبب شیءٍ۔ وقد رُوِیَ عن ابن عباسٍ انه قال: لانقومُ الی الصلاةِ وفی انفسناشیءٌ۔

☆ورُوِی عن ابن عمرَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال: اذا وُضِعَ العَشَاءُ واقیمَتِ الصلاةُ فَابْدَؤُا بِالعَشَاءِ قال: وتَعَشّٰی ابنُ عمرَ وهو یَسْمَعُ قراءةَ الامامِ۔ قال: حَدَّثَنَا بذٰلك هناد حَدَّثَنَا عبدةُ عن عبید اللّٰه عن نافعٍ عن ابن عمر۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور وہ اس حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رات کا کھانا حاضر ہو اور نماز کیلئے اقامت کہدی جائے تو پہلے کھانا کھالو۔

اس باب میں حضرت عائشہ، ابن عمر، سلمہ بن اکوع اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اسی پر عمل ہے بعض اہل علم کا صحابہ کرام میں سے جیسے ابوبکر، عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ امام احمد واسحٰق رحمہما اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک کھانا پہلے کھالینا چاہیئے اگرچہ جماعت نکل جائے۔ جارود کہتے ہیں میں نے وکیع سے سنا وہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کھانے سے اس وقت شروع کیا جائے جب کھانے کے خراب ہونے کا خطرہ ہو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام اور اہل علم دیگر فقہاء جس مطلب کی طرف گئے ہیں اس کی اتباع قرین صواب ہے کیونکہ انہوں نے یہ چاہا کہ جب آدمی نماز کیلئے کھڑا ہو تو اس کا دل کسی چیز میں اٹکا ہوا نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نماز کیلئے اس حالت میں کھڑے نہیں ہوتے کہ ہمارا دل کسی اور چیز میں لگا ہوا ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شام کا کھانا سامنے رکھ دیا گیا ہو اور نماز کھڑی ہو جائے تو پہلے کھانا کھالو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں کھانا کھایا کہ آپ امام کی قرأت سن رہے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم سے روایت کیا ہناد نے اور انہوں عبدہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے۔

﴿تشریح﴾

(والذی ذهب الیه بعض اهل العلم اشبه بالاتباع) ان بعض اہل علم سے مراد حضرت ابوبکر، عمر، ابن عمر رضی اللہ عنہم امام احمد، اسحٰق وغیرہ ہیں جن کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے وعلیہ العمل عند بعض اہل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ سے ذکر کیا ہے۔

عشاء کی نماز کو عَشاء سے مؤخر کرنا اعذار کی بناء پر ہے: امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ رات کے کھانے کو نماز سے مقدم کرنا صرف کھانے کے خراب ہونے کی وجہ سے نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ عَشاء کو عِشاء پر مقدم کرنے کی علت اطمینان کی حالت کے ساتھ نماز کو ادا کرنا ہے...... جن ائمہ کے ہاں رات کا کھانا اس وقت مقدم ہو سکتا ہے جبکہ اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ کھانا نماز سے پہلے کھانا بغیر عذر کے جائز نہیں لہٰذا ایک عذر یہ بھی بتلا

---

[1] اس مسئلہ میں اختلاف کی وضاحت یہ ہے کہ جمہور کا اتفاق ہے کہ اگر عشاء کی نماز کو پہلے پڑھ لے اور کھانا بعد میں کھائے تو بھی جائز ہے

عَشاء کو عِشاء پر مقدم کرنے کی علت میں ائمہ اربعہ کا اختلاف: حدیث شریف میں عشاء کی نماز کو پہلے پڑھنے سے منع کیوں کیا گیا ہے اس کی علت کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے کھانے کے خراب ہونے کی علت نکالی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علت انسان کے کھانے کی طرف محتاج ہونا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے یہ علت نکالی ہے کہ کھانا تھوڑا سا ہوگا اس سے کمر سیدھی کر کے نماز نشاط سے پڑھے گا۔ شوکانی نے، ابن حزم، امام احمد و اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم وجوبی ہے لہٰذا اگر کوئی آدمی بھی کھانے سے پہلے نماز پڑھ لے تو نماز باطل ہوگی لیکن حنابلہ کی فروع میں المغنی وغیرہ میں نماز کے صحیح ہونے کی صراحت موجود ہے۔ درمختار میں ہے کہ جس وقت کھانا حاضر ہو اور نفس اس کی طرف مشتاق ہو تو نماز مکروہ ہے اسی طرح ہر وہ فعل جو نمازی کے دل کو مشغول کر دے اور اس کے خشوع میں مخل ہو تو اس وقت بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

دیا کہ کھانا خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔

اس سے دوسرے اعذار کی نفی نہیں بلکہ دوسرے اعذار کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے بہر حال ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں۔ نیز صحابہ کرام تھوڑی غذا کھاتے تھے اور کھانا کبھی کبھی میسر ہوتا تھا تو کھانے کی موجودگی میں ان پر اشتہاء کا غلبہ ہو جاتا تھا لہٰذا دوسرے لوگ جو پیٹ بھرے ہیں ان کیلئے یہ حکم نہیں ہے کیونکہ علت یہ ہے کہ اشتہاء طعام کے غلبہ کی وجہ سے نماز میں خشوع اور خضوع نہ رہے اور جنکا پیٹ پہلے سے بھرا ہوا ہے ان میں یہ علت نہیں پائی جاتی۔

(و تعشیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما و ھو یسمع قرأۃ الامام) ابن عمر رضی اللہ عنہما اس دن روزہ دار تھے (اس لئے بھوک کے غلبہ کی وجہ سے سدِ رمق کے بقدر کھانے میں مشغول تھے۔ از مترجم)

باب ماجاء فی الصلاۃ عند النُّعَاسِ

باب اونگھتے وقت نماز پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا ھرونُ بن اِسحٰقَ الھَمْدَانِیُّ حَدَّثَنَا عَبْدَۃُ بن سلیمانَ الکلاَ بِیُّ عن ھشام بن عُرْوَۃَ عن ابیہ عن عائشۃَ قالت: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اذا نَعَسَ اَحَدُ کُمْ وھو یصلّی فَلْیَرْ قُدْ حتّٰی یَذْھَبَ عنہ النومُ، فاِنَّ اَحَدَ کُمْ اِذا صلّٰی وھو یَنْعَسُ لَعَلَّہٗ یَذْھَبُ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبُّ نَفْسَہٗ۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن انسٍ، وابی ھریرۃَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عائشۃَ حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور اونگھنے لگے تو چاہیئے کہ وہ (تھوڑی دیر) سو جائے یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے کیونکہ اگر تم میں سے کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا تو شاید کہ وہ استغفار کرنے کا ارادہ کرے اور پھر اپنے آپ کو گالی دینے لگے۔

اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

اس حدیث میں نماز سے نفل نماز مراد ہے یا مطلقا نماز فرض ہو یا نفل؟:(قولہ اذا نعس احدکم وھو یصلی) نماز سے مراد نفل نماز ہے[1] فرض نمازیں چونکہ کم تعداد میں ہیں اسلیئے ان کو نیند کے غلبہ کی صورت میں بھی نہیں چھوڑنا۔ نیز یہ مسئلہ بھی مسلم ہیکہ نیند کے غلبہ کی وجہ سے نہ نماز کو قضاء کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی جماعت کو چھوڑنا جائز ہے۔

(فیسب نفسه) یہاں پر لفظ سب سے مراد ایسا کلمہ بولنا ہے کہ نیند کے غلبہ میں بے اختیار ہو کر اسے معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے مثلا اللھم لا تغفرلی و لا ترحمنی (اس طرح کا کوئی جملہ منہ سے نکل جائے)۔

باب ماجاء فیمن زار قوماً لایُصلِّ بھم

باب جو آدمی کسی کی ملاقات کیلئے جائے وہ (ان کی اجازت کے بغیر) ان کی امامت نہ کرے

☆حدثنا محمودُ بن غَیلَانَ وھنّادٌ قالا: حَدَّثَنَا وکیعٌ عن اَبَانَ بن یزیدَ العطّارِ عن بُدَیلِ بن مَیسَرَۃَ العُقَیلِیِّ عن ابی عَطِیَّۃَ رَجُلٍ مِنھم قال: کان مالکُ بن الحُوَیرِثِ یَاْتِینَا فی مُصَلَّانَا یَتَحَدَّثُ، فحضَرَت الصلاۃُ یوماً، فقلنا له: تَقَدَّمْ، فقال: لِیَتَقَدَّمْ بعضُکم حتیّٰ اُحَدِّثَکُمْ لِمَ لا اَتَقَدَّمُ، سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: مَن زار قوماً فلا یَؤُمَّھُم، ولْیَؤُمَّھُمْ رجلٌ منھم۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیح۔

والعملُ علی ھذا عند اکثر اھل العلم من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم وغیرھم، قالوا: صاحبُ المنزلِ احقُّ بالامامۃِ مِن الزّائِرِ۔ وقال بعضُ اھل العلم: اِذا اَذِنَ له فلا باسَ ان یُصَلِّیَ به۔ وقال اسحٰقُ بحدیثِ مالکِ بن الحُوَیرِث، وشَدَّدَ فی ان لاَّ یُصَلِّیَ احدٌ بصاحب المنزلِ وانْ اَذِنَ له صاحبُ المنزِلِ۔ قال: وکذلك فی المسجدِ لایُصَلِّی بھم فی المسجد اذا زَارَھُمْ، یقولُ: لِیُصَلِّ بھم رجلٌ منھم۔

---

[1] اس مسئلہ میں شراح کا اختلاف ہے بعض علماء نماز سے نفل نماز مراد لیتے ہیں اور بعض علماء مطلقا نیند کے غلبہ کی صورت میں نماز پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ علامہ ابن حجر، اور عینی رحمہما اللہ نے اطلاق والے قول کو ترجیح دی ہے۔(از مترجم: پہلا قول امام مالکؒ اور ایک جماعت کی طرف منسوب ہے کہ اس حدیث میں نماز سے نماز تہجد مراد ہے اور وہ وقت نیند کا ہی ہوتا ہے۔ ص ۴۰۳، معارف السنن ج ۳

﴿ترجمہ﴾

بدیل بن میسرہ عقیلی ابوعطیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا مالک بن حویرث ہماری نماز پڑھنے کی جگہ پر ہمارے پاس آیا کرتے اور ہمیں احادیث سناتے چنانچہ ایک دن نماز کا وقت ہوگیا تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیں انہوں نے کہا تم میں سے کوئی نماز پڑھائے تاکہ میں تمہیں بتاؤں کہ میں (امامت کیلئے) کیوں آگے نہیں بڑھ رہا؟ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی قوم کی زیارت کیلئے (مہمان بن کر) جائے تو وہ ان کی امامت نہ کرے بلکہ انہیں میں سے کوئی آدمی نماز پڑھائے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور صحابہ کرام میں سے اکثر اہل علم کا اسی حدیث پر عمل ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ صاحبِ منزل زیارت کیلئے آنے والے سے امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک اگر صاحبِ منزل اجازت دے دے تو امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں۔

امام اسحٰق رحمہ اللہ کا بھی اسی مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل ہے انہوں نے اس بارے میں سختی سے کام لیا وہ فرماتے ہیں کہ صاحبِ منزل کی اجازت سے بھی کوئی نماز نہ پڑھائے اور اسی طرح اگر ان کی مسجد میں ان کی ملاقات کیلئے جائے تو بھی نماز نہ پڑھائے بلکہ انہی میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے۔

﴿تشریح﴾

(من ام قوما فلا یَؤُمُّہٗ ولیومھم رجل منھم) یہ بات گزر چکی ہے کہ بغیر اجازت کے دوسرے کی جگہ جا کر نماز پڑھانا منع ہے یہاں پر بھی یہی مراد ہے لہٰذا اگر میزبان اجازت دے دے تو مہمان کو نماز پڑھانا جائز ہے۔

باب ماجاء فی کراھِیَۃِ ان یخصَّ الاِمامُ نفسَہ بالدعاء

باب امام کا صرف اپنے لئے خاص کر دعا کرنا مکروہ ہے

☆ حَدَّثَنَا علیُّ بن حُجْرٍ اخبرنا اِسمٰعیلُ بن عَیَّاشٍ حدثنی حَبیبُ بن صالحٍ عن یزیدَ بن شُرَیْحٍ عن ابی حَیٍّ المُؤَذِّنِ الحِمْصِیِّ عن ثَوْبَانَ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لایَحِلُّ لامْرِءٍ ان یَنْظُرَ فی جَوْفِ بَیْتِ امْرِیءٍ حتیٰ یَسْتَاْذِنَ، فاِنْ نَظَرَ فقد دَخَلَ، ولا یَؤُمُّ قَوماً فَیَخُصَّ نَفْسَہُ بِدَعْوۃٍ

دُونَهُم، فان فَعَلَ فقد خانَهُم، وَلَا يَقُومُ اِلَى الصلاةِ وهو حَقِنٌ۔ قال : وفی الباب عن ابی هريرةَ ، وابی اُمَامَةَ۔

قال ابو عيسى: حديثُ ثَوْبَانَ حديث حسن۔ وقد رُوِیَ هذا الحديثُ عن معاوِيَةَ بن صالحٍ عن السَّفرِبن نُسَيْرٍ عن يزيد بن شُرَيْحٍ عن ابی اُمَامَةَ عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم۔

ورُوِیَ هذا الحديث عن يزيد بن شُرَيحٍ عن ابی هريرةَ عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم۔ وكانَّ حديث يزيدَ بن شُرَيْحٍ عن ابی حَیٍّ المُؤَذِّنِ عن ثَوْبَانَ فی هذا: اَجْوَدُ اِسناداً واشْهَرُ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کیلئے حلال نہیں کہ وہ کسی کے گھر میں اجازت کے بغیر جھانکے اگر اس نے دیکھ لیا تو گویا کہ وہ اس کے گھر میں داخل ہو گیا اور کوئی شخص کسی محلہ والوں کی امامت اس طرح نہ کرے کہ ان لوگوں کو چھوڑ کر اپنے لئے دعا کو مخصوص کرے اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے ان سے خیانت کی اور نماز میں قضاء حاجت (پاخانہ پیشاب) کو روک کر کھڑا نہ ہو۔

اس باب میں حضرت ابو ہریرہ، ابوامامہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ثوبان حسن ہے اور یہ حدیث معاویہ بن صالح رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے وہ سفر بن نسیر وہ یزید بن شریح سے وہ ابوامامہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور یہ حدیث یزید بن شریح سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ یزید بن شریح کی حدیث ابوحی موذن کی ثوبان سے مروی حدیث سے سند کے اعتبار سے اجود اور زیادہ مشہور ہے۔

﴿تشریح﴾

دعا میں مفرد کے صیغے کا استعمال ممنوع نہیں بلکہ دعا کو اپنے ساتھ خاص کرنے کی ممانعت ہے: (فیخص نفسه بالدعاء) بعض علماء نے اس حدیث کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ صحیح احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں منفرد کے صیغے وارد ہوئے ہیں مثلاً اللهم اغفرلی وارحمنی وتب علی۔ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث باب میں تخصیص سے مراد صرف اپنے لئے دعا کرنا ہے کہ اعرابی کی حدیث اللهم ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدا'' میں صرف اپنے لئے دعا کی گئی ہے۔ وہ معنی

مراد نہیں ہے جو بظاہر سمجھ میں آ رہا ہے کہ مفرد کے صیغہ کو استعمال کرنا جائز نہ ہو کیونکہ کسی قوم کا وکیل اور قاصد جب سوال کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے تو اس کی ساری قوم اس کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔

باب ماجاء فیمن امَّ قوماً وهم له كارهونَ

باب اس شخص کا امامت کرنا جس کو مقتدی ناپسند کریں

☆حدثنا عبد الاعلى بن واصلِ بن عبد الاعلى الكوفيُّ حَدَّثَنَا محمد بن القاسم الأَسَدِيُّ عَنِ الفضل بن دَلهم عن الحسن قال: سمعتُ انسَ بن مالك يقولُ : لَعَنَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ثَلاثَةً: رجلٌ اَمَّ قوماً وهم له كارهون ، وَامْرَاَةٌ باتتْ وزوجها عليها ساخطٌ ورجلٌ سمع حَيَّ على الفلاح ثُمَّ لم يُجِبْ۔ قال : وفى الباب عن ابن عبَّاسٍ ، وطَلْحَةَ ، وعبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وابى امَامَةَ۔

قال ابو عيسى: حديثُ انسٍ لايَصِحُّ ، لانه قد رُوِىَ هذا الحديث عَنِ الحَسَنِ عَنِ النبى صلى اللّٰه عليه وسلم: مرسلٌ۔ قال ابو عيسى: ومحمد بن القاسم تكلّم فيه احمدُ بن حنبلٍ وضعّفه، وليس بالحافظِ۔ وقد كَرِهَ قومٌ من اهل العلم ان يَؤُمَّ الرجلُ قوماً وهم له كارِهُونَ، فإذَا كان الإمامُ غيرَ ظالمٍ فإنما الإثمُ على مَن كرِهَهُ۔وقال احمد وإسحٰقُ فى هذا : إذا كَرِهَ واحدٌ او اثنانِ او ثلاثةٌ فلابَأسَ ان يُصَلِّىَ بهم، حتىٌ يكرههُ اكثرُ القومِ۔

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عن منصورٍ عن هِلَالِ بن يِسَافٍ عن زِيَادِ بن ابى الجَعْدِ عن عَمْرو بن الحرث بن المُصْطَلِقِ قال: كان يقالُ: اَشَدُّ الناسِ عذاباً يومَ القيامة اثنانِ: امرأةٌ عَصَتْ زوجَها، وإمامُ قومٍ وهم له كارهونَ۔ قال هنادٌ: قال جريرٌ: قال منصورٌ : فسألنا عن اَمرَ الإمامِ؟ فقيلَ لنا: إنَّمَا عَنَى بهٰذا اَئِمَّةً ظَلَمَةً، فَاَمَّا مَن اقامَ السُّنَّةَ فإنما الإثمُ على من كَرِهَهُ۔

☆حدثنا محمدُ بن اسمٰعيل حَدَّثَنَا عليُّ بن الحَسنِ حَدَّثَنَا الحُسينُ بن وَاقدٍ حَدَّثَنَا ابو غالبٍ قال: سمعتُ ابا امَامَةَ يقول: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ثلاثةٌ لاتُجَاوِزُ صلاتُهم آذانَهم: العبدُ الآبِقُ حتّٰى يَرْجِعَ، وامراَةٌ باتَتْ وزوجُها عليها ساخطٌ، وإمامُ قومٍ وهم له كارهونَ۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن غريبٌ من هٰذا الوجهِ۔وابو غالبٍ اسمه حَزَوَّرٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت حسن رضی اللہ عنہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے جو شخص کسی قوم کی امامت کرائے اور وہ اسے ناپسند کرتے ہوں۔ وہ عورت جو اس حالت میں رات گزارے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو اور وہ شخص جو ''حی علی الفلاح'' سنے اور اس کا جواب نہ دے (یعنی جماعت میں حاضر نہ ہو)۔

اس باب میں ابن عباس، طلحہ، عبداللہ بن عمرو اور ابوامامہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ صحیح نہیں اس لئے کہ یہ حدیث حسن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کی گئی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے محمد بن قاسم کے متعلق کلام کیا ہے اور وہ انہیں ضعیف قرار دیتے ہیں اور یہ حافظ نہیں ہیں۔ اہل علم کی ایک جماعت نے ناپسند کیا ہے کہ ایک شخص مقتدیوں کی ناپسندیدگی کے باوجود امامت کرے لیکن اگر امام ظالم نہ ہو تو گناہ اس (کی امامت) کو ناپسند کرنے والے پر ہوگا۔ امام احمد و اسحق اسی مسئلہ میں کہتے ہیں اگر ایک یا دو یا تین آدمی ناپسند کریں تو امامت کرنے میں کوئی حرج نہیں یہاں تک کہ مقتدیوں کی اکثریت اس کو ناپسند کرے۔

روایت کی ہم سے هناد نے انہوں نے جریر سے انہوں نے منصور سے انہوں نے ہلال بن یساف سے انہوں نے زیاد بن ابوجعد سے انہوں نے عمرو بن حارث بن مصطلق سے۔ عمرو نے کہا کہ کہا جاتا تھا کہ سب سے سخت عذاب دو شخصوں کو ہوگا وہ عورت جو شوہر کی نافرمانی کرے اور وہ امام جو مقتدیوں کے ناراض ہونے کے باوجود امامت کرے۔ جریر کہتے ہیں کہ منصور نے کہا کہ ہم نے ان سے امام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا اس سے مراد ظالم ائمہ ہیں پس اگر ایسا امام ہو جو سنت پر قائم ہو تو گناہ اسی کو ہوگا جو اسے ناپسند کرتا ہو۔

حضرت ابو غالب، ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمیوں کی نماز ان کے کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ بھاگا ہوا غلام جب تک واپس نہ آجائے، وہ عورت جو اس حالت میں پوری رات گزارے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو اور کسی قوم کا امام جس کو لوگ ناپسند کرتے ہوں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے اس سند سے ابو غالب کا نام حزور ہے۔

﴿تشریح﴾

امام کیلئے مقتدیوں کی ناپسندیدگی یا پسندیدگی کا اعتبار ہے یا نہیں؟: خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر اس امام میں ایسا وصف موجود ہے جس کی وجہ سے شرعاً وہ ناپسندیدہ ہے تو ایسے امام کا امام رہنا مکروہ ہے اگرچہ اس کو کوئی ایک شخص بھی ناپسند نہ کرے اور اگر اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے شریعت ناپسند کرتی ہو تو لوگوں کی ناپسندیدگی کا کوئی اعتبار نہیں اگرچہ سارے افراد اسے ناپسند کریں۔ اگر یہ واضح نہ ہو کہ وہ امام شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ہے (بلکہ بظاہر شریعت کا پابند نظر نہیں آرہا) تو اس میں مقتدیوں کے اکثر افراد کا اعتبار ہوگا کہ وہ اسے ناپسند کریں (تو ایسا امام نماز میں امامت نہ کرے)۔

(ثلاثة لا تجاوز صلاتهم اذانهم) مطلب یہ ہے کہ ان کی نماز قبول نہیں ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (اليه يصعد الكلم الطيب و العمل الصالح يرفعه) اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل صالح نہیں ہوتا وہ اللہ کے دربار کی طرف نہیں اٹھتا۔

باب ماجاء اِذا صلّی الاِمامُ قاعداً فصلُّوا قُعُوداً

باب اگر (معذور) امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو!

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عن ابن شِهَابٍ عن انس بن مالكٍ انه قال: خَرَّ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن فَرَسٍ فجُحِشَ، فصلّى بِنا قاعداً، فصَلَّيْنَا معه قُعُوداً، ثمّ انصرفَ فقال: اِنَّمَا الاِمامُ۔ او: اِنَّمَا جُعِلَ الاِمامُ۔ لِيُؤتَمَّ به، فاذا كَبَّرَ فكَبِّرُوا، واِذا رَكَعَ فارْكَعُوا، واِذا رَفَعَ فارْفَعُوا، واِذا قال سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حمدهُ فقولُوا: رَبَّنَا ولكَ الحمدُ، واِذا سجد فاسجُدوا، واِذا صلّى قاعداً فَصَلُّوا قُعُوداً اَجْمَعُونَ۔

قال: وفي الباب عن عائشةِ، وابي هريرةَ، وجابرٍ، وابن عمرَ، ومعاويةَ۔ قال ابو عيسى: و حديث انسٍ اَنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم خرّ عن فرسٍ فَجُحِشَ: حديث حسن صحيحٌ۔

وقد ذَهَبَ بعضُ اصحاب النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم اِلى هذا الحديث، منهم جابرُ بن عبدِ اللّٰهِ، وأُسَيْدُ بن حُضَيْرٍ، وابو هريرةَ، وغيرُهم۔ وبهذا الحديثِ يقولُ احمدُ واسحٰقُ۔

وقال بعضُ اهلِ العلم: اذا صلّى الاِمامُ جالساً لم يُصَلِّ مَن خَلْفَهُ الا قياماً، فِاِن صَلَّوا قعوداً لم يُجْزِهِمْ۔ وهوقولُ سفيانَ الثَّوْرِيِّ، ومالكِ بن انَسٍ، وابن المباركِ، والشافعيِّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے سے گرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چوٹ آگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی چنانچہ ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء بیٹھ کر ہی کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر کر متوجہ ہوئے اور فرمایا بے شک امام اس لئے ہے یا فرمایا بے شک امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو! جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو! جب رکوع سے سر اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ! جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو ربنا ولک الحمد کہو! جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو! اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو!

اس باب میں حضرت عائشہ، ابوہریرہ، جابر، ابن عمر اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس رضی اللہ عنہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے سے گرے پس آپ کو چوٹ آئی حسن صحیح ہے۔ بعض صحابہ نے اس حدیث پر عمل کیا ہے ان میں سے جابر بن عبداللہ، اسید بن حضیر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔ امام احمد و اسحٰق بھی اسی حدیث کے قائل ہیں۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ اگر امام بیٹھ کر (نماز) پڑھائے تو جو لوگ اس کے پیچھے ہوں وہ کھڑے ہو کر ہی (نماز) پڑھیں پس اگر انہوں نے بیٹھ کر اقتداء کی تو ان کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن مبارک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب والے واقعہ کے سن کی تعیین: حدیث باب کا واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیوٰۃ طیبہ کے آخری سالوں[1] میں پیش آیا ہے اسی لئے اس سے امام احمد و اسحٰق نے[2] استدلال کیا ہے ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

---

[1] یہ واقعہ گھوڑے سے گرنے کا ہے جو ۵ھ ذوالحجہ کے مہینہ میں یا ربیع الاول کے مہینے میں پیش آیا جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔

[2] **مذاہب ائمہ:** علامہ عینی وغیرہ شراح حدیث نے امام احمد و اسحٰق، ابن حزم، اوزاعی اور محدثین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جو آدمی قیام پر قادر ہے اس کی نماز ایسے امام کے پیچھے جائز نہیں جو بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہو چاہے مقتدی کھڑا ہو کر اقتدا کرے یا بیٹھ کر، دونوں صورتوں میں قادر علی القیام کی اقتداء خلف القاعد جائز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ، شافعی، ثوری، ابوثور اور جمہور سلف رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو جو شخص قیام پر قدرت رکھتا ہے وہ کھڑے ہو کر ہی اقتداء کر سکتا ہے اس کیلئے بیٹھنا ناجائز ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وسلم نے انہیں اس نماز کے بارے میں بیٹھنے کا حکم اس لئے فرمایا تھا تا کہ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ جس طرح اہل فارس وروم اپنے بادشاہوں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں یہ فعل ناپسندیدہ ہے کیونکہ اس میں شرک کا شائبہ ہے پس جب صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اس فعل کی برائی بیٹھ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا جیسا کہ زندگی کی آخری نمازوں میں جب جماعت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصر عن القراۃ ہونے کی وجہ سے امام بن گئے تھے اور آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی لیکن صحابہ کو بیٹھنے کا حکم نہیں فرمایا جبکہ اس سے پہلے سے صحت کی حالت کے واقعہ میں (سقوط عن الفرس والا واقعہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ کرام کو بیٹھنے کا حکم فرمایا تھا۔

امام ترمذیؒ نے متعدد سندوں سے ثابت کیا ہے کہ صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ خلف ابی بکر قاعداً۔اسکا جواب: بعض راویوں نے جو ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الوفات کے واقعہ میں مقتدی تھے نہ کہ امام، امام تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں جانب[1] بیٹھے تھے۔پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم امام نہ ہوتے تو بائیں جانب نہ بیٹھتے بلکہ داہنی جانب بیٹھتے۔اس پر یہ لوگ اشکال کرتے ہیں چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیماری کی وجہ سے چلنا مشکل تھا اسلئے عذر کی وجہ سے بائیں طرف ہی بیٹھ گئے۔اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی سی مشقت کی وجہ سے مقتدی کے امام کے دائیں جانب بیٹھنے کی سنت چھوڑ نہیں سکتے تھے اور یہ بھی کوئی مشکل کام نہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اشارہ کرتے تو وہ بائیں جانب آجاتے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) **مسلکِ حنابلہ میں شروطِ ثلثہ:** قلت: امام احمد وغیرہ کا یہ مذہب بہت سے شراح نے نقل کیا ہے مگر فروع حنابلہ "الروض" نامی کتاب میں اس طرح ہے کہ جو شخص کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو وہ قادر علی القیام کے لئے امام نہیں بن سکتا الا یہ کہ وہ محلّہ کا امام راتب ہو اور اس کی بیماری کے زائل ہونے کی امید ہو...... تا کہ ہمیشہ قیام کو چھوڑنا لازم نہ آئے۔ پیچھے والے مقتدیوں کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنا مستحب ہے اگر چہ وہ قیام پر قادر ہوں اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنا بھی صحیح ہے لیکن محلّہ کے امام راتب کیلئے افضل یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے کو آگے کرے۔انتہی (از مترجم: تیسری شرط یہ ہے کہ عذر طاری فی الصلوٰۃ نہ ہو بلکہ نماز سے پہلے سے ہو۔امام نے نماز بیٹھ کر شروع فرمائی ہو۔ص ۴۲۲۔اور ص ۴۱۵: معارف السنن/۳۔ایچ ایم سعید کراچی

[1] صحیحین کی روایت میں تصریح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں جانب آکر بیٹھے۔

حنابلہ کا ایک اور استدلال: امام احمد واسحٰق رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت مرض الوفات کی نماز کے متعلق متعارض ہیں۔لہٰذا تعارض کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر صحابہ کی احادیث پر عمل کیا جائیگا۔اور وہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی اس کپڑے میں آپ توشح کیئے ہوئے تھے تو یہ روایت سالم عن المعارضہ ہے۔

نیز حنابلہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض الوفات والا یہ فعل آپ کے سقوط عن الفرس والے فعل اور حکم کے معارض نہیں ہوگا جس میں آپ نے "اذا صلی قائما فصلوا قعودا اجمعین" کا حکم فرمایا۔بلکہ اس طرح مرض الوفات والی حدیث اور سقوط عن الفرس والی حدیث میں کوئی تعارض نہ رہے گا۔جبکہ ابوحنیفہ، شافعی رحمہما اللہ کے مذہب کے مطابق سقوط عن الفرس والی حدیث کو بغیر دلیل کے منسوخ ماننا پڑیگا۔حالانکہ مرض الوفات والی روایات متعارض ہونے کی وجہ سے نسخ کو ثابت نہیں کرسکتیں۔

حنابلہ کے استدلال کے جواباتِ اربعہ: (۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ انہوں نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ امام تھے جیسا کہ انہیں علم ہوا تھا پھر انہیں بعد میں معلوم ہوا تھا کہ امام تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو انہوں نے اس کو بھی نقل کر دیا۔(۲) یا یہ تطبیق دی جائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرھا کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ امام تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خاص[1] اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی ہوں بلکہ اس نماز کے علاوہ کسی دوسرے واقعہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمرے میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی ہو۔(۳) یا یہ تطبیق دی جائے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا امام بننا یہ نماز کی ابتدائی حالت کا بیان ہے[2] کیونکہ شروع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء

---

[1] یہ تسلیمی جواب زیادہ راجح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں حالت اقتداء میں بھی نماز ادا فرمائی ہے اور امام بن کر بھی نماز ادا فرمائی ہے۔بیہقی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے تو وہ واقعہ ہفتہ یا اتوار والے دن کی ظہر کی نماز کا ہے اور جس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی تھے یہ واقعہ پیر والے دن کی فجر کی نماز کا ہے۔انتھی کذافی الاوجز (از مترجم: اس مسئلہ کی وضاحت کیلئے معارف السنن کیطرف رجوع فرمائیں)

[2] امام شافعی رحمہ اللہ نے یہی تاویل کی ہے کہ پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ امام تھے پھر بعد میں وہ مقتدی بن گئے۔

میں نماز شروع فرمائی تھی تو اس کو بعض علماء نے روایت کر دیا پھر جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو[1] حصر عن القرأۃ کو ہو گیا تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیفہ بنا دیا تھا۔ (۴) یا یہ تطبیق ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے ضعف کی وجہ سے تکبیر زور سے کہہ رہے تھے تو صحابہ کرام کو صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تکبیر کی آواز آ رہی تھی تو اس لئے بعض صحابہ نے یہ سمجھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ امام ہیں حالانکہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ امام حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے کیونکہ آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے تھے۔

باب منه

باب اسی مسئلہ سے متعلق (کہ غیر معذور مقتدی معذور امام کی کھڑے ہو کر اقتداء کریں گے)

☆حدثنا محمودُ بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا شَبَابَةُ بنُ سَوَّارٍ عن شُعْبَةَ عن نُعَيْمِ بنِ ابی هِنْدٍ عن ابی وائلٍ عن مَسْرُوقٍ عن عائشة قالت: صلّى رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم خَلْفَ ابى بكرٍ فى مَرَضِهِ الذى ماتَ فيه قاعداً۔

قال ابو عيسى: حديث عائشةَ حديث حسن صحيحٌ غريب۔ وقد رُوِىَ عن عائشة عن النبىِّ صلى اللّٰه عليه وسلم انه قال: اِذا صلّى الإمامُ جالساً فصلُّوا جلوساً۔ ورُوِىَ عنها: ان النبىَّ صلى اللّٰه عليه وسلم خرجَ فى مَرَضِه وابو بكرٍ يُصلّى بالناسِ، فصلّى اِلى جَنْبِ ابى بكر و الناسُ يَأْتَمُّونَ بابى بكرٍ، وابو بكرٍ يَأْتَمُّ بالنبىِّ صلى اللّٰه عليه وسلم۔

ورُوِىَ عنها: انَّ النبى صلى اللّٰه عليه وسلم صلّى خَلْفَ ابى بكرٍ قاعداً۔ ورُوِىَ عن انس بنِ مالِكٍ: ان النبىَّ صلى اللّٰه عليه وسلم صلّى خَلْفَ ابى بكر وهو قاعدٌ۔

☆حدثنا عبدُ اللّٰهِ بن ابى زيادٍ حَدَّثَنَا شَبَابَةُ بن سَوَّارٍ حَدَّثَنَا محمدُ بن طَلْحَةَ عن حُمَيْدٍ عن

---

[1] درمختار میں ہے کہ اسی طرح امام کیلئے جائز ہے کہ جب امام کو قرأت کرنے سے حصر ہو جائے اتنی قرأت سے جس سے فرض بھی ادا نہ ہو تو اس کیلئے خلیفہ اور نائب بنانا جائز ہے اس کی دلیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی آہٹ محسوس کی تو انہیں حصر عن القرأۃ ہو گیا اور وہ پیچھے ہٹے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر نماز پوری فرمائی اور اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم امامت کیلئے آگے نہ بڑھتے۔ (بدائع) صاحبین کے نزدیک اس صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی۔

ثابتٍ عن انسٍ قال: صلى رسول الله ﷺ فی مرضِه خَلْفَ ابی بکر قاعداًفی ثَوْبٍ مُتَوَشِّحاً به۔
قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔ قال : وهکذا رواه یحیی بن اَیُّوبَ عن حمید عن ثابتٍ عن انسٍ۔ وقد رواه غیرُ واحدٍ عن حمید عن انسٍ، ولم یذ کروافیه عن ثابتٍ۔ ومن ذَکَرَفیه عن ثابتٍ فهو اَصَحُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو! ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض وفات میں باہر تشریف لائے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں کی امامت کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی اس حال میں کہ لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کر رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر رہے تھے اور ان سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی بیٹھ کر۔

ہم سے روایت کی یہ حدیث عبداللہ بن ابوزیاد نے ان سے شبابہ بن سوار نے ان سے محمد بن طلحہ نے ان سے حمید نے ان سے ثابت نے ان سے انس رضی اللہ عنہ نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی اس حال میں کہ آپ ایک ہی کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ایسا ہی روایت کیا ہے اس کو یحییٰ بن ایوب نے حمید سے انہوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے انہوں نے انس رضی اللہ عنہ سے اور روایت کیا اس حدیث کو کئی لوگوں نے حمید سے انہوں نے انس رضی اللہ عنہ سے اور اس حدیث میں ثابت کا ذکر نہیں کیا۔ اور جس راوی نے سند میں ثابت کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قولہ من ذکر فیہ ثابت فھو اصح) جاننا چاہیئے کہ حمید اور ثابت یہ دونوں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں البتہ ثابت حمید سے علم وفضل میں بڑھے ہوئے ہیں اسلیئے حمید کبھی کبھار ثابت سے روایت نقل کرتے ہیں جیسا کہ یہاں پر ہے۔

باب ماجاء فی الاِمام یَنْھَضُ فی الرکعتین ناسیاً

باب دو رکعتوں میں امام کا (قعدہ اولیٰ) بھول کر کھڑے ہو جانا

☆حدثنا احمد بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا ھشیم اخبرنا ابن ابی لَیْلَی عن الشَّعْبِیِّ قال: صَلّٰی بنا المغیرۃُ بن شُعْبَۃَ، فنھض فی الرکعتین، فَسَبَّحَ بہ القومُ وسَبَّحَ بھم، فلمّا صلّٰی بقیّۃَ صلاتِہ سَلَّمَ، ثم سجد سجدتی السَّھْوِ وھو جالسٌ، ثم حَدَّثھم ان رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فعل بھم مثلَ الذی فعلَ۔ قال: وفی البابِ عن عُقْبَۃَ بن عامرٍ، وسَعْدٍ، وعبد اللّٰہ بن بُحَیْنَۃَ۔ قال ابو عیسی: حدیث المغیرۃ بن شعبۃَ قد رُوِیَ من غیر وجہٍ عن المغیرۃ بن شعبۃ۔

قال ابو عیسی: وقد تکلّم بعضُ اھل العلم فی ابن ابی لیلَی مِن قِبَلِ حِفْظِہ۔ قال احمدُ: لایُحْتَجُّ بحدیثِ ابن ابی لیلی۔

وقال محمد بن اسمٰعیل: ابنُ ابی لیلَی ھو صَدُوقٌ، ولا اَرْوِی عنہ، لانہ لایَدْرِی صحیحَ حدیثِہِ مِن سَقیمِہ، وکلُّ من کان مثلَ ھذا فلا اروی عنہ شیئاً۔ وقد رُوِیَ ھذا الحدیثُ من غیر وجہٍ عن المغیرۃ بن شعبۃَ۔ رواہ سفیانُ عن جابرٍ عن المغیرۃ بن شُبَیْلٍ عن قیس بن ابی حازمٍ عن المغیرۃ بن شعبۃَ۔ وجابرٌ الجُعْفِیُّ قد ضعّفہ بعضُ اھل العلم، تَرکہ یحیی بن سعیدٍ وعبد الرحمن بن مھدیٍ وغیرھُما۔ والعملُ علی ھذا عند اھل العلم: اَنَّ الرجلَ اِذا قام فی الرکعتین مَضَی فی صلاتہ وسجد سجدتین: منھم مَنْ رَاَی قبل التسلیمِ، ومنھم من رأی بعد التسلیم۔ ومن رَأَی قبلَ التسلیمِ فحدیثُہ اصحُّ، لِمَارَوَی الزھریُّ ویحیی بن سعیدٍ الانصاریُّ عن عبد الرحمن الْاَعْرَجِ عن عبد اللّٰہ بن بُحَیْنَۃَ۔

☆حدثنا عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن اخبرنا یزیدُ بن ھرونَ عن المَسْعُودِیِّ عَنْ زیاد بن عِلَاقَۃَ

قال: صلّٰی بنا المغیرۃ بن شعبۃَ، فلماً صلّٰی رکعتین قام ولم یجلس، فَسَبَّحَ به مَنْ خَلْفَهُ، فاشار اِلیهم انْ قُومُوا، فلمّا فرغ من صلا تِهٖ سَلَّمَ وسجد سجدتَیِ السَّھْوِ وسلَّمَ، وقال: ھٰکذا صَنَعَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد رُوی ھذا الحدیث من غیرِ وجهٍ عن المغیرۃ بن شعبۃَ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔

﴿ترجمہ﴾

شعبی سے روایت ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ہمیں نماز پڑھائی اور دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہو گئے چنانچہ لوگوں نے سبحان اللہ کہا۔ امام کو متنبہ کرنے کیلئے اور امام نے سبحان اللہ کہا (تاکہ لوگوں کو تنبیہ ہو جائے کہ اگر میں بھول کر کھڑا ہو گیا تو تمہیں بھی کھڑا ہو جانا چاہیئے)۔ جب نماز پوری ہوئی تو سلام پھیرا اور دو سجدے کئے جبکہ وہ بیٹھے ہوئے تھے پھر حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا جیسا انہوں نے کیا۔

اس باب میں عقبہ بن عامر، سعد، اور عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث انہی سے کئی طرق سے مروی ہے اور بعض لوگوں نے ابن ابی لیلیٰ کے حفظ میں کلام کیا ہے۔ امام احمد...... ابن ابی لیلیٰ کو قابل حجت نہیں مانتے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن ابی لیلیٰ سچے ہیں لیکن میں ان سے روایت اس لئے نہیں کرتا کہ وہ صحیح اور ضعیف میں پہچان نہیں رکھتے۔ اور ہر وہ راوی جو اسطرح ہو میں اس سے روایت نہیں کرتا۔ یہ حدیث کئی طرق سے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور روایت کی سفیان نے جابر سے انہوں نے مغیرہ بن شبیل سے انہوں نے قیس بن ابو حازم سے انہوں نے مغیرہ بن شعبہ سے۔ اور جابر جعفی کو بعض اہل علم نے ضعیف کہا ہے اور یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مھدی وغیرہ نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہے اور اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ اگر کوئی شخص دو رکعتوں کے بعد کھڑا ہو جائے (تشہد پڑھے بغیر) تو نماز پوری کرے اور سہو کے دو سجدے کرے۔ بعض علماء کے نزدیک سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرے اور ان میں سے بعض حضرات کہتے ہیں کہ سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرے۔ جو حضرات سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرنے کے قائل ہیں ان کی حدیث اصح ہے اس حدیث کو زہری اور یحییٰ بن سعید انصاری نے عبدالرحمٰن اعرج سے اور انہوں نے عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

روایت کی ہم سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن نے انہوں نے یزید بن ہارون سے انہوں نے مسعودی سے انہوں نے زیاد بن علاقہ سے انہوں نے کہا کہ ہمیں نماز پڑھائی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے جب وہ دو رکعت پڑھ چکے تو بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہوگئے۔ چنانچہ مقتدیوں نے سبحان اللہ کہی تھی انہوں نے اشارہ کیا ان کی طرف کہ کھڑے ہو جاؤ جب نماز سے فارغ ہوئے تو سلام پھیرا اور دو سجدے کئے سہو کے اور پھر سلام پھیرا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے کئی طرق سے مروی ہے وہ روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

﴿تشریح﴾

قعدہ اولیٰ بھول کر کھڑے ہونے کی مختلف صورتوں میں نماز کا حکم: اس حدیث میں اس مسئلہ کا بیان ہے کہ امام اگر قعدہ اولی کو بھول جائے تو اسے کھڑا ہو جانا چاہئے لیکن اگر وہ قعدہ اولی کی طرف لوٹ گیا حالانکہ وہ کھڑا ہو چکا تھا یا اقرب الی القیام تھا پھر بھی لوٹ گیا تو محققین فقہاء[1] جن میں صاحب فتح القدیر و بحر الرائق وغیرہ ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی اگر چہ اس نے فرض قیام کو واجب قعدہ کی وجہ سے چھوڑ دیا محققین اپنی دلیل میں یہ نظیر پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قنوت وتر کو بھول کر رکوع میں چلا جائے پھر رکوع میں اس کو یاد آئے کہ اس سے قنوت رہ گیا ہے تو وہ دوبارہ قنوت کیلئے کھڑا ہو جائے تو ایسے شخص کی نماز فاسد نہیں[2] ہوتی (حالانکہ اس نے ایک فرض رکوع کو قنوت واجب کی وجہ سے چھوڑا ہے)۔ "اقرب الی السجود" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک نمازی کا نچلا آدھا دھڑ سیدھا کھڑا نہ ہو تو یہ سجدے کے زیادہ قریب ہے اور جب نصفِ اسفل سیدھا ہو گیا اور اس کی ہیئت رکوع کی سی ہو گئی تو یہ قیام کے زیادہ قریب ہو گیا۔ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے اور یہ احناف کی موید ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو ہوگا۔

---

[1] درمختار میں ہے کہ اگر ایک آدمی فرض نماز کے پہلے قعدہ کو بھول گیا تو جب تک سیدھا کھڑا نہ ہو تو اسوقت تک واپس لوٹ آئے اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو واپس نہ لوٹے کیونکہ یہ شخص فرض قیام میں مشغول ہو گیا ہے اور اس کو سجدہ سہو کرنا چاہئے۔ اگر سیدھا کھڑا ہونے کے بعد بھی دوبارہ بیٹھ جائے تشہد کیلئے تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ زیلعی رحمہ اللہ نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی اور اصح یہی ہے جیسا کہ ابن ہمام اور ابن نجیم نے اس کو ثابت کیا ہے۔ انتہی

[2] یعنی اصح قول کے مطابق اس شخص کی نماز فاسد نہ ہوگی اگر چہ بعض اہل فروع کا اس میں اختلاف ہے۔

عنقریب اس کے باب میں اس کا بیان آئیگا۔ یہ جاننا چاہیئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھنے کے قائل نہیں بلکہ نمازی قعدہ اخیرہ میں بیٹھ کر تشہد، درود وسلام اور دعا پڑھنے کے بعد سجدہ سہو کرے پھر سلام پھیر دے۔

سبحان اللہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نام کے ساتھ نماز میں تنبیہ کرنا درست ہے:(وسبح بھم) مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی اس تسبیح کا مقصد تنبیہ کرنا تھا اس بات پر کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوگئی ہے لہٰذا اب تم بھی کھڑے ہو جاؤ کیونکہ اب میرے لئے بیٹھنا صحیح نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ خاص لفظ سبحان اللہ کیلئے ساتھ ہی تنبیہ کرنا ضروری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی بھی نام کے ساتھ تنبیہ کرنا صحیح ہے (البتہ سبحان اللہ کہنا سنت اور افضل ہے)۔

ایک وہم کا ازالہ:(ثم سجد سجدتی السھو وھو جالس) صحابی نے اس وہم کو دور کر دیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جس طرح سجدۂ تلاوت کیلئے کھڑے ہو کر پھر سجدہ میں جاتے ہیں تو شاید سجدہ سہو کیلئے بھی کھڑا ہونا سنت ہو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ بیٹھنے کی حالت[1] میں ہی سجدہ سہو کرنا سنت ہے (ابن ابی لیلیٰ)۔ اس نام کے چار آدمی ہیں[2]:

۱۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔ یہ ثقہ ہے اس میں کوئی ایسا وصف نہیں جو باعثِ جرح ہو۔

۲۔ محمد بن ابی لیلیٰ مصنف کے کلام میں یہی شخص مراد ہے ان ہی پر جرح کی گئی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے وقد تکلم بعض اھل العلم فی ابن ابی لیلیٰ من قبل حفظہ سے اسی طرف اشارہ کیا آخری دو میں سے ایک عیسیٰ بن ابی لیلیٰ ہیں جو کہ ثقہ ہیں اور دوسرے عبدالرحمٰن[3] بن ابی لیلیٰ کے پوتے ہیں اور ان کو بھی ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں ان آخری دونوں کے ذکر کرنے کی اس موقع پر کوئی ضرورت نہیں۔

---

[1] **سجدہ تلاوت کا مسنون طریقہ:** درمختار میں ہے کہ سجدہ تلاوت کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو مسنون جہری تکبیروں کے درمیان اور دو مستحب قیاموں کے درمیان یہ سجدہ کیا جائیگا یعنی تالی (تلاوت کرنے والا) پہلے کھڑا ہوگا تاکہ کھڑے ہو کر سجدے میں چلا جائے اور سجدے سے سر اٹھانے کے بعد دوبارہ کھڑا ہوگا اور جاتے اور آتے ہوئے مسنون تکبیرات بھی کہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اسی طرح نقل کیا ہے پھر دوسرے قیام کے متعلق اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔

[2] حافظ رحمہ اللہ تقریب میں لکھتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰ ایک تو عبدالرحمٰن ہیں دوسرے اور تیسرے انہی کے دونوں بیٹے ہیں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور عیسیٰ بن عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، چوتھے انہی کے پوتے ہیں یعنی عبداللہ بن عیسیٰ بن عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ۔ انتہی

[3] یہ عبداللہ بن عیسیٰ بن عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ ہیں۔ صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہیں۔ ثقہ راوی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سلام سے پہلے سجدہ سہو فرمانے کا ثبوت اور اسکا جواب: (من رای قبل التسلیم فحدیثہ اصح لما روی الزھری و یحییٰ الخ) یہ روایت نسائی اور ترمذی[1] میں عبدالرحمٰن بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو رکعتیں نماز پڑھائیں اور دوسری رکعت کا تشہد پڑھے بغیر کھڑے ہو گئے لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو ہمیں آپ کے سلام کا انتظار تھا کہ آپ نے ایک تکبیر کہی پھر دو سجدے فرمائے بیٹھے ہوئے ہونے کی حالت میں سلام پھیرنے سے پہلے اور پھر سلام پھیر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ابتدائے اسلام میں تھا کیونکہ ابھی تک سہو اور سجدے کے احکامات صحابہ تک نہیں پہنچے تھے تو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر سلام پہلے پھیر دیا جائے تو صحابہ فوراً باتیں نہ شروع کر دیں خصوصاً اسلئے بھی کہ ان کی نمازوں میں شروع اسلام میں باتیں کرنے کی اجازت تھی لہٰذا اب یہ ڈر پیدا ہوا کہ اگر سجدۂ سہو میں پہلے سلام پھیر دیا جاتا تو صحابہ جلدی سے باتیں نہ شروع کر دیں تو ان کی نمازیں فاسد ہو جاتی پھر بعد میں جب یہ حکم شرعی صحابہ میں مشہور و معروف ہو گیا تو اب سجدہ سہو کے بعد سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فتفکر

باب ماجاء فی مقدار القعود فی الرکعتین الاولیین

باب قعدہ اولیٰ (یعنی پہلی دو رکعتوں کے بعد بیٹھنے) کی مقدار

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داودَ ھو الطَّیَالِسِیُّ حَدَّثَنَا شعبةُ اخبرنا سَعْدُ بن ابراھیم قال سمعتُ اَبَا عبیدة بن عبد اللّٰہ بن مسعودٍ یحدِّث عن ابیہ قال: کان رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا جلس فِی الرکعتین الاولیین کانہ علی الرَّضْفِ ۔ قال شعبةُ: ثم حَرَّکَ سَعْدٌ شَفَتَیْہ بشیءٍ فاقولُ: حتّٰی یَقُومَ؟ فیقولُ: حتّٰی یقومَ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسنٌ، اِلَّا اَنَّ ابا عبیدةَ لم یَسمعْ من اَبیہ۔ والعملُ علی ھذا عند اھل العلم: یختارونَ ان لَّا یُطِیلَ الرجلُ القعودَ فی الرکعتین الاولیین، ولا یزیدَ علی التشھد شیئاً۔ وقالوا: اِنْ زادَ علی التشھد فعلیہ سَجْدَتَا السھوِ۔ ھکذا رُوِیَ عن الشَّعْبِیِّ وغیرہ۔

---

[1] ترمذی کی یہ روایت باب سجدتی السہو قبل السلام میں عنقریب آئیگی اور جس نسائی والی روایت کو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے وہ ترمذی کی حدیث سے زیادہ واضح ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دو رکعتیں پڑھنے پر تشہد اول میں بیٹھتے تو گویا کہ وہ گرم پتھروں پر بیٹھے ہوں (یعنی جم کر نہیں بیٹھتے بلکہ ایسے بیٹھتے گویا کہ ابھی اٹھے) شعبہ کہتے ہیں پھر سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ہونٹ کو کسی چیز کے ساتھ حرکت دی اور کچھ کہا پس میں نے کہا حتی یقوم کھڑے ہونے تک؟ تو سعد رضی اللہ عنہ نے بھی کہا کہ ہاں کھڑے ہونے تک۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے مگر ابو عبیدہ کا اپنے والد سے سماع نہیں اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ کوئی شخص پہلے قعدہ کو لمبا نہ کرے اور اس میں تشہد سے زیادہ کچھ نہ پڑھے اگر تشہد پر زیادتی کر لی تو لازم ہے کہ سجدہ سہو کرے۔ شعبی رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

(قال شعبه ثم حرك سعد شفتيه بشيء) یعنی شعبہ کہتے ہیں کہ میرے استاذ سعد نے کچھ کہنے کیلئے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ حتی یقول کے الفاظ کہیں گے چنانچہ انہوں نے میرے گمان کے مطابق كانه على الرضف کے بعد حتی یقوم کے الفاظ کہے۔

باب ماجاء فی الاشَارةِ فی الصلاةِ

باب نماز میں اشارہ کرنے کا حکم

☆حدثنا قتيبه حَدَّثَنَا الليثُ بن سَعْدٍ عن بُكَيْرِ بن عبد الله بن الاَشَجِّ عن نَابِلٍ صاحبِ العَبَاءِ عن ابن عمرَ عن صُهَيْبٍ قال: مَرَرْتُ برسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يصلّي، فَسَلَّمْتُ عليه، فَرَدَّ اِلَيَّ اِشَارَةً۔ وقال: لااَعْلَمُ اِلَّا انه قال: اِشارَةً بِاِصْبَعِه۔ قال : وفى الباب عن بلالٍ، وابى هريرةَ، وانسٍ، وعائشةَ۔

☆حدثنا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا وكيعٌ حَدَّثَنَا هِشَامُ بن سَعْدٍ عن نافعٍ عن ابن عمرَ قال: قلتُ لبلالٍ: كيف كان النبى صلى الله عليه وسلم يَرُدُّ عليهم حين كانوا يُسَلِّمُونَ عليه وهو فى الصلاة؟ قال: كان يُشِيرُ بِيَدِهِ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ وحديث صُهَيْبٍ حسنٌ، لانعرفه

الامن حدیث اللیث عن بُکَیر۔ وقد رُویَ عن زیدِ بنِ اَسْلَمَ عن ابن عمر قال: قلتُ لبلالٍ: کیف کان النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یردُّ علیھم حیث کانوا یسلمون علیہ فی مسجد بنی عمرِو بن عَوفٍ؟ کان یَرُدُّ اِشارۃً۔ وکلا الحدیثین عندی صحیح، لأنَّ قصَّۃَ حدیث صُھَیبٍ غیرُ قصۃِ حدیث بلالٍ۔ وان کان ابنُ عمرَ رَوَی عنھما فَاحْتَمَلَ ان یکون سمعَ منھما جمیعاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے پاس سے گزرا تو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سلام کا جواب دیا اشارے سے۔ راوی کو شک ہے کہ شاید صہیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی کے اشارہ سے جواب دیا۔ (یعنی اشارہ سے بتایا کہ آپ نماز میں ہیں یا آپ نے ان کا سلام قبول کرلیا)۔

اس باب میں حضرت بلال، ابوہریرہ، انس، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں (ان قباوالوں کے) سلام کا کس طرح جواب دے رہے تھے؟ انہوں نے فرمایا ہاتھ سے اشارہ کر کے دے رہے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے ہم اسے لیث سے اور وہ بکیر سے روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔ زید بن اسلم سے مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد بنو عمرو بن عوف میں نماز پڑھتے ہوئے سلام کرتے تو آپ کس طرح جواب دیتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اشارے سے جواب دیتے تھے۔

(امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) اور میرے نزدیک یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ کیونکہ واقعہ صہیب اور واقعہ بلال رضی اللہ عنہ دونوں الگ الگ ہیں اگرچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ان دونوں سے روایت کرتے ہیں ہوسکتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں سے سنا ہو۔

﴿تشریح﴾

نماز میں اشارہ کرنے سے نہ فرض نماز باطل ہوتی ہے نہ نفل البتہ فرض نماز میں اشارہ کرنا مکروہ ہے نفل میں مکروہ نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کیلئے یہ اشارہ فرمایا تھا اور اس اشارہ کا ثبوت آخر عمر تک ہے تا کہ کوئی شخص اسے منسوخ نہ سمجھے۔

مسجد بنی عمرو بن عوف سے مراد مسجد قباء ہے: (فی مسجد بنی عمرو بن عوف) یہ مسجد قباء ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبا تشریف لے جاتے اور وہاں نماز ادا فرماتے تھے تو صحابہ نے جب یہ سنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں تو یہاں پہنچ کر آپ کی خدمت میں سلام کرنا شروع کیا حالانکہ آپ نماز میں تھے تو آپ نے نماز کے بعد زبانی سلام کا جواب دیا لیکن نماز کے اندر ہاتھ سے اشارہ فرماتے تھے۔

(لان قصة حديث صهيب غير قصة حديث بلال) اگر یہ واقعہ ایک ہی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ ان دونوں (حضرت بلال اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہما) صحابیوں سے مروی ہو لیکن ایک واقعہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ سے اشارہ کرنا جیسا کہ حدیث بلال رضی اللہ عنہ میں ہے اور دوسرے واقعہ میں انگلیوں سے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ[1] واقعات ہیں۔

امام ترمذیؒ کا مقصد ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ناقلین میں اضطراب کو دور کرنا ہے: ان دونوں صحابیوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ حدیث سنائی تھی[2] تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کی روایت کے مطابق الگ الگ طریقہ سے نقل کیا ہے امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہاں یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ناقلین میں جو اضطراب کا وہم پیدا ہو رہا تھا اس وہم کو دور کرنا ہے۔ یا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرنے والے راویوں سے نچلے درجہ میں راویوں میں جو اضطراب کا وہم تھا اس کو بھی رد کرنا تھا۔ اضطراب یہ تھا کہ بعض راویوں نے اس حدیث کو عن ابن عمر عن صہیب نقل کیا ہے اور بعض راویوں نے عن ابن عمر عن بلال نقل کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس حدیث کو دونوں سے سنا ہو گا لہٰذا یہاں کوئی اضطراب نہیں۔

---

[1] ہمارے شیخ کا میلان بذل المجہود علی سنن ابی داؤد میں اسطرف ہے کہ یہاں پر تین روایات ہیں۔ دو روایتیں صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور ایک روایت بلال رضی اللہ عنہ سے انہوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ پر بھی اعتراض کیا ہے۔'' فارجع الیہ لو شئت

[2] رویا معروف کے صیغہ ہیں یعنی صہیب اور بلال رضی اللہ عنہما نے اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کو یہ روایات بیان کیں۔

باب ماجاء اَنَّ التَّسبیحَ للرجالِ والتصفیق للنِّساءِ

باب اس بارے میں کہ مردوں کیلئے تسبیح ہے اور عورتوں کیلئے تصفیق تالی بجانا ہے

☆حدثنا هناد حَدَّثنا ابو معاويةَ عن الاعمشِ عن ابی صالحٍ عن ابی هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: التَّسبيحُ للرجالِ، والتصفيق للنساءِ۔

قال: وفی الباب عن علیٍّ، وسهل بن سعدٍ، وجابرٍ، وابی سعيدٍ، وابن عمرَ۔ وقال علیٌّ: كنتُ اِذا استاذنتُ علی النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم وهو يصلّی سَبَّحَ۔ قال ابو عيسی: حديث ابی هريرة حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ عليه عند اهل العلم۔ وبه يقولُ احمدُ، واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تسبیح مردوں کیلئے اور عورتوں کے لئے ہاتھ پر ہاتھ مارنا ہے (یعنی اگر امام بھول جائے تو اسے مطلع کرنے کیلئے یا نماز میں کسی اور ضرورت کے پیش آنے کی صورت میں)۔

اس باب میں حضرت علی، سہیل بن سعد، جابر، ابوسعید، اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت طلب کرتا اور آپ نماز پڑھ رہے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ کہتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے احمد اور اسحٰق رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

(قوله التصفيق للنساء) لیکن اگر عورتیں نماز میں سبحان اللہ کہہ دیں تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی[1] جیسا کہ بعض جگہ

---

[1] **عورتوں کیلئے تصفیق اور مردوں کیلئے سبحان اللہ کہنا سنت ہے اسکے برعکس ہو تو جائز مگر خلاف سنت ہے:** درمختار میں ہے کہ اگر اس حکم کے برعکس مرد تصفیق یا عورت سبحان اللہ کہے تو نماز فاسد نہیں ہوگی لیکن ان دونوں نے خلاف سنت کام کیا ہے۔ انتہی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راجح قول کے مطابق عورت کی آواز ستر نہیں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ مشہور ہے کہ عورتوں کے سبحان اللہ کہنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اسی طرح عورت پر یہ لازم نہیں ہے[۲] کہ اپنی ہتھیلی کے اندرون کو دوسری ہتھیلی کے ظاہر پر مارے۔

(قال علی رضی اللہ عنه اذا استاذنت علی النبی صلی اللہ علیه و سلم سبح) اس سبحان اللہ کہنے کی غرض یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ اشارہ کرر ہے تھے کہ میرے نماز سے فارغ ہونے تک تم ٹھہرے رہو۔

باب ماجاء فی کراھیة التّثاوبِ فی الصلاةِ

باب نماز میں جمائی لینے کی کراہت کے بیان میں

☆حدثنا علیٌّ بن حُجْرٍ اخبرنا اِسمٰعیلُ بن جعفرٍ عن العلاءِ بن عبد الرحمٰن عن ابیه عن ابی ھریرۃ ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: التّثاوُبُ فی الصلاةِ من الشیطانِ، فاِذا تَثَائَبَ احدُ کم فَلْیَکْظِمْ مَا استطاعَ۔ قال : وفی الباب عن ابی سعیدٍ الخُدْرِیِّ، وجَدِّ عَدِیِّ بنِ ثابتٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی ھریرۃ حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد کرِہَ قومٌ من اھل العلم التّثاوُبَ فی الصلوٰۃ قال ابراھیم انی لَاَرُدُّ التثاوب بِالتَّنَحْنُحِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمائی لینا نماز میں شیطان کی طرف سے ہے پس جب تم میں سے کوئی جمائی لے تو جتنا ممکن ہو سکے منہ بند کر کے روکنے کی کوشش کرے۔

اس باب میں ابو سعید خدری، اور عدی بن ثابت رضی اللہ عنہما کے دادا سے بھی روایت ہے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) بحر میں حلیہ سے نقل کیا ہے کہ یہی قول راجح ہے اور نہر میں اسی قول کو قابلِ اعتبار کہا ہے اس کے مقابلہ میں (نوازل) کی یہ روایت ہے کہ عورت کی آواز بھی ستر ہے۔ الکافی میں ہے کہ عورت جہراً تلبیہ نہ کہے کیونکہ اس کی آواز ستر ہے محیط میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اس قول کے مطابق جب عورت نماز میں جہری قرأت کرے تو اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہیئے۔ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو سبحان اللہ کہنے کی بجائے تصفیق کا حکم دیا ہے۔ جب اس کے امام کو کوئی غلطی لگ رہی ہو اور وہ اپنے امام کو تنبیہ کرنا چاہے۔ انتہی

[۲] یعنی عورت پر تصفیق ضروری نہیں ہے اسلئے فقہاء کہتے ہیں کہ عورت کو تصفیق کرنا چاہیئے لازم نہیں کہتے اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور اہل علم کی ایک جماعت نے نماز میں جمائی لینے کو مکروہ کہا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں میں کھنکھارنے کے ذریعے جمائی کو لوٹا دیتا ہوں۔

﴿تشریح﴾

جمائی نماز میں ہو یا نماز سے باہر مطلقاً ہی ناپسندیدہ فعل ہے لیکن حدیث شریف میں نماز کی تخصیص اسلئے ہے کہ نماز کے اہتمام شان کو بتلانا ہے نیز چونکہ یہاں پر نماز کے احکام بیان کرنا مقصود ہیں اسلئے نماز کی تخصیص کی گئی۔

(التثاوب فی الصلوٰۃ من الشیطن) اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اس پر خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ جمائی سستی اور غفلت کی وجہ سے اور نماز کے عظیم الشان ہونے کی پروا نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس حالت میں یہ خیال کرے[1] کہ انبیاء علیہم السلام کو جمائی نہیں آتی تھی تو جمائی لوٹ جاتی ہے۔

باب ماجاء اَنَّ صلاۃَ القاعِدِ علی النِّصْفِ من صلاۃ القائم

باب بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے ثواب سے آدھا ہے

☆ حَدَّثَنَا علیُّ بن حُجْرٍ حَدَّثَنَا عیسی بن یونسَ حَدَّثَنَا حسینٌ المُعَلِّمُ عن عبد اللّٰہ بن بُرَیْدَۃَ عن عِمْرَانَ بن حُصَیْنٍ قال: سَاَلْتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علیہ وسلم عن صلاۃ الرجلِ وھو قاعدٌ؟ فقال: مَن صلّی قائماً فھو افضلُ، ومن صلّی قاعداً فَلَہٗ نصفُ اَجْرِ القائم، ومن صَلّی نائماً فَلَہٗ نصفُ اجر القاعِدِ۔

قال: وفی الباب عن عبد اللّٰہ بن عَمْرٍو، وانسٍ، والسَّائِبِ، وابن عُمَرَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عمرانَ بن حُصَیْنٍ حدیث حسن صحیحٌ۔

---

[1] **جمائی دور کرنے کا طریقہ:** قال الزاہدی: جمائی کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں یہ خیال پیدا کرے کہ انبیاء علیہم السلام کو کبھی جمائی نہیں آئی۔ امام قدوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کا کئی مرتبہ تجربہ کیا تو ہم نے ایسا ہی پایا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا تجربہ کیا اور تجربہ کامیاب پایا۔ قلت: میں نے بھی نماز کے اندر اور باہر متعدد مرتبہ اس کا تجربہ کیا تو ایسا ہی پایا اور یہ اللہ رب العزت کے عجائب قدرت میں سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کے علو شان کا بیان ہے۔ (از مترجم: اس حقیر نے بھی اس کا بارہا تجربہ کیا تو ایسا ہی پایا۔

☆وقدرُویَ هذا الحدیثُ عن ابراهیم بن طَهْمَانَ بهذا الإسنادِ، اِلّا انه یقولُ: عن عمرانَ بن حُصَیْنٍ قال: سالتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن صلاةِ المریضِ؟ فقال: صلِّ قائماً، فِان لَّم تستطعْ فقاعداً، فِان لَّم تستطعْ فَعَلَی جَنبٍ۔ حَدَّثَنا بذلك هناد حَدَّثَنا وکیعٌ عن ابراهیم بن طَهْمَانَ عن حُسینٍ المُعَلِّمِ: بهذا الحدیث۔

قال ابو عیسی: ولانعلم احداً رَوَی عن حسینٍ المُعَلِّمِ نحوَ روایة ابراهیم بن طَهْمَانَ۔

وقد رَوَی ابو اُسَامَةَ وغیرُ واحدٍ عن حسینٍ المُعَلِّمِ نحوَ روایةِ عیسی بن یونسٍ۔ ومعنی هذا الحدیث عند بعض اهل العلم: فی صلاة التَّطَوُّعِ۔

☆حدثنا محمد بَشَّارٍ حَدَّثَنا ابن اَبِی عَدِیٍّ عن اَشْعَثَ بن عبد الملك عن الحسنِ قال: اِنْ شاءَ الرجلُ صلَّی صلاةَ التَّطَوُّعِ قائما و جالساً و مضطجعاً۔ واختلف اهلُ العلم فی صلاة المریضِ اِذا لم یستطعْ ان یصلِّیَ جالساً۔

فقال بعض اهل العلم: انه یصلِّی علی جَنْبِه الایمنِ۔ وقال بعضهم: یصلِّی مستلقِیاً علی قفاه، ورجلاه اِلی القبلةِ۔ وقال سفیان الثَّوْرِیُّ فی هذا الحدیث: مَن صلَّی جالساً فله نصفُ اجر القائمِ،قال: هذا للصَّحیحِ ولِمَنْ لیسَ له عذرٌ (یعنی فی النوافل) فاما مَن کان له عذرٌ منْ مرضٍ او غیره فصلَّی جالساً۔فله مثلُ اجر القائمِ۔ وقد رُویَ فی بعض هذا الحدیثِ مثلُ قول سفیانَ الثَّوْرِیِّ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے شخص کے بارے میں پوچھا۔فرمایا جو کھڑے ہو کر نماز پڑھے وہ افضل ہے اور جو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کیلئے کھڑے ہو کر پڑھنے والے سے آدھا ثواب ہے اور جو لیٹ کر نماز پڑھے اس کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے سے آدھا ثواب ہے۔

اس باب میں حضرت عبداللہ بن عمرو، انس اور سائب رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمران بن حصین کی حدیث حسن صحیح ہے۔

اور روایت کی گئی ہے یہ حدیث ابراہیم بن طہمان سے بھی اسی سند کے ساتھ لیکن وہ اس میں کہتے ہیں کہ عمران بن حصین

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیمار کی نماز کے بارے میں پوچھا۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو اگر بیٹھ کر بھی پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر۔

اس حدیث کو ھناد، وکیع سے وہ ابراہیم بن طھمان سے اور وہ حسین معلم سے اسی اسناد سے نقل کرتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم کسی اور کو نہیں جانتے کہ اس نے حسین معلم سے ابراہیم بن طھمان کی روایت کے مثل روایت کی ہو۔

ابواسامہ اور متعدد راوی حسین معلم سے عیسی بن یونس کی مثل روایت کرتے ہیں۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ حدیث نفل نماز کے بارے میں ہے۔

ہم سے روایت کی محمد بن بشار نے انہوں نے ابن ابی عدی سے انہوں نے اشعث بن عبدالملک سے انہوں نے حسن سے کہ حسن نے کہا آدمی نفل نماز چاہے کھڑے ہو کر پڑھے چاہے بیٹھ کر یا چاہے لیٹ کر۔ اور مریض کی نماز کے بارے میں جو بیٹھ کر نہ پڑھ سکتا ہو اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں (اگر) وہ (بیٹھ کر نہ پڑھ سکتا ہو تو) دائیں کروٹ پر لیٹ کر نماز پڑھے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ چت لیٹ کر پاؤں قبلہ کی طرف پھیلا کر نماز پڑھے۔ اس حدیث کے متعلق سفیان ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کیلئے کھڑے ہو کر پڑھنے والے سے آدھا ثواب ہے یہ تندرست شخص کیلئے ہے اور جس کے ساتھ کوئی عذر نہ ہو اور جس شخص کو عذر، بیماری وغیرہ ہو پس اگر وہ بیٹھ کر پڑھے تو اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے برابر اجر ملے گا اور بعض احادیث کا مضمون سفیان ثوری رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہے۔

﴿تشریح﴾

اشکال: (حدیث وصلوٰۃ النائم علی النصف من صلوٰۃ القاعد) اس حدیث کے ظاہر پر اشکال ہے کہ لیٹ کر پڑھنے والا شخص اگر بیماری کی وجہ سے لیٹ کر پڑھ رہا ہے جیسا کہ دوسری روایت میں تصریح ہے تو اس بیمار شخص کو آدھا ثواب نہیں بلکہ پورا ثواب ملنا چاہیئے اور اگر اس کو کوئی بیماری یا عذر نہیں ہے پھر بھی لیٹ کر پڑھ رہا ہے تو اس کا لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اس کو اس پر ثواب ملے؟[1] اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث باب میں ایسا بیمار شخص مراد ہے جس

---

[1] **اشکال کی وضاحت:** اس اشکال کی وضاحت یہ ہے کہ حدیث باب کو نہ فرض نماز پر محمول کر سکتے ہیں اور نہ ہی نفل نماز پر۔ فرض نماز تو اسلئے نہیں ہو سکتی کہ بغیر عذر کے بیٹھ کر فرض پڑھنا جائز ہی نہیں چہ جائیکہ آدھا ثواب ملے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں کھڑے ہونے کی طاقت تو ہے لیکن وہ مشقت سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اس مشقت کی حالت میں کھڑے ہونے پر جو ثواب ہے تو اس ثواب کا آدھا حصہ اس مشقت کی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھنے میں ملیگا۔ لیکن یہ حکم نفل کے ساتھ خاص ہے اسی طرح جس بیمار پر بیٹھنا مشکل ہو تو یہ بیمار شخص اپنے بیٹھنے کی حالت میں مشقت کے ساتھ جو نفل پڑھیگا اس پر جو ثواب ہے تو اس بیمار کو لیٹ کر نماز پڑھنے[1] میں اس ثواب کا آدھا حصہ ملیگا۔ لیکن اگر یہ شخص لیٹ کر فرض نماز پڑھ رہا ہے تو فرض نماز لیٹ کر پڑھنا ایسے شخص کیلئے جائز نہیں ہاں اگر کوئی شخص لیٹ کر نفل پڑھتا ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اگر عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اسے آدھا نہیں بلکہ پورا ثواب ملیگا۔ نفل نماز اس لئے نہیں ہو سکتی کہ جمہور کے نزدیک بغیر عذر کے لیٹ کر نفل پڑھنا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ خطابی اور ابن عبدالبر وغیرہ نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ بغیر عذر کے لیٹ کر نفل پڑھنا منع ہے۔ خطابی فرماتے ہیں میں اس حدیث کی تفسیر یہ کرتا تھا کہ اس سے مراد نفل نماز ہے یعنی جو آدمی صحیح اور تندرست ہو اس کیلئے آدھے ثواب کا ذکر ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "من صلی نائما" الخ نے اس معنی کو غلط قرار دے دیا کیونکہ لیٹ کر نفل پڑھنا بغیر عذر کے صحیح نہیں البتہ بیٹھ کر بغیر عذر کے نفل پڑھنا صحیح ہے کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ علماء میں سے کوئی ایک عالم نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کو جائز کہتے ہوں۔ لہٰذا اگر حدیث کا یہ ٹکڑا صحیح ہو اور یہ بھی تحقیق ہو جائے کہ کسی راوی نے مضطجع کو قاعد پر قیاس کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس جملہ "من نام صلی نائما الخ" اضافہ نہیں کیا جیسا کہ مسافر بغیر عذر کے اپنی سواری پر نفل پڑھ سکتا ہے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کر یہ لفظ مدرج من الراوی نہ ہو تو میرے نزدیک حدیث کی یہ تفسیر ہے کہ نفل نماز صحیح اور تندرست شخص کو (جو کہ بیٹھنے پر قادر ہے) لیٹ کر پڑھنا اس حدیث کی وجہ سے جائز ہے۔

اشکال کی وضاحت کے بعد حدیث کا مطلب: اب میری رائے یہ ہے کہ حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مراد وہ بیمار شخص ہے جو فرض نماز ادا کر رہا ہے اور ایسا بیمار ہے کہ مشقت کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے تو حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا کہ ایسا مریض کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں اتنا ثواب کما رہا ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے اس کو آدھا ثواب ملیگا تو اگر چہ اس کیلئے بیٹھنا جائز ہے مگر کھڑے ہو کر پڑھنے کی ترغیب مقصود ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ قابل اعتماد ہے اس کی تائید امام بخاری رحمہ اللہ کے صنیع سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ اور انس رضی اللہ عنہما کی الگ الگ حدیثوں کو مذکورہ باب میں ذکر کیا ہے جبکہ وہ دونوں حدیثیں صلوٰۃ المفترض سے متعلق ہیں۔ انتہی

قلت: اس حدیث کی اور بہت سی توجیہات ہیں ایک توجیہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے کی ہے اور دوسری توجیہات کی تفصیل ان کے مقام پر ہے۔

[1] مجھے اس مسئلہ کی تصریح تو نہیں ملی لیکن قواعد اور اصول کا مقتضیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ نوافل کے احکام میں توسع ہوتا ہے اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر نفل نماز میں تھک جائے تو سہارا لے سکتا ہے اور اس کی بہت سی نظیریں ہیں۔ وللہ در الشیخ ما اجاد

حالانکہ وہ مشکل سے بیٹھنے پر بھی قدرت رکھتا ہے تو اسے مشقتِ شدیدہ کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھنے کے ثواب کا آدھا ثواب ملیگا۔

حسن بصریؒ کا مذہب: یہ سب کچھ مشہور مذاہب کے مطابق ہے حسن بصریؒ کے مذہب[1] میں نفل نماز کھڑے ہو کر بیٹھ کر، لیٹ کر، کروٹ پر، ہر طرح صحیح ہے۔ لہٰذا ان کے مذہب پر حدیث میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ اس وقت حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جو آدمی بغیر عذر کے لیٹ کر نماز پڑھے تو اسے قاعد کا آدھا ثواب ملیگا اور اس طرح لیٹ کر نماز پڑھ حسن بصری رحمہ اللہ کے مذہب میں جائز ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یَتطوَّعُ جالساً

باب نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے کا بیان

☆حدثنا الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكُ بن انسٍ عن ابن شهابٍ عن السَّائِب بن یزیدَ عن المُطَّلِبِ بن ابی وَدَاعَةَ السَّهْمِیِّ عن حَفْصةَ زوجِ النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم انها قالت: مارَاَیْتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم صلّٰی فی سُبْحَتِهِ قاعداً ، حَتّٰی کَانَ قَبْلَ وفاتِهِ بعامٍ ، فاِنه کان یصلّی فی سُبْحَتِهِ قاعداً، ویَقْرَأُ بالسُّورةِ ویُرَتِّلُهَا ، حتّٰی تکونَ اَطْوَلَ مِن اَطْوَلَ منها۔ وفی الباب عن اُمِّ سلمة، وانس بن مالكٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث حفصةَ حدیث حسن صحیح۔ وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم : انه کان یصلّی من اللَّیْلِ جالساً، فِاذا بَقِیَ مِن قراءته قَدْرُ ثلاثینَ او اربعینَ آیةً قام فقراَ ، ثم رکع، ثم صَنَعَ فی الرکعة الثانیة مثلَ ذٰلك۔ ورُوِیَ عنه: انه کان یصلّی قاعداً، فاِذا قرأَ وهو قائم ، رکعَ وسجد۔ وهو قائمٌ، واذا قرَا وهو قاعدٌ رکعَ وسجدَ وهو قاعدٌ۔ قال احمدُ واسحٰقُ: والعملُ علی کلا الحدیثین۔ کأنهما رَاَیَا کلا الحدیثین صحیحاً معمولاً بِهِما۔

☆حدثنا الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكٌ عن ابی النَّضْرِ عن ابی سلمةَ عن عائشةَ: ان النبیَّ

---

[1] حافظ نے شافعیہ سے ایک روایت حسن بصری رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق ذکر کی ہے اسی طرح بعض مالکیہ سے بھی یہ مذہب منقول ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔

صلی اللّٰه علیه وسلم کان یصلّی جالساً، فیقراء وهو جالسٌ، فإذا بَقِی مِن قراء ته قَدْرُ مایکونُ ثلاثین او اربعین آیة قام فقراً وهو قائم، ثم رکع وسجد، ثم صَنع فی الرکعةِ الثانية مثلَ ذلك۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا احمدُ بن مَنیعٍ حَدَّثَنا هشیم اخبرنا خالدٌ، وهو الحَذّاءُ، عن عبد اللّٰه بنِ شَقیقٍ عن عائشة قال: سالتُها عن صلاةِ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: عن تَطَوُّعِهِ؟ قالت: کان یصلّی لیلاً طویلاً قائماً، ولیلاً طویلاً قاعداً، فإذا قرأ وهو قائمٌ رکعَ وسجدَ وهو قائمٌ، واذا قرأ وهو جالسٌ رکعَ وسجدَ وهو جالسٌ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمه﴾

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (ام المومنین) فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی تہجد بیٹھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات سے ایک سال پہلے تہجد بیٹھ کر پڑھنے لگے اور اس میں جب کوئی سورت پڑھتے تو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے یہاں تک کہ وہ طویل سے طویل سورہ کی مانند ہو جاتی۔

باب میں ام سلمہ، اور انس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث حفصہ رضی اللہ عنہا حسن صحیح ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ جب ان کی قرأت میں تیس یا چالیس آیات رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھنے لگتے پھر رکوع کرتے اور دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر قرأت کرتے تو رکوع اور سجدہ بھی کھڑے ہو کر کرتے اور جب بیٹھ کر قرأت کرتے تو رکوع اور سجدہ بھی بیٹھ کر ہی کرتے۔

امام احمد و اسحق فرماتے ہیں دونوں حدیثوں پر عمل ہے گویا کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور ان پر عمل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے پس قرأت بھی بیٹھ کر کرتے اور جب تیس چالیس آیات باقی رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر قرأت شروع کر دیتے پھر رکوع و سجود کرتے اور دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کرتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نماز کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم طویل رات کھڑے کھڑے اور طویل رات تک بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے تھے جب کھڑے ہو کر قرأت فرماتے تو رکوع وسجود بھی کھڑے ہو کر کرتے اور جب بیٹھ کر قرأت فرماتے تو رکوع وسجود بھی بیٹھ کر ہی کرتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

احادیث کی مختلف صورتوں میں تطبیق: حدیث باب میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی تینوں احادیث تین مختلف افعال و احوال پر محمول ہیں یا ان احادیث میں یہ تطبیق ہوگی کہ "فاذا قرء وھو قائم رکع سجد وھو قائم" اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو بیٹھ کر نماز شروع کی ہوئی تھی پھر رکوع سے ذرا پہلے کھڑے ہو جاتے اور بقیہ قرأت کھڑے ہو کر کرتے پھر رکوع سجدہ کھڑے ہونے کی حالت میں کرتے تھے۔

بہرحال اس روایت میں اس کا ذکر ہے کہ نماز بیٹھ کر شروع کی ہوتی تھی اور جب رکوع کرنے کا ارادہ ہوتا تو پہلے کھڑے ہو جاتے[1] قرأت کرتے پھر رکوع کرتے اس طرح تمام روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ یہ صورت کہ کھڑے ہو کر نماز شروع کی جائے پھر بیٹھ جائے اس کا ثبوت حدیث سے نہیں ملتا اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ صورت جائز مع الکراہۃ ہے[2]

---

[1] **حدیث میں مذکور سنت طریقے پر عمل کرنے کی ایک صورت:** اگر کوئی شخص اس سنت پر عمل کرنا چاہے تو علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کیلئے افضل یہ ہے کہ قرأت کے ختم ہونے کے قریب کھڑا ہو جائے پھر تھوڑی سی قرأت کرلے پھر رکوع کرے تاکہ سنت طریقہ پر عمل ہو جائے لیکن اگر اس شخص نے بیٹھ کر پوری قرأت کرلی پھر سیدھا کھڑا ہو گیا پھر رکوع میں گیا تو یہ بھی جائز ہے اور اگر بیٹھ کر قرأت مکمل کرنے کے بعد پورا سیدھا کھڑا نہیں ہوا بلکہ رکوع قائما کیا تو یہ رکوع ادا نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو یہ رکوع قائما ہے اسلئے کہ اس سے پہلے قیام نہیں اور نہ ہی رکوع قاعداً ہے جو کہ ظاہر ہے۔ انتھی کذافی الاوجز

[2] **نفل نماز میں امام صاحب کی طرف کھڑے ہونے کے بعد بیٹھنے کے جائز مع الکراہۃ والے قول کی نسبت درست نہیں:** درمختار میں ہے کہ جو آدمی کھڑے ہونے پر قادر ہو پھر بھی بیٹھ کر نفل شروع کر سکتا ہے۔ اسی طرح نفل کھڑے ہو کر شروع کرنے کے بعد اصح قول کے مطابق بلا کراہت بیٹھ سکتا ہے جیسا کہ بیٹھ کر شروع کرنے کے بعد بلا کراہت کھڑا ہو سکتا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قولہ وکذا بناء اُاس جملہ سے مصنف نے صاحبین کے اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(قولہ ویرتلها حتی تکون اطول منها) یعنی ترتیل سے قرآن کریم کی تلاوت کرنے سے قرآن پڑھنے کا وقت مزید طویل ہو جاتا تھا اور وہ بہت لمبی سورۃ معلوم ہوتی تھی۔

(حدثنا الانصاری قال حدثنا معن الخ) حدثنا احمد بن منیع قال حدثنا ھشیم۔ یہ دونوں روایتیں گذشتہ مجمل روایتوں کی تفصیل ہیں۔ پہلے مصنف نے وروی، وروی عنہ سے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا تھا اب دونوں کی سندوں کا بیان ہے۔

باب ماجاء ان النبی ﷺ قال انی لاَسمع بکاء الصبی فی الصلوٰۃ فاُخفّفُ

باب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نماز میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز ہلکی کر دیتا ہوں

حدثنا قتیبة نا مروان بن معاویة الفزاری عن حمید عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ ان رسول الله ﷺ قال والله انی لاَسمع بکاء الصبی وانا فی الصلوٰۃ فاُخَفِّفُ مَخافَةَ اَنْ تُفْتَتِنَ اُمُّهٗ۔

وفی الباب عن قتادة وابی سعید وابی هریرة ـ قال ابو عیسیٰ حدیث انس حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی قسم جب نماز کی حالت میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز ہلکی کر دیتا ہوں اس اندیشے سے کہ کہیں اس کی ماں پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

اس باب میں حضرت قتادہ، ابو سعید، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خزائن میں لکھا ہے کہ اگر نماز کھڑے ہو کر شروع کرے پھر بلا عذر پہلی یا دوسری رکعت میں بیٹھ جائے تو استحساناً یہ جائز ہے صاحبین کا اس میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں اس طرح کرنا مکروہ ہے۔ حلبی نے لکھا ہے کہ اصح قول کے مطابق امام صاحب کے ہاں مکروہ نہیں ہے۔ اس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس جملہ "والاصح لا" سے درمختار صاحبِ وقایہ اور شرح نقایہ وغیرہ پر رد ہے۔ جنہوں نے امام صاحب کی طرف کراہت کی نسبت کی ہے۔ انتہی۔ قلت: جمہور کے نزدیک دونوں صورتیں جائز ہیں اگرچہ اس میں کچھ اختلاف ہے جیسا کہ اوجز المسالک میں تفصیل سے موجود ہے۔

﴿تشریح﴾

ایک مسئلہ کا استنباط: اخفف کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جتنی مقدار پڑھنے کا ارادہ کیا ہوتا تھا اس سے کم پڑھ دیا کرتا ہوں۔ یہاں سے یہ مسئلہ معلوم[1] ہوا کہ مقتدیوں کی رعایت امام پر ضروری ہے اور ایسی حالت میں نماز کی قرأت میں کمی کرنا جائز ہے[2]۔

باب ماجاء لاتُقبَلُ صلاۃُ الحائض اِلا بِخِمَارٍ

باب بالغ عورت کی نماز بغیر چادر کے قبول نہیں ہوتی

☆ حدّثنا هناد قبيصة عن حماد بن سلمة عن قتادةَ عن ابن سيرينَ عن صفيّةَ ابنَتِ الحرثِ عن عائشة قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لاتُقبَلُ صلاةُ الحائِض اِلّا بِخِمَارٍ۔ قال: وفى الباب عن عبد اللّٰه بن عَمْرٍو۔(وقولُه: الحائض يعنى المراَة البالغ، يعنى اِذا حاضَتْ)

قال ابو عيسى: حديث عائشةَ حديث حسن۔ والعملُ عليه عند اهل العلم: اَنَّ المراَةَ اذا ادركت فصلَّتْ وشئ من شعرِها مكشوفٌ۔ لا تجوزُ صلاتِها۔

وهو قولُ الشافعيِّ: قال: لاتجوزُ صلاةُ المراة وشئ من جسدها مكشوفٌ۔ قال الشافعيُّ: وقد قيلَ: اِن كان ظهرُ قدميها مكشوفاً فصلاتُها جائزة۔

---

[1] **نماز میں مقتدیوں کی رعایت میں قرأت میں تخفیف کرنے کا حکم:** کیونکہ نماز بہترین فریضہ ہے تو اگر کوئی سبب نماز کو ہلکا کرنے کا ذریعہ بنے تو نماز کو ہلکی کر کے پڑھنی چاہیئے اسی وجہ سے صاحبِ درمختار نے لکھا ہے کہ مقتدیوں پر سنت مقدار سے زیادہ لمبی قرأت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی اذکارِ مسنونہ میں زیادتی کا حکم ہے چاہے مقتدی راضی ہوں یا ناراض۔ کیونکہ حدیث میں مطلقاً امام کو تخفیف صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ شرنبلالیہ میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ مقتدیوں میں سے سب سے کمزور مقتدی کی رعایت کے ساتھ نماز پڑھانی چاہیئے اور یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے رونے کی آواز سنی تو فجر کی نماز میں معوذتین کی تلاوت کی۔ انتہی

[2] اس حدیث سے ایک مشہور اختلافی مسئلہ پر استدلال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آنے والے مقتدی کیلئے رکوع کو امام لمبا کردے تاکہ مقتدی رکوع میں شامل ہو جائے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالغ عورت کی نماز بغیر چادر کے قبول نہیں ہوتی۔

اس باب میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا حسن ہے اور اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ عورت جب بالغ ہو جائے اور نماز پڑھے اور بالوں میں سے کچھ بال کھلے ہوں تو نماز جائز نہیں ہوگی۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ عورت کے جسم میں سے کچھ حصہ بھی کھلا ہو تو نماز نہیں ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ اگر اس کے پاؤں کا ظاہری حصہ کھلا رہ جائے تو نماز صحیح ہو جائیگی۔

﴿تشریح﴾

حدیث میں حائض سے مراد: یہاں پر حدیث میں حائض سے مراد بالغہ عورت ہے یہ مراد نہیں کہ وہ عورت جس کو بالفعل اور اسی وقت خون آرہا ہو کیونکہ ایسی عورت کا تو نماز پڑھنا ہی صحیح نہیں چہ جائیکہ اس کی نماز قبول ہو۔

نماز میں نمازی کے ستر میں سے کوئی عضو ربع سے کم کھل جائے تو مفسدِ صلوٰۃ نہیں اور ربع مفسدِ صلوٰۃ ہے: عرف عام میں اور لغت میں اگر کسی عورت نے اس طرح دوپٹہ اوڑھا ہوا ہے کہ اس کے سر کا کچھ حصہ ظاہر ہو رہا ہے پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دوپٹہ اوڑھا ہوا ہے اس سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نماز کی دوسری بعض شرائط کے اوپر قیاس کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عورت کے چوتھائی سر کے بقدر اگر سر کھلا ہوا ہو تو یہ معاف ہے۔ البتہ ستر عورت ایسی شرط ہے کہ اس میں ربع عضو کا ظاہر ہونا معاف نہیں (عورت غلیظہ کا تھوڑے سے حصہ کا ظاہر ہو جانا بھی مفسد صلوٰۃ ہے۔ اضافہ از مترجم) لہٰذا اگر عورت کے سر کا چوتھائی حصہ سے کم کھلا ہو تو اس کی نماز جائز ہو جائیگی اور اگر چوتھائی حصہ سر کا کھلا ہے تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ یہی حکم مرد و عورت کے ان تمام اعضاء کا ہے جن کا ستر ضروری ہے۔ عورتوں کے بالوں کا یہ حکم ہے کہ جو بال لٹک رہے ہوں تو ان بالوں کا حکم ایک مستقل عضو کے حکم کی طرح ہے لہٰذا اگر ان لٹکے ہوئے بالوں کا چوتھائی حصہ ظاہر ہو گیا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ جیسا کہ بالوں کا جوڑا بنا ہوا ہو اس میں بھی چوتھائی بالوں کا اعتبار ہے۔

نماز میں قدمین کے ستر میں داخل ہونے میں مختلف اقوال ہیں: (قال الشافعی رحمہ اللہ وقد قیل ان کا ن ظهر قدمیها مكشوفا فصلوتها جائزة) اس مسئلہ میں تو کوئی اختلاف[1] نہیں کہ عورت کے پاؤں کا اندرونی حصہ ستر میں داخل ہے لہٰذا عورت پر واجب ہے کہ اس طرح سجدہ کرے کہ پاؤں کا اندرون ظاہر نہ ہو۔

مسئلۃ القدمین میں اقوالِ ثلثہ اور راجح قول کی تعیین: (از مترجم: ہدایہ، شرح جامع الصغیر لقاضی خان میں اس کو ترجیح دی ہے کہ قدمین ستر میں داخل نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قدمین ستر میں داخل ہیں اور تیسرے قول میں یہ قدمین نماز میں ستر میں داخل نہیں خارج صلوٰۃ میں ستر میں داخل ہیں۔ البحر الرائق ص ۲۷۰: جلد ۱۔ تحت قول المصنف وبدن الحرة عورة الا وجهها وكفيها وقدميها۔ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) پاؤں کے ظاہری حصہ کے متعلق اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں یہ ستر میں داخل نہیں جیسا کہ یہاں سے معلوم ہو رہا ہے۔ حنفیہ میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے یہ تفصیل کی ہے کہ داخل صلوٰۃ میں پاؤں کا ظاہری حصہ بھی ستر ہے خارج صلوٰۃ میں ستر نہیں۔ لیکن چونکہ اس میں حرج شدید ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر پاؤں کا ظاہری حصہ[2] کھلا ہو تب بھی عورت کی نماز ہو جانی چاہیئے۔

---

[1] یعنی ہمارے اور شوافع کے مذہب میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ سیاق کلام سے معلوم ہو رہا ہے اور الارشاد الرضی میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ یہ نقل مذاہب حنفیہ کے مسئلۃ القدم میں تین اقوال میں سے ایک قول پر مبنی ہے۔ جس کی تفصیل در مختار میں اس طرح ہے کہ آزاد عورت کا تمام بدن یہاں تک کہ اس کے وہ بال جو لٹک رہے ہیں اصح قول کے مطابق سب ستر میں داخل ہے سوائے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے تو ہتھیلی کا ظاہری حصہ ہمارے ہاں ستر میں داخل ہے راجح قول کے مطابق دونوں پیر بھی ستر میں داخل نہیں ہیں۔ اس طرح عورت کی آواز بھی راجح قول میں ستر ہے اور دونوں کلائیاں مرجوح قول کے مطابق ستر ہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ تین اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ دونوں پاؤں ستر میں داخل نہیں ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں پاؤں مطلقاً ستر میں داخل ہیں۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں پاؤں نماز کے باہر خارج صلوٰۃ میں ستر میں داخل ہے۔ پھر علامہ شامی رحمہ اللہ نے تفصیل سے اقوال نقل کئے ہیں۔ فارجع الیہ لو شئت

[2] بلکہ باطن قدم اگر کھلا رہ جائے تو بھی نماز ہو جائیگی چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ عورت کا قدم ستر میں داخل نہیں اور یہی اصح قول ہے۔ در مختار میں اس کو معتمد قول کہا گیا ہے۔

باب ماجاء فی کراهیةِ السَّدْلِ فی الصلاۃِ

باب نماز میں سدل (کپڑا لٹکانا) مکروہ ہے

☆حدثنا هناد حَدَّثَنا قبیصة عن حماد بن سلمة عن عِسْلِ بن سُفْیانَ عن عطاء بن ابی رَبَاحٍ عن ابی هریرةؓ قال نهی رسول الله ﷺ عن السدل فی الصلوٰة وفی الباب عن ابی جُحَیْفَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ ابی هریرةَ لانعرفهُ من حدیث عطاء عن ابی هریرةَ مرفوعاً اِلّا من حدیثِ عِسْلِ بن سفیانَ۔وقد اختلف اهل العلم فی السَّدْلِ فی الصلاۃِ: فکَرِهَ بعضُهم السدلَ فی الصلاۃِ، وقالوا: هکذا تَصْنَعُ الیهودُ۔ وقال بعضُهم: اِنما کُرِهَ السدلُ فی الصلاة اذا لم یکن علیه اِلّا ثوبٌ واحدٌ، فَاَمَّا اذا سَدَلَ علی القمیص فلا بَأسَ۔ وهو قولُ احمدَ۔ وکره ابن المبارکِ السدلَ فی الصلاۃ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سدل سے منع فرمایا۔

اس باب میں ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ہم عطاء عن ابی ہریرۃ مرفوع روایت کے علاوہ نہیں جانتے جس کو عسل بن سفیان عطاء سے روایت کرتے ہیں۔ اہل علم کا نماز میں سدل کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک نماز میں سدل مکروہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ نماز میں سدل اس صورت میں مکروہ ہے کہ جب جسم پر ایک ہی کپڑا ہو لیکن اگر کرتے یا قمیص پر سدل کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ امام احمد کا قول ہے ابن مبارک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی نماز میں سدل مکروہ ہے۔

﴿تشریح﴾

(الا من حدیث عسل بن[1] سفیان) امام ترمذی رحمہ اللہ کے بقول عسل بن سفیان راوی اس کے نقل کرنے میں متفرد ہے

---

[1] یہاں پر یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ مصنف نے یہ حدیث باب کو عسل بن سفیان راوی کا تفرد کہا ہے یہ تفرد کہنا سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ ابوداؤد میں سلیمان احول وغیرہ کی حدیث سے اس کا متابع موجود ہے۔ بیہقی وغیرہ میں بھی اس حدیث کے متابعات موجود ہیں یہ بحث غور طلب ہے۔

عسل بن سفیان راوی کے متفرد ہونے کا دعویٰ قابل اشکال ہے: اس میں اشکال یہ ہے کہ امام ابوداؤد نے اس روایت کو سلیمان احول عن عطاء کی سند سے بھی نقل کیا ہے نیز بیھقی نے اس کے متعدد طرق نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایات دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔

سدل دونوں معنی کے اعتبار سے مکروہ ہے: سدل کے دو معنی ہیں: ا۔ اشتمال الصماء۔ جس کی تفصیل پہلے گزری۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک کپڑا اپنے دونوں کندھوں پر لٹکا لے اور نہ اس اس کپڑے میں گرہ لگائے اور نہ ہی دائیں کنارے کو بائیں کندھے پر اور کپڑے کے بائیں کنارے کو دائیں کندھے پر ڈالے اس طرح کرنا مکروہ ہے اور اگر صرف ایک کنارے کو جانب مخالف کندھے[1] پر ڈال دے تب بھی مکروہ ہے لیکن جب کپڑے کے دونوں کناروں کو دونوں کندھوں پر ڈال دیا اور پھر بھی وہ لٹکے رہے بوجہ لمبا ہونے کے تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اس طرح کپڑے کی دائیں جانب والے کنارے کو جب اس نے بائیں کندھے پر ڈالا پھر اس سے جو حصہ لٹکا رہا تھا اس کو بائیں کندھے پر دوبارہ ڈال دیا۔ تو بھی یہ مکروہ نہیں۔ بہرحال سدل کے دونوں معنوں کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود اس طرح کرتے تھے نیز ''اشتمال الصماء'' کی صورت میں نماز کے ارکان صحیح طرح ادا نہیں ہونگے اور دوسری صورت میں کپڑے کے دامن کی وجہ سے لڑھک جانے اور گر جانے کا اندیشہ ہے۔

سدل کی کراہت سے ایک اور صورت مسئلہ کی کراہت معلوم ہوئی: یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوگیا کہ لوگ اپنی گردنوں پر جو قلادہ ڈالتے ہیں اور یہ قلادہ[2] سوت کا بنا ہوا ہوتا ہے تو یہ ڈالنا بھی مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس وقت ہوگا جبکہ اس قلادہ کو باندھ کر پہنا جاتا ہو۔ اور اگر اس قلادہ کو ایسے ہی بغیر باندھے پہنا جاتا ہے تو اس میں کوئی کراہت نہیں جبکہ ارکان صلوٰۃ کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنے۔ نماز کے باہر یہ قلادہ ہر طرح پہن سکتے ہیں بعض علماء نے جو یہ کہا ہے کہ سدل اسی وقت مکروہ ہے جبکہ اس کے جسم پر ایک ہی کپڑا ہو تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ نمازی کے بدن پر ایک ہی کپڑا ہے اور اس کا ایک کنارہ وہ نمازی دوسرے کندھے پر ڈال رہا ہے تو یہ بالکل مکروہ ہے اور ایک کپڑے ہونے کی صورت میں سدل کا

---

[1] اس صورت میں میرے بعض مشائخ کا اختلاف ہے ان کے خیال میں اگر کپڑے کا ایک کنارہ مخالف کندھے پر ڈال دیا جائے تو اسے سدل نہیں کہیں گے اور یہ مکروہ نہ ہوگا۔

[2] اس قلادہ کو گلوبند کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس گلوبند کے دونوں کنارے سینے پر لٹکا لے اور اپنی گردن پر اس کو لپیٹے نہیں یہ مکروہ ہے بلکہ اس کپڑے کو اپنی گردن پر لپیٹ دینا چاہیئے۔

مشہور معنی مراد نہیں کہ جس میں کپڑے کے دونوں کناروں کو دونوں کندھوں پر نہیں ڈالا جاتا ہے۔ کیونکہ جب نمازی کے بدن پر ایک ہی کپڑا ہے اور وہ اس کے دونوں کناروں کو اپنے دونوں کندھوں پر ڈال لے تو اس کا ستر کھل جائیگا اور اس کی نماز ہی صحیح نہ ہوگی۔ کراہت کا یہاں کوئی معنی نہیں۔ اشتمال الصماء ہونے کی صورت میں ایک کپڑے کی تخصیص کی کوئی صورت نہیں بلکہ صرف ایک کپڑا ہونے کی صورت میں اشتمال الصماء کو تو غیر مکروہ اور جائز ہونا چاہیئے [1]۔

باب ماجاء فی کراهیة مسح الحصَی فی الصلاۃِ

باب نماز میں کنکریوں کو ہاتھ لگانا (ہٹانا) مکروہ ہے

☆ حَدَّثَنَا سعیدُ بن عبد الرحمٰن المَخزُومیُّ حَدَّثَنَا سفیان بن عیینة عن الزهریِّ عن ابی الاَحوَصِ عن ابی ذَرٍّ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: اذا قام احدُکم اِلی الصلاۃ فلا یَمسَحِ الحصَی، فاِنَّ الرحمةَ تُواجِهُهُ۔

☆حدثنا الحسینُ بن حُرَیثٍ حَدَّثَنَا الولیدُ بن مسلمٍ عن الاَوزَاعِیِّ عن یحیی بن ابی کَثِیرٍ قال: حدثنی ابو سلمةَ بن عبد الرحمٰن عن مُعَیقِیبٍ قال: سالتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن مَسحِ الحصَی فی الصلاۃِ؟ فقال: اِن کُنتَ لابُدَّ فاعلاً فَمَرَّةً واحدةً۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔

قال : وفی الباب عن علیّ بن ابی طالبٍ، وحُذَیفَةَ، وجابرِ بن عبد اللّٰه و مُعَیقیبٍ ۔ قال ابو عیسی: حدیثُ ابی ذَرٍّ حدیث حسنٌ۔ وقد رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: اَنَّهُ کَرِهَ المسحَ فی الصلاۃِ وقال: اِن کُنتَ لابُدَّ فاعلاً فمرَّةً واحدةً۔ کاَنَّه رُوِیَ عنهُ رخصة فی المرة الواحدة والعمل هٰذا عند اهل العلم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز کیلئے کھڑا ہو تو کنکریوں کو نہ چھوئے کیونکہ اللہ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہے۔

حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں کنکریاں ہٹانے کے بارے میں پوچھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو ایک مرتبہ ہٹالو۔

---

[1] کیونکہ اس صورت میں انتہائی تستر کا اہتمام ہے۔ یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ اشتمال الصماء اس طرح مکروہ ہے کہ اس کپڑے کو اپنی گردن پر گرہ لگادے اور دونوں ہاتھ نکال دے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔

اس باب میں علی بن ابوطالب، حزیفہ، جابر بن عبداللہ اور معیقیب رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ حسن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کنکریاں چھونے کو مکروہ کہا ہے اور فرمایا اگر ضروری ہو تو ایک مرتبہ ہٹالے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کنکریاں ہٹانے کی اجازت دی ہے اور اسی پر تمام اہل علم کا عمل ہے۔

﴿تشریح﴾

تسویۃ حصاۃ کی مقدارِ جواز: حصٰی جمع ہے اس کا واحد حصاۃ آتا ہے اگر سجدہ کرنے میں تکلیف ہو تو سجدہ کی جگہ سے کنکر کو ہٹانا بلا کراہت جائز ہے لیکن اگر کنکر کو ہٹائے بغیر بھی سجدہ کرنے کی کوئی صورت ممکن ہے تو یہ فعل مکروہ ہے۔ بعض روایات میں دو دفعہ کنکر ہٹانے کی اجازت وارد ہے۔ (از مترجم: حاشیہ میں مرقاۃ کے حوالے سے دو مرتبہ تسویہ حصاۃ کا ذکر مذکور ہے)۔ بہر حال یہ عدد مقصودی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ اتنی مقدار میں اجازت ہے بلکہ جس قدر ضرورت ہوگی اتنی ہی مقدار میں کنکر کو ہٹانے کی اجازت ہوگی۔

کنکری ہٹانا اور اس جیسے کام کے مکروہ ہونے کی علت نماز کے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہونا ہے: (قوله عليه السلام فان الرحمة تواجهه) یہ منع کرنے کی علت ہے۔ یہاں سے فقہاء نے بہت سے مسئلہ نکالے ہیں پس ہر وہ کام جس کو کرنے میں نماز کے علاوہ کسی دوسرے فعل میں مشغول ہونا لازم آتا ہے اگر اس کام کو کرنا عین نماز کی اصلاح کیلئے یا خشوع وخضوع کو باقی رکھنے کیلئے کیا جاتا ہے تو یہ فعل مکروہ نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد خشوع وخضوع اور عین نماز کا باقی رکھنا نہیں ہے تو یہ مکروہ ہے۔

کیا نماز میں تین دفعہ حرکت دینا مفسد ہے؟: یہ جو مسئلہ مشہور ہے کہ تین دفعہ حرکت دینا یا دونوں ہاتھوں سے کوئی فعل کرنا نماز کیلئے مفسد ہے تو علی الاطلاق یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی روایات میں حرکاتِ ثلٰثہ اور نماز میں دونوں ہاتھوں کے استعمال کرنے کا ذکر آتا ہے۔

معیقیب کے تکرار کی توجیہات: (و معیقیب) (۱) امام ترمذی رحمہ اللہ نے وفی الباب میں معیقیب کو غلطی سے ذکر کر دیا ہے کیونکہ ان کی روایت تو اوپر آچکی ہے (۲) یا یہ کہا جائے کہ طرداللباب ذکر کر دیا۔ (۳) تیسری یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ

گذشتہ روایت میں جن معیقیب صحابی سے روایت مروی ہے وہ روایت تو مسح حصی کی اجازت سے متعلق تھی اب وفی الباب عن معیقیب کا مقصد یہ ہے کہ انہی معیقیب راوی سے مسح الحصی کی کراہت والی حدیث بھی مروی ہے۔

(قولہ وکانہ روی عنہ رخصة فی الواحدة) مصنف رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ ایک مرتبہ کنکر کو ہٹانا بلاضرورت بھی جائز ہے[1] حالانکہ اس کا یہ مقصد نہیں ہے بلکہ جس قدر ضرورت ہوگی اس کا کرنا جائز ہوگا نیز حنفیہ کے مذہب میں بھی ایک مرتبہ کنکر کو سجدہ کی جگہ سے ہٹانا جائز ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة النفخ فی الصلاةِ

باب نماز میں پھونکیں مارنا مکروہ ہے

☆حدثنا احمدُ بن مَنیعٍ حَدَّثَنَا عَبَّادُ بن العوّامِ اخبرنا مَیْمُون اَبُو حَمْزَةَ عن ابی صالحٍ مولی طَلْحَةَ عن اُمِّ سلمةَ قالت: رَاَی النبیُّ صلی اللّٰہ علیه وسلم غلاماً یقالُ له اَفْلَحُ اِذا سجدَ نَفَخَ، فقال: یا اَفْلَحُ! تَرِّبْ وجهَكَ۔

قال احمدُ بن مَنیعٍ: و کَرِهَ عَبَّادُ بن العوّامِ النَّفْخَ فی الصلاةِ، وقال: اِنْ نَفَخَ لم یَقْطَعْ صلاتَه۔ قال احمدُ بن مَنیعٍ: وبه ناخذُ۔ قال ابو عیسی: ورَوَی بعضُهم عن ابی حمزةَ هذا الحدیثَ وقال: مولیً لنا یقالُ له رَبَاحٌ۔

☆حدثنا احمدُ بن عَبْدَةَ الضَّبیُّ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بن زیدٍ عن میمونٍ ابی حمزةَ: بهذا الاسنادِ

---

[1] **حضرت گنگوہیؒ کی توجیہ پر اشکال:** حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ اس لئے فرمائی کہ ضرورت کے موقع پر تو ایک دفعہ کنکر ہٹانے کی قید نہیں بلکہ ضرورت کے وقت تو کئی دفعہ ہاتھ کا استعمال کر سکتا ہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ہدایہ وغیرہ میں ہے کہ کنکریوں کو مت ہٹائے کیونکہ یہ عبث فعل ہے الا یہ کہ اس کو سجدہ کرنے میں مشکل ہو تو ایک مرتبہ کنکریوں کو ہٹا سکتا ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مرة یا اباذر والا فذر'' انتہی۔ ہاں البتہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے مشابہ کلام فرمایا ہے۔ (از مترجم: ''مرة یا اباذر والا فذر'' اس حدیث میں صاحب ہدایہ سے تسامح ہوا ہے کیونکہ خود ترمذی میں دو حدیثیں ہیں: ا۔ حدیث معیقیب۔ اس میں ''ان کنت لابد فاعلا فمرة واحدة'' کے الفاظ ہیں، ۲۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں ''فلا یمسح الحصی فان الرحمة تواجهه'' تو معلوم ہوا کہ مرة اجازت والی حدیث تو حدیث معیقیب ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے ہدایہ کے حواشی میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے)۔

نحوه، وقال: غلامٌ لنا يقال له رَبَاحٌ۔ قال ابو عيسى: وحديث ام سلمة إسناده ليس بذاكَ۔ وميمون ابو حمزة قد ضعفه بعض اهل العلم۔ واختلف اهلُ العلم فى النفخ فى الصلاةِ۔ فقال بعضُهم: اِنْ نَفَخَ فى الصلاةِ استَقْبَلَ الصلاةَ۔ وهو قولُ سفيانَ الثَّوْرِيِّ واهلِ الكوفةِ۔ وقال بعضُهم: يُكره النفخُ فى الصلاة، وان نفخَ فى صلا ته لم تفسُد صلا تُهُ۔ وهو قولُ احمد، وإسحٰق۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے گھر کے ایک لڑکے کو جسے ہم افلح کہتے تھے دیکھا کہ جب وہ سجدہ کرتا ہے تو پھونک مارتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے افلح! پیشانی کو خاک آلود کر۔ احمد بن منیع فرماتے ہیں کہ عباد نماز میں پھونکنے کو مکروہ سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ احمد بن منیع کہتے ہیں کہ ہم اسی قول پر عمل کرتے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض حضرات نے اس حدیث کو ابوحمزہ سے روایت کیا ہے اور کہا کہ وہ لڑکا ہمارا مولیٰ تھا اس کو رباح کہتے تھے۔

روایت کی ہم سے احمد بن عبدہ ضبی نے انہوں نے حماد بن زید سے انہوں نے میمون سے اسی اسناد سے اسی کی مثل روایت اور کہا ہمارے اس لڑکے کو رباح کہا جاتا تھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند قوی نہیں میمون ابوحمزہ کو بعض اہل علم ضعیف کہتے ہیں۔ نماز میں پھونکنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض اہل علم کے نزدیک اگر کوئی نماز میں پھونک دے تو دوبارہ نماز پڑھے یہ سفیان ثوری اور اہل کوفہ (احناف) کا قول ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ نماز میں پھونکیں مارنا مکروہ ہے لیکن اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی یہ احمد اور اسحٰق کا قول ہے۔

﴿تشریح﴾

پھونک مارنے سے نماز کے ٹوٹنے کے حکم میں اختلاف ہے: (تـــرب وجهك) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت افلح رضی اللہ عنہ کو پھونکنے سے ضمناً منع فرمایا صراحۃً منع نہیں فرمایا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مٹی لگتے رہنے کا حکم فرمایا اسی وجہ سے علماء کا اختلاف ہے کہ پھونکنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء کہتے ہیں کہ نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں پھونکنے سے اس لئے منع فرمایا تھا کہ پھونکنے کی صورت میں اپنے آپ پر مٹی لگنے کی سنت فوت ہو جاتی ہے لیکن پھونکنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ سلم نے افلح کو نماز کے لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ دوسرے بعض علماء جن کے نزدیک نماز میں پھونکنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ راوی کا نماز کے اعادہ کا ذکر نہ کرنا عدمِ اعادہ پر دال نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے پھونکنے کی وجہ سے حروف نہ نکلیں تو نماز فاسد نہ ہوگی لیکن اگر اس کی پھونک سے حروف ظاہر ہو جائیں تو یہ باتیں کرنے کی طرح ہو جائیگا اور نماز فاسد ہو جائیگی۔

باب ماجاء فی النَّهْيِ عن الاخْتِصَارِ فی الصلاۃ

باب نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی ممانعت کے بارے میں

☆حدثنا ابو كُرَيْبٍ حَدَّثَنَا ابو أُسامَةَ عن هشام بن حَسَّانَ عن محمد بن سيرين عن ابی هريرة : اَنَّ النبی صلی الله عليه وسلم نَهَی ان يصلِّيَ الرجلُ مُخْتَصِراً۔ قال : وفی الباب عن ابن عمرَ۔ قال ابو عيسی: حديث ابی هريرة حديث حسن صحيحٌ۔ وقد كره بعضُ اهل العلم الِاختصارَ فی الصَّلَاةِ۔ و كره بعضُهم ان يمشیَ الرجلُ مُخْتَصِراً۔ والا ختصارُ: ان يَضَعَ الرجلُ يده علی خاصرتِهِ فی الصلَاة، (او يضَع يديه جميعاً علی خاصر تَيه)۔ ويُرْوَی: اَنَّ اِبْلِيسَ اِذا مشَی مَشَی مُخْتَصِراً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو کوکھ پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

اس باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ بعض علماء کے نزدیک نماز میں اختصار مکروہ ہے اور اختصار یہ ہے کہ کوئی شخص نماز میں اپنے پہلو (کوکھ) پر ہاتھ رکھے۔ بعض علماء پہلو پر ہاتھ رکھ کر چلنے کو بھی مکروہ کہتے ہیں۔ روایت کیا گیا ہے کہ ابلیس (شیطان) جب چلتا ہے تو پہلو پر ہاتھ رکھ کر چلتا ہے۔

﴿تشریح﴾

ہر فعل جو سنت سے دور ہو مکروہ ہے: اس حدیث سے معلوم ہوئے[1] کہ متکبرین اور بڑے بادشاہوں[2] کی ہیئت اختیار کرنا مکروہ ہے لہٰذا ہر وہ فعل جو سنت سے جتنا زیادہ دور ہوگا اتنا زیادہ وہ مکروہ ہوگا کیونکہ یہ سنت سے دور ہے اور متکبرین کی ہیئت کے قریب ہے۔ حدیث پاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مشابہت کی ممانعت کیلئے یہ ضروری[3] نہیں ہے کہ مشبہ بہ سامنے موجود ہو کیونکہ شریعت میں شیطان کے تشبہ کو منع کیا گیا ہے حالانکہ وہ ہماری نظروں سے غائب ہے اور ہمیں دکھائی بھی نہیں دیتا یہی حکم دوسرے تشبہ کا بھی ہے تو یہود کے ساتھ تشبہ مکروہ ہے اگرچہ یہود ہمارے اس ملک میں نہ ہوں۔

باب ماجاء فی کراهية كَف الشَّعر فی الصلاةِ

باب بالوں کو باندھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے

☆حدثنا يحيى بن موسى حَدَّثَنَا عبد الرَّزاقِ اخبرنا ابن جُرَيْجٍ عن عِمْرَانَ بن موسى عن سعيد بن ابی سعيدِ المَقبُرِيٌّ عن ابيه عن ابی رافعٍ: انه مَرَّ بالحَسنِ بن عليّ وهو يصلّي ، وقد عَقَصَ ضَفِرَتَهُ فی قفاهُ ، فحلّها ، فالتفتَ اِليه الحسنُ مُغْضَباً، فقال: اَقبِلْ على صلاتك ولا تغضَبْ، فانّي

---

[1] **اختصار کی تفسیر میں پانچ اقوال:** حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ بذل میں رقم طراز ہیں کہ اختصار کی تفسیر میں اختلاف ہے مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو کوکھ پر رکھنا دوسرا قول یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے نماز کے اندر لاٹھی کو پکڑے اور لاٹھی پر سہارا حاصل کرے اس معنی کا ابن عربی نے انکار کیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ سورت میں اختصار کردے مثلاً سورت کے آخر سے ایک یا دو آیت پڑھے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ نماز میں اس طرح اختصار کرے کہ اس کے قیام، رکوع، سجدہ کو سنت کے مطابق اطمینان سے ادا نہ کرے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ جن آیات میں سجدہ تلاوت ہے نماز میں ان کو چھوڑ دے تاکہ ان کی قرأت سے سجدہ تلاوت واجب نہ ہو۔

اختصار کی ممانعت کی حکمتیں: اس منع کرنے کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ ابلیس جنت سے جب نکالا گیا تو وہ اختصار کیا ہوا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہود عموماً یہ فعل کرتے ہیں لہٰذا تشبہ بالیہود کے مکروہ ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل سے منع فرمایا اور بعض علماء کے مطابق جہنمی اس طرح راحت حاصل کریں گے یا یہ وجہ ہے کہ یہ متکبرین کا فعل ہے اور بعضوں کے نزدیک اس میں مصیبت زدہ لوگوں کی شکل کو اختیار کرنا ہے۔ جمہور کے ہاں نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنا مکروہ ہے۔ ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے بعض اہل ظواہر اس کو حرام کہتے ہیں۔ انتہی مختصراً

[2] اکاسرہ کسریٰ کی جمع ہے فارس کے بادشاہوں میں سے ہر بادشاہ کو کسریٰ کہتے ہیں۔

[3] اصل مخطوطہ میں اسی طرح لایختص کا لفظ ہے۔ بظاہر یہ لایفصل کا لفظ ہونا چاہئے۔

سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقولُ: ذٰلكِ کِفلُ الشیطانِ۔ قال: وفی البابِ عن اُمِّ سلمةَ و عبد اللّٰہ بن عباسٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی رافعٍ حدیث حسنٌ۔ والعملُ علی هذا عند اهل العلم: کرهُوا ان یصلِّیَ الرجلُ وهو مَعْقُوصٌ شَعْرُهُ۔ قال ابو عیسی: وعِمْرَانُ بن موسی هُوَ القُرَشِیُّ المَکیُّ وهو اخوایوبَ بن موسی۔

﴿ترجمہ﴾

سعید بن ابوسعید مقبری اپنے والد اور وہ ابورافع سے نقل کرتے ہیں کہ وہ حسن بن علی کے پاس سے گزرے جس وقت کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور (بالوں کا) جوڑا گدی پر باندھا ہوا تھا۔ ابورافع نے بال کھول دیئے اس پر حسن رضی اللہ عنہ نے غضب ناک نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا اپنی نماز کی طرف متوجہ رہیں اور غصہ نہ کریں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ (بالوں کو باندھ کر نماز پڑھنا) شیطان کا حصہ ہے۔

اس باب میں ام سلمہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابورافع کی حدیث حسن ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ آدمی نماز اس حال میں پڑھے کہ اس کے بال بندھے ہوئے ہوں مکروہ ہے۔ عمران بن موسیٰ قریشی مکی ہیں اور ایوب بن موسیٰ کے بھائی ہیں۔

﴿تشریح﴾

شیطان کی خواہش ہے کہ ابن آدم کو آخرت کے ثواب اور اجر سے محروم کردے: (ذلك كفل الشيطان) کیونکہ شیطان ابن آدم کو اس کے آخرت کے حصہ سے محروم کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔ تو ابن آدم جس قدر اخروی ثواب سے محروم ہوگا تو اس میں شیطان کا اس قدر بڑا حصہ ہوگا پس شیطان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ اس آدمی کو کفر و شرک میں مبتلا کردے تاکہ یہ بھی جہنم میں میرے ساتھ رہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔ اس کے بعد یہ چاہتا ہے کہ کبیرہ گناہ کروائے ورنہ صغیرہ گناہ پر ابھارتا ہے پھر اس کے بعد درجہ میں سنت کو چھڑا دیتا ہے اور سب سے آخری درجہ میں مستحب فعل کو چھوڑنے پر رضامند کرتا ہے۔ حدیث باب میں بالوں کو باندھنے کی صورت میں بال سجدہ نہیں کرتے تو بالوں کے سجدہ کرنے کا ثواب ابن آدم کے حصہ سے کم ہو جاتا ہے تو بلاشک یہ شیطان کا حصہ ہوا، پہلے بھی اس کے متعلق کچھ کلام گزر چکا ہے۔

---

[1] لفظ کفل کاف کے زیر کے ساتھ اس کے کئی معنی ہیں کمزوری، کسی چیز کا حصہ، بیل کی گردن پر جوے کے نیچے کا کپڑا۔

نماز میں لقمہ لینے کے مسائلِ متفرقہ: حدیث باب میں ابورافع نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو جو حدیث سنائی ہے حالانکہ حسن رضی اللہ عنہ تو نماز پڑھ رہے تھے لیکن انہوں نے یہ حدیث سنا کر ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر امام اپنے مقتدی سے بلاضرورت لقمہ لے لے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لوگوں میں جو مشہور ہے کہ نماز فاسد ہو جاتی ہے یہ غلط ہے اسی طرح امام کا کسی ایسے شخص سے لقمہ لینا جو نماز میں نہیں ہے اس سے بھی نماز کو فاسد سمجھا جاتا ہے یہ بھی غلط ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے امام[1] کے علاوہ کو یا اپنے امام کو لقمہ دیا حالانکہ امام اتنی مقدار قرأت کر چکا تھا جو نماز میں ضروری ہے۔ پس اگر امام نے صرف اس کے لقمہ کی وجہ سے لقمہ دینے والے پر اعتماد کر کے آگے تلاوت شروع کر دی خود نہیں سوچا کہ واقعی اس طرح ہے یا نہیں۔ تب تو لامحالہ امام کی نماز فاسد ہو جائیگی لیکن اگر لقمہ دیئے جانے کے بعد امام نے غور و خوض کیا کہ واقعی قرآن شریف میں اسی طرح ہے جیسا کہ یہ لقمہ دے رہا ہے اور پھر اپنے زعم کے مطابق تلاوت کر رہا ہے تو اس کی نماز صحیح ہو جائیگی۔ یہی حکم ہے جب قرأت کے علاوہ کسی اور ضرورت میں کوئی لقمہ دے کہ وہاں بھی تعلیم و تعلم پایا جائیگا پس اگر امام خود ہی سوچے بغیر اس کا لقمہ لے لے تو نماز فاسد ہو جائیگی ورنہ فاسد نہ ہوگی۔ اور آپ تو خوب جانتے ہیں کہ جب حافظ شخص خود کچھ بھول جاتا ہے اور پھر وہ کسی سے اس آیت کو سن لے تو بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اسے بھولی ہوئی آیت یاد نہ آئے۔

باب ماجاء فی التَخَشُّع فی الصلاۃِ

باب نماز میں خشوع کا بیان

☆حدثنا سُوَیْدُبن نَصْرٍ حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن المبارک اخبرنا اللَّیْثُ بن سعدٍ اخبرنا عَبْدُ رَبِّہٖ بن

---

[1] یہ مسئلہ اس وقت ہے جبکہ مقتدی کے علاوہ کوئی غیر مقتدی لقمہ دے اگر مقتدی اپنے امام کو لقمہ دے تو ایک قول کے مطابق یہی حکم ہے کہ قدر ما تجوز بہ الصلوٰۃ قرأت کرنے کے بعد لقمہ دینے سے امام کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ لیکن فقہاء نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے چنانچہ درمختار میں ہے کہ کسی شخص کا اپنے امام کے علاوہ کو لقمہ دینا لقمہ دینے والے کی نماز کو فاسد کر دے گا۔ اسی طرح لقمہ لینے والے کی نماز بھی فاسد ہو جائیگی الا یہ کہ یہ شخص لقمہ لینے سے پہلے تھوڑا سا سوچے اور لقمہ ختم ہونے سے پہلے خود ہی تلاوت شروع کر دے۔

مقتدی کے لقمہ دینے سے مطلقاً نماز فاسد نہیں ہوتی: لیکن اگر مقتدی اپنے امام کو لقمہ دے تب تو مطلقاً نماز فاسد نہیں ہوتی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی کسی حال میں بھی نماز فاسد نہ ہوگی چاہے امام واجب تلاوت کر چکا ہو یا نہ کی ہو۔ اور چاہے ایک آیت کو چھوڑ کر دوسری آیت کی طرف منتقل ہو گیا ہو یا نہیں۔ اور چاہے لقمہ ایک بار دیا گیا ہو یا بار بار ہر صورت میں نماز فاسد نہ ہوگی یہی اصح قول ہے۔

سعیدٍ عن عِمْرَانَ بن ابی اَنَسٍ عن عبد اللّٰہ بن نافع بنِ العَمْیَاءِ عن ربیعةَ بن الحٰرثِ عن الفضلِ بن عباسٍ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: الصلاةُ مَثْنَی مَثْنَی، تَشَهُّدٌ فی کلِّ رکعتین، وتَخَشُّعٌ، وتَضَرُّعٌ، وتَمَسْکُنٌ، وتُقْنِعُ یَدَیْكَ، یقول: تَرْفَعُهُمَا اِلی رَبِّكَ، مُسْتَقْبِلاً بِبُطُونِهما وجهَك، وتقولُ: یَارَبِّ یَارَبِّ، ومن لم یفعل ذلك فهو کذا وکذا۔ قال ابو عیسی: وقال غیرُ ابنِ المبارکِ فی هذا الحدیثِ: مَنْ لم یفعل ذلك فهی خِدَاجٌ۔

قال ابو عیسی: سمعتُ محمد بن اِسمٰعیلَ یقول: رَوَی شعبةُ هذا الحدیثَ عن عَبْدِ رَبِّهٖ بن سعیدٍ، فاخطأ فی مواضعَ، فقال: عن انس بن ابی اُنَیس وهو عِمرانُ بن ابی اَنَسٍ وقال عن عبد اللّٰہ بن الحٰرثِ، وانما هو عبد اللّٰہ بن نافعٍ بن العَمْیَاءِ عن ربیعةَ بن الحٰرث، وقال شعبةُ عن عبد اللّٰہ بن الحٰرثِ عن المُطَّلبِ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وانما هو عن ربیعة بن الحٰرث، بن عبد المُطَّلبِ عن الفضلِ بن عباسٍ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ قال محمدٌ: وحدیث اللَّیْث بن سعدٍ هو حدیث صحیحٌ، یعنی اصح من حدیث شعبةَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز دو دو رکعت ہے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد ہے اور نماز خشوع، خضوع اور عاجزی ہے اور آپ دونوں ہاتھوں کو اٹھائیں۔ راوی کہتے ہیں تقنع یدیک کا معنی ہے دونوں ہاتھوں کو اٹھانا...... اپنے رب کی طرف کہ ان کا اندرونی حصہ آپ کے چہرے کی طرف رہے اور پھر کہیں اے رب! اے رب! اور جس نے ایسا نہ کیا وہ ایسا ہے ایسا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن مبارک رحمہ اللہ کے علاوہ دوسرے راوی (یعنی لیث بن سعد کے دوسرے تلامذہ) اس حدیث میں کہتے ہیں "من لم یفعل ذلك فهو خداج" جو اس طرح نہ کرے اس کی نماز ناقص ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ شعبہ نے بھی یہ حدیث عبدربہ بن سعید سے روایت کی ہے تو انہوں نے کئی جگہ غلطی کی ہے اور (استاذ الاستاذ کے متعلق کہا) کہا روایت ہے انس بن ابی انیس سے جبکہ (صحیح نام) عمران بن ابوانس ہے اور (اس کے بعد دوسری غلطی یہ کی کہ راوی کا نام) عبداللہ بن

حارث کہا جبکہ (صحیح نام) عبداللہ بن نافع بن العمیاء ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں ربیعہ بن حارث سے (تیسری غلطی یہ کی کہ شعبہ نے عن عبداللہ بن حارث عن المطلب کہا اور مطلب نقل کرتے ہیں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جبکہ صحیح روایت اس طرح ہے کہ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب روایت کرتے ہیں فضل بن عباس سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث لیث بن سعد (کی سند) شعبہ کی (سند) سے زیادہ صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

تشہد اولیٰ رکنِ صلوٰۃ نہیں: (الصلوٰۃ مثنی مثنی تشھد فی کل رکعتین) اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ فرض اور نفل ہر نماز میں تشہد پڑھنا رکن ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد اولی کو چھوڑنے کی صورت میں نماز کا اعادہ نہیں فرمایا تھا بلکہ سجدہ سہو سے اس کا جبیرہ فرمایا تھا تو اس فعل سے معلوم ہوا کہ تشہد اولی پڑھنا فرض نہیں۔

(تقنع یدیك) اس کا عطف الصلوٰۃ پر بھی ہوسکتا ہے تب تو یہ جملہ مستانفہ ہے یا اس کا عطف تشہد پر ہے تو اس سے پہلے اَن مقدر ہوگا تا کہ عطف صحیح ہو جائے۔ "ترفعھما" راوی تقنع کی تفسیر کر رہے ہیں کہ اس سے مراد ہاتھوں کا اٹھانا ہے۔

"مستقلا ببطو نھما و جھك" یہ حدیث کے الفاظ میں سے ہے۔

ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا مسنون طریقہ حدیث سے ثابت ہے: حدیث باب سے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا ثبوت ہے جیسا کہ اس پر عوام کا عمل ہے جاہل لوگوں کا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا انکار کرنا غلط ہے (قولہ کذا وکذا) یہ لفظ راوی کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے کہ راوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ بھول گئے ہوں لہٰذا انہوں نے کذا وکذا کہہ کر احتیاط سے کام لیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا جزو ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً لفظ ذکر نہیں فرمایا بلکہ کنایہ پر اکتفاء کیا ہے۔ تخشع کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور تضرع کا تعلق زبان کے ساتھ ہے جبکہ تمسکن کا تعلق بقیہ تمام اعضاء کے ساتھ ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة التَّشْبِیک بین الاصابع فی الصلاۃِ

باب نماز میں انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا مکروہ ہے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللیثُ عن ابن عَجْلَانَ عن سعیدِ المُقْبُرِیِّ عن رجلٍ عن کَعْبِ بن عُجْرَةَ

اَنّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: إذا توضّأ احدُ کم فَاَحسَنَ وُضوءَ ہٗ ثم خرج عامداً اِلی المسجدِ فَلَا یُشَبِّکَنَّ بَیْنَ اصابعِہ، فاِنّہٗ فی صلاۃ۔ قال ابو عیسی: حدیث کعبِ بن عُجْرَۃ رواہ غیر واحدٍ عن ابن عَجْلَانَ، مثلَ حدیثِ اللیثِ۔ وروَی شَرِیکٌ عن محمد بن عَجْلَان عن ابیہ عن ابی ہریرۃ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نحوَ ھٰذا الحدیث۔ وحدیث شریکٍ غیرُ محفوظٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد جانے کے لئے گھر سے نکلے تو ہرگز اپنی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے اس لئے کہ وہ (حکماً) نماز میں ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو متعدد راویوں نے ابن عجلان سے لیث کی حدیث کی طرح نقل کیا ہے اور شریک، محمد بن عجلان سے وہ اپنے والد سے وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی حدیث کی مثل روایت کرتے ہیں اور شریک کی حدیث غیر محفوظ ہے۔

﴿تشریح﴾

تشبیک کی ممانعت سے مراد ہر اس فعل سے ممانعت ہے جو ہیئت نماز کے خلاف ہو: (قولہ فلا یشبکن بین اصابعہ فانہ فی الصلوٰۃ) اور یہ بات ظاہر ہے کہ نماز کے ارکان میں سے کسی بھی رکن میں تشبیک نہیں ہوتی اسلئے کوئی ایسا کام نہ کرے جو نماز کی ھیئت کے خلاف ہو۔ یہاں پر تشبیک کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام جو نماز کے منافی ہو چاہے تشبیک ہو یا باتیں کرنا وغیرہ یہ سب منع ہے جبکہ انسان گھر سے نکل کر نماز کی نیت سے مسجد جا رہا ہو البتہ کوئی ضروری بات یا کام کرنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی طُول القیام فی الصلاۃِ

باب (نفل) نماز میں طویل قیام کرنا

☆حدثنا ابن ابی عُمَرَ حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینۃ عن ابی الزُّبَیْرِ عن جابرٍ قال: قِیلَ اللنبیِّ صلی اللّٰہ

عليه وسلم اَیُّ الصلاةِ اَفْضَلُ؟ قال: طُولُ الْقُنُوتِ۔

قال: وفي الباب عن عبد الله بن حُبْشِيٍّ، وانس بن مالكٍ عن النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم۔

قال ابو عيسى: حديث جابر بن عبد الله حديث حسن صحيحٌ۔ وقد رُوِىَ مِن غير وجهٍ عن جابر بن عبد الله۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لمبے قیام والی نماز (جس نماز میں قیام لمبا ہو)۔

اس باب میں عبداللہ بن حبشی اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہ حدیث متعدد طرق سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

لفظِ ایٌّ کے متعلق ضابطہ: (قولہ ای الصلوٰۃ افضل) جاننا چاہیئے کہ لفظِ اَیٌّ کے بارے میں یہ قاعدہ ہے کہ جب یہ کسی معرف باللام اسم پر داخل ہو تو اس سے مراد اس اسم کے اجزاء میں ایک جزء کی تعیین ہوتی ہے اور اگر لفظ ایٌّ نکرہ پر داخل ہو تو نکرہ کے افراد میں سے ایک فرد کی تعیین ہوتی ہے لہٰذا حدیث باب میں ای الصلوٰۃ افضل سے مراد یہ ہے کہ نماز کے ارکان میں سے کونسا رکن بقیہ ارکان کے مقابلے میں سب سے افضل ہے اس سے معلوم ہوا کہ قیام[1] کو لمبا کرنا یہ رکن سب سے پسندیدہ ہے۔

---

[1] حنفیہ کے نزدیک قیام کو لمبا کرنا افضل ہے اگر چہ اس میں کچھ اختلاف ہے کہ امام محمدؒ کی ایک روایت میں کثرۃ سجود افضل ہے جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں: ا۔ سجدوں کو لمبا اور زیادہ کرنا یہ افضل ہے جیسا کہ امام ترمذی اور بغوی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت سے یہ مذہب نقل کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ طولِ قیام افضل ہے اس کو امام شافعی اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں برابر ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے توقف کا قول کیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ کذا فی البذل۔ قلت: ابن عربی رحمہ اللہ کا میلان اس طرف ہے کہ امام اسحٰق کے قول کو راجح قرار دیا جائے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ رات کو تہجد کی نماز میں طولِ قیام افضل ہے اور دن کے نوافل میں کثرت رکوع و سجود افضل ہے۔

علیک بکثرۃ السجود سے جمہور کا استدلال اور اسکا جواب: جمہور بعد میں آنے والی روایت علیک بکثرۃ السجود سے جو استدلال کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کثرت سجود سے مراد کثرت سے نماز پڑھنا ہے تو اس حدیث میں عبادات میں سے نماز کو باقی عبادتوں پر فضیلت دی گئی ہے نماز کے ارکان میں سے کسی رکن کو دوسرے ارکان پر فضیلت دینا مقصود نہیں کیونکہ اس حدیث میں کثرت سجود سے نماز کے علاوہ خارج صلوٰۃ میں سجدہ کرنا مراد نہیں۔ نیز اس حدیث میں کثرت سجود پر دخول جنت کو مرتب کیا گیا ہے تو اسی طرح کثرت قیام کی صورت میں بھی آدمی جنت میں داخل ہوگا۔

حدیثِ مبارکہ میں طول قیام کو بقیہ ارکان صلوٰۃ پر افضلیت دی گئی جبکہ ایسی فضیلت کثرۃِ سجود کے بارے میں نہیں فرمائی: اس کے برعکس حدیث باب میں قیام کو جو افضل قرار دیا گیا ہے تو یہ خاص فضیلت کثرت سجود کی صورت میں کسی حدیث میں مذکور نہیں کہ کثرت سجود والی نماز بھی افضل ترین نماز ہو۔ حدیث شریف میں طویل قیام والی نماز کو افضل ترین نماز قرار دیا ہے نہ کہ کثرت سجود والی نماز کو۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب: ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کے ارکان میں سے سجدہ سب سے افضل رکن ہے کہ سجدے میں انتہائی ذلت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ذلت کے اختیار کرنے کا مقصد اللہ کے دربار میں معزز ہونا ہے اور طول قیام کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے قرآن کی زیادہ تلاوت ہوگی اسطرح قیام میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرفِ ہمکلامی اور شرف ہم نشینی حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

باب ماجاء فی کثرۃِ الرکوع والسجودِ وفضله

باب رکوع اور سجدے (کی کثرت) کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا ابو عمّارٍ قال: حَدَّثَنَا الولیدُ بن مُسْلِمٍ عن الاَوْزَاعِیِّ قال: حدثنی الولیدُ بن هِشَامٍ المُعَیْطِیُّ قال: حدثنی مَعْدَانُ بن ابی طَلْحَةَ الیَعْمَرِیُّ قال: لَقِیتُ ثَوْبَانَ مولٰی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فقلتُ له: دُلَّنِی علی عملٍ یَنْفَعُنِی اللّٰه به ویُدْ خِلُنِی الله الجنّةَ؟ فکست عَنِّی مَلِیًّا، ثمّ الْتَفَتَ اِلَیَّ فقال: علیكَ بالسجودِ، فانّی سمعتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقولُ: مَامِنْ عبدٍ یَسْجُدُ للّٰهِ سَجْدَةً اِلّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بها دَرَجَةً وحَطَّ عنه بها خَطِیئَةً۔

---

[1] اس لفظ مصاحبۃ کا عطف مکالمہ پر ہے یعنی یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرفِ ہم کلامی بھی حاصل کر رہا ہے اور شرفِ ہم نشینی بھی۔

☆قال مَعْدَانُ بن طلحةَ فَلَقِيتُ ابا الدَّرْدَاءِ فسالتُه عماً سالتُ عنه ثَوْبَانَ؟فقال:عليكَ بالسجودِ ، فإنّي سمعتُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم يقول: مَامِنْ عبدٍ يَسْجُدُ للّٰه سجدةً اِلّا رفعهُ اللّٰه بها درجةًوحطّ عنه بها خطيئةً۔

قال: وفی الباب عن ابی هريرة وَابی اُمامةَ وابی فاطمةَ۔قال ابو عيسی: حديث ثَوْبَانَ وابی الدَّرْدَاءِ فی كثرةِ الركوع والسجود حديث حسن صحيحٌ۔ وقد اختلف اهلُ العلم فی هذا الباب۔

فقال بعضُهم: طولُ القيامِ فی الصلاة افضلُ من كثرة الركوع والسجود۔ وقال بعضهم : كثرةُ الركوع والسجود افضلُ من طول القيام۔ وقال احمد بن حنبلٍ: قد رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی هذا حديثانِ ولم يَقْضِ فيه بشیٔ۔

وقال اسحٰقُ: اَمّا فی النهار فكثرةُ الركوع والسجود، واَمّا بالليل فطولُ القيامِ ، اِلّا ان يكونَ رجلٌ له جُزءٌ بالليلِ يَأتِی عليه فكثرةُ الركوع والسجود فی هذا اَحَبُّ اِلَیّ، لِاَنّهُ يَأتِی علی جزئِه وقد رَبِحَ كثرةَ الركوع والسجود۔ قال ابو عيسی: واِنّمَا قال اسحق هذا لانه كذا وُصِفَ صلاةُ النبی صلی اللّٰه عليه وسلم باللّيلِ، وَوُصِفَ طولُ القيامِ، واما بالنهارِ فلم يُوصَفُ من صلاتِهِ مِن طول القيامِ ماوُصِفَ بالليلِ۔

﴿ترجمہ﴾

معدان بن ابی طلحہ یعمری کہتے ہیں کہ میری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی اور میں نے پوچھا کہ میری ایسے عمل کی طرف رہنمائی فرمایئے جس سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع بخشے اور مجھے جنت میں داخلہ نصیب فرمائیں (یہ سنکر) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کچھ دیر خاموش رہے پھر (غور وفکر) کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کثرتِ سجدہ کو لازم پکڑو (یعنی نوافل کی کثرت کرو) کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے جو بھی بندہ اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سجدے کے ذریعے اس کا درجہ بلند کرتا ہے اور ایک گناہ معاف کر دیتا ہے۔

معدان کہتے ہیں کہ پھر میری ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے (ایک عرصہ بعد) ملاقات ہوئی ان سے بھی یہی سوال کیا جو

ثوبان رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔انہوں نے (بغیر توقف کے) یہی جواب دیا کہ سجدے کو لازم پکڑ واور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی ارشاد سنایا جو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بتایا تھا۔اسلئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی بندہ اللہ کیلئے سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سجدے کے سبب اس کا ایک درجہ بلند فرمادیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔

اس باب میں حضرت ابوہریرہ، اور ابو فاطمہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات منقول ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ثوبان اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کی حدیث کثرتِ رکوع وسجود کے بارے میں حسن صحیح ہے۔اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک رکوع وسجود سے زیادہ افضل طول قیام ہے جبکہ بعض رکوع وسجود کی کثرت کو طول قیام سے افضل قرار دیتے ہیں۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں قسم کی روایات مروی ہیں۔چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

امام اسحٰق فرماتے ہیں کہ دن کو کثرت سے رکوع وسجود افضل ہے اور رات کو طویل قیام افضل ہے۔سوائے اس کے کسی شخص نے عبادت کیلئے رات میں کوئی متعین مقدار وظیفہ مقرر کیا ہو پھر وہ شخص اپنا وظیفہ بھی پورا کرے اس کیلئے مجھے رکوع وسجود کی کثرت پسند ہے۔کیونکہ وہ مقرر وظیفہ بھی پورا کرے گا اور رکوع وسجود کی کثرت سے مزید نفع سے بھی بہرور ہوگا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اسحٰق نے یہ بات اس لئے کہی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی یہی کیفیت بیان کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو لمبا قیام فرماتے لیکن دن کو طویل قیام کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں جیسا کہ رات کے قیام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿تشریح﴾

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کے خاموشی اختیار کرنے کی حکمتیں: (فسکت عنی ملیا) اس خاموش رہنے میں یہ حکمت ہے کہ آنے والا جواب سائل کیلئے اوقع فی النفس ثابت ہو کیونکہ یہ جواب کافی انتظار کے بعد حاصل ہوا ہے یا اس خاموشی میں یہ مقصود تھا کہ ایسے امر کو متعین کیا جائے جو سائل کے مناسبِ حال ہو اور اس پر عمل کر کے سائل جنت میں داخل ہوجائے۔یا اس وقت جواب متحضر نہیں تھا اسلئے خاموشی اختیار کی۔

امام اسحٰق کے قول کا مقصد: (جزء باللیل یاتی علیہ فکثرۃ الرکوع والسجود فیھا احب) امام اسحٰق کے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کی عادت ہو کہ وہ تہجد میں ایک خاص مقدار قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو اسے اس مقدار کے پڑھنے کے بعد کثرت رکوع وسجود کرنا زیادہ پسندیدہ ہے لیکن امام اسحٰق کے اس قول میں یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ کثرت قرأت افضل ہے یا کثرت رکوع وسجود؟ اسلئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہی راجح ہے۔

باب ماجاء فی قتلِ الاسودین فی الصلاۃ

باب سانپ اور بچھو کو نماز میں مارنے کا حکم

☆حدثنا علی بن حُجر حَدَّثَنَا اِسمٰعیلُ بن عُلَیَّۃَ وھو ابن ابراھیم عن علی بن المبارك عن یحیی بن ابی کثیرٍ عن ضَمْضَمِ بن جَوْسٍ عن ابی ھریرۃ قال: اَمَرَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بقتل الاسودین فی الصلاۃ الحیۃ والعقرب۔ وفی الباب عن ابن عباس وابی رافع قال ابو عیسی حدیث ابی ھریرۃ حدیث حسن صحیح والعمل علی ھذا عند بعض اھل العلم من اصحاب النبی ﷺ وغیرِ ھم۔ وبہ یقول احمدُ، واسحٰقُ۔ وکرہ بعضُ اھل العلم قتلَ الحیۃ والعقربِ فی الصلاۃِ۔ و قال ابراھیمُ: اِنَّ فی الصلاۃ لَشُغُلاً۔ والقولُ الاولُ اصحُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں دو کالی چیزوں کو مارنے کا حکم دیا یعنی سانپ اور بچھو کو۔

اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو رافع رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ بعض صحابہ کرام اور تابعین اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ امام احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے البتہ بعض علماء کے نزدیک نماز میں سانپ اور بچھو کو مارنا مکروہ ہے۔ ابراہیم نے فرمایا نماز میں شغل ہے (یعنی ایسی مشغولیت ہے کہ کوئی اور کام کرنا منع ہے) لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: اسودین کے مارنے کے بارہمیں دونوں قول متعارض نہیں ہیں: اسودین سے مراد

سانپ اور بچھو ہیں اسی طرح ہر وہ جانور جو نماز میں مخل اور مانع ہو اس کا بھی یہی حکم ہے "والقول الاول اصح" بظاہر امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ سمجھا ہے کہ ان دونوں قولوں میں تعارض ہے کہ امام احمد واسحٰق کے مذہب میں تو اسودین کو قتل کرنا بالکل جائز ہے اور دوسرے بعض اہل علم کے ہاں منع اور مکروہ ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں۔

فریق ثانی کا قتل اسودین سے روکنا اسوقت ہے جب تک یہ جانور خشوع وخضوع سے مانع نہ ہو: قول ثانی والے اسودین کو مارنے سے اسوقت منع کرتے ہیں جبکہ یہ موذی جانور نمازی سے اتنا دور ہو کہ نماز پڑھنے سے مانع نہ بنے اور اگر یہ موذی جانور اتنا قریب آگیا کہ اس نمازی کا خشوع وخضوع ختم ہو رہا ہے تو فریق ثانی والے یہ علماء[1] اس کو مارنے سے نہیں روکیں گے۔

---

[1] **نماز میں جانور کو مارنے کی صورت میں نماز کے فساد اور عدم فساد دونوں اقوال ہیں:** اسی وجہ سے جمہور ائمہ اربعہ کے ہاں نماز کے اندر ایسے موذی جانور کو قتل کرنا جائز ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ اس سے نماز ٹوٹے گی یا نہیں؟ بدائع میں لکھا ہے کہ سانپ اور بچھو کے نماز میں مارنے سے نماز نہیں ٹوٹتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "اقتلوا الاسودین" الحدیث اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک بچھو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈس لیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جوتا اس پر رکھ دیا۔ الحدیث۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچھو وغیرہ کو نماز میں مارنا مکروہ نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مکروہ فعل صادر نہیں ہو سکتا خصوصاً نماز کے اندر، نیز کبھی انسان کو اپنے سے مضرت دور کرنے کیلئے موذی جانور کو مارنا پڑتا ہے تو اس کو مارنا ضرورت میں داخل ہے یہ سب حکم اس وقت ہے جبکہ ایک مرتبہ مارنے سے یہ جانور مر جائے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل تھا لیکن اگر اس کو مارنے میں کئی دفعہ ضرب لگانی پڑے تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ کیونکہ یہ اپنی نماز میں گویا قتال کر رہا ہے اور یہ عمل کثیر ہے جو نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے۔ شیخ الاسلام سرخسی نے لکھا ہے کہ راجح قول میں اس کی نماز فاسد نہیں ہونی چاہئے کیونکہ موذی جانور کو مارنا نمازی کیلئے رخصت ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے نمازی کیلئے حدث کے لحوق کے بعد چلنا کنویں سے ڈول کھینچنا اور وضو کرنا یہ سارے افعال رخصت ہیں اس شخص کیلئے جو اسی سابقہ نماز پر بناء کرنا چاہتا ہو۔ انتہی کذا فی الاوجز

سانپ مارنا عمل قلیل سے ہو تو بناء جائز ہے ورنہ نماز کا اعادہ ہوگا: قلت: بنا والے مسئلہ پر حدیث باب کو قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ حدث لاحق ہونے کی صورت میں بناء کا جواز تو حدیث میں نصاً ثابت ہے بخلاف حدیث باب کے کہ اس میں سانپ مارنے کے بعد نماز کا اس پر بناء کرنا صراحۃً ثابت نہیں اسلئے جمہور کے نزدیک اسودین کے قتل کے بعد بناء اس وقت جائز ہے جبکہ اس نے عمل قلیل کے ساتھ مارا ہو یہی حنفیہ شافعیہ کا مذہب ہے ابن عربی فرماتے ہیں کہ جب اس موذی جانور سے اپنے اوپر یا اپنے غیر پر تکلیف کا اندیشہ اور ڈر ہو تو اس کو مار سکتا ہے یا وہ جانور قریب ہی ہے تب بھی مار سکتا ہے کیونکہ شرط یہ ہے کہ عمل قلیل کے ساتھ اس کو مارے لیکن اگر وہ جانور دور ہے اور اس سے اپنے اوپر ضرر کا اندیشہ ہے اور مارنے میں عمل کثیر بھی ہے تو بھی اس کو مار سکتا ہے لیکن نماز کا اعادہ کریگا۔ انتہی

اسی لئے فریق ثانی نے اپنی دلیل "ان فی الصلوۃ لشغلا" کے ساتھ دی ہے اس دلیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سانپ وغیرہ کو مارنا اس وقت منع ہے جبکہ اس کا نماز میں دیہان اس کی طرف لگا ہو اور اگر اس موذی جانور کی وجہ سے اس کا دیہان نماز میں ختم ہو گیا تب تو اس کو شغل فی الصلوٰۃ نہیں ہے بلکہ غیر صلوٰۃ میں مشغولی ہے لہٰذا جب تک نہیں مارے گا نماز کے علاوہ کے خیالات میں لگا رہے گا اور جب اس جانور کو مار دیگا تو اس وقت اس کے خیالات صرف نماز کے متعلق رہ جائیں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر سانپ وغیرہ کے آنے سے اس کی نماز کا خشوع وخضوع ختم نہیں ہوا تو سانپ وغیرہ کو نہیں مارنا چاہیئے اور اگر اس موذی جانور کی وجہ سے نماز کی طرف توجہ ختم ہو چکی ہے تو اس جانور کو مار کر ہی انسان اپنے آپ کو نماز کیلئے فارغ کر سکتا ہے۔ "ان فی الصلوٰۃ لشغلا" کے معنی یہ ہے کہ نماز میں صرف اپنے رب سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ مشغولیت ہونی چاہیئے نہ کہ کسی اور کے ساتھ۔

لفظ اسود کی وضاحت: یہ بات جان لینی چاہیئے کہ لغت میں اسود ہر اس شئی کو کہتے ہیں جس میں سیاہی پائی جائے پھر یہ صفت سانپ کے اندر اکثر پائی جاتی تھی اسلئے جب بھی لفظ اسود مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے کالا سانپ مراد ہوتا ہے پھر اس کا استعمال ہر قسم کے سانپ پر ہونے لگا چاہے وہ کالا ہو یا نہیں۔ الاسودین سے مراد سانپ اور بچھو ہیں ان کو تغلیباً اسودین کہا گیا کیونکہ بچھو نہ تو کالا ہوتا ہے اور نہ ہی اسود اس کا نام ہے۔

باب ماجاء فی سجدتی السَّهْوِ قبل التَّسْلِيمِ

باب سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنے کے بیان میں

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا اللَّيثُ عن ابن شهابٍ عن الاعرجِ عن عبد الله بن بُحينة الاسدی حليف بنی عبد المطلبِ: ان النبیَّ صلی الله عليه وسلم قام فی صلاة الظهر وعليه جلوسٌ، فلمَّا اَتَمَّ صلاتَه سجدَ، سجدتينِ، يُكَبِّرُ فی كُلِّ سجدةٍ وهو جالسٌ، قَبْلَ اَنْ يُسَلِّمَ، وسجدهما النَّاسُ معه، مكانَ مَانَسِيَ من الجلوسِ۔ قال: وفی الباب عن عبد الرحمٰن بن عوفٍ۔

حَدَّثَنَا محمد بن بَشَّارٍ حَدَّثَنَا عبدُ الاعلیَ وابُو داودَ قالا: حَدَّثَنَا هشامٌ عن يحيی بن ابی كثيرٍ عن محمد بن ابراهيم: اَنَّ اَبا هريرةَ والسَّائِبَ القاری كانا يسجدانِ سجدتی السهوِ قبل التسليمِ۔ قال ابو عيسی: حديث ابنِ بحينة حديث حسن۔ والعملُ علی هذا عند بعض اهل العلم۔ وهو قولُ

الشافعی، یَرَی سجدتي السهو کلِّهِ قبل السلام، ویقول: هذا الناسخُ لغیره من الاحادیث، ویذ کُر اَنَّ آخر فعل النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان علی هذا۔ وقال احمدُ واسحٰق: اذا قام الرجلُ فی الرکعتین فِانه یسجدُ سجدتی السهو قبل السلام علی حدیث ابنِ بحینة۔ وعبد اللّٰه بن بحینة هو عبد اللّٰه بن مالك بنِ بحینة مالك ابوه وبحینة امه۔

هکذا اخبرنی اِسحٰقُ بن منصورٍ عن علی بن عبد اللّٰه بن المَدِینیِّ۔ قال ابو عیسی: واختلف اهل العلم فی سجدتی السهو، متی یسجد هما الرجلُ: قبل السلام او بعده؟

فرأی بعضهم اَنْ یسجدَهما بعد السلام۔ وهو قولُ سفیانَ الثوریِّ، واهلِ الکوفة۔ وقال بعضهم یسجدُهما قبل السلام۔ وهو قول اکثر الفقهاء من اهل المدینة، مِثلِ یحیی بن سعیدٍ، ورَبیعةَ، وغیرِ هما، وبه یقول الشافعیُّ۔ وقال بعضهم: اِذا کانت زیادةً فی الصلاة فبعد السلامِ، واِذا کان نقصاناً فقبل السلام۔ وهو قول مالك بن انسٍ۔

وقال احمدُ: ماروُیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی سجدتی السهو فیُستَعمَلُ کُلٌّ علی جِهتِهِ: یرَی اِذا قام فی الرَّکعتین علی حدیث ابْنِ بحینة: فانه یسجدهما قبل السلام، واِذا صلَّی الظهر خمساً فاِنه یسجدهما بعد السلام،واِذا سلَّم فی الرکعتین من الظهر والعصر فاِنه یسجدهما بعد السلام، وکُلٌّ یُستعملُ علی جهته۔ وکُلُّ سهوٍ لیس فیه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ذِکْرٌفاِنَّ سجدتی السهوِ فیه قبل السلام۔ وقال اِسحٰقُ نحوَ قولِ احمدَ فی هذا کلِّه، اِلا انه قال: کلُّ سهوٍ لیس فیه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ذکرٌ، فاِن کانت زیادةً فی الصلاة یسجدهما بعد السلامِ، وان کان نقصاناً یسجدهما قبل السلام۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبداللہ بن بحینہ اسدی رضی اللہ عنہ جو حلیف تھے بنی عبدالمطلب کے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر میں قعدہ اولیٰ بھول کر کھڑے ہو گئے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پوری کر چکے تو سلام پھیرنے سے پہلے بیٹھے ہوئے دو سجدے کیئے اور ہر سجدے میں تکبیر کہی۔ لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سجدے کئے۔ اس قعدہ اولیٰ کے بدلے میں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول گئے تھے۔

اس باب میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

محمد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ اور سائب القاری سلام سے پہلے سجدہ سہو کیا کرتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن بحینہ کی حدیث حسن ہے اور بعض علماء کا اسی پر عمل ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ سہو کی تمام صورتوں میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابن بحینہ کی حدیث دوسری احادیث کیلئے ناسخ کا درجہ رکھتی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل اسی کے مطابق تھا۔ امام احمد واسحق کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص دو رکعتوں کے بعد قعدہ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جائے تو سجدہ سہو سلام سے پہلے کرے گا۔ ابن بحینہ کی حدیث کے مطابق عمل کرتے ہوئے...... اور عبداللہ بن بحینہ وعبداللہ بن مالک بن بحینہ ہیں۔ مالک ان کے والد اور بحینہ ان کی والدہ ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے اسحق بن منصور سے بواسطہ علی بن مدینی اسی طرح معلوم ہوا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ سجدہ سہو کب کیا جائے؟ سلام سے پہلے کیا جائے یا سلام کے بعد؟ بعض (اہل علم) کے نزدیک سلام کے بعد کیا جائے۔ سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا یہی قول ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ سجدہ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور یہ اکثر فقہاء (مدینہ) کا قول ہے جیسے یحییٰ بن سعید اور ربیعہ الرائے وغیرہ۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ اگر نماز میں زیادتی ہو تو سلام کے بعد اور کمی ہو تو سلام سے پہلے سجدہ سہو کیا جائے یہ مالک بن انس رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ سہو مروی ہے (لفظی ترجمہ) پس استعمال کی جائے ہر روایت اس کے رخ پر...... اسی صورت سے کیا جائے گا۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر دو رکعتوں کے بعد قعدہ اولیٰ بھول کر کھڑا ہو جائے تو ابن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق سجدہ سہو سلام سے پہلے کرے اور اگر ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ لے (یعنی قعدہ اخیر بھول کر کھڑا ہو جائے) تو سجدہ سہو سلام کے بعد کرے۔ اور اگر ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعتوں پر سلام پھیر لیا ہو تو سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرے (یعنی نماز پوری کر کے) (اور ہر حدیث استعمال کی جائے اس کے رخ پر) اور ہر وہ بھول جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں تو سجدہ سہو سلام سے پہلے کیا جائے۔ اسحق بھی امام احمد کی رائے ہی کے قائل ہیں البتہ آپ (اسحق) فرماتے ہیں بھول کی جو صورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں وہاں دیکھا جائے اگر نماز میں زیادتی ہو تو سلام کے بعد اور اگر کمی ہو تو سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔

﴿تشریح﴾

یہاں مسئلہ میں چھ مذاہب ہیں: اس مسئلہ میں پانچ مذاہب [1] ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ سہو بعد السلام ہوگا اگرچہ قبل السلام بھی جائز ہے۔ ۲۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ سہو بعد السلام [2] ہوگا لیکن قبل السلام سجدہ سہو کرنا [3] جائز ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ان کی مستدل حدیث کے علاوہ باقی ساری حدیثیں منسوخ ہیں اسلئے منسوخ حدیث پر عمل کیسے جائز ہوگا۔ ۳۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر نماز میں زیادتی ہوگئی ہے [4] تو سجدۂ سہو بعد السلام ہے اور اگر کچھ کمی واقع ہوئی ہے تو قبل السلام ہے۔ ۴۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نمازی سے اگر ایسی غلطی اور سہو ہوا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے ان میں سجدہ سہو اسی طرح کیا جائیگا جس طرح حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اور اگر نمازی سے ایسی غلطی اور سہو ہوا جو غلطی اور سہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اس میں امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب، امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی طرح ہے کہ سجدہ

---

[1] یہاں پر ایک چھٹا مذہب داؤد ظاہری کا ہے انہوں نے ظاہر الحدیث پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس غلطی اور سہو پر سجدہ سہو کرنا منقول ہے صرف انہی مواقع پر سجدہ سہو کیا جائیگا ورنہ سجدہ سہو لازم نہیں اس کے علاوہ تین اور مذاہب بھی ہیں جن کو میں نے اوجز میں تفصیل سے نقل کیا ہے تو کل نو مذہب ہو جاتے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے امام ترمذی رحمہ اللہ کی اتباع کرتے ہوئے پانچ مشہور مذاہب پر اکتفاء کیا ہے۔

[2] یہ اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے لیکن یہاں پر قلب واقع ہوگیا ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ سہو قبل السلام ہوگا اور بعد السلام جائز ہی نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے آئندہ آنے والے کلام سے اس قلب کلام کی تائید ہورہی ہے۔

[3] **احناف اور شوافع کا سجدہ سہو قبل السلام اور بعد السلام کا اختلاف افضلیت کا ہے نہ کہ جائز ناجائز کا:** حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے آنے والے قول کہ ''سجدة السهو قبل التسليم'' والی حدیثیں دوسری احادیث کیلئے ناسخ ہیں اس سے استدلال کیا ہے کہ شوافع کے نزدیک سجدہ سہو بعد السلام جائز ہی نہیں کیونکہ منسوخ حدیث پر عمل صحیح نہیں ہوتا لیکن شوافع کے مذہب کے اکثر ناقلین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ دونوں طرح کرنا جائز ہے۔ چنانچہ حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ماوردی سے نقل کیا ہے کہ دونوں طرح سجدہ سہو کرنے کے جواز پر اجماع ہے اختلاف تو افضلیت کا ہے اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ نے اجماع کا قول نقل کیا ہے۔ انتہی کذا فی الاوجز

[4] اور اگر کسی نماز میں کسی رکن میں کوتاہی بھی ہوتی ہے اور زیادتی بھی تو مالکیہ کہتے ہیں کہ سجدہ سہو قبل السلام ہونا چاہیئے کیونکہ وہ نقص کو زیادتی پر غالب قرار دیتے ہیں۔

سہوقبل السلام ہوگا۔ ۵۔ امام اسحٰق کا مذہب پہلے جزء میں تو امام احمد رحمہ اللہ کی طرح ہے کہ جس غلطی کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ سہو کرنے کا ثبوت ہے وہاں بالکل اسی طرح کیا جائیگا اور جس غلطی اور سہو کا ثبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول پر عمل کیا جائیگا۔

امام ابوحنیفہ کے مذہب کی وجہ ترجیح: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے مذہب کو اس طرح ترجیح دی ہے کہ سجدہ سہو کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف فعل مروی ہیں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل السلام سجدہ سہو ادا فرمایا اور کبھی بعد السلام ادا فرمایا لہٰذا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو ترجیح دی جس کے موافق آپ کا قول وارد ہے کیونکہ قولی حدیث میں سجدہ سہو قبل السلام کا حکم ہے۔ اس طرح قول اور فعل دونوں پر عمل ہو جائیگا۔

شوافع کی طرف سے اعتراض اور اسکا جواب: اشکال: شوافع یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل سجدہ سہو قبل السلام ہے لہٰذا یہ امر ناسخ ہے دوسری احادیث کیلئے۔ جواب: کسی فعل کے آخری ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے والا فعل منسوخ ہو بلکہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ سہو قبل السلام آخر میں بیان جواز کیلئے کیا ہو۔

شوافع کا حنفیہ کی وجہ ترجیح پر اعتراض اور اسکا جواب: ہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جس طرح حنفیہ کے پاس حدیث قولی ہے اسی طرح شوافع کے پاس حدیث قولی ہے[1] جس میں سجدہ سہو قبل السلام کا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احادیثِ قولیہ میں جب تعارض ہو جائے تو قیاس کے ذریعہ ترجیح دی جاتی ہے۔ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ سلام کے ذریعے سجدہ سہو میں فصل ہونا چاہیئے کیونکہ سجدہ سہو نماز کی کمی کو پورا کرنے والی شئی ہے اور کسی شئے کی کمی کو پورا کرنے والی شئے اس چیز کا غیر ہوا کرتی ہے جیسا کہ فرض نماز کے اندر سنتوں کی کوتاہی کو نماز کے بعد کی سنتیں اور اذکار اس کمی کو پورا کر دیتی ہیں۔ لہٰذا یہاں پر بھی سجدہ سہو کو سلام کے بعد آنا چاہیئے تاکہ کمی کو پورا کرنے والی شئی کی اصل شئی کے ساتھ جدائی ہو جائے اور یہ اصل شئی کا غیر ثابت ہو لیکن چونکہ دونوں طریقے سجدہ سہو قبل السلام اور بعد السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً اور فعلاً ثابت ہیں لہٰذا ہم کسی سے بالکلیہ نہیں روک سکتے۔

---

[1] چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے نماز میں شک ہو جانے کے متعلق یہ حدیث ذکر کی ہے "ولیبن علی ما استیقن ثم یسجد سجدتین قبل ان یسلم" اس حدیث میں قولاً سجدہ سہو قبل السلام کا حکم ہے لیکن جن احادیث میں سجدہ سہو بعد السلام کا ذکر ہے تو وہ قولاً اور فعلاً بکثرت مروی ہیں اور زیادہ واضح بھی ہیں۔

شوافع کا استدلال اور اسکا جواب: شوافع نے اپنے مذہب پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ سجدہ سہو قبل السلام والی حدیث کے راوی متاخر الاسلام ہیں لہٰذا یہ حدیث بھی بعد کی ہوگی۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ تو بے بنیاد نسخ کا دعویٰ ہے کیونکہ راوی کے متاخر الاسلام ہونے سے حدیث کا موخر ہونا لازم نہیں آتا۔

مالکیہ کا استدلال اور اسکا جواب: مالکیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں غور کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں کمی اور کوتاہی ہوئی تھی وہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو قبل السلام فرمایا ہے اور جہاں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارکان میں زیادتی ہوئی تھی وہاں پر سجدہ سہو بعد السلام ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ باب ما جاء فی الامام ینهض فی الرکعتین ناسیا میں[1] شعبہ کی روایت شعبی کی سند سے گزری ہے۔ اس میں یہ ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی اور دو رکعتوں پر بغیر تشہد پڑھے کھڑے ہو گئے مقتدیوں نے سبحان اللہ کہا تو انہوں نے بھی جوابا سبحان اللہ کہا پھر نماز کے آخر میں انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد سہو کے دو سجدے کئے اور پھر یہ بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا اب غور کریں کہ اس حدیث میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن سجدہ سہو بعد السلام کیا ہے کسی زیادتی کی وجہ سے نہیں کیا ہے۔ تو یہ حدیث مالکیہ کے خلاف حجت[2] ہے اس کا جواب مالکیہ نہیں دے سکتے اسی طرح یہ حدیث امام احمد واسحٰق کے خلاف بھی حجت ہے۔

---

[1] اسی طرح اصل نسخہ میں ہیں بظاہر یہاں پر لکھنے والے سے خطا ہوئی ہے صحیح لفظ مغیرہ بن شعبہ ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد و ترمذی نے نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ امام نووی نے خلاصہ میں لکھا ہے کہ حاکم نے مستدرک میں اسی طرح کی روایت سعد بن ابی وقاص اور عقبہ رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں سے ہر حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحت کے درجہ میں ہے۔ کذا فی الاوجز

[2] مالکیہ کا مذہب (القاف بالقاف والدال بالدال) اُن احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں یہ حکم ہے کہ نماز میں شک پڑنے کی صورت میں نمازی یقین پر بناء کرے گا اور دو سجدے قبل السلام کرے گا۔ اب غور کیجئے! کہ ان احادیث میں نمازی کو یہ شک ہے کہ وہ نماز پوری کر چکا ہے یا اس نماز میں کوئی زیادتی کر چکا ہے اور ایسی صورت میں تو مالکیہ کے ہاں سجدہ سہو بعد السلام ہوا کرنا چاہیئے حالانکہ ان احادیث میں سجدہ سہو قبل السلام کا حکم ہے۔ بہر حال اس وجہ سے علامہ باجیؒ وغیرہ نے ان روایات کی تاویل کی ہے۔

باب ماجاء فی سجدتی السهو بعد السلام والکلام

باب سلام اور کلام کے بعد سجدہ سہو کرنا

☆حدثنا اسحٰق بن منصورٍ اخبرنا عبد الرحمٰنِ بن مَهْدِيّ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عن الحَكَمِ عن ابراهيم عن عَلْقَمَةَ عن عبد اللّٰهِ بن مسعودٍ: اَنَّ النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم صلى الظهرَ خَمْساً، فقيل له: اَزِيدَ فی الصلاةِ ام نسيت فسجدَ سجدتينِ بعد ماسَلَّمَ۔ قال ابوعيسى: هذا حديث حسن صحيح۔

☆حدثنا هناد ومحمود بن غَيْلَانَ قالا: حَدَّثَنَا ابو معاويةَ عن الاعمش عن ابراهيم عن علقمةَ عن عبد اللّٰه: ان النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم سجدَ سجدتی السهو بعد الکلام۔

قال: وفی الباب عن معاويةَ، وعبد اللّٰه بن جعفرٍ، وابی هريرةَ۔

☆حدثنا احمدُ بن مَنِيع حَدَّثَنَا هشيم عن هِشَامِ بن حَسَّانَ عن محمد بن سيرينَ عن ابی هريرةَ: اَنَّ النبی صلى اللّٰه عليه وسلم سجدهما بعد السلام۔ قال ابوعيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ وقد رواهُ اَيُّوبُ وغيرُ واحدٍ عن ابن سيرينَ۔ وحديث ابن مسعود حديث حسن صحيح۔ والعملُ على هذا عند بعض اهل العلم۔

قالوا: إذا صلَّى الرجلُ الظهرَ خمساً فصلاتُه جائزةٌ، وسجدَ سجدتی السهو، وإنْ لم يجلس فی الرابعةِ۔ وهو قولُ الشافعیِّ، واحمدَ وإسحٰقَ وقال بعضهم: اذا صلَّى الظهرَ خمساً ولم يقعد فی الرابعةِ مقدارَ التشهُّدِ فسدت صلاتُه۔ وهو قولُ سفيانَ الثوریِّ، وبعض اهل الکوفةِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعتیں ادا کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں زیادتی ہوگئی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول ہوگئی؟ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد دو سجدے کئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام کرنے کے بعد سجدہ سہو کے دو سجدے کئے۔

اس باب میں معاویہ، عبداللہ بن جعفر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد دونوں سجدے کئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اس حدیث کو ایوب اور متعدد راویوں نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ اسی پر بعض علماء کا عمل ہے کہ اگر کوئی آدمی ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ لے تو اس کی نماز جائز ہے بشرطیکہ سجدہ سہو کرے اگر چہ چوتھی رکعت میں نہ بھی بیٹھا ہو اور یہ امام شافعی، احمد اور اسحٰق کا قول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اگر ظہر کی نماز میں پانچ رکعتیں پڑھ لیں اور چوتھی رکعت میں تشہد (التحیات) کی مقدار نہ بیٹھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی اور یہ سفیان ثوری اور بعض اہل کوفہ کا قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب نماز میں کلام کے جواز کے بارے میں منسوخ ہو چکی ہے: اس حدیث باب سے ان علماء کا استدلال ہے جو نماز میں فی الجملہ کلام کو جائز قرار دیتے ہیں اس حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے صحیح سند[1] کے ساتھ نقل کیا ہے کہ بعینہ اسی طرح کا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ تو انہوں نے کلام کرنے کے بعد اسی نماز پر بناء نہیں کی بلکہ از سر نو اس نماز کو ادا کیا اس وقت صحابہ کرام کا ایک مجمع موجود تھا کسی نے بھی ان پر نکیر نہیں کی حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحابہ کو یہ تاکید تھی کہ کوئی نامناسب بات ان سے صادر ہو تو ضرور تنبیہ کریں پس اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نماز میں سہواً کلام کا جواز منسوخ ہو چکا ہے کیونکہ روایات میں تصریح ہے کہ جس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا تھا اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور اب ان کا عمل اس کے خلاف ہے پھر مسئلہ یہ[2] ہے کہ نماز میں ایسا کلام کرنا جواذ کار کے قبیل[3] سے ہو نماز فاسد نہیں کرتا اور اگر کلام الناس کے قبیل سے ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

---

[1] علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور یہ صحیح سند کے ساتھ مرسلاً مروی ہے۔

[2] یہ مسئلہ عنقریب آگے آرہا ہے کہ نماز میں کلام کرنے کا کیا حکم ہے۔

[3] لیکن اس میں شرط ہے کہ نماز میں یہ ذکر کسی سائل کے جواب میں واقع نہ ہو اگر یہ ذکر جواب میں واقع ہوگا تو یہ کلام الناس میں داخل ہو جائیگا جیسا کہ اہل فروع نے اس کی تصریح کی ہے۔

امام ترمذی کی احناف پر تعریض: (والعمل علی ھذا عند بعض اھل العلم قالوا اذا صلی الرجل الظہر خمسا فصلوته جائزۃ و سجد سجدتی السھو وان لم یجلس فی الرابعۃ) **امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس قول کا** مقصد احناف پر تعریض ہے کیونکہ احناف کے ہاں اس مسئلہ میں تفصیل ہے کہ اگر یہ شخص قعدہ اخیرہ میں تشہد کی مقدار بیٹھ چکا تھا تب تو اس کی نماز صحیح ہو جائیگی اور اگر تشہد کی مقدار نہیں بیٹھا تھا اور پانچویں رکعت کا سجدہ ملالیا تو اسکے فرض باطل ہو جائینگے لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ یہ اعتراض کررہے ہیں کہ اس طرح حنفیہ کا تفریق کرنا حدیث باب کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں مطلقاً نماز کو جائز قرار دیا گیا ہے چاہے وہ تشہد کی مقدار بیٹھا ہو یا نہ بیٹھا ہو۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث باب ایک جزئی واقعہ ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہونا دو حال سے خالی نہیں یا تو تشہد کے بغیر کھڑے ہو گئے یا تشہد کی مقدار بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوئے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کی مقدار بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوتے تو بغیر تشہد پڑھے کھڑے ہونے کا حکم معلوم نہیں ہوگا اور اگر تشہد کے بغیر پانچویں رکعت کیلئے کھڑے ہوئے تھے تو پھر تشہد پڑھنے کے بعد کھڑے ہونے کا حکم ثابت نہیں ہوگا لہٰذا خصم پر لازم ہے کہ ان دونوں شقوں میں سے[1] کسی ایک شق کو ثابت کریں۔ یا یہ ثابت کریں کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ایسا فعل صادر ہوا ہے جو دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ جبکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ اس سجدہ سہو کی وضع ہی اس لئے ہے کہ نماز کے واجبات میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو پورا کیا جائے جیسا کہ سب اس کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا اگر یہاں پر قعدہ اخیرہ کی مقدار بیٹھے ہی نہیں تب تو ایک رکن چھوٹ گیا اور سجدہ سہو رکن کا جبیرہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ واجبات میں سے کسی واجب کے چھوٹنے کا یہ جبیرہ بنتا ہے اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلی روایت میں یہ حکم بیان فرمایا کہ جس شخص کو نماز کے اندر شک واقع ہو تو وہ بناء علی الاقل کرے تاکہ نماز کے ارکان میں سے کوئی رکن باقی نہ رہ جائے کیونکہ اگر کوئی فرض باقی رہ گیا تو سجدہ سہو

---

[1] لیکن حنفیہ پر اس حدیث سے اشکال نہیں کیا جاسکتا الا یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ حدیث باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کیلئے نہیں بیٹھے تھے اور اس کا ثبوت تو کسی حدیث سے نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف ایک احتمال ہے۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: حنفیہ پر لازم ہے کہ وہ ثابت کریں کہ یہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کی مقدار بیٹھے تھے؟

جواب (۱): حنفیہ پر یہ ثابت کرنا ضروری نہیں کیونکہ قعدہ اخیرہ فرض ہے لہٰذا ایک فرض کو ادا کئے بغیر نماز کا صحیح ہونا ناممکن ہے ہاں اگر کسی نص صریح سے ثابت کیا جائے کہ فرض (رکن) کے ادا کئے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے اور حدیث باب تو ایک محتمل نص ہے۔

جواب (۲): حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حدیث باب والے فعل کو متفق علیہ صورت پر محمول کرنا (کہ قعدہ اخیرہ کر چکے تھے) زیادہ اولیٰ ہے بنسبت اس کے کہ اس کو مختلف فیہ صورت پر محمول کیا جائے کذا فی الاوجز۔

اس کی کمی کو پورا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا حنفیہ نے یہاں پر مسئلہ میں یہ فرق کیا ہے کہ حدیث باب میں جو حکم ہے یہ اس وقت ہے جبکہ قعدہ اخیرہ میں تشہد کی مقدار بیٹھ چکے تھے اور اگر تشہد کی مقدار نہیں بیٹھے تھے تب تو اس کے فرض ہی باطل ہوگئے۔

حدیث شریف میں[1] اس بھول جانے کو شیطان کا حصہ اسلئے فرمایا کہ شیطان نمازی کو بھلا کر خوش ہوتا ہے اور نمازی کا وقت برباد ہوجاتا ہے اس طرح بہت سے مفاسد سامنے آتے ہیں۔

باب ماجاء فی التشهد فی سجدَتَي السهو

باب سجدہ سہو میں تشہد پڑھنے کے بارے میں

☆حدثنا محمد بن يحيى النَّيسابُورِيُّ حَدَّثَنَا محمد بن عبد اللّٰه الانصاريُّ قال: اخبرنِي اَشْعَثُ عن ابْنِ سيرينَ عن خالد الحَذَّاءِ عن ابى قِلَا بَةَ عن ابى المُهَلَّبِ عن عِمْرَانَ بن حُصَيْنٍ: اَنَّ النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم صلى بهم فسهاَ، فسجدَ سجدتَيْنِ، ثم تشهَّدَ، ثم سلَّمَ۔ قال ابو عيسى: هذا حديثٌ حسن غريب۔ ورَوَى محمد بن سيرينَ عن ابى المُهَلَّب، وهو عَمُّ ابى قِلَابَةَ: غيرَ هذا الحديثِ۔

ورَوَى محمدٌ هذا الحديث عن خالدِ الحذَّاءِ عن ابى قِلَا بَةَ عن ابى المُهَلَّبِ۔

وابو المُهَلَّبِ اسمُه عبد الرحمٰن بن عَمْرٍو ويقالُ ايضاً معاويةُ بن عَمْرٍو۔ وقد رَوَى عبدُ الوهابِ الثقفِيُّ وهشيم وغير واحدٍ هذا الحديثَ عن خالدِ الحذَّاءِ عن ابى قِلَابَةَ بِطُوله، وهو حديث عِمْرَانَ بن حُصَيْنٍ: اَنَّ النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم سلم فى ثَلَاثِ ركعاتٍ من العصرِ، فقام رجل يقال له الخرباق۔

واختلف اهل العلم فى التشهدِ فى سجدتى السهو: فقال بعضهم: يَتَشَهَّدُ فيهما ويسلِّمُ۔ وقال بعضُهم: ليس فيهما تشهُّدٌ وتسليمٌ، واذا سجد هما قبل السلام لم يتشهد۔ وهو قول احمدَ، واسحٰق۔ قالا: اذا سجد سجدتى السهو قبل السلامِ لم يَتشهد۔

---

[1] حدیث باب میں اس طرح کا کوئی لفظ موجود نہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بھولنا شیطان کا حصہ ہے لیکن چونکہ سجدہ سہو کی روایات میں اس سہو کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لئے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح بیان کردی۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور اس میں آپ کو بھول ہوگئی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سجدے کئے اور پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

ابن سیرین، ابو مہلب سے جو ابو قلابہ کے چچا ہیں اس کے علاوہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ محمد نے یہ حدیث خالد حذاء سے انہوں نے ابو قلابہ سے اور انہوں نے ابو مہلب سے روایت کی ہے اور ابو مہلب کا نام عبدالرحمن بن عمرو ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا نام معاویہ بن عمرو ہے۔ عبدالوہاب ثقفی، ہشیم اور کئی راوی خالد حذاء سے اور وہ ابو قلابہ سے یہ حدیث مکمل اور طویل ذکر کرتے ہیں۔ یہی حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں تین رکعتوں کے بعد سلام پھیر لیا تو ایک شخص جسے خرباق کہتے ہیں کھڑا ہوا...... آخر تک۔ اہل علم کا سجدہ سہو کے تشہد میں اختلاف ہے بعض اہل علم کے نزدیک ان دو سجدہ سہو میں تشہد پڑھے اور سلام پھیرے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں (یعنی سجدہ سہو میں) تشہد اور سلام نہیں ہے اور اگر سلام پھیرنے سے پہلے سجدے کرے تو تشہد نہ پڑھے اور یہ امام احمد واسحق کا قول ہے دونوں فرماتے ہیں کہ جب سلام سے پہلے سجدہ کیا تو تشہد نہ پڑھے۔

﴿تشریح﴾

سجدہ سہو کے بعد دوبارہ تشہد پڑھنے والی حدیث ایک متفق علیہ ضابطے کیوجہ سے احناف کی دلیل

ہے: (قولہ فسہا فسجد سجدتین ثم تشہد ثم سلم) حدیث باب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل ہے کہ سجدہ سہو کے بعد دوبارہ[1] تشہد پڑھا جائیگا فریق مخالف نے اس حدیث کو کس طرح چھوڑ دیا حالانکہ ان کا اتفاق ہے کہ ثقہ راوی کی

[1] **سجدہ سہو کے بعد دوبارہ تشہد پڑھنے میں ائمہ کے مذاہب:** اس مسئلہ میں ائمہ کے مذاہب اوجز میں اس طرح نقل کئے گئے ہیں کہ ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ سجدہ سہو کیلئے جاتے ہوئے بھی تکبیر کہے اور اس سے اٹھتے ہوئے بھی تکبیر کہے چاہے سجدہ سہو قبل السلام ہو یا بعد السلام۔ اگر سجدہ سہو قبل السلام ہو تو سجدہ کرنے کے بعد بغیر تشہد پڑھے سلام پھیر دے اور اگر سجدہ سہو بعد السلام ہو تو تشہد پڑھ کر سلام پھیرے چاہے واقع اور نفس الامر میں سجدہ سہو بعد السلام ہی کرنا تھا یا سجدہ سہو قبل السلام کرنا تھا لیکن اس نے بھولے سے سجدہ سہو بعد السلام کیا۔ یہ حنابلہ اور شافعیہ کا مذہب ہے۔ ''الاستذکار'' میں ہے کہ بویطی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ سجدہ سہو کے بعد تشہد پڑھنا واجب ہے لیکن اگر کوئی شخص سجدہ سہو بعد السلام کرے تو اس کے تشہد پڑھنے میں اختلاف ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

زیادتی قابل اعتبار ہوتی ہے تو اس متفق علیہ قاعدے کی مخالفت کیوں کی گئی؟ بہر حال اس متفق علیہ قاعدے کی وجہ سے حنفیہ کے مذہب میں سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھا جائیگا۔ جن احادیث میں سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھنے کا ذکر نہیں وہ ساکت ہیں اوران میں یہ تاویل کی جائیگی کہ ان احادیث میں اختصار ہے۔ راوی نے تشہد کو ذکر نہیں کیا جیسا کہ ابو ہریرہ نے حدیث ذوالیدین جو باب ما جاء فی الرجل یسلم فی الرکعتین من الظهر و العصر میں آرہی ہے سجدہ سہو کرنے کے بعد سلام پھیرنے کا ذکر نہیں کیا ہے (حالانکہ سلام تو پھیرنا ہے) چنانچہ ان کی حدیث میں ثم سجد مثل سجوده او اطول کے الفاظ ہیں۔ فقط

باب ماجاء فی الرجل یصلّی فیشکُّ فی الزیادةِ والنقصانِ

باب اس شخص کے بارے میں جسے (رکعات) نماز میں کمی یا زیادتی کا شک ہو

☆حدثنا احمدُ بن مَنیعٍ حَدَّثَنَا اِسمٰعیلُ بن ابراهیم حَدَّثَنَا هشام الدَّسْتَوائیُّ عن یحیی بن ابی کثیر عن عِیَاضٍ یعْنی ابنَ هِلَالٍ قال:قلتُ لابی سعیدٍ: اَحَدُنَا یصلِّی فلا یَدْری کیف صلّٰی؟ فقال:قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اِذا صلّٰی احدُ کم فلم یَدْرِ کیف صلّٰی فَلْیَسْجُدْ سجدتینِ وهو جالسٌ۔

قال: وفی الباب عن عثمان، وابن مسعودٍ، وعائشةَ، وابی هریرةَ۔ قال ابو عیسی:حدیث ابی سعیدٍ حدیث حسنٌ۔ وقد رُوِیَ هذا الحدیثُ عن ابی سعیدٍ من غیر هذا الوجه۔

وقد رُوی عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال:اذا شَکَّ احدُ کم فی الواحدة والثِّنْتَیْنِ فَلْیَجْعَلْهَا واحدةً، واِذا شکَّ فی الثنتین والثلاث فلیجعلهما ثِنْتَیْنِ ، ویَسْجُدُ فی ذٰلك سجدتینِ قبلَ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کے آخر میں لکھا ہے کہ مزنی نے المختصر میں لکھا ہے کہ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے سنا کہ اگر سجدہ سہو بعد السلام کیا ہے تب تو تشہد دوبارہ پڑھے گا اور اگر قبل السلام کیا ہے تو پہلا تشہد ہی کافی ہے۔ قاضی عیاض نے امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ سجدہ سہو بعد السلام کی صورت میں تشہد پڑھا جائیگا اور سجدہ سہو قبل السلام کی صورت میں تشہد کے بارے میں ان سے مختلف روایتیں ہیں۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے مذہب میں سجدہ سہو کرنے کے بعد تشہد پڑھے گا اور شافعیہ کے صحیح مذہب میں تشہد نہیں پڑھے گا۔ انتہی مافی الاوجز۔ درمختار میں حنفیہ کا مذہب اس طرح لکھا ہے کہ دو سجدے کرنے کے بعد تشہد پڑھے اور سلام پھیرے کیونکہ سجدہ سہو کرنے سے پہلا تشہد ختم ہو جائیگا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ سجدہ سہو کرنے سے تشہد کو پڑھنا کالعدم سمجھا جائیگا اب اگر یہ شخص سجدہ سہو کرنے کے فورا بعد سلام پھیر دے تو اس کی نماز تو ہو جائیگی لیکن واجب کو چھوڑنے والا کہلائیگا۔

ان یسلّم والعملُ علی ھذا عند اصحابنا۔ وقال بعض اھل العلم: اِذا شَكَّ فی صلا ته فلم یَدْرِ کم صلّی فلیُعِدْ۔

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللیث عن ابن شھابٍ عن ابی سلمة عن ابی ھریرةَ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم:اِنَّ الشیطانَ یَأتِی احدَکم فی صلا ته فَیَلْبِسُ علیه، حتی لایَدْرِی کم صلّی، فِاذا وَجَدَ ذٰلك احدُکم فلیسجد سجدتین وھو جالسٌ۔

قال ابوعیسی:ھٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا محمد بن بشّارٍ حَدَّثَنَا محمد بنُ خالدٍ ابنُ عَثْمَةَ البصریُّ حَدَّثَنَا ابراھیمُ بن سعدٍ قال: حدثنی محمد بن اِسحٰق عن مکحولٍ عن کُرَیْبٍ عن ابن عباسٍ عن عبد الرحمٰن عوفٍ قال: سمعتُ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم یقولُ: اِذا سَھَا احدُکم فی صلاته فلم یَدْرِ واحدةً صلّی او ثِنْتَیْنِ فَلْیَبْنِ علی واحدةٍ، فِان لم یَدْرِ ثنتینِ صلّی او ثلاثاً فَلْیَبنِ علی ثِنْتَیْنِ، فاِن لم یَدْرِ ثلاثاً صلّی او اربعاً فلیبنِ علی ثلاثٍ، ولْیَسْجُدْ سجدتین قبل ان یُسَلِّمَ۔

قال ابو عیسی: ھٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔وقد رُوِیَ ھٰذا الحدیث عن عبد الرحمٰن بن عوفٍ من غیر ھٰذا الوجهِ۔ رواہ الزھریُّ عن عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عتبة عن ابن عباسٍ عن عبد الرحمٰن بن عوفٍ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم۔

﴿ترجمہ﴾

یحییٰ بن ابوکثیر، عیاض بن ھلال سے نقل کرتے ہیں کہ عیاض نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور یہ بھول جائے کہ اس نے کتنی (رکعتیں) پڑھی ہیں (تو کیا کرے؟) ابوسعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے اسے یاد نہ رہے کہ اس نے کتنی (رکعتیں) پڑھی ہیں تو اسے چاہیئے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوسعید رضی اللہ عنہ حسن ہے۔ اور یہ حدیث ابوسعید رضی اللہ سے کئی سندوں سے مروی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی ایک اور دو (رکعت) میں

شک میں پڑ جائے تو انہیں ایک سمجھے اور اگر دو اور تین میں شک ہو تو دو سمجھے اور اس میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ سہو کرے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب اسی پر عمل کرتے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر نماز میں شک ہو جائے کہ کتنی رکعت پڑھی ہیں تو دوبارہ نماز پڑھے۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان تم میں سے کسی شخص کے پاس نماز میں آتا ہے اور اس کی رکعتوں کو مشتبہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں جب تم میں سے کسی کو ایسی بات پیش آئے تو اسے چاہیئے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں سہو ہو جائے اور یہ یاد نہ رہے کہ اس نے ایک رکعت پڑھی ہے یا دو رکعتیں پڑھی ہیں تو چاہیئے کہ وہ ایک ہی پر بناء کرے اور اگر دو اور تین میں یاد نہ رہے تو دو پر بناء کرے۔ پھر اگر تین اور چار میں شک ہو تو تین پر بناء کرے اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور عبدالرحمٰن بن عوف ہی سے اس کے علاوہ بھی کئی طرق سے مروی ہے اس حدیث کو زہری، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی الرجلِ یُسلِّمُ فی الرکعتین من الظهر والعصر

باب ایسے شخص (کی نماز) کے بارے میں جو ظہر و عصر میں دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دے

☆ حدثنا الانصاریُّ حَدَّثنا مَعْنٌ حَدَّثَنا مالكٌ عن ایوبَ بن ابی تَمیمَةَ، وهو ایوبُ السَّخْتِیَانیُّ عن محمد بن سیرین عن ابی هریرة: اَنَّ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انْصَرَفَ مِنَ اثْنَتینِ، فقال له ذُو الْیَدَیْنِ: اَقُصِرَتِ الصلاةُ اَمْ نَسِیتَ یا رسولَ اللّٰه؟ فقال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اَصَدَقَ ذُو الْیَدَیْنِ؟ فقال الناسُ: نَعَمْ فقام رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فصلّٰی اثْنَتَیْنِ اُخْرَیَیْنِ ثم سَلَّمَ، ثم كَبَّرَ فَسَجَدَ مثلَ سجدهِ او اَطْوَلَ، ثم كَبَّرَ فَرَفَعَ، ثم سَجَدَ مثل سجدهِ او اَطْوَلَ۔ قال ابو عیسی: وفی الباب عن

عمرَانَ بن حُصَیْنٍ، وابن عمر، وذی الیَدیْنِ۔

قال ابو عیسی: وحدیث ابی ھریرۃَ حدیث حسن صحیحٌ۔ واختلف اھلُ العلم فی ھذا الحدیث۔ فقال بعض اھل الکوفۃ: اِذا تَکلَّمَ فی الصلاۃ ناسیاً او جاھلاً اومَا کانَ: فاِنّہ یُعیدُ الصلاۃَ، واعْتَلُّوا بانَّ ھذا الحدیث کان قبلَ تحریمِ الکلامِ فی الصلاۃ۔

قال: وامَّا الشافعیُّ فرأی ھذا حدیثاً صحیحاً فقال بہ۔ وقال: ھذا اصَحُّ مِن الحدیث الذی رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الصَّائم اِذا اکل ناسیاً فاِنہ لایَقضی، واِنَّما ھو رِزْقٌ رَزَقَہُ اللّٰہُ۔

قال الشافعیُّ: وفرَّقُوا ھؤلاءِ بین العَمْدِ والنسیانِ فی اکلِ الصائمِ بحدیث ابی ھریرۃ۔ وقال احمدُ فی حدیث ابی ھریرۃ: ان تکلَّمَ الاِمامُ فی شیٔ من صلاتہ وھو یَرَی انہ قد اکْمَلَھا، ثم عَلم انہ لم یُکْمِلْھَا: یُتِمُّ صلاتَہٗ، ومن تکلَّم خلفَ الاِمامِ وھو یعلَم اَنَّ علیہ بَقِیَّۃٌ من الصلاۃِ فعلیہ ان یَسْتَقْبِلَھَا۔ وَاحْتَجَّ بِاَنَّ الفرائضَ کانت تُزَادُ وَتُنْقصُ علی عھدِ رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فاِنَّمَا تکلَّمَ ذُو الیدینِ وھو علی یقینٍ من صلاتہ انَّھَا تَمَّتْ، ولیس ھکذا الیومَ، لیس لاحدٍ ان یتکلَّمَ علی معنی ماتکلَّمَ ذُوالدینِ، لأنَّ الفرائِضَ الیومَ لایُزادُ فیھا ولایُنْقَصُ، قال احمدُ نحواًمن ھذاالکلام۔ وقال اِسحٰقُ نحوَ قولِ احمدَ فی ھذَا البابِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا تو ذوالیدین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ نماز کم ہوگئی یا آپ بھول گئے یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ذوالیدین نے صحیح کہا ہے؟ لوگوں (صحابہ) نے عرض کیا جی ہاں! پس آپ کھڑے ہوئے اور باقی دو رکعتیں پڑھیں پھر سلام پھیرا پھر تکبیر کہہ کر سجدہ میں گئے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ کرنے کا معمول تھا۔ اسی طرح یا اس سے ذرا لمبا سجدہ فرمایا پھر تکبیر کہی اور اٹھے اور اس کے بعد دوسرا سجدہ بھی اسی طرح کیا جیسے پہلے کیا کرتے تھے یا اس سے طویل کیا۔

اس باب میں عمران بن حصین، ابن عمر، اور ذوالیدین سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ اہل علم کا اس حدیث (کی شرح) میں اختلاف ہے بعض اہل کوفہ کہتے ہیں کہ نماز میں اگر کلام کرلیا بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے کسی بھی وجہ سے تو وہ نماز کو لوٹائے اور انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ حدیث باب نماز میں

کلام کی حرمت سے پہلے کی ہے۔ رہے امام شافعی رحمہ اللہ تو انہوں نے اس حدیث کو صحیح سمجھا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ حدیث اس حدیث سے اصح ہے جو روزہ کے مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر روزہ دار بھول کر کچھ کھا پی لے تو قضا نہ کرے کیونکہ یہ تو اللہ کا کھلایا ہوا رزق ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرات (علماء احناف) نے روزہ دار کے جان بوجھ کر اور بھول کر کھانے میں فرق کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے۔ امام احمد رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث باب کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر امام نے اس گمان کے ساتھ بات کر لی کہ وہ نماز مکمل کر چکا ہے اور بعد میں معلوم ہوا کہ نماز مکمل نہیں ہوئی تو نماز کو پورا کرے اور جو مقتدی یہ جانتے ہوئے بات کرے کہ اس کی نماز نامکمل ہے تو اس پر دوبارہ نماز پڑھنا لازم ہے۔ ان (امام احمد) کا استدلال اس حدیث سے اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فرائض میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی پس ذوالیدین نے اس یقین کے ساتھ کلام کیا کہ نماز مکمل ہو چکی تھی حالانکہ یہ بات آج ممکن نہیں اس لئے اب جائز نہیں کہ کوئی شخص اس انداز پر بات کرے کیونکہ آج فرائض میں کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پس مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ امام احمد کا کلام بھی اسی کے مشابہ ہے اور اسحٰق کا قول بھی اس باب میں امام احمد کی طرح ہے۔

﴿تشریح﴾

مصنف کا حنفیہ پر اعتراض: (واما الشافعی فرای هذا حدیثا صحیحا وقال هذا اصح من الحدیث الذی روی عن النبی صلی الله علیه وسلم فی الصائم اذا اکل ناسیا فانه لا یقضی) اس کا مقصد حنفیہ پر اعتراض ہے کہ روزہ دار اگر بھولے سے کھالے تو اس کا روزہ حدیث کی وجہ سے نہیں ٹوٹتا لیکن اگر نمازی بھولے سے بات کر لے تو حنفیہ کے ہاں اسکی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ حالانکہ[1] نماز میں کلام جائز ہونے والی حدیث پہلی حدیث کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہے تو حنفیہ غیر اصح روایت پر تو عمل کر رہے ہیں اصح روایت پر نہیں کر رہے۔ اس کا جواب[2] بالکل واضح اور مشہور ہے

حنفیہ پر دوسرا اعتراض: اسی طرح یہاں پر دوسرا اعتراض حنفیہ پر ہے کہ انہوں نے روزہ دار کے بھولے سے کھانے

---

[1] یعنی روزہ دار کے بھولے سے کھانے کے متعلق جو حدیث وارد ہے وہ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ (جو باب میں مذکور ہے) سے کم درجہ کی ہے جس میں نمازی کو بھولے سے کلام کی اجازت ہے تو اس اصح حدیث پر بھی عمل ہونا چاہیئے۔

[2] **متن والے اعتراض کا جواب:** شاید حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اسی مشہور جواب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز کی حالت تو مذکرہ ہے لہٰذا بھولے سے کلام کرنا نماز کو فاسد کر دیگا بخلاف روزے کے کہ اس کی حالت مذکرہ نہیں اسلئے بھولے سے کھانا مفسدِ صوم نہیں۔

کی صورت میں روزے کو جائز قرار دیا ہے اور جان بوجھ کر کھانے کی صورت میں روزہ ان کے نزدیک فاسد ہو جاتا ہے تو یہ حنفیہ نمازی کے متعلق یہ فرق کیوں نہیں کرتے۔ یہاں پر بھی بھولے سے کلام[1] جائز ہونا چاہیئے اور جان بوجھ کر کلام مفسد صلوۃ ہونا چاہیئے۔

جمہور کی دلائل: جمور کی دلیل حدیث ذوالیدین ہے جو اس باب میں وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں غلطی سے[2] یا بھولے سے بات کر لے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی اسی طرح جمہور کی دلیل وہ روایت[3] ہے جس میں اس کا ذکر ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے تشریف لائے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جواب نہیں دیا۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ابن

---

[1] اصل مخطوطہ میں اکل المصلی ہے لیکن یہ لفظ کلام للمصلی ہونا چاہیئے کیونکہ حدیث باب میں نمازی کے کھانے کے متعلق کوئی حکم نہیں ہے بلکہ نمازی کے کلام کے متعلق علماء نے مسئلہ پیش کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمہور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جس طرح روزہ دار کو بھولے سے کھانا اس کے روزے کو نہیں توڑتا اور جان بوجھ کر کھانا روزہ توڑ دیتا ہے یہی حکم بھولے سے کلام فی الصلوٰۃ کے متعلق ہونا چاہیئے اور اس سے نماز نہیں ٹوٹنی چاہیئے۔

[2] یہ شافعیہ کا مذہب ہے اوجز میں ہے کہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ جو شخص اپنی نماز میں جان بوجھ کر کلام کرے اور اس کا ارادہ اس کلام سے اصلاحِ صلوٰۃ بھی نہیں ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ ابن منذر وغیرہ نے اس مسئلہ میں اجماع نقل کیا ہے۔ البتہ نماز میں گفتگو کے متعلق کچھ اختلاف ہے۔ امام احمدؒ سے بہت سی روایات منقول ہیں، امام احمدؒ کی معتمد علیہ روایت اور حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں مطلقاً کلام نماز کو فاسد کرنیوالا ہے۔ شوافع کے نزدیک اگر جان بوجھ کر کلام کرے اگرچہ نماز کی اصلاح کیلئے ہو لیکن اسے معلوم تھا کہ کلام کرنا حرام ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ نماز میں ہے تو ان شرائط کے ساتھ یہ کلام مفسدِ صلوٰۃ ہے لیکن اگر تھوڑا سا کلام کرے اور وہ اپنی نماز کو بھولا ہوا ہو یا غلطی سے زبان سے نکل جائے اور اسے یہ مسئلہ معلوم نہیں کہ نماز میں کلام کرنا حرام ہے تو ان صورتوں میں نماز فاسد نہیں ہوگی۔ مالکیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ تھوڑا سا کلام جو نماز کی اصلاح کیلئے ہو اگرچہ جان بوجھ کر کرے مفسدِ صلوۃ نہیں ہے۔ سحون کہتے ہیں کہ ذوالیدین کا واقعہ خلاف قیاس منقول ہے لہٰذا اس کو موردِ نص پر بند کیا جائیگا چنانچہ اس میں کلام قلیل اصلاحِ صلوۃ کیلئے تھا اور عامداً تھا تو یہ صورت جائز ہوگی۔ اوجز

[3] اس حدیث کو صحیحین وغیرہ نے نقل کیا ہے بخاری میں یہ الفاظ ہیں "کنا نسلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی الصلوٰۃ فیرد علینا فلما رجعنا من عند النجاشی سلمنا علیہ فلم یرد علینا وقال ان فی الصلوٰۃ لشغلا" حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری میں یہ ثابت کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے دو مرتبہ لوٹے۔

مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں کلام کے منسوخ ہونے کا حکم مکہ مکرمہ میں واقع ہو چکا تھا[1]۔

جمہور کی دلیل کا حنفیہ کی طرف سے جواب: احناف اس دوسری روایت کا جواب دیتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے دو دفعہ آئے ہیں سب سے پہلے حبشہ سے مکہ تشریف لائے تھے لیکن جب دیکھا کہ مشرکین مکہ اسی طرح ایذائیں پہنچاتے ہیں جس طرح پہلے پہنچاتے تھے تو انہوں نے حبشہ کی طرف دوسری ہجرت فرمائی پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے اور آپ کی ہجرت مشہور ہوگئی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ حبشہ سے مدینہ تشریف لے آئے لہٰذا اس واقعہ سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔

جمہور کے مقابل حنفیہ کی دلیل: اس لئے حنفیہ کا قول راجح ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسا ہی واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں پیش آیا تھا تو انہوں نے نماز کو از سرِ نو پڑھا تھا اور کسی صحابی نے ان پر نکیر نہیں کی تھی حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذی الیدین کے اس واقعہ میں موجود تھے اور اس واقعہ میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا بھی فرمائی تھی تو ان پر نماز میں کلام ہونے والا واقعہ کیسے مخفی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں تصریح ہے کہ ان صحابہ میں[2] ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے ان میں بات کرنے کی سکت نہ تھی بوجہ ہیبت و جلال کے۔

شافعیہ کا ایک اہم اعتراض: شافعیہ کا یہ اعتراض کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو خیبر والے سال مسلمان ہوئے ہیں اور وہ نماز میں کلام والی حدیث کے راوی ہیں تو یہ واقعہ اخیر زمانہ کا ہے اور "قوموا للہ قانتین" جس سے کلام منسوخ ہوا ہے اس کا نزول شروع زمانہ میں مکہ مکرمہ میں ہوا تھا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے ذریعے وہ باتیں ممنوع قرار دی گئیں جو نماز میں جان بوجھ کر کی جاتیں تھیں غلطی اور بھول سے کی جانے والی باتیں مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔

جواب: یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ راوی بسا اوقات حدیث کو دوسرے راوی سے نقل کرتا ہے جو کہ متقدم الاسلام ہوتا ہے تو حدیث باب والے واقعہ کا آیتِ کریمہ سے متاخر ہونے کا قول صحیح نہیں۔

---

[1] علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ ابن حبان کا یہ کہنا کہ نماز میں کلام کی حرمت تو مکہ میں آچکی تھی یہ قول باطل ہے بہت سے اہل علم نے اس پر رد کیا ہے اسی طرح جمہور کا یہ اعتراض کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کلام اس وقت منسوخ ہوا تھا جب وہ نجاشی کے پاس سے لوٹ کر آئے تھے اور یہ مکہ کا واقعہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نجاشی کے پاس سے لوٹنے سے مراد حبشہ سے مدینہ کی طرف رجوع ثانی والا واقعہ ہے اس وقت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر کی تیاری میں مصروف تھے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اسی کو ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے جو رجوع اول مراد لیا ہے تو علامہ ابن الترکمانی نے الجوہر النقی میں اس پر رد کیا ہے۔ انتہی

[2] صحیحین وغیرہ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

اس جواب پر خصم کا اشکال اور اسکا جواب: یہ جواب صحیح نہیں کیونکہ حدیث پاک میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف نماز پڑھنے کی نسبت کی ہے جیسا کہ بعض روایات میں صلینا کے الفاظ آتے ہیں تو یہ روایت تو انہوں نے خود ہی سنی ہے نہ کہ واسطے سے؟

یہاں متکلم کا صیغہ مجاز پر محمول ہے: جواب: اس صلینا کے لفظ[1] سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ بسا اوقات ایک فعل کو پوری جماعت کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے حالانکہ وہ فعل بعض افراد نے کیا ہوتا ہے۔ اور یہ محاورات میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہود سے خطاب کر کے فرمایا "واذ انجینکم من آل فرعون" حالانکہ اس زمانہ میں بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دینے اور دیگر انعامات ان پر تھوڑا ہی ہوئے تھے بلکہ یہ انعامات تو ان کے آباؤ اجداد[2] پر کیئے تھے لیکن خطاب موجودہ بنی اسرائیل سے کر رہے ہیں اسی طرح "واذ قتلتم نفسا فادارأتم فیھا" میں موجودہ بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا تھا؟

---

[1] امام طحاوی کا میلان اسی طرف ہے چنانچہ انکے بقول یہ صلینا کا لفظ مجاز پر محمول ہے اس کی دلیل میں بہت سے اقوال انہوں نے ذکر کیئے ہیں مثلاً نزال بن سبرۃ تابعی کہتے ہیں قال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالانکہ نزال نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف صحبت حاصل نہیں کیا: ۲۔ طاؤس کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے حالانکہ طاؤس اس واقعہ میں موجود نہیں تھے۔ ۳۔ حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں خطبنا عتبۃ بن غزوان حالانکہ حسن اس واقعہ میں موجود نہیں تھے بلکہ عتبہ نے ان کی قوم کے سامنے خطاب کیا تھا۔

قلت: اس کی ایک اور نظیر یہ بھی ہے کہ خود ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالفطر اذا اصبح الرجل جنبا پھر جب ان سے بار بار پوچھا گیا تو فرمایا حدثنی الفضل یعنی میں نے یہ حدیث فضل سے سنی ہے۔ رہی مسلم کی روایت جس میں حدیث باب میں صراحۃً بینما انا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ نیموی نے اس کو غیر محفوظ قرار دیکر اس پر کلام کیا ہے۔

قلت: اس کے غیر محفوظ ہونے پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تصریح کی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ذی الیدین کی شہادت کے بعد مسلمان ہوئے ہیں جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ علامہ نیموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں سوائے العمری راوی کے کہ وہ مختلف فیہ ہیں نسائی وغیرہ نے ان کی تضعیف کی ہے لیکن اکثر علماء نے ان کو ثقہ راوی قرار دیا ہے پھر علامہ نیموی رحمہ اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی احادیث خصوصاً وہ حدیث جس کو نافع سے نقل کرتے ہیں حسن کے درجہ سے کم نہیں اور یہ حدیث بھی نافع ہی سے عمری نے نقل کی ہے۔

[2] یعنی موجودہ بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد کو فرعونیوں سے نجات عطا فرمائی تھی۔

دیگر جوابات: جواب۲۔ قوموا للہ قانتین سورہ بقرۃ کی آیت ہے جوکہ مدنی سورۃ ہے اس لئے اس کو مکی سورۃ کہنا غلط ہے یہی وجہ ہے کہ شوافع اس آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو احادیث کے مطابق نہیں ہیں چنانچہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ[1] ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور اس سے نماز میں باتیں کرنا منسوخ قرار دیا گیا چنانچہ اس حدیث میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے فامرنا بالسکوت. ونھینا عن الکلام فرمایا ہے تو یہ آیت مکی کیسے[2] ہوسکتی ہے کیونکہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ تو مدنی صحابی ہیں اور انہوں نے اسی آیت پر کلام کے منسوخ ہونے کو مرتب کیا ہے۔

جواب۳: زید بن ارقم رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں ان کا تعلق انصارِ مدینہ سے تھا وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ ہم نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے باتیں کرتے تھے تو یہاں یہ تاویل کیسے ہوسکتی ہے کہ نماز میں کلام مکہ مکرمہ میں منسوخ ہوا۔ اشکال: شاید زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس نسخ والے واقعہ کو کسی دوسرے صحابی سے سنا ہو جو کے متقدم الاسلام اور مکی ہوں تو زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی طرف اس حدیث میں کلام کرنے کی نسبت ایسی ہے جیسا کہ حنفیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف نماز کی نسبت مجازاً قرار دی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول "صلینا" میں حنفیہ تاویل کرسکتے ہیں کہ یہ نسبت مجازی ہے تو شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول "کنا نتکلم" میں بھی یہ نسبت مجازاً کی گئی۔ جواب: آیت کا مدنی ہونا اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ واقعہ مکہ میں ہوا ہو اگر تسلیم بھی کرلیں تو بھی یہ اشکال غلط ہے کیونکہ صحابہ کرام مکہ مکرمہ[3] میں منفرداً نماز پڑھتے تھے نہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اس کی تائید ابوداؤد کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب صحابہ نماز میں مشغول تھے تو دورانِ نماز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو صحابہ نے انہیں اشارہ کیا تھا اس روایت میں یہ بھی ہے کہ مسبوق کو نماز کے درمیان یہ بھی بتلادیا جاتا تھا کہ اتنی رکعتیں نکل چکی ہیں۔ اور یہ معاذ رضی اللہ عنہ بھی مدنی صحابی ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ میں شروع میں نماز میں مسبوق کو نکلی ہوئی رکعتیں وغیرہ بتلا کر کلام ہوجاتا تھا۔ تو مکہ میں کلام منسوخ نہ ہوا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ باجماعت نماز مدینہ ہی میں ہوئی ہے اور مدینہ میں ہی شروع میں نماز کے دوران باتیں ہوتی تھیں اس کے بعد نسخ واقع ہوا۔

---

[1] علامہ نیموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ماجہ کے علاوہ تمام اصحاب صحاح ستہ نے نقل کیا ہے۔ قلت: ترمذی میں یہ روایت باب التفسیر میں آئیگی اور کوکب اور اس کے حاشیہ میں اس پر کلام بھی آرہا ہے۔

[2] اسی طرح اصل مخطوطہ میں ہے جبکہ صحیح لفظ الایۃ مکیۃ ہونا چاہئے۔

[3] یعنی جب تک صحابہ مکہ میں رہے منفرداً نماز پڑھتے رہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃِ فی النّعَالِ

باب جوتیاں پہن کر نماز پڑھنا

☆حدثنا علی بن حُجْرٍ حَدَّثَنَا اسمٰعیلُ بن ابراهیم عن سعید بن یَزِیدَ ابی مَسْلَمَةَ قال: قلتُ لانسِ بن مالكٍ: اكانَ رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یُصَلِّی فی نَعْلَیْهِ؟ قال: نَعَمْ.

قال: وفی الباب عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ، وعبد اللّٰه بن ابی حبیبةَ وعبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وعَمْرِو حُرَیْثٍ، وشَدَّادِ بن اَوْسٍ، واَوْسٍ الثَّقَفِیِّ، وابی هریرة، وعَطَاءٍ رجلٍ من بنی شَیْبَةَ۔ قال ابو عیسی:حدیث انسٍ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی هذا عند اهل العلم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت سعید بن یزید ابو مسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوتوں میں نماز پڑھتے تھے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں۔

اس باب میں عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن ابی حبیبہ، عبداللہ بن عمرو، عمرو بن حریث، شداد بن اوس، اوس ثقفی، ابو ہریرہ، اور عطاء رضی اللہ عنہم (بنو شیبہ کے ایک شخص) سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر تمام اہل علم کا عمل ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث مبارکہ سے عام عرف کے خلاف جوتے پہن کر نماز پڑھنے کا ثبوت ہے: (قوله قلت لانس بن مالك رضی الله عنه اكان رسو ل الله صلی الله علیه وسلم یصلی فی نعلیه قال نعم) سائل نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو جوتوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا تو اسے عجیب سا لگا کیونکہ عرف عام میں جوتے پہن کر لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ نیز قرآن کریم کی آیت "فاخلع نعلیك انك بالواد المقدس "الایة کے ظاہر کا تقاضہ بھی یہی بتا رہا ہے کہ جوتے پہن کر مسجد میں نہیں جانا چاہیے۔ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے پہن کر نماز پڑھی تھی۔ یہ واقعہ جس کی طرف حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا ہے۔ بہت مشہور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم ایک دن اپنے صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے تو نماز کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں جوتے اتار دیئے تو صحابہ نے بھی اتار دیئے۔ نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جوتے اتارنے کے متعلق پوچھا تو صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ کی اتباع میں اتارے تھے۔ اس واقعہ سے دو فائدے حاصل ہوئے۔

جوتے میں نماز پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں ہے: ا۔ جوتے میں نماز پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے نہیں تھا بلکہ آپ کے پیچھے صحابہ کی جماعت بھی جوتے پہنے ہوئے تھی۔

شافعیہ اور حنفیہ اس واقعہ میں الگ الگ علتیں بیان کرتے ہیں: ۲۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک[1] یہ جوتوں کا اتارنا اس لئے تھا کہ اس میں ناپاکی لگی ہوئی تھی اور حنفیہ کے نزدیک جوتوں میں ایسی چیز لگی ہوئی تھی جسے طبیعت ناپسند کرتی ہے لہٰذا اگر جوتے پاک ہوں تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے[2] جیسا کہ موزے وغیرہ پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ چونکہ ہمارے زمانے میں عرفِ عام میں جوتے پہن کر مسجد میں نہیں داخل ہوا جاتا اسلئے اب جوتے پہن کر مسجد میں نماز پڑھنا

---

[1] یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم ہے قولِ جدید میں وہ جمہور کی طرح ہیں کہ اگر گندگی نمازی کے بدن یا کپڑے پر لگی ہوئی تھی اور اسے نماز سے فارغ ہونے تک معلوم نہیں ہوا تب بھی اس کی نماز فاسد ہوجائیگی اور واجب الاعادہ ہوگی اور اگر دورانِ صلوٰۃ اس کو پتہ چلا تو اس پر بنا کرنا صحیح نہیں بلکہ از سرِ نو پڑھے جیسا کہ ابن رسلان اور شرح الاقناع وغیرہ میں ہے۔

[2] **جوتے پہن کر نماز پڑھنا افضل ہے یا جوتے اتار کر نماز پڑھنا؟** درمختار میں ہے جو آدمی مسجد میں داخل ہو اس کو اپنے موزے اور جوتے سنبھال کر رکھنے چاہئیں اور جوتوں میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ علامہ شامیؒ وصلوٰتہ فیہما کے تحت لکھتے ہیں یعنی موزے اور جوتے اگر پاک ہوں تو ان کو پہن کر نماز پڑھنا مخالفتِ یہود کی وجہ سے افضل ہے۔ تاتارخانیہ میں لکھا ہے لیکن اگر جوتوں کی وجہ سے مسجد کے فرش کے کیچڑ آلود ہونے کا اندیشہ ہو تو اگرچہ جوتے پاک ہوں تب بھی جوتے اتار کر پڑھنا افضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد نبوی میں کنکر بچھے ہوئے تھے اس لئے اس وقت جوتے پہن کر افضل تھا بخلاف ہمارے زمانے کے کہ اب پکے فرش بنے ہوئے ہیں لہٰذا جوتے اتار کر پڑھنا افضل ہے۔ اسی وجہ سے عمدۃ المفتی میں کہا گیا ہے کہ مسجد میں جوتے پہن کر داخل ہونا بے ادبی ہے۔ حضرت سہارنپوریؒ بذل میں لکھتے ہیں کہ حدیث شریف خالفوا الیہود فانہم لا یصلون فی نعالہم و لا فی خفافہم یہ حدیث دال ہے کہ مخالفت یہود کی وجہ سے جوتوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں جوتے اتار کر نماز پڑھنے کا حکم ہونا چاہیئے کیونکہ اس زمانے میں نصاریٰ جوتے پہن کر نماز پڑھتے ہیں تو مخالفتِ نصاریٰ جوتے اتارنے میں ہے۔ انتہی

نامناسب ہے لیکن اگر کسی شخص کے جوتے پاک ہوں اور وہ انہیں پہن کر مسجد میں آئے تو وہ کسی ملامت کا مستحق نہیں ہے۔

فاخلع نعلیک کی توجیہ: آیتِ کریمہ[1] میں "فاخلع نعليك" کا حکم موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے فرمایا تھا کہ ان کے جوتے گدھے کی ایسی کھال کے بنے ہوئے تھے جس کھال کو دباغت نہیں دی گئی تھی اور شاید کہ شریعتِ موسوی کے اعتبار سے دباغت کے بعد بھی ان جوتوں میں کوئی ایسا وصف ہو کہ یہ جوتے پھر بھی ناپاک ہوں۔

حدیث مبارکہ سے مستنبط ہونے والے بعض مسائل: (۱) حدیث باب سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ناپاک کپڑا[2] یا اور کوئی چیز مسجد میں رکھ سکتے ہیں جبکہ مسجد میں تلویث کا اندیشہ نہ ہو کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوتے مسجد کے اندر ہی اتارے تھے نہ کہ مسجد کے باہر۔ (۲) اسی طرح یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ پانی سے استنجاء کیے بغیر بھی مسجد میں داخل ہو سکتا ہے جبکہ اس کے ناپاک پینے سے مسجد کے ناپاک ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ (۳) اسی طرح ایک شخص مسجد میں اس طرح داخل ہو کہ اس کے ہاتھ میں وہ ڈھیلا ہو جس سے اس نے پیشاب کرنے کے بعد استنجاء کیا اور اس ڈھیلے سے اپنے پیشاب کو سکھایا تو اس ڈھیلے کو مسجد میں لانا جائز ہے جبکہ اس ڈھیلے کی مٹی مسجد میں نہ پھیلے۔ البتہ یہ سب امور خلافِ اولیٰ فعل ہیں۔

---

[1] مفسرین نے "فاخلع نعليك" میں جوتوں کے اتارنے کے حکم کے متعلق مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقاتل، کلبی، ضحاک، قتادی، سدی سے مروی ہے کہ یہ دونوں جوتے مردار گدھے کی کھال سے بنے ہوئے تھے تو وادی مقدس کو صاف رکھنے کیلئے ان کو اتارنے کا حکم ہوا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے "انك بالواد المقدس طوى" سے اس علت کو اس حکم کے بعد ذکر کیا ہے۔ قالہ الامام الرازی۔

[2] **مسجد میں گندگی اور ناپاکی داخل کرنے کے احکام:** درمختار کی مکروہات کی فصل میں ہے کہ مسجد میں گندگی کا داخل کرنا یا اس پر گندگی ڈالنا مکروہ ہے۔ لہٰذا ایسا چراغ مسجد میں جلانا جس میں ناپاک تیل ڈالا گیا ہو ناجائز ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الاشباہ والنظائر کی عبارت اس طرح ہے کہ مسجد میں ایسی گندگی کو داخل کرنا جس سے تلویثِ مسجد کا اندیشہ ہو مکروہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خشک نجاسات کا داخل کرنا جائز ہے لیکن فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ جس شخص کے بدن پر نجاست ہو وہ مسجد میں داخل نہ ہو۔ درمختار میں علیہ کے لفظ سے اشارہ ہے کہ یہ مسئلہ متقدمین کی کتب میں صراحۃً نہیں ہے لیکن فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ مسجد میں ناپاک شئے کا داخل کرنا جائز نہیں اس سے علامہ قاسم بن قطلوبغا نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ فقہاء یہ جو مسئلہ لکھتے ہیں کہ ناپاک تیل چراغ میں ڈالا جا سکتا ہے یہ اس وقت ہے جبکہ خارج مسجد میں ہو داخل مسجد میں ناپاک تیل والے چراغ سے روشنی حاصل کرنا ناجائز ہے۔

باب ماجاء فی القُنُوت فی صلاةِ الفجرِ

باب فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا

☆حدثنا قتیبةومحمد بن المثنّی قالا: حَدَّثَنَا غُندَرٌ محمد بن جعفر عن شُعْبَةَ عن عَمْرٍ و بن مُرَّةَ عن عبد الرحمٰن بن ابی لَیْلَی عن البَرَاء بن عازبٍ: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم کان یَقْنُتُ فی صلاةِ الصبحِ والمغربِ۔

قال: وفی الباب عن علیٍّ، وانس، وابی هریرةَ، وابن عَبَّاس، وَخُفَافِ بْن اِیماءَ بن رَحْضَةَ الغِفَارِیِّ۔ قال ابو عیسی: حدیث البَرَاءِ حدیث حسن صحیحٌ۔ واختلف اهل العلم فی القُنُوت فی صلاة الفجرِ: فَرَاَی بعضُ اهل العلم من اصحابِ البنیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم وغیرِهم القُنُوتَ فی صلاة الفجرِ۔ وهو قولُ الشافعیِّ۔وقال احمدُ واِسحٰقُ: لایَقْنُتُ فی الفجرِ اِلَّا عندَ نازلَةٍ تَنْزِلُ بالمسلمینَ، فاِذا نزلت نازلَةٌ فللاِمامِ ان یدعُوَ لجیوشِ المسلمین۔

﴿ترجمه﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر اور مغرب کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔
اس باب میں حضرت علی، انس، ابو ہریرہ، ابن عباس اور خفاف بن ایماء بن رحضہ غفاری رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔
امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ اہل علم کا فجر کی نماز میں قنوت پڑھنے میں اختلاف ہے بعض صحابہ وتابعین فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کے قائل ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام احمد واسحٰق کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں قنوت نہ پڑھی جائے البتہ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو تو امام کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کیلئے دعا کرے (اس صورت میں دعاءِ قنوت پڑھے اور دعا کرے)۔

﴿تشریح﴾

شافعیہ کے ہاں قنوت فی الفجر پڑھنے کا حکم: حدیث باب سے استدلال کرتے ہوئے شافعیہ نے یہ فرمایا ہے کہ فجر کی نماز میں قنوت سارے سال پڑھنا سنت ہے اسی وجہ سے شافعیہ فجر میں رکوع کے بعد تمام سال ہاتھ اٹھا کر قنوتِ فجر پڑھتے ہیں لیکن امام دعائے قنوت پڑھتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ جب امام "فانك تقضی ولا یقضی علیك" پر پہنچ جاتا ہے تو امام خاموش ہو جاتا ہے اور مقتدی خود ہی دعائیں مانگنے لگتے ہیں البتہ مغرب کی نماز میں قنوت ان کے

نزدیک منسوخ ہے۔

حنفیہ کے ہاں قنوت کا حکم: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قنوتِ وتر[1] پورے سال پڑھنا سنت ہے۔ قنوتِ فجر اور قنوتِ مغرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی خاص مصیبت اور پریشانی کے وقت میں پڑھنے کا ثبوت ہے اور حنفیہ کے ہاں بھی یہ حدیث قابل عمل ہے منسوخ نہیں۔ لہٰذا ہمارے صحیح مذہب کے مطابق جب مسلمانوں پر کوئی آفت یا مصیبت واقع ہو تو قنوتِ فجر پڑھنا سنت ہے۔

کوئی حنفی شخص کسی شافعی امام کی نمازِ فجر میں اقتداء کرے تو؟: اگر کوئی حنفی کسی شافعی امام کی اقتداء میں فجر کی نماز ادا کرے تو امام کی اقتداء میں وہ قنوت نہیں پڑھیگا بلکہ خاموش کھڑا رہے بیٹھے بھی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے یہ قول کیا ہے کہ مخالفت کو ثابت کرنے کیلئے بیٹھ جائے لیکن یہاں مخالفت کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک بھی جب[2] مسلمانوں پر کوئی مصیبت یا آفت واقع ہو تو رکوع کے بعد[3] تمام نمازوں میں مسلمانوں کو قنوت پڑھنا چاہیئے

---

[1] لفظِ قنوت کے دس سے زیادہ معنی ہیں جس کو بعض لوگوں نے شعر میں جمع کیا ہے جیسا کہ اوجز میں ہے یہاں پر قنوت سے مراد خاص قیام کی حالت میں نماز کے اندر دعا مانگنا ہے۔ انتھی

[2] **قنوتِ نازلہ کتنی نمازوں میں ہوگی؟** درمختار میں ہے کہ وتر کے علاوہ کسی نماز میں قنوت نہیں پڑھی جائیگی لیکن جب مسلمانوں پر آفت اور مصیبت واقع ہو تو امام جہری نمازوں میں قنوت پڑھیگا اور ایک قول میں تمام نمازوں میں قنوت پڑھی جائیگی۔ انتھی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام نمازوں میں قنوت پڑھنے کا حکم شافعیہ کا مذہب ہے۔ بحرالرائق میں اس کو جمہور محدثین کا مذہب قرار دیا ہے اس سے یہ وہم نہ ہو کہ حنفیہ کا کوئی قول بھی اسی طرح ہے۔ انتھی۔ لیکن جہری نمازوں میں قنوت پڑھنے کا حکم مشائخ حنفیہ کی ایک جماعت سے ثابت ہے البتہ راجح مذہب یہ ہے کہ صرف فجر میں قنوت پڑھا جائیگا۔ مراقی الفلاح اور حاشیہ طحطاوی میں بھی تقریباً اسی قسم کا مضمون موجود ہے۔

[3] **قنوت فی الفجر منفرد کیلئے نہیں ہے، مقتدی کیا کرے؟** علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ امام قنوت فجر پڑھیگا اس سے معلوم ہوا کہ منفرد فجر میں قنوت نہیں پڑھیگا اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی قنوت پڑھیگا یا نہیں اور یہ قنوت قبل الرکوع ہوگی یا بعد الرکوع۔ یہ مسئلہ میں نے نہیں دیکھا لیکن بظاہر میرے خیال میں مقتدی اپنے امام کی اتباع کریگا الا یہ کہ امام جہر سے قنوت پڑھے تو مقتدی کو آمین کہنا چاہیئے اور یہ قنوت رکوع کے بعد ہونی چاہیئے نہ کہ پہلے جسکی دلیل یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے قنوت فجر کے مسئلہ میں جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس میں قنوت بعد الرکوع کی تصریح موجود ہے۔ علمائے حنفیہ نے اسی حدیث کو قنوتِ نازلہ پر محمول کیا ہے پھر میں نے شرنبلالی کی مراقی الفلاح میں دیکھا کہ انہوں نے تصریح کی ہے کہ قنوت بعد الرکوع پڑھی جائیگی حموی نے اس کو ترجیح دی ہے کہ قنوت قبل الرکوع پڑھنی چاہیئے لیکن راجح قول وہی ہے جس کو ہم نے ذکر کیا۔

یہاں تک کہ وہ مصیبت ٹل جائے۔

روایاتِ مختلفہ میں تطبیق: پس جن روایات[1] میں قنوتِ فجر کا انکار کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں ہمیشہ قنوت نہیں پڑھتے تھے۔ اس طرح تمام روایات میں تطبیق ہو جائیگی اور اس قول کی ضرورت نہیں پڑیگی کہ یہ کہا جائے کہ کسی نماز میں قنوت پڑھنا منسوخ ہو گیا ہے۔ ہمارے بعض علمائے حنفیہ نے یہ جو جواب دیا ہے کہ قنوت فجر منسوخ ہے یہ جواب نا قابلِ اعتبار ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکین کے خلاف بددعا فرمائی تھی تو یہ بددعا اللہ تعالیٰ کے قانونِ رحمت کے خلاف تھی نیز اسوقت ان میں سے بہت سے لوگوں کی قسمت میں اسلام لانا مقدر تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بددعا کرنے سے منع فرمایا تھا فجر میں قنوت پڑھنے سے منع نہیں فرمایا تھا کیونکہ اگر اس جواب کو تسلیم کیا جائے تب تو ہمارے نزدیک مصیبت کے وقت بھی قنوت فجر پڑھنا جائز نہ ہو حالانکہ ہمارے مذہب میں قنوت فجر مصائب میں جائز ہے۔

حدیثِ باب کا جواب: شوافع کا حدیث باب کان یقنت فی صلوۃ الصبح سے استدلال کرنا ہمارے مذہب کے خلاف نہیں کیونکہ ہم بھی اقرار کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے لیکن مصائب اور آفات کے وقت نہ کہ مطلقاً۔

اگلے باب کی حدیث سے حنفیہ کا استدلال: اگلے باب کی حدیث میں قنوت فی الفجر کو بدعت کہا جا رہا ہے یہ شوافع کے مذہب کے بالکل خلاف ہے اور یہاں شوافع لاجواب ہو جاتے ہیں اس آنے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھنا بدعت ہے کیونکہ اس وقت جب صحابی حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کے والد سے سوال کیا جا رہا تھا اسوقت کوئی مصیبت یا آفت پیش نہیں آئی تھی اور صحابی نے عام اطمینان کی حالت میں بھی فجر میں قنوت پڑھتے دیکھا تو اس کو فرمایا کہ اے میرے بیٹے! یہ فعل بدعت ہے۔

جیوش المسلمین سے مراد: (فللامام ان یدعو لجیوش المسلمین) امام کو مسلمانوں کے لشکروں کیلئے دعا مانگنی چاہیئے اور پیچھے والے مقتدیوں کو آمین کہنا چاہیئے لشکروں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ لشکروں کی کامیابی مسلمانوں کی کامیابی ہے اور ان کی شکست تمام مسلمانوں کی شکست ہے یا یہ قید اتفاقی ہے یا یہ کہا جائے کہ جیش سے مراد جماعت ہے یعنی جو لوگ بھی مصیبت میں پریشان ہیں ان کیلئے دعا کی جائے جیوشِ اصطلاحی مراد نہیں۔

---

[1] یعنی جن روایات میں قنوت فجر کا انکار کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت نہیں پڑھی جائیگی۔

باب ماجاء فی ترک القُنُوت

باب قنوت کوترک کرنے کے بارے میں

☆حدثنا احمد بن مَنیعٍ حَدَّثَنَا یزید بن هرون عن ابی مالكٍ الاشْجَعِیٌ قال: قلتُ لِاَ بِی: یاابَةِ اِنَّكَ قد صلَّیتَ خلفَ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وابی بکر وعمرو عثمانَ وعلیٌ بن ابی طالبٍ ههنا بالکوفةِ نحواً من خَمْسِ سِنِینَ، اکانُوا یَقْنُتُونَ؟قال: ای بُنَیَّ اِمُحْدَثٌ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔ والعمل علیه عند أکثر اهل العلم۔ وقال سفیانُ الثَّورِیُّ:ان قَنَتَ فی الفجرِ فَحَسَنٌ، وان لم یَقْنُتْ فحسنٌ، واختَارَ ان لایَقْنُتَ۔

ولم یَرَ ابنُ المبارك القنوتَ فی الفجرِ۔ قال ابو عیسی: و اَبُو مالكٌ الاَشجعیُّ اسمه سَعْدُ بن طَارِقِ بن اَشْیَمَ۔

☆ حَدَّثَنَا صالح بن عبد اللّٰه حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن ابی مالكٌ الاَشْجَعِیٌ بهذه الإسنادِ: نحوهَ بِمعناه۔

﴿ترجمه﴾

ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے اپنے والد سے پوچھا ابا جان! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر فاروق، عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں (مدینہ منورہ میں)۔ اور یہاں کوفہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پیچھے پانچ سال تک آپ نے نمازیں پڑھیں۔ کیا یہ حضرات (فجر میں) قنوت پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا اے میرے بیٹے یہ نئی چیز ہے (بدعت ہے)۔

ہم سے روایت کی صالح بن عبداللہ نے انہوں نے ابوعوانہ سے انہوں نے ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے (اسی سند کے ساتھ) اس کے ہم معنی حدیث۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز میں قنوت پڑھنا بھی اچھا ہے اور اگر صبح کی نماز میں قنوت نہ پڑھے تب بھی اچھا ہے البتہ انہوں نے قنوت نہ پڑھنے کو اختیار کیا ہے۔ ابن مبارک رحمہ اللہ فجر میں قنوت کے قائل نہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابو مالک اشجعی کا نام سعد بن طارق بن اشیم ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یَعْطِسُ فی الصلاۃ

باب ایسے شخص کے بارے میں جو نماز میں چھینکے

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا رِفَاعَۃُ بن یحیی بن عبد اللّٰہ بن رِفَاعَۃَ بن رافعٍ الزُّرَقِیُّ عن عَمِّ ابیہِ مُعَاذِ بن رِفَاعَۃَ عن ابیہ قال: صلیتُ خلفَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَعَطَسْتُ، فقلتُ: الحمدُ للّٰہ حمداً کثیراً طَیِّباً مبارَ کاً فیہِ مبارکاً علیہ کمایُحبُّ ربُّنا ویَرْضَی۔ فلما صَلَّی رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انْصَرَفَ فقال:مَنِ المتکلِّمُ فی الصلاۃِ؟ فلم یتکلَّمْ اَحَدٌ، ثم قالھا الثانیۃَ: من المتکلِّمُ فی الصلاۃِ؟ فلم یتکلَّمْ احدٌ، ثم قالھا الثالثۃَ: من المتکلِّمُ فی الصلاۃِ ؟ فقال رِفَاعَۃُ بن رَافِعٍ ابْنُ عَفْرَاءَ انا یارسولَ اللّٰہ، قال: کَیْفَ قلتَ؟ قال: قلتُ: الحمدُ للّٰہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ مبارکا علیہ کمایُحِبُّ ربُّنا ویَرْضَی، فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: والذی نفسی بیدہ، لقد ابْتَدَرَھَا بِضْعَۃٌ وثلاثونَ مَلَکاً، اَیُّھُمْ یَصْعَدُ بھا۔

قال: وفی الباب عن انسٍ، ووَائِلِ بن حُجْرٍ، وعامرِ بن رَبِیعۃَ۔ قال ابو عیسی: حدیث رِفاعۃَ حدیث حسنٌ۔ وکأنَّ ھذا الحدیث عندَ بعض اھل العلم انَّہُ فی التَّطَوُّعِ۔ لأنَّ غیرَ واحدٍ من التابعین قالوا: اِذا عَطَسَ الرجلُ فی الصلاۃ المکتوبَۃِ اِنَّما یَحْمَدُ اللّٰہَ فی نفسہ، ولم یُوَسِّعُوا باَکثرَ من ذلک۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کی مجھے نماز کے دوران چھینک آ گئی تو میں نے کہا"الحمدللہ" ......الخ (ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں، بہت پاکیزہ تعریف اور بابرکت تعریف اس کے اندر اور اوپر جیسے ہمارا رب چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے) پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا نماز میں کلام کرنے والا کون ہے؟ کسی نے جواب نہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا کہ نماز میں کلام کرنے والا کون ہے؟ پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری مرتبہ پوچھا نماز میں کس نے بات کی تھی؟ تو رفاعہ بن رافع بن عفراء نے عرض کیا یارسول اللہ! میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے کیا کہا تھا؟ (رفاعہ کہتے ہیں) میں نے کہا"الحمدللہ ......الخ" پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس

ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تیس سے زائد فرشتوں نے ان کلمات کو اوپر لے جانے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت کی کوشش کی کہ کون ان کلمات کو لیکر دربار الٰہی میں چڑھتا ہے۔

اس باب میں حضرت انس، وائل بن حجر اور عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں رفاعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے بعض اہل علم کے نزدیک یہ حدیث متنفل کے بارے میں ہے کیونکہ کئی تابعین فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو فرض نماز کے دوران چھینک آجائے تو اپنے دل میں الحمدللہ کہے اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

﴿تشریح﴾

دورانِ نماز لمبی دعا مانگنے کا حکم: حنفیہ کے مذہب میں اگر فرض نماز ہو تو امام کو چھینک آنے کی صورت میں حدیث باب جیسی لمبی دعا نہیں پڑھنی چاہیئے کیونکہ امام کو نماز ہلکی[1] پڑھانے کا حکم ہے لیکن اگر کوئی شخص نماز میں لمبی دعائیں مانگے تو اس سے نماز فاسد[2] نہیں ہوگی۔

سندِ حدیث کی تشریح: (حدثنا رفاعة بن یحییٰ بن عبدالله بن رفاعة بن رافع الزرقی عن عم ابیه معاذ بن رفاعه) اس سند میں رفاعہ کے والد یحییٰ بن عبداللہ ہیں۔ اور ان یحییٰ بن عبداللہ کے چچا معاذ ہیں۔ پس معاذ اور عبداللہ رفاعہ بن رافع صحابی کے بیٹے ہیں۔ تو اس سند کا خلاصہ یہ ہوا کہ رفاعہ صحابی اپنے بیٹے معاذ کو حدیث سناتے ہیں اور معاذ اپنے بھائی عبداللہ کے پوتے رفاعہ بن یحییٰ بن عبداللہ کو حدیث سنا رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کو مکرر فرمانے کی وجہ: (قال کیف قلت) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ دوبارہ اس شخص سے پوچھتے تھے تاکہ جو شخص اس واقعہ کے شروع میں نہیں تھا اسے بھی اس حدیث کا پسِ منظر معلوم ہو جائے۔ یا اگر کوئی شخص نماز کے اس واقعہ کو بھول گیا ہے

---

[1] نیز سلفِ صالحین میں سے کسی کا اس پر عمل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اتنی لمبی دعا پڑھنے کو نماز میں مستحب قرار دیتا ہے لہٰذا اس حدیث کو بیان جواز پر محمول کریں گے۔

[2] نماز اس وجہ سے فاسد نہیں ہوگی کہ اس نے اللہ سبحانہ وتقدس وتعالیٰ کی تعریف کی ہے لیکن اگر کسی غیر کے جواب میں نماز کے اندر یرحمک اللہ کہے تو بغیر کسی تردد کے نماز فاسد ہو جائیگی کیونکہ اس میں مخاطب کو جواب دینے کا ارادہ ہے۔ درمختار میں اس کی تصریح کی ہے اور علامہ شامی نے اس کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔

یا اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیف قلت فرمایا کہ[1] حاضرین مجلس میں سے کوئی شخص حدیث باب کو کسی دوسری شئی کا جواب نہ سمجھے بلکہ حدیث شریف میں یہ وضاحت کی گئی کہ آنے والی جو فضیلت بیان کی جارہی ہے یہ اسی تحمید کرنے والے کے متعلق ہے اور مجمع عام میں عموماً بات کے سیاق وسباق کے نہ جاننے کی وجہ سے اس طرح کی غلطی ہو جاتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیف قلت کہہ کر اس غلطی سے بچنے کی طرف تنبیہ فرمادی۔

صحابی سے دعائیہ کلمات خود سننے کے باوجود دوبارہ کہلوانے کی حکمت: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ان صحابی سے خود ہی سنے تھے لیکن پھر بھی دوبارہ کہنے کا حکم فرمایا اس میں حکمت یہ تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہاں پر جو فضیلت بیان کی جارہی ہے اس کلمہ اور جملہ کے علاوہ کسی اور جملہ کی فضیلت ہے۔ بہر حال پھر آگے چل کر اس فضیلت کو ذکر فرمایا لہٰذا "مالی انازع القرآن" والی حدیث کے پیشِ نظر نماز میں اس طرح کی حمد وثنا سراً پڑھنا جائز ہے لیکن جہراً پڑھنا صحیح نہیں البتہ اگر کوئی شخص جہراً اس طرح کی دعا پڑھے تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ فتدبر۔

امام ترمذیؒ کے قول کا مطلب: (قوله و كان هذا الحديث عند بعض اهل العلم فی التطوع) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث باب میں نفل نماز کے اندر اس کلمہ کو پڑھا گیا[2] تھا کیونکہ نفل نماز کی جماعت کرانا صحیح نہیں بلکہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ دوسری حدیث میں نماز کو ہلکی پڑھنے کا حکم ہے اس لئے احادیث میں تطبیق کیلئے حدیث باب والے ذکر کو نفل نماز میں پڑھا جا سکتا ہے تاکہ اس پر عمل ہو جائے۔

باب ماجاء فی نَسخ الکلام فی الصلاۃِ

باب نماز میں کلام کے منسوخ ہونے کے بارے میں

☆حدثنا احمدُ بن مَنیعٍ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ اخبرنا اِسمٰعیلُ بن ابی خالدٍ عن الحرث بن شُبَيْلٍ عن ابی عَمرٍو الشَّيْبَانِیِّ عن زید بن اَرْقَمَ قال: کنا نتکلَّمُ خلفَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الصلاۃِ،

---

[1] یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ کسی بات کو اوقع فی النفس کرنے کیلئے دوبارہ اس کے متعلق پوچھتے تاکہ اس کا پسِ منظر اچھی طرح اس کے سامنے آجائے۔

[2] اس حدیث باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال کرنا اور صحابہ کا جواب دینا اس واقعہ میں آپ ایک بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا

فرمار ہے تھے نیز سیوطی نے طبرانی کی روایت میں مغرب کی نماز کی تصریح کی ہے کہ یہ مغرب کی نماز کا واقعہ ہے۔

يكلِّمُ الرجلُ مِنَّا صاحبَه اِلى جَنْبِهِ، حتى نَزَلَتْ:وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ ـفامِرْ نَا بالسكوتِ، ونُهِينَا عن الكلامِ۔

قال: وفى الباب عن ابن مسعودٍ، ومعاويةَ بن الحكم۔ قال ابو عيسى: حديث زيد بن اَرْقَمَ حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ عليه عندا كثر اهل العلم۔

قالوا: اِذا تكلَّمَ الرجلُ عامداً فى الصلاة اَو ناسياً اَعادَ الصلاةَ۔ وهو قولُ سفيانَ الثَّورِيِّ وابن المبارِكِ، واهل الكوفةِ۔ وقال بعضُهم: اِذا تكلَّمَ عامداً فى الصلاة اعاد الصلاةَ، وان كان ناسياً او جاهلاً اجزأ۔ وبه يقولُ الشافعيُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم دورانِ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں باہم گفتگو کیا کرتے تھے (نمازی اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے آدمی کے ساتھ بات کر لیتا تھا) یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی "وقوموا الله قانتين" (ترجمہ: اور اللہ کیلئے خاموش کھڑے ہو جاؤ) پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔

اس باب میں ابن مسعود اور معاویہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زید بن ارقم کی یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر یا بھول کر نماز میں کلام کرے تو اسے نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی اور یہ ثوری اور ابن مبارک کا قول ہے (یہی احناف کا مذہب ہے) اور بعض نے کہا کہ جب نماز میں جان بوجھ کر بات کرے تو نماز کا اعادہ کرے اور اگر (نماز کو) بھول کر یا مسئلہ جاننے کی وجہ سے بات کی ہے تو نماز ہوگئی اور اسی کے امام شافعی قائل ہیں۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے حنفیہ کا استدلال: (قوله عن زيد بن ارقم رضى الله عنه كنا نتكلم) اس حدیث کا ظاہر دال ہے کہ نماز میں باتیں کرنے کا حکم مدینہ منورہ میں منسوخ ہوا کیونکہ زید بن ارقم انصاری صحابی ہیں اور ہم اس کو تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

باب ماجاء فى الصلاةِ عندَ التوبَة

باب توبہ کی نماز کا بیان

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن عثمان بن المغيرةِ عن عليٍّ بن رَبيعَةَ عن اَسمَاءَ بن الحَكَمِ الفَزَارِىِّ قال: سمعتُ علياً يقولُ: اِنِّى كنت رجلاً اذا سمعتُ من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حديثاً نَفَعَنِى اللّٰه منه بما شاء اَنْ يَنْفَعَنِى به ، واذا حدَّثنى رجلٌ من اصحابه اسْتَحْلَفْتُه، فإذا حلَفَ لى صَدَّقْتُهُ، وانه حدثنى ابو بكرٍ، وصدَقَ ابو بكرٍ، قال: سمعتُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: مامِنْ رجلٍ يُذْنِبُ ذنباً، ثم يقومُ فيتطهَّرُ ، ثم يصلِّى، ثم يستغفرُ اللّٰهَ، اِلّا غفر اللّٰه له۔ ثُمَّ قرأَ هذه الآيَةَ: وَالَّذِينَ اِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ، وَمَن يَّغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ، وَلَمْ، يُصِرُّوا عَلَى مَافَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔

قال: وفى الباب عن ابن مسعودٍ، وابى الدَّرْدَاءِ۔ وانسٍ، وابى اُمَامَةَ، ومُعَاذٍ، ووَاثِلَةَ، وابى اليَسَرِ واسمه كَعْبُ بن عَمْرٍو۔قال ابو عيسى: حديث عليٍّ حديث حسن، لانعرفه اِلَّا من هذا الوجه، من حديثِ عثمانَ بن المغيرةِ۔ورَوَى عنه شعبةُ وغيرُ واحدٍ فر فعوهِ مِثل حديث ابى عَوَانَةَ۔ورواه سفيانُ الثورىُّ ومِسْعَرٌ فَأَوْقَفَاهُ، ولم يرفعاهُ الى النبىِّ صلى اللّٰه عليه وسلم۔وقد رُوِىَ عن مِسْعَرٍ هذا الحديثُ مرفوعاً ايضاً۔ ولانعرفُ لاسماءَ بنِ الحَكَم حديثاً مرفوعاً اِلّا هذا۔

﴿ترجمه﴾

حضرت اسماء بن حکم فزاری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ میں ایک ایسا شخص تھا کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ مجھے اتنا نفع پہنچاتے جتنا وہ چاہتے (یعنی جس قدر ممکن ہوتا میں اس پر عمل کرتا) اور جب مجھ سے صحابی میں سے کوئی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا (کہ کیا آپ نے خود یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی) اگر وہ قسم کھالیتا تو میں اس کی بات کی تصدیق کرتا تھا اور بے شک شان یہ ہے کہ مجھ سے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سچ کہا وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرے پھر پاکی حاصل کر کے نماز پڑھے پھر اللہ سے گناہ کی معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے

معاف کر دیتے ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی "والذین اذا فعلوا ......الایة" (ترجمہ: اور وہ لوگ جن سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں)۔

اس باب میں ابن مسعود، ابو درداء، انس، ابو امامہ، معاذ، واثلہ اور ابو الیسر (جن کا نام کعب بن عمرو ہے) سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ہم عثمان بن مغیرہ کے علاوہ کسی سند سے نہیں جانتے۔ ان سے شعبہ اور کئی راوی نقل کرتے ہوئے ابو عوانہ کی حدیث کی طرح مرفوع بیان کرتے ہیں۔ سفیان ثوری اور مسعر نے بھی عثمان بن المغیرہ سے اسے موقوفاً نقل کیا ہے اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مرفوع نہیں کیا اور یہ حدیث مسعر سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

ترجمۃ الباب کا مقصد: اس باب کا مقصد[1] یہ ہے کہ کوئی شخص صلوٰۃ التوبۃ پڑھنے کو بدعت نہ سمجھے۔

حضرت علیؓ کا قسم کھلوانا بات کی پختگی کیلئے ہوتا تھا: (قوله استحلفه) حضرت علی رضی اللہ عنہ قسم کھلا کر پوچھتے تھے کہ تم نے یہ حدیث خود سنی ہے اس قسم کھلانے کا مقصد اپنے دل کو مطمئن کرنا تھا کسی صحابی کے متعلق شک وشکوک ان کے دل میں نہیں تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ تو سچ ہی کہا کرتے تھے کیونکہ وہ صدیق تھے لہٰذا ان کو قسم کھلائے بغیر ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل مطمئن ہو جاتا تھا اس لئے ان سے قسم کھانے کو نہیں کہتے تھے۔

(ثم قرا هذه الاية والذين اذا فعلوا فاحشة الاية) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت اس لئے فرمائی کہ اس سے استشہاد مقصود تھا کیونکہ اس آیت میں مقصد یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندے گناہ ہو جانے کی صورت میں کسی بھی ھیات پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور حدیث میں جو خاص طریقہ وارد ہوا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے باقی حدیث میں نماز پڑھنا، وضو کرنا اور ذکر کرنا اسلئے ذکر کیا گیا کہ ان میں سے بعض افراد سے گناہ

---

[1] میرے نزدیک امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس باب کا مقصد یہ ہے کہ صلوٰۃ التوبہ پڑھنا مستحب ہے چنانچہ فقہاء نے صلوٰۃ التوبہ کو مستحبات میں شمار کیا ہے۔

معاف ہو جائیں گے اور بعض افراد کیلئے رفع درجات ہونگے یا ان تمام افعال سے گناہ معاف ہو جائیں گے اور ان کے بعد استغفار کرنے پر اسے ثواب ہوگا جو آخرت کی کامیاب تجارت ہے بہر حال گناہ کی معافی کیلئے ندامت کافی ہے اور باقی افعال درجات کو بلند کریں گے۔

باب ماجاء متی یُؤْمَرُ الصبیُّ بالصلاۃ

باب بچے کو نماز کا حکم کب (کس عمر میں) دیا جائے؟

☆ حَدَّثَنَا علی بن حُجرٍ اخبرنا حَرمَلَۃُ بن عبد العزیز بن الرَّبِیعِ بن سَبْرَۃَ الجُھَنِیُّ عن عَمِّہٖ عبد الملک بن الرَّبِیع بن سَبْرَۃَ عن ابیہ عن جدّہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: عَلِّمُوا الصبیَّ الصلاۃَ ابنَ سَبْعِ سنینَ، واضرِبُوہ علیھا ابنَ عَشْرٍ۔

قال: وفی الباب عن عبدِ اللّٰہ بن عَمْرو۔ قال ابوعیسی: حدیث سَبْرَۃَ بنِ مَعْبَدٍ الجُھَنِیِّ حدیثٌ حسن صحیحٌ۔وعلیہ العملُ عند بعض اھل العلم۔ وبہ یقولُ احمدُ واسحٰقُ۔

وقالا :ماتَرَکَ الغلامُ بعدَ العَشْرِ من الصلاۃِ فإنَّہُ یُعیدُ۔ قال ابو عیسی: وسَبْرَۃُ ھو ابنُ مَعْبَدٍ الجُھنِیُّ ویقال ھو ابن عَوْسَجَۃَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سبرہ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بچے سات سال کی عمر کے ہوں تو ان کو نماز سکھاؤ اور ان کو نماز کے چھوڑنے پر مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں۔

اس باب میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔

امام احمد و اسحٰق کا بھی یہی قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ بچہ دس سال کی عمر کے بعد جتنی نمازیں چھوڑے تو ان کی قضا کرے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سبرہ، معبد جہنی کے بیٹے ہیں اور ان کو ابن عوسجہ بھی کہا جاتا ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث میں نماز کا حکم بطور فرضیت کے نہیں بلکہ بطور اعتیاد کے ہے: (قولہ واضربوہ علیہا ابن عشرۃ) دس[1] سال کی عمر میں نماز چھوڑنے پر پٹائی کرنے کا حکم اس لئے نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھنے کا مکلّف ہو گیا بلکہ اس کو عادت ڈالنے کیلئے اور تعزیراً یہ حکم دیا گیا ہے کیونکہ بچہ جب احتلام کی وجہ سے بالغ ہو جاتا ہے یا سولہ[2] سال کی عمر کو پہنچتا ہے تب احکام کا مکلّف بنتا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یُحدِثُ بعد التَّشَهُّدِ

باب (قعدہ اخیرہ میں) تشہد کی مقدار بیٹھنے کے بعد حدث پیش آجائے تو اس کا حکم

☆حدثنا احمدُ بن محمد بن موسی الملقَّبُ مردو یہ قال: اخبرنا ابن المارکِ اخبرنا عبد الرحمٰن بن زِیَادِ بن اَنْعُمٍ اَنَّ عبد الرحمٰن بنَ رافعٍ وبکرَ بن سَوَادَۃَ اخبراہ عن عبد اللّٰہ بن عَمْرٍ وقال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اِذَا اَحْدَثَ یعنی الرجلَ وقد جلَسَ فی آخرِ صَلَا تِہٖ قبل ان یُسَلِّمَ فقد جازتْ صلا تُہ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث اسنادہ لیس بذاك القویِّ، وقد اضطرَبوا فی اسنادہ وقد ذھب بعض اھل العلم الی ھذا۔

قالوا: اِذا جلس مقدارَ التشہد واحدثَ قبل ان یسلِّمَ فقد تَمَّتْ صلاتُہ۔ وقال بعض اھل العلم: اذاحدث قبل اَنْ یتشھَّدَ اَوْ قبل ان یسَلِّمَ اعاد الصلاۃَ۔وھو قولُ الشافعیِّ۔

وقال احمدُ: اِذا لم یتشھَّدْ وسَلَّمَ اجزاہُ، لقول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: و تَحْلِیلُھَا التَّسْلِیمُ

---

[1] **دس سال کی عمر کی تخصیص کیوں؟:** اس توجیہ کے مطابق دس سال کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اتنی عمر میں بچہ مار سہہ سکتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس عمر میں احتلام کے ساتھ بچہ بالغ ہوسکتا ہے جیسا کہ ابن رسلان نے لکھا ہے۔

[2] یعنی سولہ سال کی عمر میں بچہ جب داخل ہوتو وہ بالغ شمار ہوگا۔

بلوغ کی علامتیں: چنانچہ درمختار میں ہے کہ لڑکے کے بالغ ہونے کی تین علامتیں ہیں: ۱۔سوتے میں احتلام ہو، ۲۔کسی عورت کے ساتھ مباشرت سے اس عورت کو حاملہ کردے، ۳۔جاگتے میں انزال ہو جائے اسی طرح لڑکی کی بلوغت کی تین علامتیں ہیں: ۱۔احتلام، ۲۔حیض کا آنا، ۳۔حمل کا ٹھہرنا پس اگر اس میں سے کوئی سی بھی چیز نہ پائی گئی تو جب لڑکا لڑکی پندرہ سال کی عمر تک پہنچ جائے تو ہر ایک کو بالغ قرار دیا جائیگا۔یہی قول مفتی بہ ہے۔

والتشهدُ اَهْوَنُ قام النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی اثْنَتَیْنِ فَمَضَی فی صلاته ولم یتشهد۔ وقال اسحٰق بن ابراهیم: اذا تشهد ولم یسلم اجزاءہٗ۔

واحتجَّ بحدیث ابن مسعودٍ حین عَلَّمَهُ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم التشهدَ فقال: اِذَا فَرَغْتَ من هٰذا فقد قَضَیْتَ ماعلیك۔ قال ابو عیسی: و عبد الرحمٰن بن زیاد بن اَنْعُمٍ هو الافریقی وقد ضعّفه بعضُ اهل الحدیث منهم یحیی بن سعید القَطّانُ واحمد بن حنبلٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی شخص آخری قعدہ میں ہو اور سلام پھیرنے سے پہلے اسے حدث (یعنی بے وضو ہو جائے) لاحق ہو جائے تو بالتحقیق اس کی نماز جائز ہوگئی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کی سند قوی نہیں اور اس کی سند میں اضطراب ہے۔ بعض علماء کا اس پر عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر تشہد کی مقدار کے برابر بیٹھ چکا ہو اور سلام پھیرنے سے پہلے حدث کر دے (وضو توڑ دے) تو اس کی نماز ہوگئی۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر تشہد سے پہلے یا سلام سے پہلے حدث ہو جائے تو نماز کا اعادہ ضروری ہے یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تشہد نہیں پڑھا اور سلام پھیر لیا تو نماز ہو جائیگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ نماز کی تحلیل اس کا سلام ہے اور تشہد کا معاملہ سلام سے ہلکا ہے (یعنی سلام پھیرنا تو فرض ہے مگر تشہد فرض نہیں) اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں پر کھڑے ہو گئے تھے اور نماز کو جاری رکھا تھا اور آپ نے تشہد نہیں پڑھا تھا اسحٰق بن ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں اگر تشہد پڑھا لیکن سلام نہیں پھیرا تو اس کی نماز ہو جائیگی (یعنی تشہد فرض ہے سلام فرض نہیں)۔ انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تشہد سکھایا تو فرمایا جب تم اس سے فارغ ہو جاؤ تو تم نے اپنا عمل (فریضہ) پورا کر لیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی ہیں بعض محدثین یحییٰ بن سعید، قطان اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب پر احناف عمل کرتے ہیں: حدیث باب کے مقتضی پر عمل کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی نماز صحیح ہو جائیگی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ امام صاحب کی طرف خروج بصنع المصلی کے فرض ہونے کی جو نسبت کی گئی ہے یہ ایک ضعیف روایت ہے صحیح بات یہ ہے کہ نماز سے نفس خروج [۱] فرض ہے اور یہی اکثر روایات سے ثابت ہے۔

(قولہ هذا حدیث لیس اسنادہ بقوی) اس کے ضعیف ہونے کی وجہ مصنف نے بعد میں بتائی ہے کہ عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی کو بعض اہل علم (جن میں یحیٰی بن سعید القطان ہیں) نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن دوسرے ائمہ (جن میں یحیٰی بن معین [۲] وغیرہ شامل ہیں) نے ان کی توثیق کی ہے۔

امام ترمذیؒ کا دعویٰ اضطراب صحیح نہیں: امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول "وقد اضطربوا فی اسنادہ" یہ جرح مبہم ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اضطراب کی تفصیل نقل نہیں کی درحقیقت جس کو محدثین نے اضطراب سمجھا ہے [۳] وہ اضطراب ہے ہی نہیں کیونکہ یہ روایت دونوں سندوں کے ساتھ مروی ہے اس طرح اس روایت کو دو سندوں کے ساتھ مروی ہونے کی وجہ سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔

---

۱ **خروج بصنع المصلی فرض ہے یا نہیں:** اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ الارشاد الرضی تقریر ترمذی میں ہے کہ خروج بصنعہ کا امام صاحب کے نزدیک فرض ہونا یہ امام صاحب سے ایک ضعیف روایت ہے صحیح بات یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نفس خروج سے نماز صحیح ہو جائیگی جیسا کہ صاحبین کا مذہب ہے۔ انتہی۔ قلت: علامہ شامی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہاں اس اختلاف کو نقل کیا ہے کہ خروج بصنع المصلی امام صاحب کے نزدیک فرض ہے یا نہیں۔

۲ حافظ رحمہ اللہ نے تہذیب میں ابن معین کو توثیق کرنے والوں میں نقل نہیں کیا البتہ ان سے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں: ۱۔ ابن معین کہتے ہیں کہ ابن زیاد بن انعم افریقی ضعیف ہیں لیکن ان کی حدیثیں لکھ لئے جانے کے قابل ہیں، ۲۔ ابن معین سے مروی ہے "لیس به باس ضعیف" وغیرہ ذالک۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ شاید انہوں نے افریقی کی توثیق بھی کی ہوگی جیسا کہ یحیٰی بن قطان سے بھی افریقی کی توثیق مروی ہے چنانچہ بہت سے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ احمد بن صالح کہتے ہیں کہ ان کی حدیث قابل احتجاج ہے اور وہ ان پر جرح کرنے والوں کی مذمت کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ تو ثقہ ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا کلام ابھی گزرا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو یہ دیکھا کہ وہ ان کے معاملے میں انکو قوی قرار دے رہے ہیں اور انہیں مقارب الحدیث کہہ رہے ہیں۔

۳ **حضرت سہارنپوریؒ کا امام ترمذیؒ پر رد:** اسی وجہ سے حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ نے بذل میں امام ترمذی رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں اضطراب کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔

باب ماجاء اذا کان المطرُ فالصلاۃُ فی الرِّحالِ

باب جب بارش ہو رہی ہو تو کجاووں میں نماز پڑھنا جائز ہے

☆حدثنا ابو حفصٍ عَمْرُو علی البصریُّ حَدَّثَنَا ابو داود الطَّیَالِسِیُّ حَدَّثَنَا زُھَیْرُ بن معاویۃَ عن ابی الزُّبَیْرِ عن جابرٍ قال: کُنَّا مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی سَفَرٍ، فاصابنا مطرٌ، فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مَنْ شاء فَلْیُصَلِّ فی رَحْلِہِ۔

قال: وفی الباب عن ابن عمرَ، وَسَمُرَۃَ، وابی المَلیح عن اَبیہ، وعبد الرحمٰن بن سَمُرَۃَ۔

قال ابو عیسی: حدیث جابرٍ حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد رَخَّصَ اھلُ العلم فی القعود عن الجماعۃ والجمعۃ فی المطر والطِّینِ۔ وبہ یقولُ احمدُ، واسحٰقُ۔

قال ابو عیسی: سمعتُ ابا زُرْعَۃَ یقول: رَوَی عَفَّانُ بن مسلمٍ عن عمرِو بن علی حدیثاً۔

وقال ابو زُرعۃ: لم نَرَ بالبصرۃِ احفظَ من ھؤُلاءِ الثلاثۃ: عَلیِّ بن المدینی، وابنِ الشَّاذَ کُونِی، وعمرو بن علیٍّ۔ وابو المَلیحِ اسمہ عامرٌ ویقال زیدُ بن اُسَامَۃَ بن عُمَیْرٍ الھُذَلِیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ بارش ہوگئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جو چاہے نماز پڑھ لے اپنے کجاوے میں۔

اس باب میں ابن عمر، سمرہ، ابوالملیح، (اپنے والد سے) اور عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم نے بارش اور کیچڑ میں جمعہ اور جماعت کے ترک کی اجازت دی ہے۔ امام احمد واسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔

(امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میں نے ابوزرعہ سے سنا وہ کہتے ہیں عفان بن مسلم نے عمرو بن علی سے ایک حدیث روایت کی ہے ابوزرعہ کہتے ہیں میں نے بصرہ میں ان تینوں علی بن مدینی، ابن شاذ کونی اور عمرو بن علی سے بڑھ کر کسی کو ان سے زیادہ حافظہ والا نہیں دیکھا۔ ابوملیح بن اسامہ کا نام عامر ہے اور انہیں زید بن اسامہ بن عمیر الہذلی بھی کہا جاتا ہے۔

﴿تشریح﴾

الصلوٰۃ فی الرحال کا اعلان دوران اذان ہوگا یا اذان کے بعد؟ حدیث مبارک میں "الصلوۃ فی الرحال "کا جو اعلان بارش کی صورت میں لگایا جاتا تھا اس کے متعلق دو قول ہیں ایک قول[1] یہ ہے کہ اذان کے درمیان "حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح" کے[2] بدلے "الصلوٰۃ فی الرحال" کہا جاتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اذان کے بعد "الصلوٰۃ فی الرحال" کی منادی کرائی جاتی۔ پہلے احتمال کی صورت میں دوران اذان "حی علی الصلوٰۃ ، حی علی الفلاح" کے بجائے۔ گھر میں نماز پڑھنے کا حکم اباحت کیلئے ہے اور دوسرے احتمال کی صورت میں حی علی الصلوٰۃ اور الصلوٰۃ فی الرحال دونوں کو اسلئے کہتے تھے تاکہ جو شخص عزیمت پر عمل کرتے ہوئے مسجد آنا چاہے وہ آسکتا ہے کیونکہ بارش کی صورت میں مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا بہرحال افضل[3] ہے۔ اور گھر میں ادا کرنے کی رخصت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد بھی یہی حکم ہے[4]۔

بابُ ماجاءَ فی التَّسبِیحِ فِی اَدْبَارِ الصلاۃِ

باب نماز کے بعد تسبیحات کے بیان میں

☆حدثنا اِسحٰق بن ابراهیم بن حبیب بن الشهید البصری وعلی بن حُجْرٍ قالا: حَدَّثَنَا عَتَّابُ بن بشیر عن خُصَیْفٍ عن مجاهدٍ وعِکْرِمَةَ عن ابن عباسٍ قال: جاء الفقراء الی رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فقالوا: یارسولَ اللّٰہِ اِنَّ الاغنیاءَ یصلون کمانصلّی، ویصومون کمانصومُ ،ولهم اموالٌ یُعتِقُونَ ویتصدّقونَ؟ قال فإذا صلیتم فقولوا: سبحانَ اللّٰہِ، ثلاثاً وثلاثین مَرَّةً، والحمدُ للّٰہ، ثلاثاً مَرَّةً،

---

[1] یعنی اس جملہ کو کس مقام پر بولا جاتا تھا اس کے متعلق اختلاف ہے ایک قول میں یہ اعلان حیعلتین کے بدلہ ہوتا تھا اور دوسرا قول یہ ہے کہ اذان کے ختم ہونے کے بعد الصلوٰۃ فی الرحال کا اعلان کیا جاتا۔

[2] اسی پر اذان میں کلام کے جائز ہونے کا مسئلہ بھی متفرع ہے اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔

[3] یعنی جماعت سے نماز پڑھنا افضل ہے اور اس میں بہت ثوابِ عظیم ہے۔

[4] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد بھی تیز بارش میں گھروں میں نماز پڑھنے کی رخصت ہے عزیمت یہی ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کی جائے کیونکہ جماعت کی بہت فضیلت ہے۔

واللّٰہُ اکبرُ اربعاً وثلاثین مرّۃً، ولا اِلٰہ اِلّا اللّٰہُ ، عَشْرَ مَرّاتٍ، فاِنکم تُدْرِکُونَ بِہٖ مَنْ سَبَقَکُمْ وَلَا یَسْبِقُکُمْ مَنْ بَعْدَ کُمْ۔

قال: وفی الباب عن کَعْبِ بن عُجْرَۃَ، وانسٍ، وعبد اللّٰہ بن عَمْرو، وزید بن ثابت ، وابی الدَّرْدَاءِ ،وابن عمرَ، وابی ذَرٍّ۔ قال ابو عیسی: وحدیث ابنِ عباسٍ حدیث حسن غریب۔ وفی الباب ایضاً عن ابی ھریرۃَ ، المغیرۃِ۔وقد رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال: خَصلتانِ لایُحصیھما رجلٌ مسلِمٌ اِلّا دَخَلَ الجنۃَ: یُسَبِّحُ اللّٰہَ عند منامہ عَشْراً، ویَحْمَدُہُ عَشْراً، ویُکَبِّرُہُ عَشْراً، ویسبحُ اللّٰہَ فی دبر کل صلاۃ ثلاثاً وثلاثینَ، ویَحمدُہ ثلاثاً وثلاثینَ، ویکبرُہ اربعاً وثلاثینَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کچھ فقراء صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! مالدار (لوگ ہم سے سبقت لے گئے) وہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور ان کے پاس مال ہے۔ اس سے وہ غلام آزاد کرتے اور صدقہ دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز پڑھ چکو تو سبحان اللہ تینتیس مرتبہ، الحمدللہ تینتیس مرتبہ، اللہ اکبر چونتیس مرتبہ اور لا الٰہ الا اللہ دس مرتبہ پڑھا کرو۔ ان کلمات کے پڑھنے سے تم ان لوگوں کے درجات کو پہنچ جاؤ گے جو تم سے آگے نکل گئے اور وہ لوگ تم سے سبقت نہیں لے جاسکیں گے جو پیچھے رہ گئے۔

اس باب میں کعب بن عجرہ، انس، عبداللہ بن عمرو، زید بن ثابت، ابو درداء، ابن عمر اور ابوزر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن غریب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو خصلتیں ایسی ہیں جو مسلمان ان کی حفاظت کر لیتا ہے وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہر نماز کے بعد تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہنا اور سوتے وقت دس مرتبہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہنا۔

﴿تشریح﴾

اعمال انسانی میں فرق مراتب اوراذکار پر مداومت کرنے والے کی صدقہ وخیرات کرنے والے سے زیادہ فضیلت کی وجہ: (فانکم تدرکون به من سبقکم ولا یسبقکم من بعدکم) انسان کے اعمال میں سے سب سے افضل عمل بحالتِ نماز قرآن کریم کی تلاوت ہے اس کے بعد نماز سے باہر باوضو قرآن کی تلاوت افضل ہے۔ پھر بے وضو قرآن کی تلاوت کرنا ہے پھر باقی اذکار کا درجہ ہے پھر صدقہ خیرات پھر روزے رکھنا، تو مالدار صحابہ خوب صدقہ کیا کرتے تھے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین فقراء کو جو سکھلایا ہے وہ اذکار کی قبیل سے ہے لہٰذا ان اذکار پر مداومت کرنے والا صدقہ خیرات کرنے والے سے بالکل افضل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کو اپنی تعریف سے زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کی تعریف باقی تمام اذکار واعمال سے افضل ہے پھر یہ جاننا چاہیئے کہ مال کا انسان کے ساتھ ایک ایسا قلبی لگاؤ ہوتا ہے جو کسی پر مخفی نہیں لہٰذا مال کو خرچ کرنا نفس کا غیر معمولی مجاہدہ ہے روزے کے اندر جزوی فضیلت ہے کیونکہ یہ خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور اس میں ریا کا کوئی شائبہ بھی نہیں لہٰذا اس کا بدلہ بھی بغیر واسطے کے اللہ رب العزت خود عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں "الصوم لی وانا اجزی به" کا جو وعدہ اللہ رب العزت نے فرمایا اس کو معروف ومجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے دونوں صورتوں میں مناسبت اس طرح ہے کہ چونکہ روزہ بھی ایک مخفی عمل ہے چنانچہ اس کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ مخفی طور پر خود ہی دیتے ہیں یا خود ہی اس کا بدلہ ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کا ایک بڑا عمل صدقہ کرنا ہے لیکن اس کا درجہ اذکار سے کم ہے تو اذکار کرنے والے اشخاص کا ان اشخاص پر فضیلت لے جانا جو اذکار نہیں کرتے بالکل ظاہر ہے حدیث شریف میں "تدرکون" سے مخاطب ہر وہ شخص ہے جو ان اذکار کو پابندی کے ساتھ اپنا وظیفہ بنائے یہ حکم صحابہ کے ساتھ خاص نہیں۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک نفلی حج نفلی صدقہ سے افضل ہے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حج کرنا نفل صدقہ کے مقابلہ میں افضل ہے اور یہ قول انہوں نے حج کرنے کے بعد فرمایا یہ قول ہماری اس ترتیب کے منافی نہیں جس کو ہم نے ابھی ذکر کیا کیونکہ حج میں بھی بہت سا پیسہ خرچ کیا جاتا ہے اور اس میں بدنی مشقت اور تکالیف بھی اٹھائی جاتی ہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃِ علی الدَّابَّةِ فی الطِّینِ والمطرِ

باب کیچڑ اور بارش میں سواری (اونٹ) پر نماز پڑھنے (کے جواز) کے بارے میں

☆حدثنا یحیی بن موسی حَدَّثَنَا شَبَابَةُ بن سَوَّارٍ حَدَّثَنَا عُمَرُ بن الرَّمَّاحِ البَلْخِیُّ عن کثیرِ بن زیادٍ

عن عَمروبن عثمانَ بن يَعْلَى بن مُرَّةَ عن ابيه عن جده: انهم كانوا مع النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فى سفرٍ، فانتَهَوْا اِلى مَضِيقٍ، وحضَرَتِ الصلاةُ، فَمُطِرُوا، السَّماءَ مِنْ فَوْقِهِمْ، والبِلَّةُ مِنْ اَسْفَلَ منهم، فاَذَّنَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وهو على راحلته، واقامَ، فتَقَدَّم على راحلته فصلّى بهم، يُومِئُ ايماءً: يَجْعَلُ السجود اَخفَضَ من الركوعِ۔

قال ابو عيسى: هذا حديث غريب، تَفَرَّدَ بِهِ عُمَرُ بْنُ الرماحِ البلخيُّ لايُعْرَفُ اِلا من حديثه۔

وقد رَوَى عنه غيرُ واحدٍ من اهل العلم۔ وكذلك رُوِىَ عن انس بن مالكٍ: اَنَّهُ صلى فى ماءٍ وطينٍ على دابَّتِهِ۔ والعملُ على هذا عند اهل العلم۔ وبه يقول احمدُ واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

عمرو بن عثمان بن یعلی بن مرہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے پس وہ لوگ ایک تنگ جگہ میں پہنچے تو نماز کا وقت ہوگیا اور اوپر سے بارش برسنے لگی اور نیچے کیچڑ (سیلاب کی صورت) ہوگئی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری پر اذان دی اور اقامت کہی، پھر اپنی سواری کو آگے کیا اور اشارے سے نماز پڑھتے ہوئے ان کی امامت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں رکوع سے زیادہ جھکتے تھے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے کیونکہ عمر بن رماح بلخی نے تنہا اس حدیث کو روایت کیا ہے، یہ روایت کسی اور سے مروی نہیں اور ان سے کئی اہل علم روایت کرتے ہیں...... اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بارش اور کیچڑ میں اپنی سواری پر ہی نماز پڑھی۔ اہل علم کا اسی پر عمل ہے اور امام احمد و اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

اعذار میں سواری پر نماز پڑھنے کی رخصت: اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کسی دشمن کے ڈر کی وجہ سے یا سفر کے ساتھیوں سے بچھڑ جانے کی وجہ سے یا جگہ کے ناپاک ہونے یا کیچڑ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے انسان کو نماز کیلئے پاک [1]

---

[1] **فرائض اور نوافل کے حکم میں فرق:** علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ نوافل کے علاوہ فرائض اور ہر قسم کے واجبات سواری پر صحیح نہیں ہے الا یہ کہ ضرورت شدیدہ ہو مثلاً سواری سے اترنے کی صورت میں کسی چور کے مار ڈالنے کا یا کپڑے یا سواری چھین لینے کا اندیشہ ہو تو سواری پر بھی فرض اور واجب نمازیں اشارہ سے ادا کر سکتا ہے درمختار میں ہے کہ ان اعذار میں سے ایک عذر بارش کا ہونا ہے اور اتنی کیچڑ کا ہونا ہے کہ اسمیں چہرہ اندر گھس جائے اور رفقاء سے بچھڑ جانا اور ایسی سواری کا ہونا جس پر بغیر مشقت شدیدہ کے سوار ہونا ناممکن ہو ان سب صورتوں میں سواری پر فرائض و واجبات اشارہ سے ادا کرنا جائز ہے انتہی۔

جگہ میسر نہ ہو تو یہ شخص اپنی سواری پر اشارے کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے اسی طرح کا واقعہ صاحب بحر الرائق[1] نے نقل کیا ہے کہ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ حج کیا اور وہ اتنی ضعیف ہو چکی تھیں کہ سواری پر بھی خود نہیں بیٹھ سکتی تھیں لہٰذا اگر میں انہیں چھوڑ کر نماز کیلئے سواری سے اترتا تو وہ سواری سے گر جاتیں اس لئے میں سواری پر اشارہ سے نماز پڑھتا تھا۔ بہر حال اس حدیث[2] سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اذان دی ہے۔

سواری پر باجماعت نماز پڑھنے میں احناف کے مذہب پر اشکال: لیکن احناف کے مذہب کے مطابق جماعت سے نماز پڑھنے کے متعلق اشکال ہوگا کیونکہ ہمارے نزدیک مختلف سواریوں پر بیٹھ کر جماعت صحیح نہیں ہوتی کیونکہ یہ مختلف سواریاں مختلف جگہوں (مختلف مجالس) کے حکم میں ہوتی ہیں[3]۔

---

[1] **صاحب بحر کا واقعہ:** مجھے یہ حکایت نہیں ملی البتہ کنز کی شرح میں اس واقعہ کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے اس کے الفاظ یوں ہیں صاحب بحر الرائق فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنی بیوی یا والدہ کے ساتھ سوار ہو اس کا حکم مجھے نہیں ملا جیسا کہ اس فقیر کے ساتھ سفر حج میں یہ واقعہ پیش آیا کہ یہ فقیر اپنی والدہ کے ساتھ تھا اور والدہ سواری سے اترنے اور سواری پر سوار ہونے پر قادر نہیں تھیں تو کیا ایسی حالت میں جس طرح عورت کیلئے سواری پر نماز جائز ہے تو اس کے ساتھ بیٹھے مرد کیلئے بھی سواری پر فرض نماز جائز ہوگی۔ جیسا کہ جب مرد اکیلے اترنے پر قادر نہ ہو کیونکہ اس کے اکیلے اترنے سے کجاوہ جھک جائیگا اس صورت میں عورت کے لئے بھی سواری پر نماز پڑھنا جائز ہو جاتا ہے لہٰذا اس صورت مسئلہ میں بھی مرد کیلئے سواری پر اشارے سے نماز جائز ہو جائیگی۔ (از مترجم: فتاویٰ شامیہ میں ہے کہ ثم اعلم ان هذه المسئلة وقعت لصاحب البحر فی سفر حج مع امه و ذکر انه لم یر حکمها و انه ینبغی الجواز۔ اس کے بعد علامہ شامی نے اس پر اعتراض بھی کیا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے۔ ص ۴۱، الدر المختار، ایچ ایم سعید)

[2] **کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اذان دی ہے:** یہ مسئلہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے حدیث باب سے امام نووی نے استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس خود اذان دی ہے حافظ فرماتے ہیں کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس قول کو بالجزم ذکر کیا ہے اور اس کو قوی قرار دیا ہے لیکن مسند احمد میں اسی سند کے ساتھ یہ الفاظ موجود ہیں "فامر بلالا فاذن" اس سے معلوم ہوا کہ ترمذی کی روایت میں اختصار ہے یا ترمذی کی روایت میں اذن سے مراد امر بلالا بالاذان ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "اعطی الخلیفة کذا" حالانکہ دینے والا تو اس کا خزانچی ہوتی ہے خلیفہ نے صرف حکم صادر کیا ہوتا ہے۔ قالہ ابن عابدین...... در مختار میں نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں بنفسِ نفیس اذان اور اقامت دی ہے اور ظہر کی نماز پڑھائی ہے۔

[3] در مختار میں سواری پر فرض نماز کے جائز ہونے کی تفصیل کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ نفل نماز مطلقاً کجاوہ اور بیل گاڑی پر جائز ہے لیکن الگ الگ پڑھی جائیگی جماعت کے ساتھ صحیح نہیں الا یہ کہ ایک ہی سواری پر امام اور مقتدی بیٹھے ہوں علامہ شامی فرماتے ہیں قولہ لا بالجماعة یعنی ظاہر الروایۃ کے مطابق سواری پر نفل نماز باجماعت صحیح نہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیثِ باب کی حنفیہ کے مذہب کے مطابق توجیہ: البتہ حدیث باب کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری میں آگے بڑھ گئے تھے اور تین صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آپ کی سواری پر ہی بیٹھے تھے نہ کہ اپنی اپنی سواری پر۔ اسی طرح اگر ایک امام ایک مقتدی ہوں تب بھی اسے جماعت کی نماز کہا جاتا ہے تو یہاں پر بھی ممکن ہے کہ دو آدمیوں کی جماعت ہو کیونکہ اگر دو آدمی باجماعت نماز پڑھ رہے ہوں تو اسے بھی جماعت کی نماز کہا جاتا ہے نیز یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ صلی بھم کا یہ معنی نہیں کہ انکو باجماعت نماز پڑھائی بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز الگ پڑھی اور صحابہ نے اپنی الگ۔ بھم میں باء مصاحبت کا تقاضہ کرتا ہے کہ سب نے ایک ہی وقت میں نماز پڑھی تھی شرکت کا تقاضہ نہیں کرتا کہ باجماعت بھی پڑھی ہو اگرچہ صلی بھم کا عام استعمال اس معنی میں ہونے لگا ہے کہ امام نے قوم کو باجماعت نماز پڑھائی لیکن یہ استعمال کے اعتبار سے ہے لغوی معنی کے اعتبار سے یہ معنی لازم نہیں۔

باب ماجاء فی الاجتهاد فی الصلاةِ

باب نماز (تہجد) میں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا) بہت محنت فرمانا

☆حدثنا قتيبة وبِشْرُ بن مُعَاذٍ العَقَدِيُّ قالا: حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن زيادِ بن عِلَاقَةَ عن المغيرةِ بن شُعْبَةَ قال: صلّى رسول الله عليه وسلم حتى انْتَفَخَتْ قَدَمَاهُ، فقيل له: اتَتَكَلَّفُ هذا وقد غُفِرَ لك ماتقدَّمَ مِن ذنبِكَ وما تأخَّرَ؟ قال: افلا اكُونُ عَبْداً شكُوراً۔ قال : وفى الباب عن ابى هريرة، وعائشةَ۔ قال ابو عيسى: حديث المغيرةِ بن شعبةَ حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی کی سواریاں امام کی سواری کے بالکل قریب ہوں کہ مقتدیوں کی سواریوں اور امام کی سواری کے درمیان فاصلہ ایک صف کے بقدر ہو تو نفل باجماعت جائز ہے انہوں نے زمین پر نماز باجماعت پر اس کو قیاس کیا ہے۔ صحیح قول پہلا ہے کیونکہ جماعت کی نماز میں اتحاد مکان شرط ہے یہاں تک کہ اگر امام اور مقتدی ایک ہی سواری کے ایک کجاوے میں ہوں یا ایک کجاوہ کے دو کناروں میں بیٹھے ہوں تو اتحاد مکان کی وجہ سے انکی جماعت صحیح ہو جائیگی۔ انتہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث باب میں امام محمدؒ کے مذہب کے مطابق کوئی اشکال نہیں شیخین کے مذہب کے مطابق حدیث کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ عثمان بن یعلی راوی مجہول ہے۔

علیہ وسلم کے پاؤں سوج گئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں حالانکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا افلا اکون عبداشکورا فرمانے کا مقصد امت کو تعلیم دینا ہے کہ بندہ اپنے رب کا حق کبھی ادا نہیں کر سکتا: حدیث باب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بندہ اپنی اطاعت اور نیک اعمال کے ذریعے کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ جائے پھر بھی طاعات میں مشقتیں اٹھانے سے اور مزید ثواب حاصل کرنے سے مستغنی نہیں۔ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور خیر خواہی یہ جو سوال کیا کہ آپ کے تو سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں پھر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب "افلا اکون عبداشکورا" کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ یہ سمجھے تھے کہ طاعات میں انسان اسی وقت محنت اور مشقت برداشت کرتا ہے جب وہ ثواب کے حصول کیلئے پر امید ہو یا خدا کے عذاب سے ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ یہ عبادات کرتا ہے لیکن اللہ رب العزت نے جب آپ کے سارے گناہ معاف فرما دیئے اور آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثواب کے حاصل کرنے میں کوئی رغبت نہیں کیونکہ وہ تو آپ کو پہلے ہی سے حاصل ہے اور نہ ہی آپ کو عذاب اور پکڑ کا کوئی اندیشہ ہے کیونکہ آپ تو بخشے بخشائے ہیں لہٰذا آپ کو صرف اپنے فرائض اور واجبات ادا کرنے چاہئیں۔ پس اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب مرحمت فرماتے کہ میں تو بلند درجات کو حاصل کرنے کیلئے یہ مشقتیں اٹھاتا ہوں تو بہت ممکن تھا کہ بعد میں آنے والی امت میں سے کوئی یہ سمجھتا کہ فرض اور واجب کو بجالانا جہنم سے نجات اور دخول جنت کیلئے کافی ہے سنتیں اور نوافل کا پڑھنا تو رفع[1] درجات کیلئے ہے لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ میں اپنی عبادات میں اور اللہ تعالیٰ کی طاعات میں اسی لئے مشقتیں

---

[1] **آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی مزید وضاحت:** یہ ماقبل کلام پر تفریع ہے یعنی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب دیتے کہ میری یہ کوشش درجات عالیہ کو حاصل کرنے کیلئے ہے تو اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ سنتوں کا پڑھنا صرف رفع درجات کیلئے ہے لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب کو چھوڑ کر یہ جواب اختیار فرمایا کہ میری یہ کوشش اللہ تعالیٰ کے مزید انعامات کی طرف رغبت اور اس کی ناشکری سے خوف کی وجہ سے ہے۔

اٹھا تا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کی مجھ پر مزید بارش ہو اور اس کی ناشکری نعمت سے میں محفوظ رہوں جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید" اور شکرانہ نعمت کے ضروری ہونے کی طرف اللہ رب العزت نے "واشکروا نعمة الله علیکم ان کنتم ایاه تعبدون" سے اشارہ کیا ہے۔ یہاں واشکروا کا امر وجوب کیلئے ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا ضروری ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب اس لئے اختیار فرمایا کیونکہ انسانی طبیعت میں دینی کاموں میں ضروری ضروری اشیاء پر اقتصار کیا جاتا ہے[1] اور دنیاوی امور میں انہماک اور مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے لہٰذا اگر گذشتہ جواب جو ہم نے ذکر کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمادیتے تو لوگ فرائض وواجبات پر اکتفاء کرتے اور سنتوں اور نوافل کو چھوڑ دیتے اور یہ امید لگائے رہتے کہ ہم جنت میں داخل ہو جائیں گے جہنم سے نجات پا جائینگے لہٰذا درجات عالیہ کے حاصل کرنے کیلئے تکلیف اٹھانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

یہ مشقتِ شدیدہ والی طویل نماز، نمازِ تہجد تھی: (قوله صلّى رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى انتفخت قدماه) یہ نفلی نماز ہے بلکہ تہجد کی نماز ہے جو رات کے آخری حصہ میں ادا فرماتے تھے یہ فرض نماز نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدیوں کی رعایت کیلئے فرض نماز میں خفت کو پسند فرماتے تھے۔

حدیث کے بعض دیگر الفاظ اور ان میں تطبیق: (قوله حتى انتفخت) بعض روایات میں تشققت کے الفاظ ہیں ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ پاؤں کا پھٹنا پھولنے ہی کی تو ایک قسم[2] ہے خلاصہ یہ ہے کہ پاؤں کے پھولنے کی انتہاء اس کے پھٹنے پر ہو جاتی ہے تو پاؤں کا پھٹنا یہ اس کا فرد کامل ہوا (عبدا شکورا) مبالغہ کا صیغہ ہے انتہائی شکرگزار اس جملہ کی باریک بینی مخفی نہیں کیونکہ شکر نعمتوں کے بقدر ہوتا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نعمتیں اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ ہیں تو ان کا شکر بھی بہت ہونا چاہیئے۔

---

[1] ضروریات سے مراد وہ عبادات ہیں جنکا کرنا بندوں پر بہر حال ضروری ہے جیسے فرائض وواجبات......اس سے مراد ان کا مشہور معنی ضروریات دین نہیں ہے جس کی تعریف علامہ شامی رحمہ اللہ نے یہ کی ہے کہ جس کو ہر عامی اور خواص میں سے ہر شخص جانتا ہو کہ یہ دین کا جزء ہے مثلاً توحید رسالت کا اعتقاد پانچ نمازوں کی فرضیت یہ سب ضروریات دین میں ہیں بخلاف وقوف عرفہ سے پہلے جماع کرنے کی صورت میں حج کا فاسد ہونا اور دادی کو میراث کا چھٹا حصہ دینا یہ مسائل ضروریات دین میں سے نہیں ہیں بلکہ ان مسائل کو خواص ہی جانتے ہیں۔ انتہی

[2] یعنی پہلے پاؤں پھولتا ہے اور پاؤں کی پھٹن عموماً اسی پر مرتب ہوتی ہے بلکہ پاؤں کے پھولنے کی انتہاء اس کے پھٹنے ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔ اصل اعتراض کا یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں سوجن بھی چڑھی تھی اور پھٹ بھی گئے تھے۔

باب ماجاء اَنَّ اوَّلَ مايحاسَبُ به العبدُ يوم القيامة الصلاةُ

باب قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا

☆حدثنا عليُّ بن نَصرِبن عليٍّ الجَهضَمِيُّ حَدَّثَنَا سَهلُ بنُ حَمَّادٍ حَدَّثَنَا هَمَّامٌ قال: حدثنی قَتَادَةُ عن الحسن عن حُرَيثِ بن قَبِيصَةَ قال: قدمتُ المدينةَ فقلتُ: اللهمَّ يَسِّرلِی جليساً صالِحاً، قال: فجلستُ الی ابی هريرةَ فقلتُ: اِنِّی سالتُ اللّٰه ان يَرزُقَنِی جليساً صالحاً، فَحَدِّثنِی بحديثٍ سمعتَهُ من رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم، لعلَّ اللّٰهَ ان ينفعَنی به؟ فقال: سمعتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يقولُ: اِنَّ اَوَّلَ مايُحَاسَبُ به العبدُ يوم القيامة من عمله صلاتُه۔ فاِن صَلَحَتُ فقد اَفلَحَ وَاَنجَحَ، واِن فَسَدَتُ فقد خَابَ وخَسِرَ، فَاِنِ انتَقَصَ من فَرِيضَته شئٌ قال الرَّبُّ عزَّ۔وجلَّ: انظُرُوا هل لِعَبدِی مِن تَطَوّعٍ؟ فَيُكَمَّلُ بها ماانتَقَص من الفريضَةِ، ثم يكونُ سائرُ عملِهِ علی ذلك۔

قال: وفی الباب عن تميم الدَّارِیِّ۔ قال ابو عيسی: حديث ابی هريرة حديث حسن غريب من هذا الوجهِ۔وقد رُوِیَ هذا الحديثُ من غير هذا الوجه عن ابی هريرةَ۔وقد رَوَی بعضُ اصحاب الحسن عن الحسن عن قَبِيصَةَ بن ذويبٍ غيرَ هذا الحديث۔والمشهور هو قبيصة بن حريث۔

ورُوِیَ عن انس بن حَكِيمٍ عن ابی هريرةَ عن النبیِّ صلی اللّٰه عليه وسلم نحوُ هذَا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت حریث بن قبیصہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو میں نے دعا مانگی ''اے اللہ مجھے نیک ہمنشین عطا فرما'' فرماتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ (ان کی مجلس میں) بیٹھ گیا۔ اوران سے کہا میں نے (یہاں پہنچ کر) اللہ تعالیٰ سے اچھے ہمنشین کا سوال کیا تھا لہٰذا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنایئے جو آپ نے خود سنی ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچائے (یعنی میں اس پر عمل کروں) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جس عمل کا حساب ہوگا وہ نماز ہے۔ اگر یہ صحیح ہوئی تو وہ کامیاب ہوگیا اور نجات پالی اور اگر یہ خراب ہوئی تو یہ نقصان اور گھاٹے میں رہا۔ اگر فرائض میں کچھ کمی رہی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندے کے نوافل کو دیکھو (اگر ہوں تو ان سے اس کی کمی کو پورا کردو) تو ان نوافل کے

ذریعہ فرائض کی کمی کو پورا کیا جائیگا۔ پھر اس کے ہر عمل کا اسی طرح حساب ہوگا۔

اس باب میں تمیم داری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

قبیصہ بن حریث راوی کی تحقیق: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث اس طریق سے حسن غریب ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کئی سندوں سے مروی ہے۔ حضرت حسن کے بعض شاگرد حسن سے اور وہ قبیصہ بن ذویب سے اس حدیث کے علاوہ احادیث نقل کرتے ہیں۔ اور مشہور قبیصہ بن حریث ہی سے یہ روایتِ باب ہے[1]۔ انس بن حکیم اسی کے ہم معنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

---

[1] از مترجم: قبیصہ نامی راویوں کی ایک طویل فہرست ہے ان میں سے ایک راوی قبیصہ بن حریث ہے اس راوی کو قلب کر کے حریث بن قبیصہ بھی کہہ دیا جاتا ہے انسے حسن بصری نقل کرتے ہیں۔ ابن حبان نے انکو ثقہ فرمایا ہے اور ابو الحسن عجلی نے بھی انکو ثقہ تابعی فرمایا حافظ نے اس راوی پر د، ت، س کی علامت لگائی ہے۔ ص ۳۴۵ تہذیب ج ۸۔ اور بظاہر مذکورہ بالا حدیث انہی راوی سے ہے۔ دوسرے راوی قبیصہ بن ذویب ہیں یہ راوی بھی تقریباً ان کے معاصر ہیں۔ حافظ نے اگلے صفحے ۳۴۶/۸ پر انکا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے ہندوستانی نسخے اور تحفۃ الاحوذی مطبوعہ ملتان میں یہی عبارت ہے۔ وقد روی بعض اصحاب الحسن عن قبیصة بن ذویب غیر ھذا الحدیث یعنی ان دوسرے قبیصہ سے (قبیصہ بن ذویب سے) اس حدیث کے علاوہ روایت ہے لیکن روایت باب تو قبیصہ بن حریث ہی سے ہے۔ حافظ نے حریث بن قبیصہ راوی پر ت، س کی علامت لگائی ہے اور اسمیں صرف یہ لکھا ہے کہ حریث بن قبیصہ کا تذکرہ قبیصہ بن حریث میں آرہا ہے۔ ۲۳۴/۲۔ تہذیب۔ اور قبیصہ بن حریث میں تصریح ہیکہ دونوں ایک ہی راوی کے دو نام ہیں۔

البتہ یہ امر قابل اشکال ہے کہ حافظ نے تہذیب ۳۴۵/۸ پر امام ترمذیؒ کا درج بالا کلام اس طرح نقل کیا ہے۔ قال الترمذی فی حدیث حریث بن قبیصہ عن ابی ھریرۃ رواہ بعض اصحاب الحسن عنہ عن قبیصہ بن حریث والمشھور ھو قبیصة بن حریث۔

غور کیجئے! یہاں غیر ھذا الحدیث کا جملہ نہیں ہے بلکہ رواہ بعض اصحاب الحسن الخ ہے۔ یعنی یہی مندرجہ بالا روایت حسن بصری کے بعض شاگردوں نے حسن سے اور انہوں نے قبیصہ سے نقل کی ہے۔ تو اب امام ترمذیؒ کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ حسن بصری کے شاگردوں میں یہ اختلاف واقع ہوا کہ حسن کے شیخ کا نام قبیصہ ہے یا حریث؟ کسی شاگرد نے قبیصہ بن حریث کہا اور دوسرے شاگرد نے حریث بن قبیصہ کہا اور امام ترمذیؒ نے قبیصہ بن حریث نام کو ترجیح دی والمشھور ھو قبیصة بن جریث والے جملے سے ...... لیکن یہ امر اب بھی قابل تحقیق ہیکہ اگر یہ دونوں نام ایک ہی راوی کے ہیں مسمّٰی ایک ہے اور اسم الگ الگ تو پھر حافظ نے انکے تذکرہ میں روی عن سلمة بن المحبق پر اکتفا کیوں فرمایا اسکے بعد وعن ابی ھریرۃ بھی فرماتے۔ بہر حال انکی حدیث کوئی واضح نہیں اسی وجہ سے حافظ نے تہذیب میں قال البخاریؒ فی حدیثہ نظر نقل فرمایا۔ اس موقع پر جامع ترمذی کا نسخہ مطبوعہ بیروت بتحقیق الشیخ احمد شاکر القاضی الشرعی بھی قابل مطالعہ ہے شیخ احمد شاکر نے بھی ویحتاج الامر الی تحقیق پر کلام ختم فرمایا ہے۔

﴿تشریح﴾

یہ باب ماقبل باب کیلئے بمنزلہ دلیل کے ہے: یعنی عبادات میں سب سے پہلا حساب نماز کا ہوگا اور یہ باب پہلے باب کیلئے بمنزلہ دلیل کے ہے کیونکہ جب قیامت والے دن بندے سے سب سے پہلے نماز کے متعلق پوچھ ہوگی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں مشقتیں اٹھانے کی وجہ مخفی نہیں۔

مختلف احادیث میں تطبیق: (اول ما یحاسب به العبد یوم القیامة الصلوٰة) اس حدیث میں مراد حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا اور جس روایت میں آتا ہے کہ سب سے پہلے انسانوں کے خون کا حساب لیا جائیگا تو وہ حدیث حقوق العباد کے متعلق ہے[1] اسی کے آگے " فان صلحت فقد افلح وانجح " یعنی اگر نماز کما حقہ ادا کی تو وہ اپنے حساب میں کامیاب ہوگا ورنہ اپنے حساب میں ناکام خائب وخاسر لوٹے گا۔

لفظ شیئا کی ترکیبی حیثیت: (فان انتقص من فریضته شیئا) شیئا منصوب ہے تمیز ہونے کی وجہ سے اور اس روایت میں لفظ فریضۃ نکرہ ہے[2]۔

نوافل فرائض کے مکملات ہیں: (فیکمل بها ماانتقص من الفریضة) نوافل کبھی فرائض کی اس کمی کو دور کرتے ہیں فرائض میں جو[3] کیفا کمی واقع ہوگئی تھی اور کبھی کماً جو کمی واقع ہوئی تھی اس کو بھی دور کرتے ہیں۔

---

[1] لہٰذا حدیث باب اور دوسری حدیث صحیح اول ما یقضی بین الناس الدماء میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ بذل المجہود میں دوسری توجیہ یہ ذکر کی ہے کہ محاسبہ ایک الگ فعل ہے اور فیصلے کا ہونا یہ الگ فعل ہے تو سب سے پہلے نماز کا محاسبہ ہوگا اور فیصلہ قتل کے متعلق سب سے پہلے سنایا جائیگا۔

[2] یہ لفظ مصدر ہونے کی وجہ سے بھی منصوب ہوسکتا ہے جیسا کہ صاحب مدارک وغیرہ نے واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا کے تحت لکھا ہے کہ لفظ شیئا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ سب ترکیبیں اس وقت صحیح ہونگی جب انتقص فعل لازمی ہو اور اگر انتقص فعل متعدی ہو تو شیئا اس کا مفعول بنیگا چنانچہ علامہ مجد الدین لکھتے ہیں کہ انقصه و نقصه اور انتقصه و نقصه ان سب افعال کا ایک ہی معنی ہیں کہ اس نے کمی کردی پس وہ شئی کم ہوگئی پس معلوم ہوا کہ انتقص متعدی بھی مستعمل ہے۔

[3] یعنی فرائض میں جو کمی کماً رہ گئی یا کیفا۔ نوافل ان تمام نقصانات کی تلافی کردیتی ہے۔

نوافل کے ذریعہ تکمیل نقصان کماً کی ہوگی یا نقصان کیفا کی؟: کی یہ مسئلہ اختلافی ہے جمہور نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے قول کے موافق مذہب اختیار کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ فرض نماز میں جو کیفیت خشوع وخضوع کی کمی رہ گئی نوافل اس کیلئے مکملات بن جاتی ہیں اور اگر فرض نماز کماً رہ گئی بایں طور کہ اس نے بالکل پڑھی ہی نہیں تو نوافل اسکے لئے مکمل نہیں بنیں گی۔

چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ ستر رکعت نفل ایک رکعت فرض کے بدلے میں قبول کی جائیگی۔

خصم کے استدلال کی نفی: کوئی یہ نہ سمجھے کہ کثرت سجود طول قیام سے افضل ہے لہٰذا چھوٹی چھوٹی رکعت زیادہ پڑھنی چاہیئے کیونکہ ایک رکعت چاہے کتنی ہی لمبی ہو ایک رکعت ہی شمار ہوگی۔ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ نماز کی بعض رکعات ایسی ہوتی ہیں جو چالیس پچاس رکعت نفل کے برابر ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔

باب ماجاء فیمن صلّٰی فی یومٍ ولیلۃٍ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رکعۃً من السُّنَّۃِ و مالَہُ فِیہِ من الفضلِ

باب دن اور رات میں بارہ رکعتیں (سنن موکدہ) پڑھنے کی فضیلت

☆حدثنا محمد بن رافعٍ النَّیسَابُورِیُّ حَدَّثَنَا اسحق بن سلیمانَ الرازیُّ حَدَّثَنَا المغیرۃُ بن زیادٍ عن عطاءٍ عن عائشۃَ قالت:قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من ثَابَرَ علی ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رکعۃً من السُّنَّۃِ بَنَی اللّٰہ لہ بیتاً فی الجنۃ: اَرْبَعِ رکعاتٍ قبل الظھرِ ، ورکعتین بعدھا، ورکعتین بعد المغربِ، ورکعتین بعد العشاءِ ، ورکعتین قبل الفجر۔قال: وفی الباب عن اُمِّ حَبِیبَۃَ، وابی ھریرۃَ، وابی موسی، وابن عمرَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عائشۃَ حدیث غریبٌ من ھذا الوجہِ۔ ومغیرۃُ بن زیادٍ قد تکلَّمَ فیہ بعضُ اھل العلم من قِبَلِ حفظہ۔

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا مُؤَمَّلٌ ھو بنُ اسمٰعیلَ حَدَّثَنَا سفیانُ الثَّوْرِیُّ عن ابی اسحق عن المُسَیَّبِ بن رافعٍ عن عَنْبَسَۃَ بن ابی سفیانَ عن ام حَبِیبَۃَ قالت: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مَن صلّٰی فی یومٍ ولیلۃٍ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رکعۃً بُنِیَ لہ بیتٌ فی الجنۃِ: اربعاً قبلَ الظھرِ، ورکعتین بعدھا، ورکعتین بعد المغربِ ورکعتین بعد العشاء، ورکعتین قبل الفجر صلاۃ الغداۃ۔

قال ابو عیسی: وحدیث عنبسۃَ عن امِّ حبیبۃَ فی ھذا الباب حدیث حسن صحیح۔

وقد رُوِی عن عنبسۃَ من غیر وجہٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہمیشہ بارہ رکعات سنت پر

مواظبت کرے، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کیلئے ایک محل بنائے گا۔ چار (سنتیں) ظہر سے پہلے دو رکعت ظہر کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشاء کے بعد اور دو رکعتیں فجر سے پہلے۔

اس باب میں ام حبیبہ، ابو ہریرہ، ابوموسیٰ، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس سند سے غریب ہے اور مغیرہ بن زیاد کے حفظ میں بعض اہل علم نے کلام کیا ہے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دن رات میں بارہ رکعتیں (سنت) ادا کرے اس کیلئے جنت میں ایک گھر بنایا جائے گا۔ چار رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو ظہر کے بعد اور دو رکعتیں مغرب کے بعد اور دو رکعتیں عشاء کے بعد اور دو رکعتیں فجر کی نماز سے پہلے جو نماز ہے صبح کی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عنبسہ کی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث اس باب میں حسن صحیح ہے اور یہ حدیث کئی سندوں سے عنبسہ ہی سے مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

شوافع کے یہاں سنن ونوافل دو دو رکعت الگ سلام سے افضل ہے جبکہ احناف کے نزدیک ایک سلام سے افضل ہے: ہمارے نزدیک نوافل اور سنتوں کی جو چار رکعت پڑھی جائیگی وہ ایک سلام کے ساتھ افضل ہیں اور شوافع کے نزدیک دو سلام کے ساتھ کیونکہ حدیث میں صلوٰۃ اللیل والنہار مثنیٰ مثنیٰ وارد ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی دلیل اس کے موقع پر انشاء اللہ آئیگی۔

صلوٰۃ الغداۃ کے منصوب ہونے کی وجہ: (قولہ صلوٰۃ الغداۃ) یہ لفظ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا منصوب بنزع الخافض ہے۔ یعنی فجر سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو نماز پڑھتے تھے وہ دو رکعتیں دن کی نماز کا حصہ ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "صلوٰۃ الغداۃ" من الفجر کا بدل ہو۔ اس صورت میں لازم آئیگا کہ یہ لفظ مجرور ہو لیکن روایت سے یہ لفظ منصوب معلوم ہوتا ہے اس لفظ صلوٰۃ الغداۃ کی تصریح اس لئے کی تاکہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ رکعتین قبل الفجر سے مراد تہجد کی نماز ہے (حالانکہ اس سے مراد تو فجر کی سنتیں ہیں)۔

باب ماجاء فی رکعتی الفجر من الفضلِ

باب فجر کی دوسنتوں کی فضیلت

☆حدثنا صالح بن عبد اللّٰہ التِّرمِذِیُّ حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن قَتَادَةَ عن زُرَارَةَ بن اَوْفٰی عن سعد بن هشام عن عائشةَ قالت: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: رَکْعَتَا الفجرِ خیرٌ من الدنیا وما فیھا۔ قال: وفی الباب عن علیٍّ، وابن عمرَ، وابن عباسٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث عائشةَ حدیث حسن صحیحٌ۔

وقد رَوَی احمدُ بن حنبلٍ عن صالح بن عبد اللّٰہ التِّرمِذِیِّ حدیثاً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فجر کی دوسنتیں دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سب سے بہتر ہیں۔

اس باب میں حضرت علی، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی صالح بن عبداللہ ترمذی رحمہ اللہ سے ایک حدیث نقل کی ہے (لہٰذا صالح راوی ثقہ ہوا)۔

﴿تشریح﴾

فجر کی سنتوں کی فضیلت: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فجر کی سنتیں بقیہ تمام نمازوں، تہجد، سنتوں وغیرہ سے افضل ہے کیونکہ ہر تسبیح، تکبیر اور تہلیل دنیا و مافیہا سے بہتر ہے لہٰذا ایک یا دو رکعتیں تو بطریق اولیٰ دنیا و مافیہا سے بہتر ہونگی لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی سنتیں اپنے اعتبار سے یہ فضیلت رکھتی ہیں نہ کہ دوسری سنتوں کے تقابل کے اعتبار سے۔ باقی اس کا دوسری سنتوں کے مقابلہ میں زیادہ مؤکد ہونا دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوھما ولو طردتکم الخیل"۔

غرضِ مصنف: (وقد روی احمد بن حنبل عن صالح بن عبداللہ الترمذی حدیثا) اس کا مقصد یہ ہے کہ صالح ثقہ راوی ہیں کیونکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان سے حدیث نقل کی ہے

باب ماجاء فی تخفیفِ رکعتی الفجرِ

وماکان النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ فیھما

فجر کی سنتوں میں تخفیف کرنا (ہلکا کر کے پڑھنا) اوران میں قرأت کا بیان

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ وابو عَمَّارٍ قالا: حَدَّثَنَا ابو احمدَ الزُّبَیْرِیُّ حَدَّثَنَا سفیانُ عن ابی اسحٰق عن مُجَاھِدٍ عن ابن عمرَ قال: رَمَقْتُ النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شھراً، فکان یقرأُ فی الرکعتین قبلَ الفجر بِ قُلْ یٰاَیُّھَاالْکَافِرُوْنَ و قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔

قال: وفی الباب عن ابن مسعود، وانسٍ، وابی ھریرۃَ، وابن عباس، وحفصۃ، وعائشۃَ

قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث حسن۔

ولا نعرفہ من حدیث الثَّوْرِیِّ عن ابی اِسحٰقَ اِلا من حدیث ابی احمدَ، والمعروفُ عند الناسِ حدیث اسرائیل عن ابی اِسحٰقَ۔وقد روی عن ابی احمد عن اسرائیل ھذا الحدیث ایضاً۔

وابو احمدَ الزُّبَیْرِ ثقۃٌ حافظٌ۔ قال سمعتُ بُنْدَاراً یقول: مارایتُ احداً احسنَ حفظاً من ابی احمدَ الزُّبَیْرِیِّ۔ وابو احمدَ اسمہ محمدُ بن عبد اللّٰہ بن الزُّبَیْرِ الکُوفِیُّ الاسَدِیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں ایک ماہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغور دیکھتا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دوسنتوں میں سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

اس باب میں ابن مسعود، انس، ابو ہریرہ، ابن عباس، حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور ہم اسے بواسطہ سفیان ثوری، ابواسحٰق سے صرف ابواحمد کی روایت سے جانتے ہیں اور لوگوں کے نزدیک معروف یہ ہے کہ اسرائیل ابواسحٰق سے روایت کرتے ہیں۔ (نہ کہ سفیان ثوری ابواسحٰق سے۔ ازمترجم)۔

ابواحمد سے بھی یہ حدیث بواسطہ اسرائیل روایت کی گی ہے اور ابواحمد زبیری ثقہ اور حافظ ہیں۔ (اسلئے ہوسکتا ہے کہ دونوں راوی ابواسحٰق سے ناقل ہوں)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے بندار سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابواحمد زبیری سے بہتر حافظ نہیں دیکھا ان کا نام محمد بن عبداللہ بن زبیر اسدی کوفی ہے۔

﴿تشریح﴾

فجر کی سنتوں کی تخفیف کی وجہ: فجر کی سنتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مختصر ادا فرماتے تا کہ فرض نماز کی ادائیگی میں کمزوری نہ ہو کیونکہ فجر کی فرض رکعتوں میں لمبی قرأت کرنا سنت ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قال ابو عیسیٰ حدیث ابن عمر حدیث حسن و لا نعرفه من حدیث الثوری عن ابی اسحق) مقصد یہ ہے کہ تمام راوی اس روایت کو عن اسرائیل عن ابی اسحٰق نقل کرتے ہیں لیکن ابواحمد الزبیری نے اس کو ایک روایت میں سفیان ثوری کے واسطہ سے عن ابی اسحٰق نقل کیا ہے۔ لیکن خود ابواحمد الزبیری نے دوسری روایت میں عن اسرائیل عن ابی اسحٰق نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ آگے چل کر یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ میں نے بندار سے سنا کہ ابواحمد الزبیری جیسا حافظ حدیث میں نے نہیں دیکھا لہٰذا ابواحمد ثقہ[۲] اور حافظ الحدیث ہیں انہوں نے اس روایت کو دونوں طرح نقل کیا ہے ان سے کوئی غلطی یا سہو نہیں ہوا۔

باب ماجاء فی الکلام بعد رکعتَیِ الفجرِ

باب فجر کی سنتوں کے بعد گفتگو کرنا

☆حدثنا یوسف بن عیسی المَرْوَزِیُّ حَدَّثَنَا عبدُ اللّٰہِ بن ادریسَ قال: سمعتُ مالکَ بن انسٍ عن ابی النَّضرِ عن ابی سَلَمَۃَ عن عائشۃَ قالت: کانَ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِذا صلّٰی رکعتَیِ الفجرِ، فاِنْ کانت له اِلَیَّ حاجۃٌ کلَّمنِی، واِلّا خرجَ اِلی الصلاۃِ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔وقد کرِہَ بعضُ اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وغیرھم الکلامَ بعد طلوعِ الفجرِ حتی یصلِّیَ صلاۃَ الفجرِ، اِلّا ماکان من ذِکر اللّٰہ اوما لابُدَّمنه۔وھو قولُ احمد، واسحٰقَ۔

---

[۱] حدیث باب کے متعلق ایک مضبوط اشکال ہے جو باب ماجاء فی الرکعتین بعد المغرب میں آ رہا ہے۔

[۲] یہ کلام بندار کے قول پر متفرع ہے یعنی جب ابواحمد حافظ الحدیث ہیں تو اس روایت کو ان کی طرف غلطی کی صورت میں منسوب نہیں کرنی چاہیئے کہ ان سے غلطی ہوئی۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی سنتیں پڑھ لیتے تو اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہوتا تو بات کر لیتے ورنہ نماز کیلئے چلے جاتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے بعض علماء صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہم نے طلوع فجر کے بعد فجر کی نماز پڑھنے تک ذکر اللہ اور ضروری گفتگو کے علاوہ گفتگو کرنے کو مکروہ کہا ہے۔ امام احمد اور اسحٰق رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

فجر کی سنتوں کے بعد غیر ضروری بات چیت کرنا ممنوع ہے: فجر کی سنتوں کی مشروعیت اسلئے ہے کہ دل پر جو نیند کی غفلتیں طاری ہیں ان کو ختم کیا جائے اور اس وقت میں باتیں کرنا مزید غفلتوں کو پیدا کرتا ہے لہٰذا سنتوں کے بعد غیر ضروری بات نہیں کرنی چاہیئے بعض نادان سمجھتے ہیں کہ اگر فجر کی سنتوں کے بعد باتیں کر لیں تو سنتوں کو لوٹانا ضروری ہے تو یہ فحش غلطی ہے[1]۔

باب ماجاء لاصلاةَ بعد طلوع الفجر اِلا ركعتينِ

باب اس بارے میں کہ طلوع فجر کے بعد دوسنتوں کے علاوہ کوئی نماز نہیں

☆حدثنا احمد بن عَبْدَةَ الضَّبِّيُّ حَدَّثَنَا عبد العزيز بن محمدٍ عن قُدَامَةَ بن موسى عن محمد بن الحُصَيْنِ عن ابي عَلْقَمَةَ عن يَسَارٍ مولى ابنِ عمر عن ابن عمرَ اَنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: لا صلاةَ بعد الفجرِ اِلَّا سجدتينِ۔

ومَعْنَى هذا الحديثِ اِنَّما يقول: لاصلاةَ بعد طلوع الفجر اِلاركعتي الفجر۔

---

[1] فرض سے قبل سنتوں کے بعد کلام کرنے سے کیا سنتیں باطل ہو جاتی ہیں؟: درمختار میں ہے کہ اگر فرض اور اس کی سنتوں کے درمیان باتیں کریگا تو سنتیں باطل تو نہیں ہونگی لیکن اس کا ثواب کم ہو جائیگا۔ دوسری قول میں سنتیں بالکل ہی باطل ہو جائینگی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دوسرے قول کے مطابق اگر یہ سنن قبلیہ ہیں تو ان کا اعادہ کریگا اور اگر یہ سنن بعدیہ ہیں تب بظاہر یہ نفل بن جائینگی لیکن اس قول کے مطابق اس کے اعادہ کا حکم نہیں دیا جائیگا۔

قال: وَفِی الباب عن عبد اللّٰہ بن عَمرٍو وحفصةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث غریب لانعرفُه اِلّا من حدیثِ قُدامَةَ بن موسی، ورَوَی عنه غیرُ واحدٍ۔وھو مَا اجتَمَعَ، علیه اھلُ العلم: کرھو ان یصلِّیَ الرجلُ بعد طلوع الفجرِ اِلا رکعتی الفجرِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طلوع فجر کے بعد دوسنتوں (سنت موکدہ) کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔

اس باب میں عبداللہ بن عمر اور حفصہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث غریب ہے۔ہم اس حدیث کو قدامہ بن موسیٰ کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور ان سے کئی حضرات روایت کرتے ہیں اور اسی پر اہل علم کا اجماع ہے کہ وہ طلوع فجر کے بعد فجر کی سنتوں کی دو رکعتوں کے علاوہ کوئی اور نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے ہیں۔اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد فجر کی دوسنتوں کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھی جائے۔

﴿تشریح﴾

فجر کی سنتوں کے بعد نوافل کی ممانعت کی تصریح کی وجہ: اس وقت میں چونکہ باتوں کے ممنوع ہونے کی وجہ سے کوئی شخص یہ سمجھے کہ میں اس وقت میں نفل پڑھ لیا کروں کیونکہ یہ ذکر کی اقسام میں سے سب سے **افضل قسم** ہے اور ذکر کرنے کا تو حکم دیا گیا ہے لہٰذا حدیث باب میں اس خیال پر رد کرتے ہوئے صراحۃً نوافل پڑھنے سے منع کیا گیا۔

الاسجدتین میں چار احتمالات اور اس مقام پر معنی مقصودی کی تعیین: "الا سجدتین" میں چار احتمال ہیں: ۱۔طلوع فجر کے بعد صرف دوسجدے کرسکتا ہے سجدہ سے مراد معنی حقیقی وضع الجبهة علی الارض ہے[۱] لیکن یہ احتمال یہاں مراد نہیں، ۲۔لاصلوٰۃ بعد الفجر کا مطلب فجر کی نماز کے بعد صرف دوسجدے کرنا جائز ہیں سجدہ سے اسکے حقیقی معنی مراد لئے جائیں یہ احتمال بھی یہاں مراد نہیں، ۳۔ فجر کی نماز کے بعد صرف دو رکعتوں کی اجازت ہے یہ معنی بھی یہاں مراد نہیں

---

[۱] کیونکہ اس معنی کی صورت میں تو یہ لازم آتا ہے کہ طلوع فجر کے بعد صرف دوسجدے مشروع ہیں حالانکہ سنتوں میں چار سجدے اور فرض نماز میں چار سجدے مشروع ہیں اسی طرح دوسرا احتمال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ فجر کی نماز کے بعد کوئی نماز بھی صحیح نہیں تو دوسجدے کے استثناء کی کیا وجہ؟ تو حضرت گنگوہیؒ نے ان دونوں معنوں کے حدیث باب میں مراد نہ ہونے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی کیونکہ اسکی وجہ بالکل ظاہر تھی۔

کیونکہ فجر کی نماز کے بعد مطلقاً نوافل کی ممانعت ہے تو دو رکعتوں کا یہ استثناء کیسے صحیح ہوسکتا ہے، ۴۔ طلوع فجر کے بعد صرف دو رکعت سنت پڑھی جاسکتی ہے یہاں پر یہی معنی مراد ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے "ومعنی هذا الحدیث انما یقول لا صلوة بعد طلوع الفجر الا رکعتین" سے حدیث باب کا یہی چوتھا معنی بیان کیا ہے۔

باب ماجاء فی الاضطجاع بعد رکعتی الفجر

باب فجر کی دوسنتوں کے بعد لیٹنے کے بارے میں

☆ حَدَّثَنَا بِشْرُ بن مُعَاذٍ الْعَقَدِیُّ حَدَّثَنَا عبد الواحد بن زیادٍ حَدَّثَنَا الاعمش عن ابی صالحٍ عن ابی هریرةَ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اِذا صلّٰی احدُ کم رکعتیِ الفجرِ فَلْیَضْطَجِعْ علی یمینهِ ۔ قال : وفی الباب عن عائشة۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیحٌ غریبٌ من هذاالوجه۔

وقد رُوِیَ عن عائشةَ: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم کان اِذا صلّٰی رکعتی الفجرِ فی بیته اضْطَجَعَ علی یمینه۔ وقد رأی بعضُ اهل العلم ان یَفْعَلَ هذا استحباباً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص فجر کی دو سنتیں پڑھ لے تو دائیں کروٹ پر لیٹ جائے۔

اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس طریق سے حسن صحیح غریب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی سنتیں گھر میں پڑھتے تو اپنی دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ مستحب سمجھتے ہوئے ایسا کرنا چاہیئے۔

﴿تشریح﴾

تہجد کے بعد فجر کی سنتوں سے پہلے داہنی کروٹ پر لیٹنے کا حکم اور اسکی حکمت: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تہجد کی نماز کے بعد کی فجر کی سنتوں سے پہلے بھی تھوڑی دیر لیٹنے کا ثبوت ہے جیسا کہ فجر کی سنتوں کے بعد فرض سے پہلے لیٹنے کا

ثبوت ہے۔شافعیہ کے نزدیک یہ لیٹنا سنت موکدہ[1] ہےاورابن عمر رضی اللہ عنہماوغیرہ دیگر ائمہ کے نزدیک بدعت ہے لیکن راجح قول میں یہ فعل استحبابی ہے خصوصاً ایسے شخص کیلئے جورات بھرتہجد میں گزارے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر مداومت نہیں فرمائی۔ داہنی کروٹ پر لیٹنے کی حکمت یہ ہے کہ اس صورت میں دل معلق[2] رہتا ہےلہٰذا اس پر غفلت طاری نہیں ہوتی بخلاف بائیں کروٹ پر سونے کے۔اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ اپنا سرزمین پر نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنی کہنی پر سر رکھتے تھےاور کہنی زمین پر ہوتی تھی۔

باب ماجاء اذا اقیمت الصلاةُ فلا صلاةَ اِلَّا المکتوبةُ

باب جب اقامت شروع ہوجائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں

☆حدثنا احمد بن مَنیعٍ حَدَّثَنَا رَوْحُ بن عُبَادَةَ حَدَّثَنَا زکریاً بن اسحق حَدَّثَنَا عمرُو بن دینارٍ قال: سمعت عطاءَ بن یَسَارٍ عن ابی هریرةَ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم:اِذا اُقیمتِ

---

[1] اس مسئلہ میں علماء کے چھ اقوال ہیں جنکی تفصیل بذل اوراوجز میں ہے۔اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے کلام میں یہ بات آرہی ہے کہ اس لیٹنے کا مقصد یہ ہے کہ تہجد پڑھنے کے بعد کچھ دیر آرام کیا جائے اور یہی قول راجح ہے نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مختلف تھی کبھی فجر کی سنتوں کے بعد آرام فرماتے اور کبھی پہلے۔(از مترجم: حضرت شیخ نے اوجز المسالک الجزء الثانی ص ۳۲۸ صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الوتر کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ فجر کی دوسنتیں پڑھنے کے بعد اضطجاع کے متعلق چھ اقوال ہیں: (۱) امام شافعی اور انکے اصحاب کے مذہب میں سنت ہے، (۲) صحابہ کرام کی ایک جماعت کے نزدیک یہ اضطجاع مستحب ہے اور مغنی میں امام احمد کا یہی مذہب لکھا ہے اور امام احمدؒ سے عدم سنیت کا قول بھی مروی ہے۔ لان ابن مسعود رضی اللہ عنہ انکرہ۔ (۳) امام ابن حزم ظاہری کے نزدیک واجب مفترض ہے لہٰذا جس نے اضطجاع بعد رکعتی الفجر عمداً نسیاناً چھوڑ دیا اسکی فجر کی نماز نہ ہوگی۔ (۴) ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ بدعت ہے، (۵) حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خلاف اولیٰ ہے۔ (۶) جو شخص تہجد پڑھ کر تھک گیا ہو اسکے لئے استراحت کی نیت سے لیٹنا مستحب ہے اور اسکے علاوہ کیلئے مستحب نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جن ائمہ نے اس اضطجاع کو فجر کی سنتوں کے تابع قرار دیکر سنتوں اور فرض میں فصل کیلئے مشروع قرار دیا انہوں نے اس اضطجاع کو بدعت کہا ہے اور جن علماء کے نزدیک یہ اضطجاع تہجد کی نماز کے بعد استراحت کیلئے ہے تو انکے نزدیک یہ مندوب ہے چاہے یہ فجر کی دوسنتیں پڑھنے کے بعد ہو اگر سنتیں اول وقت میں پڑھی جائیں یا پہلے استراحت کرے اور سنتیں بعد میں پڑھے۔ص ۳۲۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

[2] کیونکہ جب دل بائیں جانب ہے تو بائیں کروٹ لینے کی صورت میں سارا بوجھ دل پر پڑیگا اسی لئے طبی اعتبار سے بھی بائیں کروٹ پر سونا نقصان دہ ہے۔

الصلاةُ فلا صلاةَ اِلَّا المكتوبةُ۔

قال:وفی الباب عن ابن بحينة، وعبداللّٰه بن عمرٍو، وعبد اللّٰه بن سَرْجِسَ،وابنِ عباسٍ، وانسٍ۔

قال ابوعيسى: حديث ابی هريرةَ حديث حسن۔وهكذا رَوَى ايوبُ ورَوْقَاءُ بن عُمَرَ وزيادُ بن سعدٍ،واسمٰعيلُ بن مُسْلِمٍ، ومحمد بن جُحَادَةَ: عن عمرو بن دينارٍ عن عطاء بن يسارٍ عن ابی هريرة عن النبیِّ صلى اللّٰه عليه وسلم۔ورَوَى حمادُ بن زيدٍ وسفيانُ بن عيينة عن عمرو بن دينارٍ فلم يَرْفَعَاهُ۔ والحديث المرفوعُ اصحُّ عندنا۔ والعملُ على هذا عند بعض اهل العلم من اصحاب النبی صلى اللّٰه عليه وسلم وغيرِهم: اِذا اقيمتِ الصلاةُ ان لَّا يصلِّيَ الرجل اِلا المكتوبةَ۔

وبه يقول سفيانُ الثوریُّ، وابن المباركِ ،الشافعیُّ، واحمدُ ، واسحٰقُ۔وقد رُوِىَ هذا الحديث عن ابی هريرة عن النبی صلى اللّٰه عليه وسلم من غير هذا الوجهِ۔

رواه عَيَّاشُ بن عَبَّاسٍ القِتْبَانِیُّ المصریُّ عن ابی سلَمة عن ابی هريرة عن النبیِّ صلى اللّٰه عليه وسلم نحو هذا۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اقامت شروع ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔

اس باب میں ابن بحینہ، عبداللہ بن عمرو، عبداللہ بن سرجس، ابن عباس اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔
امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوہریرہ حسن ہے اور ایوب، ورقاء بن عمر، زیاد بن سعد، اسماعیل بن مسلم، محمد بن جحادة، بھی عمرو بن دینار سے وہ عطاء بن یسار سے وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

اور حماد ابن زید، سفیان بن عیینہ، عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہیں کہ یہ حضرات اسے مرفوع نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک مرفوع حدیث اصح ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث اس کے علاوہ بھی کئی سندوں سے مروی ہے۔ عیاش بن عباس قتبانی مصری نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ اس حدیث پر صحابہ کرام وغیرہ اہل علم کا عمل ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو کوئی شخص فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب حنابلہ اور شافعیہ اور دیگر فقہاء کے مذہب[1] پر صراحۃً دال ہے۔

خصم کے استدلال کا جواب: بیہقی کی روایت میں اس استثناء (الا المکتوبۃ) سے استثناء مروی[2] ہے جیسا کہ عینی نے شرح بخاری میں ذکر کیا ہے (یعنی فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ الا رکعتی الفجر) تو احناف اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ نیز احناف کی دلیل[3] یہ ہے کہ عبادلہ ثلٰثہ ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہم اقامت کے شروع ہونے کے بعد بھی

---

۱ **فجر کی سنتوں کے پڑھنے کے متعلق دو اختلافی مسئلے ہیں:** یعنی فقہاء میں سے شافعیہ، حنابلہ کا یہی مذہب ہے نہ کہ اصحاب ظواہر کا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہاں پر دو اختلافی مسئلے ہیں: ۱۔ اگر اقامت شروع ہو جائے اور کوئی شخص سنتوں وغیرہ میں مشغول ہو تو اہل ظواہر کے ہاں سنتیں بالکل باطل ہو جائینگی اس کو سلام پھیرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر اگر اس پر صرف سلام باقی ہو اور اقامت شروع ہو جائے تب بھی یہی مسئلہ ہے لیکن جمہور ائمہ اربعہ کے ہاں یہ نماز جو پڑھ رہا ہے صحیح قرار دی جائیگی نفس اقامت سے باطل نہیں ہوگی۔ ۲۔ اگر اقامت شروع ہو جائے تو سنتیں خصوصاً فجر کی سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں یا نہیں تو شافعیہ حنابلہ کے نزدیک فجر کی سنتیں ایسی حالت میں بالکل نہیں پڑھیگا مالکیہ کے نزدیک اگر اس کو پہلی رکعت نکلنے کا اندیشہ ہو تب تو فجر کی سنتیں نہیں پڑھیگا اور اگر اسے یقین ہو کہ پہلی رکعت نہیں نکلے گی تو مسجد کے باہر سنتیں پڑھ سکتا ہے یہی مذہب حنفیہ کا بھی ہے البتہ ہمارے نزدیک جب تک دوسری رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو اس وقت تک فجر کی سنتیں پڑھ سکتا ہے کمافی المغنی۔

ائمہ کا اختلاف: سنتوں کی ممانعت کی علت کیا ہے؟: اصل اختلاف یہ ہے کہ حدیث باب میں سنتوں کے پڑھنے کی ممانعت کی علت کیا ہے؟ بعض علماء نے کہا ہے کہ جب اقامت شروع ہو جائیگی تو فرض نماز کے علاوہ کسی دوسری نماز میں مشغول ہونا لازم آئیگا اس لئے مطلقاً سنتوں اور نوافل میں مشغول ہونا منع ہے اور جن علماء نے یہ علت نکالی ہے کہ ممانعت اس لئے فرمائی کہ دو نمازوں کا اختلاط نہ ہو جائے لہٰذا انہوں نے مسجد میں سنتوں کو منع کیا ہے چنانچہ ہمارے مذہب کی تائید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "اصلاتان معاً" سے ہوتی ہے۔ جب ایک صحابی فجر کے فرائض کے بعد سنتیں پڑھنا چاہ رہے تھے ان کو یہ ارشاد فرمایا تھا۔ پھر حنفیہ و مالکیہ کے درمیان اختلاف کا سبب یہ ہے کہ دونوں کا مقصود جماعت کی فضیلت کو پالینا ہے۔ اب مالکیہ کہتے ہیں کہ دونوں رکعتیں ملیں گی تب جماعت کی فضیلت حاصل ہوگی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ ایک رکعت ملنے سے بھی جماعت کی فضیلت حاصل ہو جائیگی چنانچہ حدیث شریف میں "من ادرك ركعة من الصلوٰة فقد ادرك الصلوٰة" سے حنفیہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا مقصد صرف دوسرے اختلافی مسئلہ کو بیان کرنا ہے۔

۲ **الا رکعتی الفجر کا استثناء:** لیکن اس زیادتی پر علماء نے کلام کیا ہے جس کی تفصیل مطولات میں ہے الارشاد الرضی میں نقل کیا ہے کہ الا رکعتی الفجر کا استثناء صحیح قوی سند کے ساتھ مروی ہے۔ فتامل

۳ امام طحاوی رحمہ اللہ نے ان آثار کو ذکر کیا ہے جو اکثر صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ کما قالہ النیموی

فجر کی سنتیں کسی ستون وغیرہ کے پیچھے پڑھ لیا کرتے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ "فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ" کا یہ مطلب آپ کے نزدیک بھی نہیں ہے کہ جس محلّہ یا شہر کے اندر فجر کی نماز شروع ہو جائے تو وہاں پر سنتیں پڑھنا بالکل منع ہوگا یا تمام عالم میں سنتیں اور نوافل کی ممانعت ہو جائیگی بلکہ آدمی اس اقامت کے وقت اگر دوسرے ملک کسی دوسرے شہر یا محلّہ کے اندر ہو تو سنتیں پڑھ سکتا ہے تو جب آپ نے اس حدیث کے عموم پر عمل نہیں کیا تو حنفیہ بھی اس حدیث کا یہ معنی کریں گے کہ خاص فرض نماز کی جگہ پر سنتیں پڑھنا منع ہے۔

حنفیہ کے یہاں الا المکتوبۃ کا مطلب اور اس پر ایک اشکال: وہ آدمی جس پر گذشتہ فرض نماز قضاء لازم ہو اور وہ صاحب ترتیب بھی ہو تو اس پر گذشتہ فرض کو پہلے پڑھنا ضروری ہے اور یہ حدیث باب کی مخالفت نہیں ہوگی کیونکہ حدیث باب میں "الا المکتوبۃ" کا استثناء ہے اور یہ شخص بھی تو فرض ہی پڑھ رہا ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ المکتوبۃ میں الف لام عہدی ہے یعنی خاص وقتی فرض نماز...... اس طرح قضاء نماز الا المکتوبۃ میں داخل نہیں ہوگی۔

اشکال کا جواب: لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس قضاء نماز کو پڑھنا اسی ادا نماز کی صحت کیلئے تو ہے۔ لہٰذا چونکہ ترتیب ضروری ہے اسلئے وقتی فرض نماز باطل ہو جائیگی اور اس پر پہلے گذشتہ فرض نماز کی قضاء لازم ہے لہٰذا الا المکتوبۃ میں الف لام جنسی ہونا چاہیئے (یعنی چاہے فرض نماز وقتی ہو یا قضا ہو) شافعیہ[1] کے نزدیک چونکہ نمازوں کے درمیان ترتیب واجب نہیں اسلئے ان کے ہاں فرض وقتی نماز اس کو پڑھنا ضروری ہے چاہے اس پر گذشتہ نماز کی قضاء لازم ہو۔

باب ماجاء فیمن تَفُوتُهُ الرکعتانِ قبل الفجر یصلّیهما بعدَ صلاۃ الفجرِ

باب جس کی فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں وہ فجر (کے فرضوں) کے بعد انہیں پڑھ لے

☆حدثنا محمد بن عَمرٍو السَّوّاقُ البَلْخِيُّ قال حَدَّثَنَا عبد العزیز بن محمد عن سَعْد بن سعیدٍ عن محمد بن ابراهیم عن جَدهِ قَیْسٍ قال: خَرج رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فاقِیمَتِ الصلاۃُ، فصلَّیتُ معه الصبحَ، ثم انصرفَ النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم فوجدنی أُصَلّی، فقال: مَهْلًا یاقیس!

---

[1] علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی، زہری، ربیعہ، یحییٰ الانصاری، لیث، امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ امام مالک، احمد، اسحٰق رحمہم اللہ کے نزدیک فوت شدہ نماز اور وقتی نماز کے درمیان ترتیب ضروری ہے۔ طاؤس، امام شافعی، ابوثور، ابن القاسم، سحنون کے نزدیک ترتیب ضروری نہیں ہے۔ انتہی

اَصَلَاتَانِ مَعاً؟ قلتُ: یارسولَ اللّٰہِ، اِنِّی لم اَکُنْ رَکَعْتُ رکعتَیِ الفجرِ، قال: فَلَااِذَاًا۔

قال ابو عیسی: حدیثُ محمد بن ابراھیم لانعرفہ مثلَ ھذا اِلّا مِن حدیث سعد بن سعیدٍ۔ وقال سفیانُ بن عیینۃ: سمع عطاء بن ابی رَبَاحٍ من سعد بن سعیدٍ ھذا الحدیثَ وانما یُرْوٰی ھذاالحدیث مرسَلاً۔ وقد قال قومٌ من اھل مکۃ بھذاالحدیث:لم یَرَوْاباساً ان یصلِّیَ الرجلُ الرکعتین بعدَ المکتوبۃِ قبل ان تطلُعَ الشمس۔

قال ابو عیسی: وسعد بن سعیدٍ ھو اخو یحیی بن سعیدِ الانصاریُّ۔ قال : وقیسٌ ھو جدُّ یحیی بن سعیدِ الانصاریُّ ، ویقال ھو قیس بن عَمْرٍو ویقال ھو قیس بنُ قَھْدٍ۔

واِسنادُھذا الحدیثِ لیس بِمُتَّصِلٍ : محمد بن اِبراھیم التیمیُّ لم یَسْمَعْ من قیسٍ۔وروٰی بعضُھم ھذا الحدیث عن سعد بن سعیدٍ عن محمد بن ابراھیم: ان النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خرجَ فرَاٰی قیساً۔ وھذااصحُّ من حدیث عبد العزیز عن سعد بن سعیدٍ۔

﴿ترجمہ﴾

محمد بن ابراہیم سعد کے دادا قیس سے نقل کرتے ہیں (از مترجم: العرف الشذی میں لکھا ہے کہ جدہ کا مرجع سعد ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (گھر سے باہر) نکلے تو نماز کی اقامت ہوگئی میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی جانب رخ کر کے بیٹھ گئے (یا آپ نماز پڑھ کر تشریف لے جانے لگے) تو مجھے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے قیس! ٹھہر جاؤ دو نمازیں اکٹھی کیسے؟ (یعنی فرضوں کے بعد تم نے کونسی نماز پڑھی)۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! میں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر کوئی حرج نہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم محمد بن ابراہیم کی اس طرح کی روایت سعد بن سعید کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح نے سعد بن سعید سے یہ حدیث سنی اور یہ حدیث مرسلاً مروی ہے۔ اہل مکہ کی ایک جماعت کا اس حدیث پر عمل ہے کہ وہ صبح کی قضا شدہ سنتوں کو فرضوں کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سعد بن سعید، یحیٰی بن سعید انصاری کے بھائی ہیں اور قیس، یحیٰی بن سعید کے دادا ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ قیس بن عمرو ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ قیس بن فہد ہیں۔ اس حدیث کی سند متصل نہیں۔ محمد بن ابراہیم تیمی

نے قیس سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ بعض راوی یہ حدیث سعد بن سعید سے اور وہ محمد بن ابراہیم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس کو دیکھا۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے امام ترمذی طلوع شمس سے پہلے فرضوں کے بعد سنتوں کی ادائیگی پہ استدلال کرتے ہیں: حدیث باب سے امام ترمذی رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ جس شخص کی فجر کی سنتیں رہ جائیں وہ فرض پڑھنے کے بعد طلوع شمس سے پہلے سنتیں ادا کرے۔تو یہ ترجمۃ الباب شارحہ ہے۔

امام ترمذیؒ کے استدلال کے جوابات: اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث باب نہی والی[1] حدیث کے معارض ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ''فلا اذاً'' میں دونوں معنوں کا احتمال ہے کیونکہ لب ولہجہ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں (یعنی اگر لہجہ غصہ والا ہوتو اس کا مطلب منع کرنا ہوگا ورنہ اجازت دینا مقصود ہوگا)۔ نیز تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ فرض نماز پڑھ رہے ہیں کیونکہ اس وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو نفل پڑھنے سے منع فرما چکے تھے پھر جب معلوم ہوا کہ یہ نفل پڑھ رہے ہیں تو یا تو ان کو اجازت دے دی جیسا کہ ایک معنی[2] کے اعتبار سے فَلَا اذًا کا یہی مطلب ہے اور یا انہیں منع کر دیا جیسا کہ فلا اذا کا دوسرا معنی یہی ہے۔لیکن دوسرا معنی نہی والی روایت کے موافق ہے اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس سے مقصود رخصت دینا تھا تب بھی یہ اجازت اپنے مورد پر بندر ہیگی نیز جن احادیث میں "فسکت عنه" کے الفاظ ہیں اس کا بھی یہی معنی ہے جو حدیث باب کا معنی ہے[3]۔

---

[1] یعنی وہ احادیث جن میں فجر کی نماز کے بعد طلوع شمس تک نماز پڑھنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔

[2] یہ بات گزر چکی ہے کہ لب ولہجہ کی تبدیلی کی وجہ سے فلا اذا میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ا۔اجازت دینا مقصود ہو،۲۔منع کرنا

[3] حدیث باب سے مراد فلا اذاً والی حدیث ہے تو جن علماء نے فلا اذا سے سنتوں کے مباح ہونے کا معنی سمجھا ہے یعنی فلا باس اذا تو فسکت والی حدیث کا معنی ان کے نزدیک یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کی تقریر کی اس پر نکیر نہیں فرمائی کیونکہ لغت میں السحدیث سکت علیه فلاں کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اس نے اس پر نکیر نہیں کی اور اس کی تضعیف نہیں کی۔ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ سند میں جدہ کی ضمیر کا مرجع سعد بن سعید ہے نہ کہ محمد بن ابراہیم۔

فلا اذاً کسی معنی پر صریح نہیں لہٰذا دوسری روایتِ صریح قابل عمل ہوگی: بہر حال اس اختلاف کا مدار فَلَا اِذًا کے جملہ میں ہے کہ لا کا اسم کیا ہے۔ تو اس کے معنی "لا صلوٰۃ اذا" اور "لا تصلی اذا" ہے یا "لا باس اذا" ہے جب یہ حدیث دونوں معنوں میں سے کسی معنی پر صراحۃً دلالت نہیں کر رہی تو اس حدیث کے معنی کو سمجھنے کیلئے دوسری روایت میں غور کرنا ضروری ہے چنانچہ ہم نے غور کیا تو ہمیں بہت سی ایسی روایات ملیں جو فجر کی نماز کے بعد نفل نماز پڑھنے کی ممانعت پر دلالت کرتی ہیں لہٰذا ان روایات کے مقتضی پر عمل ضروری ہے کیونکہ وہ اپنے معانی پر صریح ہیں اور یہ حدیث محتمل ہے۔

(قال ابو عیسیٰ: سمع عطاء بن ابی رباح من سعد بن سعید هذا الحدیث) **اس قول کا مقصد سعد راوی کی توثیق ہے۔**

فجر کی رہ جانے والی سنتوں کے بارے میں علماء احناف کے دو قول ہیں: حنفیہ کے مذہب میں امام محمد رحمہ اللہ کی ایک روایت کے مطابق جس شخص کی صرف فجر کی سنتیں رہ جائیں تو وہ شخص طلوع شمس کے بعد زوال سے پہلے ان کی قضاء کریگا۔ شیخین نے اس اعادہ[1] سے منع نہیں کیا بلکہ شیخین سے مروی ہے کہ اگر سنتیں فرض کے بغیر فوت ہوں تو اسکی قضاء واجب نہیں لیکن اگر کوئی شخص طلوع شمس کے بعد سنتیں پڑھ لے تو شیخین سے اس کے متعلق کوئی روایت منقول نہیں۔

---

[1] **فجر کی سنتوں کی قضاء کے بارے میں ائمہ کے مذاہب کی تفصیل:** ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی صرف فجر کی سنتیں فوت ہو جائیں تو یہ شخص طلوع شمس سے پہلے ان کی قضاء نہیں کریگا کیونکہ اب یہ نفل مطلق بن گئی ہیں اور فجر کی نماز کے بعد نفل مطلق مکروہ ہے۔ ارتفاع شمس کے بعد شیخین کے نزدیک قضاء نہیں ہے امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ ارتفاع شمس کے بعد زوال شمس تک ان کی قضاء کرسکتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ التعریس کی صبح سنتوں کی قضاء سورج کے بلند ہو جانے کے بعد فرمائی۔ شیخین کی دلیل یہ ہیکہ قضاء کسی واجب فعل کی ہوتی ہے سنتوں کی قضاء نہیں ہوتی لیلۃ التعریس کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتوں کی قضاء تبعاً للفرائض فرمائی تھیں۔ لہٰذا جب صرف سنتیں قضا ہو جائیں تو اصول کے مطابق انکی قضا نہ ہوگی اور جب سنتیں فرضوں کے ساتھ قضا ہوں تو طلوع شمس کے بعد زوال تک انکی قضا کر سکتے ہیں۔ اگر زوال کے بعد سنتوں کی قضا کرے تو پھر ان سنتوں کی قضا کے متعلق مشائخ کا اختلاف ہے۔ انتہی حنفیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ کا مذہب اس طرح ہے کہ شافعیہ کے راجح قول میں سنتوں کی قضاء ساری زندگی کرسکتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک طلوع شمس کے بعد سنتوں کی قضاء کریگا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک طلوع شمس کے بعد سنتوں کی قضا اگر کرنا چاہے تو کرسکتا ہے مسئلہ کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

باب ماجاء فی إعادتهما بعد طلوع الشمسِ

باب فجر کی سنتیں اگر چھوٹ جائیں تو طلوع آفتاب کے بعد پڑھے

☆حدثنا عقبة بن مُكْرَمٍ العَمِّيُّ البصريُّ حَدَّثَنَا عمرو بن عاصم حَدَّثَنَا همامٌ عن قتادة عن النَّضرِ بن انسٍ عن بَشِيرِ بن نَهِيكٍ عن ابی هريرةَ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: مَنْ لم يُصَلِّ ركعتَي الفجرِ فلْيُصَلِّهِمَا بعدَ ماتَطْلُعُ الشمسُ۔

قال ابو عيسى: هٰذا الحديث لانعرفهُ اِلَّا مِن هٰذا الوجهِ۔ وقد رُوِى عن ابن عمرَ انه فَعَلَهُ۔ والعملُ على هٰذا عند بعض اهل العلم۔ وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ، وابن المبارك، والشافعيُّ، واحمدُ، واسحٰقُ۔ قال: ولا نعلمُ احداً رَوَى هٰذا الحديث عن هَمَّامٍ بهذا الإسنادِ نحوَ هٰذا اِلَّا عَمْرَو بن عاصمٍ الكِلَابِيَّ۔ والمعروفُ من حديث قتادةَ عن النضر بن انسٍ عن بَشِيرِ بن نَهِيكٍ عن ابی هريرةَ عن النبیِّ صلى اللّٰه عليه وسلم قال: مَن اَدركَ ركعةً من صلاةِ الصبحِ قبلَ ان تطلُعَ الشمسُ فقد ادركَ الصبحَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے فجر کی دوسنتیں نہ پڑھی ہوں تو وہ طلوع آفتاب کے بعد پڑھ لے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم اس حدیث کو اس سند کے علاوہ نہیں جانتے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ ان کا فعل بھی یہی تھا۔ بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے سفیان ثوری، شافعی، احمد اور اسحٰق اور ابن مبارک رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن عاصم کلابی کے علاوہ کوئی دوسرا راوی ہمیں نہیں معلوم (جس نے ہمام سے یہ حدیث اسی سند کے ساتھ روایت کی ہو)۔ قتادہ مذکورہ بالا سند سے محدثین کے یہاں جو متن مشہور و معروف ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے سورج نکلنے سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالی گویا کہ اس نے فجر کی پوری نماز پالی (لہٰذا عمرو بن عاصم کی روایت سے مذکورہ بالا متن شاذ ہے)۔

﴿تشریح﴾

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (والمعروف من حدیث قتادۃ عن النضر) امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ عاصم راوی[1] کو متن حدیث کے متعلق وہم ہوگیا ہے تو انہوں نے حدیث کا متن ہی بدل دیا۔

امام ترمذیؒ کے اعتراض کا جواب: اسکا جواب یہ ہے کہ حدیث کے ان دونوں متون میں بہت فرق ہے تو یہ بات بہت بعید ہے کہ عاصم راوی نے روایت بالمعنی کر کے اس حدیث کا متن بدل دیا ہے نیز چونکہ عمرو بن عاصم ثقہ راوی ہے لہٰذا، ہمام عن قتادہ کی روایت سے جو متن مشہور ہے "من ادرک رکعۃ من الصبح" والا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قتادہ کا دوسرا ثقہ شاگرد اگر دوسری طرح حدیث نقل کرے تو وہ حدیث غیر صحیح ہے بلکہ یہ دونوں ہی حدیثیں صحیح اور واجب القبول ہیں۔

باب ماجاءَ فی الاَرْبَعِ قبلَ الظهرِ

باب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں پڑھنا

☆حدثنا محمد بن بَشّارٍ حَدَّثَنَا ابو عامرٍ العَقَدِیُّ حَدَّثَنَا سفیانُ عن ابی اِسحٰقَ عن عاصمِ بن ضَمُرَۃَ عن علی قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلی قبلَ الظهرِ اربعاً وبعدها رکعتین۔

قال: وفی الباب عن عائشةَ، واُمِّ حبیبةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث علی حدیث حسن۔

قال ابو بکرٍ العطّارُ: قال علیُّ بن عبد اللّٰہ عن یحیی بن سعیدٍ عن سفیانَ قال: کنا نَعْرِفُ فَضلَ حدیث عاصمِ بن ضَمُرَۃَ علی حدیثِ الحٰرثِ۔

والعملُ علی هٰذا عند اکثر اهل العلم من اصحابِ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ومَن بعدهم: یختارون ان یصلیَ الرجلُ قبلَ الظهرِ اربَعَ رکعاتٍ۔ وهو قولُ سفیانَ الثوریِّ، وابن المبارکِ، واسحٰق، واهل الکوفة۔ وقال بعضُ اهل العلم: صلاۃُ اللیل والنهارِ مَثْنٰی مَثْنٰی، یَرَوْنَ الفصلَ بین کل رکعتین۔ وبه یقولُ الشافعیُّ، واحمدُ۔

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے صحیح لفظ دونوں جگہ عمرو بن عاصم ہے غلطی سے عمرو بن عاصم کی جگہ عاصم راوی لکھ دیا گیا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کی تقریر بالکل واضح ہے کیونکہ حاکم نے بھی اس حدیث عمرو بن عاصم کی علی شرط الشیخین تصحیح کی ہے اور ذہبی نے ان کی اس بات پر نکیر بھی نہیں کی۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں (سنت) پڑھا کرتے تھے۔

اس باب میں حضرت عائشہ، ام حبیبہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث علی حسن ہے۔ ابوبکر عطار کہتے ہیں کہ علی بن عبداللہ، یحییٰ بن سعید سے اور انہوں نے سفیان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا ہم عاصم بن ضمرہ کی حدیث کی فضیلت حارث کی حدیث پر جانتے تھے۔ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے جن میں صحابہؓ اور بعد کے علماء شامل ہیں کہ ظہر سے پہلے چار رکعت سنت پڑھے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک رات اور دن کی نمازیں دو دو رکعت ہے اور ہر دو رکعت کے درمیان فصل ہے (یعنی دو رکعت پڑھنے کے بعد سلام پھیرے پھر دو رکعت پڑھے) امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قوله كنا نرى فضل حديث عاصم بن ضمرة على حديث حارث) جاننا چاہیئے کہ حارث الاعور اور عاصم[1] بن ضمرۃ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ محدثین نے حارث الاعور پر کلام کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد حارث الاعور اور عاصم بن ضمرۃ پر کلام: حدیث باب میں حارث سے مراد یہی حارث الاعور ہے اور عاصم راوی اس سے اقویٰ ہے۔ کیونکہ محدثین نے حارث الاعور کو رافضی کہا ہے (چنانچہ حافظ نے رمی بالتشیع کے الفاظ کہے ہیں: از مترجم) بہر حال حارث کے متعلق کلام گزر چکا ہے عاصم کی یہ حدیث اگر چہ صحت کے درجہ تک کو نہیں پہنچ سکی لیکن حسن کے درجہ تک تو بہر حال پہنچی ہوئی ہے۔

---

[1] یعنی عموماً یہ دونوں تابعی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں مصنف نے عاصم بن ضمرۃ کے متعلق سفیان ثوری سے جو مقولہ نقل کیا ہے، حافظ نے امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ عاصم، حارث راوی سے درجہ میں بڑھا ہوا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ عاصم راوی کا حافظہ کمزور ہے اس سے فحش غلطیاں سرزد ہوتی ہیں پھر بھی حارث راوی کے مقابلہ میں یہ زیادہ اچھا راوی ہے۔ ابواسحٰق جوزجانی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک عاصم اور حارث ثقاہت میں قریب قریب ہیں۔

باب ماجاء فی الرکعتین بعد الظھرِ

باب ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا

☆حدثنا احمد بن مَنیع حَدَّثَنَا اسمٰعیل بن ابراھیم عن ایوبَ عن نافعٍ عن ابنِ عمرَقال: صلیتُ مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رکعتین قبل الظھر، ورکعتین بعدھا۔ قال : وفی الباب عن علی، وعائشۃَ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمر حدیث صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔

اس باب میں حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

رکعتین قبل الظہر کا مصداق: ظہر سے پہلے کی دو رکعتیں تحیۃ المسجد تھیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت سنتیں اپنے گھر میں ادا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ، ام حبیبہ اور حفصہ رضی اللہ عنہن نے نقل کیا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث باب [1] میں یہ ذکر ہے کہ آپ نے دو رکعتیں ادا فرمائی ہیں لیکن یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ سنت موکدہ ہیں یا کوئی اور سی نماز اور نیز شاید ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اشتباہ ہو گیا کہ یہ کونسی نماز ہے [2]۔

---

[1] **ظہر سے پہلے کی سنتوں کی تعداد میں اختلاف روایات کی وجہ سے ائمہ کے درمیان سنن رواتب کی تعداد میں اختلاف** ہے: اس مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ ظہر سے پہلے کی سنتوں کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دو رکعت سنت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ظہر سے پہلے کی چار سنتیں نقل کرتی ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے مفصلا و مجملا ان روایات کو ذکر کیا ہے اسی وجہ سے ظہر سے پہلے کی سنت موکدہ کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے حنابلہ کہتے ہیں کہ ظہر سے پہلے دو رکعت سنت ہے اور یہی شافعیہ کی راجح روایت ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ظہر سے پہلے چار رکعت سنت موکدہ ہیں اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی ہے اسی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کو بیان کرنے والوں کا اختلاف واقع ہوا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرائض کے بعد ظہر کی سنن قبلیہ اور بعدیہ کی ترتیب میں علماء حنفیہ کا اختلاف ہے: (قوله اذا لم يصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها) علماء حنفیہ میں اختلاف ہے کہ ظہر کے بعد اس شخص کو پہلے چار سنتیں قبلیہ پڑھنی چاہیئے یا دو سنن بعدیہ۔ جن علماء[1] نے حدیث باب میں "صلاهن بعدها" سے بعدیت متصلہ مراد لی ہے تو ان کے نزدیک فرض کے فوراً بعد پہلے چار سنن قبلیہ ہونی چاہیئے اور جن علماء نے مطلقاً فرض کے بعد چار رکعتیں پڑھنا مراد لیا ہے ان کے نزدیک اولاً دو سنتوں کو ان کے وقت میں ادا کرنا چاہیئے اور پھر چار سنتیں پڑھے۔ فتح القدیر میں اس دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ چار سنتوں کو ظہر کی دو سنتوں کے بعد پڑھے۔

بابٌ مِنهُ آخَرُ

باب اسی مسئلے (کہ ظہر سے پہلے کی سنتیں رہ جائیں تو ان کو بعد میں پڑھے) سے متعلق

☆حدثنا عبد الوارثِ بن عُبَيدِ اللّٰهِ العَتَكِيُّ المَرْوَزِيُّ اخبرنا عبد الله بن المباركِ عن خالدٍ الحَذَّاءِ عن عبد الله بن شَقِيقٍ عن عائشة: ان النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان اِذا لم يُصَلِّ اربعاً قبل الظهرِ صَلَّاهُنَّ بعده ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريب، انما نعرفهُ من حديث ابن المباركِ مِن هذا الوجه۔ وقد رواه قيس بن الربيع عن شُعْبَةَ عن خالدٍ الحذّاء نحوَ هذا۔ ولا نعلمُ احداً رواه عن شعبة غيرَ قيس بن الربيع۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) **حدیثِ باب کے جوابات اربعہ:** ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بعض علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ دو رکعتیں تحیۃ المسجد تھیں۔ جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما دو رکعتیں بھول گئے لیکن یہ بات بعید ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ یہ اختلافِ احوال پر محمول ہے کہ کبھی کبھار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں سنتیں ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب مسجد میں ادا فرماتے تو دو رکعت اس طرح کے بہت سے اقوال ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک سنتوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں بلکہ جس قدر چاہے سنتیں پڑھ سکتا ہے اس مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے۔

[2] یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ معلوم نہ تھا کہ تحیۃ المسجد ہیں یا ظہر کی سنتیں؟ مولانا رضی الحسن مرحوم کی تقریر میں اسی طرح ہے۔

[1] اگر کسی شخص کی ظہر سے پہلے کی سنتیں رہ جائیں تو جب نماز ظہر کے بعد ان کو پڑھیگا تو اس میں علماء حنفیہ کے دو قول ہیں: ا۔ پہلے دو سنتیں پڑھے بعد میں چار سنن موکدہ کی قضاء کریگا، ۲۔ پہلے چار سنتیں پڑھیگا پھر دو سنتیں پڑھیگا۔

وقد رُوی عن عبد الرحمٰن بن ابی لیلی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم نحوُ ھذا۔

☆حدثنا علیُّ بن حُجرٍ اخبرنا یزیدُ بن ھرونَ عن محمد بن عبد اللّٰہِ الشُّعَیثِیِّ عن ابیہ عن عَنبَسَۃَ بن ابی سفیانَ عن اُمِّ حَبِیبَۃَ قالت: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مَن صلّٰی قبلَ الظھرِ اربعاً وبعدھا اربعاً حَرَّمَہُ اللّٰہ علی النَّارِ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن غریبٌ۔ وقد رُوِیَ من غیر ھذا الوجہِ۔

☆حدثنا ابو بکرٍ محمد بن اِسحٰق البغدادیُّ حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن یوسفَ التِّنِّیسِیُّ الشّامیُّ حَدَّثَنَا الھیثمُ بن حمیدٍ اخبرنی العَلاءُ ھو ابن الحرث عن القاسم ابی عبد الرحمٰن عن عَنبَسَۃَ بن ابی سفیانَ قال: سمعتُ اختی امَّ حبیبۃ زوجَ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم تقولُ: سمعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقولُ: من حافظ علی اربعِ رکعاتٍ قبلَ الظھرِ واربعٍ بعدھا حَرَّمَہ اللّٰہ علی النَّارِ۔

قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ غریبٌ من ھذا الوجہ۔ والقاسمُ ھو ابن عبد الرحمٰن، یکنی ابا عبد الرحمٰن وھو مولٰی عبد الرحمٰن بن خالد بن یزیدَ بن معاویۃَ وھو ثقۃٌ شامِیٌّ۔وھو صاحبُ ابی اُمَامَۃَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں نہ پڑھ پاتے تھے تو انہیں ظہر کے بعد پڑھ لیتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے ہم اسے ابن مبارک کی روایت سے اسی سند سے جانتے ہیں۔قیس بن ربیع نے اس حدیث کو شعبہ سے انہوں نے خالد الحذاء سے اسی کی مثل روایت کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ اس حدیث کو شعبہ سے قیس کے علاوہ کسی اور نے روایت کیا ہو۔عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں۔

☆ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں اور اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کردے گا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے یہ حدیث اس کے علاوہ دوسری سند سے بھی مروی ہے۔

☆ حضرت عنبسہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی بہن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے سنا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے ظہر سے پہلے چار رکعات اور اس کے بعد چار رکعات کی پابندی کی اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردے گا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث اس سند سے حسن صحیح غریب ہے۔ قاسم عبدالرحمٰن کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے وہ عبدالرحمٰن بن خالد بن یزید بن معاویہ کے آزاد کردہ غلام ہیں، ثقہ ہیں۔ شام کے رہنے والے ہیں اور ابو امامہ کے شاگرد ہیں۔

باب ماجاء فی الاربع قبلَ العصرِ

باب عصر سے پہلے چار سنتیں پڑھنا

☆حدثنا بُنْدَارٌ محمد بن بشّارٍ حَدَّثَنَا ابو عامرٍ هو العَقَدِيُّ عبد المللك بن عَمْرٍو حَدَّثَنَا سفيانُ عن ابى اِسحٰق عن عاصم بن ضَمُرَةَ عن عليٍّ قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يصلّى قبلَ العصرِ اربعَ ركعاتٍ، يَفْصِلُ بينهنَّ بالتسليمِ على الملائكةِ المُقَرَّبين ومَن تَبِعَهُمْ مِن المسلمينَ والمؤمنينَ۔ قال ابو عيسى: وفي الباب عن ابن عمر، وعبد الله بن عمرو۔ قال ابو عيسى: حديث عليٍّ حديث حسنٌ۔

واختارَ اِسحٰقُ بن ابراهيم ان لايُفْصَلَ فى الاربع قبل العصر، واحْتَجَّ بهذا الحديث۔ وقال اِسحٰق : ومعنى انه يَفْصِلُ بينهنَّ بالتسليم يعنى التشهُّدَ۔ ورأى الشافِعيُّ واحمدُ صلاةَ الليل والنهارِ مَثْنَى مَثْنَى ، يَخْتَارَان الفَصْلَ فى الاربع قبل العصرِ۔

☆حدثنا يحيى بن موسى ومحمود بن غَيْلَانَ واحمد بن ابراهيم الدَّوْرَقِيُّ وغيرُ واحدٍ، قالوا: حَدَّثَنَا ابو داود الطَّيالِسِيُّ حَدَّثَنَا محمد بن مُسْلِمِ بن مِهْرَانَ سمع جَده عن ابن عمرَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: رحِمَ اللّٰهُ امرأً صلّى قبل العصرِ اربعاً۔ قال ابو عيسى: هذاحديث غريب حسن

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے اور ان کے درمیان مقرب فرشتوں اور مسلمانوں ومومنوں میں سے ان کے متبعین پر سلام بھیج کر (یعنی تشہد سے) جدائی کیا کرتے تھے۔

اس باب میں ابن عمر اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث علی حسن ہے اسحٰق بن ابراہیم نے یہ اختیار کیا ہے کہ عصر کی چار سنتوں کے درمیان سلام نہ پھیرے (یعنی ایک سلام سے پڑھے) انہوں نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان "سلام سے فصل کرتے تھے" سے مراد یہ ہے کہ ان کے درمیان تشہد سے فصل کرتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دن اور رات کی دو دو رکعتیں ہیں اور وہ ان میں فصل کرنے کو پسند کرتے ہیں۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعات (سنت) پڑھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

تسلیم سے اصطلاحی سلام پھیرنا مراد نہیں بلکہ تشہد پڑھنا ہے: اس تسلیم سے مراد تشہد پڑھنا ہے اور یہ زیادہ اولیٰ ہے[1] اس سے کہ اس تسلیم سے سلام پھیرنا مراد لیا جائے کیونکہ اگر یہاں تسلیم سے سلام پھیرنا مراد لیا جائیگا تو اس سلام کے پھیرتے وقت صرف ملائکہ کی نیت ہوتی ہے نہ کہ تمام مسلمانوں کی حالانکہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ سلام میں ملائکہ اور پیچھے والے تمام مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے لہٰذا یفصل بینھن سے مراد السلام علینا و علی عباداللہ الصالحین ہے اس جملہ میں تمام مسلمانوں اور ملائکہ کو سلام کہا جا رہا ہے۔ بہرحال اس سے مراد تشہد پڑھنا ہے لہٰذا عصر سے پہلے کی چار رکعت ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائینگی۔

من حدیث ابن مسعودؓ کہنے کی وجہ: (حدیث ابن مسعود حدیث غریب من حدیث ابن مسعود) یہ لفظ مکرر[2] ہے صحیح بات یہ ہے کہ دوسرا من حدیث ابن مسعود نہیں ہونا چاہیئے البتہ اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ اس کا یہ مطلب ہو کہ ابھی جو حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ مذکور ہوئی یہ حدیث اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کی جائے تب تو غریب ہے اور اگر دوسرے صحابہ سے نقل کی جائے تو یہ حدیث غریب نہیں ہوگی۔

---

[1] **شافعیہ نے سلامِ اصطلاحی مراد لیا ہے:** یعنی شوافع وغیرہ جن کے نزدیک عصر سے پہلے کی چار سنتوں کے درمیان سلام کے ساتھ فصل ہوگا انہوں نے یفصل بینھن بالتسلیم سے مراد دو رکعتوں پر سلام پھیرنا مراد لیا ہے یہ معنی ظاہر کے خلاف ہے بلکہ اس حدیث کا ظاہری معنی یہ ہے کہ حدیث میں تسلیم سے مراد تشہد والا السلام علینا والا اسلام ہے۔ سلام پھیرنا مراد نہیں ہے۔

[2] نسخہ احمدیہ میں یہ لفظ من حدیث ابن مسعود مکرر ہے۔ ترمذی کے دوسرے نسخوں میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ وہاں عبارت اس طرح ہے حدیث ابن مسعود حدیث غریب لا نعرفه الا من حدیث عبدالملك (یہی نسخہ آجکل متداول ہے: از مترجم)

باب ماجاء فی الرکعتین بعد المغرب والقراءۃ فیھما

باب مغرب کے بعد دو رکعت (سنت) اور (ان میں) قرأت کا بیان

☆ حَدَّثَنَا ابو موسی محمد بن المُثَنّٰی حَدَّثَنَا بَدَلُ بن المُحَبَّرِ حدثنا عبد الملك بن مَعْدَانَ عن عاصم بن بَهْدَلَةَ عن ابی وائلٍ عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ انه قال: مااُحْصِی ماسمعتُ من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقرأ فی الرکعتین بعد المغرب وفی الرکعتین قبل صلاۃ الفجر بقُلْ یٰاَیُّهَاالکافِرُونَ وقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ قال: وفی الباب عن ابن عمرَ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابن مسعودٍ حدیث غریب من حدیث ابن مسعودٍ لانعرفُه اِلّا مِن حدیث عبد الملك بن مَعْدَانَ عن عاصم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں شمار نہیں کرسکتا میں نے کتنی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کے بعد اور فجر سے پہلے کی دوسنتوں میں قل یاایھا الکافرون اور قل ھواللہ احد پڑھتے ہوئے سنا۔

اس باب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے۔ ہم اس کو عبدالملک بن معدان کی عاصم سے روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔

باب ماجاء انَّه یُصلِّیهما فی البیت

باب مغرب کے بعد کی سنتیں گھر پر پڑھنا

☆ حدثنا احمد بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا اسمٰعیل بن ابراهیم عن اَیُّوبَ عن نافع عن ابن عمرَ قال: صلیتُ مع النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم رکعتین بعد المغرب فی بیته۔

قال: وفی الباب عن رافع بن خَدِیجٍ، وکعبِ بن عُجْرَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث حسن صحیحٌ۔

☆ حدثنا الحسنُ بن علیٍّ الحُلْوَانِیُّ الخَلّالُ حَدَّثَنَا عبدُ الرزّاق اخبرنا عن ایوبَ عن نافعٍ عن ابن عمر قال: حفظتُ عن رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عَشْرَ رکعاتٍ کان یصلّیها باللیل

والنهارِ: ركعتين قبل الظهرِ، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغربِ، وركعتين بعدَ العشاءِ الآخرَةِ۔ قال: وحدثتني حفصةُ انه كان يصلّي قبل الفجرِ ركعتين۔ هذاحديث حسن صحيحٌ۔

☆حدثنا الحسنُ بن عليٍّ حَدَّثَنَا عبد الرزّاقِ اخبرنا مَعْمَرٌ عن الزُّهْرِيِّ عن سالمٍ عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: مِثْلَهُ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز کے بعد دو رکعتیں آپ کے گھر پر پڑھیں۔

اس باب میں رافع بن خدیج اور کعب عجرہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما حسن صحیح ہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں یاد کی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن اور رات میں پڑھا کرتے تھے۔ دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں اس کے بعد دو رکعتیں مغرب کے بعد اور دو رکعتیں عشاء کے بعد اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتیں فجر سے پہلے بھی پڑھا کرتے تھے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ ہم سے روایت کی حسن بن علی نے ان سے عبدالرزاق نے ان سے معمر نے ان سے زہری نے ان سے سالم نے ان سے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب کی ترجمۃ الباب سے مطابقت: جاننا چاہیئے کہ جو حدیث باب میں مذکور ہے اس سے ترجمۃ الباب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ باب کی حدیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مغرب کے بعد کی دو سنتیں گھر میں پڑھنا جائز ہے حالانکہ مصنف کا مقصد تو یہ ہے کہ مغرب کے بعد کی دو سنتیں گھر میں پڑھنا مستحب ہے[1] چنانچہ یہاں پر دوسری بہت سی روایات

---

[1] جیسا کہ ترجمۃ الباب کے سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ مصنف کا مقصد مغرب کے بعد کی سنتوں کو گھر میں پڑھنے کو مستحب قرار دینا ہے۔

موجود ہیں جو ترجمۃ الباب کو ثابت کر رہی ہیں مثلاً ''صلوا'' کا صیغہ احادیث میں وارد ہے اور امر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ وہ مستحب ہو لہٰذا گھر میں سنتیں پڑھنا مستحب ہوگا۔ بعض لوگوں نے اس امر کو وجوب کیلئے لیا ہے ان کے نزدیک مسجد میں نفل نماز پڑھنا ناجائز ہے لیکن یہ معنی غلط ہے اگر چہ ہمارے نزدیک بھی سنتیں گھر میں پڑھنا اور لوگوں پر ظاہر نہ کرنا ہی افضل و اولیٰ ہے اس حدیث باب سے بھی ترجمۃ الباب کو ثابت کیا جا سکتا ہے بایں طور کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو سنت پر محمول کیا جائے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ اور آپ کی سنت گھر میں اس نماز کو پڑھنے کی تھی۔

ابن عمرؓ کے حدثتِنی حفصة اور حَفِظْتُ کہنے کی وجہ: (قولہ حدثتنی حفصہ انہ کا ن یصلی قبل الفجر رکعتین) ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی حدیث کے درمیان حدثتنی[1] حفصة کا اضافہ اس لئے فرمایا کہ انہوں نے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی سنتیں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے فجر کی سنتیں آپ تک پہنچی تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بعد قال حفظت اس لئے کہا تا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جس طرح حدیث شریف کے پہلے ٹکڑے کے راوی ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں کہ وہ نافع کو حدیث سنا رہے ہیں تو کوئی یہ نہ سمجھنے لگے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی نافع کو یہ حدیث سنا رہی ہیں بلکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فجر کی سنتوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔

اشکال: یہاں یہ اشکال ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں لانے سے امام ترمذی رحمہ اللہ کا کیا مقصد ہے اسی طرح اس کے بعد والی حدیث حدثنا حسن بن علی قال نا عبدالرزاق نا معمر عن الزہری الخ کا بھی کیا مقصد ہے

---

[1] بخاری کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ فجر کی سنتیں اس وقت ادا فرماتے تھے کہ میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتا تھا یعنی ازواج کے حجرے میں سنتیں پڑھتے تھے اس لئے حدثتنی حفصہ کہا۔

ایک اہم اشکال و جواب جس سے حافظ نے تعرض نہیں فرمایا: ''باب ما جاء فی تخفیف رکعتی الفجر'' میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل سورۃ کافرون و اخلاص سنت فجر میں پڑھتے دیکھا تو وہ حدیث حدیثِ باب کے معارض ہے۔ حافظ ابن حجرؒ پر تعجب ہے کہ انہوں نے فتح الباری میں اس اشکال سے تعرض نہیں کیا۔ ملا علی قاری سے میں نے شمائل ترمذی کے حاشیہ پر نقل کیا ہے کہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ابن عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کے اس واقعہ کے نقل کرنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو سنتیں پڑھتا ہوا نہیں دیکھا ہوگا اس کے بعد دیکھا ہوگا۔ یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ حالت حضر میں دیکھنے کی نفی ہے اور جن روایات میں دیکھنے کا ذکر ہے اس سے مراد حالتِ سفر میں دیکھنا ہے۔

کیونکہ ترجمۃ الباب تو اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کے بعد کی سنتیں گھر میں ادا فرماتے تھے[1] اوران احادیث میں تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ گھر میں سنتیں ادا فرماتے ہوں البتہ ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ نوافل گھر میں بھی ہوتے تھے۔

باب ماجاء فی فضل التَّطَوُّع وسِتِّ رکعات بعد المغرب

باب مغرب کے بعد چھ رکعت نفل کی فضیلت کے بارے میں

☆حدثنا ابو کُرَیْبٍ یعنی محمد بن العلاء الهَمْدَانی حَدَّثَنَا زید بن الحُباب حَدَّثَنَا عُمَرُ بن ابی خَثْعَمٍ عن یحیی بن ابی کثیر عن ابی سلمةَ عن ابی هریرةَ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من صلّی بعد المغربِ سِتَّ رکعاتٍ لم یَتَکلَّمْ فیما بینهنّ بِسُوءٍ عُدِلْنَ له بعبادةِ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ سنةً۔

قال ابو عیسی: وقد رُوِیَ عن عائشة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من صلّی بعد المغرب عشرین رکعةً بنَی اللّٰهُ لهُ بیتاً فی الجنّة۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرةَ حدیث غریب لانعرفهُ اِلّا من حدیث زیدِ بن الحُباب عن عُمَرَ بن ابی خَثْعَمٍ۔ قال: وسمعتُ محمدَ بن اسمٰعیلَ یقولُ: عمر بن عبد اللّٰه بن ابی خَثْعَمٍ منکرُ الحدیث، وضَعَّفَهُ جِدًّا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعتیں نوافل پڑھے اوران کے درمیان بری بات نہ کرے تو یہ چھ رکعتیں اس کیلئے بارہ سال کی عبادت کے برابر قرار دی جائیں گی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مغرب کے بعد بیس رکعتیں (نوافل) پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں گھر بنا دیتا ہے۔

---

[1] **عبارتِ متن کے اشکال کا جواب:** میرے نزدیک زیادہ راجح یہ ہے کہ مصنف نے ان دونوں روایتوں کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ ان کے بعض طرق میں رکعتین بعد المغرب فی البیت کے الفاظ بھی ہیں لہٰذا ترجمۃ الباب سے مطابقت بالکل ظاہر ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے۔ ہم اس حدیث کو زید بن حباب کی عمر بن ابی خثعم کی سند کے علاوہ نہیں جانتے۔

(امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا کہ عمر بن عبداللہ بن ابی خثعم منکرِ حدیث ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ انہیں بہت زیادہ ضعیف قرار دیتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

مغرب کے بعد نوافل روایاتِ ضعیفہ سے ثابت ہیں: مغرب کی نماز کے بعد جن احادیث میں نوافل پڑھنے کی فضیلت آئی ہے وہ سب ضعیف ہیں لیکن فضائل الاعمال میں ضعیف روایت قابل اعتبار[1] ہوتی ہیں۔ یہ بات جاننی چاہیئے کہ محدثین کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں پر بھی کسی عمل کی فضیلت کے متعلق کوئی ضعیف روایت آئیگی چاہے وہ اصول شرعیہ کے مطابق ہو یا مخالف چاہے جائز عمل کو ثابت کر رہی ہے یا ناجائز کو ہر صورت میں یہ ضعیف حدیث معتبر ہوگی یہ معنی مراد نہیں کیونکہ محدثین کرام کے یہاں یہ مسلم اصول ہے کہ ضعیف حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کے معتبر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر شرعی طور پر کوئی فعل فی نفسہ جائز ہو جیسا کہ ہمارے مسئلہ میں مغرب کے بعد کے نوافل فی نفسہ جائز ہیں پھر اس فعل کے متعلق کسی روایت میں فضیلت وارد ہو تو اس روایت کو باوجود ضعیف ہونے کے قبول کیا جائیگا کیونکہ ہم اس ضعیف روایت سے یہ حکم ثابت نہیں کر رہے بلکہ دوسری صحیح روایات سے مطلقاً نماز کی یہ فضیلت ثابت ہے لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اونچا درجہ لینا چاہے اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے تو ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے فضل اور اس فضیلت اور درجہ کو پالے گا نیز یاد رہے کہ اس فضیلت کے متعلق بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں جن کے تعدد طرق کی وجہ سے ان کا درجہ حسن کے درجہ سے کم نہیں۔

---

[1] **ضعیف احادیث کے معتبر ہونے کی شرائط ثلاثہ:** بلکہ حدیث ضعیف سے کوئی استحبابی حکم بھی ثابت نہیں ہوسکتا اسی وجہ سے صاحبِ درمختار نے لکھا ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں: ۱۔ حدیث انتہائی ضعیف نہ ہو، ۲۔ کسی عام اصول شرعی کے تحت داخل ہو، ۳۔ اس حدیث کے سنت ہونے کا اعتقاد نہ رکھا جائے۔ انتہی

باب ماجاء فی الرکعتین بعد العِشَاءِ

باب عشاء کے بعد دو رکعت (سنت) پڑھنا

☆حدثنا ابو سَلَمة یحیی بن خَلَفٍ حَدَّثَنَا بِشْرُ بن المُفَضَّل عن خالدٍ الحذّاءِ عن عبد اللّٰہ بن شَقِیقٍ قال : سألتُ عائشة عن صلاۃِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟فقالت: کان یصلّی قبل الظھرِ رکعتینِ وبعدھا رکعتین ، وبعد المغربِ ثِنْتَیْنِ ، وبعد العشاءِ رکعتین، وقبل الفجرِ ثِنْتَیْنِ۔ قال: وفی البابِ عن علیٍّ ، وابن عمرَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عبد اللّٰہ بن شَقِیقٍ عن عائشۃَ حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن شقیق فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (نفل) نماز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے اور بعد دو دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو، عشاء کے بعد دو اور فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

اس باب میں علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن شقیق کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

خصم کی دلیل کا جواب: (کان یصلی قبل الظھر رکعتین) اس کا جواب گزر چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر روایات میں چار رکعت پڑھنے کا ثبوت ہے اور ثقہ راوی کی زیادتی معتبر ہوتی ہے۔

باب ماجاء ان صلاۃ اللیل مَثْنَی مَثْنَی

باب رات کی نماز دو دو رکعت ہے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللیثُ عن نافعٍ عن ابن عُمَرَ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال: صلاۃُ اللیلِ مَثْنَی مَثْنَی فإذا خِفْتَ الصبحَ فأَوْتِرْ بواحدۃٍ، واجعلْ آخِرَ صلاتِكَ وِتْراً۔

قال ابو عیسی: وفی الباب عن عَمْرِو بن عَبَسَۃَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی ھذا عند اھل العلم: ان صلاۃَ اللیل مَثْنَی مَثْنَی۔ وھو قول سفیانَ الثوریِّ ، وابن المبارکِ ، والشافعیِّ، واحمدَ، واسحٰق۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کی نماز (تہجد) دو دو رکعت ہے پھر جب تمہیں صبح صادق کا اندیشہ ہو تو دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت ملا کر پڑھ لو اور آخری نماز کو وتر بنالو۔

اس باب میں عمرو بن عبسہ سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعتیں ہے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔

﴿تشریح﴾

رات کی نماز میں دو رکعت پر سلام نہ پھیرنا افضل ہے: حدیثِ باب میں تو اسی طرح ہے جبکہ بعض روایات میں "صلوٰۃ اللیل والنہار[1] مثنی مثنی" ہے۔ ان دونوں حدیثوں کا مطلب یہی ہے کہ ہر دو رکعتوں[2] پر تشہد پڑھنا چاہیئے یہ احادیث صراحۃً دلالت نہیں کرتیں کہ دو رکعت پر سلام پھیرنا مراد ہو نیز چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دن میں چار رکعت پڑھنے کا ثبوت ہے لہٰذا یہ کہا جائیگا کہ دن کی نماز میں جس طرح چار چار رکعت پڑھ سکتے ہیں دو دو رکعت بھی پڑھنا جائز ہے۔

---

[1] صلوٰۃ اللیل والنہار میں لفظ والنہار کے اضافہ پر جمہور محدثین نے کلام کیا ہے۔

[2] بلکہ یہی معنی متعین ہے تاکہ جس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چار رکعت نماز کا ثبوت ہے اس روایت اور حدیث باب میں تعارض نہ ہو۔

حدیثِ باب کی تشریح میں ائمہ اربعہ کے اقوال: اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "صلوٰۃ اللیل مثنی مثنی" کی تفسیر میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام احمد رحمہما اللہ کے ہاں یہ حدیث افضل طریقے کو بیان کر رہی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث میں جائز طریقے کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا ان کے نزدیک چونکہ مثنی مثنی کے لفظ میں جائز طریقے کا حصر ہے اس لئے رات میں دو رکعتوں سے زیادہ ایک سلام سے پڑھنا ناجائز ہے۔ حنفیہ کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر دو رکعت پر تشہد پڑھی جائیگی جیسا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے یہ مطلب بیان کیا ہے یا حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ کم از کم دو رکعت نماز مشروع ہے اس سے کم نماز پڑھنا صحیح نہیں اور اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ اہل عرب مثنی کی ضد طاق لاتے ہیں یعنی دو رکعت نماز جائز ہے نہ کہ ایک رکعت۔

حدیثِ باب شوافع کے مذہب پر صریح ہے: احناف کی طرف سے جواب: (قولہ فاذا خفت الصبح فاوتر بواحدۃ) یہ حدیث شوافع کے مذہب پر صریح ہے کہ وتر کی ایک رکعت ہے، علمائے احناف کہتے ہیں کہ اوتر کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے شفع کو ایک رکعت ملا کر طاق بنالو، مثلا اس سے پہلے چھ رکعت نماز پڑھی ہے پھر ایک شفعہ (دو رکعت) پڑھو اور اس کے ساتھ ایک رکعت ملا کر اس آخری شفعہ کو طاق بنالیا جائے تو پوری نماز طاق بن جائیگی مجموعہ کے اعتبار سے۔

احناف کی توجیہ پر اعتراض: لیکن یہ جواب تکلف سے خالی[1] نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "اوتر بواحدۃ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک رکعت الگ سے پڑھو نہ کہ پہلی دو رکعتوں کے ساتھ اس کو ملاؤ ورنہ اس جواب کی صورت[2] میں یہ خرابی لازم آئیگی کہ وتر کی پہلی دو رکعتیں وتر کی نیت کے بغیر ادا کریگا کیونکہ جب وہ دو رکعتیں نفل پڑھے گا یا تو اسمیں نفسِ نماز کی نیت ہوگی یا نفل کی نیت ہوگی؟ دونوں صورتوں میں وتر واجب ایسی نیت سے ادا نہیں ہوتا کیونکہ وتر کے اندر شروع تحریمہ سے ہی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اب دو رکعتیں پڑھنے کے بعد اس نے جو ایک رکعت طلوع فجر سے پہلے پہلے پڑھی ہے اگر چہ یہ ایک رکعت واجب کی نیت سے ہو پھر بھی ایسی تین رکعات جس میں دو نفل ہوں اور ایک واجب رکعت ان سے حنفیہ کے اصول کے مطابق وتر کی نماز صحیح نہیں ہونی چاہیئے۔

صحیح جواب: لہٰذا حدیث باب کا صحیح جواب یہ ہے کہ ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھنے کا عمل ابتداء اسلام میں مشروع تھا پھر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "لا بتیراء" یا "نھی عن البتیراء" سے منسوخ ہو گیا کیونکہ اگر حدیث شریف کا یہی معنی مراد لیا جائے جیسا کہ حنفیہ لیتے ہیں (کہ شفع کی دو رکعت پڑھکر ایک رکعت وتر کی ملالو) یہ حدیث کا ایسا مطلب ہے کہ اس حدیث کے قائل بھی اس مطلب سے خوش نہیں ہیں۔

---

[1] قلت: لیکن اس تھوڑے سے تکلف کو احادیث کے تعارض کی صورت میں برداشت کیا جائیگا۔

[2] قلت: لیکن اس میں یہ خرابی اسوقت لازم آئیگی جب نفل کی دو رکعت پڑھنے کے بعد اس کے ساتھ وتر کی ایک رکعت ملائے جبکہ حنفیہ کہتے ہیں کہ پہلی دو رکعت وتر ہی کی شفع رکعتیں ہونگی اور اس کے ساتھ وتر کی ایک طاق رکعت کو مزید ملالیا جائیگا لہٰذا حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کیونکہ اب انکے قاعدے کے مطابق حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ وتر کے پچھلے شفعہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر اس کو طاق بنالو۔ حدیث میں صرف ایک رکعت کو اسلئے ذکر کیا ہے کہ اسی ایک رکعت کے ذریعہ وتر باقی تہجد کی نماز سے ممتاز ہو جاتی ہے اور حدیث شریف کی یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے جس زمانے میں وتر کا حکم استحبابی تھا (لہٰذا دو رکعت نفل کی نیت سے اور تیسری رکعت وتر کی نیت سے پڑھی جاتی تھیں تو پھر یہ مذکورہ اعتراض وارد نہیں ہوگا۔ از مترجم)

کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک رکعت وتر[1] پڑھتے تھے لہٰذا حدیث شریف کا ایسا معنی مراد لینا جو راوی کے عمل کے خلاف ہو کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ دوسری احادیث جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہا سے مروی ہے وہ صراحۃً دال ہیں کہ وتر تین رکعت پڑھی جائیگی اور ان صحابیہ کا اپنا عمل بھی تین رکعت وتر کی تائید کررہا ہے۔

وتر کو آخری نماز بنانے کا مطلب: (قولہ واجعل آخر صلوتك وترا) بعض وہ حضرات جو ظاہرِ حدیث[2] پر عمل کرتے ہیں انہوں نے حدیث باب سے استدلال کیا ہے کہ وتر کے بعد کسی طرح کی نماز پڑھنا منع ہے لیکن وتر کے بعد نماز کے متعلق بہت سی صریح حدیثیں اس قول کو رد کرتی ہیں اسی طرح صحابہ کا عمل بھی اس قول کے خلاف ہے لہٰذا حدیث باب کا حکم یا تو استحبابی ہے اور یا حدیث شریف کا معنی یہ ہے اور یہی معنی صحیح بھی ہے کہ تم اپنے اوپر ضروری نمازوں میں سے آخری نماز وتر پڑھا کرو اس طرح فرائض اور وتر کے درمیان ترتیب ثابت ہو جائیگی نیز وتر کا واجب ہونا بھی ثابت ہو جائیگا لہٰذا اگر کوئی شخص عشاء سے پہلے وتر پڑھ لے تو وہ اس کا اعادہ کریگا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اجعل آخر صلوتك وترا" سے وتر کو فرض نماز سے موخر کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ وتر کو فرائض میں شمار کیا گیا ہے لہٰذا یہ فرض عملی ہے۔

---

[1] لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں کیونکہ اوتر بواحدۃ کے قائل ابن عمر رضی اللہ عنہما نہیں بلکہ اس کے قائل تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک رکعت وتر کا ثبوت نہیں ہے۔

خصم کے پاس وتر بر کعۃ واحدۃ پر کوئی دلیل نہیں ہے: ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خصم کے پاس کوئی حدیث موجود نہیں جو اس پر دال ہو کہ وتر الگ سے ایک رکعت ہے نہ اس کا ثبوت کسی صحیح حدیث میں ہے نہ ضعیف میں۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "نهى عن البتيراء" مروی ہے۔ یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہوا کرتی ہے۔ انتہی۔ قلت: حضرت سہارنپوریؒ نے بذل میں حدیث بتیراء کے بہت سے طرق ذکر کیئے ہیں جو بذل المجہود میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

[2] **مسئلہ نقضِ وتر:** امام اسحٰقؒ کا مذہب یہ ہے کہ جس آدمی نے رات کے شروع حصہ میں وتر پڑھ لیئے پھر اسے تہجد میں اٹھنے کی توفیق ہوئی یا اس کا نفل پڑھنے کا ارادہ ہوا تو اسے چاہیئے کہ پہلے ایک رکعت پڑھ کر گذشتہ وتر کو شفع بنالے (یہ دوسرا وتر ہوا) پھر جتنی چاہے نماز پڑھتا رہے پھر تیسری مرتبہ وتر پڑھے انہوں نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کیا ہے جمہور کا مذہب ان کے خلاف ہے جیسا کہ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کی بذل میں باب نقض الوتر میں تفصیل کے ساتھ ہے۔

باب ماجاء فی فضل صلاۃِ اللیل

باب رات (تہجد) کی نماز کی فضیلت

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو عَوَانَةَ عن ابی بِشرٍ عن حُمیدِ بن عبد الرحمٰنِ الحِمْیَرِیِّ عن ابی ھریرةَ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: اَفضَلُ الصیامِ بعدَ شھر رمضانَ شَھرُ اللّٰہِ المُحَرَّمُ، وافضلُ الصلاۃِ بعد الفریضة صلاۃُ اللیلِ۔قال: وفی البابِ عن جابرٍ، وبِلالٍ، وابی امامَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی ھریرة حدیث حسن۔

قال ابو عیسی: و ابو بِشرٍ اسمه جعفر بن ایاس وھو جعفر بن ابی وحشیة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رمضان کے روزوں کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے اللہ تعالیٰ کے مہینے محرم کے ہیں اور فرائض کے بعد سب سے افضل نماز تہجد کی نماز ہے۔

اس باب میں جابر، بلال اور ابوامامہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔ ابو بشر کا نام جعفر بن ایاس ہے اور وہ جعفر بن ابو وحشیہ ہیں۔

﴿تشریح﴾

ایک اہم اشکال: (افضل الصیام بعد شھر رمضان شھر اللہ المحرم) یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے میں دو سال کے روزوں کا ثواب ملتا ہے اور محرم کا روزہ رکھنے میں ایک سال کے روزوں کا ثواب ملتا ہے۔

جواب: حدیث باب میں بعد شہر رمضان میں بعدیت سے مراد بعدیت متصلہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ رمضان کے بعد محرم کے روزوں کا درجہ ہو بلکہ عرفہ کا روزہ اس سے افضل ہے لیکن یہ جواب ضعیف ہے۔

صحیح جواب[1]: یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع میں یہی اطلاع دی گئی تھی کہ محرم کے روزے افضل ہیں اس حدیث کے

---

[1] **تیسرا جواب:** قلت: اس تعارض کا یہ جواب بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث باب میں شھر اللہ الحرام سے مراد پورے محرم کی فضیلت ہے لہٰذا اب یہ مطلب ہوگا کہ مہینوں کے اعتبار سے محرم کے پورے مہینے میں نفل روزے رکھنا ذی الحجہ کے پورے مہینے میں نفلی روزوں سے افضل ہے اگرچہ ۹ ذی الحجہ کے روزوں کو خاص دن کے اعتبار سے اس پر فضیلت حاصل ہے۔ شوافع کی ایک جماعت نے اس قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ شافعی مذہب کی کتاب الانوار الساطعہ میں ہے کہ مہینوں میں سب سے افضل مہینہ رمضان کا ہے پھر محرم پھر رجب پھر ذی الحجہ پھر ذوالقعدہ پھر شعبان پھر باقی سارے مہینے۔

بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے روزے کی فضیلت بیان فرمائی ہے لہٰذا زمانے کے اختلاف کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔

باب ماجاء فی وصف صلاة النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم باللیلِ

باب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد کی نماز کی کیفیت کے بیان میں

☆حدثنا اسحٰقُ بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالکٌ عن سعید بن ابی سعیدٍ المقبُرِیِّ عن ابی سلمَةَ انه اخبره: انه سأَلَ عائشةَ: کیف کانت صلاةُ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم باللیل فی رمضانَ؟ فَقَالَتْ: ماکان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یزیدُ فی رمضانَ ولافی غیره علی احدَی عَشْرَةَ رکعةً : یصلّی اربعاً، فلا تَسْئَلُ عن حُسْنِهِنَّ وطُولِهِنَّ ، ثم یصلّی اَر بعاً فلا تَسْئَلُ عن حسنهنّ وطولهنّ، ثم یصلّی ثلاثاً۔ فقالت عائشةُ: فقلت: یارسولَ اللّٰهِ، اَتَنَامُ قبلَ ان تُوتِر؟ فقال: یا عائشةُ، اِنَّ عَیْنَیَّ تنَامَانِ ولا یَنَامُ قَلْبِی۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا اسحٰقُ بن موسی الانصارِیُّ حَدَّثَنَا مَعْنُ بن عیسی حَدَّثَنَا مالکٌ عن ابن شهَابٍ عن عروةَ عائشةَ: اَنَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان یصلّی مِن اللیلِ اِحدَی عشرة رکعةً، یُوتِرُ منها بواحدةٍ، فاِذا فَرَغَ منها اضْطَجَعَ علی شِقِّهِ الایمنِ۔

☆حدثنا قتیبة عن مالکٍ عن ابن شهابٍ:نحوهَ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی رمضان میں رات کی نماز کی کیفیت کیا تھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں اس طرح پڑھتے تھے کہ ان کی عمدگی اور درازی کے بارے میں مت پوچھو (یعنی رمضان کی وجہ سے رکعتوں کی تعداد میں تو اضافہ نہیں فرماتے تھے مگر کیفیت بدل جاتی) پھر اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتے ان کی عمدگی اور درازی کے متعلق بھی نہ پوچھو اس کے بعد تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا (یعنی میں چوکنا سوتا ہوں کہ اگر کوئی ناقض وضو بات پیش آجائے تو مجھے اس کا احساس ہو جائے گا اسلئے میری نیند ناقض وضو نہیں۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے ان میں سے

ایک رکعت پڑھ کر گذشتہ شفعہ کو طاق بنالیتے۔ پھر جب اس سے فارغ ہوتے تو دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔قتیبہ بن مالک سے اورانہوں نے ابن شہاب سے اسی کے مثل روایت کی ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حضرت عائشہؓ کے جواب کی وضاحت:(انه سال عائشة رضي الله عنها كيف كانت صلوٰة رسول الله صلى الله عليه و سلم في رمضان) **۱)** سائل یہ سمجھ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں تہجد میں بکثرت نوافل پڑھتے ہوں گے کیونکہ رمضان کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد کی نماز کی کیفیت اسے معلوم تھی ، اسلئے اس نے خاص رمضان کی تہجد کے متعلق سوال کیا گویا اس نے جو سن رکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی راتوں میں عبادات میں بہت زیادہ مشقت برداشت کرتے ہیں جیسا کہ بہت سی روایتوں میں وارد ہے تو اس سے سائل یہ سمجھا کہ رمضان کی تہجد کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیر رمضان سے زیادہ رکعتیں ادافرماتے ہوں گے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی صرف رمضان کے متعلق زیادہ رکعتوں کی نفی فرمائی ہے سائل کے سوال **کیف کانت صلوٰۃ** میں جو کیفیت کے متعلق سوال تھا اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔سائل بھی اس جواب پر خاموش ہوگیا اور نہ ہی اس نے یہ اعتراض کیا کہ میں تو رات کی نماز کی کیفیت پوچھ رہا ہوں **۲)** یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "فلا تسئل عن حسنهن و طولهن" سے اس کی کیفیت کے متعلق سوال کا جواب مرحمت فرمادیا۔شروع میں "ما كان يزيد في رمضان و لا في غيره" **کا اضافہ** اس لئے فرمایا کہ انہوں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ رکوع وسجود کی کثرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لہٰذا کثرت رکعت کی نفی کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گیارہ رکعت تہجد سے زیادہ کی نفی اکثر احوال کے اعتبار سے ہے: یہ بات جاننی چاہیئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گیارہ رکعت سے زیادہ تہجد کی جو نفی کی ہے یہ نفی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر احوال کے اعتبار سے ہے کہ عموماً گیارہ رکعت ادافرماتے تھے ورنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گیارہ رکعت سے زیادہ تہجد پڑھنے کا ثبوت[1]

---

[1] بلکہ خود عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی گیارہ رکعت سے زیادہ تہجد والی روایت مروی ہے چنانچہ موطا مالک میں ہے کہ عروہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعت نماز ادافرماتے تھے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تیرہ رکعت بلکہ اس سے بھی زیادہ مختلف روایتیں مروی ہیں اسی طرح ام سلمہ، جابر، زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہم سے تیرہ رکعت تہجد کی روایت مروی ہے۔نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سولہ رکعت رات کی نماز ادافرماتے تھے اس کی تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں "قوله في رمضان" اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں تہجد کے وقت گیارہ رکعت نماز ادافرماتے تھے لہٰذا رمضان کی راتوں میں عشاء کی نماز کے بعد جو تراویح کا ثبوت ہے وہ حدیث باب کے منافی نہیں لہٰذا تراویح بیس رکعات ادافرماتے ہونگے اور حدیث میں تو رمضان میں تہجد والی نماز کا ذکر ہے۔انتہی

ہے بعض علماء نے ان روایات میں یہ جوتطبیق دی ہے کہ اگر عشاء کے بعد کی دو رکعتوں کو نہ ملایا جائے تب تو صلوٰۃ اللیل کی گیارہ رکعتیں ہوتی ہیں ورنہ تیرہ ہوتی ہیں یہ تطبیق صحیح نہیں کیونکہ صلوٰۃ اللیل کے لفظ سے عموماً ذہن تہجد کی نماز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے اٹھنے کے بعد اور عشاء کی نماز سے کافی دیر کے بعد نماز تہجد شروع فرماتے تھے لہٰذا عشاء کے بعد کی دو رکعتوں کو صلوٰۃ اللیل کے ساتھ کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے۔

نوافل لیلیہ بسلام واحد افضل ہیں: (ثم یصلی اربعا فلا تسال عن حسنهن و طولهن) اس حدیث سے احناف نے استدلال کیا ہے کہ رات کے نوافل ایک سلام کے ساتھ چار رکعت پڑھنے چاہیئے کیونکہ حضرت عائشہؓ فرما رہی ہیں "کان یصلی اربعاً" لہٰذا جب انہوں نے اربعاً کو ایک لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کے بعد "ثم یصلی اربعاً" کو دوسرے جملہ میں تو ان کے اس صنیع سے معلوم ہو رہا ہے کہ دوسری چار رکعتیں پہلی چار رکعتوں سے جدا ہوتی تھیں اس طرح کہ پہلی چار رکعتوں پر سلام پھیر دیتے تھے بخلاف نفس چار رکعتیں ان میں دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے ورنہ تو حضرت عائشہؓ کو "کان یصلی مثنی مثنی" کے ساتھ اس نماز کو تعبیر کرنا چاہیئے نہ کہ "کان یصلی اربعا" کے ساتھ......اسی طرح "ثم یصلی ثلاثا" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس تعبیر کا تقاضہ یہ ہیکہ وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہ پھیرا جائے ورنہ ثم یصلی ثلاثا نہ فرماتیں بلکہ اگر دو رکعتوں پر سلام پھیرا کرتے تھے تو وتر ایک رکعت ہوتی (تو ثم یوتر برکعة فرمانا چاہئے تھا) تو یہ تعبیر نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تین رکعت وتر پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وتر ثلاث رکعات بسلام واحد ہے۔

اس استدلال پر اعتراض: لیکن یہ بات آپ خوب جانتے ہیں کہ حنفیہ کا حدیث باب سے استدلال تام نہیں کیونکہ اس حدیث میں چار رکعتوں پر جو فصل کا ذکر ہے اسی طرح آٹھ رکعت پر وتر سے پہلے فصل کا ذکر ہے اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت اور آٹھ رکعت کے بعد نیند کی غرض سے یا اپنے گھر والوں کے ساتھ باتیں کرنے کیلئے یا تھوڑی دیر لیٹنے کی غرض سے فصل فرماتے تھے یہ مطلب نہیں کہ چار رکعت پر سلام کے ذریعے فصل ہوتا تھا ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ سوال "اتنام قبل ان توتر" کا کیا مطلب ہوگا لہٰذا حدیث باب سے دو رکعت پر سلام پھیرنے کی نفی نہیں ہے۔ فافہم۔

(اتنام قبل ان توتر) اس سوال کا منشا یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دیکھا کہ چار رکعت نماز پڑھتے ہیں پھر نیند فرماتے ہیں پھر چار رکعت ادا فرماتے ہیں تو انہوں نے سو کر بلا وضو نماز کو مستبعد سمجھا لیکن چونکہ نوافل میں تساہل برتا جاتا ہے اس لئے انہوں نے نوافل کے متعلق سوال نہیں کیا پھر جب انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کو دیکھا کہ دوبارہ نیند سے بیدار ہوکر بغیر وضو کئے وتر ادا فرمار ہے ہیں تو اب یہ بات ان کو بڑی ہی عجیب سی معلوم ہوئی تو انہوں نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "ان عینی تنامان" الخ کا مطلب یہ ہے کہ نیند کی حالت میں...... میں حدث وغیرہ[1] سے محفوظ ہوں لہٰذا نیند سے میرا وضو نہیں ٹوٹتا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کا وضو نیند سے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہاں پر سبب کو مسبب کے قائم مقام بنادیا جاتا ہے۔ تاکہ آسانی بھی ہو نیز عبادات کے اندر احتیاط بھی برتی جائے[2]۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فجر کی سنتوں سے قبل وبعد استراحت فرمانا: (فاذا فرغ منها اضطجع علی شقه الایمن) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی سنتوں سے پہلے بھی[3] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استراحت کا ثبوت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک فعل پر مداومت نہیں فرماتے تھے بلکہ کبھی سنتوں سے پہلے استراحت کیلئے لیٹتے، کبھی سنتوں کے بعد کیونکہ اس سے مقصود یہ تھا کہ تھوڑا آرام مل جائے تاکہ فرض نماز کی ادائیگی میں تھکاوٹ نہ ہو اور یہ مقصود تو جس طرح فجر کی سنتوں سے پہلے لیٹنے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح فجر کی سنتوں کے بعد بھی لیٹنے سے حاصل ہوتا ہے۔

باب منه

باب اسی سے متعلق

☆حدثنا ابو كُرَيْبٍ قال حَدَّثَنَا وكيعٌ عن شعبةَ عن ابی جَمْرَةَ الضُّبَعِیِّ عن ابن عباس قال: كان النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم یصلِّی من اللیلِ ثلاثَ عَشْرَةَ رکعةً۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسنٌ صحیحٌ۔ وابو جَمْرَةَ الضُّبَعِیُّ اسمه نَصْرُ بنِ عِمْرَانَ الضُّبَعِیُّ۔

---

[1] یعنی انبیاء علیہم السلام کو نیند میں حدث لاحق ہو اور وہ اس سے بے خبر رہیں ایسا نہیں ہوسکتا لہٰذا اب یہ اشکال نہ ہو کہ حدث کی علت تو استرخاء مفاصل ہے اور یہ علت تو انبیاء اور غیر انبیاء سب میں پائی جاتی ہے۔

[2] اصول شاشی کے شارح صاحب فصول الحواشی لکھتے ہیں کہ کبھی کبھار سبب کو علت کے قائم مقام کردیا جاتا ہے جب نفسِ علت پر اطلاع مشکل ہو اس کا مقصد مکلف پر آسانی پیدا کرنا ہوتا ہے اس سبب کی موجودگی میں علت کا اعتبار نہیں کیا جاتا اور حکم کا مدار سبب پر ہوتا ہے کیونکہ حقیقت علت پر عمل کرنے کی صورت میں مشقت شدید ہوتی ہے، مثلاً کامل نیند کو جب حدث کے قائم مقام بنادیا گیا تو حقیقتِ حدث کا اعتبار نہیں کیا جائیگا کیونکہ نیند کے اندر حقیقتِ حدث پر اطلاع متعذر ہے۔

[3] یعنی جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی سنتوں کے بعد استراحت مروی ہے اسی طرح فجر کی سنتوں سے پہلے بھی مروی ہے اس مسئلہ کے متعلق علماء کے چھ مذاہب گزر چکے ہیں۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔
امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

باب منہ میں حدیث باب کو الگ سے ذکر کرنے کی وجہ: (حدثنا ابو کریب) اس باب کو الگ سے ذکر کیا کیونکہ اس باب میں ایسی زیادتی ہے[1] جو گذشتہ روایت میں نہیں۔

باب منه

باب اسی سے متعلق

☆حدثنا هناد ابو الأحْوَصِ عن الاعمشِ عن ابراهيم عن الاَسْوَدِ بن يزيدَ عن عائشةَ قالت: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يصلّي مِن الليلِ تِسْعَ ركَعاتٍ۔

قال: وفي الباب عن ابي هريرةَ، وزيدِ بن خالدٍ، والفضلِ بن عباسٍ۔ قال ابو عيسى: حديث عائشةَ حديث حسن غريب من هذاالوجهِ۔

☆ورواه سفيانُ الثوريُّ عن الاعمشِ: نحوَ هذا، حَدَّثَنا بذلك محمودُ بن غَيْلَانَ حَدَّثَنا يحيى بن آدمَ عن سفيانَ عن الاعمشِ۔قال ابو عيسى: واكثرُ مارُوِىَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم في صلاة الليلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ ركعةً مع الوترِ، واقلُّ ماوُصِفَ من صلا ته بالليل تِسْعُ ركعاتٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔
اس باب میں ابو ہریرہ، زید بن خالد اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں۔
امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث اس سند سے حسن غریب ہے۔ سفیان ثوری نے اسے اعمش سے اسی کے مثل روایت کیا ہے۔ جس کی سند اس طرح ہے کہ ہم سے روایت کی اسی کے مثل محمود بن

---

[1] اس باب میں وہ زیادتی یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے۔

غیلان نے ان سے یحیٰی بن آدم نے ان سے سفیان نے ان سے اعمش نے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کے بارے میں ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ (وتروں کو ملاکر) تیرہ رکعتیں ہیں اور کم از کم نو رکعتیں منقول ہیں۔

﴿تشریح﴾

کلامِ ترمذی کی وضاحت: (قولہ حدیث عائشۃ حدیث غریب من ھذا الوجہ) **اس حدیث کے غریب** ہونے کی وجہ ابراہیم یا اسود یا اعمش کا متفرد ہونا ہے ورنہ اعمش سے نچلے راویوں میں انکا متابع موجود ہے[1] پھر حدیث کے غریب ہونے کا کیا مطلب؟۔

اس باب کی غرض: اس باب کو الگ سے ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس حدیث سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز حنفیہ کے مذہب کے مطابق چھ رکعت ثابت ہوتی ہیں اور تین رکعت وتر جبکہ شافعیہ کے مذہب کے مطابق آٹھ رکعت تہجد اور ایک رکعت وتر جبکہ گذشتہ روایت میں اس کے علاوہ مذکور ہے۔

امام ترمذی کے قول ''واقل مااوصف الخ'' پر اہم اعتراض اور جوابات: (قولہ واقل ما وصف من صلوتہ من اللیل تسع رکعات) مصنف نے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تہجد کی کم از کم نو رکعت مروی ہیں لیکن ابواب الوتر میں چند ہی صفحات کے بعد آئیگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جب قویٰ کمزور اور آپ ضعیف ہو گئے تو آپ رات کو سات رکعت ادا فرماتے تھے لہٰذا یا تو یہ کہا جائیگا کہ مصنف سے اس روایت کا ذہول ہو گیا ہے یا یہ کہا جائیگا کہ "اقل ما وصف" کا مطلب صحت کے زمانہ میں نو رکعت کا ثبوت ہے اور سات رکعت تہجد والی روایت اس وقت کی ہے جب آپ کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے اور آپ کو ضعف لاحق ہو گیا تھا۔

باب اِذا نامَ عن صلاتِہ باللیل صلّٰی بالنہار

باب اس بارے میں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تہجد کی نماز رہ جاتی تو اسے دن میں پڑھتے

☆حدثنا قتیبۃُ حَدَّثَنَا ابو عَوانَۃَ عن قتادۃَ عن زُرَارَۃَ بن اَوْفٰی عن سعد بن ھشامٍ عن عائشۃَ

---

[1] چنانچہ خود مصنف نے محمود بن غیلان کی روایت سے ان کا متابع ذکر کیا ہے نیز مصنف نے اپنی شمائل میں اس روایت کو دونوں طریق سے نقل کیا ہے اور اس پر غریب ہونے کا حکم بھی نہیں لگایا اور شاید مصنف نے یہاں پر غریب ہونے کا حکم لگا کر شمائل میں اس حکم کو لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

قالت: کان النبیؐ اِذا لم یُصَلِّ مِن اللیلِ، مَنَعَهُ مِن ذٰلك النومُ او غَلَبَتْهُ عَیْنَاهُ: صلّٰی مِن النهار ثِنْتَیْ عَشْرَةَ رکعةً۔قال ابو عیسی:هذاحدیث حسن صحیحٌ۔

حَدَّثَنا عباسٌ هو ابن عبد العظیم العَنْبَرِیُّ حَدَّثَنَا عَتَّاب بن المُثَنّٰی عن بَهْز بن حَکِیمٍ قال: کان زُرَارَةُ بن اَوْفٰی قاضِیَ البصرة، و کان یَؤُمُّ فی بَنِی قُشَیْرٍ، فقرأ یوماًفی صلاة الصبحِ: فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُور فذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یَوْمٌ عَسِیرٌ خرَّ مَیِّتاً، فکنتُ فیمن احتملَه الی داره۔قال ابو عیسی: وسعدُ بن هِشامٍ هو ابن عامرٍ الانصاریُّ، وهشامُ بن عامرٍ هو من اصحاب النبیؐ صلی اللّٰه علیه وسلم۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نیند یا آنکھ لگ جانے کی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکتے تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔روایت کی ہم سے عباس نے جو بیٹے ہیں عبدالعظیم عنبری کے انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا عتاب بن مثنی نے وہ روایت کرتے ہیں بہز بن حکیم سے کہ زرارہ بن اوفی بصرہ کے قاضی تھے اور قبیلہ بنو قشیر کی امامت کرتے تھے ایک دن فجر کی نماز میں انہوں نے پڑھا"فاذا نقر فی ......"(ترجمہ: جب پھونکا جائے گا صور تو وہ دن بہت سخت ہوگا) تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور فوت ہو گئے انہیں ان کے گھر پہنچانے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سعد بن ہشام کے والد ہشام عامر انصاری کے بیٹے ہیں اور یہ ہشام بن عامر صحابی ہیں۔

﴿تشریح﴾

ایک وہم اور اسکا جواب:(قوله منعه من ذلك النوم او غلبته عيناه صلى من النهار ثنتى عشرركعة) اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ رات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت تہجد ادا فرماتے تھے کیونکہ قضاء اتنی رکعت کی ہوگی جتنی رکعت ادا فرماتے ہوں حالانکہ کسی بھی روایت میں بارہ رکعت[1] تہجد کا ثبوت نہیں اس لئے اس کا جواب یہ ہے کہ ان بارہ رکعتوں میں (آٹھ رکعت تہجد کی قضا ہوتی تھی اور) چار رکعت چاشت کی ہوتی تھیں۔

---

[1] یعنی محدثین کے ہاں ان روایات کا ثبوت نہیں اسی وجہ سے جن احادیث میں وتر سمیت تہجد کی نماز گیارہ رکعت سے زیادہ ثابت ہے محدثین ان کی تاویل کرتے ہیں۔

زرارہ راوی کی جلالتِ شان کا بیان: (قولہ کان زرارۃ بن اوفی قاضی البصرۃ الخ) **مصنف کا** مقصود ان کی جلالت شان اور خوف وخشیت کا بیان ہے (کہ ان کا انتقال اس حالت میں اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے ہوا۔ از مترجم)

(قولہ و کنت فیمن احتملہ الی دارہ) کنت کا قائل بہز بن حکیم ہے۔

(سعد بن هشام و هو ابن عامر) **ھوضمیر کا مرجع** ہشام ہے نہ کہ سعد[1]۔

باب ماجاء فی نُزُولِ الرَّبِّ عزّوجلّ الی السَّمَاءِ الدُّنیَا کلَّ لیلۃٍ

باب اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہر رات آسمان دنیا پر نزول فرمانا

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا یعقوبُ بن عبد الرحمٰنِ الإسکندَرانیُّ عن سُهَیلٍ بن ابی صالحٍ عن ابیه عن ابی هریرةَ اَنَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: یَنزِلُ اللّٰهُ اِلی السَّمَاءِ الدُّنیَا کُلَّ لیلةٍ حِینَ یَمضِی ثُلُثُ اللیلِ الأوَّلُ۔ فیقولُ: اَنَا المَلِكُ، مَن ذَاالَّذِی یَدعُونِی فَاَستَجِیبَ لَهُ: مَن ذاالَّذِی یَسأَلُنِی فَاُعطِیَهُ، مَن ذاالَّذِی یَستَغفِرُنی فَاَغفِرَله، فلا یزالُ کذٰلك حتّٰی یُضِیءَ الفجرُ۔ قال: وفی الباب عن علیٍّ بن ابی طالبٍ، وابی سعیدٍ، ورِفاعَةَ الجُهَنِیِّ، وجُبَیرِ بنِ مُطعِمٍ، وابنِ مسعودٍ، وابی الدَّردَاءِ، وعثمانَ بن ابی العاصِ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرةَ حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد رُوِیَ هٰذا الحدیثُ من اوجهٍ کثیرةٍ عن ابی هریرةَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم۔ ورُوِیَ عنه انه قال: یَنزِلُ اللّٰهُ عزّوجلّ حینَ یَبقَی ثُلُثُ اللیلِ الآخِرُ۔ وهو اصحُّ الروایاتِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہر رات کے پہلے تہائی حصے کے گزرنے پر آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں میں بادشاہ ہوں کوئی ہے جو مجھ سے دعا مانگے کہ میں

---

[1] انکا سلسلہ نسب اس طرح ہے سعد بن ہشام بن عامر الانصاری، عامر حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی ہیں یہ سعد صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہیں۔

اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں؟ کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت کا طلبگار ہو کہ میں اس کو بخش دوں؟ پھر اسی طرح برابر ارشاد فرماتے رہتے ہیں یہاں تک کہ طلوع فجر ہو جاتی ہے۔

اس باب میں علی بن ابی طالب، ابوسعید، رفاعہ جہنی، جبیر بن مطعم، ابن مسعود، ابودرداء، عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے اور یہ حدیث بہت سی سندوں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو نزول فرماتے ہیں۔ اور یہ روایت اصح ہے۔

﴿تشریح﴾

لفظ "اول" "ثلث" کی صف ہے: (حین یمضی ثلث اللیل الاول) بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رات کے آخری ثلث میں اللہ تعالیٰ نزول فرماتے ہیں، بہرحال لفظ اول دونوں جگہ لفظ ثلث کی صفت ہے نہ کہ لیل کی یعنی رات کی پہلی تہائی اور رات کی آخری تہائی حصہ میں اللہ تعالیٰ نزول فرماتے ہیں بہرحال رات کے آخری تہائی حصہ میں جو رحمت اور قبولیت اور فضیلتیں ہیں وہ پہلے تہائی حصہ میں نہیں ہیں۔

باب ماجاء فی قراءۃ اللیلِ

باب تہجد (رات) کو قرآن پڑھنا

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا یحیی بن اِسحٰق وھو السَّالِحِینِیُّ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بن سلَمة عن ثـابتٍ البُنَانِیِّ عن عبدِ اللّٰہِ بن رَبَاحٍ الانصارِیِّ عن ابی قتادۃ: ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لابی بکرٍ: مررتُ بِكَ وانت تقرأُ وانت تَخْفِضُ مِن صوتِك، فقال: اِنِّی اَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَیْتُ، قال: ارْفَعْ قلیلاً۔ وقال لِعُمَرَ: مررْتُ بك وَانت تقرأُ وانت ترفع صوتَك، قال: اِنِّی اُوقِظُ الوَسْنَانَ، واَطْرُدُ الشیطانَ، قال: اخْفِضْ قلیلاً۔ قال وَفِی البابِ عن عائشةَ، واُمِّ ھانیءٍ، وانسٍ، وامِّ سلَمة، وابن عباسٍ۔قال ابو عیسی: ھٰذا حدیث غریبٌ۔وانما اَسْنَدَهُ یحیی بن اِسحٰق عن حماد بن سلَمَةَ، واکثرُ الناسِ انما رَوَوْاھذا الحدیثَ عن ثابتٍ عن عبد اللّٰہ بن رَبَاحٍ مُرْسَلاً۔

☆حدثنا ابو بکرٍ محمدُ بن نافعٍ البَصْرِیُّ حَدَّثَنَا عبد الصمد بن عبدِ الوارثِ عن اِسمٰعیلَ بن

مسلمٍ العبدیٌّ عن ابی المتوکلِ النّاجیِّ عن عائشۃَ قالت: قام النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بآیۃٍ مِن القرآنِ لیلۃً۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن غریبٌ من ھذا الوجہِ۔

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا اللیثُ عن معاویۃَ بن صالحٍ عن عبد اللّٰہ بن ابی قیسٍ قال: سالتُ عائشۃَ: کیف کان قِراءۃُ النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم باللیلِ، اکان یُسِرُّ بالقراءَ ۃ ام یَجْھَرُ؟ فقالت: کُلُّ ذلك قد کان یَفعلُ، رُبَّمَا اَسَرَّ بالقراءَ ۃِ ورُبَّمَا جھر، فقلتُ: الحمدُ لِلّٰہِ الذی جَعَلَ فی الامرِ سَعَۃً۔قال ابو عیسی:ھذاحدیث حَسَنٌ صحیحٌ غریبٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا میں رات کو تمہارے پاس سے گزرا تو تم قرآن پڑھ رہے تھے اور آواز بہت دھیمی تھی (تو اس کی کیا وجہ ہے؟)۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں نے سنا دیا اس ہستی کو جس سے سرگوشی کر رہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آواز تھوڑی سی بلند کرو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا میں تمہارے پاس سے گزرا تم بھی پڑھ رہے تھے اور تمہاری آوز بہت بلند تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں اونگھنے والوں کو جگا رہا تھا اور شیطانوں کو بھگا رہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا پست آواز سے پڑھا کرو۔اس باب میں عائشہ،ام ہانی،انس،ام سلمہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

☆ حضرت عبداللہ بن ابی قیس سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی (تہجد میں) رات کو قرأت کیسی تھی؟ انہوں نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح قرأت کرتے کبھی سرّاً اور کبھی جھراً۔حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) میں نے کہا "الحمدلله ......" تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے دین کے کام میں وسعت رکھی۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح غریب ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابوقتادہ غریب ہے اسے یحیٰی بن اسحٰق نے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے جبکہ اکثر حضرات نے اس حدیث کو ثابت سے اور انہوں نے عبداللہ بن رباح سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو صرف ایک آیت کے ساتھ ہی قیام فرمایا (یعنی قیام میں قرآن کی ایک ہی آیت پڑھ پڑھ کر رات گزار دی)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث اس طریق سے حسن غریب ہے۔

باب ماجاء فی فضل صلاةِ التطوُّع فی البیتِ

باب نفل (نماز) گھر میں پڑھنے کی فضیلت

☆حدثنا محمد بن بشّارٍ حَدَّثَنَا محمد بن جعفر حَدَّثَنَا عبد اللّٰه بن سعید بن ابی هِنْدٍ عن سالم ابی النَّضْرِ عن بُسْر بن سعیدٍ عن زید بن ثابتٍ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: اَفْضَلُ صلاتکم فی بیوتکم اِلا المکتوبةَ۔ قال: وفی الباب عن عمرَ بن الخطاب، وجابرِ بن عبد اللّٰه، وابی سعیدٍ، وابی هریرةَ، وابن عمرَ، وعائشةَ، وعبد اللّٰه بن سعدٍ، وزید بن خالدٍ الجُهَنِیِّ۔ قال ابو عیسی: حدیث زید بن ثابتٍ حدیث حسنٌ۔

وقد اختلف الناس فی روایة هذا الحدیث: فَرَوی موسی بن عُقْبَةَ وابراهیمُ بن ابی النَّضْرِ عن ابی النَّضْرِ مرفوعاً۔ورواه مالك بن اَنَسٍ عن ابی النَّضْرِ ولم یرفعه، واوقفه بعضهم۔ والحدیثُ المرفوعُ اصحُّ۔

☆حدثنا اِسحٰقُ بن منصورٍ اخبرنا عبد اللّٰه بن نُمَیْرٍ عن عبید اللّٰه بن عمرَ عن نافعٍ عن ابن عمرَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: صلُّوا فی بیوتکم ولا تَتَّخِذُوها قبوراً۔قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری افضل ترین نماز وہ ہے جو گھر میں پڑھی جائے۔مگر فرائض مستثنیٰ ہیں۔

اس باب میں حضرت عمر بن خطاب، جابر بن عبداللہ، ابوسعید، ابو ہریرہ، ابن عمر عائشہ، عبداللہ بن سعد اور زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اہل علم نے اس حدیث کی روایت میں اختلاف کیا ہے۔موسیٰ بن عقبہ اور ابراہیم بن ابونضر نے اسے مرفوعاً جبکہ بعض حضرات نے اسے موقوفاً روایت کیا ہے۔مالک نے ابونضر سے موقوفاً روایت کی ہے اور مرفوع حدیث اصح ہے۔

☆حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

اسکی تشریح میں دوقول ہیں: (صلوا فی بیوتکم ولا تتخذوھا قبورا) **مطلب یہ ہے** کہ اپنے گھروں میں مردے دفن نہ کیا کرو۔ کیونکہ جب انسان قبروں کے زیادہ قریب رہتا ہے تو وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتا یا حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردے اپنی قبروں کے اندر نماز نہیں پڑھتے تم بھی اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ کہ اس میں نماز نہ پڑھو۔

﴿ابواب الوتر﴾

باب ماجاء فی فضل الوِتْرِ

باب وتر کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللیث بن سعدٍ عن یزیدَ بن ابی حَبِیبٍ عن عبد اللّٰه بن راشدٍ الزَّوْفیِّ عن عبد اللّٰه بن ابی مُرَّةَ الزَّوْفِیِّ عن خارِجةَ بن حُذَافَةَ انه قال: خَرج علینا رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال:اِنَّ اللّٰهَ امدَّ کُمْ بصلاةٍ ھی خیرٌ لکم مِن حُمُرِ النَّعَمِ، والوِتْرُ، جعله اللّٰهُ لکم فیما بین صلاةِ العشاءِ اِلی ان یَطْلُعَ الفجرُ۔

قال: وفی الباب عن ابی ھریرةَ، وَعبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وبُرَیْدَةَ، وابی بَصْرَةَ الغِفَارِیِّ صاحبِ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔

قال ابو عیسی: حدیث خَارِجَةَ بنِ حُذَافَةَ حدیث غریب، لانعرفه اِلَّا من حدیث یزیدَ بن ابی حبیبٍ۔ وقد وھم بعضُ المحدِّثین فی ھذاالحدیث فقال: عن عبد اللّٰه بن راشد الزُّرَقِیِّ وھو وَھَمٌ فی ھذا۔ وابو بَصْرَةَ الغِفَارِیُّ اسمه حُمَیْلُ بن بَصْرَةَ وقال بعضُھم جَمِیلُ بن بَصْرَةَ الغِفَارِیُّ رجلٌ آخَرُ یَرْوِی عن اَبی ذَرٍّ وھو ابن اخی ابی ذَرٍّ۔

﴿ترجمه﴾

خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف نکلے اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک نماز سے تمہاری مدد کی ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے (یعنی) وتر۔ اسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے عشاء

اور طلوع فجر کے درمیانی وقت میں مقرر فرمایا ہے۔

اس باب میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو، بریدہ اور ابی بصرہ غفاری صحابی رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے ہم اسے یزید بن ابوحبیب کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔ بعض محدثین کو اس حدیث میں وہم ہوا ہے اور انہوں نے عبداللہ بن راشد زرقی کہا ہے اور یہ وہم (غلطی) ہے۔ (بلکہ عبداللہ بن راشد کی نسبت الزوفی ہے نہ کہ زرقی)۔

﴿تشریح﴾

باب سے مقصود وتر کی فضیلت کا بیان ہے: اس باب کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی فضیلت بیان فرما رہے ہیں اور صحابہؓ کے دلوں میں اس کو موکد فرما رہے ہیں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ہاں جو انتہائی فضیلت عمدہ مال (سرخ اونٹ) تھا وتر کو اس پر فضیلت دی ہے تاکہ یہ لوگ مال سے اعراض کر کے وتر اور عبادات میں مشغول ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تسبیح اور تہلیل اس مال و متاع سے بہتر نہیں بلکہ ایک مرتبہ تسبیح یا تہلیل دنیا کے تمام مال و متاع سے بہتر ہے۔

احناف کے وتر کو واجب کہنے کی دلیل: (ان اللہ امدکم بصلاۃ) یہ لفظ امدکم وتر کے وجوب پر دال ہے وجہ استدلال یہ ہے کہ وتر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے جبکہ نوافل کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا[1]۔ حنفیہ وتر کو فرض اسلئے نہیں کہتے کہ یہ روایت نہ قطعی الثبوت ہے نہ قطعی الدلالۃ کہ مدعی پر صراحۃً دلالت کرے بلکہ اس میں احتمال ہے کہ امدکم سے مراد ثواب اور اجر کی زیادتی ہے لہٰذا احتمال کی صورت میں فرائض میں اعتقاداً یا عملاً زیادتی نہیں ہوگی بلکہ ثواب کی زیادتی مراد ہوگی۔

---

[1] **نمازِ نفل کی تعریف:** یعنی اللہ رب العزت عز اسمہ کی طرف سے نوافل پڑھنے کا مطالبہ نہیں اسلئے ابن نجیم نے نفل کی یہ تفسیر کی ہے کہ نفل لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں اور شریعت میں عبادت کی ایسی زیادتی جو ہمارے لئے مشروع ہو ہم پر لازم نہ ہو۔ انتہی۔ صاحبِ عنایہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے وتر کے واجب ہونے پر کئی طریقے سے استدلال کیا جاتا ہے: ا۔ یہاں پر امدکم میں نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جبکہ سنتیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ انتہی۔ قلت: صاحبِ عنایہ کی اس بات کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے "ان اللہ فرض علیکم صیام رمضان و سننت لکم قیامہ" انتہی۔ تو اس حدیث میں فرض حکم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور سنت تراویح کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔

جمہور کا ایک اعتراض اور اسکا جواب: جمہور کا یہ اعتراض کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر سواری پر ادا فرماتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عذر کی بناء پر تو فرض نماز بھی سواری پر پڑھی جاسکتی ہے لہٰذا وتر نماز کو سواری پر پڑھنا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔ "امدکم" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نماز کو پانچ نمازوں کے علاوہ تم پر لازم کیا ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر واجب ہے کیونکہ کسی شئی پر زیادتی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ مزید علیہ (جس پر زیادتی کی جائے) متعین شئے ہو اور فرض نماز تو متعین ہے جو کہ پانچ ہیں اور نفل نماز متعین نہیں ہیں لہٰذا وتر کی نماز فرائض کی قبیل سے ہوئی۔ مخالفین یہ اعتذار کرسکتے ہیں کہ سنن موکدہ پر بھی تو زیادتی کی جاسکتی ہے کیونکہ سننِ موکدہ تو متعین ہیں (۱۰ یا ۱۲) لہٰذا یہ وتر سنن موکدہ کی قبیل سے ہو کہ اس میں بھی مزید علیہ متعین ہے۔

(قولہ حمر النعم) یعنی سرخ اونٹ، اہل عرب کے ہاں اس سے زیادہ عمدہ مال کوئی نہیں تھا۔

(قولہ جعلہ اللہ لکم فیما بین صلوٰۃ العشاء الی ان یطلع الفجر) **عبارتِ مذکورہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں:**
۱) اس ٹکڑے سے اشارہ ہے وتر کے وقت کی طرف **۲)** نیز وتر اور فرائض کے درمیان ترتیب کے فرض ہونے کی طرف اشارہ ہے **۳)** نیز یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح فرائض کے بھول جانے کی صورت میں یا وقتی فرض نماز کے فوت ہونے کے اندیشہ سے یا جب فرائض چھ سے زیادہ قضاء ہوں ان تینوں صورتوں میں ترتیب ساقط ہوجاتی ہے اسی طرح وتر نماز میں بھی ان تین باتوں کی وجہ سے ترتیب ساقط ہوجاتی ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی وضاحت: (لا نعرفہ الا من حدیث یزید بن ابی حبیب) یعنی عبداللہ بن راشد[۲] سے صرف یزید ہی نقل کرتے ہیں اور عبداللہ بن راشد سے ابی حبیب (یعنی یزید) کے علاوہ کوئی راوی نہیں۔

---

۱ درحقیقت حدیث باب سے وجوب وتر پر جو استدلال کیا جاتا ہے۔ ابن ہمام نے اس استدلال پر یہ اعتراض کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس اعتراض کو تسلیم بھی کریں تو جب اس وتر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے تو وتر کو فرائض کی قبیل سے ہونا چاہیئے نہ کہ سنن رواتب کی قبیل سے۔ کیونکہ وہ سنن اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی جاتیں جیسا کہ صاحب عنایہ کا کلام گزر چکا ہے۔ زیلعی کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث سے تین طرح وتر کے واجب ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے پھر ان وجوہات کو ذکر کیا ہے۔ فارجع الیہ

۲ یعنی اس حدیث میں عبداللہ بن راشد سے صرف یزید بن ابی حبیب راوی ہیں ورنہ حافظ نے اپنی تہذیب میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن راشد سے یزید بن ابی حبیب اور خالد بن یزید روایت کرنے والے دو راوی ہیں۔ انتہی۔ مرقاۃ السعود میں ہے کہ عبداللہ بن راشد اور عبداللہ بن ابی مرۃ اور خارجہ بن حذافہ سے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ میں سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ باقی صحاح ستہ میں ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔

باب ماجاء اَنَّ الوِترَ لیس بِحَتمٍ

باب وتر واجب نہیں ہے

☆حدثنا ابو کُرَیبٍ حَدَّثَنَا ابو بکر بنُ عَیَّاشٍ حَدَّثَنَا ابو اسحق عن عاصم بن ضَمُرَةَ عن علی قال: الوتر لیس بِحَتمٍ کصلاتکم المکتوبةِ، ولکنْ سَنَّ رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، وقال: اِنَّ اللّٰهَ وِترٌ یحبُّ الوترَ، فَاَوْتِرُوا یااهلَ القرآنِ۔

قال: وفی الباب عن ابن عمرَ، وابن مسعودٍ، وابن عباسٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث علیٍّ حدیث حسنٌ۔

☆ورَوَی سفیانُ الثوریُّ وغیره عن اَبی اسحق عن عاصم بن ضَمُرَةَ عن علی قال: الوترُ لیس بحتم کهیئة الصلاةِ المکتوبةِ، ولکن سنة سنها رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم۔ حَدَّثَنَا بِذٰلکَ محمد بن بَشَّارٍ حَدَّثَنَا عبد الرحمٰن بن مهدیٍّ عن سفیانَ عن ابی اِسحٰقَ وهذا اصحُّ من حدیث ابی بکر بن عَیَّاشٍ۔وقد رواه منصور بن المُعْتَمِرِ عن ابی اِسحٰقَ: نحوَ روایة ابی بکر بن عیاشٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وتر تمہاری فرض نمازوں کی طرح واجب نہیں لیکن یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ طاق (تنہا) ہے اور وہ طاق کو پسند کرتا ہے۔ اے اہل قرآن! وتر پڑھا کرو۔ اس باب میں ابن عمر، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور روایت کی سفیان ثوری وغیرہ نے ابو اسحٰق سے انہوں نے عاصم بن ضمرہ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وتر تمہاری فرض نمازوں کی طرح واجب نہیں لیکن سنت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت قرار دیا۔

روایت کی ہم سے بندار نے انہوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے ابو اسحٰق سے ...... اور یہ حدیث ابوبکر بن عیاش کی حدیث سے اصح ہے۔ منصور بن معتمر بھی ابو اسحٰق سے ابوبکر بن عیاش کی حدیث کے مثل روایت کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

اس باب سے خصم کا استدلال: گذشتہ حدیث کے الفاظ "ان اللہ امدکم" اور " جعله الله لکم" سے وجوب وتر کا

ثبوت معلوم ہورہا تھالہذا مصنف نے اس باب کی حدیث "الوتر لیس بحتم" کے الفاظ سے صراحۃً اس قول کو رد فرمایا۔

احناف کا جواب: حنفیہ کی طرف سے حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہمارے مذہب کے خلاف نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "ان اللہ زادکم" سے اس کا وجوب ثابت ہو چکا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر اس کے معارض نہیں ہوسکتا۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ وتر فرض نمازوں کی طرح ضروری[1] اور لازمی نہیں بلکہ وتر کا وجوب فرض نمازوں کے وجوب سے کم ہے اگر چہ نفسِ عمل کے اندر دونوں برابر ہیں (اعتقادی اعتبار سے انمیں فرق ہے)

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: اے احناف! وتر تمہارے نزدیک اگر چہ واجب ہے لیکن صحابہ کرامؓ پر تو یہ فرض ہونے چاہیئے کیونکہ صحابہؓ نے اپنے کانوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ سنے تھے جن سے وتر کے وجوب کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ جواب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اگر چہ قطعی الثبوت ہے لیکن قطعی الدلالۃ نہیں اسلئے صحابہؓ پر یہ وتر کی نماز واجب قرار دی گئی نہ کہ فرض نیز قطعی الدلالۃ اس لئے نہیں کہ "ان اللہ امدکم" سے مراد ثواب میں اضافہ کرنا ہو یہ احتمال بھی تو موجود ہے اگر چہ بظاہر امدکم سے مراد ان پر فرض نمازوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے۔

(قولہ ولکن سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سنت سے سنتِ اصطلاحی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ثابت بالسنۃ ہے اور احادیث میں اس طرح استعمال ہوتا رہتا ہے۔

مصنفؒ نے اپنے مذہب کو ثابت کرنے کیلئے ایسی سند ذکر کی جو امر بالوتر سے خالی ہے: (قولہ فاوتروا یا اھل القرآن) لیکن یہاں[2] اہل القرآن سے مراد یا تو تمام مومنین ہیں[3] تو اس صورت میں یہ امر وجوب کیلئے ہے

---

[1] کیونکہ یہ پانچ نمازیں شب معراج میں نہایت تاکید اور خصوصیات کے ساتھ فرض کی گئی تھیں اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی نماز کی ایسی تاکید اور خصوصیت نہیں ہے جیسا کہ فرائض خمسہ کی ہے۔

[2] **اہلِ قرآن کی تعیین میں دو اقوال:** اس لفظ لکن سے اول باب کے کلام کے مفہوم سے استدراک کیا جارہا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ گذشتہ باب سے چونکہ وتر کا واجب ہونا ثابت ہورہا تھا تو مصنف نے اس باب سے وتر کے وجوب کی نفی کا ارادہ کیا "الوتر لیس بحتم" کے الفاظ اس پر دلالت کررہے ہیں لیکن حضرت گنگوہیؒ فرمارہے ہیں کہ اس باب کی ذکر کردہ حدیث کا آخری ٹکڑا "اوتروا یا اھل القرآن" وتر کے واجب ہونے کی طرف اشارہ کررہا ہے لہذا یہ حدیث وتر کے عدم وجوب پر نہیں بلکہ وتر کے وجوب کی دلیل بن رہی ہے۔ اسی لئے مصنف نے اس جملہ پر کلام کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیونکہ امر کا اصل معنی وجوب کا ہے تو مصنف نے "اوتروا یا اھل القرآن" اس ٹکڑے پر آگے کلام ذکر کیا ہے تاکہ مصنف کا مذہب اس حدیث کے خلاف نہ ہو اور اس حدیث سے وجوب ثابت نہ ہو چنانچہ اس کے بعد مصنف نے ایسی سند ذکر کی ہے جس میں "فاوتروا یا اھل القرآن" والا جملہ نہیں ہے۔

مصنف کے اعتراض کا جواب: کیا مصنف بھول گئے کہ ثقہ راوی کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے نیز اگر یہ لفظ ثابت نہ بھی ہو تو دوسری احادیث سے وتر کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ "اوتروا یا اھل القرآن" کے متابعات موجود ہیں جیسا کہ مصنف نے خود اس کا اقرار کیا ہے (از مترجم: شاید کہ ترمذی کی عبارت و قدروی منصور بن المعتمر عن ابی اسحق نحو روایة ابی بکر بن العباس سے مصنف نے اس فاوتروا یا اھل القرآن کا متابع ذکر کیا ہے)۔

باب ماجاء فی کراھیة النومِ قبل الوتر

باب وتر سے پہلے سونے کے مکروہ ہونے کے بیان میں

☆ حَدَّثَنَا ابو کریب حَدَّثَنَا یحیی زکریَّا بن ابی زائدَةَ عن اسرائیل عن عیسی بن ابی عَزَّةَ عن الشَّعْبِیِّ عن ابی ثَوْرٍ الْاَزْدِیِّ عن ابی هریرة قال: اَمَرَنِی رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اوتِر قبل ان انامَ۔ قال عیسی ابن ابی عَزَّةَ وکان الشَّعْبِیُّ یوترُ اَوَّلَ اللیلِ ثم ینامُ۔ قال: وفی الباب عن ابی ذَرٍّ۔

قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرةَ حدیث حسن غریبٌ مِن هذا الوجهِ۔

وابی ثَوْرٍ الاَزْدِیُّ اسمه حَبِیبُ بن ابی مُلَیْکَةَ۔ وقداختارَ قوم من اهل العلم من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم ومَن بعدهم ان لّاینامَ الرجلُ حتی یوترَ۔

ورُوِیَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم انه قال: مَن خَشِیَ منکم ان لّا یستیقظَ مِن آخِرِ اللیلِ فَلْیُوتِرْ مِن اَوَّلِهِ، ومَن طَمِعَ منکم ان یقومَ من آخر اللیل فلیوتر من آخر اللیل، فاِن قراء ة القرآنِ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۳ قلت: یہ بھی احتمال ہے کہ اہل قرآن سے مراد قرآن کریم کے ماہرین ہیں یعنی حفاظ قرآن اس صورت میں وتر سے مراد رات میں پڑھی جانیوالی تہجد کی نماز ہے اور لفظ وتر کا اطلاق متعدد روایات میں رات کی نماز کے اوپر ہوتا رہتا ہے اس صورت میں خاص حفاظ قرآن کو حکم اسلیئے دیا گیا کیونکہ ان کو چاہیئے کہ رات کا ایک حصہ اپنے بستروں سے بیدار ہو کر قرآن شریف کی تلاوت میں صرف کریں کیونکہ حافظ قرآن ہی رات کو ایک بڑی مقدار میں قرآن کریم کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کر سکتا ہے اور اس کیلیئے اس کی اہمیت بھی ہے بخلاف غیر حافظ کے کہ وہ تو تہجد کی نماز میں تھوڑی بہت ہی تلاوت کریگا اسلیئے اس کو حکم نہیں دیا گیا۔

فی آخر اللیلِ مَحضُورَۃٌ، وھی افضلُ حَدَّثَنَا بذلک ھنادٌ حَدَّثَنَا ابو معاویۃ عن الاعمش عن ابی سفیانَ عن جابرٍ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بذلک۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں سونے سے پہلے وتر پڑھا کروں۔عیسی بن ابوعزہ کہتے ہیں کہ شعبی شروع رات میں وتر پڑھتے پھر سوتے تھے۔

اس باب میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس سند سے حسن غریب ہے اور ابوثور رازدی کا نام حبیب بن ابوملیکہ ہے اور صحابہ کرامؓ اور تابعین اہل علم کی ایک جماعت نے یہ بات پسند کی ہے کہ آدمی وتر پڑھنے سے پہلے نہ سوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جسے یہ اندیشہ ہو کہ رات کے آخری حصے میں نہیں اٹھ سکے گا تو شروع ہی میں وتر پڑھ لے اور جسے رات کے آخری حصے میں اٹھنے کی امید ہو وہ رات کے آخری حصے میں وتر پڑھے کیونکہ رات کے آخری حصہ میں جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے اور یہ افضل ہے۔

روایت کی ہم سے یہ حدیث ھناد نے انہوں نے کہا کہ روایت کی ہم سے ابو معاویہ نے انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابوسفیان سے انہوں نے جابر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب وتر کے وجوب کی واضح دلیل:(قول ابی ھریرۃ امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوتر قبل ان انام)اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھے بغیر سو جانے کو ناپسند فرمایا ہے کیونکہ اس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس طرح وتر فوت نہ ہو جائیں۔تو یہ حدیث وتر کے واجب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ یہاں پر اس امر میں وجوب کے علاوہ کسی اور معنی پر قرینہ موجود نہیں ہے۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ عشاء کے بعد علوم حدیث کا مذاکرہ کرنے والے لوگوں میں سے تھے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ **قول**"وروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من خشی منکم ان لا یستیقظ الخ" یہ حدیث سونے کے بعد وتر پڑھنے کی جو کراہت سمجھ میں آرہی ہے اس کا جواب ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ حدیث باب میں سونے سے پہلے وتر پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے یہ بطور احتیاط کے ہے ورنہ جس شخص کو تہجد اور رات میں اللہ جل شانہ کے سامنے کھڑے

ہونے کی امید ہو اس کیلئے افضل یہ ہے کہ رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھے ہاں جس شخص کو اٹھنے کا یقین نہ ہو اس کو چاہیئے کہ احتیاطاً سونے سے پہلے وتر پڑھ لے تاکہ اپنے عمل کے ثواب کو پالے۔

باب ماجاء فی الوِتْرِ مِن اولِ اللیلِ و آخِرِهِ

باب وتر رات کے اول اور آخر دونوں وقتوں میں پڑھنے کا بیان

☆حدثنا احمدُ بن مَنِیعٍ حَدَّثَنَا ابو بکرِ بن عَیَّاشٍ حَدَّثَنَا ابو حَصِینٍ عن یحیی بن وَثَّابٍ عن مسروقٍ: انه سال عائشةَ عن وترِ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم؟ فقالت: مِنْ کُلِّ اللیلِ قد اَوْتَرَ: اَوَّلِهٖ واوْسَطِهٖ وآخِرَہ، فانْتَهٰی وترُہ حین مات فی وجه السَّحَرِ۔ قال ابو عیسی: ابو حَصِینٍ اسمه عثمانُ بن عاصمٍ الاَسَدِیُّ۔ قال: وفی الباب عن علیٍّ، وجابرٍ، وابی مسعودٍ الأنصاریٍّ، وابی قتادةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عائشةَ حدیث حسن صحیحٌ۔ وهو الذی اختاره بعض اهل العلم: الوترُ من آخر اللیلِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت مسروق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے ہر حصے میں وتر پڑھے ہیں۔کبھی رات کے شروع میں، کبھی درمیانی حصے میں اور کبھی رات کے آخری حصے میں۔ یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری حصے (سحر کے وقت) میں وتر پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوحصین کا نام عثمان بن عاصم اسدی ہے۔ اس باب میں حضرت علی، جابر، ابومسعود انصاری اور ابوقتادہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے بعض اہل علم نے وتر کو رات کے آخری حصے میں پڑھنے کو اختیار کیا ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محض آخری معمول کو بیان کر رہی ہے جس سے پہلے معمول کا نسخ لازم نہیں: (فانتهی وتره حین مات فی وجه السحر) وجہ السحر سے مراد رات کا آخری حصہ ہے کیونکہ سحر کہتے ہیں رات کے آخری چھٹے حصے کو اس آخری چھٹے حصے کے دو (کنارے) ہیں: ۱۔ایک کنارہ جو فجر سے ملتا ہے دوسرا کنارہ جو اس

کا ابتدائی حصہ ہے یعنی رات سے ملتا ہے۔ یہاں پر وجہ السحر سے مراد سحر کا وہ کنارہ ہے جو فجر سے ملتا ہے۔ بہر حال یہ بات جاننی چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر آخری فعل پہلے فعل کیلئے ناسخ نہیں ہوتا جیسا کہ یہاں پر تصریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری عمل وتر کو اخیر شب میں پڑھنے کا معمول ہو گیا تھا (از مترجم: لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے رات کے شروع یا وسط میں وتر کی نماز پڑھنا منسوخ ہو اور صحیح نہ ہو)۔

باب ماجاء فی الوتر بسبع

باب وتر کی سات رکعات پڑھنے کا بیان

☆ حَدَّثَنَا هناد حَدَّثَنَا ابو معاويةَ عن الاعمشِ عن عَمْرِو بن مُرَّةَ عن يحيى بن الجَزَّارِ عن ام سلمةَ قالت: كان النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم يوترُ بثلاثَ عَشْرَةَ ركعةً فلما كبر وضَعُفَ اَوْتَرَ بسبعٍ قال: وفي الباب عن عائشةَ۔ قال ابو عيسى: حديث ام سلمةَ حديث حسن۔ وقد رُوِىَ عن النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم الوترُ بثلاث عَشْرَةَ، واحدى عَشْرَةَ، وتسعٍ، وسبعٍ، وخمسٍ، وثلاثٍ، وواحدةٍ۔

قال اسحق بن ابراهيم: معنى مارُوِىَ ان النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم كان يوترُ بثلاث عَشْرَةَ قال: انما معناه انه كان يصلّي من الليل ثلاثَ عَشْرَةَ ركعةً مع الوِترِ فَنُسِبَتْ صلاةُ الليل الى الوترِ، ورَوَى في ذلك حديثاً عن عائشةَ۔

واحْتَجَّ بما رُوِىَ عن النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم انه قال: اَوْتِرُوا ياأَهْلَ الْقُرْآنِ ۔ قال: انما عَنَى به قيامَ الليل يقولُ: انما قيامُ الليل على اصحاب القرآن۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ رکعتیں وتر پڑھا کرتے تھے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمر رسیدہ اور ضعیف ہو گئے تو سات رکعتیں وتر پڑھنے لگے۔

اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا حسن ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ، تین اور ایک رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اسحٰق بن ابراہیم کہتے ہیں (کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے)۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر

سمیت تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے چنانچہ تہجد کی نماز بھی وتر کی طرف منسوب ہوگئی یعنی تہجد کو مجازاً وتر کہہ دیا۔ اس میں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی حدیث روایت کی ان کا استدلال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس حدیث سے ہے کہ ''اے اہل قرآن (اے حفاظ)! وتر پڑھا کرو''۔ اسحٰق فرماتے ہیں اس حدیث میں بھی (وتر سے) قیام اللیل ہی مراد ہے۔ یعنی تہجد کو مجازاً وتر کہتے ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قرآن (حفاظ) کو (قیام اللیل) تہجد کا حکم دیا۔

باب ماجاء فی الوتر بخمسٍ

باب وتر کی پانچ رکعات پڑھنے کا بیان

☆حدثنا اِسحٰقُ بن منصورِ الکوسَجُ حدثنا عبد اللّٰہ بن نمیر حَدَّثَنَا ھشام بن عروۃَ عن ابیه عن عائشة قالت: کانَتْ صلاۃُ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم مِن اللیْلِ ثلاث عَشْرَۃَ رکعةً، یوترُ مِن ذٰلک بِخمسٍ، لایجلِسُ فی شیءٍ منھنَّ اِلَّا فی آخرھنَّ، فِاذا اَذَّنَ المؤذِّنُ قام فصلّٰی رکعتین خفیفتین۔

قال: وفی البابِ عن ابی اَیُّوبَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عائشةَ حدیث حسن صحیحٌ۔

وقدرأَی بعضُ اھلِ العلم مِن اصحَابِ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وغیرِھم الوترَ بخمسٍ، وقالوا: لایجلِسُ فی شیءٍ منھن اِلَّا فی آخرھنَّ۔ قال ابو عیسی: وسالتُ ابا مصعبٍ المدینیَّ عن ھذا الحدیث کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یوترُ بالتسعِ والسبعِ قلت: کیف یوتر بالتسعِ والسبعِ؟ قال یصلّی مَثْنَی مَثْنَی، ویسلِّمُ ویوترُ بواحدۃٍ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز تیرہ رکعتوں پر مشتمل تھی اس میں سے پانچ رکعتیں وتر پڑھتے تھے ان رکعتوں میں سے کسی میں نہیں بیٹھتے تھے صرف آخری رکعت میں بیٹھتے پھر جب موذن اذان دیتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوجاتے اور دو ہلکی رکعتیں پڑھتے۔

اس باب میں حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے اور بعض علماء صحابہ (رضی اللہ عنہم) وغیرہ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے کہ وتر کی پانچ رکعتیں ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ان کے دوران نہ بیٹھے بلکہ صرف آخری رکعت میں بیٹھے۔

﴿تشریح﴾

حدیث کے دومطلب:(قولہ یوتر من ذلک بخمس لا یجلس فی شئی منھن)

۱) پہلا مطلب: اس جملہ کی تشریح یہ ہے کہ لا یجلس میں تشہد کیلئے بیٹھنے کی نفی نہیں ہے بلکہ نفی[۱] استراحت اور سونے کیلئے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت تہجد پڑھنے کے بعد بیٹھ جاتے آرام فرماتے اور اسمیں نیند فرمالیا کرتے تھے پھر چار پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ جاتے آرام اور نیند فرمالیا کرتے تھے لیکن حدیث باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں "یوتر من ذلک بخمس لا یجلس فی شئ منھن الا فی آخرھن" کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعات ادا فرماتے ان رکعات کے درمیان میں بالکل آرام کرنے کیلئے نہیں بیٹھے بلکہ ان پانچ رکعات کے بعد آپ نے تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ ان پانچ رکعات میں تین رکعات تو وتر کی ہیں اور اس سے پہلے کی دو رکعتیں یا تو تحیۃ الوضو ہیں یا اس نیت سے دیگر نوافل ادا فرمائے ہوں گے۔

دوسرا مطلب: ۲) اس حدیث کا دوسرا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پانچ رکعتوں میں سے کوئی رکعت بھی بیٹھ کر ادا نہیں فرماتے تھے چونکہ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر بھی پڑھتے تھے اور کچھ حصہ بیٹھ کر بھی ادا فرماتے تھے اور بسا اوقات بیٹھ کر نماز شروع کرتے جب قرأت کے ختم ہونے کا وقت آتا تو کھڑے ہو کر بقیہ قرأت فرماتے اور رکوع فرماتے تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ فرما رہی ہیں کہ ان پانچ رکعتوں میں کوئی رکعت بھی بیٹھ کر نہیں ادا فرماتے تھے تو "لا یجلس" سے مراد ایسا جلوس جو قیام کے قائم مقام ہو اس کی نفی ہے اس صورت میں "الا فی آخرھن" کا استثناء، استثناء منقطع ہوگا[۲] بہر حال دونوں صورتوں میں "الا فی آخرھن" سے مراد حقیقی طور پر آخری جزء ہے یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر آرام فرماتے تھے

---

[۱] اگر لا یجلس میں جلسہ سے مراد تشہد کے جلسہ کی نفی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ دوسری رکعت کا تشہد پڑھتے نہ چوتھی رکعت کا۔ تو یہ حدیث جمہور کے عمل اور مذہب کے خلاف ہوئی اس لئے اس حدیث میں تاویل کی ضرورت پیش آئی بعض علماء کے نزدیک حدیث باب، صلوٰۃ اللیل مثنٰی مثنٰی سے منسوخ ہوگئی نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول آپ کے فعل کے مقابلہ میں راجح ہوا کرتا ہے یہ تاویل بھی ہوسکتی ہے کہ الا فی آخرھن سے مراد آخری رکعت ہو۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشہد پڑھکر بغیر سلام کے جلوس فرماتے تھے لیکن آخری رکعت میں تشہد کے بعد سلام بھی پھیر دیا کرتے تھے تو یہ جلسہ ایسا ہوتا تھا کہ اس میں تشہد بھی ہوتا تھا اور سلام بھی۔

[۲] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ استثناء متصل ہو۔ اب الا فی آخرھن کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ آخری دو رکعتیں مراد ہیں تو ان پانچ رکعتوں میں سے پہلی تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں اور وتر کے بعد دو رکعتیں آپ بیٹھ کر ادا فرماتے تھے۔

اگر چہ بظاہر فی آخرھن میں فی ظرفیت کے لئے ہے اور یہ دلالت کر رہا ہے کہ اس سے مراد نماز کے آخری جزء میں بیٹھنا مراد ہے لیکن یہاں پر یہ معنی مراد نہیں بلکہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کیلئے بیٹھنا مراد ہے۔

باب ماجاء فی الوتر بثلاث

باب وتر کی تین رکعتوں کا بیان

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو بكر بن عياش عن ابى اسحق عن الحرث عن على قال: كان النبى صلى الله عليه وسلم يوترُ بثلاثٍ ، يَقرا فيهن بتسع سور من المفصل، يقرا فى كل ركعة بثلاث سور، آخرهن قل هو الله احد۔قال : وفى الباب عن عمران بن حصين ، وعائشة ، وابن عباسٍ، وابى ايوب۔ وعبد الرحمٰن بن ابزى عن ابى بن كعب، ويُروى ايضاً عن عبد الرحمٰن بن ابزى عن النبى صلى الله عليه وسلم هكذا رَوَى بعضهم فلم يذ كروا فيه عن ابى وذكر بعضهم عن عبد الرحمٰن بن ابزى عن ابى۔قال ابو عيسى:وقد ذهب قومٌ من اهل العلم من اصحابِ النبى صلى الله عليه وسلم وغيرهم الى هذا، وَرَاَوْان يوترَ الرجلُ بثلاثٍ۔

قال سفيانُ: ان شئتَ اوترتَ بخمسٍ، وان شئتَ او ترتَ بثلاثٍ، وان شئتَ او ترتَ بركعةٍ۔ قال سفيانُ: والذى اَستَحِبُّ ان يوترَ بثلاث ركعاتٍ۔وهو قولُ ابن المبارك، واهل الكوفةِ۔

☆حدثنا: سعيد بن يعقوبَ الطَّالَقَانِیُّ حَدَّثَنَا حمَّاد بن زيد عن هشامٍ عن محمد بن سيرينَ قال: كانوايُوتِرُونَ بِخَمْسٍ، وبثلاثٍ، وبركعةٍ، وَيَرَوْنَ كلَّ ذلك حَسَناً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور ان میں مفصلات کی نو سورتیں پڑھتے اور ہر رکعت میں تین سورتیں پڑھتے ان نو سورتوں میں آخری سورۃ ، سورۃ اخلاص ہوتی تھی۔

اس باب میں عمران بن حصین ، عائشہ ، ابن عباس ، ابوایوب اور عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں، عبدالرحمٰن بن ابزی، ابی بن کعب سے بھی روایت کرتے ہیں اور عبدالرحمٰن بن ابزی (براہ راست بلا واسطہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کرتے ہیں۔ (اس وقت یہ مرسل صحابی ہوگی)۔ بعض حضرات اسے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ابی بن کعب کا واسطہ ذکر نہیں کرتے جبکہ بعض حضرات عبدالرحمٰن بن ابزیٰ سے اور وہ ابی بن کعب کے واسطے سے نقل

کرتے ہیں ۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں صحابہؓ وغیر صحابہ کی ایک جماعت اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ وتر میں تین رکعات پڑھی جائیں ۔سفیان کہتے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو پانچ رکعات وتر پڑھیں چاہیں تو تین رکعت پڑھیں اور چاہیں تو ایک رکعت پڑھیں (یعنی یہ سب جائز ہے) لیکن میرے نزدیک وتر کی تین رکعتیں پڑھنا پسندیدہ ہے ۔ابن مبارک اور اہل کوفہ (احناف) کا بھی یہی قول ہے ۔ہم سے روایت کی سعید بن یعقوب طالقانی نے انہوں نے حماد بن زید سے انہوں نے ہشام سے انہوں نے محمد بن سیرین سے محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ پانچ ، تین اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور وہ ان سب صورتوں کو ٹھیک سمجھتے تھے ۔

﴿تشریح﴾

(قال سفیان ان شئت او ترت بخمس وان شئت اوترت بثلاث وان شئت اوترت برکعۃ) یہ اختیار دینا وجوب کے منافی [1] ہے (تو ان کے نزدیک وتر واجب نہیں ہے) اور نہ ہی سنت مؤکدہ ہے ۔

ہر شخص کسی ایک مذہب حق کو اختیار کرنے کا پابند ہے: (قولہ کانوا یوترون بخمس او بثلاث او برکعۃ) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے ہاں وتر کی نماز ایک ہی وقت میں ایک رکعت ، تین رکعت ، پانچ رکعت تینوں طرح پڑھی جائیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کے ہاں اختیار تھا کہ ان تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو بھی اختیار [2] کرنے سے وتر کی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ضابطہ ہے کہ حق مذہب مذاہب کے درمیان دائر رہتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کو ہر ہر طریقے کا اختیار ہو بلکہ عوام کو ایک طریقے میں اپنے امام کی اتباع کرنی چاہیئے ۔

---

[1] اس میں کوئی بعد نہیں ہے کہ سفیان ثوری اور انکے متبعین کے نزدیک وتر کی نماز سنت ہو کیونکہ وہ خود مجتہد تھے ۔

[2] چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح نے ذکر کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عشاء کے بعد ایک رکعت وتر ادا فرمائی ان کے پاس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک غلام بیٹھے تھے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی اطلاع کی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرف صحبت اٹھا چکے ہیں دوسری روایت میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ وہ صحیح کرتے ہیں کیونکہ وہ فقیہ صحابی ہیں ۔اس سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فعل ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فعل کے خلاف تھا اور یہ اختلاف تابعین میں مشہور و معروف تھا تبھی تو تابعین ایک صحابی کی شکایت دوسرے کے سامنے لگاتے تھے لیکن اس سب کے باوجود حضرت ابن عباسؓ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کی تصویب فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ حق ان مذاہب کے درمیان دائر غیر متعین ہے ۔

باب ماجاء فی الوتر برکعةٍ

باب ایک رکعت وتر پڑھنے کا بیان

☆ حَدَّثَنَا قتیبة حَدَّثَنَا حمّاد بن زیدٍ عن انس بن سیرینَ قال: سالتُ ابنَ عمرَ، فقلتُ: اُطِیلُ فی رکعتی الفجرِ؟ فقال: کان النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلّی من اللیل مَثْنَی مَثْنَی، ویوتر برکعةٍ، وکان یـصـلّـیَ الـرکعتینِ والاذَانُ فی اُذُنِہِ (یعنی: یُخَفِّفُ)۔ قال :وفی البابِ عن عائشةَ، وجابرٍ، والفضل بن عَبّـاسٍ، وابـی ایـوبَ، وابـن عبـاسٍ۔قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ عـلـی ھٰذا عند بعض اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم والتابعین:رَاَوْ ان یَفْصِلَ الرجلُ بین الرکعتین والثالثةِ، یُوتِرُ برکعةً۔ وبہ یقول مالکٌ، والشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن سیرین سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کیا میں فجر کی دو رکعتوں (سنتوں) میں لمبی قرأت کرسکتا ہوں؟ تو انہوں نے فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت کرکے نماز پڑھتے اور پھر آخر میں ایک رکعت سے نماز کو طاق بنایا کرتے تھے۔اور فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) اس حال میں پڑھتے کہ فجر کی اذان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں ہوتی (اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اذان سے مراد اقامت ہے یعنی جیسے وہ شخص جلدی جلدی فجر کی سنتیں پڑھتا ہے جس کو خیال لگا ہو کہ ابھی اقامت شروع ہونے والی ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتیں جلدی جلدی پڑھتے اسلئے ان کو لمبا کرکے پڑھنا خلافِ سنت ہے۔ازمترجم)۔

اس باب میں حضرت عائشہ، جابر، فضل بن عباس، ابوایوب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور بعض صحابہ اور تابعین کا اسی پر عمل ہے کہ دو رکعتوں اور تیسری رکعت کے درمیان فصل کرے (سلام پھیرے) اور تیسری رکعت وتر کی پڑھے۔امام مالک، شافعی، احمد و اسحٰق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیث باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی سنتیں مختصر پڑھنے کا بیان ہے:(قولہ سالت ابن عمر

رضی اللہ عنھما فقلت اطیل فی رکعتی الفجر) رکعتی الفجر سے مراد سنتیں ہیں جیسا کہ جواب سے معلوم ہورہا ہے۔

ابن عمرؓ نے صراحتاً تطویل رکعتی الفجر سے منع نہیں فرمایا: ابن عمر رضی اللہ عنہما نے لاتطل کہہ کر منع نہیں فرمایا تا کہ کوئی شخص سنتوں کے لمبا کرنے کو حرام نہ سمجھے یا کوئی یہ نہ سمجھے کہ سنتوں کو مختصر پڑھنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اپنی رائے ہے بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ذکر فرمایا جس سے یہ ثابت ہوا کہ فجر کی سنتوں میں اختصار کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے لیکن اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں لمبی پڑھتا ہے تب بھی اس نے کوئی حرام کام نہیں کیا۔

(قولہ کان یصلی الرکعتین والاذان فی اذنہ) **والاذان سے مراد اقامت ہے:** یہ جملہ کنایہ ہے سنتوں کے جلدی پڑھنے سے اس کو مختصر ادا کرنے سے، کیونکہ اذان سے مراد اقامت ہے تو یہاں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فجر کی سنتوں کے پڑھنے کو تشبیہ دی ہے ایسے شخص کے ساتھ جو اقامت سنتے ہوئے فجر کی سنتیں پڑھنے میں مشغول ہو اور یہ شخص جلدی جلدی سنتوں سے فارغ ہونے کے ساتھ امام کے ساتھ فرض نماز میں داخل ہونے کی کوشش کریگا اور سنتوں کو مختصر کرنے میں اپنی پوری طاقت[1] خرچ کردیگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس قدر جلدی سنتیں ادا فرماتے تھے۔

باب ماجاء فیما یُقرأُ بہ فی الوتر

باب وتر کی نماز میں کیا پڑھے؟

☆حدثنا علی بن حُجر اخبرنا شَرِیکٌ عن ابی اِسحٰقَ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأُفی الوتر بسبح اسم ربك الاعلی وقل یایھا الکافرون وقل ھو اللّٰہ احد فی رکعۃ رکعۃ۔قال: وفی الباب عن علی، وعائشۃ، وعبد الرحمٰن بن ابزی عن ابی بن کعب ویُرْوَی عن عبد الرحمٰن بن ابزی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔قال ابوعیسی: وقد رُوی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: انہ قرأفی الوتر فی الرکعۃ الثالثۃ بالمعوذتین وقل ھو اللّٰہ احد۔

والذی اختارہ اکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ومَنْ بعدھم: ان یقرا بسبح اسم ربك الاعلی وقل یایھا الکافرون۔و قل ھو اللّٰہ احد یقرأفی کل رکعۃٍ من ذٰلك بسورۃ۔

☆حدثنا اسحٰق بن ابراھیم بن حبیب بن الشھید البصری حدثنا محمد بن سلمۃ الحرانی عن خصیف عن عبد العزیز بن جریج قال: سالت عائشۃ: بای شیءٍ کان یوترُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

---

[1] مجدالدین فرماتے ہیں استفرغ مجھودہ کا مطلب اپنی پوری طاقت کو خرچ کرنا ہے۔

علیه وسلم ؟ قالت: کان یقرا فی الاولی بسبح اسم ربك الاعلی ، وفی الثانیة بقل یایها الکافرون وفی الثالثة بقل هو الله احد والمعوذتین۔قال ابو عیسی: وهذا حدیث حسن غریب۔قال: وعبد العزیز هذا هو والد ابن جریج صاحب عطاء، وابنُ جریج اسمه عبد الملك بن عبد العزیز بن جریج۔ وقد رَوَی یحیی بن سعیدٍ الانصاریُّ هذا الحدیث عن عمرةَ عن عائشةَ عن النبی صلی الله علیه وسلم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی ایک ایک رکعت میں سورۃ اعلیٰ، سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص پڑھتے تھے۔ اس باب میں حضرت علیؓ، عائشہؓ سے روایات ہیں نیز عبدالرحمٰن بن ابزی، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی تیسری رکعت میں سورۃ اخلاص اور معوذتین (قل اعوذ برب الفلق وقل اعوذ برب الناس) بھی پڑھیں اور (وہ صورت) جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے اہل علم کی اکثریت نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہی ہے کہ "سبح اسم ربك الاعلیٰ" سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص تینوں میں سے ہر رکعت میں ایک سورت پڑھے۔ (یعنی پہلی رکعت میں سورۃ اعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ کافرون اور تیسری رکعت میں سورۃ اخلاص پڑھے)۔

حضرت عبدالعزیز بن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں کونسی سورتیں پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت میں "سبح اسم ربك الاعلیٰ" اور دوسری رکعت میں "قل یا ایها الکافرون" اور تیسری رکعت میں "قل هو الله احد" اور معوذتین پڑھتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے یہ عبدالعزیز، ابن جریج کے والد ہیں اور عطاء کے شاگرد ہیں ابن جریج کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے بھی یہ حدیث بواسطہ عمرہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں (از مترجم: والمعوذتین کا اضافہ شاذ ہے لہٰذا وتر کی تیسری رکعت میں صرف سورۃ اخلاص پڑھنا سنت ہے اس تیسری رکعت میں معوذتین نہیں پڑھیں گے)۔

﴿تشریح﴾

اس باب سے مقصود گذشتہ ابواب کی تشریح اور وضاحت ہے: گذشتہ ابواب سے جو بات تبعاً معلوم ہوئی تھی کہ وتر کی ہر رکعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین سورتیں پڑھتے جس میں آخری سورت قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے تھے تو اس

باب میں اس کو صراحۃً بیان کیا جارہا ہے کہ وتر کی تیسری رکعت میں معوذتین سورۃ اخلاص کے ساتھ پڑھتے تھے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: اس سے تو یہ لازم آئیگا کہ وتر کی اس تیسری رکعت کی قرأت پہلی رکعت سے بھی لمبی ہو جائیگی۔ جواب ا: چونکہ ہر شفعہ مستقل نماز ہے اسلئے تیسری رکعت کے لمبی ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔

جواب نمبر۲: کسی حدیث میں یہ ثابت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیسری رکعت میں جب ان تین سورتوں کو جمع فرماتے تو اس سے پہلی دو رکعتوں میں یہی سبح اسم اور قل یاایھا الکافرون پڑھتے ہوں بلکہ ممکن ہے کہ اس وقت پہلی دو رکعتوں میں اس سے طویل سورتیں پڑھتے ہوں گے لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ پہلی رکعت میں سورہ اعلیٰ دوسری میں کافرون، تیسری میں یہ تین سورتیں پڑھتے تھے تو اس کا یہی جواب دیا جائیگا کہ ہر شفعہ مستقل نماز ہے۔

مصنف کے کلام کی وضاحت: (قوله عبدالعزيز هذا والد ابن جريج صاحب عطاء) یعنی عبدالعزیز اس شخص کے والد ہیں جو ابن جریج کی کنیت سے مشہور ہیں جن کا نام عبدالملک تھا حقیقت میں وہ شخص ابن جریج نہیں ہیں بلکہ ابن عبدالعزیز ہیں لیکن دادا کی طرف منسوب کر کے اس کو ابن جریج کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ عبدالعزیز کے والد کا نام جریج ہے۔ اب عبدالعزیز ھذا والد ابن جریج کا مطلب یہ ہوا کہ عبدالعزیز اس شخص کے والد ہیں جو ابن جریج کے ساتھ مشہور ہیں در حقیقت وہ جریج کے بیٹے نہیں بلکہ وہ تو ابن عبدالعزیز بن جریج ہیں یعنی جریج کے پوتے ہیں۔ حدیث باب میں پورے سال وتر میں قنوت کا پڑھنا اور اس کا محل قبل الرکوع ہوگا یا بعد الرکوع تو اس کے متعلق مجھے اپنے استاذ محترم مداللہ ظلہ کی کوئی بات یاد نہیں لہٰذا اس بحث کو معلوم کیا[1] جائے مہمل نہ چھوڑا جائے۔

قنوت فی الوتر تمام سال ہوگی اور قبل الرکوع ہوگی: ہاں یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ اگلے باب باب ماجاء فی القنوت فی الوتر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی[2] روایت ان دونوں مسئلوں میں دال ہے کہ قنوت فی الوتر تمام سال ہوگی اور رکوع سے پہلے ہوگی۔ لہٰذا حنفیہ نے بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب اختیار کیا ہے۔

---

[1] اس مسئلہ کی تفصیل مطولات جیسے بذل المجہود، اوجز المسالک وغیرہ میں موجود ہے لہٰذا وہاں پر دیکھا جاسکتا ہے۔

[2] **حنفیہ کے دلائل:** ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے علقمہ سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرامؓ وتر کی نماز میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تمام سال وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ کذا فی الاوجز۔ یہ بات جاننی چاہئے کہ امام ترمذی نے امام احمد کا مذہب امام شافعی کے ساتھ ذکر کیا ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ حنابلہ کی کتابوں میں تصریح ہے کہ وتر کی قنوت تمام سال پڑھی جائیگی جیسا کہ احناف کا مذہب ہے ہاں قنوتِ فجر میں حنابلہ کے نزدیک مداومت نہیں ہے جیسا کہ اوجز میں حنابلہ کی فروع سے نقل کیا ہے لہٰذا امام ترمذی نے جو حنابلہ کا مذہب ذکر کیا ہے اگر اسکو صحیح تسلیم کیا جائے تو شاید یہ امام احمد کی ایک روایت ہوگی کہ قنوت وتر صرف رمضان کے نصفِ اخیر میں ہے۔

باب ماجاء فی القنوت فی الوترِ

باب وتر میں قنوت پڑھنا

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو الاحَوْصِ عن ابی اِسحٰقَ عَنْ بُرَیْد بن ابی مَرِیمَ عَنْ اَبِی الحَوْرَاءِ السَّعْدِیِّ قال: قال الحسنُ بن علی رضی الله عنهما عَلَّمَنِی رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کَلِمَاتٍ اَقُولهن فی الوتر: اللّٰهُمَّ اهْدِنِی فِیمَنْ هَدَیْتَ، وَعافِنِی فیمن عَافَیْتَ، وتَوَلَّنِی فیمن تَوَلَّیْتَ، وبَارِكْ لِی فیما اَعْطَیْتَ، وقِنِی شَرَّ مَاقَضَیْتَ، فإنك تَقْضِی ولا یُقْضَی علیك، واِنَّهُ لایذِلُّ مَن وَالَیْتَ، تبارکتَ رَبَّنَا وتَعَالَیْتَ۔قال: وفی الباب عن علیٍّ۔قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن، لانعرفه اِلَّا مِن هذا الوجه، مِن حدیث اَبی الحَوْرَاءِ السَّعْدِیِّ، واسمه رَبِیْعَةُ بن شَیْبَانَ۔ ولا نعرِفُ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی القنوت فی الوتر شیئاً احسنَ من هذا۔ واختلف اهل العلم فی القنوت فی الوتر۔

فرأی عبد اللّٰه بن مسعودٍ القُنُوتَ فی الوتر فی السَّنَةِ کلِّها، واختارَ القنوتَ قبلَ الرکوع۔ وهو قولُ بعضِ اهل العلم، وبه یقول سفیانُ الثوریُّ، ولبن المبارکِ، واِسحٰقُ، واهل الکوفة وقد رُوِیَ عن علیٍّ بن ابی طالبٍ: انه کان لایقنُتُ اِلَّا فی النصف الآخِرِ من رمضانَ، وکان یقنُتُ بعد الرکوع۔ وقد ذهب بعض اهل العلم اِلی هذا وبه یقولُ الشافعیُّ، واحمدُ۔

﴿ترجمه﴾

ابوحوراء کہتے ہیں کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ کلمات سکھائے وتر میں پڑھنے کیلئے "اللهم اهدنی ......الخ" (اے اللہ! مجھے ہدایت دے ان لوگوں کے ساتھ جنہیں تو نے ہدایت دی، مجھے عافیت عطا فرما ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے عافیت بخشی، میرا کارساز بن ان بندوں میں شامل کر کے جن کی آپ کارسازی فرماتے ہیں، اور جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا ہے (یعنی صحت و مال و دولت اور بیوی بچے، گھربار، کاروبار) اس میں برکت عطا فرما اور مجھے ان برائیوں سے بچا جو میرے مقدر میں لکھ دی گئیں بے شک تو فیصلہ فرماتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں ہوسکتا اور جسے تو دوست رکھتا ہے وہ رسوا نہیں ہوسکتا، اے پروردگار تو بابرکت ہے اور تیری ہی ذات بلند و برتر ہے اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ ہم

اسے اسی سند یعنی ابوحوراء سعدی کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔ ابوحوراء کا نام ربیعہ بن شیبان ہے۔ قنوت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں سے اس سے بہتر روایت کا ہمیں علم نہیں۔ اہل علم کا وتر میں قنوت کے بارے میں اختلاف ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پورا سال وتر میں قنوت پڑھے اور انہوں نے قنوت کی دعا رکوع سے پہلے پڑھنا پسند کیا ہے یہ بعض علماء کا بھی قول ہے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، اسحٰق اور اہل کوفہ (احناف) کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ صرف رمضان کے آخری پندرہ دنوں میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے تھے۔ بعض اہل علم نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ اما شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

باب ماجاء فی الرجل ینام عن الوتر اوینساہ

باب جو شخص وتر سے سوتا رہ جائے یا پڑھنا بھول جائے

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیع حَدَّثَنَا عبد الرحمن بن زید بن اَسْلَمَ عن ابیه عن عطاءِ بن یَسَارٍ عن اَبی سعیدٍ الخدریؓ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: مَن نَامَ عن الوترِ او نَسِیَهُ فَلْیُصَلِّ اِذا ذَکَرَ واِذااستیقَظَ۔

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا عبد اللّٰه بن زید بن اَسْلَمَ عن ابیه ان النبیؐ صلی اللّٰه علیه وسلم قال: مَن نام عن وتره فَلْیُصَلِّ اِذا اصبح۔ قال ابو عیسی: وهٰذا اَصَحُّ من الحدیثِ الاوّلِ۔قال ابو عیسی: سمعتُ اَبا داودَ السِّجْزِیَّ یعنی سُلَیمانَ بن الاَشْعَثِ یقول: سَالتُ احمدَ بن حنبلٍ عن عبد الرحمٰن بن زید بن اَسْلَمَ؟ فقال: اخوہ عبدُ اللّٰه لاباس به۔قال: وسمعت محمداً یَذْکُرُ عن علیِّ بن عبد اللّٰه: انه ضَعَّف عبدَ الرحمٰن بن زید بن اَسْلَمَ، وقال: عبد اللّٰه بن زید بن اَسْلَمَ ثقة۔ قال: وقد ذهب بعض اهل العلم بالکوفةِاِلی الحدیث، فقالوا: یوتر الرجل اذا ذکر، وان کان بعدَ ماطلعتِ الشمسُ وبه یقول سفیانُ الثوریُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص وتر پڑھے بغیر سو جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیئے کہ وتر پڑھ لے جب اسے یاد آجائے یا جب وہ بیدار ہو۔

حضرت زید بن اسلم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی وتر پڑھے بغیر سو جائے تو صبح ہونے پر پڑھے۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے اصح ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابوداؤد سجزی یعنی سلیمان بن اشعث سے سنا انہوں نے فرمایا کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا راوی ہے؟ انہوں نے کہا ان کے بھائی عبداللہ میں کچھ مضائقہ نہیں اور میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو علی بن عبداللہ کے حوالے سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کو ضعیف کہتے ہوئے سنا اورانہوں نے کہا کہ عبداللہ بن زید بن اسلم ثقہ ہیں۔بعض اہل کوفہ کا اسی حدیث پر عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ جب یاد آجائے تو وتر پڑھے اگر چہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد یاد آئے۔سفیان ثوری کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

وجوبِ وتر پر استدلال:(قوله صلى الله عليه وسلم من نام عن وتر او نسيه فليصل اذا ذكره واذا استيقظ) یہ حدیث تو ہماری دلیل ہے کہ وتر واجب ہے کیونکہ قضاء کیا جانا فرض نماز کی صفت ہوتی ہے نوافل کی قضا نہیں ہوتی۔

باب ماجاء فی مبادرة الصبح بالوتر

باب صبح سے پہلے وتر پڑھنے کا بیان

☆حدثنا احمد بن منيع حَدَّثَنَا يحيى بن زكريا بن أَبي زائدةَ حَدَّثَنَا عبيد الله بن نافع عن ابن عمرَ ان النبيَّ صلى الله عليه وسلم : قال: بَادِرُوا الصبحَ بالوتر،قال ابو عيسى:هذا حديث حسن صحيحٌ۔

☆حدثنا الحسنُ بن عليٍّ الخلّالُ حَدَّثَنَا عبد الرَّزّاقِ اخبرنا مَعْمَرٌ عن يحيى بن ابى كَثير عن ابى نَضْرَةَ عن ابى سعيد الخُدْرِيِّ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : اَوْتِرُوا قبلَ ان تُصْبِحُوا۔

☆حدثنا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا عبد الرزاق اخبرنا ابن جريج عن سليمان بن موسى عن نافعٍ عن ابن عمرَ عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: اِذا طلع الفجرُ فقد ذهبَ كلُّ صلاةِ الليلِ والوترُ، فاَوْتِرُوا قبلَ طلوع الفجرِ۔قال ابو عيسى: و سليمان بن موسى قد تَفَرَّدَ به على هذا اللفظ ورُوِىَ عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال: لا وِتْرَ بعد صلاة الصبح۔ وهو قول غير واحد من اهل العلم۔ وبه يقول الشافعيُّ ، واحمدُ، واِسحٰقُ: لايَرَوْنَ الْوِتْرَ بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وتر پڑھنے میں صبح سے سبقت کرو

(یعنی وتر طلوع فجر سے پہلے پڑھ لیا کرو)۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وتر صبح ہونے سے پہلے پڑھ لو۔

☆حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب فجر طلوع ہو جائے تو تہجد اور وتر کا وقت ختم ہو جاتا ہے لہٰذا صبح صادق سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سلیمان بن موسیٰ اس لفظ کو بیان کرنے میں متفرد ہیں۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبح کی نماز کے بعد وتر نہیں یہ متعدد اہل علم کا قول ہے۔امام شافعی، احمد اور اسحٰق کی رائے بھی یہی ہے کہ فجر کی نماز کے بعد وتر نہیں ہیں۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب سے جمہور کا استدلال اور اسکا جواب:(قولہ اذا طلع الفجر فقد ذھب کل صلوٰۃ اللیل والوتر) اس حدیث سے جمہور یہ ثابت کرر ہے ہیں کہ وتر سنت ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ذھب کل صلوٰۃ اللیل کا لفظ تو عشاء کی نماز پر بھی صادق آتا ہے کہ طلوع فجر سے عشاء کا وقت ختم ہو گیا لہٰذا حدیث باب کا بھی یہی مطلب ہے کہ طلوع فجر سے وتر کی نماز کا وقتِ ادا ختم ہو گیا ہے لیکن جس طرح عشاء کی نماز کی قضا لازم ہے اسی طرح وتر کی بھی قضا لازم ہے۔

باب ماجاء لاوِتْرَانِ فی لیلۃٍ

باب ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا مُلَازِمُ بن عَمْرو حدثنی عبد الله بن بَدْرٍ عن قيس بن طلق بن علی عن ابيه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لاوتران فی ليلة۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريب۔ واختلف اهل العلم فی الذی يوتر من اول الليل ثم يقوم من آخره: فرای بعض اهل العلم من اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم ومن بعدهم نقض الوتر، وقالوا: يضيف اليها ركعة ويصلی مابداله، ثم يوتر فی آخر صلاته، لانه لا وتران فی ليلة۔وهو الذی ذهب اليه اسحق۔

وقال بعضُ اهل العلم من اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم وغيرهم: اِذا اوتر من اول الليل ثم نام ثم قام من آخر الليل فاِنه يصلی مَابَدَالَهٗ وَلَا يَنْقُضُ وتره، ويدع وتره علی ماكان۔

وهو قول سفيان الثوری ومالك بن انس وابن المبارك، والشافعی واهل الكوفة واحمد۔

وهٰذا اصحُّ، لانه قد رُوی من غير وجه: ان النبی صلى الله عليه وسلم قد صلّٰی بعد الوتر۔

☆حدثنا محمد بن بشّارٍ حَدَّثَنَا حمّاد بن مَسْعَدَةَ عن میمون بن موسی المَرَئیّ عن الحسن عن أُمّه عن امّ سلمة: ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یصلّی بعد الوتر رکعتین۔قال ابو عیسی: وقد رُوِیَ نحوُ ھذا عن ابی امامة وعائشةَ وغیرِ واحدٍ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

﴿ترجمہ﴾

قیس بن طلق بن علی رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو رات کے شروع میں وتر پڑھ چکا ہو اور پھر آخری حصے میں اٹھے۔بعض صحابہ اور بعد کے علماء کہتے ہیں کہ وتر توڑ دے اور ان کے ساتھ ایک رکعت ملا لے اور پھر جتنی چاہے نماز پڑھ لے پھر نماز کے آخر میں وتر پڑھے اس لئے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔اور اسی کی طرف امام اسحٰق گئے ہیں۔بعض علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کا کہنا ہے کہ اگر رات کے شروع میں وتر پڑھ کر سو گیا پھر آخری حصے میں اٹھا تو جتنی چاہے تہجد کی نماز پڑھے وتر کو باطل نہ کرے (یعنی وتر کو) اسی طرح بحالہ رہنے دے۔سفیان ثوری، مالک بن انس، احمد اور ابن مبارک رحمہم اللہ کا یہی قول ہے اور یہ زیادہ اصح ہے اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کے بعد نوافل پڑھے۔

☆حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔حضرت ابوامامہ، عائشہ اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب احناف کے وجوبِ وتر کے قول پر دلیل ہے: (لا وتران فی لیلة) اس حدیث باب سے حنفیہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ وتر کی نماز واجب ہے وجہ استدلال یہ ہے کہ نفل نماز کو مکرر پڑھا جا سکتا ہے وتر کی نماز میں عدم تکرار اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے نیز یہ بات بھی ان کے لئے موید ہے کہ یہاں سنت موکدہ ہونا بھی مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وتر کی نماز اگر سنت موکدہ ہوگی تو اس کی تکرار کرنے سے سنتوں میں زیادتی لازم آئیگی اور سنتوں میں تو زیادتی صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما سکتے ہیں کسی امتی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سنتوں میں زیادتی کرے مثلاً کوئی شخص ظہر کی سنت کو

دوبارہ ظہر کی سنتوں کی نیت سے پڑھتا ہے تو یہ ناجائز ہے تو یہاں پر بھی اگر وتر کو سنت مانیں تو اس کو مکرر پڑھنا ناجائز ہے۔

نقضِ وتر کا مسئلہ: یہاں ایک مسئلہ باقی رہ گیا کہ ایک دوسری حدیث میں وارد ہے کہ تم سب سے آخری نماز وتر پڑھا کرو اور حدیث باب کا تقاضہ یہ ہے کہ جو آدمی وتر پڑھ کر سو جائے تو وہ دوبارہ وتر نہ پڑھے بلکہ وہ تہجد کی نماز پڑھے تو یہ حدیث باب پہلی حدیث کے معارض ہے اس پہلی حدیث کو دیکھتے ہوئے بعض علماء نے نقضِ وتر کا قول کیا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ جب یہ شخص وتر پڑھکر سو گیا اب بیدار ہوا تو بیدار ہونے کے بعد ایک رکعت پڑھ لے تا کہ گذشتہ وتر شفع بن جائے اور پھر تہجد کی نماز پڑھ کر آخر میں وتر پڑھے۔

نقضِ وتر پر رد: یہ انتہائی عجیب قول ہے کیونکہ جس رکعت کو اس نے وتر کے بعد پڑھا ہے ان کے درمیان ایک بڑے زمانے کا فاصلہ ہے تو یہ ایک رکعت ان تین رکعتوں کے ساتھ کس طرح مل سکتی ہے اور کس طرح ان کے مجموعہ کو ایک نماز شمار کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس میں دوسری خرابی یہ ہے کہ حدیث میں "نھی عن البتیراء" مذکور ہے جبکہ اس صورت میں بتیراء نماز لازم آتی ہے لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ۔

نقضِ وتر کے قائلین کی دلیل کے جوابات: "اجعلوا آخر صلوٰتکم وتراً" والی حدیث یا تو استحباب پر محمول ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی نماز کا وقت پانچوں نمازوں کے اوقات کے آخر میں ہے تو اس حدیث میں وتر کا وقت بیان کیا گیا ہے کہ اس کا وقت عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تیسری تاویل کی جا سکتی ہے کہ اس حدیث میں فرائض اور وتر کے درمیان ترتیب کے ضروری ہونے کو بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح فرض نمازوں کی آپس میں ترتیب ضروری ہے اسی طرح وتر اور عشاء میں بھی ترتیب ضروری ہے لہٰذا وتر کی نماز عشاء کی نماز سے پہلے نہ اداءً پڑھنا جائز ہے نہ قضاءً (کہ اگر مثلاً عشاء اور وتر دونوں قضاء ہو جائیں تو قضاء عمری کرتے ہوئے وتر کی نماز کی قضا عشاء کے فرض پر مقدم نہیں کر سکتے۔ از مترجم)

لقاء الحسن عن علیؓ: (عن الحسن عن امه عن ام سلمة رضی الله عنها) اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حسنؒ کا لقاء ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے اور چونکہ وہ مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کیے ہوئے تھے لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ان کی ملاقات مستبعد نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی والدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کیا کرتی تھیں اور یہ حسن اپنی والدہ کے ساتھ ہوتے تھے۔

حسن بصری کے حالاتِ زندگی: (اضافہ از مترجم: الاکمال فی اسماء الرجال میں ہے کہ یہ حضرت حسن بصری اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے ان کی پیدائش مدینہ میں ہوئی اور حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے ان کی تحنیک فرمائی چونکہ ان کی والدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ہوتی تھیں بسا اوقات وہ کسی کام سے گئی ہوتی تھیں تو حسن بصری روتے تھے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کو خاموش کرانے کیلئے اپنے پستان سے ان کو بہلاتی تھیں۔ محدثین کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری کو اللہ پاک نے جو عقل وفہم وحکمت ودانائی عطا فرمائی تھی وہ اسی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پستان سے چمٹنے کی برکت ہے "وھو امام وقتہ فی کل فن وعلم وزھد وورع وعبادۃ"۔ رجب ۱۱۰ھ میں ان کی وفات ہوئی)۔ کیونکہ مدینہ منورہ سے انکی والدہ جب ہجرت کر کے گئی ہیں تو حسن کی عمر پندرہ سال کی تھی اور بظاہر اس سے کم عمر میں بھی تحمل حدیث اور روایتِ حدیث ممکن ہے تو حضرت حسن کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تحمل حدیث کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حضرت حسن کا لقاء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ممکن ہے اور بہت سے علماء کے نزدیک راوی اور مروی عنہ میں امکانِ لقاء کافی ہے۔

غرضِ مصنف رد ہے امام اسحٰق وغیرہ پر: (قولہ وھذا اصح لانہ قد روی من غیر وجہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد صلی بعد الوتر رکعتین) امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ نقض وتر کے قائلین کا مذہب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "اجعلوا آخر صلوٰتکم وترا" پر مبنی تھا تو مصنف اس حدیث سے انکی دلیل کو توڑ رہے ہیں کہ خود حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کے بعد بھی نماز ادا فرمائی ہے تو اس طرح ان کا دعویٰ خود ہی باطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مصنف فرما رہے ہیں کہ وتر کے بعد نفل پڑھنے کا جائز ہونا یہی اصح مذہب ہے کیونکہ حدیث میں وتر کے بعد نفل پڑھنے کی اجازت ہے آگے اس حدیث کی سند بیان کی ہے۔

باب ماجاء فی الوتر علی الراحلة

باب سواری پر وتر پڑھنے کا بیان

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا مالك بن انسٍ عن ابی بكر بن عمر بن عبد الرحمٰن عن سعید بن یَسَارٍ قال: كنت امشی مع ابن عمرَ فی سفر، فتخلفتُ عنه، فقال: این كنت؟فقلت: اَوْتَرْتُ، فقال: الیس لك فی رسول الله اَسْوَةٌ حسنةٌ ؟ رَاَیْت رسول الله صلی الله علیه وسلم یوترُ علی راحلته۔ قال: وفی الباب عن ابن عباس۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد ذهب بعضُ اهل العلم من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم وغیرهم الی هذا، ورَاَوْان یوترَ الرجلُ علی راحلته۔ وبه یقول الشافعیُّ، واحمدُ، واِسحٰقُ۔ وقال بعض اهل العلم :لا یوترُ الرجل علی الراحلة، واِذا اراد ان یوترَ نزل فاوتر علی الارض۔ وهو قول بعض اهل الكوفة۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سعید بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سفر میں تھا کہ (نماز پڑھنے کیلئے) ان سے پیچھے رہ گیا (پھر جب ان کے ساتھ ہوا) انہوں نے فرمایا تم کہاں تھے؟ میں نے کہا میں وتر پڑھ رہا تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تیرے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ نہیں؟ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سواری (اونٹ) پر وتر پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض علماء صحابہ وغیرہ کا اسی حدیث پر عمل ہے کہ (انہوں نے جائز سمجھا ہے کہ) سواری پر وتر پڑھ لے۔ امام شافعی، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے جبکہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ سواری پر وتر نہ پڑھے پس اگر وتر پڑھنا چاہے تو اترے اور زمین پر وتر پڑھے۔ بعض اہل کوفہ یہی کہتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

(قوله الیس لك فی رسول الله صلی الله علیه وسلم اسوة حسنة) جاننا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کی پیروی بھی کی جائے وہ فعل بہر حال بہترین نمونہ ہے تو یہاں پر لفظ حسنۃ واقع اور خارج کا بیان ہے کہ آپ کا ہر فعل تو بہترین نمونہ ہی ہے، یہ قید احترازی نہیں۔

ایک سوال: یہاں حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن یسار کا زمین پر وتر پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے خلاف ہے حالانکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی نماز زمین پر ادا فرمائی ہے تو سعید بن یسار نے وتر زمین پر پڑھکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی ہے نہ کہ مخالفت تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کیسے ان پر نکیر فرما رہے ہیں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انکی حالت کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ یہ زمین[1] پر وتر کو ناجائز سمجھتے ہیں تو ان کے اس زعم پر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نکیر فرمائی ان کے زمین پر وتر پڑھنے پر نکیر نہیں کی کیونکہ زمین پر وتر پڑھنا تو عزیمت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مستحب افعال اور خلافِ اولیٰ افعال کے درمیان فرق: یہ بات جاننا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فعل کو ایک یا دو دفعہ کیا ہے اس کو مستحب کہا جاتا ہے اور بعض افعال بیان جواز کیلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یا دو دفعہ کئے ہیں وہ مستحب

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح لکھا ہے بظاہر یہ سبقت قلمی ہے یہاں الایتار علی الراحلہ ہونا چاہیئے یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ سمجھے کہ سعید بن یسار سواری پر وتر کو ناجائز سمجھتے تھے۔

نہیں ہیں کیونکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلے قسم کے افعال تو وہ ہیں جن کے کرنے کی فضیلت ہے لیکن آپ نے واجب ہونے کے خوف سے اسکو چھوڑ دیا لہٰذا یہ مستحب کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے افعال وہ ہیں جن کے اندر اصل تو یہ ہے کہ انہیں نہ کیا جائے چنانچہ ان کی ممانعت بھی فرمائی لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دو دفعہ انہیں ادا فرمایا تا کہ اس کی حرمت کا شبہ نہ ہو اسلئے یہ افعال مستحب نہیں ہیں۔

خصم نے وتر علی الراحلۃ سے وتر کے مسنون ہونے پر استدلال کیا ہے: بہرحال وتر علی الراحلہ کے اس باب کی حدیث سے ان حضرات کا استدلال ہے جو وتر کو سنت کہتے ہیں جبھی تو وتر کی نماز سواری پر پڑھنا جائز ہے۔

استدلال کا جواب: (۱) اس کا جواب یہ ہے کہ وتر کی نماز سواری پر اس وقت جائز ہے جبکہ سواری سے اترنے پر قدرت نہ ہو تو یہ حدیث وتر کے سنت ہونے کی دلیل اس وقت بنتی جبکہ وتر کی نماز بغیر عذر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر ہی ادا فرمائی ہوتی لیکن یہاں پر چونکہ وتر کی نماز کی بہت سی احادیث میں تاکید وارد ہوئی ہے اس سے اس کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے لہٰذا لامحالہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کی نماز سواری پر اس موقع پر ادا فرمائی ہوگی جب کسی دشمن کا خوف یا کسی اور مانع کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اترنے پر قادر نہ تھے لیکن چونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس عذر پر تنبہ نہیں ہوا تھا اسلئے وہ سواری پر وتر کے جواز کے قائل ہیں اور (۲) یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ شاید وتر کی نماز کی یہ خصوصیت[۱] ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک واجب بھی تھی لیکن اس کا سواری پر پڑھنا جائز بھی تھا۔

باب ماجاء فی صَلَاۃ الضُّحَی

باب چاشت (ضحیٰ) کی نماز

☆حدثنا ابو کریب محمد بن العلاءِ حَدَّثَنَا یونس بن بُکَیْرٍ عن محمد بن اِسحٰقَ قال: حدثنی موسی بن فُلَانِ بن انسٍ عن عمهِ ثُمَامَةَ بن انسِ بنِ مالكٍ عن انس بن مالكٍ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: مَنْ صلّی الضُّحَی ثِنْتَیْ عَشْرَةَ رکعةً بَنَی اللّٰهُ له قصراً مِن ذهبٍ فی الجنةِ۔

قال: وفی الباب عن اُمِّ هانی، وابی هریرةَ ونُعیمِ بن هَمَّارٍ وابی ذر، وعائشة وابی امامة، وعتبة بن عبد السلمی، وابن ابی اوفی، وابی سعید، وزید بن اَرْقَمَ، وابن عباسٍ۔

---

[۱] یعنی اگر ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ مذہب ثابت ہو جائے کہ ان کے نزدیک وتر کی نماز واجب تھی تو شاید انکے نزدیک وتر کی نماز میں ایسی خصوصیت تھی کہ واجب ہونے کے باوجود سواری پر پڑھی جا سکتی تھی۔

قال ابو عیسی: حدیث انسٍ حدیث غریب، لانعرفُه اِلّا من ھذا الوجہِ۔

☆حدثنا ابو موسی محمد بن المثنی حَدَّثَنَا محمد بن جعفر اخبرنا شعبةُ عن عَمرو بن مُرَّةَ عن عبد الرَّحمٰن بن ابی لیلی قال: مااَخبَرَنِی احدٌ انه رای النبیَّ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلِّی الضُّحَی اِلّا اُمُّ ھانیٍ، فاِنها حدثت: ان رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم دخلَ بیتها یومَ فتحِ مکةَ فاغتسلَ فَسَبَّحَ ثَمانَ رکعاتٍ، مارایتُه صَلّٰی صلاةً قطُّ اخفَّ منها، غیر انه کان یتمُّ الرکوعَ والسجودَ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔وکَانَّ احمدَ رأَی اصحَّ شیءٍ فی ھذا الباب حدیثَ امِّ ھانیٍ۔ واختلفوا فی نُعَیمٍ: فقال بعضهم نعیم بن خَمّارٍ وقال بعضهم ابن همار ویقال ابن هبار ویقال ابن همام والصحیح ابن همار۔ وابو نعیم وهم فیه فقال ابن خمار واخطافیه، ثم تَرَکَ فقال: نعیم عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم۔قال ابوعیسی: واخبرنی بذٰلك عبدُ بن حمید عن ابی نعیم۔

☆ حَدَّثَنَا ابو جعفرٍ السِّمْنَانِی اخبرنا محمد بن حصین حَدَّثَنَا ابو مُسْهِرٍ حَدَّثَنَا اِسمٰعیلُ بن عَیَّاشٍ عن بَحیرِ بن سعدٍ۔ عن خالد بن مَعْدَانَ عن جُبیر بن نفیر عن ابی الدَّرْدَاءِ وابی ذر عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : عن اللّٰہ عزَّ وجلَّ انه قال: ابنَ آدَمَ، ارکع لی مِن اَوَّلِ النهارِ اربَع رکعاتٍ اَکْفِكَ آخِرَهُ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن غریب۔

☆حدثنا محمد بن عبد الاعلی البصریُّ حَدَّثَنَا یزیدُ بن زُرَیْعٍ عن نَهَّاسِ بن قَهْمٍ عن شَدَّادٍ ابی عَمَّارٍ عن ابی هریرةَ قال: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من حافظ علی شَفْعَةِ الضُّحَی غُفِرَله ذنوبهُ، وان کانت مِثلَ زَبَدِ البحرِ۔قال ابو عیسی: وقد رَوَی وَکیع والنَّضر بن شُمَیْل وغیرُ واحدٍ مِن الائمة ھذا الحدیثَ عن نَهَّاسِ بن قَهْمٍ، ولانعرفه الا من حدیثه۔

☆حدثنا زیاد بن ایوب البغدادی حَدَّثَنَا محمد بن ربیعة عن فضیل بن مرزوق عن عطیة العوفی عن ابی سعید الخدری قال: کان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یصلِّی الضُّحَی حتی نقولَ لا یَدَع ویَدَعُهَا حتی نقولَ لایُصَلِّی۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چاشت کی نماز بارہ

رکعات پڑھے اس کیلئے اللہ تعالیٰ جنت میں سونے کا محل بنائے گا۔اس باب میں ام ہانی، ابو ہریرہ، نعیم بن ہمار، ابوذر، عائشہ، ابوامامہ، عتبہ بن عبد سلمی، ابن ابی اوفی، ابوسعید، زید بن ارقم اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں انس رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے ہم اسے اس سند کے علاوہ نہیں جانتے۔

☆ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے ام ہانی رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی صحابی نے نہیں بتایا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا صرف ام ہانی نے مجھے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن ان کے گھر میں آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اور آٹھ رکعات نفل پڑھی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے پہلے کبھی اتنی ہلکی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجود پوری طرح کرر ہے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس باب میں ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت اصح ہے۔ نعیم کے نام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں نعیم بن خمار اور بعض نے ابن ہمار کہا ہے انہیں ابن هبار اور ابن ہمام بھی کہا جاتا ہے جبکہ صحیح ابن ہمار ہی ہے۔ ابونعیم کو اس میں وہم ہو گیا ہے وہ ابن خمار کہتے ہیں انہوں نے اس میں خطا کی ہے پھر ابونعیم نے اس راوی کو جب ذکر کیا تو ان کے والد کو ذکر کئے بغیر صرف اسی طرح کہا نعیم عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے عبد بن حمید نے بواسطہ ابونعیم اس کی خبر دی ہے۔

☆ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (حدیث قدسی) نقل کرتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابن آدم! تو میرے لئے دن کے شروع میں چار رکعتیں پڑھ میں تیرے دن کے آخر تک تیری کفایت کروں گا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ وکیع اور نضر شمیل اور کئی ائمہ حدیث نے یہ حدیث نہاس بن قہم سے روایت کی ہے اور ہم اس حدیث کو صرف نہاس کی سند سے پہچانتے ہیں۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے چاشت کی دو رکعتیں پابندی سے پڑھیں اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگر چہ سمندر کے جھاگ کی طرح ہی کیوں نہ ہو۔

☆ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز پڑھتے یہاں تک کہ ہم کو گمان ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنا بند کر دیتے تو ہمیں گمان ہوتا کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کبھی نہیں پڑھیں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

وقتِ ضحیٰ کی وضاحت: چاشت کی نماز کا وقت سورج کے بلند ہونے کے بعد سے زوال تک رہتا ہے اس کے دو حصے ہیں ایک ضحوۃ کبریٰ، ایک ضحوۃ صغریٰ۔ ضحوۃ کبریٰ اس وقت کا دوسرا آدھا حصہ ہے اور ضحوۃ صغریٰ پہلا آدھا حصہ ہے۔ عموماً لفظِ ضحیٰ کا اطلاق ضحوۃ کبریٰ پر ہوتا ہے (یعنی چاشت پر)۔

ترجمۃ الباب کا مقصد چاشت کی نماز کے سنت ہونے کو ثابت کرنا ہے: اس باب کا مقصد ان لوگوں پر رد ہے جو چاشت کی نماز کو سنت نہیں سمجھتے اور وہ چاشت کی نماز کو بدعت[1] کہتے ہیں۔

اشراق کی نماز متفق علیہ ہے چاشت کی نماز میں اختلاف ہے: یہ بات جاننی چاہیئے کہ الضحوۃ الصغریٰ کی نماز جسے ہم اشراق کہتے ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ الضحوۃ الکبریٰ چاشت کی[2] نماز میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول (وفی الباب عن ام ہانی وابی ہریرۃ ونعیم بن ھمار وابی ذر وعائشۃ وابی امامۃ الخ) اس سے یہ اشارہ ہے کہ چاشت کی نماز والی حدیث صحابہ میں اس قدر مشہور تھی کہ اس کے نفسِ ثبوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اگر چہ ہر روایت میں محدثین کرام کو کچھ کچھ کلام ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا یہ قول کہ مجھے کسی صحابی نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا ہو سوائے ام ہانی کے اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی نماز پڑھی ہی نہیں یا اس نماز کا ثبوت ہی نہیں بلکہ اس جملہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلی علیہ وسلم کے سامنے یہ نماز نہیں پڑھتے تھے ورنہ صحابہ میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہوتا۔ تو یہ سب احادیث فی الجملہ چاشت کی نماز کے ثبوت پر دال ہیں۔ علماء کی دوسری جماعت کے نزدیک چاشت کی نماز ثابت نہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی نماز نہیں پڑھی تھی بلکہ وہ فتحِ مکہ کی بنا پر صلوٰۃ الشکر تھی۔

---

[1] جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صلوٰۃ الضحی بدعت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے چاشت کی نماز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ نمازیں تو پانچ ہیں گویا چاشت کی نماز کا انکار کر رہے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو چاشت کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ سے اس نماز کے پڑھنے کا ثبوت نہیں ہے۔ ابن قیم نے ان احادیث کو ترجیح دی ہے جس میں صلوٰۃ الضحی کے نہ پڑھنے کا ذکر ہے اور ان تمام روایتوں پر تفصیلی کلام کیا ہے جن میں صلوٰۃ الضحی کا ذکر ہے۔ قلت: اس مسئلہ میں علماء کے چھ مذاہب ہیں جنکو میں نے اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

[2] قلت: لیکن عام محدثین چاشت اور اشراق کی نماز میں فرق نہیں کرتے اگر چہ دونوں نمازوں کا ثبوت ہے جیسا کہ میں نے اوجز میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

نعیم بن ھمار کے نام میں اختلاف: (قولہ نعیم بن ھمار) یہ نعیم مصغر (تصغیر کا صیغہ) ہے ان کے والد کے نام میں اختلاف[1] ہے بعضوں نے انکے والد کا نام خمار بتایا ہے نقطے والے خاء اور میم مشدد کے ساتھ اور بعضوں نے ھمار بتلایا ہے یعنی ھاء ھوز اور اس کے بعد میم، بعضوں نے ھمام بتلایا ہے۔

ابونعیم تصغیر کے صیغہ کے ساتھ بخاری کے اساتذہ میں سے ایک استاذ کا نام ہے انہوں نے اس نعیم صحابی کے نسب بیان کرنے میں وہم[2] کیا ہے پھر انہوں نے ان صحابی کو نعیم بغیر والد کی طرف منسوب کئے ذکر کرنا شروع کر دیا کہ صرف انہیں نعیم کہتے۔

اربع رکعات کا مصداق: (قولہ ابن آدم ارکع لی اربع رکعات الخ) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی چار رکعت دن کے ابتدائی حصہ میں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کے تمام کاموں کی کفایت فرمائینگے اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو آدمی صبح فجر کی نماز کی دو سنتیں اور دو فرض یہ چار رکعت پڑھ لے ان چار رکعت پڑھنے پر بھی یہ فضیلت وارد ہے چنانچہ[3] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی فجر کی نماز پڑھتا ہے وہ اللہ کے ذمہ میں داخل ہو جاتا ہے لہٰذا تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کو مت توڑو۔ اسی طرح اگر انسان چار رکعت اشراق پڑھ لے تو یہ وعدہ دوسری مرتبہ بھی صادق آتا ہے اور جب کوئی بندہ چار رکعت چاشت ادا کرے تو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تیسری دفعہ صادق آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چاشت کی نماز متعدد احادیث سے ثابت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن علماء میں یہ اختلاف ہے کہ کتنی رکعت پڑھی جائینگی۔

---

[1] المغنی میں ہے کہ نعیم بن ھمار، ھاء کے زبر میم کی تشدید اور اس کے بعد لفظ راء ہے۔ بعضوں نے ھبار کہا ہے یعنی تشدید والی باء کے ساتھ بعضوں نے ھدار کہا ہے دال مشددہ کے ساتھ اور بعضوں نے خمار کہا ہے نقطہ والی خاء کے ساتھ۔ انتھی۔ تقریب میں لکھا ہے کہ نعیم بن ھمار انکے والد کا نام یا تو ھمار ہے یا ھدار...... یا ھبار...... یا خمار خاء اور حاء کے ساتھ۔ غطفان سے ان کا تعلق ہے صحابی ہیں اکثر علماء نے ان کے والد کا نام ھمار بتلایا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ ابونعیم فضل بن دکین سے نعیم صحابی کے سلسلہ نسب بیان کرنے میں غلطی ہوئی چنانچہ انہوں نے ان کا نسب نامہ نعیم بن خمار ذکر کیا ہے جب انہیں غلطی پر تنبہ ہوا تو ابونعیم نے ان صحابی کو انکے والد کی طرف منسوب کئے بغیر ذکر کرنا شروع کیا چنانچہ وہ عن نعیم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مطلقاً ذکر کرتے۔

[3] **فجر کی نماز پڑھنے والا "اَکْفِکَ اٰخِرَہٗ" کے مصداق میں داخل ہے:** یعنی جو شخص فجر کی نماز پڑھتا ہے تو وہ " اکفک آخرہ" کے عموم میں داخل ہو جائیگا اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو باب فضل العشاء و الفجر فی جماعۃ میں گزری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص فجر کی نماز ادا کرتا ہے وہ اللہ کے ذمہ میں ہوتا ہے (الحدیث) معلوم ہوا کہ فجر کی نماز پڑھنے والا جب اللہ کے ذمہ میں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی کفایت بھی فرمائینگے۔

بہرحال خلاصہ[1] یہ ہے کہ حدیث میں اربع رکعات سے فجر کی سنتیں اور دوفرض بھی مراد ہوسکتے ہیں جیسا کہ دوسری حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے نیز اس کا مصداق اشراق کی چار رکعتیں بھی ہوسکتی ہیں تو ان چار رکعت پر بھی اللہ کا وعدہ ہے اور اس سے چاشت کی چار رکعتیں بھی مراد ہوسکتی ہیں کہ اس پر بھی اللہ کا وعدہ ہے۔ اس طرح حدیث باب میں جو بارہ رکعت کا ذکر ہے تو اسکی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص اشراق یا چاشت دونوں وقتوں میں بارہ رکعات ادا کرے مثلاً اشراق میں چھ رکعت پڑھے اور چاشت میں چھ رکعت یا اشراق میں چار رکعت اور چاشت میں آٹھ ہر صورت میں جنت میں سونے کے گھر کا جو وعدہ کیا گیا ہے یہ وعدہ اس شخص کو بھی حاصل ہو جائیگا۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ بارہ رکعتیں خاص ایک وقت میں پڑھنا ضروری نہیں۔

(قولہ قال ابو عیسیٰ ھذا حدیث غریب) یعنی ابن آدم ارکع لی اربع رکعات والی حدیث غریب ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح ھذا الحدیث کے دو مطلب ہیں: (وروی وکیع والنضر بن شمیل وغیر واحد من الائمة ھذا الحدیث عن نھاس ابن قھم) یعنی وکیع اور نضر وغیرہ نے آنے والی حدیث "من حافظ علی شفعة الضحی" کو نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس جملہ[2] سے اشارہ کیا ہے کہ نہاس بن قہم اس حدیث کے نقل کرنے میں متفرد ہیں اسلئے آنے والی حدیث غریب ہے۔ تو اس جملہ میں ھذا الحدیث کا مشارالیہ اگلی آنے والی حدیث ہے یا یہ تاویل کی جائیگی کہ اس سے اشارہ مطلقاً صلوٰۃ الضحیٰ کی طرف ہے جس کے بارے میں بحث چل رہی ہے تو اس صورت میں ھذا الحدیث سے اشارہ کرنا صحیح ہے کہ صلوٰۃ الضحیٰ والی حدیث وکیع اور نضر وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔

(قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی الضحی حتی نقول لا یدع ویدعھا حتی نقول لا یصلی)

اشکال: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام کو کرتے تو اسپر ہمیشگی فرماتے تھے جبکہ اس حدیث سے معلوم ہورہا ہے کہ صلوٰۃ الضحیٰ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مداومت نہیں فرماتے تھے تو یہ حدیث تو آپ کی عادت کے خلاف دلالت کررہی ہے۔

جواب: آپ کی عادتِ مبارکہ تو مداومت کی تھی چنانچہ ہر کام میں آپ کا قصد اور ارادہ یہی ہوتا تھا کہ اس پر مداومت فرمائینگے البتہ بہت سے عوارض کی وجہ سے اس کام کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہاں سے آگے تک یہ سارا کلام مکرر ہے لیکن چونکہ ہمارے مخطوطہ کے حاشیہ میں اسی طرح لکھا ہوا تھا تو ہم نے اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا ہے کہ اس میں بعض مزید فوائد بھی موجود ہیں۔

[2] اس وجہ سے بعض مصری نسخوں میں یہ کلام اگلی حدیث کے بعد مذکور ہے۔

ایک فعل کر رہے ہوتے تھے پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے فعل کو اختیار کرتے تاکہ یہ پہلا فعل واجب نہ قرار دیا جائے تو بہر حال اس جیسے دوسرے افعال کو پہلے افعال کے قائم مقام کر کے ان پر مداومت تو کی جاتی تھی اگر چہ بعینہ اس عمل پر مداومت نہیں ہوتی تھی تو یہی حال چاشت کی نماز کا ہے کہ اس پر بعینہ تو مداومت نہیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی دوسرا فعل اس کی جگہ ادا فرماتے ہوں اس طرح اس فعل پر مداومت ہو جاتی تھی۔

باب ماجاء فی الصلاۃ عند الزوالِ

باب زوال کے وقت نماز پڑھنا

☆حدثنا ابو موسی محمد بن المثنی حَدَّثَنَا ابو داودَ الطَّیالسی حَدَّثَنَا محمد بن مُسلم بن ابی الوضَّاحِ، هو ابو سعیدِ المودب، عن عبد الکریم الجزری عن مجاهدٍ عن عبد اللّٰه بن السَّائبِ : اَنَّ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان یصلّی اربعاً بعدَ ان تزُولَ الشمس قبلَ الظهرِ، وقال: انها ساعةٌ تُفتَحُ فیها ابوابُ السماءِ، واُحِبُّ ان یَصْعَدَ لی فیها عملٌ صالح۔ قال: وفی الباب عن علیٍّ، وابی ایوبَ۔ قال ابو عیسی: حدیث عبد اللّٰه بن السائبِ حدیث حسن غریب۔وقد رُوِیَ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: انه کان یصلّی اربَع رکعاتٍ بعد الزوالِ لایسلِّم اِلَّا فی آخرهنَّ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے اور فرمایا یہ ایسی گھڑی ہے کہ اس میں آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ اس میں میرے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے دربار میں چڑھیں۔ اس باب میں حضرت علی اور ابو ایوب رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن سائب کی حدیث حسن غریب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد چار رکعت نماز ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

﴿تشریح﴾

اربع سے مراد حنفیہ شافعیہ کے یہاں سنن زوال ہیں: (قولہ اربع بعد الزوال) یہ چار رکعتیں کونسی تھیں تو بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ ظہر کی سنتیں ہوتی تھیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ چار رکعتیں سنتوں کے علاوہ ہیں شافعیہ کے مذہب کے

مطابق تو بات بالکل واضح ہے کیونکہ ان کے ہاں ظہر کی سنتیں دو رکعتیں ہیں اور یہ تو چار رکعتیں ہیں جو ایک سلام کے ساتھ پڑھی جارہی ہیں تو ان کے ہاں یہ چار رکعتیں سنت نہیں ہیں۔ حنفیہ کے مذہب میں بھی یہ چار رکعت سنتیں نہیں تھیں کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتیں تو فرائض سے متصل ہونی چاہیئے[1]۔ یہی اصول ہے اور امتیوں کو گرمی میں ظہر کی نماز کی تاخیر کا حکم دیا گیا ہے تو یہ چار رکعت ظہر کی سنتیں کس طرح ہوسکتی ہیں کیونکہ اس میں اور فرائض میں تو بہت بڑے وقت کا فاصلہ لازم آئیگا یہ نماز تو زوال کے فوراً بعد پڑھی جارہی ہے۔

باب ماجاء فی صلاۃ الحاجَةِ

باب نماز حاجت کے بیان میں

☆حدثنا علیٌّ بن عیسی بن یزیدَ البَغْدَادِیُّ حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن بکرٍ السَّھْمِیُّ، وحدثنا عبد اللّٰہ بن مُنِیرٍ عن عبد اللّٰہ بن بکرٍ عن فَائِدِ بن عبد الرحمن عن عبد اللّٰہ بن ابی اَوْفَی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مَن کانت لہ الی اللّٰہ حاجةٌ او الی احدٍ من بنی آدمَ فلیتو ضّأ فلیُحسن الوضوءَ، ثم لیُصَلِّ رکعتین، ثم لیثن، علی اللّٰہ ، ولْیُصَلِّ علی النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، ثم لِیَقُلْ: لاالٰہ الَّا اللّٰہُ الحلیم الکریمُ، سُبحَان اللّٰہ رَبِّ العرشِ العظیمِ الحمدُ للّٰہ ربِّ العالمین، اَسْئَلُکَ مُوجباتِ رحمتِکَ، وعَزَائِمَ مغفرتکَ، والغنیمةَ مِن کلِّ بِرٍّ، والسلامةَ مِن کلِّ اِثْمٍ، لاتَدَعْ لی ذنباً اِلَّا غفرتَہ، ولا ھَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَہ، ولا حاجةً ھِیَ لک رِضاً اِلَّا قَضَیْتَھَا، یَاْ رحمَ الرَّاحِمینَ۔ قال ابو عیسی:ھٰذا حدیثٌ غریب وفی اسنادہ مقالٌ۔فائد بن عبد الرحمٰن یُضَعَّفُ فی الحدیثِ، وفائدٌھو، ابو الورقاء۔

---

[1] **سنتوں کے بعد کلام کرنے کا حکم:** چنانچہ صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سنتوں اور فرض کے درمیان باتیں کریگا تو سنتیں ساقط تو نہیں ہونگی لیکن اس کا ثواب کم ہوجائیگا اور ایک قول میں سنتیں باطل ہوجائیں گی۔ اسی طرح سنتوں کے بعد ایسا کام کرنا جو نماز کی تحریمہ کے منافی ہے اس کا بھی یہی حکم ہے چنانچہ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کوئی آدمی سنتوں کے بعد خرید وفروخت یا کھانے میں مشغول ہو جائے تو اسے سنتوں کا اعادہ کرنا چاہیئے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں وقیل تسقط اس قول کے مطابق اسے سنن قبلیہ کے بعد اگر باتیں کی ہیں تو انکا اعادہ کرنا چاہیئے اور اگر اسنے فرض نماز کے بعد سنن بعدیہ سے پہلے باتیں شروع کردیں تو وہ سنتیں نفل بن جائینگی اور اس قول کے مطابق اسکا اعادہ نہیں ہوگا۔ انتہی صاحب بحرالرائق نے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص طلوع فجر کے بعد دومرتبہ سنتیں پڑھے تو راجح قول میں آخری والی دو رکعت فجر کی سنتیں شمار ہونگی کیونکہ یہ سنتیں فرض کے زیادہ قریب ہیں ان میں اور فرض میں کوئی فاصلہ نہیں ہے اور سنتیں وہ نماز کہلاتی ہیں جو فرض نماز سے متصل پڑھی جائیں۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی کو کوئی حاجت درپیش ہو خواہ اللہ سے یا لوگوں سے تو اسے چاہیئے کہ اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے۔ پھر اللہ کی حمد وثناء کرے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور یہ پڑھے "لا الہ الا اللہ....." الخ (ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بردبار بزرگی والا ہے۔ پاک ہے اللہ اور عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ چیزیں مانگتا ہوں جو تیری رحمت کو واجب کرنے والی اور تیری بخشش کا پکا ذریعہ ہوتی ہیں اور میں ہر نیکی میں سے غنیمت (یعنی بغیر محنت کے فائدہ مانگتا ہوں) اور ہر گناہ سے سلامتی طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ! میرے کسی گناہ کو بخشے بغیر نہ چھوڑیں، اور نہ چھوڑیں میرے کسی غم کو، (مگر اسے دور کر دیں) اور نہ کسی حاجت کو جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہو مگر اسے پورا فرما دیں۔ اے رحم کرنے والوں سے بہت زیادہ رحم کرنے والے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اس اسناد میں کلام ہے اور فائد بن عبدالرحمٰن ضعیف ہیں اور وہ فائد ابوالورقاء ہیں۔

﴿تشریح﴾

سندِ حدیث میں دو فرق: (قولہ حدثنا علی بن عیسیٰ بن یزید البغدادی قال اخبرنا عبداللہ بن بکر السھمی قال وحدثنا عبداللہ بن منیر عن عبداللہ بن بکر) مصنفؒ نے اپنے دونوں استادوں (علی بن عیسیٰ اور عبداللہ بن بکر) کو اکٹھے اس لئے ذکر نہیں کیا کیونکہ ان دونوں اساتذہ کی سندوں میں کئی طرح فرق ہے۔ نمبر۱: پہلے استاذ علی بن عیسیٰ سند میں عبداللہ بن بکر کو نسبتِ سہمی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جبکہ دوسرے استاذ عبداللہ بن منیر سند میں عبداللہ بن بکر کو بغیر نسبتِ سہمی کے ذکر کرتے ہیں دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں اخبرنا کی تصریح ہے اور دوسری حدیث میں یہ روایت معنعن ہے۔

باب ماجاء فی صلاةِ الأستخارةِ

باب استخارے کی نماز

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا عبد الرحمٰن بن ابی المَوَالی عن محمد بن المُنْكَدِرِ عن جابر بن عبد الله قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلّمنا الا ستخارةَ فى الامور كلّها، كما يعلمنا السورةَ من

القرآن، يقولُ: إذا هَمَّ احدُ كم بالامرِ فليركع ركعتين من غيرِ الفريضةِ، ثم لِيَقُلْ: اللّٰهُمَّ انى استخيرك بعلمك واستقدرك بقدرتك واسئلك من فضلك العظيم فانك تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغيوب اللهم اِنْ كنتَ تَعْلَمُ اَنَّ هذا الامرَ خَيْرٌ لي في دِيني ومَعِيشَتي وعاقبة امرِي، اوقال: في عاجِلِ امرِي وآجِلِهِ: فَيَسِّرْهُ لي، ثم بارك لي فيه، وان كنتَ تعلمُ اَنَّ هذا الامر شَرٌّ لي في دِيني ومعيشتي وعاقِبَةِ امري، اوقال: في عاجل امري وآجله: فَاصْرِفْهُ عَنِّي، واصْرِفْني عنه، واقْدُرْلي الخيرَ حيثُ كان، ثُمَّ ارْضِني به۔ قال: ويُسَمِّي حاجَتَهُ۔

قال : وفي الباب عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ، وابي اَيُّوبَ۔ قال ابو عيسى: حديث جابر حديث حسن صحيحٌ غريبٌ، لانعرفُه اِلَّا من حديث عبد الرحمٰن بن ابي المَوَالِي۔وهو شيخٌ مدينيٌّ ثقةٌ، رَوَى عنه سفيانُ حديثاً، وقد رَوَى عن عبد الرحمٰن غيرُ واحدٍ من الائمة۔ وهو عبد الرحمٰن بن زيد بن ابي الموالي۔

﴿ترجمه﴾

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تمام معاملات میں استخارہ کرنا سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی ایک سورۃ سکھاتے تھے۔فرماتے کہ تم میں سے کسی کے سامنے کوئی اہم معاملہ ہوتو چاہیئے کہ وہ فرض کے علاوہ دو رکعت نماز نفل پڑھے پھر یہ دعا پڑھے۔''اللہم انی......الخ ''اور جب ھٰذا الامر پر پہنچے تو اپنی حاجت کو زبان سے کہے (اور اگر عربی نہ جانتا ہوتو اپنی حاجت کا دھیان کرے) اے اللہ! میں آپ کی صفت علم کے وسیلے سے آپ سے خیر طلب کرتا ہوں اور آپ کی صفت قدرت کے ذریعہ سے آپ سے قدرت مانگتا ہوں اور آپ کے فضل عظیم کا طلبگار ہوں آپ ہر چیز پر قادر ہیں اور میں کسی چیز پر قادر نہیں۔آپ ہر چیز کو جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا۔آپ پوشیدہ چیزوں سے بھی واقف ہیں۔اے اللہ! اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے لئے بہتر ہے میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت میں یا فرمایا کہ میرے اس دنیا اور اس کے بعد کے معاملے میں تو اسے میرے لئے مقدر کر دیجئے اور آسانی فرمایئے اور اس میں میرے لئے برکت نصیب فرمایئے اور اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے دین میری دنیا اور میری آخرت میں میرے لئے برا ہے تو اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دیجئے۔اور میرے لئے جہاں ہو بھلائی مقدر فرمایئے پھر مجھے اس سے راضی کر دیجئے۔اس باب میں عبداللہ بن مسعود اور ابوایوب رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابرؓ کی حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ہم اسے عبدالرحمٰن بن ابی الموالی کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور وہ (عبدالرحمٰن مدنی ہیں۔ مدینۃ السلام یعنی بغداد کے باشندے ہیں) وہ ثقہ ہیں۔سفیان نے ان سے حدیث روایت کی ہے اور دیگر متعدد ائمہ بھی عبدالرحمٰن سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

(قولہ فی دینی ومعیشتی) یعنی میں اس وقت جس دینی اور دنیوی حالت پر ہوں یہ کام میری اس حالت کے مناسب ہے یا نہیں۔

(وعاقبة امری) یعنی انجام کار کے اعتبار سے یہ کام میرے دینی یا دنیوی اعتبار سے مناسب ہے یا نہیں۔

(یسمی حاجته) اسکے دو مطلب ہیں: پہلا مطلب یہ ہے کہ ان كنت تعلم ان هذا الامر میں هذا الامر کی جگہ اپنی ضرورت کو ذکر کرے کہ میرا یہ سفر یا نکاح وغیرہ۔دوسرا قول یہ ہے کہ دعا میں تو هذا الامر کہے اور اس سے اشارہ اپنے کام کی طرف کرے۔جاننا چاہیئے استخارہ ایسے کام میں کیا جاتا ہے جس کے متعلق تردد ہو کہ اس میں خیر ہے یا نہیں اسی طرح وقت کی تعیین میں بھی استخارہ کیا جاتا ہے مثلاً اس سال نفل حج کرنے میں خیر ہے یا نہیں اس میں بھی استخارہ کیا جا سکتا ہے۔

باب ماجاء في صلاة التّسبيح

باب صلوٰۃ التسبیح کے بیان میں

☆حدثنا ابو كُرَيْبٍ محمد بن العلاء حَدَّثَنَا زيد بن حُبَابٍ العُكْلِيُّ حَدَّثَنَا موسى بن عبيدة حدثني سعيدُ بن ابي سعيد مولى ابي بكر بن محمد بن عمرو بن حزمٍ عن ابي رافع قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم للعباسِ: ياعَمِّ، اَلاَ اَصِلُكَ ، اَلاَ اَحْبُوكَ، اَلاَ اَنْفَعُكَ؟ قال:بَلٰى يارسولَ اللّٰه، قال: ياعَمِّ، صلِّ اربعَ ركعات تقرأُ في كلِّ ركعةٍ بفاتحة الكتاب وسورةٍ، فإذا انْقَضَتِ القراءةُ فقل: اللّٰه اكبرُ، والحمدُ لله، وسبحَان اللّٰه، ولا اِله اِلاَّ اللّٰه: خَمْسَ عَشْرَةَ مَرَّةً قبل ان تركعَ، ثم اركعْ فَقُلْهَا عَشْراً، ثُمَّ ارْفَعْ رَأْسَكَ فَقُلْهَا عَشْراً، ثم اسجد فقلها عشراً، ثُمَّ ارْفَعْ رَاسكَ فقلها عشراً، ثم اسجد الثانية فقلها عشراً، ثم ارفع راسكَ فقلها عشراً قبلَ ان تقومَ۔ فتلك خَمْسٌ وسبعون في كلِّ ركعةٍ، وهي ثلاثمائة في اربع ركعاتٍ۔ فلو كانت ذنوبك مِثْلَ رَمْلٍ عَالِجٍ لَغَفَرَهَا

اللّٰهُ لك۔ قال: يارسولَ اللّٰه: ومن يستطيعُ ان يقولهافی كلِّ يومٍ؟ قال: فإن لم تستطِعْ ان تقولهافی كـلِّ يومٍ فَقُلْهَا فی جمعةٍ، فإن لم تستطع اَنْ تقولها فی جمعةٍ فقلها فی شهرٍ، فلم يَزَلْ يقول له حَتّٰی قال: فقلها فی سَنَةٍ۔ قال ابو عيسی: هذا حديثٌ غريبٌ من حديث ابی رافعٍ۔

☆حدثنا احمد بن محمد بن موسی اخبرنا عبد اللّٰه بن المباركِ اخبرنا عِكْرِمَةُ بن عَمار حدثنی اسحٰق بـن عبـد اللّٰه بن ابی طلحةَ عن انس بن مالك: اَنَّ اُمَّ سُلَيمٍ غَدَتْ علی النبیِّ صلی اللّٰه عليه وسلم فـقـالـت: عَلِّمْنی كلماتٍ اقولُهُنَّ فی صلاتی ، فقال: كَبِّرِی اللّٰهَ عَشْراً، وسَبِّحِی اللّٰهَ عَشْراً، وَاحْـمَـدِيهِ عَشراً ، ثُم سَلِی ماشِئتِ، يقول: نَعَمْ نَعَمْ۔قال : وفی الباب عن ابن عباسٍ، وعبد اللّٰه بن عـمـروٍ، والـفـضـل بـن عباسٍ، وابی رافعٍ۔قال ابو عيسی: حديث انسٍ حديث حسن غريبٌ۔ وقد رُوِیَ عـن الـنبـیِّ صـلـی الـلّٰـه عـلـيـه وسـلـم غيـرُ حديثٍ فی صلاة التَّسبِيحِ، ولا يصحُّ منـه كبيرُ شیٔ۔وَقَدْرأَی ابنُ المبارك وغيرُ واحدٍ من اهل العلمِ صلاةَ التَّسبِيحِ، وذكروا الفضلَ فيه۔

☆حـدثـنـا احـمـد بن عَبْدَةَ حَدَّثَنَا ابو وَهْبٍ قال سالتُ: عبد اللّٰه بن المباركِ عن الصلاةِ التی يُسَبَّحُ فيـهـا؟ فـقـال: يُكَبِّرُ ثُمَّ يقول: سبحانكَ اللهمَّ وبحمدكَ، وتبارك اسمُك، وتعالَی جَدُّكَ ، ولا اِلٰهَ غيرُك۔ ثم يـقـولُ خَـمْـسَ عَشْـرَةَ مَرَّةً: سبحان اللّٰه، والحمدللّٰه، ولا اِلٰهَ اِلا اللّٰهُ، واللّٰهُ اكبرُ، ثم يَتَعَوَّذُ ويقرأُ بسم اللّٰه الـرحمن الرحيم وفاتحةَ الكتابِ وسورةً۔ ثم يقولُ عَشْرَ مرّاتٍ: سبحانَ اللّٰه، والحمدُ للّٰه، ولا اِلٰه اِلا اللّٰهُ، والـلّٰـه اكبر۔ ثم يركعُ فيقولها عشراً۔ ثم يرفعُ راسَه من الركوع فيقولها عشراً۔ ثم يسجدُ فيقولها عشراً۔ ثم يرفع راسه فيقولها عشراً۔ ثم يسجد الثانية فيقولها عشراً۔ يصلّی اربعَ ركعاتٍ علی هذا، فذلك خمسٌ وسبـعـونَ تسبيـحةً فی كلِّ ركعةٍ، يبدأُفی كلِّ ركعةٍ بخمس عشرةَ تسبيحَةً، ثم يقرأُثم يسبح عشراً۔ فإن صـلّـی لَيْلاً فَـاَ حَـبُّ اِلَـیَّ ان يسلِّم فی الركعتين، وان صلّی نهاراًفإن شاء سَلَّمَ وان شاء لم يسلِّم۔ قال ابو وَهْـبٍ، واخبـرنی عبد العزيز بن ابی رِزْمَةَ عن عبد اللّٰه انه قال: يَبْدَأُ فی الركوعِ بسبحَان ربی العظيم، وفی السـجود بسبحَان ربی الاعلی: ثلاثاً، ثم يسبِّحُ التسبيحاتِ۔ قـال احمد بن عبدة: وحدثنا وهب بن زمعة قـال: اخبـرنـی عبـد الـعـزيـز ، وهـو ابن ابی رزمة، قال: قلت لعبد اللّٰه بن المبارك: إن سَهَا فيها يسبح فی سجدتی السهو عشراً عشراً ؟قال:لا انما هی ثلاثمائة تسبيحة۔

﴿ترجمہ﴾

☆ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے میرے چچا! کیا میں آپ کے ساتھ صلہ رحمی نہ کروں؟ کیا میں آپ کو تحفہ نہ دوں؟ کیا میں آپ کو نفع نہ پہنچاؤں؟ انہوں نے عرض کیا ہاں کیوں نہیں اے اللہ کے رسول (یارسول اللہ!) آپ نے فرمایا اے میرے چچا! چار رکعت پڑھیئے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور کوئی سورۃ پڑھیئے اس کے پڑھنے کے بعد رکوع سے پہلے پندرہ مرتبہ ''اللہ اکبر، الحمد للہ، سبحان اللہ'' پڑھیئے پھر رکوع کیجئے اور رکوع میں دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھیئے۔ پھر رکوع سے سر اٹھا کر دس مرتبہ یہ تسبیح پڑھیئے پھر سجدہ کریں اور اس میں دس مرتبہ پھر سر اٹھا کر دس مرتبہ پھر دوسرے سجدے میں دس مرتبہ اور پھر سر اٹھا کر، کھڑے ہونے سے پہلے، دس مرتبہ یہی کلمات پڑھیئے یہ ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ ہوا اور چاروں رکعتوں میں ۳۰۰ مرتبہ ہوا۔ اگر آپ کے گناہ (صغیرہ) ریت کے ٹیلے کے برابر بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسے ہر روز کون پڑھنے کی طاقت رکھتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آپ روزانہ پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تو جمعہ کے دن (یعنی ہفتہ میں ایک مرتبہ) اگر جمعہ کو بھی نہ پڑھ سکیں تو مہینے میں ایک مرتبہ پڑھ لیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح فرماتے رہے یہاں تک کہ فرمایا تو پھر سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث ابورافع کی حدیث سے غریب ہے۔

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا صبح کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئیں اور عرض کیا آپ مجھے کچھ کلمات سکھایئے جو میں اپنی نماز میں پڑھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دس مرتبہ اللہ اکبر، دس مرتبہ سبحان اللہ اور دس مرتبہ الحمد للہ پڑھو۔ پھر جو چاہو مانگو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہاں، ہاں (یعنی عطا فرماتا ہے)۔

اس باب میں ابن عباس، عبداللہ بن عمرو، فضل بن عباس اور ابورافع رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن غریب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ التسبیح کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور بھی روایات مروی ہیں لیکن ان میں سے کچھ بڑی تعداد صحیح نہیں ہیں۔ ابن مبارک اور کئی علماء نے بھی صلوٰۃ التسبیح کو تسلیم کیا ہے اور اس کی فضیلت بیان کی ہے۔

☆ روایت کی ہم سے احمد بن عبدہ نے ان سے بیان کیا ابو وہب نے انہوں نے کہا میں نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا اس نماز کے متعلق جس میں تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا ''اللہ اکبر'' کہے (تکبیر تحریمہ کہے) اور پھر ثنا پڑھے

"سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالیٰ جدك ولا اله غيرك" اس کے بعد "سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اكبر" پندرہ مرتبہ پڑھے۔ پھر تعوذ وتسمیہ پڑھ کر سورۃ فاتحہ اور کوئی اور سورۃ پڑھے پھر دس مرتبہ "سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اكبر" پڑھے پھر رکوع میں دس مرتبہ پھر سر اٹھا کر دس مرتبہ پھر سجدے میں دس مرتبہ پھر سجدے سر سے اٹھا کر دس مرتبہ پھر دوسرے سجدے میں دس مرتبہ یہی پڑھے چاروں رکعتیں اسی طرح پڑھے یہ ہر رکعات میں ۷۵ تسبیحات ہوئیں۔ ہر رکعت کے شروع میں پندرہ مرتبہ تسبیح پڑھے۔ پھر قرأت کرے پھر دس مرتبہ تسبیح پڑھ لیں پس اگر رات میں یہ نماز پڑھ رہا ہو تو نمازی ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرے یہ مجھے پسند ہے اور اگر دن میں پڑھے تو چاہے سلام پھیرے چاہے نہ پھیرے (یعنی دن میں صلوٰۃ التسبیح ایک سلام سے بھی صحیح ہے اور دو سلام سے بھی)۔

ابو وہب کہتے ہیں مجھ سے عبدالعزیز (جو ابن ابی رزمہ ہیں) نے عبداللہ (ابن المبارک) سے روایت کرتے ہوئے بتایا ان کا کہنا ہے کہ نمازی رکوع میں پہلے تین مرتبہ "سبحان ربي العظيم" اور سجدے میں پہلے تین مرتبہ "سبحان ربي الاعلى" پڑھے اور پھر مذکورہ تسبیحات پڑھے۔ احمد بن عبدہ کہتے ہیں ہم سے وہب بن زمعہ نے بیان کیا ان کو عبدالعزیز (ابن ابی رزمہ) نے بتایا کہ انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ اگر اس نماز میں بھول جائے تو کیا سجدہ سہو کے دونوں سجدوں میں بھی دس دس مرتبہ تسبیحات پڑھے گا؟ کہا کہ نہیں یہ تین سو مرتبہ تسبیحات ہی ہیں۔

تشریح

(قوله ولو كانت ذنوبك مثل رمل عالج) یعنی تمہارے گناہ تہہ بہ تہہ ٹیلے کے مانند ہوں۔

(قوله ومن يستطع ان يقولها في يوم) یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ جہاد وغیرہ دوسرے مشاغل کی وجہ سے ہم میں سے کون شخص اس کو روزانہ پڑھ سکے گا۔

(فلم يزل يقوله) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ایک مہینے میں ایک بار پڑھ لیا کرو پھر اس طرح فرمایا کہ دو مہینوں میں ایک بار، پھر فرمایا کہ چار مہینے میں ایک بار پڑھ لیا کرو۔ یہاں تک کہ بالآخر فرمایا کہ سال میں ایک بار پڑھ لیا کرو۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: (قوله ان ام سليم غدت) علماء نے امام ترمذی رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اس دوسری حدیث کو صلوٰۃ التسبیح کے باب میں کیوں ذکر کیا ہے حالانکہ یہ اذکار تو نماز کے بعد[1] پڑھے جاتے ہیں

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے بظاہر یہاں پر یقرا بعد السلام ہونا چاہیئے۔ (نہ کہ یصلی بعد السلام)

جیسا کہ اس روایت کی دوسری سند میں ہے۔[1]

جواب: حدیث باب سے مصنف کا استدلال محدثین کے طریقے کے مطابق ہے کیونکہ محدثین کے ہاں اگرچہ حادثہ واحدہ میں مختلف قسم کی حدیثیں وارد ہوں تو وہ الگ الگ حدیثیں شمار ہوتی ہیں اور محدثین ہر لفظ حدیث سے ایک الگ مسئلہ نکالتے ہیں چنانچہ یہاں پر حدیث باب میں ''اقولھن فی صلوٰتی'' کا لفظ ہے اور فی کا اصل معنی ظرفیت ہے تو اس کے ظاہری الفاظ سے مصنف نے استدلال کیا ہے کہ نماز کے اندر یہ تسبیحات پڑھی جائیں گی لہٰذا اس حدیث کو صلوٰۃ التسبیح کے باب میں ذکر کرنا صحیح ہوا اگرچہ درحقیقت یہاں پر فی ظرفیت کیلئے نہیں ہے بلکہ فی صلوٰتی کا مطلب بعد صلاتی ہے۔

باب ماجاء فی صفة الصلاة علی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے طریقے کے بیان میں

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو اسامة عن مِسْعَرٍ والا جْلَحِ ومالكِ بن مغْوَلٍ عن الحَکَم بنِ عتیبة عن عبد الرحمٰن بن ابی لیلی عن کَعْبِ بن عُجْرَةَ قال: قلنا: یارسولَ اللّٰه، هذا السَّلَامُ علیك قد عَلِمْنَا، فکیف الصلاةُ علیك؟ قال: قولوا: اللهمَّ صلِّ علی محمد وعلی آل محمد، کما

---

[1] **اس حدیث میں تسبیحاتِ فاطمی کا بیان ہے نہ کہ صلاۃ التسبیح کا:** علامہ عراقی فرماتے ہیں اس ام سلیم والی حدیث کو صلوٰۃ التسبیح کے باب میں ذکر کرنا محل نظر ہے کیونکہ مشہور تو یہ ہے کہ حدیث ام سلیم میں تسبیحاتِ فاطمی کا بیان ہے کہ یہ تسبیحات نماز کے بعد پڑھی جائینگی نہ کہ نماز کے اندر جیسا کہ بہت سی روایتوں میں اس کی تصریح ہے چنانچہ مسند ابی یعلی اور طبرانی کی کتاب الدعاء میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے ام سلیم! جب تم فرض پڑھ لیا کرو تو سبحان اللہ دس بار کہہ لیا کرو۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل بھی دس دس بار کہہ لیا کرو۔

مصنف کی طرف سے اعتذار: اس کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کو یہ اذکار نماز کے اندر پڑھنے کی تلقین بھی فرمائی تھی اور نماز کے باہر بھی۔ امام ترمذیؒ نے بھی یہی معنی سمجھا ہے۔ اب اس طرح مختلف احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے نیز ہر حدیث کو اس کے ظاہر پر رکھا جائیگا۔ ابو الطیب فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ سکھلایا تھا کہ وہ نماز کے اندر یہ کلمات پڑھیں جیسا کہ "اقولهن فی صلوتی" کے الفاظ اس پر دلالت کرر ہے ہیں۔ علماء میں سے کسی کے نزدیک بھی صلوٰۃ التسبیح کا یہ طریقہ مشروع نہیں اسلئے بظاہر یہاں پر مضاف محذوف ہے یعنی "اقولهن فی دبر صلوتی" مصنف نے تھوڑی سی مناسبت کی وجہ سے اس حدیث کو صلوٰۃ التسبیح کے باب میں ذکر کر دیا۔

صليت على ابراهيم، انك حميد مجيد، وبارك على محمد وعلى آل محمد كما باركت على ابراهيم انك حميد مجيد۔ قال محمود: قال ابو اسامة: وزادني زائدةُ عن الاعمش عن الحَكمِ عن عبد الرحمٰن بن ابي ليلى قال: ونحن نقولُ: وعلينا معهم وفي الباب عن علي وابي حميد وابي مسعود وطلحة وابي سعيدٍ، وَبُرَيْدَةَ، وزيدِ بن خارجةَ، ويقال ابن حارثةَ وابي هريرةَ۔قال ابو عيسى: حديث كعب بن عُجْرَةَ حديث حسن صحيحٌ۔ وعبد الرحمٰن بن ابي ليلَى كنيته ابو عيسى، وابو ليلَى اسمه يَسَارٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نے آپ پر یہ سلام بھیجنے کا طریقہ تو جان لیا۔ آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو "اللهم صل على محمد ......الخ" (اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر رحمت نازل فرائی۔ بیشک تو بزرگ و برتر ہے۔ اے اللہ! تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل پر برکت نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور انکی آل پر برکت نازل فرمائی بے شک تو بزرگی والا اور برتر ہے)۔

محمود نے کہا کہ ابو اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ سے یہ حدیث زیادتی کے ساتھ زائدہ راوی نے اعمش کی سند سے بیان کی انہوں نے حکم سے وہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ کہا عبدالرحمٰن نے کہ ہم درود میں کہتے تھے "وعلينا معهم" یعنی ان کے ساتھ ہم پر بھی رحمت اور برکت نازل فرما۔ اس باب میں حضرت علی، ابوحمید، ابومسعود، طلحہ، ابوسعید، بریدہ، زید بن خارجہ، (انہیں ابن جاریہ بھی کہا جاتا ہے) اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ کنیت ابوعیسیٰ ہے اور ابولیلیٰ کا نام یسار ہے۔

﴿تشریح﴾

صحابہ کرام کے سوال کا منشا: (هذا السلام عليك قد علمنا فكيف الصلوٰة عليك) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اس سوال کا سبب یہ تھا کہ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند مرتبہ اور مقام معلوم تھا لہٰذا وہ یہ سمجھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا وہ طریقہ نہیں ہے جیسا کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو سلام اور دعائیں دیتے ہیں بلکہ اس کا تو کوئی خاص طریقہ ہوگا۔ تو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "التحيات لله والصلوات والطيبات السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته" میں انہیں سلام کا طریقہ سکھلا دیا تو صلوٰۃ کا طریقہ ابھی مشتبہ اور اس کی کیفیت

نامعلوم تھی لہٰذا اصحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صلوٰۃ کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد الخ سے وہ طریقہ سکھلایا۔

لفظِ صلوٰۃ غیر انبیاء کے لئے تبعاً مستعمل ہوسکتا ہے: حدیث باب سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ غیر انبیاء پر لفظِ صلوٰۃ کے ساتھ دعا کی جاسکتی ہے جبکہ تبعاً ہو اسی وجہ سے عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ نے علینا معھم کا لفظ زائد کیا ہے کیونکہ انہوں نے لفظ آل کا ایسا معنی مراد نہیں لیا جو تمام امت کو شامل ہو بلکہ اس سے مراد خاص معنی لیا ہے۔ لہٰذا یہ اشکال نہ ہو کہ عبدالرحمٰن راوی نے اس بدعت کو کیسے ایجاد کیا کیونکہ بدعت تو وہ ہوتی ہے جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو اور یہ فعل بدعت نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل خود حدیث ہے کہ تبعاً غیر انبیاء پر لفظِ صلوٰۃ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

ادعیہ ماثورہ میں زیادتی کرنا: یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ احادیثِ ماثورہ میں جو زیادتی کی جائیگی تو وہ الفاظ ماثورہ کے بعد یا ان سے پہلے کی جائے نہ کہ ان کے درمیان میں اسی لئے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تلبیہ ماثورہ کے الفاظ پڑھنے کے بعد اس تلبیہ میں کچھ اضافہ فرماتے تھے۔

درود شریف کی مقدار کی تحدید وتوقیت: نیز یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس صلوٰۃ کی مقدار کماً وکیفاً اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو معلوم ہے اسلئے کما صلیت علی ابراھیم کہکر ہم نے اللہ پاک کو گویا وکیل بنادیا (کہ جس صفت اور تعداد میں آپ چاہیں اپنے نبی پر درود بھیجیں) بعض لوگوں نے اپنے درود شریف کے اندر اس صلوٰۃ کی ایک مقدار مقرر کی ہے اور اس کا وقت مقرر کیا ہے یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ انعام اور احسان منعم علیہ کے مرتبہ کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً کوئی ایسا شخص جس کی بادشاہ کے دربار میں وجاہت ہو وہ بادشاہ سے درخواست کرے کہ آپ وزیر کو خلعت فاخرہ عطا کریں تو بادشاہ یہ جوڑا وزیر کے درجہ اور مقام کے شایانِ شان ہی دیگا یہاں پر بھی اسی طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اتنی رحمتیں نازل کریں جو آپ کی مشقتوں تکالیف اور علوِ منزلت کے مساوی ہوں لہٰذا بعض اوقات اس درود شریف کی تحدید کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کمی واقع ہوجاتی ہے ہاں جن احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنے لئے ان صیغوں کا انتخاب کیا ہے جن میں تحدید اور توقیت ہے ان کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] ازمترجم: ترمذی کتاب الحج میں تلبیہ ماثورہ کے بعد اضافہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے نہ کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے۔ فلیفتش

کما صلیت علی ابراهیم :حضرت ابراہیمؑ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟: حدیث باب میں چونکہ ابراہیم علیہ السلام کو مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے کسی دوسرے نبی یا رسول کو مشبہ بہ نہیں بنایا گیا اسلئے علماء کا اختلاف ہے کہ موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام میں سے کون سے پیغمبر افضل تھے اور حدیث باب میں ابراہیم علیہ السلام ہی کو مشبہ بہ بنانے میں کیا نکتہ ہے؟۔ اکثر علماء[1] کے نزدیک ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام ان دونوں پیغمبروں سے افضل ہیں کیونکہ ان دونوں پیغمبروں کے فضائل درحقیقت ابراہیم علیہ السلام ہی کے فضائل ہیں اس لئے کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں داخل ہیں بخلاف ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے اس قدر فضائل اور مناقب ہیں جو آپ کے آباء کی طرف منسوب نہیں کیئے جاسکتے کیونکہ یہ فضائل تو اسوقت ازل میں طے ہو چکے تھے جب آپ کسی باپ کے بیٹے نہیں تھے۔ کما صلیت اور کما بارکت میں تشبیہ نفسِ صلوٰۃ[2] کے اعتبار سے ہے۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابراہیم علیہ السلام پر صلوٰۃ زیادہ تھی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کم اب مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ نازل فرمائیے کیونکہ آپ نے اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام پر بھی صلوٰۃ نازل کی ہے اور اے اللہ! آپ اس آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ اعلیٰ اور اولیٰ رحمتیں نازل فرمائیے۔

(قوله انك حميد مجيد) حمید کا مطلب آپ اپنے افعال میں ایسے ہیں کہ آپ کی تعریف کی جاتی ہے لہٰذا اللہ پاک کی طرف سے صلوٰۃ ایسی ہوگی جیسا آپ کے شایانِ شان ہے یہی معنی مجید کے بھی ہیں۔

---

[1] حدیث باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خاص طور سے مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے اسکی بہت سی توجیہات ہیں جنکو میں نے اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فارجع الیہ لو شئت تفصیل ذلک۔

[2] **ایک اشکال کا جواب:** مقصد یہ ہے کہ یہاں سے ایک اشکال کو دور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ تشبیہ کے اندر مشبہ کم درجہ کا ہوتا ہے مشبہ بہ سے جبکہ حدیث باب میں اس کے الٹ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اکیلے ہی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے تمام آل و اولاد سے افضل ہیں اس کے بہت سے جوابات میں نے اوجز میں تفصیل سے ذکر کیئے ہیں۔ایک جواب حضرت گنگوہیؒ نے یہاں پر یہ دیا ہے۔

باب ماجاء فى فضل الصلاة على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم

باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی فضیلت کے بارے میں

☆حدثنا محمد بن بشّارٍ بُندارٌ حَدَّثَنَا محمد بن خالدٍ ابن عثمةَ حدثنى موسى بن يعقوبَ الزَّمْعِيُّ حدثنى عبد اللّٰه بن كَيْسَانَ ان عبد اللّٰه بن شدّاد اخبره عن عبد اللّٰه بن مسعودٍ ان رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: اَوْلَى النَّاسِ بى يومَ القيامةِ اكثرُهم علىَّ صلاةً۔

قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريبٌ۔ ورُوِىَ عن النبىِّ صلى اللّٰه عليه وسلم انه قال: مَن صلَّى علىَّ صلاةً صلَّى اللّٰهُ عليهِ بهَا عَشْراً، وكَتب له بهاَ عَشْرَ حسناتٍ۔

☆حدثنا على بن حجر اخبرنا اسمٰعيل بن جعفر عن العلاء بن عبد الرحمن عن ابيه عن ابى هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: مَن صلَّى علىَّ صلاةً صلَّى اللّٰهُ عليه بها عشراً۔قال: وفى الباب عن عبد الرحمٰن بن عوفٍ، وعامر بن ربيعةَ۔وَعَمَّارٍ، وابى طلحةَ، وانسٍ، وابى بن كعبٍ۔ قال ابو عيسى: حديث ابى هريرة حديث حسن صحيحٌ۔ورُوِىَ عن سفيانَ الثورىِّ وغيرِ واحدٍ من اهل العلم، قالوا: صلاةُ الرَّبِّ الرحمةُ، وصلاةُ الملائكةِ الاستغفارُ۔

☆حدثنا ابو داود سليمانُ بن سَلْمٍ المُصَاحِفِىُّ البَلْخِىُّ اخبرنا النَّضْرُ بن شُمَيْلٍ عن ابى قُرَّةَ الأَسَدِىِّ عن سعيد بن المُسَيَّبِ عن عمرَ بن الخطّابِ قال: اِنَّ الدعاء موقوفٌ بين السماء والارض، لايَصْعَدُ منه شئٌ حتى تصلِّىَ على نبيك صلى اللّٰه عليه وسلم۔

☆ حَدَّثَنَا عباس بن عبدالعظيم العَنْبَرِىُّ حَدَّثَنَا عبد الرحمٰن بن مهدىٍّ عن مالك بن انسٍ عن العلاءِ بن عبد الرحمٰن بن يعقوبَ عن ابيه عن جده قال: قالَ عُمَرُ بنُ الخَطَّابِ لايَبِعْ فى سُوقنا اِلَّا مَن قد تَفَقَّهَ فى الدِّينِ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريبٌ۔ عباسٌ هو ابن عبد العظيم۔قال ابو عيسى: و العلاء بن عبد الرحمٰن هو بن يعقوب وهو مولى الحُرَقَةِ والعلاء هو من التابعين، سمعَ مِن انس بن مالكٍ وغيره۔ وعبد الرحمٰن بن يعقوبَ والد العلاءِ هو ايضاً من التابعينَ، سمعَ مِن ابى هريرةَ وابى سعيدٍ الخدرىِّ وابن عمر۔ ويعقوبُ جدُّ العلاءِ هو من كبار التابعينَ ايضاًقد ادرك عمرَ بن الخطاب ورَوَى عنه۔

﴿ترجمہ﴾

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ان میں سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجنے والا ہوگا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس پر دس مرتبہ درود بھیجتے ہیں اور اس کے بدلے میں دس نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل فرماتا ہے۔

اس باب میں عبدالرحمٰن بن عوف، عامر بن ربیعہ، عمار، ابوطلحہ، انس، ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔ سفیان ثوری اور کئی علماء سے مروی ہے کہ رب کے صلوٰۃ بھیجنے سے مراد رحمت ہے اور فرشتوں کے صلوٰۃ بھیجنے سے مراد استغفار ہے۔

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دعا آسمان اور زمین کے درمیان معلق (لٹکی ہوئی) رہتی ہے اس دعا میں سے کوئی حصہ آسمان پر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علاء بن عبدالرحمٰن یعقوب کے بیٹے اور حرقہ کے مولیٰ ہیں اور علاء تابعین میں سے ہیں انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہ سے احادیث سنی ہیں اور عبدالرحمٰن بن یعقوب یعنی علاء کے والد بھی تابعی ہیں انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں اور یعقوب کبار تابعین میں سے ہیں اور انہوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی ہے اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں۔

☆ ہم سے عباس بن عبدالعظیم عنبری نے نقل کیا انہوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے انہوں نے مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب سے، وہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارے بازار میں کاروبار نہ کرے مگر وہ شخص جو دین میں خوب سمجھ بوجھ حاصل کر لے یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

درود شریف کا پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلقِ محبت کو بڑھانے کا سبب ہے: (قولہ اولی الناس الخ)

کیونکہ جو آدمی جس سے محبت کرتا ہے تو اسے یاد بھی زیادہ کرتا ہے لہٰذا اس شخص کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھنا آپ سے محبت کی علامت ہے اور آخرت میں آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہے اور اگر اس کا یہ فعل صرف ظاہری طور پر ہے حقیقت میں اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے پھر بھی یہ شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقین کے مشابہ ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے " من تشبه بقوم فهو منهم" نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھنے سے اس شخص کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جڑ پکڑ جائے گی نیز جب کوئی شخص اپنی زبان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں مشغول رکھتا ہے تو لامحالہ کم از کم اس کی زبان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک کی معیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک اشکال کا جواب: (قوله من صلى علي صلوٰة صلى الله عليه عشرا) کسی کو یہ وہم[1] نہ ہو کہ درود شریف دیگر نیک اعمال کی طرح ہے جس طرح دوسرے اعمال میں سے ہر عمل پر دس نیکیاں ملتی ہیں اسی طرح درود شریف پڑھنے میں بھی دس نیکیاں ملتی ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی دس بار صلوٰۃ دس نیکیوں سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ نیز بعض روایتوں میں دس نیکیوں سے زیادتی کی تصریح موجود ہے کیونکہ جب صلوٰۃ بھیجنا ایک نیکی ہے تو ایک مرتبہ درود شریف پڑھنے پر دس نیکیاں ملیں گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مزید دس صلوٰتیں ان نیکیوں کے علاوہ ہیں۔

انبیاء علیہم السلام ملائکۃ سے افضل ہیں: (صلوٰة الرب الرحمة و صلوٰة الملائكة الاستغفار) امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ملائکہ کی انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "ان الله و ملائكته يصلون على النبي" ارشاد فرمایا ہے اور صلوٰۃ رحمت کو کہتے ہیں اور رحمت تو کسی ایسی ذات کی طرف سے ہوتی ہے جو افضل و اعلیٰ ہوتی ہے لہٰذا ملائکہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں افضل ہونگے۔

لفظِ صلوٰۃ دو معنی میں مشترک ہے: جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ رحمت اور استغفار دونوں معنی میں مشترک ہے چنانچہ آیت مبارکہ میں دونوں معنی مراد لئے گئے ہیں لیکن یہ معنی شوافع کے مذہب کے مطابق صحیح ہونگے جو مشترک

---

[1] یہاں سے مقصود اشکال کو دور کرنا ہے اشکال یہ ہے کہ جو آدمی بھی کوئی نیک کام کرتا ہے تو اسے دس گنا ثواب ملتا ہے یہ ایک عام قاعدہ ہے لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنا یہ بھی ایک نیکی ہے تو اس طرح درود شریف کی دوسرے افعالِ حسنہ کے مقابلہ میں کوئی فضیلت معلوم نہیں ہوتی؟ جواب بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

لفظ میں عموم کے قائل ہیں حنفیہ کے مذہب میں اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ رحمت کے دو کنارے ہیں :ا۔فعلی (یعنی رحمت بھیجنا)، ۲۔انفعالی (یعنی رحمت کو وصول کرنا) تو جس طرح لفظِ رحمت کا اطلاق پہلے معنی پر حقیقۃً ہوتا ہے اس طرح اسکا اطلاق دوسرے معنی پر بھی حقیقۃً ہے جیسا کہ ہمارے عرف میں ایک آدمی دوسرے کیلئے نرم گوشہ رکھتا ہو اور اس کی بدحالی کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے لیکن اس کی مدد نہیں کرسکتا تو اس کو بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی اس پر رحم کھایا ہے اسی طرح جو شخص رحم تو نہ کھائے لیکن اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرے تو یہ شخص بھی اس پر رحم کرنے والا شمار ہوتا ہے اور لفظ رحم کا اسپر بھی اطلاق ہوتا ہے۔گویا کہ آیتِ مبارکہ میں صلوٰۃ سے مراد توجہ کرنا ہے اور یہ لفظ توجہ ان دونوں صلوٰتوں کو شامل ہے لیکن یہ مقام مقامِ بحث وتفتیش ہے اسے علماء سے معلوم کیا جانا چاہیئے [1]۔

راوی کی ولدیت کی تصحیح:(قوله سليمان بن مسلم) اس وقت کے تمام موجودہ نسخوں میں یہ غلطی ہے صحیح یہ ہے حدثنا ابو دائود سليمان بن سلم البلخي المصاحفي کیونکہ کسی راوی کا نام سليمان بن مسلم البلخي المصاحفي نہیں ہے۔

دعا کے آداب میں درود شریف کا پڑھنا بھی داخل ہے:(لايصعد منه شئي حتى تصل على نبيك صلى الله عليه و سلم) اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دعا میں الگ سے مستقل طور پر درود شریف پڑھا جائے بلکہ نماز کے اندر تشہد میں پڑھا جانے والا درود شریف بھی اس دعا کو اللہ کی بارگاہ میں پہنچا دیگا۔دعا کے آسمان اور زمین کے درمیان بغیر درود شریف ہونے کی وجہ سے موقوف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام اور دعا کے تمام طریقے چونکہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہنچے ہیں لہٰذا دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہنچتی ہے۔

---

[1] صاحب نورالانوار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت کو اس مقصد کیلئے لایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے ملائکہ کی اقتداء کو لازم قرار دیا جائے یعنی اے مومنو! جب اللہ پاک اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں تم پر بھی ان دونوں کی پیروی لازم ہے تم بھی رحمت بھیجو۔ اور یہ معنی تب ہی حاصل ہوگا جبکہ صلوٰۃ کا ایک معنی عام مراد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سب کو شامل ہو تو صلوٰۃ کا معنیٰ عام الاعتناء بشانه ہے۔

[2] سلم بروزن فلس ہے۔قاله المناوی۔خلاصہ میں ہے کہ یہ سلم لام کے سکون کے ساتھ ہے اہل الرجال نے کوئی ایسا راوی ذکر نہیں کیا جسکا نام سلیمان بن مسلم (میم کے ساتھ) البلخی ہو۔

سماع یعقوب عن عمر کا اثبات: (قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ) اس لفظ سے یہ لازم نہیں کہ یعقوب کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لقاء ثابت ہے کیونکہ اس میں صراحۃ تحدیث اور اخبار کے الفاظ نہیں ہیں چونکہ محدثین نے اس روایت کو منقطع نہیں فرمایا بلکہ اس روایت کو مطلقاً قبول فرمالیا لہٰذا اس قال یعقوب قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مطلب یعقوب کا صراحۃ سماع ہی مراد ہے۔ اس اثرِ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو شروع کرے تو اس کو اس کام کے مسائل کا جاننا ضروری ہے مثلاً نکاح کرنے والے شخص کو نکاح کے مسائل کا جاننا ضروری ہے اسی طرح جو روزہ رکھے یا نماز پڑھے یا کوئی بھی معاملہ کرے تو اس شخص کو روزے کے احکام، نماز کے احکام اور اس معاملہ کے احکام و مسائل کو جاننا لازمی اور ضروری ہے۔ (لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرمارہے ہیں کہ ہمارے اس بازار میں خرید وفروخت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ بیع وشراء کے احکام و مسائل سیکھے۔ امترجم)۔

﴿تمت ابواب الوتر﴾

﴿ابواب الجمعة﴾

باب ماجاء فی فضل یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن کی فضیلت

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا المغیرةُ بن عبد الرحمٰن عن ابی الزِّنَادِ عن الاعرجِ عن ابی هریرة ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: خَیْرُ یومٍ طَلَعَتْ فیه الشمسُ یومُ الجمعة، فیه خُلِقَ آدمُ، وفیه اُدْخِلَ الجنة، وفیه اُخْرِجَ مِنها، ولا تقومُ الساعةُ اِلّا فی یوم الجمعةِ۔ قال: وفی الباب عن ابی لُبَابَةَ، وَسَلْمَانَ، وابی ذَرٍّ، وسعد بن عُبَادَةَ، واَوْسِ بن اَوْسٍ۔قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورج طلوع ہونے والے دنوں میں بہترین دن جمعہ کا دن ہے۔اس جمعہ کے دن میں آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اسی دن آپ جنت میں داخل کیئے گئے۔اسی دن آپ جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی۔اس باب میں حضرت ابولبابہ، سلیمان، ابوذر، سعد بن عبادہ اور اوس بن اوس رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

بحثِ اول: (خیر یوم طلعت فیه الشمس یوم الجمعة) یا تو یہ کہا جائے کہ ہفتہ کے سات دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے نہ کہ مطلقاً یا جمعہ کے دن کی کوئی جزئی فضیلت ہے یہ تاویل اس لئے کرنی پڑ رہی ہے کہ بہت سی احادیث میں عرفہ کے دن کی فضیلت[1] مذکور ہے۔

بحثِ ثانی: دوسری بحث یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش تو بالکل بدیہی نعمت ہے اور ان کا جنت میں داخلہ اس سے

---

[1] **افضل الایام کونسا ہے؟:** علماء کا اختلاف ہے کہ جمعہ کا دن افضل ہے یا عرفہ کا دن؟ اس مسئلہ کی میں نے وضاحت کے ساتھ اوجز میں تفصیل کی ہے ثمرہ اختلاف اس شخص کے حق میں ظاہر ہوگا جو یہ نذر مانتا ہے کہ میں افضل الایام کا روزہ رکھوں گا۔

بڑی نعمت ہے اور جنت سے زمین کی طرف اتارا جانا اس سے بھی بڑی نعمت ہے اسی طرح قیامت کا قائم ہونا یعنی نفخہ اولیٰ یہ بھی دخول جنت کا سبب ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش کا نعمت ہونا اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود، عدم کے مقابلہ میں باعث شرف واعزاز ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کرنا اسطور پر نعمت ہے کہ اس میں بیش بہا نعمتیں حشم وخدم نیز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین کی طرف اتارا جانا نعمت اس طرح ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت ساری صفات کا ظہور ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفت رازقیت، تکوین، سمع وبصر ان سب کا ظہور دنیا میں آنے کے بعد ہوتا ہے نیز دنیا میں آنے کے بعد انسان میں اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کی نعمت اور اسلام کی دولت القاء کی جاتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرتا ہے اور منہیات سے بچتا ہے جنت میں یہ چیزیں کہاں ہونگی کیونکہ دنیا میں تو انسان اپنے اچھے انتخاب کے ذریعے بڑی عظیم الشان نعمتیں حاصل کر لیتا ہے۔

جمعہ کی فضیلت اپنی ذاتی ہے دوسری اشیاء پر موقوف نہیں: یہ بات جاننی چاہیئے کہ جمعہ کے دن کی فضیلت ان چار اشیاء پر موقوف نہیں کیونکہ جمعہ کا دن تو ان چار اشیاء سے پہلے ہی فضیلت رکھتا تھا البتہ ان اشیاء کے وجود نے یہ رہنمائی کی کہ جمعہ کے دن کی یہ فضیلت اور شرافت اس کی اصلی شرافت ہے ان امور کے ملانے سے اس کی فضیلت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اور اسے جس طرح پہلے ذاتی فضیلت حاصل تھی اب عرضی فضیلت بھی حاصل ہو گئی تو اس میں دونوں فضیلتیں جمع ہو گئیں۔

باب ماجاء فی الساعة ترجی فی یوم الجمعة

جمعہ کے دن کی وہ گھڑی جس میں قبولیتِ دعا کی امید ہے

☆حدثنا عبد اللّٰه بن الصَّبَّاحِ الهاشميُّ البصريُّ العطَّار حَدَّثَنَا عبيد اللّٰه بن عبد المجيد الحنفي حَدَّثَنَا محمد بن ابی حميد حَدَّثَنَا موسى بن وَرْدَانَ عن انس بن مالك عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم انه قال: التمسُوا الساعة التي تُرْجَى في يومِ الجمعةِ بعد العصرِ اِلى غَيْبُوبَةِ الشمس۔ قال ابو عيسى: هذا حديث غريب من هذا الوجه۔ وقد رُوِيَ هذا الحديث عن انسٍ عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم من غير هذا الوجه۔ ومحمد بن ابی حميد يُضَعَّفُ، ضَعَّفَه بعض اهل العلم مِنْ قِبَلِ حفظِه، ويقال له حَمَّاد بن ابی حميد، ويقال هو ابو ابراهيم الانصاريُّ۔ وهو منكرُ الحديث۔

ورای بعضُ اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وغیرِهم اَنَّ الساعةَ التی تُرْجَی فیهَا بعدَ العصر اِلی ان تغرُبَ الشمس۔ وبه یقولُ احمد، واسحٰق۔و قال احمد: اکثر الاحادیث فی الساعة التی تُرْجَی فیها اِجابةُ الدعوة انها بعد صلاة العصرِ، وتُرْجَی بعدَ زوالِ الشمس۔

☆حدثنا زِیَادُ بن ایوبَ البغدادِیُّ حَدَّثَنَا ابو عامرٍ العَقَدِیُّ حَدَّثَنَا کثیرُ بن عبد اللّٰه بن عَمْرِو بن عوفٍ المزنِیُّ عن ابیهِ عن جدِّه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: اِنَّ فی الجمعةِ ساعةً لایَسْاَلُ اللّٰهَ العبدُ فیها شیئاً اِلَّا آتاهُ اللّٰهُ اِیَّاهُ، قالوا:یارسولَ اللّٰه، اَیَّةُ ساعةٍهی؟قال: حین تقامُ الصلاةُ الی الانصراف منها۔قال: وفی الباب عن ابی موسی، وابی ذَرٍّ، وسلمان ، وعبد اللّٰه بن سلام ، وابی لبابة، سعد بن عبادة، وابی امامة۔قال ابو عیسی: حدیث عمرو بن عوفٍ حدیث حسن غریب۔

☆حدثنا اسحٰق بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مالكُ بن انسٍ عن زید بن عبد الله بن الهادِ عن محمد بن ابراهیم عن ابی سلمة عن ابی هریرة قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: خیرُ یومٍ طلعت فیه الشمس یوم الجمعةِ، فیه خُلِقَ آدمُ ، وفیه اُدْخِلَ الجنةَ، وفیه اُهبِطَ منها، وفیه ساعة لایوافقها عبدٌ مسلمٌ یصلِّی فَیَسْاَلُ اللهَ فیها شیئاًالا اعطاه ایاه قال ابو هریرة: فَلَقِیتُ عبدَ اللّٰه بن سَلَامٍ فذکرتُ له هذا الحدیثَ، فقال: انا اَعْلَمُ بتلك السَّاعَةِ، فقلتُ: اخبرنی بها، ولا تَضْنَنْ بها عَلَیَّ؟ قال: هی بعدَ العصرِ الی ان تغربَ الشمسُ، فقلتُ: کیف تکون بعد العصر وقد قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لایُوَافِقُهَا عبدٌ مسلمٌ وهو یصلِّی، وتلك الساعةُ لَایصلِّی فیها؟ فقال عبد اللّٰه بن سلامٍ: اَلَیْسَ قَدْ قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من جَلَسَ مجلساً ینتظرُ الصلاةَ فهو فی صلاةٍ ؟ قلت: بلی، قال: فهو ذاك۔ قال ابو عیسی: وفی الحدیث قصةٌ طویلةٌ۔ قال ابو عیسی: وهذاحدیث صحیحٌ۔قال: ومعنی قوله اخبرنی بها ولاتَضْنَنْ بها علی یقول : لاتَبْخَلْ بها علی۔ و الضَّنین البَخِیلُ۔و الظَّنِینُ المتَّهَمُ۔

﴿ترجمه﴾

☆حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اس گھڑی کو جس کی جمعہ کے دن امید دلائی گئی ہے عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے تک ڈھونڈو۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث اس سند سے غریب ہے اور یہی حدیث دوسری سند سے بھی حضرت انس رضی

اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ محمد بن ابی حمید ضعیف ہیں انہیں بعض علماء نے حافظہ کی جہت سے ضعیف کہا ہے انہیں حماد بن ابی حمید بھی کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابوابراہیم انصاری یہی ہیں جو منکر الحدیث ہیں بعض صحابہ کرام اور تابعین فرماتے ہیں کہ وہ گھڑی جس میں قبولیتِ دعا کی امید ہے وہ عصر سے غروب آفتاب تک ہے۔ امام احمد، امام اسحٰق کا یہی قول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث جن میں قبولیت دعا کی امید دلائی گئی ہے وہ عصر کے بعد کے وقت کے بارے میں ہیں اور یہ بھی امید ہے کہ وہ (قبولیت دعا کا وقت) زوال آفتاب کے بعد ہو۔

☆ عمرو بن عوف المزنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے کہ بندہ جو بھی چیز اللہ سے اس وقت میں مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز ضرور عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون سی گھڑی ہے۔ فرمایا جب نماز (جمعہ) کھڑی کی جاتی ہے (یعنی امام خطبہ دینے کیلئے منبر پر آتا ہے اس وقت سے لیکر نماز سے) پھرنے تک۔

اس باب میں ابوموسی، ابوذر، سلمان، عبداللہ بن سلام، ابولبابہ اور سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن عوف کی حدیث حسن غریب ہے۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین دن جس میں سورج نکلتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے اس دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیئے گئے اور اسی دن جنت میں داخل کئے گئے اور اسی دن (جنت سے) زمین پر اتارے گئے۔ اس میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اگر اس میں مسلمان بندہ نماز پڑھنے کی حالت میں اس وقت کو پالے پھر اللہ تعالیٰ سے اس گھڑی میں کوئی چیز مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور وہ چیز عطا فرمادیتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میری عبداللہ بن سلام سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے فرمایا میں خوب جانتا ہوں کہ وہ گھڑی کس وقت ہوتی ہے میں نے کہا کہ پھر مجھے بتایئے اور بتانے میں بخل اور کنجوسی سے کام نہ لیجئے انہوں نے کہا کہ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے میں نے کہا کہ وہ گھڑی کیسے ہوسکتی ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں موافق ہوتا کوئی مسلمان اس گھڑی سے مگر اس حال میں کہ نماز پڑھ رہا ہو اور اس وقت (عصر کے بعد) تو کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص کسی جگہ نماز کے انتظار میں بیٹھے تو وہ (حکماً) نماز میں ہے۔ میں نے کہا کہ بے شک یہ بات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کہ بس وہ یہی ہے (یعنی یصلی سے حقیقتاً نماز پڑھنا مراد نہیں بلکہ نماز کا انتظار کرنا مراد ہے اور منتظر صلوٰۃ حکماً نماز میں ہوتا ہے) اور اس حدیث میں طویل قصہ ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے اور "اخبرنی بھا ولا تضنن بھا علی" کا معنی یہ ہے کہ اس کے بتانے میں میرے ساتھ کنجوسی نہ کرو۔ الضنین بخیل کو کہا جاتا ہے اور الظنین متھم کے معنی میں ہے۔

﴿تشریح﴾

قبولیتِ دعا کی گھڑی کی تعیین میں اختلاف: اس گھڑی کی تعیین میں مختلف احادیث مروی ہیں جن علماء کے نزدیک یہ گھڑی جمعہ کے دن مختلف اوقات میں منتقل ہوتی رہتی ہے ایک وقت سے دوسرے وقت کی طرف تو ان کے نزدیک احادیث کے اختلاف کی وجہ ظاہر ہے کہ چونکہ کسی جمعہ میں کسی وقت میں اور دوسرے جمعہ میں دوسرے وقت میں یہ قبولیت کا وقت پایا جاتا ہے اس لئے احادیث میں مختلف اوقات منقول ہیں جن علماء کے نزدیک یہ ایک مقرر اور متعین لمحہ ہے۔

اس گھڑی کے مخفی رکھنے میں مصالح: تو احادیث کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کو مخفی رکھنے میں بہت سی مصالح ہیں مثلاً یہ کہ اگر لوگوں کو یہ وقت معلوم ہو جائے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "بلغوا عنی ولو آیۃ" کی وجہ

---

[1] محدثین کرام میں یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ مبارک گھڑی اب بھی باقی ہے یا ختم ہوگئی ہے دونوں ہی قول ہیں۔ جن علماء کے ہاں یہ گھڑی اب بھی باقی ہے تو ان میں یہ اختلاف ہے کہ یہ جمعہ کے دن میں ایک متعین وقت میں پائی جاتی ہے یا جمعہ کے دن کے غیر متعین وقت میں؟ تو محققین نے اس مسئلہ میں پچاس کے قریب اقوال لکھے ہیں جن کو مطولات میں ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں اور ہمارے شیخ نے بذل میں ذکر کیا ہے ان اقوال میں سے گیارہ قول مشہور ہیں جن کو ابن قیم نے ذکر کیا ہے اور اوجز میں اس کا خلاصہ نقل کیا گیا ہے، بہر حال ان تمام اقوال میں سب سے مشہور قول دو ہیں جنکا بیان آرہا ہے۔

اس میں بیالیس اقوال کی تفصیل: از فتح للحافظ ابن حجر: (از مترجم: علامہ بدرالدین عینیؒ نے اس موقعہ پر چالیس اقوال ذکر کئے ہیں اور ان سے زیادہ وضاحت کے ساتھ حافظ الدنیا نے فتح الباری میں بیالیس اقوال ذکر کئے ہیں جو درج ذیل ہیں: ۱۔ یہ گھڑی اب ختم ہو چکی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس قول کہ یہ گھڑی اب ختم ہو چکی ہے پر رد فرمایا تھا، ۲۔ یہ گھڑی اب بھی موجود ہے لیکن ہر سال صرف ایک جمعہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ کعب احبارؒ نے کہا تھا لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے انپر رد فرمانے کے بعد انہوں نے رجوع کرلیا، ۳۔ جس طرح شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں پوشیدہ ہے اسی طرح یہ گھڑی جمعہ کے پورے دن میں ایک نامعلوم گھڑی ہے، ۴۔ جمعہ والے دن یہ گھڑی ایک وقت سے دوسرے وقت کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے، ۵۔ جب موذن صبح کی اذان دیتا ہے (یا نمازِ جمعہ کی اذان دیتا ہے) اسوقت دعا قبول ہوتی ہے، ۶۔ طلوع فجر سے طلوع شمس تک اس مستجاب الدعوۃ گھڑی کا وقت ہے، ۷۔ جمعہ والے دن نماز عصر کے بعد سے نماز مغرب تک اس گھڑی کا وقت ہے، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے دوسروں کو بتلا دیں گے اور جب دوسرے لوگوں کو یہ وقت معلوم ہو جائیگا یہاں تک کہ گناہ گار اور سرکش لوگوں کو بھی یہ وقت معلوم ہو جائیگا تو وہ ایسی چیزیں مانگیں گے جن کا مانگنا صحیح نہیں اسی طرح اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب لوگوں کو

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۸۔امام جب جمعہ کا خطبہ دیکر منبر سے اترے اس وقت سے لیکر جمعہ کی نماز کی تکبیر کہنے تک دعا کی قبولیت کا وقت ہے، ۹۔طلوع شمس کے بعد کی پہلی گھڑی، ۱۰۔طلوع شمس کے وقت (جب سورج ایک بالشت کے بقدر بلند ہو جائے اس وقت سے لیکر جب تک سورج ایک ذراع کے بقدر بلند ہو جائے، ۱۱۔دن کی تیسری ساعۃ کے آخری لمحات، ۱۲۔زوال کے وقت سے لیکر جبتک سایہ آدھے ذراع تک ہو جائے، ۱۳۔زوال کے وقت سے لیکر جب تک سایہ ایک ذراع تک ہو جائے، ۱۴۔زوال کے بعد جب سورج کا سایہ ایک بالشت ہو جائے اسوقت سے لیکر جب تک سایہ ایک زراع تک ہو جائے، ۱۵۔وقتِ زوال، ۱۶۔جب موذن جمعہ کی نماز کیلئے اذان کہے، ۱۷۔زوال کے بعد سے اسوقت تک کہ جب آدمی نماز شروع کرے، ۱۸۔زوال کے بعد سے اسوقت تک کہ جب امام خطبہ پڑھنے کیلئے نکلے، ۱۹۔زوال سے لیکر غروبِ آفتاب تک، ۲۰۔جب امام خطبہ پڑھنے کیلئے نکلے اسوقت سے لیکر نمازِ جمعہ قائم ہونے تک، ۲۱۔جب امام خطبہ پڑھنے کیلئے نکلے، ۲۲۔جب امام خطبہ پڑھنے کیلئے نکلے اسوقت سے لیکر نماز جمعہ ختم ہونے تک، ۲۳۔جس وقت میں خرید وفروخت حرام ہوا سوقت سے لیکر خرید وفروخت کے حلال ہو جانے کے وقت تک کا درمیانی فاصلہ، ۲۴۔اذانِ جمعہ سے لیکر نماز کے ختم ہونے تک، ۲۵۔جب امام منبر پر بیٹھے اس وقت سے لیکر نماز جمعہ کے ختم ہونے تک، ۲۶۔اذان کے وقت اور جس وقت امام وعظ ونصیحت کر رہا ہو اور اقامت کے وقت، ۲۷۔اذان کے وقت اور امام کے منبر پر چڑھنے کے وقت اور نمازِ جمعہ کھڑے ہوتے وقت، ۲۸۔خطبہ کی ابتداء سے لیکر اختتام خطبہ کے درمیان والا وقت، ۲۹۔جب خطیب منبر پر پہنچ جائے اور خطبہ شروع کردے، ۳۰۔دوخطبوں کے درمیان میں بیٹھتے وقت، ۳۱۔جب امام منبر سے اترے، ۳۲۔جب اقامت شروع ہو جائے یہاں تک کہ امام اپنے مصلے پر پہنچ جائے، ۳۳۔صفوں کے درست کرنے سے لیکر نمازِ جمعہ ختم ہونے تک۔رواہ الترمذی، ۳۴۔یہ وہ گھڑی ہے جس میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ ادا فرماتے تھے، ۳۵۔نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک، ۳۶۔نمازِ عصر کے دوران، ۳۷۔نمازِ عصر کے بعد سے جبتک عصر کا وقت مختار (غیر مکروہ) باقی ہو، ۳۸۔مطلقاً بعد نمازِ عصر، ۳۹۔آدھے دن سے لیکر دن کے اختتام کے قریب تک، ۴۰۔سورج کے زرد ہو جانے سے لیکر غروبِ شمس تک، ۴۱۔عصر کے بعد کے آخری لمحات (اور آخری گھڑی) چنانچہ ایک حدیث میں ہیکہ دن کے بارہ گھنٹے ہوتے ہیں اور یہ دعا کی قبولیت والی گھڑی آخری گھنٹے میں ہوتی ہے، ۴۲۔جب سورج کی آدھی ٹکیہ غروب ہو جائے یا سورج غروب ہونے کیلئے نیچے لٹک جائے۔یہاںتک کہ سورج مکمل غروب ہو جائے۔چنانچہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مشہور واقعہ ہیکہ وہ اپنے غلام کو بھیجتی کہ سورج کو بغور دیکھو، جب سورج غروب ہونے لگتا تو وہ بتلا دیتا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دعا میں مشغول ہو جاتیں۔(فتح الباری ص ۵۳۴: جلد دوم: قدیمی کتب خانہ، کراچی)۔

بعینہ یہ وقت معلوم ہو جائیگا تو وہ اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں دعا اور عبادات میں مشغول ہی نہیں ہونگے ان وجوہات کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایسا جواب ارشاد فرمایا جو ان کے زیادہ مناسب حال تھا چنانچہ مختلف احادیث میں ان واقعات کو ذکر فرمایا جن میں دعا قبول ہوتی ہے۔ اگرچہ متعین طور پر اس خاص گھڑی کا ذکر نہیں فرمایا۔

(وقال احمد اکثر الاحادیث فی الساعات التی ترجی فیھا اجابة الدعوٰی انھا بعد صلوٰة العصر) جیسا کہ گذشتہ حدیث میں ہے اسی طرح اکثر احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گھڑی عصر کی نماز کے بعد ہے۔

(قولہ وترجی[1] بعد الزوال) آنے والی حدیث اور بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھڑی زوال شمس کے بعد ہے

(فقال انا اعلم بتلك الساعة) عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا یہ قول یا تو اسلئے ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ یہ گھڑی نماز عصر کے بعد ہے یا پہلی کتابوں سے انہوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ گھڑی عصر کے بعد ہے اگرچہ کتب سابقہ میں بھی اس کی تصریح موجود نہیں۔

ضرورت کے موقع پر کتمانِ علم صحیح ہے: (قولہ اخبرنی بھا ولا تضنن بھا علی) اس سے معلوم[2] ہوا کہ بعض علوم ایسے ہیں جنکو ایسے لوگوں سے چھپایا جاسکتا ہے جو اس کے اہل نہ ہوں اسی طرح ایک وقت سے دوسرے وقت کی طرف بات کو پھیرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ بھی تو بخل کی ایک قسم ہے کیونکہ اگر کسی علمی مسئلہ میں بخل بالکل ہی ناجائز ہوتا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان سے مسئلہ کو چھپانے کا خوف نہ کرتے اور یہ دونوں ہی صحابی ہیں ان دونوں حضرات سے کسی ناجائز کام صادر ہونے کا گمان نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسرے صحابی کے بارے میں کسی ناجائز فعل کا تصور (مسئلہ کو چھپانا) نہیں کر سکتے۔

---

[1] یہ دونوں قول تمام اقوال میں سب سے زیادہ مشہور ہیں ابن قیم فرماتے ہیں کہ ان اقوال میں سے یہ دونوں قول زیادہ راجح ہے کیونکہ صحیح احادیث میں ان دونوں کا ذکر ہے ان دونوں قولوں میں سے ایک قول دوسرے پر زیادہ راجح ہے پہلا قول تو یہ ہے کہ امام جب خطبہ کیلئے بیٹھے اس وقت سے لیکر جمعہ کی نماز کے ختم ہونے تک یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے اس کی دلیل مسلم میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ گھڑی عصر کے بعد ہے اور یہی آخری قول دونوں قولوں میں راجح ہے۔ عبداللہ بن سلام، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما، امام احمد اور ایک جماعتِ کثیرہ کا یہی مذہب ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی احادیث تمام اقوال میں سب سے زیادہ راجح ہیں انتہی۔ اس کی تفصیل کیلئے اوجز ملاحظہ ہو۔

[2] یہ بات جاننی چاہیئے کہ مصنف نے وفی الحدیث قصة طویلة میں جو اشارہ کیا ہے امام نسائی نے اپنی مجتبیٰ میں اور امام مالک نے اپنی موطا میں اس طویل قصہ کو ذکر کیا ہے۔

(قولہ والضنین البخیل) چنانچہ قرآن شریف میں ضنین کا لفظ موجود ہے اور ایک دوسری قرأت میں یہ لفظ ظاء کے ساتھ ہے مصنف نے ضنین بالضاد اور ظنین بالظاء ان دونوں لفظوں کے معنوں کو بیان کیا ہے کیونکہ دونوں ہی قرآن کی مختلف قرأتیں ہیں۔

باب ماجاء فی الاغتسال یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن غسل کرنے کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن مَنِیع حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینة عن الزُّهْرِیِّ عن سالمٍ عن ابیه انه سمع النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: مَنْ اَتَی الجمعةَ فلیغتسِلْ۔ قال: وفی الباب عن عُمَرَ، وابی سعیدٍ، وجابرٍ، والبَرَاءِ، وعائشةَ، وابی الدَّرْدَاءِ۔قال ابو عیسی: حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیحٌ۔

☆ورُوِیَ عن الزهریِّ عن عبدِ اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عمر عن ابیه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم هذاالحدیث ایضاً حَدَّثَنَا بذلك قتیبة حَدَّثَنَا اللیث بن سعد عن ابن شهاب عن عبد اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عمر عن ابیه: انَّ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: مِثْلَهُ۔ وقال محمد: وحدیث الزهری عن سالمٍ عن ابیه وحدیث عبد اللّٰه بن عبد اللّٰه عن ابیه: کلا الحدیثین صحیح۔وقال بعضُ اصحاب الزهریِّ عن الزهریِّ قال: حدثنی آلُ عبد اللّٰه بن عمرَ عن عبد اللّٰه بن عمرَ۔ قال ابو عیسی: وقد رُوِیَ عن ابن عمرَ عن عمرَ عن النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی الغُسْلِ یومَ الجمعة ایضاً، وهو حدیث صحیحٌ۔

☆ورواه یونسُ ومَعْمَرٌ عن الزهریِّ عن سالمٍ عن ابیه: بینما عمر بن الخطاب یخطبُ یومَ الجمعةِ اِذ دخلَ رجلٌ من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: اَیَّةُ ساعةٍ هذه؟ فقال: ماهُوَ اِلَّا اَنْ سمعت النِّدَاءَ وَمَا زِدْتُ علی اَنْ توضاتُ، قال: والوضوءَ ایضاً وقد علمتَ ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اَمَرَ بالغُسْلِ؟ حَدَّثَنَا بذلك ابو بکر محمد بن ابانَ حَدَّثَنَا عبد الرزّاقِ عن مَعْمرٍ عنِ الزهریِّ۔

☆قال :وحدثنا عبد اللّٰه بن عبد الرحمٰن اخبرنا ابوصالحٍ عبد اللّٰه بن صالحٍ حَدَّثَنَا اللَّیْث عن یونسَ عن الزهریِّ بهذا الحدیثِ۔ورَوَی مالكٌ هذاالحدیثَ عن الزهریِّ عن سالمٍ قال: بَیْنَما عمر بن الخطاب یخطبُ یومَ الجمعةِ۔ فذَکَرَ هذا الحدیث۔

قال ابو عیسی: و سالتُ محمداً عن هذا؟ فقال: الصحیحُ حدیث الزهریِّ عن سالم عن ابیه۔ قال محمد :وقد رُوِیَ عن مالكٍ ایضاً عن الزُّهْرِیِّ عن سالمٍ عن ابیه نَحْوُ هذا الحدیثِ۔

﴿ترجمہ﴾

☆ سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ پڑھنے آئے اسے چاہیئے کہ غسل کرلے۔ اس باب میں ابوسعید، عمر، جابر، براء، عائشہ اور ابودرداء رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے یہ حدیث زہری سے بھی مروی ہے وہ عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اپنے والد سے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی حدیث روایت کرتے ہیں۔

☆ ہم سے روایت کی حدیث قتیبہ نے انہوں نے لیث بن سعد سے انہوں نے ابن شہاب انہوں نے عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں زہری کی سالم سے مروی حدیث جس میں وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمر کی ان کے والد سے روایت دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ زہری کے بعض شاگرد زہری سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن عمر کے خاندان سے کسی نے (وہ سالم ہیں یا عبداللہ اس کی تعیین نہیں) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ اسی اثناء میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک صحابی رسول (حضرت عثمان غنیؓ) داخل ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ کون سا وقت ہے (آنے کا) انہوں نے عرض کیا نہیں ہے یہ (دیر کرنا) مگر میں نے اذان سنی اور صرف وضو کیا۔ (اس سے زیادہ دیر تو نہیں لگائی) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اچھا صرف وضو کیا حالانکہ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا حکم دیا ہے۔

☆ ہم سے بیان کی یہ حدیث محمد بن ابان نے عبدالرزاق کے حوالے سے انہوں نے معمر سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں

☆ عبداللہ بن عبدالرحمٰن نے بھی عبداللہ بن صالح سے انہوں نے لیث سے انہوں نے یونس سے اور انہوں نے زہری سے یہ حدیث روایت کی ہے اور مالک اس حدیث کو زہری سے سالم کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے پس حدیث ذکر فرمائی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا زہری کی حدیث جو انہوں نے بواسطہ سالم ان کے والد سے نقل کی ہے، صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل حدیث نقل کی گئی ہے وہ زہری سے وہ سالم سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

غسلِ جمعہ کا حکم: (من اتی الجمعة فلیغتسل) یہ حکم ابھی بھی اسی طرح باقی ہے جیسا کہ پہلے تھا شروع زمانے میں بھی

یہ حکم وجوبی نہیں تھا لہٰذا اسے منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ جن لوگوں کی وجہ سے مسجد والوں کو تکلیف پہنچتی تھی انہیں غسل کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور آج بھی ایسے میلے کچیلے لوگوں کو لازماً غسل کا کہا جائیگا ان کے علاوہ لوگوں کو یہ حکم استحبابی ہوگا۔

مصنفؒ نے احادیث میں اضطراب کی نفی کی ہے: (کلا الحدیثین صحیح) یعنی یہاں پر کوئی اضطراب نہیں ہے بلکہ زہری نے سالم اور عبداللہ دونوں سے اس روایت[1] کو نقل کیا ہے۔ اور پہلی روایت یہی سالم اور دوسری روایت میں عبداللہ بن عبداللہ دونوں ہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کر رہے ہیں

غسّل کے دو معنی: (من اغتسل وغسل) غسّل کا مطلب اپنے بدن کو میل کچیل سے صاف کرے یا مطلب یہ ہے کہ اپنے سر کو کسی صاف کرنے والی شیئے سے دھوئے یا مطلب غسّل امراتہ ہے کہ اس سے جماع کرے تا کہ اس کا دل جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے جاتے ہوئے مشوش نہ ہو جب راستے میں عورتوں پر نگاہ پڑے۔

(غفر له مابینه ، وبین الجمعة[2] وزیادة ثلثة ایام) کیونکہ نیکی کا ثواب دس گنا ملا کرتا ہے[3]۔

---

[1] ان دونوں سندوں میں سے کونسی سند راجح ہے اس کے متعلق محدثین کا اختلاف ہے مصنف کا میلان اس طرف ہے کہ دونوں میں حدیثیں صحیح ہیں مصنف نے اس کی تصریح کی ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس سند میں لیث کا ابن جریج کے علاوہ کوئی متابع نہیں ہے اور زہری کی شاگرد اس روایت کو عن سالم عن ابیہ ذکر کرتے ہیں نہ کہ عن عبداللہ۔

[2] ابوالطیب کی شرح میں ہے کہ جمعہ سے مراد گذشتہ جمعہ بھی ہوسکتا ہے (گذشتہ جمعہ سے اس موجودہ جمعہ تک کے گناہ معاف ہوں) اور آنے والے جمعہ بھی ہوسکتا ہے (کہ اس جمعہ سے آئندہ جمعہ تک کے گناہ معاف ہوں)۔ کرمانی فرماتے ہیں کہ دونوں ہی احتمال ہیں حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گذشتہ جمعہ سے اس جمعہ تک کے گناہوں کی معافی ہے۔ کیونکہ صحیح ابن خزیمہ میں ما بینه وبین الجمعة التی قبلها کے الفاظ ہیں، میرک فرماتے ہیں کہ ابوداوٗد میں ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے کفارة لما بینها وبین الجمعة التی قبلها کے الفاظ ہیں یہ دلالت کرر ہے ہیں کہ اس سے مراد گذشتہ جمعہ کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں لیکن ابوداوٗد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کفارة الی الجمعة التی تلیها کے الفاظ دلالت کرر ہے ہیں کہ اس سے مراد آئندہ جمعہ تک کے گناہ ہوتے ہیں تو اس سے کرمانی کے قول کی تائید ہوتی ہے بہرحال دونوں صورتوں میں معافی سے مراد صغیرہ گناہوں کا معاف ہونا ہے۔

[3] تو اس قول کے مطابق دو جمعوں میں سے ایک جمعہ شمار کیا جائیگا موجودہ جمعہ والے کے گناہ معاف نہیں ہونگے سب سے بہتر توجیہ میرے والد مرحوم نے سبق پڑھاتے ہوئے یہ فرمائی تھی کہ اس سے مراد گذشتہ جمعہ کی نماز سے اس جمعہ کی نماز تک کے سارے گناہ معاف ہوجائینگے تو یہ سات دن ہیں مزید تین دنوں کے گناہ اور معاف ہونگے اسطرح دس دن ہوجائینگے۔

باب ماجاء فی فضل الغسل یوم الجمعة

غسل جمعہ کرنے کی فضیلت کے بیان میں

☆حد ثنا محمو د بن غیلا ن حد ثنا و کیعٌ حد ثنا سفیا ن وابو جَنَابٍ یحیی بن ابی حَیَّةَ عن عبد الله بن عیسی عن یحیی بن الحا رِثِ عن ابی الا شعثِ الصّنعا نیِّ عن اوس بن اوسٍ قا ل قال رسول الله ﷺ مَنِ اغتسلَ یومَ الجمعةِوغَسَّلَ و بَكَّرَ وابتكَرَ ودَنَا وَا سْتَمَعَ وَاَنْصَتَ کان له بكُلِّ خَطْوةٍیخطوهااجرُ سَنَةٍ صیامِهَاوقیامها قال محمودفی هٰذا الحدیث قال و کیعٌ اغتسل هو وغَسَّل امرأته۔قال ویُروَی عن عبدالله بن المبارك انه قال فی هٰذاالحدیث مَنْ غَسَّلَ واغتسل یعنی غَسَلَ رأسهُ واغتسل ۔قال وفی الباب عن أبی بکروعمران بن حصین وسلمان وأبی ذر وأبی سعید وابن عمر وأبی ایوب قال ابو عیسی حدیث اوس بن اوس حدیث حسن وابو الاشعث الصنعا نی اسمه شرحبیل بن آدةوابو جناب یحیی بن حبیب القصاب الکوفی۔

﴿ترجمه﴾

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جوشخص جمعہ کے دن نہایا اور دھویا اور سویرے مسجد گیا اور خوب سویرے گیا اور امام سے قریب ہوا اور توجہ سے خطبے کو سنا اور خاموش رہا تو اس کو ہر قدم کے بدلے جو وہ اٹھاتا ہے ایک سال کے روزے کا اور ایک سال کی رات کی نفلوں کا ثواب ہے۔محمود نے اس حدیث میں کہا کہ وکیع نے کہا کہ اس نے خود بھی غسل کیا اور اپنی بیوی کو بھی غسل کروایا۔ابن مبارک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس حدیث میں غسل اور اغتسل کے معنی یہ بتائے ہیں کہ جس نے اپنے سر کو دھویا اور غسل کیا۔

اس باب میں ابوبکر،عمران بن حصین،سلمان،ابوذر،ابوسعید،ابن عمر اور ابوایوب (انصاری) رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور ابوالاشعث کا نام شرحبیل بن آدہ ہے۔

باب ماجاء فی الوضوء یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن (غسل کے بجائے صرف) وضو کرنا

☆حدثنا ابو موسی محمدبن المثنی حَدَّثَنَا سعیدبن سفیان الجحدری حَدَّثَنَا شعبة عن قتادة

عن الحسن عن سمرة بن جندب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من توضأ يومَ الجمعة فَبِهَا ونِعْمَتْ ، ومَنِ اغتسلَ فالغسلُ افضلُ۔قال: وفی الباب عن ابی هريرة، وعائشة، وانس۔ قال ابو عيسى: حديث سمرة حديث حسن۔وقدرواه بعض اصحاب قتادةَ عن قتادةَ عن الحسنِ عن سمرةَ بن جُنْدُب۔ورواهُ بعضُهم عن قتادة عن الحسن عن النبیّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلٌ۔والعملُ على هذا عند اهل العلم من اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم ومَن بعدهم، اختَارُوا الغسلَ يوم الجمعة، ورَأَوْا انْ يُجزِئَ الوضوءُ من الغسل يوم الجمعةَ۔ قال الشافعیُّ : وممّا يدلُّ على ان امْرَ النبیِّ صلى الله عليه وسلم بالغسل يوم الجمعة انه على الاختيارِ لاعلى الوجوبِ: حديثُ عمرَ، حيث قال لعثمانَ وَالوضوءُ ايضاً وقد علمتَ ان رسول الله ﷺ اَمَرَ بِالْغُسْلِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلَوْ عَلِمَا اَنَّ اَمْرَهُ عَلَى الْوُجُوبِ لَا عَلَى الْاِخْتِيَارِ لَمْ يَتْرُكْ عُمَرُ عثمانَ حتى يَرُدَّهُ ويقول له : ارْجِعْ فَاغْتَسِلْ ولما خفی على عثمان ذلك مع علمه ولكن دل فی هذا الحديث ان الغسل يوم الجمعة فيه فضل من غير وجوبٍ يَجِبُ على المرءِ كذلك۔

☆ حدَّثنَا هناد قال حَدَّثنَا ابو معاوية عن الاعمش عن ابی صالحٍ عن ابی هريرةَ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَن توضأ فَاَحْسَنَ الوضوءَ، ثُمَّ اتی الجمعةَ فَدَنَا واستمعَ وأَنْصتَ غُفِرَله مابَيْنَهُ وبَيْنَ الجمعةِ وزيادةُ ثلاثةِ ايامٍ، ومَنْ مَسَّ الحصَى فقد لَغَا۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کے دن وضو کیا اس نے اچھا کیا اور جس نے غسل کیا (پھر جمعہ پڑھا) تو غسل کرنا زیادہ افضل ہے۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ، انس، اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔ حضرت قتادہ کے بعض ساتھی اسے قتادہ سے وہ حسن کے واسطے سے سمرہ سے نقل کرتے ہیں بعض حضرات نے اسے قتادہ سے انہوں نے حسن سے (بغیر سمرہ کے واسطے کے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ صحابہ کرام اور بعد کے علماء کا اسی پر عمل ہے کہ انہوں نے پسند کیا جمعہ کے دن غسل کرنے کو اور وہ جمعہ کے دن غسل کے بجائے صرف وضو کو بھی کافی سمجھتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی دلیل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمعہ کے دن غسل کا حکم افضلیت پر محمول ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اچھا صرف وضو کر کے آئے

ہو حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن غسل کا حکم دیا تھا اگر یہ دونوں حضرات جانتے ہوتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا حکم وجوب کیلئے ہے اختیاری نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ چھوڑتے یہاں تک کہ ان سے کہتے کہ جاؤ اور غسل کرو پھر یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کے رتبہ علم کے باوجود پوشیدہ نہ ہوتی (کہ غسل کا حکم وجوبی ہے کیونکہ وہ ہر حکم جانتے تھے) لیکن یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ جمعہ کے دن غسل کرنا افضل ہے واجب نہیں ہے (کہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو)۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا اور پھر جمعہ کیلئے آیا اور امام کے قریب بیٹھا پھر توجہ سے خطبہ سنا اور خاموش رہا تو اس جمعہ اور دوسرے جمعہ کے درمیان جو گناہ اس سے ہوئے بخش دیئے جائیں گے اور مزید تین دن کے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے (یعنی کل دس دن کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے) اور جو کنکریوں کو چھوئے اس نے لغو کام کیا (اس کیلئے جمعہ پڑھنے کا اجر نہیں ہے)۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

باب ماجاء فی التَّبْکیر الی الجمعة

باب جمعہ کی نماز کے لئے سویرے (مسجد) جانا

☆حدثنا اِسحٰق بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا معْنٌ حَدَّثَنَا مالكٌ عن سُمَیٍّ عن ابی صالحٍ عن ابی هریرةَ اَنَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال:مَنِ اغتسلَ یوم الجمعة غُسْلَ الجنابة ثُمَّ راحَ فکاَنَّما قَرَّبَ بَدَنَةً، ومن راح فی الساعة الثانیة فکانَّما قَرَّبَ بقرةً، ومن راح فی الساعة الثالثة فکاَنَّما قَرَّبَ کَبْشاً اَقْرَنَ ، ومن راح فی الساعة الخامسة فکا نما قرّب بَیْضَةً، فاِذاخرجَ الاِمامُ حَضَرَتِ الملائکةُ یستمعونَ الذِّکرَ۔ قال : وفی الباب عن عبد اللّٰه بن عَمْرٍو، وسَمُرَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی هریرةَ حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے جمعہ کے دن غسل کیا جس طرح جنابت سے (اچھی طرح) غسل کیا جاتا ہے پھر اول وقت مسجد گیا گویا اس نے (راہِ خدا میں) ایک اونٹ کی

قربانی کی پھر جو شخص دوسری گھڑی میں گیا گویا اس نے گائے کی قربانی کی اور جو تیسری گھڑی میں گیا گویا اس نے سینگ دار مینڈھے کی قربانی کی پھر جو چوتھی گھڑی میں گیا گویا اس نے اللہ کی راہ میں مرغی قربان کی اور جو پانچویں گھڑی میں گیا گویا اس نے اللہ کی راہ میں ایک انڈا دیکر ثواب حاصل کیا پھر جب امام خطبہ کیلئے منبر پر آجاتا ہے تو فرشتے (خطبہ سننے) مسجد میں چلے آتے ہیں۔اس باب میں عبداللہ بن عمرو اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(من اغتسل یوم الجمعة غسل الجنابة) یعنی اس طرح مبالغہ کے ساتھ غسل کرے جس طرح جنابت کا غسل ہوتا ہے یا اس سے حقیقی معنی بھی مراد[1] ہو سکتا ہے۔

رواح اور ساعۃ کے معنی کی تعیین میں علماء کے دو مذہب ہیں: (۱) (ثم راح) بعض علماء نے رواح سے اس کے حقیقی معنی مراد لیئے ہیں یعنی زوال کے بعد جانا تو ان کے نزدیک حدیث میں مذکورہ ساعات کی ابتداء زوال کے بعد سے ہوتی ہے یہاں پر ساعۃ سے مراد مطلقاً تھوڑا سا وقت ہے اصطلاحی ساعۃ یعنی ایک گھنٹہ مراد نہیں لیکن یہ مذہب ضعیف ہے کیونکہ اس صورت میں جمعہ کی نماز میں جلدی جانے کی طرف ترغیب نہیں ہوتی جو کہ حدیث کو مقصود ہے۔(۲) دوسرے ائمہ[2] کے نزدیک رواح سے مراد مطلقاً جانا ہے اور حدیث میں ساعۃ سے مراد عرفی ساعت یعنی ایک گھنٹہ ہے تو فجر کے بعد سے جمعہ تک پانچ چھ گھنٹے ہو ہی جاتے ہیں۔

امام شافعیؒ بدنۃ کو اونٹ کے ساتھ خاص کرتے ہیں: (قوله قرب بدنة) لفظ بدنہ باء اور دال کے فتحون کے ساتھ ہے اسکی جمع بدن آتی ہے باء کے پیش اور دال کے سکون کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ

---

[1] کیا غسل جنابت کرنے سے جمعہ کا غسل ادا ہو جائیگا؟ جمہور کے نزدیک غسلِ جنابت کے اندر جمعہ کا سنت غسل ادا ہو جائیگا، بعض علماء کا اختلاف ہے کما فی الاوجز

[2] پہلے قول کی طرف میرے والد مرحوم کا اپنے سبق میں میلان تھا جو کہ امام مالک وغیرہ کا قول ہے جمہور نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے

ساعات خمسہ کی ابتداء میں راجح قول: میرے نزدیک سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حدیث میں مذکور ساعات خمسہ کی ابتداء چوتھائی دن سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ میں نے اس مسئلہ میں اوجز میں تفصیل سے اقوال نقل کئے ہیں۔

بدنۃ صرف اونٹ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ حدیث میں اس سے مراد اونٹ ہے تو یہ لفظ گائے[1] کو شامل نہیں؟

اس کا جواب: حدیث باب میں بدنۃ کا گائے کو شامل نہ ہونا ایک قرینہ کی وجہ سے ہے کیونکہ اس کے مقابلہ میں بقرۃ کا ذکر آرہا ہے۔

(اقرن) یعنی سینگوں والا مینڈھا کیونکہ سینگوں والا جانور زیادہ عمدہ اور فربہ ہوتا ہے "فکانما قرب بیضة" اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ انڈا پاک اور حلال ہے۔

خطبہ جمعہ کی فضیلت: "حضرت الملائکة یستمعون الذکر" اس جملہ سے تنبیہ ہے کہ ملائکہ باوجود اس کے کہ وہ گناہوں سے اور عیوب سے پاک ہیں نیز انہیں جمعہ کے خطبہ کے سننے کی ضرورت بھی نہیں پھر بھی خطبہ غور سے سنتے ہیں تو انسانوں کو بطریق اولی خطبہ غور سے سننا چاہیئے اور اس سے یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو شخص امام کا خطبہ شروع ہونے کے بعد جمعہ کی نماز کیلئے آیا تو ملائکہ کے صحیفہ میں اس کا نام موجود نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی کوئی فضیلت ہے سوائے اس کے کہ اس نے اللہ کے حکم کو پورا کر کے اپنی ذمہ داری کو پورا کر لیا لہٰذا مسلمان کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ ان فضائل کو چھوڑ کر فضولیات اور لایعنی امور میں مشغول رہے۔

باب ماجاء ان الدعاء لا یرد: شرح میں اس باب کے غیر محل آنے کی خاص وجہ ہے: (باب ما جاء ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامة) یہ باب اس مقام "ابواب الجمعۃ" میں سے نہیں لیکن جس وقت استاذ محترم نے یہ مقام پڑھایا اس وقت میں نے اس کا سماع نہیں کیا تھا تو اس مقام کو میں نے دوبارہ پڑھا[2]۔

---

[1] **للہ علی بدنۃ کہنے کی صورت میں حنفیہ اور شافعیہ میں اختلاف:** یہ مسئلہ مشہور اختلافی ہے ثمرہ اختلاف اس صورت میں ظاہر ہوگا جب کوئی شخص یہ کہے للہ علی بدنة تو حنفیہ کے نزدیک چاہے وہ اونٹ کی قربانی کرے یا گائے کی ہر صورت میں اس کی نذر ادا ہو جائیگی اور شافعیہ کے نزدیک اس کی نذر اونٹ کی قربانی میں ادا ہوگی اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیث باب میں بدنۃ سے مراد اونٹ ہے۔ تو شوافع نے اس کا حقیقی معنی مراد لیا ہے اور ہم نے مجازی معنی کیونکہ ایسا قرینہ موجود ہے جو کہ بدنۃ کو اس کے عمومی معنی سے پھیرنے والا ہے تو یہاں پر عام کو اسکے بعض افراد میں قرینہ کی وجہ سے بند کیا گیا ہے اس کی پوری تفصیل اوجز المسالک میں ہے۔

[2] قلت: چونکہ اس باب کے موخر کرنے میں بھی ایک بڑا اہم قصہ کارفرما ہے تو ہمارے خیال میں اس باب کو ابواب الجمعہ میں ذکر کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ (از مترجم: حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ آپ بیتی نمبر ۴: ص ۱۲۶ پر میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب نور اللہ مرقدہ کے عنوان کے تحت اس باب کے موخر ہونے کا واقعہ اس طرح رقمطراز ہیں؛ چونکہ میرے والد صاحب کا یہ اہتمام تھا کہ کوئی حدیث استاذ کے سامنے پڑھنے سے نہ چھوٹے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

احادیث میں اذان کے بعد اور دورانِ اذان قبولیت دعا کے دو الگ الگ وعدے ہیں: حدیث باب میں یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں ہوتی جبکہ دوسری حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اذان کے بعد دعا قبول ہوتی ہے یہ دو الگ الگ وعدے ہیں کیونکہ پہلا وعدہ تو اس شخص سے کیا جا رہا ہے جو شخص اذان سننے کے بعد نماز کیلئے مسجد میں حاضر ہو چکا ہے ورنہ اگر وہ نماز کیلئے نہیں آیا تو اسے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ وقت اذان اور اقامت کے درمیان کا ہے۔ بخلاف وہ دوسرا وعدہ کہ اذان کے بعد دعا قبول ہوتی ہے تو یہ تو ہر اس شخص کیلئے ہے جو اذان سنے چاہے وہ اس مسجد کے اہل محلّہ میں سے ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو اس وعدے کی وجہ سے لوگوں کو ابتدائی وقت میں جماعت کیلئے مسجد پہنچنے کی ترغیب ہو جاتی ہے کیونکہ نمازی آدمی جب اذان سن کر فوراً ہی مسجد جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہے پس وہ اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد کی طرف چلتا ہے تو اس کے نشاناتِ قدم لکھے جاتے ہیں پھر وہ مسجد میں داخل ہونے کی دعائیں پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے اور دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتا ہے پھر نماز کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے تو یہ شخص نماز ہی کے حکم میں ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "لایزال احدکم فی صلوۃ مادام ینتظر" تو کیا کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں کی جائیگی۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک موقع پر اعلیٰ حضرت کے اصرار پر والد صاحب کاندھلہ تشریف لے گئے اور اعلیٰ حضرت نے انکی غیبت میں سبق نہ پڑھانے کا وعدہ فرمالیا تھا جب واپس تشریف لائے تو قاری ولایتی تھے انہوں نے ایک باب چھوڑ کر اگلے باب سے شروع کیا میرے والد صاحب اور دوسرے شرکاء نے ٹوکا کہ ایک باب اس سے پہلے باقی ہے مگر چونکہ وہ ولایتی تھے زور میں نہ مانے چند ماہ بعد میری دادی صاحبہ کے اصرار پر حضرت قدس سرہ نے میرے والد صاحب کو پھر کاندھلہ جانے کو ارشاد فرمایا۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ مجھے پہلی ہی روانگی کا قلق ہے کہ میرا ایک باب چھوٹ گیا۔ حضرت نے فرمایا کل کو وہی ہوگا اور سبق میں بیٹھتے ہی اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا کہ مولوی یحییٰ تمہارا کونسا بابا چھوٹ گیا؟ اور حضرت نے سب سے پہلے وہی باب پڑھایا۔ اتفاق سے قاری اس دن بھی وہی ولایتی تھے۔ اس باب کے ختم پر انکے منہ سے نکل گیا کہ کوئی اور باب چھوٹ گیا ہو تو وہ بھی پڑھوالو۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہ کو غصہ آ گیا اور غصہ میں فرمایا چلو تو تو باولا ہے۔ چند ہی روز کے بعد یہ طالب علم باولا ہو گیا۔ اس زمانہ میں کوے کا مسئلہ زوروں پر تھا یہ طالب علم ایک بانس کے اوپر کوے کو باندھ کر سارے دن گنگوہ کی گلیوں میں یہ اعلان کرتا پھرتا کہ یہ کوا حلال ہے...... میں نے بھی کوکب الدری میں اسی باب کو اسی جگہ پر رہنے دیا جس جگہ پر حضرت گنگوہیؒ نے پڑھایا تھا اپنی جگہ پر منتقل نہیں کیا۔ اسکے حاشیہ میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ ص ۴/۱۲۷: آپ بیتی۔ (از مترجم: معلوم ہوا کہ حضرت مولانا یحییٰ صاحب شروع میں اپنے گھر جب تشریف لے گئے تھے جب مواقیت الصلوٰۃ کے باب ماجاء ما یقول الرجل اذا اذن المؤذن من الدعاء کے بعد باب منہ آخر پڑھ چکے تھے۔ اسکے چند ماہ بعد جب ابواب الجمعۃ میں سبق باب ما جاء فی التبکیر الی الجمعۃ ہو چکا تو مذکورہ بالا واقعہ پیش آیا جس کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے متروکہ باب باب ماجاء لا یرد الدعاء بین الاذان والاقامۃ پڑھایا)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظرِ صلوٰۃ کی فضیلت بیان کرنے سے مقصود مسجد میں جلد پہنچنے کی ترغیب ہے: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا سبب یہ ہے کہ صحابہ کرام نماز کی اس طرح خوب تیاری کرتے تھے لیکن مسجد پہنچنے میں تاخیر کرتے تھے کہ جب اقامت کا وقت قریب ہوتا تو مسجد پہنچتے لہٰذا انہیں تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کا موقع نہیں ملتا تھا تو نماز کے انتظار کا موقع کیسے ملتا کہ وہ اس وقت میں بیٹھ کر دعائیں مانگیں اور ان کی دعائیں قبول ہوں بہرحال اس طرح اگر کسی شخص کو اقامت کا وقت معلوم ہو لیکن وہ جماعت میں حاضر نہیں ہوتا یا تاخیر سے پہنچتا ہے یعنی اقامت سے چند لمحے پہلے تو یہ شخص اگر اذان کے بعد اقامت سے پہلے گھر ہی میں دعائیں مانگتا ہے تو حدیث باب کے مقصد کو دیکھتے ہوئے اس شخص کیلئے یہ وعدہ نہیں ہونا چاہیئے اگرچہ ظاہر حدیث کا تقاضہ یہ ہے کہ اس شخص کی دعائیں بھی قبول ہونگی۔ واللہ اعلم بالصواب

باب ماجاء فی ترکِ الجمعة من غیر عُذْرٍ

باب بغیر عذر شرعی جمعہ ترک کرنے پر وعید

☆حدثنا علی بن خَشْرَمٍ اخبرنا عیسی بن یونسَ عن محمد بن عَمْرٍو عن عَبِیدَةَ بن سفیانَ عن ابی الجَعْدِ یعنی الضَمْرِیَّ، و کانت له صحبةٌ فیما زعم محمد بن عَمْرٍو، قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: مَنْ ترك الجمعةَ ثلاث مراتٍ تهاوناً بها طَبَعَ اللّٰهُ علی قلبه۔قال: وفی الباب عن ابن عَمَر، وابن عباسٍ، وسَمُرَةَ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی الجعد حدیث حسنٌ۔قال:وسالتُ محمداً عن اسمِ ابی الجعدِ الضَّمرِیِّ؟ فلم یَعْرِفِ اسمَه۔ وقال: لااعرفُ له عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم الا هذا الحدیث۔ قال ابو عیسی: ولانعرفُ هذا الحدیثَ اِلّا من حدیث محمد بن عمرٍو۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبیدہ بن سفیان روایت کرتے ہیں ابوالجعد سے (یعنی الضمری سے جو محمد بن عمرو کے قول کے مطابق صحابی ہیں) ابوالجعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے تین جمعہ چھوڑ دیئے جمعہ کے حق کو ہلکا سمجھنے کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ اس باب میں ابن عمر، ابن عباس، اور سمرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوجعد کی حدیث حسن ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری سے ابو جعد ضمری کے نام کے متعلق پوچھا تو انہیں ان کا نام معلوم نہیں تھا انہوں نے کہا میں ان کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف یہی روایت جانتا ہوں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو محمد بن عمرو کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔

﴿تشریح﴾

جمعہ کا چھوڑنا اور اہتمام نہ کرنا خسارہ کا باعث ہے: (من ترك الجمعة ثلث مرات تهاونا بها طبع الله على قلبه) جاننا چاہیئے کہ جمعہ کی نماز کو چھوڑنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ یہ شخص اسے معمولی سمجھتا ہے اور لاپرواہی کی وجہ سے وہ اہتمام نہیں کرتا تو اس صورت میں مہر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نفاق کی مہر اس پر لگادیتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہ[1]۔ اور اگر اس کا جمعہ کو چھوڑنا لاپرواہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے اوپر جو جمعہ کی ادائیگی فرض ہے تو یہ شخص اس جمعہ کو چھوڑ کر ایک طرح سے اس کی توہین کر رہے ہیں تو اس صورت میں مہر سے مراد یہ ہے کہ دل زنگ آلود ہو جاتا ہے حدیث شریف دونوں معنوں کو شامل ہے۔

مصنف کو ابوالجعد الضمری کے صحابی ہونے میں تردد ہے: (قوله يعني الضمري[2]) اس سے مصنف نے یعنی الضمری کا اشارہ کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ابوالجعد نامی راوی بہت سارے[3] ہیں میری مراد ابوالجعد الضمری ہے۔ (قوله و كانت له صحبة) یعنی ان کا صحابی ہونا مجھے تسلیم نہیں لیکن میرے استاذ الاستاذ[4] محمد بن عمرو کے خیال میں یہ صحابی ہیں۔

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام کاموں سے پناہ میں رکھے جو ابھی مذکور ہوئے کہ جمعہ کی نماز چھوڑنے سے اور دل پر مہر لگنے سے اور نماز جمعہ میں سستی کرنا اور نفاق وغیرہ دیگر امور سے۔

[2] ابوالطیب فرماتے ہیں الضمری یہ لفظ ضاد کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ ضمرۃ بن بکر بن عبد مناف کی طرف منسوب ہے جیسا کہ جامع الاصول اور مغنی میں ہے۔

[3] **تہذیب میں ابوالجعد نامی راوی دو ذکر کیے گئے ہیں:** حافظ نے تہذیب میں ابوالجعد نامی دو شخص ذکر کئے ہیں اور تیسرا ابو الجعد نامی شخص کو تعجیل میں ذکر کیا ہے ان ضمری راوی کے نام کے متعلق مختلف اقوال ہیں یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جنگ جمل میں تھے اور اسی واقعہ میں شہید ہوئے (از مترجم: حافظ نے تہذیب میں الکنی کے تحت لکھا ہے کہ ابوالجعد نامی دو راوی ہیں: ۱۔ ابو الجعد الضمری: ان پر ۴ کی علامت (سنن اربعہ) ہے یہ صحابی ہیں ایک قول میں انکا نام ادرع ہے دوسرے قول میں عمرو بن بکیر تیسرے قول میں ان کا نام جنادہ ہے اس کے بعد امام ترمذی کا اوپر والا سارا کلام ذکر کیا۔ علامہ برقی فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ ۲۔ ابوالجعد غطفانی ہیں یہ مسلم کے راویوں میں سے ہیں انکا نام رافع بن سلمہ بصری ہے اور یہ سالم کے والد ہیں (تہذیب التہذیب ص ۵۵/ جلد ۱۲)۔

[4] بلکہ انکے استاذ کے استاذ الاستاذ کی رائے یہ ہے حضرت گنگوہیؒ نے اس کلام سے فیما زعم محمد بن عمرو کے لفظ کے فائدہ کی طرف اشارہ کیا ہے یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کلام بطور استشہاد کے ذکر کیا ہے کیونکہ ان کے صحابی ہونے کے ثبوت کیلئے کسی دلیل کی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ معروف صحابہ میں سے نہیں ہیں اور ان سے صرف ایک ہی حدیث مروی ہے۔

امام بخاریؒ پر رد: (قوله سالت محمداً عن اسم ابی الجعد الضمری فلم یعرف اسمه وقال لا اعرف له عن النبی صلی الله علیه وسلم الا هذا ، الحدیث) یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے لیکن ان راوی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے جیسا کہ علامہ سیوطی[1] نے اس دوسری روایت کو نقل کیا ہے اگرچہ امام بخاری رحمہ اللہ کو یہ دوسری روایت معلوم نہیں۔

کیا جمعہ کی ادائیگی کیلئے شہر ہونا یا دارالاسلام ہونا شرط ہے: جاننا چاہیئے کہ جمعہ کے مسئلے میں ہمارے علماء کے مختلف اقوال ہیں کہ ہمارے ان شہروں میں جمعہ ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور کیا بستی میں جمعہ ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں[2]؟ اکثر شہروں میں یہ مشہور ہے کہ جمعہ ان لوگوں پر واجب نہیں جو ہمارے ان بلاد میں رہتے ہیں کیونکہ یہ دارالاسلام نہیں۔ ہائے افسوس! ان علماء نے یہ شرط کہاں سے نکال لی۔ حالانکہ فقہاء کی کتابوں[3] میں اس شرط کا نام ونشان نہیں۔ یہ استدلال کرنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جمعہ اس لئے ادا نہیں کیا کہ وہ دارالکفر تھا اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں علت یہ نہیں تھی بلکہ علت یہ تھی کہ وہاں کفار سے امن نہیں تھا اور کھلم کھلا جمعہ کی نماز ادا کرنے پر قدرت نہیں تھی کیونکہ کفار مسلمانوں کو

---

[1] **ابوالجعد الضمری سے دو یا تین احادیث مروی ہیں:** چنانچہ سیوطی قوت المغتذی میں امام بخاریؒ کے کلام کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ان راوی سے دو حدیثیں مروی ہیں ایک تو یہی حدیث باب اور دوسری حدیث وہ ہے جس کو طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ ابوالجعد راوی سے مرفوعاً نقل کیا ہے "لا تشد الرحال الا الی المسجد الحرام" الحدیث۔ حافظ نے تلخیص الحبیر میں بخاری کے کلام کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بزاز نے ان راوی سے دوسری حدیث بھی نقل کی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ان راوی سے صرف یہی دو حدیثیں مروی معلوم ہیں۔ انتہی۔ قلت: اگر بزاز کی حدیث طبرانی کی حدیث کے علاوہ ہے تو ان راوی سے تین حدیثیں ہو جائینگی ورنہ دو حدیثیں لہٰذا اس مقام کو دیکھا جائے اور تفتیش کی جائے۔

[2] قطب العصر اس تقریر ترمذی کے قائل حضرت گنگوہیؒ کا اس باب میں ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام اوثق العری فی تحقیق الجمعة فی القری ہے اور ان کے نائب شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے اس کی ایک مفصل شرح لکھی ہے جس نام احسن القری ہے لہٰذا ان دونوں رسالوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

[3] بلکہ علامہ شامیؒ نے معراج الدرایۃ سے بحوالہ مبسوط ذکر کیا ہے کہ جو شہر کفار کے ہاتھ میں ہے وہ اسلامی شہر کہلاتے ہیں نہ کہ بلادِ حرب کیونکہ ان شہروں میں کافرانہ نظام رائج نہیں بلکہ قاضی حاکم سب مسلمان ہیں اور یہ سب ضرورت کی وجہ سے اور بغیر ضرورت کے بھی اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے ہیں لہٰذا ہر وہ شہر جس میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی حاکم ہو تو مسلمانوں کا اس میں جمعہ قائم کرنا صحیح ہے اور مسلمانوں کی رضا کی وجہ سے قاضی، شرعی قاضی شمار ہوگا اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مسلمان حکمران کو منتخب کریں۔ انتہی

تنگ کرتے تھے تو یہ علت نہیں تھی کہ مکہ دارالحرب تھا۔ دوسرے بعض علماء کا یہ استدلال کرنا کہ جمعہ کی شرائط میں سے شہر کا ہونا ضروری ہے اور یہ شرط یہاں مفقود ہے کیونکہ یہ مصر نہیں کہلاتے کیونکہ اس میں حدود قائم نہیں ہوسکتیں اس لئے یہاں پر جمعہ پڑھنا فرض نہیں۔

مصر کی تعریف میں اقوال: اس کا جواب یہ ہے کہ مصر کی شرط تو ہمیں تسلیم ہے لیکن شہر کے متحقق ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ہر وہ جگہ جہاں پر کوئی حاکم ہو جو حدود کو قائم کرے تو اس میں حدود کے قائم کرنے کی تصریح نہیں ہے کہ آپ کا استدلال صحیح ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم [1] وقت کو اس قدر اختیارات ہوں کہ وہ حدود قائم کرسکتا ہو کیونکہ اگر یہ مطلب مراد نہ لیا جائے تو اس زمانہ میں کسی بھی شہر میں جمعہ پڑھنا صحیح نہ ہو کیونکہ کسی بھی شہر میں عملاً حدود نافذ نہیں کی جاتیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ شہر اسے کہتے ہیں جہاں چار ہزار مرد [2] ہوں وغیرہ یہ سب شہر کی متعین تعریف نہیں بلکہ سمجھانے کیلئے اس طرح ذکر کیا گیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنے عرف میں جس جگہ کو شہر سمجھتے ہیں تو وہ شہر کہلائے گا اور وہاں جمعہ پڑھنا صحیح ہوگا اور جو شہر نہ ہو وہاں جمعہ پڑھنا صحیح نہ ہوگا۔ ہاں فناء مصر میں جمعہ پڑھنے کی اجازت ہے۔

جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط امام کا ہونا ہے: جمعہ کیلئے ایک شرط امام کا ہونا ہے تو یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ جس شخص کی امامت پر مسلمانوں کی جماعت اتفاق کرے تو وہی امام ہوگا کسی خلیفہ یا اسکے نائب کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ خلیفہ اور اس کے نائب کی شرط لگانے کا مقصد اتفاق پیدا کرنا اور جھگڑے کو ختم کرنا ہے اور یہ اس صورت میں بھی حاصل ہے۔ سلف کی ایک بڑی جماعت [3] نے مصر کی یہ تعریف کی ہے کہ اس میں اسقدر آبادی ہو کہ اس شہر کی سب سے بڑی مسجد انکو کافی نہ ہو اسکا مطلب یہی ہیکہ اس شہر کی مساجد میں سے سب سے بڑی مسجد میں بھی یہ لوگ نہ آسکیں کیونکہ اس قول کے قائل کے

---

[1] چنانچہ درمختار میں مصر کی تعریف کے متعلق لکھا ہے کہ ہر وہ جگہ جہاں پر ایک حاکم اور قاضی ہو جو کے حدود قائم کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ علامہ شامی نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام احکام وہ بالفعل نافذ بھی کردے کیونکہ جمعہ تو سب سے ظالم بادشاہ حجاج کے زمانے میں بھی پڑھا جاتا تھا اور وہ تمام احکام شرعیہ کو نافذ تھوڑا ہی کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حاکم احکام شرعیہ کو نافذ کرنے پر قادر ہو۔ انتہی

[2] میرے پاس موجود مشہور کتابوں میں مجھے یہ قول نہیں ملا لیکن مصر کی تعریف میں فقہاء کا بہت اختلاف ہے تو یہ بھی کوئی قول کسی امام کا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ جامع الرموز میں بحوالہ مضمرات نقل کیا ہے۔ کہ شہر وہ ہوتا ہے جہاں ایک ہزار افراد رہتے ہوں

[3] درمختار میں ہے کہ اسی پر اکثر فقہاء نے فتویٰ دیا ہے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ صدر الشریعہ نے اسکی تائید ذکر کی ہے کہ شریعت کے احکام خصوصاً شہروں میں حدود قائم کرنے میں سستی پیدا ہوئی ہے اس لئے اس کی یہ تعریف زیادہ بہتر کی گئی ہے۔

مذہب میں جمع منتہی الجموع کا اطلاق دس یا اس سے زیادہ پر ہوتا ہے۔ حالانکہ جمہور کے مذہب کے خلاف ہے اس قول کے قائل صدر الشریعۃ صاحب توضیح ہیں تو انکی اس تعریف کا مقصد عرفِ عام میں شہر کی وضاحت کرنا ہے کیونکہ مساجد شہروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں تو یہ مراد نہیں کہ دیہات میں کوئی بڑی مسجد آبادی کو نا کافی ہو تو اس پر بھی یہ تعریف صادق آجائے۔

مسئلہ احتیاط الظہر: یہ جو لوگوں میں رائج ہے کہ جمعہ پڑھنے کے بعد بطور احتیاط کے نماز ظہر ادا کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے شہروں میں ہے تو یہ ایسا فعل ہے جو قابل اعتراض ہے اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہیئے اس کی اصل امام محمد کے زمانے سے ملتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ[1] نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں کا ایک مسجد میں جمعہ کیلئے جمع ہونا بہت مشکل ہے اور اسمیں حرجِ عظیم ہے کیونکہ یہ اسی وقت ممکن تھا کہ بغداد کے درمیان[2] میں جو دجلہ اور فرات ہیں ان کو عبور کر کے لوگ ایک جگہ جمع ہوسکیں اسلئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ایک شہر میں جب بیچ میں نہر حائل ہو جائے تو کئی جگہ جمعہ پڑھ سکتے ہیں اور اس مسئلے میں امام صاحب سے کوئی روایت منقول نہیں کیونکہ امام صاحب کے زمانے میں شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوا کرتا تھا۔ پھر جب امام محمد نے یہ دیکھا کہ بڑی بڑی بستیوں اور شہروں کے تمام افراد کا ایک مسجد میں جمع ہونا بہت مشکل ہے تو یہ فتویٰ دیا کہ شہر میں مطلقاً کئی جگہوں پر جمعہ جائز ہے تو آج کل فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے لیکن لوگوں نے بطور احتیاط احتیاط الظہر کا مسئلہ نکالا جسپر صاحب بحر الرائق وغیرہ نے رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بہت دفعہ لوگوں کو اس سے رکنے کا فتویٰ دیا لیکن وہ مانتے نہیں کیا ان لوگوں کیلئے امام محمد کا قول کافی نہیں؟ حالانکہ انہوں نے امام محمدؒ کی بہت سے ایسے مسئلوں میں بھی تقلید کی ہے جن میں وہ متفرد ہیں۔ نہ امام ابوحنیفہ ان کے ساتھ ہیں نہ امام ابو یوسف تو اس مسئلہ میں بھی انکی تقلید کیوں نہیں کرتے کیا جمعہ کی نماز کے علاوہ کسی بھی مسئلہ میں احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

احتیاط الظہر کے قائلین پر رد: ہائے افسوس! اگر انہیں امام محمدؒ کے اس فتویٰ میں شک ہے تو اس پر عمل کیوں کرتے ہیں صرف ظہر ہی پڑھ لیا کریں۔ اگر یہ لوگ کہیں کہ ہم ظہر کی نماز ادا کر کے احتیاط سے کام لیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں ہر نماز دو مرتبہ پڑھنی چاہیئے ایک مرتبہ امام کے پیچھے فاتحہ کے ساتھ اور دوسری مرتبہ امام کی اقتداء میں بغیر فاتحہ کے کیونکہ

---

[1] ملا علی قاری شرح نقایہ میں لکھتے ہیں کہ چوتھا قول امام ابو یوسفؒ سے یہ ہے کہ جمعہ دو جگہوں پر ہوسکتا ہے جبکہ شہر بڑا ہو یا دو علاقوں کے درمیان نہر حائل ہو جیسا کہ بغداد میں۔

[2] بغداد کے بیچ میں نہر دجلہ ہے حموی معجم میں لکھتے ہیں کہ بغداد کو مدینۃ السلام کہا جاتا ہے کیونکہ دجلہ کو وادی السلام کہتے ہیں انتہی۔ ہدایہ کے مقدمے میں ہے کہ دجلہ دال کے کسرے کے ساتھ بغداد کی نہر کا نام ہے اور فرات فاء کے پیش کے ساتھ شام اور عراق کے درمیان مشہور دریا ہے۔ بلادِ روم کے پہاڑوں سے بہتا ہے اور وہ جنت کی نہروں میں سے ہے۔

ہمارے بعض مشائخ نے فاتحہ خلف الامام کو مستحسن سمجھا ہے اسلیئے اختلاف سے بچنے کیلیئے ان لوگوں کو ہر نماز دومرتبہ پڑھنی چاہیئے اس طرح ان پر ہر وہ کام ضروری ہو جائیگا جس کے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہو۔ کیا اختلاف سے بچنے کیلیئے انکے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا جو انہوں نے ایجاد کیا انہیں اسوقت احتیاط والی بات ذہن میں نہیں آتی کہ جس مسجد میں پہلے جماعت ہو چکی ہو تو اس مسجد میں دوبارہ جماعت خلافِ احتیاط ہے۔

باب ماجاء مِنْ كَمْ يُؤْتَى الجمعةُ

باب جمعہ کیلیئے کتنی دور سے آنا ضروری ہے؟

☆حدثنا عَبْدُ بن حُمَيْدٍ ومحمد بن مَدُّوَيَه قالا: حَدَّثَنَا الفضلُ بن دُكَيْنٍ حَدَّثَنَا اسرائيل عن ثُوَيْرٍ عن رجلٍ من اهل قُبَاءَ عن ابيه، وكان من اصحاب النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: اَمَرَنَا النبيُّ صلى الله عليه وسلم اَنْ نَشْهَدَ الجمعةَ مِنْ قُبَاءَ۔قال ابو عيسى: هذا حديث لانعرفه اِلَّا من هذا الوجه۔ ولا يصحُّ فى هذا الباب عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شيءٌ۔وقد رُوِىَ عن ابى هريرة عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم انه قال: الجمعةُ عَلَى مَنْ آوَاهُ الليلُ الى اهله۔ وهذا حديث اسنادهُ ضعيفٌ، اِنَّمَا يُرْوَى مِن حديث مُعَارِكِ بن عَبَّادٍ عن عبد الله بن سعيدٍ المَقْبُرِىِّ۔ وضَعَّفَ يحيى بنُ سعيدٍ القَطَّانُ عبد الله بن سعيدٍ المقبرى فى الحديث۔قال: واختلف اهل العلم عن مَن تجبُ الجمعةُ: فقال بعضُهم: تجب الجمعةُ على مَن آواهُ الليلُ الى منزله۔ وقال بعضُهم : لاتجب الجمعةِاِلَّا على مَن سمع النداء۔ وهو قولُ الشافعى، واحمد، واسحٰق۔

☆سمعتُ احمدَ بن الحسن يقول: كنّا عند احمد بن حنبلٍ فذكروا على مَن تَجبُ الجمعةُ ، فلم يَذكر احمدُ فيه عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شيئاً،قال احمدُ بن الحسن: فقلتُ لاحمدَ بن حنبلٍ: فيه عن ابى هريرة عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فقال احمدبن حنبلٍ: عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم؟ اقلت: نعم، (قال احمد بن الحسنِ): حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بن نُصَيْرٍ حَدَّثَنَا مُعَارِكُ بن عَبَّادٍ عن عبد الله بن سعيدٍ المقْبرىِّ عن ابيه عن ابى هريرة عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال:الجمعةُ على من آواه الليلُ الى اهله قال: فغضبَ علىَّ احمد بن حنبلٍ، وقال لى: استغفر ربَّك، استغفر ربَّك۔ قال ابو عيسى: اِنَّما فعل احمد بن حنبلٍ هذالانه لم يَعُدَّ هذا الحديثَ شيئاً، وضعَّفه لحالِ اسنادِه۔

﴿ترجمہ﴾

ثویر قبا کے ایک شخص سے اور وہ اپنے والد (جو صحابی ہیں) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ جمعہ پڑھنے کیلئے ہم مسجد قباء سے مدینہ آئیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو اس سند کے علاوہ نہیں جانتے۔ اس باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث میں سے کوئی بھی حدیث صحیح نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ اس شخص پر واجب ہے جسکو رات اس کے گھر میں ٹھکانہ دے (یعنی جمعہ پڑھنے کے بعد اپنے گھر واپس پہنچ سکے رات سے پہلے پہلے) اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

یہ معارک بن عباد کی عبداللہ بن سعید مقبری سے روایت ہے اور یحییٰ بن سعید قطان، عبداللہ بن سعید مقبری کو حدیث میں ضعیف کہتے ہیں۔ اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جمعہ کس پر واجب ہے بعض اہل علم کے نزدیک جمعہ اس پر واجب ہے جو شہر سے اتنی مسافت پر ہو کہ جمعہ میں حاضر ہو کر (جمعہ پڑھ کر) رات کو گھر واپس آ سکے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جو اذان جمعہ سنے اس پر جمعہ واجب ہے۔ امام شافعی، احمد اور اسحٰق کا یہی قول ہے۔ (امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میں نے احمد بن حسن سے سنا کہ ہم احمد بن حنبلؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو یہ تذکرہ زیر بحث آیا کہ جمعہ کس پر واجب ہے لیکن احمد بن حنبلؒ نے اس کے متعلق کوئی حدیث بیان نہیں کی۔ احمد بن حسن کہتے ہیں میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہا اس مسئلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث منقول ہے۔ امام احمد نے پوچھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے؟ میں نے کہا ہاں۔ ہم سے بیان کیا حجاج بن نصیر نے انہوں نے معارک بن عباد سے انہوں نے عبداللہ بن سعید مقبری سے انہوں نے اپنے والد سے اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ اس پر واجب ہے جو رات ہونے سے پہلے اپنے گھر میں پہنچ جائے۔ احمد بن حسن کہتے ہیں امام احمد بن حنبل یہ سن کر مجھ پر غصہ ہو گئے اور فرمایا (اپنے رب سے توبہ کرو! توبہ کرو! استغفار کرو) امام احمد نے یہ اسلئے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے وہ اس حدیث کو مسائل میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ اس کی سند کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیتے تھے۔

﴿تشریح﴾

(عن رجل من اھل قباء) اس طرح حدیث منقطع سے استدلال کرنا صحیح نہیں[1]۔

(قولہ عن ابیہ و کان من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و سلم) یعنی یہ والد صاحب صحابی تھے تو ان صحابی کے نام اور حالات کا معلوم نہ ہونا کوئی نقصان دہ نہیں کیونکہ صحابہ سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں اور نہایت معتبر ہیں۔

(قولہ ان نشھد الجمعة من قبا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بطور وجوب کے نہیں فرمایا تھا کہ لازماً قبا سے جمعہ پڑھنے آیا کرو تو اس کا مقصد ان پر جمعہ کی نماز کو لازمی قرار دینا نہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ بہت سی روایتوں میں اہل قبا سے مروی ہے کہ ہم باری باری جمعہ میں حاضر ہوتے تھے تو اگر ان اہل قبا پر جمعہ کی نماز میں حاضر ہونا ضروری تھا تو باری باری آنے کا کیا مطلب؟ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا کو جمعہ میں حاضر ہونے کا حکم[2] اس لئے فرمایا تا کہ مسلمانوں کے مجمع میں حاضر ہوں اور ان لوگوں کو مسلمانوں کی ضروریات معلوم ہوسکیں اور خطبہ میں جو وعظ ونصیحت اور احکام بیان کئے جائیں اسے سنیں اسیلئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب "باب ما جاء من کم[3] یوتی الی الجمعة" قائم کیا نہ کہ "باب ما جاء من کم یجب ان یوتی الی الجمعة"۔

جمعہ کن لوگوں پر واجب ہے: فقہاء کا اختلاف ہے کہ جمعہ کن لوگوں پر ضروری ہے۔ بعض علماء کے نزدیک جمعہ اس

---

[1] نیز اس کی سند میں ثویر بن ابی فاختہ راوی بہت ضعیف ہے، یہاں تک کہ سفیان ثوری نے فرمایا کہ ثویر جھوٹ کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ دارقطنی اور علی بن جنید نے اس کو متروک راوی قرار دیا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ شخص سندوں میں الٹ پھیر کرتا تھا تا کہ اپنی روایت میں موضوع اشیاء داخل کر سکے۔ انتہی

[2] حدیث شریف کی یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کریں کہ یہ حدیث ان علماء کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ فناء مصر اتنی مقدار تک ممتد ہوتا ہے تو اس مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ فناء مصر کی تعیین میں علماء کے نو اقوال ہیں۔

فناءِ مصر کی تعیین میں نو (۹) اقوال: علامہ شامی نے انکا خلاصہ ذکر کیا ہے: (۱) ایک غلوہ کی مقدار، (۲) ایک میل، (۳) ۲ میل، (۴) ۳ میل، (۵) ایک فرسخ، (۶) دو فرسخ، (۷) تین فرسخ، (۸) جہاں تک آواز پہنچے، (۹) جس جگہ اذان سنی جاسکے۔ اسکی کچھ تفصیل حضرت گنگوہیؒ کے کلام میں بھی آرہی ہے۔ تین فرسخ والے قول کے مطابق فناء مصر کی حد ۹ میل تک ہوتی ہے کیونکہ فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ حموی نے معجم میں ذکر کیا ہے کہ قباء مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ شہر سے دو میل کے فاصلہ تک فناء مصر ہے۔

[3] فقہاء کی تعبیر یہ ہے کہ شہر کی فناء سے جمعہ میں حاضر ہونا ضروری ہے۔

شخص پر لازم ہے جسے رات ٹھکانہ دے بعض حضرات[1] کے نزدیک جو شخص جمعہ کی اذان سنے اس پر جمعہ واجب ہے اور بعض اہل ظواہر[2] کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شہر میں ہی ہو اور جمعہ کی اذان نہ سنے تو اس پر بھی جمعہ واجب نہیں لیکن صحیح مذہب یہ ہے کہ اس حدیث الجمعة علی من سمع النداء میں اس شخص کا حکم بیان کیا گیا ہے جو شہر سے باہر ہو کیونکہ شہری پر بہر حال جمعہ واجب ہے چاہے وہ اذان سنے یا نہ سنے۔ فقہاء کا یہ قول کہ الجمعة علی من سمع النداءکا مطلب یہ ہے کہ اگر شہر کی فصیل اور (دروازے) پر اذان دی جائے تو اس کی آواز جن لوگوں تک پہنچے ان سب پر جمعہ واجب ہے لیکن یہ قول کوئی تحدیدی نہیں بلکہ سمجھانے کیلئے ہے شہریوں پر تو بہر حال جمعہ واجب ہے چاہے وہ اذان سنیں یا نہ سنیں۔

(استغفر ربك) امام احمد کے استغفار کے حکم دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان راوی (احمد بن الحسن نے) ایسی ضعیف حدیث سے استدلال کیا تھا جو کہ نا قابل استدلال حدیث ہے۔

---

[1] **مفتی بہ قول:** درمختار میں ہے کہ جمعہ کے فرض ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ شخص شہر میں مقیم ہو لہٰذا وہ جگہیں جو شہر سے الگ ہیں تو اگر وہاں پر شہر کی اذانوں کی آواز پہنچ جاتی ہے تو امام محمد کے نزدیک اس پر جمعہ ضروری ہے اور یہ قول مفتی بہ ہے جیسا کہ ملتقی میں ہے۔ بحر الرائق میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ آسانی سے جمعہ پڑھ کر رات اپنے گھر میں پہنچ جائے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ بدائع میں اس قول کو اچھا اور مستحسن قرار دیا ہے اور مواہب الرحمٰن میں امام ابو یوسفؒ کے اس قول کو صحیح قرار دیا گیا ہے کہ جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو ایسی جگہ پر ٹھہرا ہوا ہے کہ اس کو چھوڑ کر اگر آگے چلا یگا تو وہ مسافر ہو جائیگا اور جب اس جگہ پر پہنچے تو وہ مقیم بن جائیگا (یعنی شہر کی آخری حدود) انہوں نے اس کی شرح ''البرہان'' میں اس کی علت یہ لکھی ہے کہ جمعہ ان لوگوں پر واجب ہے جو اہل مصر ہیں اور جو لوگ شہر کی ان حدود سے باہر ہیں تو وہ اہل مصر نہیں کہلاتے۔

[2] ابن العربی فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے اذان جمعہ کے سننے پر سعی کو معلق کیا ہے لہٰذا اس قول کے اختیار کرنے کی وجہ سے جو شخص ایک بڑے شہر میں ہو اور اسے اذان کی آواز نہ آئے تو اس پر سے تو جمعہ ساقط ہونا چاہیئے، اس مسئلہ کا احتمال بھی موجود ہے۔ انتہی عراقی نے ترمذی کی شرح میں امام شافعی، احمد، مالک رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک اہل مصر (شہریوں) پر جمعہ واجب ہے اگر چہ وہ جمعہ کی اذان نہ سنیں بلکہ بحر الرائق میں تو دعویٰ کیا گیا ہے کہ شہر میں اذان جمعہ سننے نہ سننے کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ مطلقاً شہریوں پر جمعہ واجب ہے۔ کذا فی البذل

باب ماجاء فی وقتِ الجمعة

باب جمعہ کے وقت کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن مَنیعٍ حَدَّثَنا سُرَیْجُ بن النُّعمَانِ حَدَّثَنا فُلَیْحُ بن سلیمانَ عن عثمانَ بن عبد الرحمٰن التَّیمِیِّ عن اَنَس بن مالکٍ: ان النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یصلِّی الجمعة حین تَمِیلُ الشمسُ۔

☆حدثنا یحیی بن موسٰی حَدَّثَنا ابو داودَ الطیالسیُّ حَدَّثَنا فُلَیْحُ بن سلیمانَ عن عثمانَ بن عبد الرحمٰن التیمیِّ عن انسٍ عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: نحوَہ۔قال: وفی الباب عن سَلَمَةَ بن الاکْوَعِ، وجابرٍ، والزُّبَیْرِ بن العوام۔ قال ابو عیسی: حدیث انسٍ حدیث حسن صحیحٌ۔وهو الَّذِی اَجْمَعَ علیهِ اکثرُ اهل العلم:اَنَّ وقتَ الجمعةِ اِذا زالتِ الشمسُ، کوقتِ الظُّهرِ۔وهو قولُ الشافعیِّ، واحمدَ،واسحٰق۔ورَاٰی بعضُهم انَّ صَلاة الجمعةِ اذا صُلِّیَتْ قبلَ الزَّوَالِ اَنَّها تجوزُ ایضاً۔وقال احمد: ومَنْ صلَّاها قبل الزوال فَاِنَّهٗ لَمْ یَرَعلیه اعادةً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ پڑھتے تھے جس وقت سورج ڈھلتا تھا۔ روایت کی ہم سے یحیٰی بن موسیٰ نے انہوں نے ابوداؤد طیالسی سے انہوں نے فلیح بن سلیمان سے انہوں نے عثمان بن عبدالرحمٰن تیمی سے انہوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اوپر کی حدیث کے مثل۔اس باب میں سلمہ بن اکوع، جابر اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کے وقت کی طرح زوال آفتاب پر ہوتا ہے۔امام شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔بعض حضرات کے نزدیک جمعہ کی نماز آفتاب کے زوال سے پہلے پڑھ لینا بھی جائز ہے۔امام احمدؒ فرماتے ہیں جو شخص جمعہ کی نماز زوال سے پہلے پڑھ لے تو اسے نماز کا لوٹانا (یعنی دوبارہ پڑھنا) ضروری نہیں۔

﴿تشریح﴾

(حین تمیل الشمس) اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز زوال سے پہلے نہیں پڑھتے تھے۔

حنابلہ کا مذہب اور انکے دلائل اور اسکے جوابات: جیسا کہ بعض علماء نے کم فہمی کی وجہ سے یہ مذہب اختیار کیا ہے کہ

جمعہ کی نماز زوال سے پہلے ہوسکتی ہے چنانچہ ان کی دلیل ”کنا یوم الجمعة لا نقیل و لا نتغدیٰ الا بعد الجمعة“ ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ قیلولہ تو اس وقت کیا جاتا ہے جب دن آدھا ہو جائے اور غداء اس کھانے کو کہتے ہیں جو زوال سے پہلے کھایا جائے (اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز نصف النہار سے پہلے پڑھی جاتی تھی اس کے بعد غداء اور قیلولہ کیا جاتا تھا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہمارا صبح کا کھانا اور نصف النہار کا قیلولہ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہوتا تھا کیونکہ ان دونوں (غداء اور قیلولہ) کے وقت میں نمازِ جمعہ میں مشغولی کی وجہ سے فراغت نہیں ہوتی تھی کہ ہم کھانا کھا کر ہوسکیں۔ بہر حال اس قول کو تھوڑے سے علماء اہل ظاہر[1] نے لیا ہے اور ان کے منجملہ دلائل میں سے ایک دلیل: راوی کا قول: ہم جمعہ پڑھ کر لوٹتے تھے تو اس وقت بھی ہمیں دیواروں کا سایہ اتنا نہ ملتا تھا کہ جس کے ذریعے ہم اپنے سروں کو دھوپ سے بچاسکیں۔ پھر اس صورتحال پر غور کریں کہ انسان پہلے جمعہ کے خطبہ میں مشغول ہو پھر نماز جمعہ ادا کر کے دعاء اور نوافل میں مشغول ہو پھر اپنے گھر لوٹے اور رستے میں اسے سایہ میسر نہ ہو تو لامحالہ یہ سب کام زوال سے پہلے ہوئے ہونگے ورنہ واپسی کے وقت دیواروں کا سایہ کیوں نہیں ہوتا؟ جواب: اگر نصف النہار کے فوراً بعد زوالِ شمس ہوتے ہی یہ سب کاموں کو کیا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ خطبہ اور نماز سے فراغت کے بعد یہ صورتحال ہو کہ دیواروں کا اسقدر سایہ نہ ہو جس میں سروں کو دھوپ سے بچایا جائے اسلئے کہ (اول تو یہ خطبہ اور نماز بالکل ابتدائے وقت میں ادا کئی گئی) پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز خطبہ کی طرح میانہ رو ہوتی تھی نہ بہت مختصر نہ بہت لمبی (لہٰذا اتنے وقت میں دیواروں کا سایہ نہ ہونا کوئی بعید نہیں) رہا سنتیں اور دعائیں تو سنتیں تو گھر میں پڑھی جاتی تھیں انکے مسجد میں پڑھنے پر کونسی دلیل ہے اور دعاؤں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مجمع کے ساتھ بہت کم مشغول ہوتے تھے (بلکہ طویل دعائیں منفرداً مانگتے تھے) نیز اس زمانہ میں دیواریں زیادہ بلند بھی نہ ہوتی تھیں اس لئے ان کا سایہ بہت دیر بعد پڑتا تھا۔

---

[1] ائمہ مجتہدین میں سے بعض فقہاء کا بھی یہی مذہب ہے۔ نوویؒ فرماتے ہیں: امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی اور جمہور فقہاء صحابہؓ اور ان کے بعد کے جمہور علماء کے مذہب میں جمعہ کی نماز زوال کے بعد ہی صحیح ہوگی امام احمد بن حنبل اور امام اسحٰق نے زوال سے پہلے جمعہ کو جائز قرار دیا ہے۔ کذا فی الاوجز۔ حضرت گنگوہیؒ نے صرف ظاہریہ کو مخالفین میں شمار کیا ہے کیونکہ امام احمدؒ کو بھی بسا اوقات اہل ظاہر میں سے شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسرے ائمہ کے مقابلے میں اکثر حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الْخُطْبَةِ عَلَی الْمِنبَرِ

باب منبر پر خطبہ دینے کا بیان

☆حدثنا ابو حَفْصٍ عَمْرُو بن عليٍّ الفلّاسُ الصَّيرفيُّ حَدَّثَنَا عثمانُ بن عمر ويحيى بن كَثِيرٍ ابو غَسَّانَ العَنْبَرِيُّ قالا حَدَّثَنَا مُعَاذُ بن العَلَاء عن نافعٍ عن ابن عُمَرَ: ان النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ يَخْطُبُ اِلَى جِذْعٍ فَلَمَّا اتُّخِذَ المِنبَر حَنَّ الجِذْعُ، حتى اَتَاهُ فالْتَزَمَهُ، فسَكَنَ۔ قال: وفى الباب عن انسٍ، وجابرٍ، وَسَهْلِ بن سعدٍ، وابى بن كعبٍ، وابن عبّاسٍ، وامِّ سَلَمَةَ۔ قال ابو عيسى: حديث ابن عمرَ حديث حسن غريب صحيحٌ۔ ومُعَاذُ بن العلَاءِ هو بصريٌّ، وهو اَخو ابى عَمْروبن العَلَاءِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے پھر جب (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے) منبر بنا دیا گیا تو کھجور کا تنا (ستون) بلکنے لگا۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے اور اسے چمٹا لیا پس اس کا بلکنا بند ہو گیا۔ اس باب میں حضرت انس، جابر، سہل بن سعد، ابی بن کعب، ابن عباس، اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابن عمر حسن غریب صحیح ہے اور معاذ بن علاء بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ جو ابو عمرو بن علاء کے بھائی ہیں۔

﴿تشریح﴾

مقصودِ مصنف: اس باب کا مقصد اس وہم کو دور کرنا ہے کہ منبر پر خطبہ دینا بدعت یا ظالم، جابر، متکبر حکمرانوں کی عادت تھی اسلئے یہ ممنوع سمجھا جائے بلکہ منبر پر خطبہ دینا سنت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کی تین سیڑھیاں تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اوپر والی سیڑھی[1] پر بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] عینیؒ نے طفیل بن ابی بن کعب عن ابیہ کی روایت ثلاث درجات کی ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

ایک اہم اشکال منبر کے کتنے درجے تھے؟: اگر یہ اشکال کیا جائے کہ ابوداؤد نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فاتخذ لہ منبر مرقاتین نقل کیا ہے تو دونوں حدیثوں میں تعارض ہوا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ جس راوی نے دو سیڑھیوں کا ذکر کیا ہے تو اس نے اس سیڑھی کو ذکر نہیں کیا جسپر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی نشست مبارک کے ادب میں دوسری سیڑھی پر خطبہ دیا پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اسی علت کی وجہ سے تیسری سیڑھی پر خطبہ دیا پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو وہ سب سے اوپر والے درجہ پر چڑھ گئے کیونکہ تیسری سیڑھی کے بعد کوئی اور سیڑھی نہ تھی نیز ان کے اس طرح سب سے اوپر چڑھ بیٹھنے میں کسی کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ برابری کا دعویٰ کر رہے ہیں (بخلاف اگر شیخین میں سے کوئی یہ فعل کرتا تو یہ وہم ہوسکتا تھا)۔

باب ماجاء فی الجلوس بین الخطبتین

باب دونوں خطبوں کے درمیان میں بیٹھنے کا بیان

☆حدثنا حمیدُ بن مسعدة البصریُّ حَدَّثَنَا خالد بن الحرث حَدَّثَنَا عبید اللّٰہ بن عمرَ عن نافعٍ عن ابن عمر: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کَانَ یَخْطُبُ یومَ الجمعةِ ثُمَّ یَجْلِسُ، ثم یقومُ فیخْطُب، قال: مِثْلَ مَا یفعلونَ الیومَ۔قال: وفی الباب عن ابن عباسٍ، وجابر بن عبد اللّٰہ، وجابر بن سَمُرَةَ۔قال ابو عیسی:حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیحٌ۔ وھو الَّذِی رآہُ اھلُ العلم: ان یَفْصِلَ بین الخطبتین بجلوسٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دیتے تھے پھر بیٹھتے تھے پھر کھڑے ہوتے تھے پس خطبہ دیتے تھے۔راوی (ابن عمر رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں جیسا آج (کے ائمہ) کرتے ہیں۔اس باب میں ابن عباس، جابر بن عبداللہ، اور جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور یہی وہ بات ہے کہ جس کے علماء قائل ہیں۔یعنی دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھ کر فصل کرے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) خمیس میں ہے کہ ابن النجار نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ اس منبر کی دو سڑھیاں تھیں اور تیسری سیڑھی پر آپ بیٹھتے تھے۔ دارمی نے اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ایسا منبر تیار کیا گیا تھا جس کی دو سیڑھیاں تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیسری سیڑھی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ یحییٰ نے ابوالزناد سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر اپنی نشست پر تشریف رکھنے کے بعد اپنے پاؤں دوسری سیڑھی پر رکھتے تھے پھر جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو وہ دوسرے درجہ پر تشریف رکھتے اور سب سے نیچے درجہ پر پاؤں رکھتے پھر جب عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے وہ تیسرے درجہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور زمین پر پاؤں رکھتے پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے بھی اپنی خلافت کے چھ سال تک تیسری سیڑھی پر خطبہ دیا پھر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست مبارک پر بیٹھ گئے (اور وہاں خطبہ دینا شروع کیا)۔

﴿تشریح﴾

(قولہ ثم یجلس) یعنی دوخطبوں کے درمیان کچھ دیر بیٹھتے تھے لیکن نہ دعا مانگنی چاہیئے اور نہ ہی کوئی بات کرے البتہ اپنے دل سے جو چاہے دعائیں مانگ سکتا ہے۔(قوله أخو ابی عمرو بن العلاء) ابوعمرو ایک شخص کی کنیت [1] ہے مطلب یہ ہے کہ ابوعمر اور معاذ دونوں بھائی بھائی ہیں۔دونوں علاء کے بیٹے ہیں۔

باب ماجاء فی قَصْرِ الخطبة

باب خطبہ مختصر دینے کا بیان

☆حدثنا قتيبة وهناد قالا:حدثنا ابو الاحوَصِ عن سِمَاكِ بن حربٍ عن جابر بن سَمُرَةَ قال: كنتُ أُصلِّی مع النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم، فكانت صلا تُه قَصْداً، وخطبته قَصْداً۔قال: وفی الباب عن عَمَّارِ بن يَاسِرٍ، وابن ابی اَوْفَی۔قال ابو عيسى: حديث جابر بن سَمُرَةَ حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی درمیانی ہوتی تھی اور خطبہ بھی درمیانی تھا (یعنی نہ زیادہ طویل اور نہ زیادہ مختصر) اس باب میں عمار بن یاسر اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الْقِرَاءَ ةِ عَلَی الْمِنبَرِ

باب (خطبہ میں) منبر پر قرآن پڑھنے کا بیان

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا سفيانُ بن عيينة عن عَمْرِو بن دينارٍ عن عَطَاءٍ عن صَفْوَانَ بن يَعْلَى بنِ اُمَيَّةَ عن ابيه قال: سمعتُ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم يَقْرَأُ علی المنبرِ وَنَادَوْا يَامَالِكُ۔

قال : وفی الباب عن ابی هريرةَ، وجابر بن سَمُرَةَ ۔ قال ابو عيسى: حديث يَعْلَى بن اُمَيَّةَ حديث حسن صحيح غريب وهو حديث ابن عيينة۔ وقد اختار قومٌ من اهل العلم ان يقرا الامامُ فی الخطبةِ آياً من القرآنِ۔ قال الشافعیُّ: واِذا خطب الاِمامُ فلم يقرا فی خطبته شيئاً من القرآنِ اعاد۔ الخطبةَ۔

---

[1] چونکہ ابوعمرو مشہور شخص تھا اسلئے مصنف نے معاذ راوی کی اسطرح پہچان کرائی کہ وہ ابوعمرو کا بھائی ہے اور یہ ابوعمرو قراء سبعہ میں سے ایک امام ہیں ان کے نام میں متعدد اقوال ذکر کئے جاتے ہیں۔

﴿ترجمہ﴾

صفوان بن یعلی بن امیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ آیت و نادوا یا مالك پڑھتے ہوئے سنا۔اس باب میں حضرت ابو ہریرہ، جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعلی بن امیہ کی حدیث حسن غریب صحیح ہے اور یہ ابن عیینہ کی حدیث ہے۔علماء کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ امام خطبہ میں قرآن کی آیات پڑھے گا۔امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر امام نے خطبہ دیا اور خطبہ میں قرآن کی کوئی آیت نہ پڑھی تو خطبہ دوبارہ دے۔

﴿تشریح﴾

خطبہ میں قرآن پڑھنے کا حکم:(قوله يقراء على المنبر و نادوا [1] يا مالك الخ) اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ میں منبر پر قرأت قرآن سنت ہے۔امام شافعیؒ کے نزدیک قرآن کی ایک آیت خطبہ میں پڑھنا رکن ہے،اور ہمارے یہاں سنت ہے ہماری دلیل فاسعوا الی ذکر الله ہے تو ذکر اللہ عام ہے قرآن کیساتھ خاص نہیں (لہٰذا بغیر قرآن پڑھے اگر اللہ کا ذکر خطبہ میں کیا جائے تو بھی فرضیت ادا ہو جائیگی)۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي اِسْتِقْبَالِ الْاِمَامِ اِذَا خَطَبَ

باب جب امام خطبہ دے تو لوگ اس کی طرف اپنے چہروں کا رخ کرلیں

☆حدثنا عَبَّادُ بن يعقوبَ الكوفيُّ حَدَّثَنَا محمد بن الفَضْلِ بن عطية عن منصورٍ عن ابراهيم عن عَلْقَمَةَ عن عبد الله بن مسعود قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اذا اسْتَوَى على المنبرِ استقبلناه بوجوهنا۔ قال ابو عيسى: وفي الباب عن ابن عمر۔وحديث منصورٍ لانعرفُه اِلَّا مِن حديث محمد بن الفضل بن عطيّةَ۔ ومحمد بن الفضل بن عطيّةَ ضعيفٌ ذَاهِبُ الحديثِ عند اصحابنا۔

---

[1] قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں صرف یہ ایک آیت تلاوت فرمار ہے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ پوری سورۃ پڑھ رہے تھے،ابو الطیب کہتے ہیں خطبہ میں بالاتفاق تلاوت کرنا مشروع ہے البتہ ائمہ میں اس کے ضروری ہونے میں اختلاف ہے۔ہمارے نزدیک قرآن کی تلاوت خطبہ میں مستحب ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک کم از کم ایک آیت کی تلاوت ضروری اور واجب ہے۔انتہی

والعملُ علی ھذا عند اھل العلم من اصحاب النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وغیرھم، یَسْتَحِبُّوْنَ استقبالَ الإمام إذا خَطب۔وھو قولُ سفیانَ الثوریؒ، والشافعیؒ، واحمدَ، وإسحٰقَ قال ابو عیسی: ولا یصحُّ فی ھذاالباب عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم شیءٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوتے تھے تو ہم اپنے چہروں سے آپ کی طرف اپنا رخ پھیر لیتے تھے۔اس باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے اور منصور کی حدیث کو ہم محمد بن فضل بن عطیہ کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے محمد بن فضل بن عطیہ ضعیف ہیں۔ ہمارے ائمہ کے نزدیک......ان کو اپنی حدیثیں یاد نہیں تھیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کا اسی حدیث پر عمل ہے کہ امام کی طرف چہرہ سے متوجہ ہونا (خطبہ کے وقت) مستحب ہے۔ یہ سفیان ثوری، شافعی، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا قول ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔

﴿تشریح﴾

اس قول کی تشریح: (قولہ استقبلنا بوجوھنا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مقتدی عین امام کی طرف اپنا چہرہ پھیر لیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب مقتدی اپنا چہرہ جہتِ امام کی طرف کریں گے، کیونکہ اگر امام صاحب کی ذات کی طرف سبوں نے چہرہ پھیرلیا تو جمعہ سے پہلے حلقہ بنانا لازم آئیگا جس کی دوسری حدیث میں ممانعت ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ إِذَا جَاءَ الرَّجُلُ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ

باب جس وقت امام خطبہ دے رہا ہو اس دوران مسجد میں آنے والے شخص کیلئے دو رکعت (تحیۃ المسجد) پڑھنے کا حکم

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا حماد بن زید عن عمرو بن دینارٍ عن جابر بن عبداللّٰہ قال: بینما النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یخطبُ یوم الجمعةِ اذجاء رجل، فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اَصَلَّیْتَ؟ قال لا۔ قال: قُمْ فارکع۔ قال ابو عیسی: وھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا محمد بن ابی عمر حَدَّثَنَا سفیان بن عیینة عن محمد بن عجلان عن عیاض بن عبد اللّٰہ بن ابی سَرْحٍ:اَنَّ ابا سعیدِ الخدریؓ دخل یوم الجمعةومروانُ یخطبُ، فقام یصلّی، فجاء الحرَسُ لِیُجْلِسُوْہُ، فَاَبَی حتی صلّی، فلمّا انصرف اَتَیْنَاہُ، فقلنا: رَحمك اللّٰہ ، ان کادوا لَیَقَعُوا بك!

فَقَالَ مَاكُنْتُ لاترُ كهُمَا بَعْدَ شَيْءٍ رايته من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم،ثم ذَكَرَ اَنَّ رَجلاً جاء يومَ الجمعةِ في هَيْئَةٍ بَذَّةٍ والنبیُّ صلى اللّٰه عليه وسلم يخطبُ يومَ الجمعةِ فَاَمَره فصلّى ركعتين، والنبیُّ صلى اللّٰه عليه وسلم يخطبُ۔قال ابنُ ابى عمر: كان سفيان بن عيينة يصلى ركعتين اذاجاء والامام يخطبُ وَكَانَ يَاْمُرُ بِهٖ، وكان ابو عبد الرحمٰن المُقرى يراه۔قال ابو عيسى: وسمعتُ ابنَ ابى عمرَ يقول: قال سفيانُ بن عيينة: كان محمدُ بن عَجْلَان ثقةً ماموناً فى الحديثِ۔

قال :وفى الباب عن جابرٍ، وابى هريرةَ، وسَهْلِ بن سعدٍ۔ قال ابو عيسى: حديث ابى سعيد الخدریِّ حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ على هذا عند بعض اهل العلم۔ وبه يقولُ الشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰق۔ وقال بعضُهم: اِذا دخل والإمامُ يخطب فاِنّه يجلسُ ولايصلّى۔ وهو قولُ سفيانَ الثوریِّ، واهل الكوفة۔ والقولُ الاول اصحُّ۔

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا العَلاءُ بن خالدٍ القُرَشِى قال: رايتُ الحسنَ البصریَّ دخلَ المسجدَ يومَ الجمعةِ والإمامُ يخطُب، فصلّى ركعتين، ثم جلسَ۔انما فعلَ الحسنُ اتباعاًللحديث۔ وهو رَوى عن جابر عن النبیِّ صلى اللّٰه عليه وسلم هذا الحديث۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ اسی اثناء میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک ایک شخص وارد ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھڑے ہو اور نماز پڑھو۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

حضرت عیاض بن عبداللہ بن ابی سرح سے منقول ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوئے جبکہ مروان خطبہ دے رہا تھا انہوں نے نماز پڑھنی شروع کر دی اس پر پہرے دار انہیں بٹھانے کیلئے آئے لیکن آپ نے بیٹھنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو گئے پھر جب (جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر) لوٹے تو ہم ان کے پاس آئے اور کہا اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے قریب تھا کہ پہرے دار آپ کی توہین کر دیتے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان (دو رکعتوں) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک چیز دیکھ لینے کے بعد کسی صورت میں نہیں چھوڑ سکتا پھر واقعہ بیان کیا کہ (ایک مرتبہ) جمعہ کے دن ایک آدمی بوسیدہ حالت میں آیا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا (دو رکعتیں پڑھنے کا) تو اس نے دو رکعتیں پڑھیں دراں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ ابن ابی عمر فرماتے ہیں کہ ابن عیینہ اگر امام کے خطبہ کے دوران مسجد میں آتے تو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور اسی کا حکم دیتے تھے۔ ابوعبدالرحمٰن مقری کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابن ابی عمر سے سنا کہ ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ محمد بن عجلان ثقہ اور حدیث میں قابل اعتماد ہیں۔ اس باب میں جابر، ابوہریرہ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوسعید خدری کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر بعض اہل علم کا عمل ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں جب کوئی شخص امام کے خطبہ کے دوران مسجد میں داخل ہو تو بیٹھ جائے اور نماز نہ پڑھے یہ سفیان ثوری اور اہل کوفہ (احناف) کا مذہب ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ علاء بن خالد قرشی فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بصری کو دیکھا کہ جمعہ کے دن مسجد میں آئے دراں حالیکہ امام خطبہ پڑھ رہا تھا تو انہوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور پھر بیٹھے (امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) حضرت حسن نے حدیث کی اتباع میں ایسا کیا اور وہ خود حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

دورانِ خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم: اس حدیث سے جمہور[1] اپنے مقصد پر استدلال نہیں کر سکتے۔

حدیثِ باب کا جواب: کیونکہ دوسری احادیث میں اس واقعہ میں تصریح ہے کہ یہ صحابی جب نماز پڑھنے کھڑے

---

[1] علماء کا اختلاف ہیکہ جو شخص جمعہ میں اسوقت مسجد پہنچے کہ خطبہ شروع ہو چکا ہو تو یہ شخص تحیۃ المسجد پڑھیگا یا نہیں؟

مذاہب ائمہ: امام شافعی، احمد واسحٰق اور جمہور محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک اسے تحیۃ المسجد پڑھنی چاہیئے اور امام نووی کے بقول یہ دو رکعت تحیۃ المسجد مختصرا پڑھے، فروعِ شافعیہ میں ہے کہ اس نماز کو انتہائی مختصر ادا کرنا ضروری ہے، نیز خطیب کیلئے ان دو رکعتوں کا پڑھنا مستحب نہیں ہے اسی طرح ایسے شخص کیلئے جو کہ خطبہ کے بالکل آخر میں آکر شریک ہوا ہو تو اس کیلئے بھی تحیۃ المسجد پڑھنا مستحب نہیں کیونکہ اسے اس بات کا ڈر ہے کہ جمعہ کی نماز کا کچھ حصہ اس سے فوت نہ ہو جائے قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ امام مالک، لیث، ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور جمہور صحابہ وتابعین کا مذہب یہ ہے کہ دورانِ خطبہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں نہیں پڑھیگا۔ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ سے یہی مذہب مروی ہے، ابن عربی فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد نہیں پڑھیگا اور یہی مذہب صحیح ہے جسکے تین وجوہ ہیں، سلیک غطفانی کی حدیث ان اصولوں کے معارض نہیں ہو سکتی چار وجوہ سے، پھر ابن عربیؒ نے ان ساتوں وجوہات کو بیان کیا ہے اور ابن عربی کے اس کلام کو اوجز میں لیا گیا ہے مذکورہ دونوں کتابوں میں سے کسی کی طرف بھی مراجعت کی جا سکتی ہے۔

ہوئے تھے تو اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وجہ سے خاموش[1] ہو گئے تھے، حنفیہ کے نزدیک بھی اگر امام خطبہ روک دے تو تحیۃ المسجد پڑھنا جائز ہوگا۔

حضرت ابوسعیدؓ کے قول سے جمہور کا استدلال اور اسکا جواب: جمہور کا ابوسعید رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرنا جس میں وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور یہ صحابی تحیۃ المسجد پڑھتے رہے اس کا جواب یہ ہے کہ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ابقاء ما کان علی ما کان کے اعتبار سے یہ سمجھا ہوگا (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلیک غطفانی کی نماز کے دوران بھی خطبہ دیتے رہے ہونگے) یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاموشی کی حالت میں منبر پر موجود ہونے کو انہوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ یہ خاموشی اتفاقی طور پر لاحق ہوئی تھی نہ کہ قصداً تو گویا کہ خطبہ جاری تھا۔

---

[1] **سلیک غطفانی کی احادیث کے مزید جوابات:** دارقطنی نے دوسندوں کے ساتھ نقل کیا ہے (جن میں ایک سند مسند اور دوسری مرسل ہے) کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تحیۃ المسجد کے دوران خاموش ہو گئے تھے پھر دارقطنی فرماتے ہیں کہ مرسل روایت زیادہ صحیح ہے کذا فی الاوجز۔ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اسی جواب کو اختیار فرمایا ہے اور اسے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن ابن نجیم اس جواب پر خوش نہیں ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ سلیک غطفانی والا واقعہ اس زمانے کا ہے جب نماز میں کلام کرنا حرام نہیں تھا۔ یہ جواب اسلئے ضروری ہے کہ خطبہ میں کلام کے متعلق احادیث متعارضہ مروی ہیں بعض روایت میں اجازت ہے جیسا کہ حدیث باب اور بعض احادیث میں ممانعت ہے لہذا حدیث باب کو منسوخ ماننا پڑیگا ہمارے فقہاء کا یہ جواب دینا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان صحابی کے نماز سے فارغ ہونے تک خطبہ سے رکے رہے یہ جواب امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے لحاظ سے نامناسب ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جب امام خطبہ سے پہلے ہی صرف خطبہ کیلئے نکل کھڑا ہو تو اسوقت سے نمازِ جمعہ کے ختم ہونے تک کسی کو بھی کسی قسم کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے لہذا یہ جواب نامناسب ہوا۔ انتہی۔ (قولہ لمذہب الامام) امام نجیم کی اس عبارت سے صاحبین کے مذہب سے احتراز مقصد نہیں کیونکہ ہمارے تینوں ائمہ کا اجماع ہے کہ امام جیسے ہی خطبہ کیلئے کھڑا ہو تو مقتدیوں کیلئے نماز ممنوع ہو جائیگی البتہ اس اختلاف اس میں ہے کہ آپس میں گفتگو کی ممانعت کس وقت ہوگی۔ تو امام صاحب کے نزدیک نفسِ خروجِ امام آپس کی گفتگو کو منع کر دیگا اور صاحبین کے ہاں خطبہ کا شروع ہونا...... لہذا امام سے مراد تمام علماء احناف کا مذہب ہے لیکن ابن نجیم کا یہ اعتراض صحیح نہیں کیونکہ ہدایہ میں ہے کہ صاحبین کے نزدیک جب امام خطبہ سے پہلے اٹھ کھڑا ہو تو آپس میں گفتگو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اس کی دلیل یہ ذکر کی ہے کہ گفتگو کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ خطبہ سننا فرض ہے اور آپس کی گفتگو اس میں مخل ہے، اور ابھی تک چونکہ خطبہ شروع نہیں ہوا لہذا آپس میں گفتگو کی اجازت ہونی چاہیئے بخلاف نماز کے کہ خطیب کے خطبہ کیلئے نکلتے ہی نماز مطلقاً منع ہے کیونکہ بسا اوقات نماز لمبی ہو جاتی ہے۔ انتہی۔ صاحبِ ہدایہ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ یہ نماز سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات نماز لمبی ہو کر خطبہ کے سننے سے مانع بنے گی اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جب امام کسی مقتدی کیلئے خطبہ سے رک جائے تو اس مقتدی کی نماز مقصود (خطبہ سننے) سے مخل نہیں ہوگی۔

اہم اور قابلِ توجہ استدلال: نیز حنفیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ جن علماء کے نزدیک دورانِ خطبہ نوافل کی اجازت ہے تو وہ اس تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کے ضروری ہونے کے قائل نہیں بلکہ اسکے نفل ہونے کے قائل ہیں تو کیا ان دو رکعتوں کے جواز پر کوئی یقینی دلیل موجود ہے حالانکہ یہ نماز نفلی ہے اور اسکے برعکس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت میں صراحۃً امر بالمعروف سے منع فرمایا تھا جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے "من قال انصت فقد لغا" حالانکہ امر بالمعروف تو ہر شخص پر ضروری ہے تو جب یہ امر بالمعروف جو ضروری ہے دورانِ خطبہ منع ہے تو یہ نفل دورانِ خطبہ کیسے جائز ہوگی؟ نیز جب ایک صحابی نے اپنے ساتھ والے صحابی سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو اسے بھی جائز قرار نہیں دیا گیا۔ حنفیہ کے مذہب میں دورانِ خطبہ خاموش رہنا ضروری ہے نہ چھینک آنے پر الحمدللہ کہہ سکتا ہے اور نہ ہی یرحمک اللہ کہہ کر چھینکنے والے کا جواب دے اور نہ ہی جواب دینے والے کو دعا دے سکتا ہے۔

(وفی الباب عن جابر) امام ترمذی کی عادت کے مطابق یہ جملہ صحیح نہیں کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت تو گزر چکی ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی عادت یہ ہے کہ جس صحابی سے روایت وہ ذکر کر چکے ہوں تو وفی الباب کے تحت اس صحابی کو ذکر نہیں کرتے لہٰذا یا تو ان کو نسیانًا ذکر کر دیا یا مطلب یہ ہیکہ جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث باب کے علاوہ کوئی اور روایت بھی مروی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ الکلامِ والامامُ یخطبُ

باب امام کے خطبہ کے دوران بات چیت کے ممنوع ہونے کے بیان میں

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عن عقیل عن الزُّھْرِیِّ عن سعید بن المُسَیِّبِ عن ابی ھریرۃَ ان النبیَّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: مَنْ قال یوم الجمعۃِ والإمامُ یخطبُ أنْصِتْ فقد لَغَا۔قال ابو عیسی: وفی الباب عن ابْنَ ابی اَوْفَی، وجابر بن عبد اللّٰہ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابی ھریرۃ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعمل علیہ عند اھل العلم۔ کَرِھُوا الرجلُ ان یتکلمَ والامامُ یخطبُ، وقالوا: ان تکلم غیرُہ فلا یُنکِر علیہ اِلَّا بالإشارۃِ۔واختلفوا فی ردِّ السلام وتشمیت العاطس والامامُ یخطبُ: فرخَّص بعضُ اھل العلم فی ردِّ السلام وتشمیت العاطس والامامُ یخطبُ۔ وھو قولُ احمدَ واسحٰقَ۔ وکرہ بعضُ اھل العلم من التابعینَ وغیرِھم ذٰلک۔ وھو قولُ الشافعیِّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے جمعہ کے دن......

اس حال میں کہ امام خطبہ دے رہا ہو...... کہا چپ! تو جس نے لغو بات کی۔ اس باب میں ابن ابی اوفیٰ اور جابر رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور علماء یہ بات مکروہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کلام کرے درآں حالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو پس انہوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص بات کرے تو اسے بھی صرف اشارے سے منع کردے اور علماء نے سلام کا جواب دینے اور چھینک کا جواب دینے کے بارے میں اختلاف کیا ہے بعض علماء اجازت دیتے ہیں دورانِ خطبہ سلام کا جواب دینے اور چھینک کا جواب دینے کی۔ امام احمد واسحٰق کا بھی یہی قول ہے جبکہ بعض علماء، تابعین وغیرہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

باب ماجاء فی کراهية التَّخَطّی يومَ الجمعةِ

جمعہ کے دن (لوگوں کی) گردنیں پھلانگنا مکروہ ہے

☆حدثنا ابو كُرَيْبٍ حَدَّثَنا رِشْدِينُ بنِ سَعْدٍ عن زَبَّانَ بن فائِدٍ عن سَهْل بن مُعَاذِ بن أنَسٍ الجُهَنِيِّ عن ابيه قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: مَن تَخَطّٰى رِقابَ النَّاس يوم الجمعةِ اتُّخِذَ جِسراً اِلى جهنَّم۔ قال:وفي الباب عن جابرٍ۔قال ابو عيسى: حديث سهل بن مُعَاذ بن انسٍ الجُهَنِيِّ حديث غريبٌ، لانعرفُه اِلَّا من حديث رِشْدِين بن سعدٍ۔ والعملُ عليه عند اهل العلم: كرهوا ان يتخطّٰى الرجلُ رقابَ الناس يومَ الجمعةِ وشدَّدوا في ذلك۔ وقد تكلَّم بعضُ اهلِ العلم في رِشْدِينَ بنِ سعدٍ، وضَعَّفه مِن قِبلِ حفظه۔

﴿ترجمہ﴾

سہل بن معاذ بن انس جہنی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے وہ جہنم کی طرف جانے کیلئے پل بنایا جائیگا۔ اس باب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سہل بن معاذ بن انس جہنی کی حدیث غریب ہے ہم اس حدیث کو رشدین بن سعد کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور اسی حدیث پر اہل علم کا عمل ہے کہ جمعہ کے دن گردنیں پھلانگنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ سختی کرتے ہیں۔ بعض علماء نے رشدین بن سعد کے متعلق کلام کیا ہے وہ رشدین کو ضعف قرار دیتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

یوم جمعہ کی قید اتفاقی ہے: (قوله من تخطى رقاب الناس يوم الجمعة اتخذ جسرا الى جهنم) کیونکہ اس دن ہجوم

بہت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا یہ فعل ہر نماز میں منع ہوگا نیز جو علماء مفہوم مخالف کے قائل نہیں انہیں تو جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

لفظ اتخذ کو دو طرح ضبط کیا گیا ہے: لفظ اتخذ کو روایۃً اور درایۃً مبنی للمفعول (مجہول کا صیغہ) ضبط کیا گیا ہے یعنی اس شخص کو آخرت میں پل بنا دیا جائیگا جس پر لوگ چڑھ کر جائینگے کیونکہ یہ بھی لوگوں کے کندھے پر چڑھا تھا۔ دوسرے قول میں یہ لفظ اتخذ فعل معروف کا صیغہ ہے یعنی یہ شخص اپنے آپ کو جہنم کی طرف پل بنانے کا سبب بنے گا دونوں صورتوں میں یہ اس کے فعل کا بدلہ ہے کہ یہ لوگوں کی گردنوں پر چڑھ کر ان کی تحقیر کرتا تھا اور بسا اوقات اسکا پاؤں بھی کسی کو لگ جاتا ہوگا (لہٰذا آخرت میں اس کو ایسا ہی بدلہ ملے گا)۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی کَرَاهِيَةِ الْاِحْتِبَاءِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ

باب امام کے خطبہ کے دوران احتباء مکروہ ہے

☆حدثنا محمد بن حمید الرازی وعباس بن محمد الدوری قالا: حَدَّثَنَا ابو عبد الرحمٰن المقری عن سعید بن ابی ایوب حدثنی ابو مرحوم عن سهل بن معاذ عن ابیه: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم نَهَی عن الحَبْوَةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ والامامُ يخطبُ۔ قال ابو عيسى: وهٰذا حديث حسن۔ وابو مَرْحُومٍ اسمه عبد الرَّحيم بنُ مَيْمُون۔ وقد كره قومٌ من اهل العلم الحبوة يَوْمَ الْجُمُعَةِ والامام يخطب۔ ورَخَّصَ فی ذٰلك بعضهم۔ منهم عبد اللّٰه بن عمرَ وغيرهُ۔ وبه يقولُ احمدُ، واسحٰقُ: لَايَرَيَانِ بِالْحَبْوَةِ والامام يَخْطُبُ بأساً۔

﴿ترجمہ﴾

سہل بن معاذ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران حبوۃ کی ممانعت فرمائی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے اور ابو مرحوم کا نام عبدالرحیم بن میمون ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت جمعہ کے خطبہ کے دوران حبوۃ کو مکروہ سمجھتی ہے۔ جبکہ بعض حضرات جن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ بھی شامل ہیں نے اس کی اجازت دی ہے۔ امام احمد و اسحٰق بھی اسی کے قائل ہیں اور یہ دونوں ائمہ حبوۃ بنانے میں جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

﴿تشریح﴾

احتباء کی کیفیت اور اسکا شرعی حکم: احتباء کی کئی صورتیں ہوتی ہیں: ۱۔ دونوں ہاتھوں کے ذریعہ احتباء کرنا، ۲۔ رومال

وغیرہ کے ذریعہ یہ صورت بنانا کہ دو پاؤں کھڑے کر کے سرین پر بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو رومال سے باندھ دے۔ احتباء کی دونوں صورتیں کبھی تو تکبر کی وجہ سے ہوتی ہیں تو یہ ممنوع ہونگی اور کبھی انکساری کی ہیئت میں ہوتی ہیں جسکا مقصد جسم کو آرام پہنچانا ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ مکروہ تنزیہی ہوگا نہ کہ مکروہ تحریمی اور اس مکروہ ہونے کی علت یہ ہے کہ کہیں اسے اس حالت میں نیند نہ آجائے تو سونے کی وجہ سے خطبہ کے سننے میں کوتاہی لاحق ہو جائیگی، ہاں جو شخص نیند سے مامون ہے تو اس کیلئے اس طرح بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں صحابہ کرامؓ سے دورانِ خطبہ جو حبوۃ کا ثبوت [1] ملتا ہے اس کو اسی پر محمول کیا جائیگا کہ انہیں یقین تھا کہ ہمیں نیند نہیں آئیگی اس طرح حبوہ کے متعلق مختلف احادیث میں تطبیق ہو جائیگی جیسا کہ بعض روایات میں حبوۃ سے منع کیا گیا ہے اور بعض میں حبوۃ کو مستحب و جائز رکھا گیا ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ رَفْعِ الْاَيْدِى عَلَى الْمِنبَرِ

باب (خطبہ کے دوران) منبر پر دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے

☆حدثنا احمد بن مَنيع حَدَّثَنَا هشيم اخبرنا حُصَيْنٌ قال: سَمِعْتُ عمارة بن رويبة الثقفي وبشر بن مروان يَخْطُبُ، فَرَفَعَ يَدَهُ فِي الدُّعَاءِ، فَقَالَ عُمَارَةُ: قَبَّحَ اللّٰهُ هَاتِينِ الْيُدَيَّتَيْنِ الْقُصَيِّرَتَيْنِ القد رايتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وما يزيدُ على ان يقولَ هٰكذا: واشار هشيم بالسَّبَّابَةِ۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيحٌ۔

---

[1] یعنی صحابہ کے حبوۃ کی یہی توجیہ ہوگی چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ ابن عمر، انس، شریح وغیرہ حبوۃ کیا کرتے تھے، اور یعلی بن شداد سے مروی ہے کہ میں حضرت معاویہ کے ساتھ بیت المقدس حاضر ہوا آپ نے ہمیں جمع کیا تو میں نے بغور دیکھا کہ امام کے خطبہ کے دوران کثیر صحابہ کرامؓ مسجد میں احتباء کئے ہوئے تھے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ مجھے صرف عبادۃ بن انس کے بارے میں یہ روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے احتباء کو مکروہ بتایا ہے اور کسی بھی شخص نے اسے مکروہ نہیں کہا۔

دورانِ خطبہ حبوۃ والی احادیث کی توجیہات: علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم کے مذہب میں احتباء مکروہ نہیں، زرقانی نے عدم کراہت کو ائمہ اربعہ و دیگر علماء کا مذہب بتایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جمہور کے نزدیک یہ فعل جائز ہے، جن احادیث میں حبوۃ کی ممانعت ہے اس کی توجیہ میں شراح کا اختلاف ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ان احادیث کی بہت عمدہ توجیہ ذکر فرمائی ہے جس سے ان میں تطبیق ہو جاتی ہے بعض علماء نے نہی عن الحبوۃ والی حدیث کو ضعیف کہا ہے اور بعضوں نے منسوخ۔ امام طحاویؒ نے چوتھی توجیہ یہ کی ہے کہ دورانِ خطبہ نیا حبوۃ بنانا منع ہے کیونکہ یہ خطبہ کے دوران ایک شغل کرنا لازم آئیگا کثیر صحابہ سے مسجد میں اس حبوۃ کا ذکر ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحابہ خطبہ سے پہلے اپنا حبوۃ بنالیا کرتے تھے۔ ھٰکذا فی الاوجز

﴿ترجمہ﴾

احمد بن منیع ،ہشیم سے اور وہ حصین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے عمارہ بن رویبہؓ سے سنا کہ بشر بن مروان مدینہ کا گورنر خطبہ دے رہا تھا اس نے دعا میں ہاتھ اٹھائے تو عمارہ بن رویبہؓ نے اسے بد دعا دی کہ اللہ تعالیٰ ان چھوٹے ہاتھوں کو ہلاک کرے۔ بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے زیادہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور (حدیث کے راوی) ہشیم نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

صحابی کے قول کی تشریح: صحابی عمارہ بن رویبہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول "وما یزید علی ان یقول" کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر ہاتھوں کو بھی نہیں اٹھاتے تھے تو اس طرح استدلال صحیح ہوگیا۔خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دورانِ خطبہ دعا پڑھتے ہوئے یا عام حالت میں ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے ہاں کلمہ توحید کے وقت اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے تھے تو بشر بن مروان کا منبر پر دعا کے دوران ہاتھوں کو اٹھانا یہ بدعت والا کام ہوا جس پر ان کا انکار کرنا ضروری تھا۔

باب ماجاء فی اذان الجمعة

باب جمعہ کی اذان کے بیان میں

☆حدثنا احمد بن منیع حَدَّثَنَا حماد بن خالد الخیاط عن ابن ابی ذِئبٍ عن الزُّهْرِیِّ عن السَّائِبِ بن یزیدَ قال: کان الاَذَانُ علی عَهْدِ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وابی بکرٍ وعمر: اِذا خَرَجَ الإمامُ وإذا اُقِیمَتِ الصلاةُ، فلمّا کان عثمانُ رضی اللّٰه عنه زاد النِّدَاءَ الثَّالِثَ علی الزَّوْرَاءِ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیثٌ حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر کے زمانے میں (جمعہ کی) اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام نکلتا تھا پھر دوسری اذان یعنی اقامت نماز جمعہ سے پہلے ہوتی تھی پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے مقام زوراء پر تیسری اذان زیادہ کی (اقامت کو بھی اذان کہتے ہیں اسلئے اقامت کو ملا کر اذانِ عثمانی، اذان ثالث ہوئی)۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

ایک وہم کا ازالہ: (کان الاذان فی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابی بکر وعمر رضی الله عنهما اذا خرج الامام اقیمت الصلوٰۃ) اقیمت الصلوٰۃ کے جملہ کو اسلئے زیادہ کیا گیا ہے کہ یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ امام جمعہ کے نکلتے ہی اذان ہونی چاہیئے، چاہے امام کا مقصد نماز جمعہ پڑھانے کیلئے جانا نہ ہو تو اقیمت الصلوٰۃ لا کر بتا دیا کہ امام جب خطبہ دینے کیلئے نکلے تب اذان ہوگی اور صلوٰۃ سے مراد حکماً صلوٰۃ ہے یعنی خطبہ تو مطلب ہوا کہ خطیب کے نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے نکلتے ہی اذان جمعہ کہی جاتی اور اس کے فوراً بعد جمعہ کا خطبہ شروع ہوجاتا۔ (از مترجم: ہمارے سامنے ترمذی مصححة بتصحیح شیخ احمد شاکر بیروت کے نسخے میں کان الاذان فی عهد رسول اللهﷺ وابی بکرؓ وعمرؓ اذا خرج الامام ...... کے بعد...... واذا اقیمت الصلوٰۃ کے الفاظ ہیں یعنی خروج امام کے بعد اذان دی جاتی اور نماز کے شروع میں اقامت (تکبیر) کہی جاتی یہ نسخہ بالکل بے غبار ہے۔۱۲)

اذانِ ثالث کا اضافہ حضرت عثمان غنیؓ نے کیا یا حضرت عمرؓ نے: (قوله زاد عثمان) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس اذان کا اضافہ فرمایا یہ ان کی اپنی رائے نہ تھی بلکہ صحابہ کی موجودگی اور ان کے اتفاق رائے سے اس اذان کا اضافہ کیا گیا، بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں الصلوٰۃ جامعة الصلوٰۃ جامعة کہکر لوگوں کو بلایا جاتا تھا تو جب لوگ بہت زیادہ ہوگئے تو بعضوں کو تو الصلوٰۃ الصلوٰۃ کے الفاظ سنائی دیتے اور بعض نہیں سن پاتے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ سے مشورہ کیا اور مقامِ زوراء[1] (جو کہ مسجد کے بائیں جانب تھا) پر اذانِ ثالث کا اضافہ فرمایا۔

زوراء کیا چیز تھی؟ متعدد اقوال: یہ زوراء کیا چیز تھی تو ایک قول میں دیوار کا نام اور دوسرے قول میں بلند ٹیلے کا نام تھا اور تیسرے قول میں ایک بلند جگہ کو کہتے تھے ان اقوال میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ یہ بلند ٹیلوں کی جگہ پر ایک بلند دیوار ہوگی

اذانِ اول پر بیع وشراء حرام ہے: اسی اذان کے بعد[2] خرید وفروخت حرام ہوجاتی ہے اور جمعہ کی تیاری ضروری ہوجاتی

---

[1] معجم البلدان میں ہے "الزوراء" مسجد کے قریب مدینہ منورہ کے بازار کیپاس ایک جگہ ہے۔ داؤدی کہتے ہیں کہ وہ مینارے کی طرح ایک بلند جگہ ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ مدینہ کے بازار کا نام ہی زوراء تھا۔

[2] درمختار میں بھی اس قول کو اصح قرار دیا گیا ہے کہ اذان اول کے ہوتے ہی خرید وفروخت کو چھوڑنا اور جمعہ کی تیاری ضروری ہے اگرچہ یہ اذان اول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ثابت نہیں تھی بلکہ یہ اذان اول حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شروع کی گئی ہے۔

اذان اول کا مصداق کونسی اذان ہے؟: علامہ شامیؒ شرح منیة المصلی سے نقل فرماتے ہیں کہ اذان اول سے کونسی اذان مراد ہے اسکی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ اذان اول سے مراد مشروعیت کے اعتبار سے جو اذان پہلے مشروع ہوئی یہ وہی اذان ہے جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے کیونکہ یہ اذان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین کے زمانے میں مشروع تھی بعد میں حضرت عثمانؓ نے مقامِ زوراء پر اذانِ ثانی کا اضافہ فرمایا جبکہ لوگوں کا مجمع بہت بڑھ چکا تھا لیکن راجح قول کے مطابق اذان اول سے مراد وقت کے اعتبار سے اذان اول ہے جو کہ وقت زوال کے بعد مینارہ پر دی جاتی ہے (اسی اذان پر خرید وفروخت اور سعی الی الجمعہ کا مدار ہے)۔

ہے کیونکہ قرآن کریم کی آیت میں یہ الفاظ ہیں "اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر الله" یہ اذان بھی تو جمعہ والے دن نماز کیلئے بلا رہی ہے۔

باب ماجاء فی الکلام بعد نزول الامام من المنبر

باب امام کے منبر سے اترنے کے بعد گفتگو کرنے کے بیان میں

☆حدثنا محمدبن بشار، حدثنا ابوداؤد الطیالسی حَدَّثَنَا جریربن حازم عن ثابت عن انس بن مالك قال کان النبی صلی الله علیه وسلم یکلم بالحاجة اذا نزل من المنبر ـقال ابو عیسی هذاحدیث لانعرفه الا من حدیث جریربن حازم قال وسمعت محمداً یقول وهم جریربن حازم فی هذاالحدیث والصحیح ما روی عن ثابت عن انس قال اقیمت الصلاة فاخذرجل بید النبیﷺ فمازال یکلمه حتی نعس بعض القوم قال محمدوالحدیث هو هذا وجریربن حازم ربما یهم فی الشیٔ وهو صدوق ـقال محمد وهم جریربن حازم فی حدیث ثابت عن انس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا اقیمت الصلاة فلا تقوموا حتی ترونی قال محمد و یروی عن حماد بن زید قال کنا عند ثابت البنانی فحدث حجاج الصواف عن یحیی بن ابی کثیر عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابیه عن النبی صلی الله علیه عسلم قال اذا اقیمت الصلاة فلا تقوموا حتی ترونی فو هم جریر فظن أن ثابتاً حدثهم عن انس عن النبیﷺ

☆حدثنا الحسن بن علی الخلا ل حدثناعبدالرزاق أخبرنا معمر عن ثابت عن انس قال لقدرأیت النبی صلی الله علیه وسلم بعد ما تقام الصلاة یکلمه الرجل یقوم بینه وبین القبلة فما یزال یکلمه فلقد رأیت بعضهم ینعس من طول قیام النبی صلی الله علیه وسلم له قال أبوعیسی هذا حدیث حسن صحیح

﴿ترجمه﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترنے کے بعد بوقت ضرورت گفتگو فرما لیتے تھے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو ہم جریر بن حازم کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے ، میں نے امام (محمد بن اسماعیل) بخاری سے سنا کہ جریر بن حازم کو اس حدیث میں وہم ہوگیا ہے اور صحیح وہ واقعہ ہے جو ثابت نے انس سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ اقامت کہی جانے کے بعد ایک شخص (شاید یہ فرشتہ تھا یا کسی قبیلے کا سردار تھا۔معارف السنن) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور باتیں کرنے لگا یہاں تک کہ بعض لوگ اونگنے لگے۔امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ (صحیح) حدیث تو یہ ہے اور جریر بن حازم کو کبھی کسی حدیث میں وہم بھی ہو جاتا

ہے اگر چہ وہ صدوق ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ہی جزیر کے وہم کی مثال میں کہتے ہیں کہ جریر بن حازم کو ثابت کی انس سے مروی اس حدیث میں بھی وہم ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کیلئے اقامت کہی جائے تو آپ لوگ نہ کھڑے ہوں یہاں تک کہ مجھے (حجرہ سے نکلتا ہوا) نہ دیکھ لیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حماد بن زید سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم ثابت بنانی کے پاس تھے تو حجاج صواف نے یحییٰ بن ابی کثیر سے انہوں نے عبداللہ بن ابی قتادہ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب نماز کی تکبیر کہی جائے تو تم لوگ نماز کیلئے اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک مجھے (حجرہ سے نکلتا ہوا) دیکھ نہ لو۔ اس پر جریر کو وہم ہو گیا کہ یہ حدیث ثابت نے انس سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے (تو اس روایت میں جریر کو اس طرح وہم ہوا کہ یہ روایت تو ابوقتادہ صحابی سے مروی تھی مگر جریر نے سمجھا کہ ثابت بنانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نماز کی اقامت ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے لگا اور وہ قبلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ بعض حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے اونگھنے لگتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے (اور منبر سے اترنے بعد گفتگو کرنے کی روایت جریر راوی کا وہم ہے)۔

﴿تشریح﴾

(یتکلم بالحاجة اذانزل من المنبر) جریر بن حازم اس جملہ کے نقل کرنے میں متفرد[1] ہیں، نیز اپنے استاذ کے

---

[1] **حدیث باب میں جریر بن حازم کے وہم کی وضاحت:** ابوالطیب فرماتے ہیں کہ اس حدیث یتکلم بالحاجة اذا نزل عن المنبر میں جریر راوی کو وہم ہوا ہے واقع میں حدیث عن ثابت عن انس کی سند سے اس طرح مروی ہے کہ نماز کی اقامت کہے جانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص نے ہاتھ پکڑ کر آپ سے طویل گفتگو فرمائی، یہ طویل قصہ ہے۔ اس حدیث میں منبر سے اتر کر کلام کرنے کا ذکر نہیں بلکہ اس صحیح السند حدیث کے ظاہر کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ واقعہ عشاء کی نماز کا ہے کیونکہ اس روایت میں لوگوں کے اونگھنے کا ذکر بھی ہے۔ آگے امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے ذکر کیا ہے کہ جریر راوی کو صرف اسی حدیث میں وہم نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری حدیث میں بھی جریر راوی کو وہم ہوا ہے کہ جریر راوی نے عن ثابت عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے یہ دوسری حدیث نقل کی ہے، "اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی" تو اس حدیث میں درحقیقت ثابت راوی حضرت انسؓ سے اس حدیث کو نقل نہیں کر رہے بلکہ ثابت البنانی راوی اس مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے جس مجلس میں یہ حدیث ابوقتادہؓ سے نقل کی جارہی تھی (تو جریر راوی کو وہم ہو گیا اور انہوں نے سمجھا کہ ثابت بنانی اس حدیث کو انسؓ سے نقل فرما رہے ہیں۔ از مترجم)

دوسرے شاگردوں کے مقابلہ میں جریر راوی[1] حفظ اور اتقان میں بڑھے ہوئے بھی نہیں تھے اور دوسرے مقام سے بھی جریر کا وہم ہونا ثابت ہو رہا ہے جیسا کہ مصنف نے اس دوسرے مقام کو بھی بیان کر دیا ہے (کہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز کی اقامت کے بعد کسی شخص سے گفتگو فرمائی تھی جریر راوی نے یہ نقل کر دیا کہ منبر سے اترنے کے بعد گفتگو فرمائی ہے) لہٰذا مصنف نے جریر کی اس روایت کو وہم قرار دیا ہے۔

اہم تنبیہ: یاد رکھیں کہ نفسِ مسئلہ کے اعتبار سے یہ حکم صحیح ہے کہ خطیب منبر سے اتر کر گفتگو کر سکتا ہے کیونکہ جب دوسری روایت سے یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اقامت کے بعد ضرورت کی بناء پر گفتگو فرمایا کرتے تھے تو خطبہ کے بعد بھی بقدرِ ضرورت کلام کی اجازت ہوگی کیونکہ جمعہ اور دیگر نمازوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي الْقِرَاءَةِ فِي صَلَاةِ الْجُمُعَةِ

باب جمعہ کی نماز میں قرأت (کی جانے والی سورتوں) کے بیان میں

☆حدثنا قتيبة حدثناحاتم بن اسمعيل عن جعفر بن محمد عن أبيه عن عبيدالله بن ابى رافع مولى رسول الله صلى اللى عليه وسلم قال استخلف مروان أبا هريرة على المدينة وخرج الى مكة فصلى بنا ابو هريرة يوم الجمعة فقرأ سورة الجمعة وفى السجدة الثانية اذا جائك المنافقون قال عبيدالله فأدركت أباهريرة فقلت له تقرأ بسورتين كان عَلِيٌّ يَقْرَأُبِهِمَا بالكوفة فقال أبوهريرة إِنِّي سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ بهما وفى الباب عن ابن عباس والنعمان بن بشير وابى عنبة الخولانى قال ابو عيسى حديث ابى هريره حديث حسن صحيح وروى عن النبى صلى الله عليه وسلم أنه كان يقرأفى صلاة الجمعة بسبح اسم ربك الاعلى و هل أتاك حديث الغاشية۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبید اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابو رافع کے صاحبزادے سے روایت ہے کہ مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود مکہ چلا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہمیں جمعہ کے

---

[1] یعنی جریر راوی اپنے استاذ کے دوسرے شاگردوں کے ہم پلہ بھی نہیں کہ ان کی روایت قابلِ اعتبار ہو لغت میں قابل الشئی بالشئی کہا جاتا ہے جب ایک شئی دوسری شئی کے معارض ہوتا کہ دونوں کے درمیان برابری یا مخالفت سمجھ میں آجائے۔

دن (جمعہ کی) نماز پڑھائی اور (پہلی رکعت میں) سورۃ الجمعۃ پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۃ المنافقون پڑھی۔ عبید اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ آپ نے جو دونوں سورتیں پڑھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کوفہ میں یہی پڑھتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (جمعہ کی نماز میں) یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ اس باب میں حضرت ابن عباس، نعمان بن بشیر اور ابو عنبہ خولانی رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ فقلت تقرأ بسورتین کان علیؓ یقرأ بهما) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ سائل کو یہ تنبیہ ہو جائے کہ میرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کے طور پر ہے اسلئے انہوں نے یہ حدیث سنائی۔

باب ماجاء فی مایقرافی صلاة الصبح یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن فجر کی نماز میں کونسی سورتیں پڑھنی چاہئیں

☆حدثنا علی بن حجر أخبرنا شریك عن مخول بن راشد عن مسلم البطین عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأ یوم الجمعة فی صلاة الفجر الم تنزیل السجدة وهل أتی علی الانسان قال وفی الباب عن سعد وابن مسعود وابی هریره قال ابو عیسی حدیث ابن عباسٍ حدیث صحیح وقدرواه سفیان الثوری وشعبة وغیره عن مخول۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ السجدۃ (الم تنزیل) اور سورۃ الدھر (وھل اتی علی الانسان) پڑھا کرتے تھے۔ اس باب میں سعد، ابن مسعود، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسے سفیان ثوری، شعبہ اور کئی حضرات نے مخول سے روایت کیا ہے۔

﴿تشریح﴾

جمعہ والے دن سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقین کی تلاوت اور جمعہ کے دن فجر کی نماز میں تنزیل سجدہ اور سورۃ دھر پڑھنے کی وجہ اور اسکی مناسبت اس دن کے ساتھ یہ ہے کہ ان سورتوں میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے اور مبدا معاد اور آخرت کی نعمتوں کی یاددہانی کی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سورتوں کے پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر ان کو پڑھا کرتے تھے نہ کہ ہمیشہ (از مترجم: حافظ نے فتح الباری میں طبرانی کی روایت میں عبداللہ بن مسعود سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل و کان یدیم ذلک کے الفاظ ذکر کئے ہیں پھر اس پر کلام کیا ہے۔ دیکھئے صحیح بخاری باب ما یقرأ فی صلوٰۃ الفجر یوم الجمعة)۔

باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعة و بعد ها

باب جمعہ سے پہلے اور بعد کی سنتوں کا بیان

☆حدثنا ابن ابی عمر حَدَّثَنَا سفیان بن عیینة عن عمرو بن دینار عن الزهری عن سالم عن ابیه عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان یصلی بعد الجمعة رکعتین قال وفی الباب عن جابر قال ابو عیسی حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیح وقدروی عن نافع عن ابن عمر ایضاً والعمل علی هذا عند بعض اهل العلم وبه یقول الشا فعی وأحمد

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا اللیث عن نافع عن ابن عمر أنه کان اذا صلی الجمعة انصرف فصلی سجدتین فی بیته ثم قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصنع ذلک قال أبو عیسی هذا حدیث حسن صحیح

☆حدثنا ابن أبی عمر حَدَّثَنَا سفیان عن سهیل بن أبی صالح عن ابیه عن أبی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من کان منکم مصلیا بعد الجمعة فلیصل اربعا قال أبو عیسی هذا حدیث حسن صحیح

☆حدثنا الحسن بن علی حَدَّثَنَا علی بن المدینی عن سفیان بن عیینة قال کنا نعد سهیل بن ابی صالح ثبتا فی الحدیث والعمل علی هذا عند بعض أهل العلم وروی عن عبدالله بن مسعود انه کان یصلی قبل الجمعة اربعا وبعدها اربعا وقدروی عن علی بن أبی طالب رضی الله عنه انه امر ان یصلی بعد الجمعة رکعتین ثم أربعا وذهب سفیان الثوری وابن المبارک الی قول ابن مسعود وقال اسحق ان صلی فی المسجد یوم الجمعة صلی أربعا وان صلی فی بیته صلی رکعتین واحتج بان النبی صلی الله علیه وسلم کان یصلی بعد الجمعة رکعتین فی بیته وحدیث النبی صلی الله علیه وسلم من

كان منكم مصليا بعد الجمعة فليصل أربعا قال أبوعيسى وابن عمر هو الذى روى عن النبى صلى الله عليه وسلم انه كان يصلى بعد الجمعة ركعتين فى بيته وابن عمر بعد النبى صلى الله عليه وسلم صلى فى المسجد بعد الجمعة ركعتين وصلى بعد الركعتين أربعاًحدثنا بذلك ابن ابى عمرحدثناسفيان بن عيينة عن ابن جريج عن عطاء قال رأيت ابن عمر صلى بعدالجمعة ركعتين ثم صلى بعد ذلك أربعا

☆حدثنا سعيد بن عبدالرحمن المخزومى حَدَّثَنَا سفيان بن عيينة عن عمروبن دينارقال مارأيت أحداًأنص للحديث من الزهرى وما رأيت أحداً الدنانيروالدراهم أهون عليه منه ان كانت الدنانير و الدراهم عنده بمنزلة البعر قال ابوعيسى سمعت ابن ابى عمرقال سمعت سفيان بن عيينة يقول كان عمروبن دينار اسن من الزهرى۔

﴿ترجمه﴾

سالم اپنے والد اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نماز) جمعہ کے بعد دو رکعت نماز (سنت) پڑھتے تھے۔ اس باب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بواسطہ نافع بھی مروی ہے اور بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔

☆ نافع ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ (ابن عمر رضی اللہ عنہما) نماز جمعہ پڑھنے کے بعد گھر لوٹے تو گھر میں دو رکعتیں پڑھیں اور پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جمعہ (کی نماز) کے بعد نماز پڑھے تو اسے چار رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ روایت کی ہم سے حسن بن علی نے انہوں نے کہا خبر دی ہم کو علی بن مدینی نے انہوں نے سفیان بن عیینہ سے انہوں نے کہا ہم سہیل بن ابی صالح کو حدیث میں مضبوط اور قابل اعتماد راوی سمجھتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعت سنت پڑھتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے جمعہ کے بعد پہلے دو رکعتیں اور پھر چار رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ سفیان ثوریؒ اور ابن مبارکؒ نے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ اسحق کہتے ہیں کہ اگر جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے بعد مسجد میں نماز پڑھے تو چار رکعت اور اگر گھر پر

پڑھے تو دو رکعت پڑھے اور اسحٰق نے اسی (حدیث فعلی) سے استدلال کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے ایک اور حدیث (جو قولی ہے) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں جو شخص جمعہ کی نماز کے بعد کوئی نماز پڑھنا چاہے تو چار رکعت پڑھے تو پہلی حدیث گھر میں سنتیں پڑھنے پر اور دوسری حدیث مسجد میں پڑھنے پر محمول ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ہی یہ (فعلی) حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اور پھر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں دو رکعتیں پڑھی ہیں اور پھر چار رکعت پڑھیں۔ (از مترجم: بظاہر یہاں سے امام ترمذی امام اسحٰق پر رد کر رہے ہیں جنہوں نے گھر اور مسجد میں فرق کیا ہے)۔

☆ ہم سے یہ بات بیان کی ابن ابی عمر نے ان سے سفیان نے ان سے ابن جریج نے ان سے عطاء نے کہ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جمعہ کے بعد پہلے دو رکعتیں اور اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا سعید بن عبدالرحمٰن مخزومی، سفیان بن عیینہ سے اور وہ عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو نے کہا میں نے زہری سے بہتر حدیث بیان کرنے والا نہیں دیکھا اور نہ ہی دولت کو ان سے زیادہ حقیر جاننے والا دیکھا اور ان کے نزدیک درا ہم اور دنانیر اونٹ کی مینگنی کے برابر حیثیت رکھتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بحوالہ سفیان بن عیینہ سنا کہ سفیان کہا کرتے تھے کہ عمر بن دینار زہری سے بڑے تھے۔

﴿تشریح﴾

جمعہ والے دن کتنی سنتیں پڑھنی چاہیئے اس کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں۔

نماز جمعہ کے بعد کی سنتوں کے متعلق اختلاف: بعض احادیث سے جمعہ کے بعد دو[1] رکعت سنتوں کا ثبوت ملتا ہے اور بعض سے چار رکعتوں کا۔ لہٰذا امام ابوحنیفہؒ نے اس قول کو اختیار کیا ہے جس میں احتیاط[2] پائی جاتی ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے جمعہ کے بعد چھ رکعت کے سنت ہونے کا قول کیا ہے یہ قول بھی حدیث سے ثابت ہے۔

---

[1] **جمعہ سے پہلے کی سنتوں کا ثبوت:** نہ تو مصنف نے جمعہ سے پہلے سنن موکدہ کے متعلق کوئی بھی مرفوع روایت ذکر کی نہ ہی حضرت گنگوہیؒ نے اس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا، یہ مسئلہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے اس کو اوجز میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ابن قیم اور ان کے متبعین نے جمعہ کی نماز سے پہلے والی سنتوں کا انکار کیا ہے، جمہور کے نزدیک جمعہ سے پہلے چار رکعت سنتیں ثابت ہیں ان علماء کے اقوال اور ان کے دلائل اوجز میں تفصیل سے نقل کئے گئے ہیں۔ (از مترجم: اوجز المسالک ص ۲۴۸: الجزء الثالث، تالیفاتِ اشرفیہ ملتان پر ہے" جمعہ سے پہلے سنتوں کے ثبوت کے متعلق علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جمعہ کے بعد چھ سنتوں میں پہلے دو رکعت سنتیں پڑھنی چاہئیں پھر چار: البتہ انکا یہ کہنا کہ پہلے چار سنتیں پڑھے پر دو رکعت تو ہمیں ابھی تک ایسی کوئی روایت[1] نہیں ملی جو اس مذہب کی مؤید ہو بلکہ صحابہؓ سے اسکے برعکس ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ جمعہ کی نماز عید کی نماز کی طرح ہے اس سے پہلے سنت پڑھنے کا ثبوت نہیں کیونکہ عہدِ نبوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف ایک اذان ہوتی تھی اور حضرت بلالؓ کی اذان کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ شروع فرما دیتے اور کوئی بھی دو رکعات سنتیں نہیں پڑھتا تھا...... تو صحابہؓ سنتیں کب پڑھتے ہونگے۔ علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اس پر اعتراض کیا ہے...... جمہور کے نزدیک جمعہ سے پہلے سنتوں کا ثبوت ہے، رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لاتے ہی اذان دی جاتی اور خطبہ شروع ہو جاتا، یہ بات صحیح ہے لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے کی سنتیں گھر میں پڑھ کر باہر تشریف لاتے ہوں...... خود امام مالکؒ جمعہ سے پہلے سنتیں پڑھتے تھے...... حنابلہ کے ہاں جمعہ سے پہلے چار رکعات مستحب ہیں سنت موکدہ نہیں ہیں...... شافعیہ کے مذہب میں جمعہ ظہر کی نماز کی طرح ہے لہٰذا اس سے پہلے دو رکعات پڑھنا سنتِ موکدہ اور چار رکعات پڑھنا مستحب ہے۔ حنفیہ کے یہاں ظہر سے پہلے اور جمعہ سے پہلے چار رکعات پڑھنا سنت موکدہ ہیں۔ ہمارے دلائل: (۱) طحاوی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ میں۔ اربع رکعات بعد الزوال والی حدیث میں هذه ساعة تفتح ابواب السماء فيها الخ سے علامہ شامی نے استدلال کیا ہے کہ جمعہ اور ظہر ہر ایک نماز سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت ہے۔ (۲) ابن ماجہ میں ہے كان النبي ﷺ يركع قبل الجمعة اربعا الخ۔ (۳) ابوداؤد میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ سے پہلے لمبی نماز پڑھتے اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھتے اور فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے۔ (۴) حافظ نے تلخیص میں فرمایا کہ جمعہ سے پہلے کی سنتوں کے متعلق سب سے زیادہ اصح روایت ابن ماجہ کی ہے کہ سلیک غطفانی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے دوران تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا اصليت ركعتين قبل ان تجيء۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ قبل ان تجيء کے لفظ کو تصحیف کہا گیا ہے اور فرمایا صحیح لفظ قبل ان تجلس ہے۔ (۵) عبداللہ بن مسعودؓ اور علیؓ سے طبرانی نے نقل کیا ہے۔ نیز ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فعل بھی ہے۔ (۶) طبرانی نے اپنی اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے دو رکعتیں اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ اس کے بعد حافظ نے فتح الباری میں متعدد روایات ذکر کی ہیں اور ان پر کلام کیا ہے۔ (۷) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے من اغتسل ثم اتى الجمعة فصلى ما قدر له۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمرؓ، ابن مسعودؓ، عمر بن عبدالعزیز، ابراہیم نخعی اور ابومجلز کے آثار نقل کئے ہیں۔ (اوجز ص ۲۵۲)

[2] امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں چار رکعت سنتیں جمعہ کے بعد پڑھی جائیںگی یہی محتاط مذہب ہے کیونکہ اسمیں دو رکعتیں بھی آ گئیں۔

[1] **قاضی صاحب کے قول کی دلیل:** بعض علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ حدیث شریف میں ایک نماز کے بعد اسی کے مثل دوسری نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اس وجہ سے پہلے چار رکعت پڑھنی چاہیئے، بدائع میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک پہلے چار سنتیں پڑھیگا پھر دو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ اس کی علت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد اسی کے مثل دو رکعت سنتیں نہ پڑھے اور بحر کے حاشیہ میں ذخیرہ کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا گیا ہے کہ چھ رکعتیں سنتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح پڑھتے کہ پہلے دو رکعت پڑھتے پھر چار رکعتیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نماز کے بعد حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ پہلے دو رکعت پڑھتے پھر چار۔ بعض روایات میں "من کان مصلیا بعد الجمعة فلیصل اربعا" کے الفاظ ہیں اس سے بعض حضرات نے یہ اشکال کیا ہے کہ اس حدیث میں اختیار دیا گیا ہے حالانکہ امام صاحب تو چار رکعت کو متعین طور ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ان چار رکعت کے متعین ہونے کے منافی نہیں کیونکہ اس طرح کے الفاظ کبھی کبھار ایسے مواقع پر بھی استعمال ہوتے ہیں جو وجوب کیلئے نہیں ہوتے اب مطلب یہ ہوگا کہ تم میں سے جو شخص سنتیں ادا کرنا چاہے وہ چار رکعت ادا کرے۔

(قال ابو عیسیٰ وابن عمر هو الذی روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان یصلی بعد الجمعة رکعتین) اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اس حدیث کو نقل کرتے ہیں اور انکا عمل خود اس طرح ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے بعد پہلے مسجد میں دو رکعتیں پڑھتے پھر چار، تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کے خیال میں چھ رکعت سنتیں ہیں کیونکہ چار رکعتوں کی سنیت دو رکعتوں کے مسنون ہونے سے کم درجہ کی ہے۔ (ما رایت احدا انص للحدیث من الزهری) یعنی زہری حدیث کو سب سے زیادہ واضح ومفصل بیان کرنے والے ہیں ان زہری کا ذکر اس باب کی سب سے پہلی حدیث کی سند میں آیا ہے۔

(قوله وکان عمرو بن دینار اسن من الزهری) یہ جملہ بھی زہری کی فضیلت کو بیان کررہا ہے کہ انکے اکابر[1] بھی ان سے روایت کو نقل کرتے ہیں۔

باب ماجاء فیمن یدرک من الجمعة رکعةً

باب جو شخص جمعہ کی ایک رکعت کو پاسکے اس کا بیان

☆حدثنا نصر بن علی وسعید بن عبدالرحمن وغیر واحد قالوا حدثنا سفیان بن عیینة عن الزهری

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) **حضرت علیؓ کا ایک اثر قاضی ابو یوسف کے مذہب کے موافق ہے:** انہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت میں پہلے چار پھر دو رکعتوں کا ثبوت ہے اس آخری روایت کو امام ابو یوسف، طحاوی اور بہت سے مشائخ نے اختیار کرلیا ہے۔ کذا فی الاوجز (از مترجم: اوجز المسالک ص ۲۴۹: جلد ثالث اسکے بعد لکھا ہے کہ شمس الائمہ حلوائی فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار سنتیں پڑھے پھر دو سنتیں۔ تو مذکورہ بالا اثر سے اس طرف اشارہ ہے کہ نمازی کو اختیار ہے کہ چاہے جمعہ کے بعد پہلے چار سنتوں کو ادا کرے اور یہ بھی اختیار ہے کہ دو رکعت سنتیں پڑھے لیکن افضل یہ ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت سنتوں کو مقدم کرے تاکہ فرض نماز کے بعد اسی کے مثل سنتیں پڑھنے والا نہ بنے۔ انتہی مافی ھامش البحر

[1] حافظ نے زہری کے تلامذہ میں عمرو بن دینار کو بھی شمار کیا ہے۔

عن ابی سلمۃعن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من ادرک عن الصلاۃ رکعۃً فقد ادرک الصلاۃ قال ابوعیسی ھذاحدیث حسن صحیح والعمل علی ھذا عنداکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرھم قالوا من ادرک رکعۃ من الجمعۃصلی الیھا اخری ومن ادرکھم جلوساً صلی اربعا وبہ یقول سفیان الثوری وابن المبارک والشافعی واحمد واسحق۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے اس نماز کو پالیا۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو جمعہ میں ایک رکعت ملی تو دوسری کو اس کے ساتھ ملالے اور جس نے نمازیوں کو جمعہ کے قعدہ اخیرہ میں بیٹھے ہوئے پایا تو وہ ظہر کی چار رکعتیں پڑھے۔سفیان ثوری،ابن مبارک،شافعی احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

اگر جمعہ کی نماز میں صرف تشہد کو پائے تو اسپر ظہر کی بناء کریگا یا جمعہ کی؟: حدیث باب من ادرک من الصلوۃ رکعۃ فقد ادرک الصلوۃ کے اطلاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم جمعہ اور تمام نمازوں کو شامل ہے لہٰذا اگر چہ حدیث باب جمعہ کی نماز کے ساتھ خاص نہیں لیکن اس کے عموم کی وجہ سے ترجمۃ الباب ثابت ہو رہا ہے۔امام ابوحنیفہؒ کا مذہب حدیث باب کے خلاف ہے کہ جو آدمی امام کے ساتھ صرف تشہد پالے تو وہ اس پر جمعہ کی نماز کی بناء کریگا لیکن دوسرے ائمہ[1] کے

---

[1] **اس مسئلہ میں تین اقوال:** سلف اور تابعین کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ جس شخص کا خطبہ فوت ہو گیا ہو تو وہ ظہر کی چار رکعت پڑھے، مگر جمہور فقہاء کا یہ قول نہیں لہٰذا ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے امام محمدؒ کے مطابق اگر کسی کو جمعہ کی ایک رکعت بھی نہ مل سکی تو وہ ظہر کی چار رکعت پڑھے اور امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور ایک جماعت کہتی ہے کہ اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے تحریمہ کہہ لی تو جمعہ کی دو رکعتیں ہی پڑھیگا یہی نخعی سے مروی ہے، اور حکم، حماد اور داؤد کا بھی یہی کہنا ہے۔

شیخین کے دلائل: ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جس نے جمعہ کا تشہد پالیا تو اس نے جمعہ پالیا، اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب کوئی جمعہ میں امام کے سلام سے پہلے داخل ہو گیا تو اس نے جمعہ پالیا۔ ان حضرات کا مستدل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے عموم سے ہیکہ نماز کا جو حصہ (امام کے ساتھ) پالو تو اس کو پڑھ لو اور جو رہ جائے تو اس کو (بعد میں) پورا کرلو۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کو (بعد میں) قضا کرلو اور ظاہر ہے کہ جو چیز فوت ہوتی ہے وہ جمعہ ہی (کا حصہ) ہے نہ کہ ظہر۔ اسکی تفصیل اوجز میں ہے

نزدیک تشہد ملنے کی صورت میں اس نماز پر ظہر کی نماز کی بناء کریگا یہ مسئلہ اس پر مبنی ہے کہ حدیث باب من ادرك ركعة میں ادراک سے مراد نماز کو پالینا اور جماعت کا ثواب حاصل کرنا ہے تو حدیث میں ادراک بمعنی احاطہ مراد نہیں ہے اسلئے کہ کسی امام کا یہ مذہب نہیں کہ جب اسے نماز کی ایک رکعت ملیگی تو وہ پوری نماز کو پانے والا شمار ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک رکعت ملنے کی صورت میں اس جماعت کا ثواب مل جائیگا یا وہ جماعت سے نماز پڑھنے والا شمار ہوگا لہٰذا جمعہ کی نماز کا بھی وہی حکم ہے جو اور نمازوں کا ہے۔ جمعہ اور دوسری نمازوں میں کوئی فرق نہیں رہیگا۔

جمہور کے مذہب پر ایک مضبوط اعتراض: لیکن جمہور پر یہ اعتراض باقی رہے گا جو کہ لا ینحل[1] ہے کہ حدیث باب سے بطور مفہوم مخالف کے یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ جس آدمی کو نماز کی ایک رکعت نہ ملے تو اس شخص کو مدرک صلوٰۃ نہیں کہا جائیگا۔ حالانکہ جمہور کا اس مفہوم مخالف کے خلاف اجماع ہے کہ اگر عام نمازوں میں ایک رکعت سے کم بھی ملے تب بھی وہ شخص مدرک صلوٰۃ کہلاتا ہے لہٰذا شیخین کی طرف سے یہ اعتراض باقی رہیگا کہ جب آپ کے نزدیک جمعہ کے علاوہ باقی نمازوں میں مفہوم مخالف پر عمل نہیں ہے پھر جمعہ کے اندر آپ مفہوم مخالف پر کیوں عمل کرتے ہیں (اسلئے اگر جمعہ والے دن ایک رکعت سے بھی کم امام کے ساتھ کسی کو جماعت ملے تو وہ شخص مدرک جمعہ ہونا چاہیئے۔ از مترجم)

باب ماجاء فی القائلة یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن قیلولہ کرنے کے بیان میں

☆حدثنا علی بن حجر حَدَّثَنَا عبد العزیز بن ابی حازم وعبدالله بن جعفرٍ عن ابی حازم عن سهل بن سعد رضی الله عنه قال ماكنا نتغدی فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا نقیل الا بعد الجمعة قال وفی الباب عن انس بن مالك رضی الله عنه قال ابوعیسی حدیث سهل بن سعد حدیث حسن صحیح

﴿ترجمه﴾

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صبح کا ناشتہ بھی جمعہ

---

[1] یعنی جمہور کے نزدیک جمعہ اور دوسری نمازوں میں جو فرق ہے اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "من ادرك ركعة من الصلوٰة" یہ ایسا ہے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا کہ جسے جمعہ کی ایک بھی رکعت مل جائے اسکا بھی یہی حکم ہے۔ تو جسطرح جمعہ کی نمازوں کے علاوہ دیگر نمازوں میں جس آدمی کو امام کے ساتھ ایک رکعت ملے یا اس سے بھی کم ملے دونوں صورتوں میں وہ شخص مدرک صلاۃ کہلاتا ہے تو آپ کے نزدیک یہ ہوتا کہ آپ جمعہ کے اندر بھی اسی طرح فرق نہ کرتے کہ جسکو جمعہ کی ایک رکعت ملے یا اس سے کم ملے دونوں صورتوں میں یہ شخص مدرک جمعہ کہلانا چاہیئے۔

کے بعد کرتے تھے اور قیلولہ بھی جمعہ کے بعد ہی کرتے تھے۔ اس باب میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے۔

باب ماجاء فیمن ینعس یَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنَّهُ یَتَحَوَّلُ من مجلسه

باب جو شخص جمعہ والے دن اونگھنے لگے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جائے

☆حدثنا ابو سعید الاشج حدثناعبدة بن سلیمان وابوخالدالا حمرعن محمدبن اسحق عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال اِذَانَعَسَ اَحَدُکُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْیَتَحَوَّلْ عَنْ مَجْلِسِهٖ ذلك قال ابوعیسی: هذا حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن اونگھنے لگے تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ بیٹھ جائے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(قوله انه یتحول عن مجلسه) (اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے اٹھ جانے کا حکم دیا جبکہ دوران خطبہ وہ اونگھنے لگے) اس کا سبب اور علت وہ نہیں ہے جو علت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیلۃ التعریس کے واقعہ میں ہوئی تھی کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز فوت ہوگئی تھی وہاں پر اپنی جگہ سے تحول کا حکم اس لئے تھا کہ اس جگہ میں شیطان کا تسلط دوسرے مقامات سے زیادہ تھا بخلاف حدیث باب میں مسجد کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرنے کا حکم ہے نہ کہ اس مسجد کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کا لہٰذا حدیث باب کی علت یہ ہے کہ یہ شخص چل پھر کر حرکت کر کے دوسری جگہ جا کر بیٹھ جائے تا کہ اس کی غفلت اور سستی ختم ہو جائے یہ بات یاد رہے کہ ایسا ضروری نہیں کہ یہ حکم کھڑے ہو کر دوسری جگہ پر بیٹھنے ہی سے پورا ہوتا ہو بلکہ اگر کوئی شخص اپنی جگہ پر تھوڑا وقت کھڑا ہو یا اپنی جگہ پر تھوڑا ٹہل کر[1] اپنی اسی جگہ پر دوبارہ لوٹ آئے تو اس سے بھی یہ حکم پورا ہو سکتا ہے۔

---

[1] تنقل یعنی چلا جانا۔

باب ماجاء فی السَّفَرِ یوم الجمعة

باب جمعہ کے دن سفر کرنا

☆ حَدَّثَنَا احمد بن منیع حَدَّثَنَا ابو معاویة عن الحَجَّاجِ عن الحَکَمِ عن مِقْسَم عن ابن عباس قال: بَعَثَ النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم عبدَ اللّٰه بن رَوَاحَةَ فی سَرِیَّةٍ،فوافقَ ذٰلِکَ یومَ الجمعة، فَغَدَا اصحابُهُ فقال: اَتَخَلَّفُ فاصلّی مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثم اَلْحَقُهُمْ فلمَّا صلّٰی مع النبی صلی اللّٰه علیه وسلم رآهُ ،فقال: مامَنَعَکَ اَنْ تَغْدُوَمع اصحابك؟ فقال: اردتُ ان اصلّیَ معكِ ثم اَلْحَقَهُمْ، قال: لو اَنْفَقْتَ مافی الارض جمیعاً مااَدْرَکْتَ فَضْلَ غَدْوَتِهِمْ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث غریب لانعرفه اِلَّا من هٰذا الوجه۔قال علیُّ ابن المَدینی: قال یحیی بن سعید: وقال شعبةُ: لم یسمعِ الحکمُ من مِقْسَمٍ اِلَّا خمسَة احادیثَ، وعَدَّهَاشعبةُ، وَلَیْسَ هٰذَا الْحَدِیثُ فیما عَدَّ شعبةُ۔ فکانَّ هٰذا الحدیث لم یسمعه الحکمُ مِن مِقْسِمٍ۔وقد اختلفَ اهلُ العلم فی السفرِ یوم الجمعة: فلم یَرَبعضُهم باساً بان یَخْرُجَ یوم الجمعة فی السفر، مالم تَحْضُرِ الصلاةُ۔وقال بعضُهم: اِذَا اَصْبَحَ فلایَخرج حتی یصلّیَ الجمعةَ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عبداللہ بن رواحہ کو ایک سریہ میں بھیجا اور اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا۔ ان کے ساتھی صبح روانہ ہو گئے عبداللہ نے کہا میں پیچھے رہ جاتا ہوں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھ سکوں پھر ان سے جاملوں گا۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو پوچھا تمہیں ساتھیوں کے ساتھ صبح سویرے جانے سے کس چیز نے منع کیا؟ انہوں نے عرض کیا میں چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لوں اور پھر ان سے جاملوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم جو کچھ زمین میں ہے اتنا مال بھی صدقہ کردو تو انکے سویرے چلنے کی فضیلت تک نہیں پہنچ سکتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو سند کے علاوہ ہم نہیں جانتے۔ علی بن مدینی، یحیٰی بن سعید سے وہ شعبہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ حکم نے مقسم سے صرف پانچ حدیثیں سنی ہیں شعبہ نے انہیں گنا۔ یہ حدیث ان پانچ میں نہیں گویا کہ یہ حدیث حکم نے مقسم سے نہیں سنی...... جمعہ کے سفر کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ نماز جمعہ کا وقت داخل نہ ہو۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اگر صبح صادق ہو جائے تو جمعہ کی نماز پڑھ کر سفر کیلئے روانہ ہو۔

﴿تشریح﴾

اصح قول کے مطابق جمعہ والے دن زوال سے پہلے سفر کرنا جائز ہے زوال شمس کے بعد[1] ناجائز کیونکہ سبب وجوب وقت ہے اور زوال شمس کے بعد یہ سبب وجوب آ پہنچا۔ جن علماء کے نزدیک جمعہ والے دن طلوع فجر کے بعد سفر منع ہے تو وہ حدیث باب کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جن صحابہ کرامؓ نے جہاد کا سفر اس وقت کیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم تھا یا یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ لوگ صبح صادق سے پہلے نکل گئے تھے۔ حدیث شریف میں جو یہ کہا گیا کہ یہ غدوۃ (دن چڑھے) کے وقت گئے تھے تو یہ سمجھانے کیلئے اور اندازے کے طور پر یا مجازاً کہا۔

(قوله فضل غدو تهم) یہ لفظ اشارہ کررہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں رفقاء کے ساتھ نکلنے کا جو حکم ارشاد فرمایا تھا اس کو پورا کرنا بہت اعلیٰ اور افضل تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھنے سے...... ہاں اس میں جمعہ پڑھنے کی

---

[1] **جمعہ کے دن زوال کے بعد جمعہ پڑھے بغیر سفر کرنا منع ہے۔ قاضی خان کے ایک تسامح کی وضاحت:** درمختار میں ہے کہ جمعہ والے دن سفر کرنے کی اجازت ہے اس شرط کے ساتھ کہ یہ شخص اپنے شہر کی عمارتوں سے ظہر کے وقت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے نکل جائے۔ فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح لکھا ہے مگر ظہیریہ وغیرہ کی عبارت اس طرح ہے کہ ظہر کا وقت داخل ہونے سے پہلے یہ شخص شہر کی آبادی سے باہر نکل جائے، شرح منیۃ المصلی میں لکھا ہے کہ صحیح قول کے مطابق زوال کے بعد جمعہ والے دن جمعہ کی نماز پڑھے بغیر سفر کرنا مکروہ ہے زوال سے پہلے مکروہ نہیں۔ علامہ شامی، قاضی خان کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شمس الائمہ حلوانی نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ آخری وقت کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جبکہ یہ آدمی منفرداً نماز کو ادا کرے۔ جمعہ کی نماز چونکہ امام اور مجمع کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ جس وقت میں لوگ نماز ادا کرتے ہیں اس وقت کا اعتبار کیا جائے تاکہ یہ شخص شہر سے لوگوں کے نمازِ جمعہ پڑھنے سے پہلے نہ نکلے بلکہ اگر لوگوں کے نمازِ جمعہ پڑھنے کا وقت ہو جائے تو اس پر بھی جمعہ میں حاضری ضروری ہے۔ تتارخانیہ میں تہذیب سے نقل کیا ہے کہ اگر جمعہ کی اذان ہو گئی تو اس پر سفر ممنوع ہو جائیگا، شرح منیۃ المصلی میں ظہیریہ والے قول کی تائید کی گئی ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ فتاویٰ قاضیخان والا قول ضعیف ہے اور اسپر صاحبِ شرح المنیہ نے دلیل پیش کی ہے کہ وقت کے داخل ہونے سے پہلے جمعہ فرض ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب کہ جمعہ کی طرف بھاگو یہ اس وقت متوجہ ہوتا ہے جبکہ وقت داخل ہو چکا ہو (لہٰذا وقت کے داخل ہونے کے بعد چونکہ خطاب متوجہ ہے اسلئے اس کے لئے سفر منع ہوگا۔ از مترجم) مناسب یہ ہے کہ اس حکم سے ایک صورت مستثنیٰ ہو وہ یہ کہ اگر یہ شخص جمعہ کی نماز ادا کریگا تو اس کے رفقاء سفر اس سے بچھڑ جائینگے اور یہ شخص ایسا ہے کہ یہ اکیلا سفر کر بھی نہیں سکتا تو ایسے شخص کیلئے زوال شمس کے بعد بھی سفر کی اجازت ہونی چاہیئے۔

فضیلت اپنی جگہ ہے لیکن پھر بھی صحابہؓ کے ساتھ صبح جانے کی فضیلت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو پورا کرنے کی فضیلت اس مسجد نبوی میں جمعہ پڑھنے کی فضیلت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

(قوله و کان هذا الحديث لم يسمع الحكم من مقسم) لفظ کَانَ سے اسطرف اشارہ ہے کہ اس حدیث کا منقطع ہونا اور حدیث باب میں حکم کا مقسم سے عدم سماع یہ سب کچھ شعبہ کی تحقیق پر مبنی ہے کوئی یقینی بات نہیں۔

باب ماجاء في السِّواكِ والطيب يوم الجمعة

باب جمعہ کے دن مسواک کرنا اور خوشبو لگانا

☆حدثنا عليُّ بن الحسَنِ الكوفيُّ حَدَّثَنَا ابو يحيى اسمٰعيل بن ابراهيم التيمي عن يزيدَ بن ابي زِيَادٍ عن عبد الرحمٰن بن ابي لَيْلَى عن البراء بن عازبٍ قال: قال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حَقٌّ على المسلمين ان يغتسلوا يومَ الجمعةَ، وَلْيَمَسَّ احدُهم مِن طِيبِ اَهلِهِ، فإن لم يَجِدْ فالماء له طيبٌ۔ قال: وفي الباب عن ابي سعيدٍ، وشيخٍ من الانصار۔

☆حدثنا احمد بن منيع حَدَّثَنَا هشيم عن يزيدَ بن ابي زيادٍ بهٰذا الإسنادِ: نحوهَ۔ قال ابو عيسى: حديثُ البَرَاءِ حديثٌ حسنٌ۔ وروايةُ هشيم احسنُ من رواية اسمٰعيل بن ابراهيم التيمي۔ واسمٰعيلُ بن ابراهيم التيمي يُضَعَّفُ في الحديث۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمانوں کیلئے ضروری (اور لازم) ہے کہ جمعہ کے دن غسل کریں اور ہر ایک اپنے گھر کی خوشبو لگائے (یعنی گھر پر موجود خوشبو لگائے) اور اگر نہ ہو تو پانی ہی اس کیلئے خوشبو ہے۔ اس باب میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری شیخ سے بھی روایت ہے۔

روایت کی ہم سے احمد بن منیع نے ان سے ہشیم نے ان سے یزید بن ابی زیاد نے اوپر کی حدیث کے مثل۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں براء کی حدیث حسن ہے اور ہشیم کی روایت اسماعیل بن ابراہیم تیمی سے بہتر ہے۔ اسماعیل بن ابراہیم تیمی حدیث میں ضعیف ہیں۔

﴿تشریح﴾

ترجمۃ الباب سے مطابقت: حدیث باب میں مسواک کا لفظ[1] مذکور نہیں لیکن وہ احادیث عامہ جو کے اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جمعہ والے دن خوشبو لگائی جائے اور اپنے آپ سے میل کچیل بدبو کو دور کیا جائے ان کے عموم سے مسواک پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(قولہ حقا علی المسلمین) یعنی مسلمانوں پر یہ حکم اس وقت واجب ہے جبکہ وہ بدبو اور میل کچیل کی صفت رکھتے ہوں اور اگر یہ بات نہ ہو تو یہ حکم استحبابی ہے۔

(قولہ ولیمس احدھم من طیب اھلہ) اس حدیث میں مبالغۃً فرمایا ہے کہ ہر حال میں خوشبو استعمال کرو اگر چہ اپنی بیوی کی خوشبو لگا کر آؤ کیونکہ مردوں کی خوشبو تو وہ ہوتی ہے جس میں خوشبو زیادہ ہو اور رنگ کم اور عورتوں کی خوشبو وہ ہوتی ہے جس میں رنگ خوب واضح ہو اور اس کی مہک نہ ہو تو اس اعتبار سے مردوں کیلئے عورتوں کی خوشبو منع ہے کیونکہ وہ خوشبو زرد رنگ کی ہوتی ہے اور اس کا رنگ بہت گہرا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس ممانعت کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مبالغہ کے مرد کو خوشبو لگانے کا حکم دیا۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: اس مقام کے مناسب تو یہ تھا کہ یوں ارشاد فرماتے کہ "ولو من طیب اھلہ"۔
جواب: اگر یہ الفاظ ارشاد فرماتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس شخص کیلئے افضل واعلیٰ تو یہ ہے کہ وہ خوشبو استعمال کرے جو مرد استعمال کرتے ہیں اور اگر وہ خوشبو نہ ملے تب عورتوں کو خوشبو استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن حدیث شریف میں "ولیمس احدھم من طیب اھلہ" فرمایا گیا۔ اس میں جب عورتوں کی خوشبو لگانے کی اجازت دی گئی تو اس سے یہ امر سمجھ میں آ گیا کہ مردوں والی خوشبو اس کیلئے استعمال کرنا دلالۃ النص سے اس کا جواز معلوم ہو جائیگا۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "ولیمس من طیب اھلہ" میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس شخص کو خوشبو کے حاصل کرنے میں اسقدر تکلف کرنا ضروری نہیں کہ کسی سے مانگے یا خریدے بلکہ اگر اسکے گھر والوں کے پاس خوشبو موجود ہو تب لگالے ورنہ کوئی ضروری نہیں۔

---

[1] اس حدیث کی سند کے شروع میں امام ترمذی نے علی بن الحسن الکوفی راوی کو ذکر فرمایا ہے ان کے متعلق یہ بات یاد رہے کہ سیوطی نے قوت المغتذی میں عراقی سے نقل کیا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے اساتذہ والے طبقہ میں علی بن الحسن نامی تین شخص میں یہاں کونسا مراد ہے اس کی تعیین نہیں ہوسکی۔ (از مترجم: چنانچہ پہلے راوی کا نام علی بن حسن بن سلیمان الکوفی ہے ان کی کنیت ابو الحسن ہے اور یہ ابو الشعثاء کے نام سے مشہور ہیں ان سے امام مسلم نقل کرتے ہیں۔ ۲۔ علی بن حسن الکوفی راوی ہیں جو عبدالرحمٰن بن سلیمان سے نقل کرتے ہیں ان سے امام نسائی نے نقل کیا ہے، ۳۔ علی بن حسن الکوفی یہ اسماعیل بن ابراہیم التیمی سے روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس تیسرے راوی سے یہاں حدیث نقل کی ہیں)۔

﴿ابواب العیدین﴾

بعض طلبہ علم نے لفظ عیدین کے یا اور نون جو کے تثنیہ کی علامت ہے کو حذف کردیا کیونکہ آنے والی احادیث میں عیدالاضحیٰ کا کوئی حکم انہیں نظر نہیں آرہا لہٰذا ان کے خیال میں یہ ابواب عیدالفطر کے متعلق لائے گئے ہیں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہاں دونوں عیدوں کے احکام بیان ہوئے ہیں کیونکہ آگے آنے والی احادیث کے اکثر احکام دونوں عیدوں میں مشترک ہیں نیز مصنف نے آخری باب میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے "ولا یطعم یوم الاضحی حتی یرجع" اور یہ حکم تو صرف عیدالاضحیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

باب ماجاء فی المشی یومَ العید

باب عیدین کے دن عید کی نماز کیلئے پیدل جانا

☆حدثنا اسمعیلُ بن موسی الفزاریُّ حَدَّثَنَا شَرِیكٌ عن ابی اسحٰق عن الحرث عن علیٍّ بن ابی طالب قال: مِنَ السُّنَّةِ ان تَخْرُجَ الی العیدِ ماشیاً، وان تاکل شیئاً قبلَ ان تخرجَ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسنٌ۔ والعملُ علی ھذا الحدیث عند اکثر اھل العلم: یَسْتَحِبُّونَ ان یخرجَ الرجلُ الی العید ماشیاً وَ ان لَّا یرکبَ اِلَّا مِن عُذْرٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز عیدالفطر کیلئے پیدل چلنا اور گھر سے نکلنے سے پہلے کچھ کھالینا سنت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اکثر اہل علم کا عمل ہے کہ عید کی نماز کیلئے پیدل نکلنا مستحب ہے اور بغیر عذر کے کسی (سواری) پر سوار نہ ہو۔

﴿تشریح﴾

(قولہ من السنة ان تخرج الی العید ماشیا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاپیادہ تشریف لے جانا یا تو بطور عادت کے تھا تو سواری پر جانا خلافِ اولیٰ[1] ہوگا اور یا بطور عبادت کے آپ پیدل تشریف لے جاتے ہوں تو سواری استعمال کرنا مکروہ تنزیہی

---

[1] درمختار میں ہے کہ عیدالفطر کے دن نماز عید سے پہلے کسی میٹھی چیز کو طاق عدد میں کھانا مستحب ہے ایسے ہی مسواک اور غسل کرنا بھی مستحب ہے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے ان افعال کو مستحب کہا ہے جبکہ مصنف نے عیدین والے دن غسل کو سنتوں میں شمار کیا ہے، صحیح قول کے مطابق عید کے دن یہ سارے افعال سنت ہیں۔انتہی

ہوگا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ہے کہ پا پیادہ جانا سنن ھدیٰ یا سنن زوائد میں سے ہے۔اس حدیث میں ''من السنۃ'' کے لفظ میں دونوں ہی احتمال ہیں۔

حدیث باب میں عیدگاہ جانے سے پہلے کچھ کھانے کا حکم اس لئے دیا تا کہ اللہ رب العزت نے جو رمضان کے روزے فرض فرمائے تھے تو صورۃ بھی اس پر زیادتی نہ ہو اور ان روزوں پر زیادتی کی جڑ ہی کٹ جائے شریعت میں یہ روزہ اس وقت شمار ہوتا ہے جب یہ شخص اس کو پورا کرے اور اس میں نیت بھی ہو۔لیکن اس تھوڑے سے وقت میں امساک، بظاہر روزہ لگ رہا تھا تو کچھ تناول فرما کر روزہ کی ظاہری شکل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احتراز فرمایا۔

باب ماجاء فی صلاۃ العِیدَیْنِ قَبلَ الخُطبة

باب عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھنا

☆حدثنا محمد بن المثنی حَدَّثَنَا ابو اسَامةَ عن عبید اللّٰہ هو ابن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر بن الخطابِ عن نافعٍ عن ابن عمر قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وابو بکر وعمرُ یُصَلُّونَ فی العیدین قبلَ الخطبةِ، ثُمَّ یخطُبُونَ۔قال: وفی الباب عن جابرٍ، وابن عباسٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث ابن عمرَ حدیث حسن صحیحٌ۔ والعمل علی هذا عند اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم وغیرهم: اَنَّ صلاۃَ العیدین قبل الخطبة۔ویقال اِنَّ اوَّلَ مَن خَطب قبل الصلاۃِ مَرْوَانُ بن الحَکَمِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما عیدین میں نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے اور پھر خطبہ دیا کرتے تھے۔اس باب میں جابر، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ میں سے اہل علم حضرات کا عمل ہے کہ عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھی جائے۔کہا جاتا ہے کہ عید کی نماز سے پہلے خطبہ دینے والا پہلا شخص مروان بن حکم تھا۔

﴿تشریح﴾

مقصدِ باب: مروان بن حکم حاکم کے فعل پر نکیر کرنا ہے: اس باب کا مقصد اس وہم کو دور کرنا ہے کہ مروان عیدین

میں، خطبہ پہلے دیتا اور عید کی نماز بعد میں پڑھاتا تو اس کے فعل سے شاید کسی کو یہ وہم ہو کہ شاید عیدین میں خطبہ کو نماز سے مقدم کرنا سنت ہے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مروان اور اس کے حواری عیدین کی نماز کو جمعہ کی نماز پر قیاس کرتے ہوں جس طرح جمعہ میں خطبہ پہلے ہوتا ہے اور نماز بعد میں ہوتی ہے اسی طرح عیدین میں پہلے خطبہ ہو اور بعد میں نماز ہو۔ حالانکہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کیونکہ جمعہ کی نماز کیلئے خطبہ ہونا تو اس کی شرائط میں سے ہے اور شرط اس شئی پر مقدم ہوتی ہے عیدین میں خطبہ شرط نہیں ہے[1]۔

سب سے پہلے نماز عید سے پہلے خطبہ کس نے جاری کیا: (قولہ ویقال ان اول من خطب قبل الصلوٰۃ مروان بن حکم) اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں ان میں تطبیق اس طرح ہے کہ مروان بن حکم نے غلط اور بری نیت کے ساتھ خطبہ عید کو نماز پر مقدم کیا تھا ورنہ مروان سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ[2] نے عید کے خطبہ کو نماز سے مقدم فرمایا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے اچھی نیت سے خطبہ عید کو نماز عید پر مقدم کیا تھا اور مروان نے بُری نیت سے یہ کام کیا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں کا مجمع بہت زیادہ ہو گیا ہے اور مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہو چکا ہے نیز پھر بھی دورانِ خطبہ لوگوں کی جماعتیں عیدگاہ کی طرف جوق در جوق آرہی ہیں تو انہوں نے عیدین کے خطبہ کو مقدم فرمایا تا کہ مسلمانوں کی نماز عید فوت نہ ہو تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ایک مستحسن

---

[1] **اگر عیدین میں خطبہ عید کو نمازِ عید پر مقدم کیا تو؟:** بلکہ عیدین میں خطبہ کا ہونا سنت ہے علامہ شامی نے بحر سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بالکل خطبہ نہ دے بلکہ بغیر خطبہ کے نماز عید پڑھائے تو اس کی نماز ہوگئی مگر اس نے سنت کے چھوڑنے کی وجہ سے برا کام کیا اسی طرح اگر اس نے خطبہ عید پہلے دیا اور عید کی نماز بعد میں پڑھائی تو بھی خطبہ ادا ہو گیا لیکن یہ اس کا فعل خلاف سنت ہے البتہ نماز عید کا اعادہ نہیں ہوگا۔

[2] چنانچہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وہ کام جو انہوں نے سب سے پہلے نافذ فرمائے انکو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عید میں خطبہ کو نماز پر مقدم کیا ہے نیز انہوں نے زہری سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ عید میں خطبہ کو نماز پر سب سے پہلے مقدم کرنے والے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اخرجہ عبدالرزاق انتہی۔ قلت: ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق دینا کوئی مشکل نہیں اگر یہ دونوں حدیثیں صحیح سند سے ثابت ہوں ورنہ اسکے برعکس بخاری کی روایت ہے جس میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ عیدین میں نماز کو خطبہ پر مقدم کرتے تھے یہاں تک کہ مروان نے یہ بدعت ایجاد کی کہ خطبہ کو نماز پر مقدم کیا۔ الحدیث، اس سے ابو الطیب شارح ترمذی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اول من خطب قبل الجمعۃ والی روایت کا انکار کیا ہے۔

فعل تھا جس پر صحابہؓ اور تابعین میں سے کسی نے بھی نکیر نہیں کی۔ اسکے برعکس مروان کے خطبہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور رشتہ داروں پر دورانِ خطبہ اعتراض کیا کرتا تھا اور ان کے ساتھ بے ادبی سے پیش آتا۔ لوگوں نے اس کے اس انداز کو جب دیکھا تو صحابہ کرامؓ میں اس قدر صبر نہیں تھا کہ بیٹھ کر اس کی اہل بیت کے ایذاء رسانی والی باتیں سنتے رہیں لہٰذا اصحابہؓ چونکہ نماز عید تو امام کے ساتھ پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوتے تھے اس لئے وہ مروان کے خطبہ کو چھوڑ کر جانا شروع ہو جاتے تھے اس لئے مروان نے عیدین کے خطبہ کو نماز پر مقدم کیا تاکہ یہ خطبہ ہر ایک لازمی طور پر مجبوری کے ساتھ سن سکے بہر حال اس کا یہ فعل خباثت پر مبنی تھا اسلئے صحابہؓ نے اس پر نکیر فرمائی۔

باب ماجاء ان صلاة العيدين بغيرِ اذانٍ ولا اِقامةٍ

باب عیدین کی نماز میں اذان واقامت نہیں ہوتی

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا ابو الاحوصِ عن سِمَاكِ بن حربٍ عن جابر بن سمرة قال: صَلَّيْتُ مع النبيِّ صلى الله عليه وسلم العيدينِ غيرَ مَرَّةٍ ولا مَرَّتَيْنِ، بغيرِ اذانٍ ولا اقامةٍ۔ قال: وفي الباب عن جابر بن عبد الله، وابن عباسٍ۔ قال ابو عيسى: وحديث جابر بن سمرة حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ عليه عند اهل العلم من اصحاب النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرهم انَّهُ لايُؤَذَّنُ لصلاة العيدين، ولالشيءٍ من النوافلِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیدین کی نماز کئی مرتبہ عیدین کی نماز بغیر اذان اور تکبیر کے پڑھی۔ اس باب میں جابر بن عبداللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر علماء صحابہ کا وغیرہ کا عمل ہے کہ عیدین یا کسی نفل نماز کیلئے اذان نہ دی جائے۔

﴿تشریح﴾

عیدین میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہہ کر بلانا صحیح ہے: اس حدیث میں لوگوں کو عیدین کی نماز میں مطلق[1] بلانے کی نفی

---

[1] حضرت گنگوہیؒ نے یہ جو مسئلہ بیان کیا ہے کہ اذان کے علاوہ دوسرے الفاظ سے نماز عیدین کیلئے اعلان جائز ہے اس کی تصریح شارح ترمذی شیخ سراج نے کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کے ہاں عید کی نماز کیلئے الصلوٰۃ جامعۃ کے الفاظ سے پکارنا مستحب ہے اس طرح دوسرے علماء نے ائمہ اربعہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے۔ کمافی الاوجز۔ زرقانی نے مالکیہ سے نقل کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک عیدین کی نماز کیلئے لوگوں کو کسی بھی قسم کے کلمات سے نہ بلایا جائے تو اس قول کے مطابق (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں ہاں عیدین کیلئے مخصوص طریقے پر مشروع اذان واقامت منع ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں بالکل کسی قسم کا اعلان ہوتا ہی نہ تھا چنانچہ بعض احادیث میں بغیر اذان ولا اقامۃ ولاشئی کے الفاظ ہیں۔ (از مترجم صحیح مسلم جلد اول کتاب صلوٰۃ العیدین میں صفحہ ۲۹۰ پر حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان لا اذان للصلوٰۃ یوم الفطر حین یخرج الامام ولا بعد ما یخرج ولا اقامۃ ولا نداء۔ ولا شئ لاندا یومئذ ولا اقامۃ ۔قدیمی کتب خانہ، کراچی) لیکن وہ روایات قابلِ اعتماد ہیں جس میں یہ وارد ہے کہ عیدین میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہکر پکارا جاتا تھا اور یہ قیاس کے موافق بھی ہے کیونکہ نوافل کی وہ جماعت جوشریعت میں مشروع ہیں انمیں لوگوں کو جمع کرنے کیلئے اعلان کرنا مشروع ہے مثلاً نماز تراویح کسوف اور استسقاء وغیرہ میں جب لوگوں کو جمع کرنے کیلئے پکارا جا سکتا ہے تو عیدین میں بھی اذان کے علاوہ کسی بھی قسم کے الفاظ سے اعلان کرنا جائز ہونا چاہیئے لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ جو شخص عیدین میں لوگوں کو جمع کرنے کیلئے اعلان کرے تو اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

مختلف احادیثِ متعارضہ میں تطبیق: ان مختلف احادیث میں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ شروع میں بالکل ہی کسی قسم کے الفاظ سے اعلان ہوتا ہی نہ تھا جیسا کہ بعض روایات میں ہے پھر اس کے بعد کے زمانے میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہکر نمازِ عید کا اعلان ہوتا تھا جو صحابہ رضی اللہ عنہم شروع زمانے میں حاضر خدمت ہوئے تھے تو انہوں نے اپنے مشاہدے کو نقل کردیا اور انہیں بعد کے زمانے والا واقعہ نہیں پہنچا یا بعد کے زمانے کے واقعہ کی خبر انہیں پہنچی تھی مگر انہوں نے صرف شروع زمانے والے واقعہ کو ذکر کیا یا انہوں نے دونوں ہی واقعات کو نقل کیا ہو لیکن راوی نے اختصار سے کام لیکر صرف ایک ہی واقعہ کو نقل کیا ہو اور بعض سامعین اس اختصار کی وجہ سے خلافِ مقصود معنی کو سمجھ گئے۔

باب ماجاء فی القراءۃ فی العیدین

باب عیدین کی نماز میں قرأت کا بیان

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا ابو عَوَانَۃَ عن ابراھیمَ بن محمد بن الْمُنْتَشِرِ عن ابیه عن حَبِیبِ بن سالِمٍ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) عیدین کی نماز کو کسوف وغیرہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ نماز کسوف لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی اور اس کا وقت بھی معلوم نہیں ہوتا اسلئے اس میں لوگوں کو جمع کرنے کیلئے اذان کے علاوہ دوسرے کلمات سے اعلان جائز ہوگا بخلاف عید کی نماز کہ اسکا وقت بالکل متعین ہے اور سب لوگوں کو معلوم بھی ہے اور عید کی نماز کیلئے جلدی جانا مستحب بھی ہے۔ فتامل۔ اس متن والی تقریر ترمذی پر یہ اشکال ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے لامع الدراری میں ابواب الکسوف کے تحت عیدین میں اذان کے علاوہ کسی بھی قسم کے الفاظ سے پکارے جانے پر اشکال کیا ہے۔

عن النُّعمانِ بن بَشِیرٍ قال: کان النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَقْرَأُ فی العیدین و فی الجمعۃِ بسبح اسم ربك الاعلی وھل اتاك حدیث الغاشیۃ وربما اجتمعا فی یوم واحد فیقرا بھما۔قال: وفی الباب عن ابی واقدٍ، وسمرۃَ بن جندب، وابن عباس۔ قال ابو عیسی: حدیث النعمان بن بشیر حدیث حسن صحیحٌ۔وھکذا روی سفیانُ الثوریُّ ومِسْعَرٌ عن ابراھیم بن محمد بن المنتشر نحوَ حدیث ابی عوانۃ۔ واما سفیانُ بن عیینۃ فیختلف علیہ فی الروایۃ:یُروی عنہ عن ابراھیم بن محمد بن المنتشر عن ابیہ عن حبیب بن سالمٍ عن ابیہ عن النعمان بن بشیر۔ ولانعرفُ لحبیب بن سالم روایۃ عن ابیہ۔ وحبیب بن سالمٍ ھو مولی النعمان بن بشیرٍ، ورَوَی عن النعمان بن بشیرٍ احادیثَ۔ وقد رُوِیَ عن ابن عُیینۃ عن ابراھیم بن محمد بن المنتشر نحوُ روایۃِ ھؤُلاء۔ وروی عن النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: انہ کان یقرأ فی صلاۃ العیدینِ بقاف واقتربت الساعۃ وبہ یقول الشافعیُّ۔

☆حدثنا اسحق بن موسی الانصاریُّ حَدَّثَنَا مَعْنُ بن عیسی حَدَّثَنَا مالكُ بن انسٍ عن ضَمْرَۃَ بن سعیدٍ المازِنِیِّ عن عبید اللّٰہ بن عبد اللّٰہ بن عتبۃ: اَنَّ عمرَ بن الخطابِ سال ابا واقد اللَّیْثِیَّ: ماکان رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرا بہ فی الْفِطْرِ والْاَضْحَی؟ قال: کان یقرأُ بقٓ والقُرْآنِ المَجِیدِ واقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا ھناد حَدَّثَنَا سفیانُ بن عیینۃ عن ضَمْرۃَ بن سعیدٍ بھذا الاسناد: نَحْوَہٗ۔ قال ابو عیسی: وابو واقِدٍ اللَّیْثِیُّ اسمہ الحرثُ بن عَوْفٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک حدیث الغاشیہ پڑھتے تھے اور کبھی عید جمعہ کے دن ہوتی تو بھی یہی دونوں سورتیں (جمعہ اور عید) دونوں نمازوں میں پڑھتے تھے۔ اس باب میں ابو واقد، سمرہ بن جندب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نعمان بن بشیر کی حدیث حسن صحیح ہے۔ اسی طرح سفیان ثوری اور مسعر نے ابراہیم بن محمد بن منتشر سے ابوعوانہ کی حدیث کے مثل بیان کرتے ہیں۔ ابن عیینہ کی روایت میں اختلاف پایا گیا ہے سفیان بن عیینہ کا ایک شاگرد ان سے بواسطہ ابراہیم بن محمد بن منتشر روایت کرتا ہے وہ اپنے والد سے وہ حبیب بن سالم سے حبیب اپنے والد سے اور وہ نعمان بن بشیر سے روایت کرتے ہیں جبکہ حبیب بن سالم کی ان کے والد سے کوئی روایت معروف نہیں۔ یہ

حبیب بن سالم نعمان بن بشیر کے مولیٰ ہیں اور ان سے بلاواسطہ احادیث روایت کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی ابن عیینہ سے مروی ہے کہ وہ ابراہیم بن محمد بن منتشر سے ان حضرات کی روایت کے مثل یعنی حبیب بن سالم کے بعد عن ابیہ کے اضافہ کے بغیر بیان کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازوں میں سورۃ ق اور اقتربت الساعۃ پڑھتے تھے۔امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

☆ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوواقد لیثی سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں کیا پڑھتے تھے۔ ابوواقد نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ق، والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ پڑھتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ روایت کی ہم سے ھناد نے ان سے ابن عیینہ نے ان سے ضمرہ بن سعید نے اسی اسناد سے اوپر کی حدیث کے مثل۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوواقد لیثی کا نام حارث بن عوف ہے۔

﴿تشریح﴾

جمعہ اور عید ایک دن میں آجائیں تو وہ دن منحوس نہیں: (قولہ وربما اجتمعا فی یوم واحد فیقرأ بھما) پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ کی نماز میں سورۃ اعلیٰ اور غاشیہ کا کیوں انتخاب فرماتے تھے۔ نیز حدیث باب سے ان بے وقوفوں پر بھی رد ہو جاتا ہے جن کے خیال میں اگر عید اور جمعہ کا خطبہ ایک ہی دن میں جمع ہو جائے تو وہ نحوست والا دن ہوتا ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی اہم تشریح: (واما ابن عیینہ فیختلف علیہ) یعنی سفیان بن عیینہ سفیان ثوری کے معاصر ہیں تو سفیان ثور کے تلامذہ حدیث کو ایک ہی طریقہ پر روایت کرتے ہیں اور وہ حبیب بن سالم اور نعمان بن بشیر کے درمیان عن ابیہ کا لفظ زائد نہیں کرتے لیکن مصنفؒ فرما رہے ہیں کہ سفیان بن عیینہ کے شاگردوں میں اس حدیث کی سند میں اختلاف واقع ہوا ہے چنانچہ بعض شاگرد سفیان بن عیینہ سے نقل کرتے ہوئے حبیب بن سالم کے بعد لفظ ابیہ کا اضافہ کرتے ہیں اور بعض شاگرد یہ اضافہ نہیں کرتے، جو شاگرد لفظ ابیہ کا اضافہ نہیں کرتے انکی روایت صحیح ہے، پھر مصنف نے اس کی صحت پر یہ قرینہ پیش کیا کہ کسی بھی روایت میں حبیب بن سالم سے بواسطہ ان کے والد کے کوئی روایت منقول نہیں جیسا کہ مصنف کا قول" ولا یعرف لحبیب بن سالم روایۃ عن ابیہ" سے معلوم ہو رہا ہے۔لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہی روایت صحیح ہو جس میں عن ابیہ کا واسطہ نہیں ہے لیکن چونکہ عن ابیہ والے واسطہ کی روایت پر کوئی ایسی دلیل موجود نہیں کہ وہ بالکل غلط ہو اسلئے مصنف نے بالجزم نہیں فرمایا کہ حبیب بن سالم عن ابیہ والی روایت صحیح نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حبیب بن سالم عن ابیہ والی روایت اگرچہ معروف تو نہیں لیکن ممکن ہیکہ اسطرح کی بھی کوئی سند مروی ہو اور حدیث باب میں حبیب بن سالم

اپنے والد ہی سے نقل کررہے ہوں۔(وحبیب بن سالم) یہ حبیب نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے آزادکردہ غلام ہیں۔

(وروی عن النعمان بن بشیر احادیث) یہ لفظ روی فعل معروف بھی ہوسکتا ہے تو اس صورت میں حبیب ہی کے احوال بیان کئے جارہے ہیں تو اب معنی یہ ہوگا کہ حبیب نے نعمان بن بشیرؓ سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں اور یہ لفظ رُوِیَ فعل مجہول بھی ہو سکتا ہے تو اس صورت میں یہ ماقبل سے الگ جملہ ہوگا کہ نعمان بن بشیر صحابی رضی اللہ عنہ سے بہت سی احادیث مروی ہیں اس صورت میں یہ جملہ نعمان سے حال[1] بنے گا حبیب راوی سے حال واقع نہیں ہوگا۔

(قولہ وقد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یقرأ فی صلاۃ العیدین بقاف واقتربت الساعۃ) مصنف نے آگے اس حدیث کی سند کو بیان کیا[2] ہے جس کو یہاں پر قد روی کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا آگے اسی روایت کو متصل سند کے ساتھ حدیث کے الفاظ ذکر کئے ہیں اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سوۃ اعلیٰ اور سورۃ غاشیہ کا پڑھنا عیدین میں بطور دوام کے نہ تھا کہ ان سورتوں کے علاوہ بالکل نہیں پڑھتے ہونگے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان سورتوں کے علاوہ بھی عیدین میں دوسری سورتوں کا پڑھنا ثابت ہے۔

حضرت عمرؓ نے ابوواقدؓ لیثی سے سوال کیوں کیا؟: حدیث باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابوواقد اللیثی سے پوچھنے میں دو احتمال ہیں یا تو یہ مقصد ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسنون سورتیں معلوم نہیں تھیں چنانچہ بہت سے مسائل کبار صحابہؓ پر مخفی تھے، تو اس سے تنبیہ ہے کہ جو شخص علم اور فقہ میں بڑھا ہوا ہو وہ اپنے سے علم میں کمتر سے سوال کرسکتا ہے تو اس طرح ابوواقد اللیثی کی فضیلت اور انکا درجہ بھی واضح ہورہا ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسنون سورتیں معلوم تھیں لیکن خلیفہ وقت کے علاوہ دوسرے صحابی سے مسئلہ کی وضاحت کروانا چاہ رہے تھے چنانچہ کبھی ایک صحابی حدیث کو بیان کرتا ہے اور خلیفہ وقت اسپر خاموشی اختیار کرتا ہے اس طرح سکوت کے ذریعے آدمی جو تبلیغ کرتا ہے وہ اس کے کہنے اور بیان کرنے کی صورت سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم تھا لیکن انکا مقصد یہ تھا کہ وہ مزید توثیق حاصل کرلیں کیونکہ انہیں اس مسئلہ میں شک اور تردد پڑ گیا تھا۔

---

[1] یہ بھی ایک احتمال ہے لیکن اس صورت میں اس کلام میں کوئی مزید فائدہ حاصل نہیں ہوتا لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ پہلے والا احتمال مراد لیا جائے اور اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ لفظ ابیہ کے غلط ہونے پر ایک اور قرینہ ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حبیب راوی نے بہت سی روایتیں نعمان صحابی سے بغیر کسی واسطہ کے سنی ہیں کیونکہ وہ انکے آزاد کردہ غلام اور کاتب تھے (تو یہ دوسرا قرینہ اسی وقت بنیگا جب یہ لفظ روئ ہو فعل معروف ہو اور یہاں احتمال اول مراد ہو۔ازمترجم)

[2] امام ترمذیؒ پر یہ اشکال ہے کہ انہوں نے حدیث باب عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ ان عمر بن الخطاب والی روایت کو صحیح قرار دیا ہے حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبیداللہ راوی کا حضرت عمرؓ سے لقاء ثابت نہیں اور انکی یہ روایت مرسل ہے جیسا کہ خلاصہ میں اسکی تصریح ہے۔

(قوله بهذا الاسناد ونحوه) یعنی اس دوسری حدیث کی سند اور متن بالکل پہلی حدیث کی طرح ہے تو ھناد راوی نے بھی حدیث کو اسی سند اور متن کے ساتھ ذکر کیا ہے جس سند اور متن کو اسحٰق بن موسیٰ انصاری نے ذکر کیا ہے۔

باب ماجاء فی التکبیر فی العیدین

باب عیدین کی تکبیرات زائدہ کا بیان

☆حدثنا مُسْلِمُ بن عمر وابو عمرو الحذّاء المدینی حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن نافعٍ الصَّائِغُ عن کثیر بن عبد اللّٰہ عن ابیه عن جده: اَن النبیَّ صلی اللّٰہ علیه وسلم کَبَّرَ فی العیدین: فی الاولی سَبْعاً قبلَ القراءۃِ وفی الآخرۃِ خَمْساً قبلَ القراءۃِ۔قال: وفی الباب عن عائشةَ، وابن عمرَ، وعبد اللّٰہ بن عَمْرٍو۔ قال ابو عیسی: حدیث جَدِّ کَثِیرٍ حدیثٌ حسنٌ، وهو احسنُ شیءٍ رُوِیَ فی هذا الباب عن النبیِّ ﷺ۔ واسمه عَمْرُو بن عَوْفٍ المُزَنِیُّ۔ والعملُ علی هذا عند بعض اهل العلم من اصحاب النبیِّ صلی اللّٰہ علیه وسلم وغیرهم۔ وهکذا رُوِیَ عن ابی هریرةَ: انه صلّٰی بالمدینة نحوَ هذه الصلاۃ۔ وهو قول اهل المدینة۔وبه یقولُ مالكُ بن انس، والشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰق۔ ورُوِیَ عن عبد اللّٰہ بن مسعود انه قال فی التکبیر فی العیدین: تِسْعَ تکبیرات :فی الرکعة الاولی خَمْساً قبلَ القراءۃ، وفی الرکعة الثانیة یَبْدَأُ بالقراءۃِ ثُمَّ یُکَبِّرُ اربعاً مع تکبیرة الرُّکوعِ۔وقد رُوِیَ عَنْ غیر واحدٍ من اصحاب النبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم نحوُ هذا۔ وهو قولُ اهل الکوفة۔ وبه یقولُ سفیانُ الثوریُّ۔

﴿ترجمہ﴾

کثیر بن عبداللہ نے اپنے والد اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کی نماز میں پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں۔ اس باب میں عائشہ، اور ابن عمر اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کثیر کے دادا کی حدیث حسن ہے اور اس باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث میں سب سے اچھی ہے۔ کثیر کے دادا کا نام عمرو بن عوف مزنی ہے۔ اسی پر بعض اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کا عمل ہے۔ اسی حدیث کی مانند حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ میں اسی طرح عید کی نماز کی امامت کی۔ یہی قول اہل مدینہ، شافعی، مالک، احمد واسحٰق کا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عید کی نماز میں نو تکبیریں کہیں۔ پانچ تکبیریں

قرأت سے پہلے پہلی رکعت میں اور چار تکبیریں دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع کی تکبیر کے ساتھ۔ کئی صحابہؓ سے اسی طرح مروی ہے یہ اہل کوفہ اور سفیان ثوری کا قول ہے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ روی عن ابن مسعود انہ قال فی التکبیر فی العیدین تسع تکبیرات[1] فی الرکعة الاولی خمس تکبیرات) ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول میں پانچ تکبیرات بطور تغلیب کے کہی گئی ہیں ورنہ قرأت سے پہلے پانچ تکبیرات نہیں کہتے تھے بلکہ قرأت سے پہلے چار تکبیرات کہتے تھے ایک تکبیر تحریمہ اور تین تکبیراتِ زائدہ اور قرأت کے بعد پانچویں تکبیر رکوع کیلئے ہوتی تھی چونکہ اس روایت کے علاوہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صراحۃً اسی طرح ثابت ہے

حنفیہ کی وجوہِ ترجیح: اسلئے امام ابوحنیفہؒ نے اس مذہب کو اختیار کیا ہے جس پر ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابوموسیٰؓ متفق ہیں یعنی دو رکعتوں میں چھ تکبیراتِ زائدہ امام ابوحنیفہؒ کے تکبیرات عیدین میں ابن مسعود کے قول کو اختیار کرنے کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ انکے علاوہ دوسرے صحابہ سے متعارض روایات مروی ہیں نیز ابوموسیٰ اشعری، حذیفۃ بن الیمان اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی احادیث اس مسئلہ میں ایک ہی طرح مروی ہے نیز ان صحابہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسی طرح تعامل[2] مروی ہے اس لئے ہم نے ان کے مذہب کو اختیار کیا ہے۔

باب ماجاء لاصلاةَ قبل العید و لا بعدها

باب عیدین سے پہلے اور بعد میں کوئی نماز نہیں

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داودَ الطَّیَالِسِیُّ قال: انبانا شعبة عن عَدِیٍّ بن ثابتٍ قال:

---

[1] تکبیرات عیدین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں یہاں تک کہ ابن منذر سے اس میں بارہ قول نقل ہیں جن میں سے مشہور تین قول ہیں: ۱۔امام مالک کا قول اور امام احمد کی مشہور روایت میں عیدین کی پہلی تکبیر اولی کو ملا کر سات زائد تکبیریں ہونگی اور دوسری رکعت میں پانچ، ۲۔امام شافعیؒ کے مذہب میں پہلی رکعت میں سات تکبیرات زائدہ ہونگی تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور دوسری رکعت میں پانچ، ۳۔حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں تین تکبیرات زائدہ ہونگی مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے شاید آپ کو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ، امام مالکؒ کا ایک ہی مذہب ذکر کیا ہے یہ نقل صحیح نہیں۔

[2] اوجز میں ان صحابہ کرام کے آثار کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے فارجع الیہ لوشئت تفصیل الدلائل۔

سمعت سعید بن جُبَیرٍ یحدِّث عن ابن عباسٍ: ان النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم خرجَ یومَ الفطر فصلّی رکعتین، ثم لم یُصَلِّ قبلھا ولا بعدھا۔قال: وفی البابِ عن عبد اللّٰہ بن عمرَ، وعبد اللّٰہ بن عمرو، وابی سعید۔قال ابو عیسی: حدیث ابن عباسٍ حدیث صحیحٌ۔ والعملُ علیہ عند بعض اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وغیرھم۔ وبہ یقول الشافعیُّ، واحمد، واسحٰق۔وقد رَاَی طائفۃ من اھل العلم الصلاۃَ بعدصلاۃ العیدین وقبلھا، من اصحاب النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم وغیرھم۔ والقولُ الاولُ اصحُّ۔

☆حدثنا ابو عمّارٍ الحسین بن حُرَیْثٍ حَدَّثَنَا وکیعٌ عن ابانَ بن عبد اللّٰہ البَجَلِیِّ عن ابی بکر بن حفصٍ، وھو ابن عمرَ بن سعد بن ابی وقّاص، عن ابن عمر: اَنَّہٗ خرج یوم عیدٍ فلم یُصَلِّ قبلَھا ولا بعدھا، وذکران النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فَعَلَہٗ۔قال ابو عیسی: وھٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن گھر سے نکلے اور دو رکعتیں پڑھیں (یعنی عید کی نماز) نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ اس کے بعد۔اس باب میں عبداللہ بن عمرو، ابوسعید رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر بعض علماء صحابہ وغیرہ کا عمل ہے۔امام شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اہل علم کی ایک جماعت عید سے پہلے اور بعد میں نفل نماز پڑھنے کی قائل ہے لیکن پہلا قول اصح ہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ عید کے لئے گھر سے نکلے اور عید کی نماز سے پہلے اور بعد کوئی نماز نہیں پڑھی اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حنفیہ کا مذہب: (لا صلوٰۃ قبل العیدین ولا بعدھا[1]) اس مسئلہ میں حنفیہ کا مذہب[2] یہ ہے کہ عیدین سے پہلے نوافل مطلقاً منع ہیں نہ گھر میں پڑھیگا نہ عیدگاہ میں اور عیدین کے بعد عیدگاہ میں نفل منع ہے گھر پر کوئی حرج نہیں۔

---

[1] ولا بعدھا نسخوں میں اسی طرح مفرد کی ضمیر کے ساتھ ہے لیکن راجح یہ ہے کہ بعدھما ہونا چاہئے اگر چہ مفرد کی ضمیر کی تاویل بھی ہوسکتی ہے۔

[2] **اس مسئلہ میں تین مذہب:** یعنی حنفیہ کا راجح مذہب یہی ہے ورنہ اس مسئلہ میں لمبا تفصیلی اختلاف ہے اس کو میں نے اوجز میں نقل کیا ہے ابن المنذر نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ اہل کوفہ عیدین کے بعد نوافل پڑھتے ہیں عیدین سے پہلے نہیں پڑھتے اور اہل بصرہ عیدین سے پہلے نوافل پڑھتے ہیں نہ کہ اسکے بعد اور اہل مدینہ نہ عیدین سے پہلے نوافل پڑھتے ہیں اور نہ ہی عیدین کے بعد۔

(وقد رای طائفة من اھل العلم الصلوٰۃ قبل العیدین و بعدھا) ان علماء کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر چہ خودتو عیدین سے پہلے اور بعد میں نوافل نہیں پڑھے لیکن اس سے منع تو نہیں فرمایا لہٰذا ان نوافل سے کیسے روکا جا سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز اس وقت ادا فرماتے تھے جب سورج اسقدر بلند ہو جائے کہ وقت مکروہ ختم ہو چکا ہو لہٰذا اگر عید کی نماز سے پہلے نوافل پڑھنا جائز ہوتو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ نوافل پر حریص تھے زندگی بھر میں کبھی تو اس وقت نوافل ادا فرماتے لیکن آپ نے پوری عمر میں ایک مرتبہ بھی عیدین میں ارتفاعِ شمس کے بعد نوافل نہیں پڑھے۔

باب ماجاء فی خُروج النساء فی العیدین

باب عیدین کیلئے عورتوں کا نکلنا

☆حدثنا احمدُ بن منیع حَدَّثَنَا ھشیم اخبرنا منصورٌ، وھو ابن زَاذَانَ، عن ابن سیرینَ عن اُمِّ عَطِیَّةَ: اَنَّ رسولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کان یُخرِجُ الابُکَارَ وَالعَوَاتِقَ وذَوَاتِ الخُدُورِ والحُیَّضَ فی العیدین، فَاَمَّا الحُیَّضُ فَیَعْتَزِلْنَ المصلّٰی ویَشْھَدْنَ دَعْوَۃَ المسلمینَ، قالت اِحْدَاھُنَّ، یارسولَ اللّٰہِ، ان لم یَکُنْ لھا جِلْبَابٌ ؟ قال: فَلْتُعِرْھَا اُخْتُھَا من جَلبابھا۔

☆حدثنا احمد بن منیع حَدَّثَنَا ھشیم عن ھشام بن حسان عن حفصة بنت سیرین عن ام عطیة: بنحوہ۔ قال: وفی الباب عن ابن عباس، وجابر۔ قال ابو عیسی: حدیث امِّ عطیة حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد ذھب بعضُ اھل العلم الی ھذا الحدیث، ورَخَّصَ للنساء فی الخروج الی العیدین۔ وکرھه بعضھم۔ ورُوی عن عبد اللّٰہ بن المبارك انه قال: اَکْرَہُ الْیَوْمَ الخروج للنساء فی العیدین، فِان اَبَتِ المراۃ الا ان تخرج فلیاذن لھا زوجھا اَنْ تَخْرُجَ فی اطمارھا ولا تتزین فان ابت ان تخرج کذلك فللزوج ان یمنعھا عن الخروج۔ویُروَی عن عائشةَ رضی اللّٰہ عنھا قالت: لَوْرَاٰی رسولُ اللّٰہ ﷺ مااَحْدَثَ النساءُ لَمَنَعَھُنَّ المسجدَ کما مُنِعَتْ نساء بنی اسرائیل۔ویروی عن سفیانَ الثوریِّ انه کرہ الیوم الخروج للنساء الی العید۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کیلئے کنواری لڑکیوں، جوان و پردہ نشین اور حائضہ عورتوں کو نکلنے کا

حکم دیتے تھے۔ حائضہ عورتیں عیدگاہ میں ایک جانب کو علیحدہ بیٹھتیں اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوتیں۔ ان میں سے ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کسی کے پاس چادر نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کی بہن اسے اپنی چادر (ادھار) دیدے۔

ہم سے بیان کیا احمد بن منیع نے انہوں نے ہشیم سے انہوں نے ہشام بن حسان سے انہوں نے حفصہ بن سیرین سے انہوں نے ام عطیہ سے اسی کے مثل۔ اس باب میں ابن عباس و جابر سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ام عطیہ حسن صحیح ہے۔ بعض اہل علم اسی پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کو عیدین کیلئے جانے کی اجازت دیتے ہیں اور بعض اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ ابن مبارک سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا آج کل میں عیدین کی نماز کیلئے عورتوں کا گھر سے نکلنا مکروہ سمجھتا ہوں لیکن اگر وہ نہ مانے تو اس کا شوہر اسے میلے کپڑوں میں بغیر زینت کے نکلنے کی اجازت دیدے اور اگر زینت کرے تو اس کے شوہر کو اسے نکلنے سے منع کر دینا چاہیئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی ان چیزوں کو دیکھتے جو انہوں نے نئی بدعات نکالی ہیں تو انہیں مسجد جانے سے منع فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا۔ سفیان ثوری سے بھی یہی مروی ہے کہ وہ اب عورتوں کیلئے نکلنا مکروہ سمجھتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

(قولہ ذوات الخدور) یہ پہلی دونوں قسموں کو شامل ہیں (یعنی ابکار اور عواتق دونوں کو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ عورتیں نماز پڑھنے کی غرض سے نکلیں تو یہ حکم ان عورتوں کیلئے نہیں ہے جو کہ اپنی ضروریات کیلئے نکلتی ہیں اور لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہیں بلکہ نماز عیدین کیلئے نکلنے کا حکم پردہ نشین اور تمام قسم کی عورتوں کو ہے۔

کیا عیدگاہ اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟: (قولہ فیعتزلن المُصلّٰی) اس جملہ سے ان علماء نے استدلال کیا ہے[1] جو کہتے ہیں کہ عیدگاہ کا بھی مسجد والا حکم ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ناپاک عورتوں کو عیدگاہ سے

---

[1] **حائضہ عورتوں کو عیدگاہ میں الگ رکھنے کی علت:** حافظ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ جمہور نے اس حکم کو استحباب پر محمول کیا ہے کہ عورتوں کیلئے مستحب یہ ہے کہ عیدگاہ سے الگ رہیں لیکن چونکہ عیدگاہ کا حکم مسجد کا حکم نہیں ہے اسلئے عیدگاہ میں جانا حرام بھی نہیں، کرمانی نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ عورتوں کو عیدگاہ سے الگ رہنا ضروری ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ ممانعت بطور مکروہ تنزیہی فعل سے روکنے کیلئے نہ کہ مکروہ تحریمی فعل سے لہٰذا ان عورتوں کو عیدگاہ جانے سے روکا جائیگا تاکہ بلاضرورت عورتوں کا مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔ ہمارے بعض علماء نے عورتوں کے اس فعل کو حرام کہا ہے ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ حائضہ کو الگ رہنے کا حکم اسلئے دیا گیا کہ وہ اپنے خون اور بدبو سے دوسری عورتوں کو تکلیف نہ پہنچائے۔ حنفیہ کی فروع میں ہے کہ عیدگاہ کا حکم اس مسئلہ میں مسجد کا نہیں البتہ اقتداء کے صحیح ہونے میں اس کا حکم مسجد ہی کا حکم ہے۔ علامہ شامیؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

الگ رہنے کا حکم اسلئے دیا تا کہ نماز پڑھنے والی عورتیں، نماز نہ پڑھنے والی عورتوں کے ساتھ نہ ملیں کیونکہ نماز نہ پڑھنے والی عورتوں کے کپڑے کچھ نہ کچھ ناپاک ہوا ہی کرتے ہیں نیز عورتوں کو یہ حکم دیا گیا تا کہ وہ زیب وزینت کر کے باہر نہ نکلیں تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ عورتیں اپنے گھر کے کپڑوں میں عیدین میں شریک ہونگی تو انکے گھر کے کپڑوں میں نماز نہ پڑھنے کے دنوں میں کچھ نہ کچھ نجاست تو ہوگی نیز اگر یہ ناپاک عورتیں نمازی عورتوں کے ساتھ ملکر عیدگاہ میں داخل ہو جائینگی تو اس سے صفیں درست نہ رہیں گی اور بیچ بیچ میں سے صفوں کا ٹوٹنا لازم آئیگا۔

(ویشھدن دعوۃ المسلمین) اس جملہ سے تنبیہ ہے کہ عوتوں کے عیدگاہ میں جانے کے کیا کیا فوائد ہیں تو ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے اور انکی تعداد زیادہ نظر آتی ہے نیز نیک لوگوں کے انوار انکے ساتھ رہنے والے لوگوں پر منعکس ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی ایک جماعت کے پاس پہنچا وہ لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے تو یہ شخص ان کے ساتھ عصر کی نماز میں شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اس وقت میں نفل پڑھنا مکروہ ہے لیکن انکی دعاؤں میں شریک ہوسکتا ہے۔

(وکرہ بعضھم) عورتوں کے عیدین کی نماز کیلئے نکلنے کے مکروہ ہونے پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ جب بنو اسرائیل کی عورتوں نے غلط کام شروع کئے تو انہیں گھر سے باہر نکلنے سے روک دیا گیا تھا چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانے کی عورتوں کے ان کاموں کو دیکھ لیتے تو ان عورتوں کو گھروں سے نکلنے سے روک دیتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ فرمان انکی وسعت علمی اور بھرپور حکمت پر دال ہے تو انکے اس قول سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گذشتہ امتیوں کے شرعی احکام ہمارے لئے بھی واجب العمل [1] ہیں جب تک کے بطور انکار اور رد کے انکی تلاوت نہ کی جائے لہذا گذشتہ امتوں کی عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی اجازت امت محمدیہ کی عورتوں کیلئے بھی اجازت شمار ہوگی اور جب انہیں انکے برے افعال پر گھر سے نکلنے سے منع کر دیا گیا تو امت محمدیہ کی عورتوں کو بھی منع ہونا چاہیئے۔

(وقد روی عن ابن المبارك انه قال اکرہ الخروج للنساء یوم العید) اس ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں کا نکلنا کسی فساد اور فتنہ کو برپا نہیں کرتا تھا بخلاف ہمارے زمانے کی عورتیں کہ عیدین کیلئے بھی نکلیں گی تو فتنہ اور فساد مچائیں گی۔

---

[1] یعنی پہلی امتوں کے شرعی احکام ہم پر اس وقت واجب العمل ہونگے جبکہ کتاب وسنت میں اسے بیان کیا جائے جیسا کہ اہل اصول نے اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے کیونکہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ہے لہذا یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ فلاں حکم واقعی شرعی حکم تھا یا انکا گھڑا ہوا یہ اسی وقت معلوم ہوگا جبکہ قرآن وسنت میں اس کا ذکر موجود ہو۔

آج کے زمانے میں عورتوں کا عیدگاہ جانا منع ہے: (فان ابت الا ان تخرج فلیاذن لھا زوجھا ان تخرج فی اطمارھا الخ) مطلب یہ ہے کہ یہ عورتوں کو گھر سے نکلنے سے روکنے کا ایک حیلہ ہے بظاہر تو اس جملہ سے اجازت معلوم ہو رہی ہے لیکن حقیقت میں اس سے مقصود عورت کو منع کرنا ہے عیدین میں جانے سے کیونکہ عورتوں کی یہ عادت ہے کہ وہ عیدین کی طرف زیب و زینت کر کے نکلتی ہیں اسلئے انہیں بوسیدہ کپڑوں میں نکلنے کا حکم دیا گیا تا کہ بالکل وہ نکلے ہی نہیں۔

بابُ ماجاء فی خُرُوجِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم الی العید فی طریق وَرُجُوعُهُ من طریق آخر

باب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عیدین کی نماز کیلئے ایک راستے سے جانا اور دوسرے سے آنا

☆حدثنا عبد الاعلی بن واصل بن عبد الاعلی الکوفی وابو زرعة قالا: حَدَّثَنَا محمد بن الصَّلْتِ عن فُلَیحِ بن سلیمانَ عن سعید بن الحرث عن ابی هریرة قال: کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم اِذا خرج یوم العید فی طریق رجَع فی غیره۔ قال: وفی الباب عن عبد اللّٰه بن عمرَ، وابی رافعٍ۔قال ابو عیسی: وحدیث ابی هریرة حدیث حسن غریب۔ ورَوَی ابو تُمَیْلَةَ ویونس بن محمد هذا الحدیث عن فُلَیحِ بن سلیمان عن سعید بن الحرث عن جابر بن عبد اللّٰه۔ قال: وقد استحبَّ بعضُ اهل العلم للِامام اذا خرج فی طریقٍ ان یرجع فی غیره، اتِّبَاعاً لهٰذا الحدیث۔ وهو قولُ الشافعیِّ۔ وحدیث جابرٍ کَاَنَّهٗ اَصَحُّ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز کیلئے ایک راستے سے جاتے اور دوسرے سے واپس تشریف لاتے۔ اس باب میں عبداللہ بن عمر، ابو رافع رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حسن غریب ہے اسے ابو تمیلہ اور یونس بن محمد، فلیح بن سلیمان سے وہ سعید بن حارث سے اور وہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اہل علم کے نزدیک اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے نماز عید کیلئے ایک راستے سے جانا اور دوسرے سے واپس آنا مستحب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے اور حدیث جابر رضی اللہ عنہ گویا کہ زیادہ صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

راستہ بدلنے کی حکمت: اس طرح راستے بدلنے کا مقصد یا تو یہ تھا کہ یہ دونوں راستے قیامت والے دن گواہ بن جائیں یا دونوں جانب کے کفاروں کو مسلمانوں کی شوکت اور دبدبہ دکھلانا مقصود تھا یا اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں راستے آپ کی آمد و رفت سے مشرف ہو جائیں اور وہ لوگ جو بوجہ ضعف اور کمزوریوں کے عید میں حاضر نہیں ہو سکے اسی طرح جو

عورتیں اور بچے عیدگاہ نہیں جاسکیں تو وہ نمازیوں کی آمد و رفت اور اللہ تعالیٰ کے ذاکرین مرد اور عورتوں کی آمد سے مشرف ہو جائیں خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کمزوروں کو آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے اسی طرح خلفاء کے زمانے میں وہ انکی زیارت کرسکیں۔

(قوله وقد استحب بعض اهل العلم للامام اذا خرج فی طریق الخ) امام کی تخصیص کی وجہ یہی ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ حاکم وقت کے ساتھ عیدگاہ جاتے اور ساتھ واپس آتے ورنہ یہ ہر ہر شخص کے حق میں سنت ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (وحدیث جابر کانه اصح) لفظ کانہ سے اشارہ ہے کہ مصنف اسکو یقینی طور پر[1] اصح نہیں کہہ سکتے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث بھی ممکن ہے کہ ایسی سندوں سے مروی ہو جو حضرت جابرؓ کی حدیث کی بنسبت کم راویوں سے مروی ہو۔

باب ماجاء فی الاکل یوم الفطر قبل الخروج

باب عیدالفطر میں نماز عید کیلئے نکلنے سے پہلے کچھ کھا کر جانا چاہیئے

☆حدثنا الحسن بن الصباح البزار البغدادی حَدَّثَنَا عبد الصمد بن عبد الوارث عن ثواب بن عتبة عن عبد اللّٰه بن بريدة عن ابيه قال: كَانَ النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم لايَخرُجُ يومَ الفطرِ حتّٰى يَطْعَمَ، وَلا يَطْعَمُ يومَ الاَضحى حتى يصلِّيَ۔ قال:وفی الباب عن عليٍّ ، وانسٍ۔ قال ابو عيسى: حديث بُرَيْدَة بن حُصَيْبٍ الْأَسْلَمِّي حديث غريبٌ۔وقال محمدٌ: لااعرفُ لثوَابِ بن عُتْبَةَ غيرَ هذا الحديث۔ وقد استَحَبَّ قومٌ من اهل العلم ان لَّا يخرجَ يوم الفطرِ حتّٰى يَطْعَمَ شيئاً، ويُسْتَحَبُّ له ان يُفطرَ على تَمْرٍ، وَلَا يَطْعَمَ يومَ الاضحى حتّٰى يرجعَ۔

---

[1] اہل فن حدیث کا ان دونوں روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینے میں اختلاف واقع ہوا ہے چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ کی حدیث نقل کی ہے پھر فرمایا کہ یونس بن محمد نے عن فلیح عن ابی ہریرہ کی سند سے اس کی متابعت کی ہے لیکن جابر کی حدیث اصح ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ روایت جابرؓ کی مسندات میں سے ہے لیکن ابومسعود اور بیہقی نے انکی مخالفت کر کے اسے مسندات ابی ہریرہ میں شمار کیا ہے اور مجھے ابھی تک کسی ایک سند کی وجہ ترجیح ظاہر نہیں ہوئی، انتہی۔ قلت: یہ بات جاننی چاہیئے کہ امام بخاریؒ کا قول اس حدیث کی فلانے نے عن ابی ہریرہ کی سند سے متابعت کی ہے یہ بات قابل اشکال ہے بہر حال اسکی تفصیل کا محل شروح بخاری ہیں۔

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا هشیم عن محمد بن اسحٰق عن حَفْصِ بن عبید اللّٰه بن انس عَنْ انس بن مالكٍ: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم كان یُفطِرُ علی تَمَراتٍ یومَ الفِطرِ قبل ان یخرج الی المصلّٰی۔

قال ابوعیسی: ھذا حدیث حسن غریب صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کیلئے اس وقت تک نہ جاتے جب تک کچھ کھا نہ لیتے جب کہ عیدالاضحیٰ میں اس وقت تک کچھ نہ کھاتے جب تک نماز نہ پڑھ لیتے۔ اس باب میں علی وانس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بریدہ بن حصیب اسلمی کی حدیث غریب ہے۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری فرماتے ہیں میں ثواب بن عتبہ کی اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں جانتا۔ اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک یہ مستحب ہے کہ عیدالفطر کے دن نماز سے پہلے کچھ کھالینا چاہیئے اور کھجور کا کھانا مستحب ہے۔ عیدالاضحیٰ میں نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا مستحب ہے یہاں تک کہ گھر لوٹ آئے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن عیدگاہ کی طرف نکلنے سے پہلے چند کھجوریں تناول فرماتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

عیدین کے دن روزہ حرام ہونے کی حکمت: یہ بات بدیہی ہے کہ رمضان کے مہینے کے روزوں میں سے سب سے پہلے روزہ میں جو مشقت ہوتی ہے وہ دوسرے روزے میں نہیں ہوتی اور دوسرے روزے میں جو مشقت ہوتی ہے وہ تیسرے روزے میں نہیں ہوتی اسی طرح آخر تک، تو رمضان کے آخری دنوں کے روزے رکھنے مشقت سے خالی رہتے ہیں اور وہ عادت بن جاتے ہیں تو حدیث باب سے مقصود یہ ہے کہ شارع نے اپنے احکام کی جو حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کیا جائے لہٰذا رمضان کے روزوں میں کمی بیشی سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ چونکہ رمضان کی فرضیت سے پہلے مسلمان روزوں کے عادی نہیں[1] تھے تو انکی ہلکی سے مخالفت بھی کافی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے بظاہر یہ عبارت غیر معتادی الصیام ہونا چاہیئے العادی لغت میں اس شئی کو کہتے ہیں جس کو عادۃ کیا جاتا ہو

"لا تواصلوا شعبان برمضان" سے انہیں منع فرمادیا۔ رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنے کے بعد مسلمان روزے رکھنے کے عادی ہو گئے اور اب طبیعت روزے سے اعراض نہیں کرتی تھی جیسا کہ رمضان سے پہلے کرتی تھی اسلئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ انہیں ایسی سختی کیساتھ ممانعت کی جائے جو پہلی ممانعت سے بڑھی ہوئی ہو لہٰذا پانچ دنوں کے روزے حرام قرار[1] دیئے گئے۔ جن میں ایک عید الفطر کے دن بھی روزہ رکھنا حرام قرار دیا گیا۔ نیز حدیث باب میں نماز عید سے پہلے کچھ کھانے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے تا کہ اس حرام فعل کا سد باب کیا جائے ہاں عید الاضحیٰ میں یہ حکم نہیں دیا گیا کیونکہ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی مہمانی سے ابتداء کرنے کا حکم ہے پھر صبح وقت کچھ دیر اگر کوئی شخص بغیر کھائے پیئے رہے تو یہ بھی ایک قسم کا روزہ ہے کیونکہ یہود کا روزہ اتنی ہی دیر کا ہوتا تھا اس لئے تشبہ بالیہود لازم آرہا تھا بخلاف عید الاضحیٰ کے کہ اس میں یہ علت نہیں پائی جارہی کیونکہ وہاں پر نماز عید کو جلدی پڑھنے کا حکم ہے اسلئے اتنی دیر کا روزہ بھی نہیں ہوگا نیز ذی الحجہ کے مہینے میں شریعت کی طرف سے روزہ رکھنے کا حکم ہی نہیں تو ۱۰ تاریخ کو روزہ رکھنے سے شرعی روزوں پر زیادتی بھی لازم نہیں آتی نیز ۱۰ تاریخ کو افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے رب کریم کی میزبانی میں سے کچھ کھائے۔

کھجور کی تخصیص کی وجہ: (قوله يستحب له ان يفطر على تمر) کھجور کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ حدیث باب میں کھجور کی ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کے ہاں یہ سب سستی شئی تھی یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھجور تناول فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ چونکہ یہ میٹھی ہوتی ہے تو معدہ کو میٹھی چیز سے مناسبت ہے اسلئے کھجور کو حدیث میں ذکر کیا گیا۔

---

[1] حرام سے مراد مکروہ تحریمی ہے کیونکہ فقہاء کے عرف میں مکروہ تحریمی پر لفظ حرام کا اطلاق ہوتا رہتا ہے چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ امام محمد نے مکروہ تحریمی کا نام حرامِ ظنی رکھا ہے۔

﴿ابواب السفر﴾

باب ماجاء فی التّقُصِیرِ فی السَّفَرِ

باب سفر میں قصر نماز پڑھنا

☆ حدثنا عبدالوهّاب بن عبدالحكم الورّاق البغداديُّ حدَّثَنَا يحيىٰ بن سليم عن عبيد الله عن نافع عن ابن عمرؓ قال: سافرتُ مع النبيِّ ﷺ وابى بكر وعمر وعثمان فكانوا يُصَلُّونَ الظهرَ والعصرَ ركعتين، لا يُصَلُّونَ قبلها ولا بعدها وقال عبدالله : لو كنت مصليا قبلها او بعدها لا تممتها۔ قال: وفى الباب عن عمرَ، وعليٍّ، وابن عباسٍ، وانسٍ، وعمران بن حُصَينٍ، وعائشة۔ قال ابو عيسىٰ: حديث ابن عمر حديث حسن غريب، لانعرفه الا من حديث يحيىٰ بن سليم مثل هذا۔ قال محمد بن اسماعيل : وقد روى هذا الحديث عن عبيد الله بن عمر عن رجل من آل سراقة عن عبدالله بن عمر۔ قال ابو عيسىٰ: وقد روى عن عطيَّةَ العَوْفِيِّ عن ابن عمرَ: ان النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَتَطَوَّعُ فى السفرِ قبلَ الصلاة وبعدَها۔وقد صَحَّ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم انه كان يَقْصُرُ فى السفرِ، وابو بكر وعمرُ وعثمانُ صَدْراً من خلافته۔ والعمل على هذا عند اكثر اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم وغيرهم۔ وقد رُوِىَ عن عائشةَ انها كانت تتم الصلاة فى السفر۔والعملُ على مارُوِىَ عن النبى صلى الله عليه وسلم واصحابه۔وهو قول الشافعيِّ، واحمدَ، واسحٰق، اِلَّا اَنَّ الشافعيَّ يقول: التَّقْصِير رُخْصَةٌله فى السفر، فاِن اَتَمَّ الصلاةَ اجزأ عنه۔

☆حدثنا احمد بن منيع حَدَّثَنَا هشيم اخبرنا عليُّ بنُ زَيد بن جُدْعَانَ القُرَشِيُّ عن ابى نَضْرَةَ قال: سُئِلِ عِمْرَانُ بن حُصَيْنٍ عن صلاة المسافرِ؟ فقال: حَجَجْتُ مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلّى ركعتين: وحججتُ مع ابى بكرٍ فصلّى ركعتين، ومع عمرَ فصلّى ركعتين ، ومع عثمانَ سِتَّ سنين من خِلافتِهِ، او ثَمانِيَ سنينَ، فصلّى ركعتين۔ قال ابوعيسى: هذاحديث حسن صحيحٌ۔

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا سفيانُ بن عيينة عن محمد بن المنكدر وابراهيم بن مَيْسَرَةَ انهما سمعا انس بن مالكٍ قال: صلَّينا مع النبى صلى الله عليه وسلم الظهرَ بالمدينة اربعاً، وبذِى الحُلَيْفَةِ العصر ركعتين۔ قال ابو عيسى: هذا حديث صحيحٌ۔☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا هشيم عن منصورِ بن زَاذَانَ عن ابن سيرينَ عن ابن عباسٍ: ان النبى صلى الله عليه وسلم خرج من المدينة الى مكة لايَخَافُ اِلَّا اللّٰه رَبَّ العالَمينَ، فصلّى ركعتين۔ قال ابو عيسى: هذا حديثٌ حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفر کیا یہ حضرات ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور ان سے پہلے یا بعد میں کوئی نماز نہ پڑھتے۔ عبداللہ فرماتے ہیں اگر میں ان سے پہلے یا بعد میں بھی سنتیں پڑھنا چاہتا تو فرض ہی کو مکمل کر لیتا۔ اس باب میں حضرت عمر، علی، ابن عباس، انس، عمران بن حصین اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن غریب ہے۔ ہم اسے یحییٰ بن سلیم کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے وہ اس کے مثل روایت کرتے ہیں امام محمد بن اسماعیل بخاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث عبیداللہ بن عمر سے بھی مروی ہے وہ آل سراقہ کے ایک شخص سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عطیہ عوفی، ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران فرض نماز سے پہلے اور بعد میں نفل نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی صحیح سند سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر نماز پڑھتے اسی طرح ابوبکر، عمر، بھی قصر کرتے تھے اور حضرت عثمان بھی اپنے دورِ خلافت کے اوائل (اس کی وضاحت اگلی روایت میں خلافتِ عثمانی کے شروع کے چھ سال یا آٹھ سال سے آرہی ہے) میں قصر ہی پڑھتے۔ اکثر علماء اور صحابہ وغیرہ کا اسی پر عمل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ سفر میں پوری نماز پڑھتی تھیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے مروی حدیث پر ہی عمل ہے۔ امام شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے مگر امام شافعی فرماتے ہیں سفر میں قصر کرنا رخصت ہے (نہ کہ عزیمت) یعنی اگر وہ نماز پوری پڑھ لے تو بھی جائز ہے۔

☆ حضرت ابونضرہ فرماتے ہیں کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مسافر کی نماز کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں اور حج کیا میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو انہوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور حج کیا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو انہوں نے دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کے دورِ خلافت میں چھ یا آٹھ سال حج کیا آپ نے بھی دو ہی رکعتیں پڑھیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں ظہر کی چار رکعات ادا کیں پھر ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعتیں پڑھیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کیلئے روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العالمین کے علاوہ کسی کا خوف نہ تھا اور راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(قوله لا يصلون قبلها و لا بعدها) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء ثلثہ بطور تاکد کے ان سنتوں کو نہیں پڑھتے تھے ورنہ خود ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہ روایت ثابت[1] ہے کہ وہ سنتیں سفر میں پڑھتے تھے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ کے اس قول کی تشریح:(قوله ولو كنت مصليا قبلها او بعدها لَا تْمَمْتُهَا) انکے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب سفر میں تخفیف کی وجہ سے فرائض میں کمی کر دی گئی ہے تو سنتوں میں بھی تخفیف ہونی چاہیئے۔ ہاں سنتوں میں تخفیف رکعتوں کی تعداد کم کرنے سے نہیں بلکہ اس میں تخفیف بایں طور ہے کہ جو نماز حالتِ اقامت میں سنت موکدہ تھی تو وہ سفر میں غیر موکدہ ہو جائیگی۔ تو ابن عمرؓ کا مقصد یہ ہوا کہ اگر حالت اقامت میں سنتوں میں تاکید تھی اب بھی حالت سفر میں یہ سنتیں موکدہ ہی ہیں تو فرائض میں بھی تخفیف نہیں ہونی چاہیئے لیکن جب نص قطعی سے یہ ثابت ہو گیا کہ فرض نماز میں سفر میں تخفیف کی جائیگی تو نوافل میں بھی ایک دوسرے طریقہ سے تخفیف ہونی چاہیئے، حضرت ابن عمرؓ کے خیال میں لوگ سفر میں سنتوں کی ادائیگی کو ضروری سمجھ رہے تھے چاہے کتنی مشقت اٹھانی پڑے تو جب انہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دیکھا کہ وہ سفر میں بھی سنتوں کو اسی طرح موکد سمجھتے ہیں جیسا کہ حالت اقامت میں یہ سنتیں موکدہ تھیں تو اس پر بطور نکیر کے یہ ارشاد فرمایا۔

بحالتِ سفر حضرت عثمان غنیؓ اور اماں عائشہؓ کے اتمام کی توجیہات:(وعثمان صدرا من خلافته) اس کے بعد

---

[1] **ابن عمرؓ سے سفر میں سنتیں پڑھنے سے متعلق متعارض احادیث میں تطبیق:** ابن عمرؓ سے سفر میں نوافل کے متعلق مختلف روایات مروی ہیں جن میں کئی طرح تطبیق دی گئی ہے ایک تطبیق وہ ہے جو حضرت گنگوہیؒ نے بیان فرمائی ہے حافظ نے یہ تطبیق ذکر فرمائی ہے کہ ابن عمرؓ سنن موکدہ اور غیر موکدہ میں فرق کرتے تھے سنن موکدہ پر انکار فرما رہے ہیں اور سنن غیر موکدہ کا ان سے ثبوت ہے۔ امام بخاریؒ کے صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سنن بعدیہ اور قبلیہ میں فرق ہے۔ علامہ عینی کا میلان اس طرف ہے کہ اکثر اوقات میں سفر میں سنتیں پڑھنے کی نفی ہے اور کبھی کبھار انکے پڑھنے کا اثبات ہے۔ شیخ المشائخ شاہ عبدالغنیؒ نے اس کو اختیار فرمایا ہے کہ دوران سفر سنتیں پڑھنے کی نفی ہے اور ایک جگہ ٹھیرنے کے بعد سنتیں پڑھنے کا ثبوت ہے میرے نزدیک سب سے راجح یہ ہے کہ زمین پر سنتیں پڑھنے کی نفی ہے اور سواری پر دوران سفر سنتیں پڑھنے کا اثبات ہے۔ والبسط فی الاوجز

کے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پوری چار رکعت حالت سفر میں ادا فرماتے تھے انکے اتمام کی مختلف[1] توجیہات کی گئی ہیں ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ انہوں نے اس لئے اتمام فرمایا تھا کہ اس جگہ کے حاضرین یہ نہ سمجھیں کہ ظہر وعصر کی دو ہی رکعتیں فرض ہیں لیکن اس توجیہ پر یہ اشکال ہے کہ اس سے تو یہ لازم آئیگا کہ اس جگہ مقامی لوگوں کی نماز حضرت عثمانؓ کے پیچھے فاسد ہوگی کیونکہ وہ چاروں رکعت حضرت عثمانؓ کے پیچھے فرض کی نیت سے پڑھ رہے ہیں جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آخری دونوں رکعتوں میں نفل کی نیت سے نماز ادا فرمارہے تھے تو انہوں نے ان لوگوں کو تنبیہ کیوں نہ فرمائی اور کیسے خاموش بیٹھے رہے۔ بعض حضرات نے ایک دوسری توجیہ یہ کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ میں گھر بنالیا تھا اسپر اشکال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو منع کیا تھا کہ تم لوگ جس شہر (مکہ) سے ہجرت کر کے آئے ہو اس شہر کی طرف دوبارہ نہیں لوٹنا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ ممنوع کام کیسے کیا حالانکہ آپ جلیل القدر صحابی ہیں اس لئے صحیح جواب[2] یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح سفر میں قصر واتمام دونوں کو جائز سمجھتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے "فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ" فرمایا ہے تو اس آیت کا سیاق یہ دلالت کررہا ہے کہ نماز کے قصر کرنے میں اختیار ہے اسی کو انہوں نے اختیار کیا لیکن حنفیہ چونکہ مفہوم مخالف کے قائل نہیں لہٰذا وہ کہتے ہیں اس آیت کا سیاق یہ بتارہا ہے کہ صحابہ اس قصر کرنے کو بہت گناہ سمجھتے تھے اسلئے اس کی نفی کی گئی۔ تحقیق سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ مضمون صراحۃً موجود ہے کہ شروع میں نماز دو رکعت فرض ہوئی پھر حالتِ اقامت میں رکعت میں اضافہ کیا گیا اور حالت سفر میں اضافہ نہیں کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ دو رکعت پڑھنا رخصت نہیں بلکہ سفر میں چار رکعت سرے سے فرض تھے ہی نہیں کہ ہم دو رکعت کو رخصت کہیں۔ رہا قرآن کی آیت میں اسے قصر کہا گیا تو یہ قصر، حضر کی نماز کے

---

[1] **سفر میں قصر واجب ہے یا رخصت؟ اسمیں ائمہ اربعہ کے اقوال:** جاننا چاہئے کہ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ قصر کا حکم کیا ہے حنفیہ کا اس مسئلہ میں ایک ہی قول ہے کہ قصر واجب ہے۔ امام شافعیؒ سے مختلف روایتیں مروی ہیں سب سے مشہور روایت جو شوافع کے ہاں راجح مذہب ہے وہ یہ ہے کہ قصر رخصت ہے اسی طرح امام مالکؒ سے بھی مختلف روایتیں ہیں چنانچہ اشہب نے ان سے روایت کی ہے کہ یہ فرض ہے اور ابو مصعب نے امام مالکؒ سے سنت ہونا نقل کیا ہے اور یہی امام مالک کی مشہور روایت ہے اور امام احمد سے بھی کئی روایات ہیں ایک روایت فرض کی ہے دوسری سنت کی ہے۔ تیسری افضلیت کی ہے اور ایک روایت کے مطابق وہ فرماتے ہیں کہ میں اس مسئلہ میں کلام کرنے کے بجائے عافیت پسند کرتا ہوں۔ یہی اوجز میں ہے۔

[2] یہ بھی احتمال ہیکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خوف کے وقت قصر کو جائز سمجھتے ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قصر کی نماز کو ان خفتم کی قید کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔ فتامل

مقابلے میں اسے کہا گیا ہے نہ کہ اس اعتبار سے کہ حالت سفر میں بھی چار رکعت فرض ہوں اور اس وقت قصر کر کے دو رکعت پڑھی جائے اور اگر یہ کہا جائیکہ شروع میں حالتِ سفر میں چار رکعتیں فرض تھیں تو اس صورت میں یہ منسوخ ہوگئی لہٰذا منسوخ طریقے پر عمل کرنا جائز نہیں اسلئے اتمام بھی ناجائز ہوگا صرف قصر ہی جائز ہوگا۔[1]

(قولہ الا ان الشافعی یقول التقصیر رخصۃ لہ فی السفرفان اتم الصلوٰۃ اجزء ہ عنہ) یہ استثناء دلالت کررہا ہے کہ باقی ائمہ کے ہاں سوائے شوافع کے قصر کرنا ضروری ہے، حالت سفر میں پوری نماز[2] پڑھنا جائز نہیں۔

ظاہر یہ پررد: (قولہ بذی الحلیفۃ العصر رکعتین) یہ حدیث دلالت کررہی ہے کہ سفر میں نماز کو قصر پڑھنے کا مدار اس پر نہیں ہے کہ سفر کی مدت پوری کرنے کے بعد قصر کرنا جائز ہو بلکہ جب ایک آدمی ۴۸ میل سے زیادہ مدت کے سفر کا ارادہ رکھتا ہے تو سفر کے شروع کرنے کے بعد قصر نماز پڑھ سکتا ہے (بشرطیکہ شہر کی عمارتوں سے تجاوز کر جائے) لہٰذا یہ حدیث صرف اسی کو بیان کررہی ہے۔ ذوالحلیفہ مدینہ منورہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے تو (ذوالحلیفہ پہنچنا اس سے مقصد سفر کی ابتداء کو بیان کرنا ہے۔ ازمترجم)

(قولہ لا یخاف الا رب العالمین) اسکا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ان خفتم کی قید پر قصر کا مدار نہیں بلکہ اگر خوف نہ بھی ہو تو بھی قصر کر سکتے ہیں حدیث باب میں اس سفر سے حجۃ الوداع کا سفر مراد ہے۔

باب ماجاء فی کم تُقْصَرُ الصلاۃُ

باب کتنے دن اقامت کی نیت کرنے کی صورت میں نماز میں قصر کی جائے

☆حدثنا احمد بن مَنیع حَدَّثَنَا هشیم اخبرنا یحیی بن ابی اسحٰقَ الحضرمیُّ حَدَّثَنَا انس بن مالك قال: خرجنا مع النبی صلی اللّٰه علیه وسلم من المدینة الی مکَّةَ، فصلّٰی رکعتین، قال: قلتُ لانسٍ: کَمْ اقامَ رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بمکّةَ؟ قال: عَشْراً۔قال : وفی الباب عن ابن عباسٍ، وجابرٍ۔ قال ابو عیسی: حدیث انسٍ حدیث حسن صحیحٌ۔وقدرُوِیَ عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: اَنّه اَقَامَ فی بعض اسفاره تِسْعَ عَشْرَةَ یصلّی رکعتین۔ قال ابن عباس: فنحن اِذا اقمنا مابیننا وبین تِسْعِ عشرة صلّینا رکعتین، وان زدنَا علی ذلك اتممنا الصلاة ۔ ورُوِیَ عن علیٍّ انه قال: مَن اقام عشرة ایام اَتَمَّ الصلاۃ۔ ورُوی عن ابن عمر انه قال: من اقام خمسة عشر یوماً

---

[1] حضرت سہارنپوری نے بذل میں اس بحث کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔

[2] تو امام ترمذیؒ کی اس نقل کے مطابق وھو قول الشافعی واحمد واسحٰق کہ تمام ائمہ کے مذہب میں قصر عزیمت ہے سوائے امام شافعیؒ کے لہٰذا اس کے برعکس امام احمد سے جو مذہب نقل کیا گیا ہے کہ قصر رخصت ہے یہ انکی صرف ایک روایت ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔

اتم الصلاۃ۔وقد رُوِیَ عنه ثِنَتی عَشرَةَ۔ورُوِیَ عن سعید بن المسیَّبِ انه قال: اذا اقام اربعاً صلّی اربعاً۔ ورَوَی عنه ذٰلكَ قتادةُ وعطاء الخُرَاسانیُّ۔ورَوَی عنه داودُ بن ابی هِندِ خلافَ هذا۔واختلفَ اهلُ العلم بعدُ فی ذٰلك۔فاماسفیانُ الثوریُّ واهلُ الكوفةِ فذهبوا الی تَوقِیتِ خمسَ عَشرَةَ، وقالوا:اِذا اجمع علی اقامةِ خمُسَ عَشرَةَ اتم الصلاۃَ۔ وقال الاوزاعیُّ: اِذَا اجمع علی اقامة ثنتی عشرة اتم الصلاۃَ۔ وقال مالكُ بن انسٍ والشافعیُّ واحمدُ: اِذا اجمع علی اقامة اَربَعَةٍ اتم الصلاۃَ۔واما اسحٰق فرای اقوی المذاهبِ فیه حدیثَ ابن عباسٍ۔ قال: لانه رَوَی عن النبیٍّ صلی اللّٰه علیه وسلم ثم تاوّلَه بعدَ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم:اِذااجمع علی اقامة تِسعَ عشرة اتم الصلاۃَ۔ثم اجمع اهل العلم علی ان المسافرَ یَقصُرُ مالم یُجمِعُ اِقامةً، وان اتی علیه سِنُونَ۔

☆حدثنا هناد بن السَّرِیِّ حَدَّثَنَا ابو معاویة عن عاصمٍ الاحُوَلِ عن عِكرِمَةَ عن ابن عباسٍ قال: سافر رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم سَفَراً، فصلّی تسعةَ عَشرَ یوماً ركعتینِ ركعتین، قال ابن عباسٍ: فنحن نصلِّی فیما بیننا وبینَ تِسعَ عَشرَةَ ركعتینِ ركعیتینِ، فاِذا اقمنا اكثرَ من ذٰلك صلَّینا اربعاً۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث غریبٌ حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے مکہ کیلئے روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں (قصر) پڑھیں۔راوی نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے دن مکہ میں قیام کیا؟ انہوں نے فرمایا دس دن۔ اس باب میں ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حدیث انس حسن صحیح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں انیس دن تک قیام کیا اور دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں چنانچہ اگر ہمارا قیام کسی دوسرے علاقے میں انیس دن یا اس سے کم مدت کا ہوتا تو ہم بھی قصر ہی پڑھتے اور اگر اس سے زیادہ رہتے تو پوری نماز پڑھتے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو دس دن قیام کرے وہ پوری نماز پڑھے، ابن عمر رضی اللہ عنہما پندرہ دن اور دوسری روایت میں بارہ دن قیام کرنے والے کے متعلق پوری نماز کا حکم دیتے تھے۔قتادہ اور عطاء خراسانی، سعید بن مسیّب سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص کسی علاقہ میں چار دن تک قیام کرے وہ چار رکعتیں ادا کرے۔ داؤد بن ابی ہند

ان سے اس کے خلاف روایت کرتے ہیں اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے سفیان ثوری اور اہل کوفہ (احناف) پندرہ دن تک قصر کی مسلک اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر پندرہ دن قیام کا پختہ ارادہ ہو تو پوری نماز پڑھے۔ امام اوزاعی بارہ دن قیام کی نیت پر پوری نماز پڑھنے کے قائل ہیں۔ امام شافعی، مالک، احمد کا یہ قول ہے کہ اگر چار دن رہنے کا ارادہ ہو تو پوری نماز پڑھے۔ اسحٰق کہتے ہیں کہ اس باب میں قوی ترین مذہب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا ہے کیونکہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اسی پر عمل پیرا ہیں کہ اگر انیس دن قیام کا پختہ ارادہ ہو تو پوری نماز پڑھے پھر اس پر علماء کا اجماع ہے کہ اگر کسی جگہ قیام کی پکی نیت نہ ہو تو قصر ہی پڑھنی چاہیئے اگر چہ اس پر سالوں گزر جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کیا اور انیس دن تک قصر نماز پڑھتے رہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، ہم بھی اگر انیس دن تک قیام کریں تو قصر نماز پڑھتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ ٹھہریں گے تو چار رکعتیں (یعنی پوری نماز) پڑھیں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

ترجمۃ الباب کی تشریح: اس باب کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ا۔ دوسرے شہر جا کر کتنے دن اقامت کی نیت کرنے سے آدمی قصر نماز پڑھیگا اور کتنے دن کی نیت کرنے سے پوری نماز پڑھیگا، ۲۔ کتنی مدت، اور کتنے میل سفر کرنے سے آدمی مسافر شمار ہوگا۔ یہاں پر لفظ "کم" کمیت کے بیان کیلئے وضع کیا گیا ہے یہ دونوں[1] قسموں کو شامل ہے اگر چہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث کو ذکر کرنے کے بعد صرف یہ ذکر کیا ہے کہ دوسرے شہر جا کر کتنے دن اقامت کی نیت کرنے سے آدمی مقیم ہوتا ہے اس کے اندر اختلاف کو مصنف نے بتلایا ہے۔ دوسرے مسئلہ میں حنفیہ کے نزدیک ۴۸ میل وہ مقدارِ سفر ہے جسکا سفر کرنے سے انسان مسافرِ شرعی شمار ہوتا ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ امام مالکؒ نے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ ۴ برید سے کم میں قصر نہیں کیا جائیگا اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اور ایک فرسخ تین میل یا کم وبیش اس کے قریب قریب ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ۴۸ میل کے سفر سے انسان مسافر شمار ہوگا۔

فتح مکہ کے موقع پر روایات مختلفہ میں تطبیق: (قوله انه اقام في بعض اسفاره تسع عشرة يصلي ركعتين) یہ واقعہ فتح مکہ کے سفر کا ہے بعض راویوں نے نقل کی ہے کہ ۱۹ دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں اقامت فرمائی تھی اور

---

[1] یعنی حدیث کے اعتبار سے یہاں پر عموم ہونا چاہیئے ورنہ امام ترمذیؒ کی غرض اس باب سے یہ ہے کہ وہ یہ بیان کرنا چاہ رہے ہیں کہ کتنے دن کی اقامت کی نیت سے آدمی مقیم شمار ہوگا چنانچہ انہوں نے اس مسئلہ میں علماء کے اقوال ذکر کیے ہیں دوسرے مسئلہ میں اختلاف اور اقوال ذکر نہیں کیے۔

بعض نے ۱۸/ ۱۷/ ۱۶ دن اور ایک روایت میں ۱۵ دن کا بھی ذکر ہے، ان سب میں تطبیق اسطرح ہے کہ پہلی تین روایتوں میں تو بالکل ظاہر ہے کہ جس راوی نے مکہ مکرمہ تشریف آوری کا دن اور وہاں سے واپس جانے کا دن دونوں کو شمار کیا[1] تو اس نے ۱۹ دن ذکر کیا اور جس راوی نے ان دونوں دنوں کو شمار نہیں کیا تھا تو اس نے ۱۷ دن شمار کئے اور جس راوی نے ان دونوں میں سے ایک دن کو شمار کیا اس نے ۱۸ دن کو ذکر کیا۔ ہاں ۱۵ اور ۱۶ دن والی روایات میں اشکال ہے۔

حضرت علیؓ کے اثر کا جواب: (قوله روی عن علی رضی الله عنه انه قال من اقام عشرة ایام) یہ اثر چونکہ دوسرے صحابہ کرام کے عمل کے خلاف ہے نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی حدیث کے معارض ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ مکہ میں دس دن یا اس سے زیادہ مقیم رہے لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پوری نہیں پڑھی[2] اسلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نا قابل استدلال ہے۔

ایک وہم اور اسکا ازالہ: کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دس دن اتفاقی طور پر گزارے تھے کیونکہ آپ تو اس سے کم وقت میں واپس جانے کا ارادہ رکھتے تھے اسلئے اس حجۃ الوداع والے واقعہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا استدلال صحیح نہیں۔ جواب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں ۴ ذی الحجہ کو تشریف لائے تو آپ کا یہی ارادہ تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد لوٹ جاؤں گا اور حج سے فراغت ۱۴ ذی الحجہ ہی کو ممکن[3] ہے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

(روی عن ابن عمر رضی الله عنهما) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے تو مختلف روایات مروی ہیں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایک روایت پر عمل کیا جائے اور دوسری روایت کو چھوڑ دیا جائے۔

---

[1] بیھقی نے بھی اسی طرح تمام احادیث میں تطبیق دی ہے، ۱۵ دن والی روایات کو امام نووی نے ضعیف قرار دیا ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں اور اس روایت کے متابع موجود ہیں اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ خمسہ عشرہ والی روایت صحیح ہے تو یہ کہا جائیگا کہ راوی نے یہ سمجھا کہ اصل میں ۱۷ دن والی روایت بنیادی روایت ہے لہٰذا اس میں سے مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے والے دن کو نکال دیا۔ انتہی مافی البذل مختصراً

[2] "لم یتمم" یہ لفظ باب تفعیل کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اتمام اور تتمیم لغت میں دونوں کا ایک ہی معنی ہے راجح قول یہ ہے کہ یہ لفظ اتمام سے مشتق ہے اور حالتِ جزمی میں اس صیغے میں ادغام اور فک ادغام دونوں جائز ہیں۔

[3] یہ امر بالکل بدیہی ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان ۱۰ دنوں کا قیام ایک مقام پر نہیں تھا بلکہ منی، عرفات، مکہ وغیرہ بہت سی جگہوں پر قیام تھا لہٰذا حنفیہ کے اصول کے مطابق اس سے استدلال تام نہیں ہوسکتا، میرے پھوپھا الشیخ مولانا رضی الحسن کی تقریر میں اس اشکال کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ ساری جگہیں مکہ ہی میں داخل ہیں۔ انتہی۔ یعنی منی وغیرہ فناء مکہ ہیں۔ فتامل

سعید بن مسیب کے اثر کا جواب: (قولہ وروی عن سعید بن المسیب انہ قال اذا اقام اربعاً صلی اربعا) سعید بن مسیب کا اثر صحابہ کرام کے عمل کے خلاف ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عمل حجۃ الوداع میں اس کے خلاف تھا کیونکہ حجۃ الوداع میں صحابہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چار دن سے زیادہ ٹھہرنے کا یقین تھا۔ (قولہ الی توقیت خمسۃ عشر) ہمارے مذہب کی دلیل یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روایت[1] کے مطابق مکہ میں ۱۵ دن ٹھہرے تھے نیز حضرت ابن عمر کی روایت میں بھی یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔ (قولہ ثم[2] ناولہ) ترمذی کے نسخہ میں ہمارے سامنے اسی طرح ہے لیکن استاذِ محترم نے ہمیں فتناولہ کا لفظ پڑھایا تھا۔ تا دو نقطوں کے ساتھ ہے نون ایک نقطہ والا نہیں پڑھایا۔

ابن عباسؓ کے اثر کا جواب: (قولہ فصلی تسعۃ عشر یوما رکعتین رکعتین) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ۱۹ دن[3] ٹھہرنے میں اس قدر دنوں کی اقامت کی نیت نہیں تھی اور نہ آپ کو یقین تھا کہ میں اتنے دن ٹھہروں گا کیونکہ اسوقت قبیلہ ہوازن اور اہل طائف وغیرہ آپ کے خلاف جمع ہو گئے تھے لہٰذا اتنے دن اقامت کی نیت کیسے ممکن ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹ دن اس نیت کے ساتھ اقامت پذیر رہے کہ کل یہاں سے نکلیں گے تو اس امروز و فردا میں ۱۹ دن پورے ہو گئے۔

باب ماجاء فی التَّطَوُّعِ فِی السَّفَرِ

باب سفر میں نفل نماز پڑھنا

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ بن سعدٍ عن صَفْوَانَ بن سُلَیْمٍ عن ابی بُسْرَۃَ الغِفَارِیِّ عَنْ البَرَاءِ بن عازبٍ قال: صحبتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمانیۃ عَشَرَ سَفَراً، فما رایتہ تَرَکَ الرکعتین اذا زاغتِ الشمسُ قبلَ الظهرِ۔ وفی الباب عن ابن عمر۔ قال ابو عیسی: حدیث البراءِ حدیث غریبٌ۔ قال: وسالتُ محمداً عنہ فلم یعرفہ الّا من حدیث اللیث بن سعدٍ، ولم یَعرف اسمَ ابی بُسْرَۃَ الغِفَارِیِّ، ورآہٗ حَسَناً۔ ورُوِیَ عن ابن عمر: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لایَتَطَوَّعُ فِی السَّفَرِ قبلَ الصلاۃِ ولا بعدھا۔ ورُوِیَ عنہ عن النبی صلّی اللہ علیہ وسلم: انہ کان یَتَطَوَّعُ فی السفرِ۔ ثم اختلف اھلُ العلم بعدَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: فرأی بعضُ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتطوَّعَ الرجلُ فی السفرِ۔ وبہ یقول احمدُ،

---

[1] ۱۵ دن والی روایت میں سب سے کم دنوں کا ذکر ہے لہٰذا اس روایت کو جو متیقن ہے لینا اولیٰ ہے۔

[2] شرح السراج کے حاشیہ میں اس لفظ کا ناولہ ضبط کیا ہے تو یہ مناولہ سے مشتق ہوا جسکا معنی ہے لینا اور بعض نسخوں میں تا کے ساتھ تناولہ ہے بمعنی اس پر عمل کیا۔

[3] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے بظاہر یہ جملہ وھی ھذہ مبتداء خبر کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

واسحقُ۔ ولم یَرَ طائفۃٌ من اھل العلم ان یُصَلّٰی قبلَھا ولا بعدَھا۔ ومعنٰی مَن لم یتطوَّعُ فی السفرِ قبولُ الرُّخصَۃِ، ومَن تطوَّعَ فلہ فی ذلک فضلٌ کثیر۔وھو قولُ اکثر اھل العلم: یختارون التطوعَ فی السفر۔

☆حدثنا علیُّ بن حُجرٍ حَدَّثَنَا حفصُ بن غِیَاثٍ عن الحجّاجِ عن عطیّۃَ عن ابن عمرَ قال: صلَّیتُ مع النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الظھرَ فی السفر رکعتین وبعدَھا رکعتین۔ قال ابوعیسی: ھذا حدیث حسنٌ۔ وقد رواہ ابن ابی لیلَی عن عطیۃ ونافعٍ عن ابن عمرَ۔

☆حدثنا محمد بن عبیدٍ المُحَارِبِیُّ یعنی الکوفی حَدَّثَنَا علیُّ بن ھاشمٍ عن ابن ابی لیلَی عن عطیّۃَ ونافعٍ عن ابن عمر قال: صلَّیتُ مع النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الحَضَرِ والسفَرِ: فصلَّیتُ معہ فی الحَضَرِ الظھرَ اربعاً وبعدَھا رکعتین، وصلَّیتُ معہ فی السَّفَرِ الظُّھرَ رکعتین وبعدھا رکعتین، والعصرَ رکعتین ولم یُصَلِّ بعدَھا شیئاً، والمغربَ فی الحضرِ والسفرِ سواء، ثلاث رکعاتٍ، لایَنقُصُ فی الحضَرِ ولا فی السفرِ، وھی وِترُالنھارِ،وبعدَھا رکعتین۔قال ابوعیسی: ھذا حدیث حسنٌ۔ سمعتُ محمداً یقولُ: مارَوَی ابنُ ابی لیلَی حدیثاً اَعْجَبَ اِلیَّ مِن ھذا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ سفر کئے۔ میں نے آپ کو زوال آفتاب کے وقت ظہر سے پہلے دو رکعتیں چھوڑتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔اس باب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث براء غریب ہے میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے لیث بن سعد کی روایت کے علاوہ اس حدیث کو نہیں پہچانا اور امام بخاری کو ابوبسرہ غفاری کا نام معلوم نہیں لیکن وہ اس حدیث کو حسن سمجھتے ہیں۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران فرض نماز سے پہلے یا بعد نوافل نہیں پڑھتے تھے۔انہیں سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں نفل نماز (سنتیں) پڑھتے تھے۔اہل علم کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض صحابہ سفر میں نوافل پڑھنے کے قائل ہیں امام احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے جبکہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے کہ فرض نماز سے پہلے یا بعد کوئی نوافل نہ پڑھے جائیں اور سفر میں نوافل نہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کی دی ہوئی رخصت کو قبول کر کے اس سے فائدہ اٹھائے اور اہل علم کہتے ہیں کہ جو شخص سنتیں اور نفل سفر میں پڑھ لے اس کے لئے بہت بڑی فضیلت ہے اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے کہ سفر میں نوافل پڑھے جاسکتے ہیں۔

☆حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں ظہر کی دو رکعتیں اور

اس کے بعد بھی دو رکعتیں پڑھیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ابن ابی لیلیٰ نے عطیہ سے اور نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر اور حضر میں نمازیں پڑھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضر میں ظہر کی چار رکعات اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھتے اور سفر میں ظہر کی دو اور اسکے بعد بھی دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ پھر عصر کی دو رکعتیں پڑھتے اور ان کے بعد کچھ نہ پڑھتے۔ جبکہ مغرب کی نماز سفر و حضر میں ایک طرح تین رکعات ہی ہے اس میں کوئی کمی نہیں اور یہ دن کے وتر ہیں اسکے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ابن ابی لیلیٰ کی کوئی روایت اس سے زیادہ پسندیدہ نہیں۔

﴿تشریح﴾

(فما رایته ترك الركعتين اذا زاغت الشمس) یہ دو رکعتیں صلوۃ الزوال تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے یہ تھی کہ سنن موکدہ سفر میں نہیں[1] پڑھنی چاہیئے نوافل مطلقہ پڑھ سکتے ہیں۔

(وروی عن ابن عمر رضی الله عنهما الخ) ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ مختلف روایتیں مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قول اور ان کی مرویات میں تعارض ہے لیکن ہم ان روایات میں تطبیق دے چکے ہیں کہ جن احادیث میں سنتوں پر انکار اور نفی مروی ہے ان سے مراد سنن موکدہ ہیں اور دوسری احادیث میں نوافل اور سنن مطلقہ کا اثبات ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قوله ولم یر طائفة من اهل العلم ان یصلی قبلها و لا بعدها) اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے نزدیک سفر میں نماز سے پہلے اور اس کے بعد سنتیں نہیں رہیں۔ یہ مقصد نہیں کہ انکے ہاں نماز سے پہلے اور اسکے بعد کسی قسم کی نماز نوافل جائز ہی نہیں پہلے قول اور اس قول میں فرق یہ ہے کہ پہلے قول کے قائلین[2] امام احمد و اسحٰق وغیرہ کے نزدیک سفر میں نماز سے پہلے اور اسکے بعد سنت پڑھی جا سکتی ہے ہاں وہ نماز سنت موکدہ نہیں ہوگی البتہ نفس سنت ہونے کی نفی انہوں نے بھی نہیں کی اور دوسرے قول کے قائلین کے نزدیک فرض نمازوں سے پہلے اور بعد والی سنتیں نہ تو سنت موکدہ ہیں اور نہ ہی مسنون ہاں نفل نمازوں کی فضیلت تو اپنی جگہ برقرار ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرمارہے ہیں کہ

---

[1] جیسا کہ ابھی یہ تطبیق گزری۔

[2] اصل مخطوطہ میں اسی طرح ہے اس جملہ اور بھی بہت سی توجیہات ہوسکتی ہیں جیسا کہ نحو سے ممارست رکھنے والے پر مخفی نہیں ہے۔

جونفل نماز پڑھیگا تو اسے بہت زیادہ ثواب ملیگا۔ (قولہ وھی وتر النھار) مغرب کی نماز کو وتر النہار اسلئے کہا گیا کیونکہ یہ نماز دن کی روشنی اور کام کاج کی مشغولی کے بعد پڑھی جاتی ہے اور دن کے یہ آثار روشنی اور کام کاج وغیرہ مغرب تک باقی ہوتے ہیں انہی الفاظ حدیث کے پیشِ نظر بعض اصحاب ظواہر نے یہ کہا ہے کہ مغرب کے بعد افطار اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ غروبِ شمس کے بعد اتنا وقت نہ گزر جائے جو صبح صادق کے وقت کے مساوی ہو۔

باب ماجاء فی الجَمْعِ بین الصلا تَیْنِ

باب دو نمازوں کو جمع کرنا

☆حدثنا قتیبة بن سعیدٍ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ بن سعدٍ عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل هو عامر بن واثلة عن معاذ بن جبل: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم کان فی غزوةِ تَبُوكَ اِذاارْتَحَلَ قبلَ زَیْغِ الشمسِ اَخَّرَ الظهرَ الی ان یَجمعَها الی العصرِ فیصلِّیهما جمیعاً، واذا ارْتَحَلَ بعدَ زَیْغِ الشمسِ عجَّلَ العصرَ الی الظهرِ، وصلَّی الظهرَ والعصرَ جمیعاً، ثُمَّ سَارَ۔ وکان اذا ارْتَحَلَ قبلَ المغرِبِ اَخَّرَ المغرِبَ حتی یصلِّیَها مع العشاءِ، واذا ارْتَحَلَ بعدَ المَغرب عَجلَ العشاءَ فصلّاها مع المغربِ۔ قال : وفی الباب عن علیٍّ وابن عُمَرَ، وانسٍ، وعبدِ اللّٰه بن عَمْرٍو، وعائشةَ، وابن عباسٍ، واسامةَ بنِ زیدٍ ، وجابر بن عبد اللّٰه قال ابو عیسی:ورَوَی علیُّ بن المدینیِّ عن احمدَ بن حنبلٍ عن قتیبةَ هٰذا الحدیثَ۔

وحدیث معاذ حدیث حسن غریب، تفرَّد به قتیبةُ، لانَعرفُ احداً رواه عن اللَّیْثِ غیرَه۔ وحدیث اللَّیْثِ عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الطُّفَیْلِ عن مُعاذٍ حدیث غریبٌ۔والمعروفُ عنداهل العلم حدیث معاذ من حدیث ابی الزُّبَیْرِ عن ابی الطُّفَیْلِ عن معاذٍ: اَنَّ النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم جَمَعَ فی غزوة تَبُوكَ بین الظهرِ والعصرِ، وبین المغرب والعشاءِ۔ رواه قُرَّةُ بن خالدٍ وسفیانُ الثوریُّ ومالكٌ وغیرُ واحدٍ عن ابی الزُّبیر المکّیِّ۔وبهٰذا الحدیث یقولُ الشافعیُّ، واحمدُ واسحٰق یقولان : لاباسَ ان یَجْمَعَ بین الصلاتین فی السفر وقت احداهما۔

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا عَبدة بن سلیمان عن عبید اللّٰه بن عمرَ عن نافعٍ عن ابن عمرَ: انه اُسْتُغِیثَ علی بعضِ اهلِهِ، فَجَدَّ به السَّیْرُ فَاَخَّرَ المغربَ حتی غاب الشَّفَقُ، ثم نَزَلَ فَجَمَعَ بینهما، ثم اَخبرهم ان رسولَ اللّٰه صلَّی اللّٰه علیه وسلم کان یفعلُ ذٰلك اذا جَدَّبه السَّیْرُ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔وحدیث اللیث عن یزید بن ابی حبیبٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے موقع پر اگر سورج ڈھلنے سے پہلے کوچ کرتے تو ظہر کو عصر تک موخر کر دیتے اور پھر دونوں نمازیں اکٹھی پڑھتے اور اگر زوال کے بعد کوچ کرتے تو عصر میں تعجیل کرتے اور ظہر اور عصر کو اکٹھا پڑھ لیتے اور پھر روانہ ہوتے پھر مغرب سے پہلے کوچ کرنے کی صورت میں مغرب کو عشاء تک موخر کرتے یہاں تک کہ مغرب کو عشاء کے وقت میں عشاء کے ساتھ جمع فرماتے اور مغرب کے بعد کوچ کرنے کی صورت میں عشاء میں جلدی کرتے اور عشاء کو مغرب کے ساتھ پڑھ لیتے۔ اس باب میں علی، ابن عمر، انس، عبداللہ بن عمرو، عائشہ ابن عباس، اسامہ بن زید اور جابر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث علی بن مدینی سے بھی مروی ہے وہ احمد بن حنبل سے اور وہ قتیبہ سے روایت کرتے ہیں۔ معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن غریب ہے کیونکہ اس کی روایت میں قتیبہ منفرد ہیں ہمیں علم نہیں کہ لیث سے ان کے علاوہ کسی اور نے بھی روایت کی ہو۔ لیث کی یزید بن حبیب سے مروی حدیث غریب ہے (جس کو) وہ ابوطفیل سے اور وہ معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں (یہ وہی سند ہے جو اس باب میں مذکور ہے) علماء کے نزدیک حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح اور معروف وہ ہے جو ابوالزبیر عن ابی الطفیل عن معاذ کی سند سے مروی ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں ظہر، عصر، اور مغرب عشاء کو جمع کیا۔ اس حدیث کو قرہ بن خالد، سفیان ثوری، مالک اور کئی حضرات نے ابوزبیر مکی سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں اور احمد اور اسحق کہتے ہیں کہ سفر میں دو نمازوں کو جمع کر کے ایک وقت میں پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک اہلیہ (جنکا نام صفیہ بنت عبید تھا) کی طرف سے ان سے مدد مانگی گئی (وہ سخت بیمار پڑ گئی تھیں انہوں نے پیغام بھیجا کہ میری زندگی کا آخری دن ہے الخ) جس پر انہیں جلدی جانا پڑا۔ انہوں نے مغرب کو شفق (احمر) کے غائب ہونے تک موخر کیا اور مغرب اور عشاء کو جمع کیا پھر لوگوں کو بتایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جلدی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حدیثِ باب کا جواب: حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ یہ جو جمع کیا گیا[1] ہے یا تو یہ دونوں نمازیں عصر کے وقت میں پڑھی گئی ہونگی یا دونوں نمازیں ظہر کے وقت میں پڑھی گئی ہونگی یا دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئی ہونگی تو ان احتمالات میں سے کسی ایک کو متعین کرنا یہ بغیر دلیل کے من مانی تعیین ہے۔ نیز جمہور نے جو احتمال[2] متعین کیا ہے وہ احتمال قرآن پاک کی اس صراحت کے خلاف ہے "ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا" جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ چونکہ حدیث میں ایک نماز کے وقت میں دونوں نمازوں کے جمع کرنے کی صراحت نہیں ہے ہاں صرف احتمال ہے لہٰذا اس[3] صرف احتمال کی وجہ سے کتاب اللہ کے خلاف عمل نہیں کیا جائیگا۔ حدیث باب میں عـجّـلَ کا معنی یہ ہے کہ اس نماز کو اس کے معروف وقت سے جلدی پڑھتے تھے نہ کہ وقت شروع ہونے سے پہلے پڑھنا مراد ہو۔ حدیث باب میں ''عجل العصر'' اور ''اخر الظہر'' ان دونوں حالتوں میں جو نماز پڑھی گئی ہے وہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں نمازیں[4] واقع ہوئی ہیں لیکن صرف تعبیر کا فرق ہے کہ (حنفیہ کے ہاں اس تعجیل اور تاخیر سے مراد وقت معہود سے ظہر کو موخر کرنا اور وقتِ معہود سے عصر کو مقدم کرنا مراد ہے ہاں دونوں

---

[1] **جمع بین الصلوتین کے متعلق علماء کے چھ اقوال:** جاننا چاہیئے کہ عرفہ اور مزدلفہ کے علاوہ جمع بین الصلوٰتین کے متعلق علماء کے چھ قول ہیں: ۱۔ حنفیہ، حسن بصری، ابن سیرین نخعی، اسود، کا مذہب یہ ہے کہ جمع بین الصلوٰتین مطلقاً ناجائز ہے اور یہی ابن قاسم نے امام مالک سے ایک روایت نقل کی ہے اور صحابہ میں ابن مسعود، سعد بن ابی وقاص، جابر بن زید اور تابعین میں اسود، عمر بن عبدالعزیزؒ، لیث وغیرہ کا مذہب ہے، ۲۔ امام شافعی، احمد، اسحٰق، مالکیہ میں سے اشہب رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جمع بین الصلوٰتین جائز ہے جیسا کہ قصر جائز ہے، ۳۔ امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ یہ اس وقت جائز ہے جبکہ سفر کی جلدی ہو، ۴۔ یہ اس وقت جائز ہے جبکہ راستہ جلدی طے کرنے کا ارادہ ہو، ۵۔ یہ مکروہ ہے یہ مالکیہ کی ایک روایت ہے، ۶۔ جمع تاخیر جائز ہے جمع تقدیم جائز نہیں، ابن حزم نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور امام مالک واحمد سے بھی اسی طرح ایک روایت ہے (از مترجم: امام بخاریؒ نے بھی باب تاخیر الظہر الی العصر کا باب قائم کیا ہے جس سے انکار رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، نیز ابوداؤد کا رجحان بھی اسی مذہب کی طرف ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں لیس فی جمع التقدیم حدیث قائم)۔ امام نوویؒ نے یہ جو کہا ہے کہ صاحبین نے خود امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی ہے تو صاحب غایۃ نے اس پر رد کیا ہے۔ مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے۔

[2] جو احتمال خصم نے بتلایا کہ دونوں نمازوں میں سے کسی ایک نماز کے وقت میں جمع حقیقی کے طور سے جمع بین الصلوٰتین کی جائیگی

[3] یعنی اب ان کی یہ متعین کردہ صورت صرف احتمالی صورت رہ گئی ہے۔

[4] یعنی مطلب یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھا گیا اگر چہ وہ وقت دونوں نمازوں کا اپنا اپنا وقت تھا ایک کا آخر وقت دوسرے کا اول وقت۔

نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئی تھیں۔ازمترجم)

اثرِ ابن عمرؓ کی توجیہ: نیز ابن عمرؓ کی وہ روایت جو آگے آرہی ہے اس میں تصریح ہے کہ یہاں پر وہی احتمال مراد ہے جس کو حنفیہ نے اختیار کیا ہے وہ روایت حدثنا هناد والی روایت میں ہے کہ حتی غاب الشفق تو اس سے معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ابن عمرؓ کو یہ بتایا گیا کہ انکی کسی زوجہ محترمہ کی حالت بہت ناساز ہےلہٰذا وہ جلدی جلدی پہنچیں۔تو (از مترجم: حدیث باب میں اس قصہ میں یہ تصریح ہے کہ شفق غائب ہونے بعد انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی تھی جبکہ) ابوداؤد اور نسائی[1] کی روایت میں تصریح ہیکہ شفق غائب ہونے کے قریب تھا کہ انہوں نے مغرب پڑھ لی، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث باب میں حقیقۃً غروبِ شفق مرادنہیں بلکہ اسے مبالغۃً غروب شفق کہہ دیا گیا تھا ورنہ ایک ہی قصہ میں دونوں معنی کیسے ہوسکتے ہیں یا یہ توجیہ کی جائیگی کہ غاب الشفق میں شفق سے مراد سرخی کا غائب ہونا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں حمرة غائب ہونے کے بعد بھی مغرب کا وقت باقی رہتا ہے۔ابن عمرؓ کا یہ کہنا "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يفعل ذلك" اس قول سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن روایات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع بین الصلوٰتین کیا ہے اس سے مراد یہی جمع صوری ہے ورنہ یہ قول "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يفعل ذلك" صحیح نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی صلاة الاستسقاء

باب نمازِ استسقاء کا بیان

☆حدثنا يحيى بن موسى حَدَّثَنَا عبد الرزاقِ اخبرنا معمر عن الزهرى عن عباد بن تميم عن عمه: ان رسولَ اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وسلم خَرج بالناس يَسْتَسْقِي، فصلّٰى بهم ركعتين، جَهَرَ بالقراءة فيهما، وحَوَّلَ ردَاءَهُ، ورَفَعَ يديه واسْتَسْقَى، واستقبَلَ القِبلةَ۔قال: وفى الباب عن ابن عباس، وابى هريرةَ، وانس وآبى اللَّحْمِ۔قال ابو عيسى: حديث عبد اللّٰه بن زيد حديث حسن صحيحٌ۔ وعلى هذا العملُ عند اهل العلم۔ وبه يقولُ الشافعىُّ، واحمدُ، واسحٰقُ۔ واسمُ عَمّ عَبّادِ بن تميم هو عبدُ اللّٰه بن زيد بن عاصم المازِنى۔

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا الليث بن سعدٍ عن خالد بن يزيدَ عن سعيد بن ابى هلَالٍ عن يزيدَ بن عبد

---

[1] ابوداؤد کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں نافع وعبداللہ بن واقد سے سند متصل سے مروی ہے کہ ابن عمرؓ کے موذن نے دورانِ سفر کہا: نماز پڑھ لیں! توانہوں نے سفر کو جاری رکھنے کا کہا۔یہاں تک کہ شفق غائب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے سواری سے اترے اورانہوں نے مغرب کی نماز پڑھی پھر شفق کے غائب ہونے کا انتظار کیا پھر عشاء کی نماز پڑھی، پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ ایسا ہی کرتے جیسا میں نے کیا اس معنی کی اور بہت سی احادیث مروی ہیں جنکو میں نے اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اللّٰہ عن عمیرٍ مولی آبِی اللَّحْمِ عن آبی اللَّحْمِ: انہ رَاَی رسولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم عِنْدَ اَحْجَارِ الزَّیْتِ یَسْتَسْقِی، وھو مُقْنِعٌ بِکَفَّیْہِ یَدْعُو۔ قال ابو عیسی: کذا قال قتیبۃُ فی ھذاالحدیث عن آبِی اللَّحْمِ ولا نَعرفُ لہ عن النبیِّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم اِلّا ھذا الحدیث الواحدَ۔ وعُمَیْرٌ مولی آبی اللَّحْمِ قد رَوَی عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم اَحادیثَ، ولہ صُحْبَۃٌ۔

☆حدثنا قتیبۃ حَدَّثَنَا حاتمُ بن اسمٰعیلَ عن ھشام بن اسحٰقَ وھو ابْنُ عبد اللّٰہ بن کِنَانَۃَ عن ابیہ قال: اَرْسَلَنِی الولیدُ بن عُقْبَۃَ، وھو امیرُ المدینۃ، الی ابن عباسٍ اسالہ عن استسقاءِ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم؟فاتیتہ، فقال: ان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم خَرَجَ مُتَبَذِّلاً مُتَوَاضِعاً مُتَضَرِّعاً، حتی آتی المصلّی، فلم یَخْطُبْ خُطبتکم ھذہ، ولکن لم یَزَلْ فی الدعاءِ والتضرُّعِ والتکبیرِ، وصلّی رکعتین کماکان یصلّی فی العیدِ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیع عن سفیان عن ھشام بن اسحٰق بن عبد اللّٰہ بن کِنَانَۃَ عن ابیہ: فذَکَر نحوہَ وزادفیہ مُتَخَشِّعاً۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیحٌ۔وھو قولُ الشافعیِّ، قال: یُصلِّی صلاۃَ الاستسقاءِ نحوَ صلاۃ العیدین، یُکبِّرُ فی الرکعۃِ الاولی سبعاً، وفی الثانیۃَ خمساً، واحْتَجَّ بحدیث ابن عَبَّاسٍ۔قال ابو عیسی: ورُوِی عن مالك بن انسٍ انہ قال: لایکبر فی صلاۃ الاستسقاء کمایکبر فی صلاۃ العیدین۔ وقال النعمان ابو حنیفۃَ:لاتُصلی الاستسقاء ولاآمُرُھم بتحویل الرِّداء ولکن یدعون ویر جعون بجملتھم۔ قال ابو عیسی: خالفَ السُّنَّۃَ۔

﴿ترجمہ﴾

عباد بن تمیم اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے لوگوں کے ساتھ بارش کی طلب کیلئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھائیں جن میں بلند آواز سے قرأت کی پھر اپنی چادر کو پلٹ کر اوڑھا، دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور بارش کیلئے دعا مانگی درآں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ کی طرف متوجہ تھے۔اس باب میں ابن عباس، ابو ہریرہ، انس اور ابی اللحم سے بھی روایات ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عبداللہ بن زید کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے جن میں شافعی، احمد اور اسحٰق بھی شامل ہیں۔عباد بن تمیم کے چچا کا نام عبداللہ بن زید بن عاصم مازنی ہے۔

☆ ابی اللحم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احجار زیت کے قریب بارش کیلئے دعا کرتے ہوئے دیکھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دونوں ہتھیلیوں کو بند کئے ہوئے دعا مانگ رہے تھے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے

ہیں قتیبہ نے بھی ''ابی اللحم سے روایت کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے'' ابی اللحم کی اس حدیث کے علاوہ کسی حدیث کا ہمیں علم نہیں۔ ان کے مولیٰ عمیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث روایت کرتے ہیں اور وہ صحابی ہیں۔

☆ قتیبہ حاتم بن اسماعیل سے وہ ہشام بن اسحٰق سے (جو ابن عبداللہ بن کنانہ ہیں) اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ولید بن عقبہ جب مدینہ کے گورنر تھے تو انہوں نے مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ استسقاء کے متعلق پوچھنے کیلئے بھیجا۔ میں ان کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر زینت کے عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے نکلے یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے ان خطیبوں کی طرح کوئی خطبہ نہیں پڑھا۔ لیکن دعا، عاجزی اور تکبیر میں مصروف رہے عید کی نماز کی طرح دو رکعت نماز پڑھی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

☆ ہم سے بیان کیا محمود بن غیلان نے انہوں نے کہا ہم سے روایت کی وکیع نے انہوں نے سفیان سے انہوں نے ہشام بن اسحٰق بن عبداللہ بن کنانہ سے انہوں نے اپنے باپ سے اسی کے مثل روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں متخشعا یعنی خشوع وخضوع کی کیفیت کے ساتھ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام شافعی کا یہی قول ہے کہ نماز استسقاء عیدین کی نماز کی طرح پڑھے پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مالک بن انس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا نماز استسقاء میں عیدین کی نماز کی طرح تکبیریں نہ کہے۔

﴿تشریح﴾

نمازِ استسقاء سے متعلق امام ابوحنیفہ کا مذہب اور انکی دلیل: متون میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب مشہور ہے کہ انکے ہاں[1] استسقاء کی نماز نہیں ہوتی۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے نمازِ استسقاء کو استسقاء کیلئے سنت موکدہ قرار دینے کی نفی کی ہے کہ یہ نماز، استسقاء کے ارکان میں داخل نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے جمعہ کے خطبہ کے[2] دوران بارش کی دعا فرمائی اسی طرح دوسری روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] یہاں پر چند عمدہ مباحث ہیں جنکی تفصیل اوجز میں ہے، مثلاً استسقاء کے لغوی معنی کیا ہیں اس کا سبب کیا ہے اور اس کی مشروعیت کی ابتداء کب ہوئی، اس میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے، کسوقت نماز پڑھی جائیگی، اسکی کیا کیفیت ہوگی اور اگر بارش نہ ہو تو متعدد بار نماز پڑھی جائے۔

[2] یہ وہ حدیث ہے کہ خطبہ کے دوران اعرابی نے آکر کہا "یا رسول اللہ! ھلك الكراع و ھلك الشاء" یہ حدیث کتب حدیث میں مشہور ہے۔

بارش کی دعا فرمائی اور اس استسقاء کیلئے نماز نہیں پڑھی[1]، ہاں امام صاحبؒ کے نزدیک استسقاء میں نماز کے استحباب اور اسکے جواز کا انکار نہیں کیونکہ نماز کے بعد استسقاء کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

تحویلِ رداء کی کیفیت: تحویل رداء بھی اسی طرح ہے[2] اسکی تفسیر یہ ہے کہ چادر کے داہنے حصہ کو بائیں جانب اور بائیں کو دائیں جانب کردے اسی طرح اوپر والے حصہ کو نیچے اور نیچے والے حصہ کو اوپر کردے اور صرف چادر کے ظاہری حصہ کو اندر کرنا اور باطنی حصہ کو باہر کرنے سے یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہونگی۔

کیا نمازِ استسقاء میں تکبیرات زائدہ مشروع ہیں؟ اور اس اثر کا جواب: (قولہ صلی رکعتین کما کان یصلی بالعید) اس حدیث سے ان علماء نے استدلال کیا ہے[3] جنکے نزدیک استسقاء کی نماز میں تکبیرات مشروع ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث باب میں تشبیہ اس بات میں ہے کہ صلوٰۃ الاستسقاء کی نماز عید کی نماز کی طرح دو رکعتیں دن چڑھے جماعت کی ہیئت کے ساتھ ہوگی، ہر ہر عمل میں تشبیہ مقصود نہیں۔

باب ماجاء فی صلاۃِ الکسُوفِ

باب سورج گرہن کی نماز کا بیان

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا یحیی بن سعیدٍ عن سفیانَ عن حبیب بن ابی ثابت عن طاوس عن ابن عباس عن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: انہ صلی فی کسوف، فقرا ثم رکع، ثم قرا ثم رکع، ثم

---

[1] **امام ابوحنیفہ کے دلائل:** یعنی اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز استسقاء نہیں پڑھی بلکہ صرف دعا مانگ کر بارش طلب کی جیسے کہ اوجز میں بہت سی روایات ذکر کی گئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دعا پر اکتفا فرمایا تھا نیز اللہ رب العزت نے صرف استغفار پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسانے کا وعدہ فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''واستغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا'' سرخسی فرماتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء میں نماز پڑھی ہے یہ روایت عموم بلوی میں شاذ ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی عوام وخواص سب ہی کو ضرورت ہو تو وہاں شاذ روایت قابل قبول نہیں ہوتی اور یہ حدیث بھی انہی احکام میں سے ہے جن میں ابتلاء عام ہے۔

[2] **تحویلِ رداء میں ائمہ کے مذاہب:** یعنی امام صاحب کے نزدیک تحویل رداء سنت نہیں ہے بعض مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تحویل رداء سنت ہے پھر تحویل رداء کی کیفیت میں اختلاف ہے میں نے اوجز میں ان مذاہب کی تفصیل نقل کردی ہے۔

[3] **نمازِ استسقاء میں تکبیراتِ زائدہ کے متعلق مذاہبِ ائمہ:** یہی مذہب حنفیہ میں سے امام محمدؒ سے مروی ہے کہ استسقاء میں بھی تکبیرات زائدہ کہی جائینگی لیکن امام محمدؒ کی مشہور روایت اس کے خلاف ہے ہاں شافعیہ، حنابلہ کے مذہب میں استسقاء میں تکبیرات زوائد ہونگی، حنفیہ، مالکیہ کے نزدیک استسقاء میں تکبیراتِ زائدہ نہیں ہونگی۔ کذا فی الاوجز

قرأثم ركع، ثلاث مرات ثم سجد سجدتين، والاخرى مثلها۔قال: وفی الباب عن علی، وعائشة، وعبد اللّٰه بن عمرو، والنعمان بن بشير، والمغيرةِ بن شعبة، وابی مسعودٍ، وابی بكرة، وسمرة، وابی موسی الاشعری، وابن مسعودٍ، واسماء بنت ابی بكر الصديق، وابن عمر، وقبيصة الهلالی، وجابر بن عبد اللّٰه، وعبد الرحمٰن بن سمرة، وابی بن كعب۔قال ابو عيسى: حديث ابن عباسٍ حديث حسن صحيحٌ۔وقد رُوِیَ عن ابن عباس عن النبی صلّی اللّٰه عليه وسلم: انّه صلی فی كسوف اربع ركعات فی اربع سجدات۔وبه يقولُ الشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰقُ۔قال: واختلف اهلُ العلم فی القراء ة فی صلاة الكسوفِ: فرای بعضُ اهل العلم ان يُسِرَّ بالقراءةِ فيها بالنهارِ۔ورای بعضُهم ان يجهر بالقراء ة فيها، كنحو صلاة العيدين والجمعة۔ وبه يقولُ مالكٌ، واحمدُ، واسحٰقُ: يَرَوْنَ الجهرَ فيها۔وقال الشافعیُّ: لايَجْهَرُ فيها۔ وقد صَحَّ عن النبیِّ صلّی اللّٰه عليه وسلم كلتا الروايتين: صَحَّ عنه: انه صلّی اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ فی اربع سَجَدَاتٍ۔وصح عنه انه صلی ست ركعات فی اربع سجدات وهٰذا عند اهل العلم جائز علی قَدْرِ الكسوفِ: ان تطاول الكسوفُ فصلّی سِتَّ ركعات فی اربع سجداتٍ فهو جائزٌ، وان صلّی اربعَ ركعاتٍ فی اربع سجداتٍ واطال القراء ةَ فهو جائزٌ۔ ويَرٰی اصحابُنَا ان تُصَلّٰی صلاةُ الكسوف فی جماعةٍ، فی كسوفِ الشمس والقمرِ۔

☆حدثنا محمد بن عبد الملكِ بن ابی الشَّوارِبِ حَدَّثَنَا يزيد بن زريع حَدَّثَنَا معمر عن الزهری عن عروة عن عائشة انها قالت: خَسَفَتِ الشَّمْسُ علی عهد رسول اللّٰه ﷺ، فصلّی رسولُ اللّٰه ﷺ بالناس، فاطَالَ القراء ةَ، ثم ركع فاطال الركوعَ، ثم رفع راسه فاطال القراء ة وهی دون الاولی، ثم ركع فاطال الركوعَ، وهو دون الاول ثم رفع راسه فسجدَ، ثم فعل مثل ذٰلك فی الركعة الثانية۔قال ابو عيسى: وهٰذا حديث حسن صحيحٌ۔وبهٰذا الحديثِ يقولُ الشافعیُّ، واحمدُ، واسحٰقُ: يَرَوْنَ صلاة الكسوف اربعَ ركعاتٍ فی اربع سَجَدَاتٍ۔قال الشافعیُّ: يَقْرَا فی الركعةِ الاولی بام القران ونحوا من سورة البقرة سراً اِن كان بالنهار، ثم ركع ركوعا طويلا نحواً من قراء ته، ثم رفع راسه بتكبير وثبت قائما كماهو، وقرا ايضاً بام القران ونحوا من آلِ عمران، ثم ركع ركوعا طويلا نحوا من قراء ته، ثم رفع راسه، ثم قال سمع الله لمن حمده، ثم سجد سجدتين تامتين، ويقيم فی كل سجدة نحوا مما اقام فی ركوع، ثم قام فقرا بام القران ونحوا من سورة النساء، ثم ركع ركوعا طويلا نحوا من قراء ته، ثم رفع راسه بتكبير وثبت قائما، ثم قرا نحوا من سورةِ المائدةِ، ثم ركع ركوعاً طويلا نحوا من قراء ته، ثم رفع فقال: سمعَ اللّٰه لِمَنْ حَمِدَهُ، ثم سَجَدَ سجدتين، ثم تَشَهَّدَ وسَلَّمَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کی نماز پڑھی اس میں قرأت کی پھر رکوع کیا پھر قرأت کی پھر رکوع کیا پھر قرأت کی پھر رکوع کیا۔ تین مرتبہ پھر دو سجدے کیئے اور دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھی۔ اس باب میں علی، عائشہ، عبداللہ بن عمرو، نعمان بن بشیر، مغیرہ بن شعبہ، ابومسعود، ابوبکرہ، سمرہ، ابن مسعود، اسماء بنت ابی بکر، ابن عمر، قبیصہ ہلالی، جابر بن عبداللہ، ابوموسی، عبدالرحمٰن بن سمرہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف (سورج گرہن کی نماز) میں دو رکعتوں میں چار رکوع کئے۔ یہ امام شافعی واحمد واسحٰق کا قول ہے۔ نماز کسوف میں قرأت کے متعلق علماء کا اختلاف ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ دن کے وقت بغیر آواز قرأت کرے جبکہ بعض اہل علم بلند آواز سے قرأت کے قائل ہیں جیسے کہ جمعہ اور عیدین کی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ امام مالک، احمد، اور اسحٰق اسی کے قائل ہیں کہ بلند آواز سے پڑھے لیکن امام شافعی بغیر آواز سے پڑھنے کا کہتے ہیں پھر یہ دونوں حدیثیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ایک حدیث یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکوع، چار سجدوں (دو رکعتوں میں) کئے اور دوسری حدیث میں ہیکہ چار سجدوں میں (دو رکعتوں میں) چھ رکوع کئے اہل علم کے نزدیک یہ کسوف کی مقدار کے بقدر جائز ہے یعنی اگر سورج گرہن لمبا ہو تو چھ رکوع اور چار سجدے کرنا جائز ہے لیکن اگر چار رکوع اور چار سجدے کرے اور قرأت بھی لمبی کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ ہمارے ائمہ کے نزدیک سورج گرہن اور چاند گرہن دونوں میں نماز باجماعت پڑھی جائے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی اور قرأت لمبی کی پھر لمبا رکوع کیا پھر کھڑے ہوئے اور لمبی قرأت کی لیکن پہلی رکعت سے کم تھی پھر رکوع کیا اور اسے بھی لمبا کیا لیکن پہلے رکوع سے کم تھا پھر رکوع سے سر اٹھایا اس کے بعد سجدہ کیا اور پھر دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام شافعی، احمد اور اسحٰق بھی اسی کے قائل ہیں کہ نماز کسوف کی دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدے کرے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اگر دن میں نماز پڑھ رہا ہو تو پہلے سورہ فاتحہ پڑھے اور پھر سورہ بقرۃ کے برابر بغیر آواز قرأت کرے پھر لمبا رکوع کرے لمبی قرأت کی طرح پھر تکبیر کہہ کر سر اٹھائے اور کھڑا ہو کر پھر سورۃ فاتحہ پڑھے اور سورہ آل عمران کے برابر تلاوت کرے۔ اس کے بعد اتنا ہی طویل رکوع کرے پھر سر اٹھاتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہے پھر اچھی طرح دو سجدے کرے اور ہر سجدے میں رکوع کے برابر رکے پھر کھڑا ہو کر سورہ فاتحہ پڑھے اور سورہ نساء کے برابر قرأت کرے اور اسی طرح رکوع میں بھی ٹھہرے پھر اللہ اکبر کہہ کر

سر اٹھائے اور کھڑا ہو کر سورہ فاتحہ کے بعد سورہ مائدہ کے برابر قرأت کرے پھر اتنا ہی طویل رکوع کرے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر سر اٹھائے اور دو سجدے کرے اور اس کے بعد تشہد پڑھ کر سلام پھیرے۔

﴿تشریح﴾

صلوٰۃ الکسوف میں کتنے رکوع ہونگے: صلوۃ الکسوف کی نماز میں رکوع کی تعداد میں مختلف روایات ہیں بعض راویوں نے ایک رکعت میں دو رکوع نقل کئے ہیں اور بعض نے چار رکوع اور بعض نے چھ رکوع تک بھی روایت کئے ہیں انہی میں سے حضرت عائشہؓ کی روایت بھی ہے (حضرت عائشہؓ اربع رکوعات فی اربع سجدات نقل کر رہی ہیں جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے۔ از مترجم)

حدیث عائشہؓ کی توجیہ: روایات میں تناقض کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بات بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ تو اپنے حجرے میں تھیں اور اندھیرا بہت زیادہ تھا تو ہم انکی روایت پر اعتماد کسطرح کر سکتے ہیں۔

دیگر احادیث کی توجیہ: اسی طرح جن راویوں نے صلوٰۃ الکسوف کی دو رکعتوں میں دو سے زیادہ رکوع نقل کئے ہیں انکی روایت پر بھی کلام ہے انمیں سے بعض راوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے لہٰذا چونکہ انکی روایت اصول کے بھی معارض ہے اور دوسرے صحابہ کی احادیث کے بھی معارض ہے اسلئے نا قابل اعتماد ہوگی۔

حدیثِ سمرۃ بن جندبؓ اور اسکی وجوہِ ترجیحات: لہٰذا احناف نے ان احادیث کو اختیار کیا ہے جن میں صلوٰۃ الکسوف کی دو رکعتوں میں دو رکوع کا ذکر ہے کیونکہ یہ روایت اصول کے موافق ہے نیز کسوف کی دو رکعتوں میں دو رکوع والی احادیث میں ایسے قرائن موجود ہیں جو دلالت کرتے ہیں کہ ان احادیث کے راوی خود اعتمادی اور وثوق کے ساتھ اس واقعہ کو ذکر کر رہے ہیں چنانچہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں باب صلوٰۃ الکسوف میں روایت ذکر کی ہے کہ حضرت سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ اس دوران کہ میں اور ایک انصاری لڑکا اپنے نشانے پر تیر اندازے کر رہے تھے کہ اچانک سورج افق سے دو یا تین نیزے کے بقدر بلند ہوا اسی وقت میں سورج بالکل سیاہ ہوگیا یہاں تک کہ تنومہ سیاہ جڑی بوٹی کے مانند ہوگیا۔ تو ہم میں سے ایک نے دوسرے کہا چلو مسجد چلو خدا کی قسم اس سورج کی یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت میں ضرور نیا کام کریں گے۔ تو راوی کہتا ہے کہ ہم مسجد پہنچے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھلے میدان میں تشریف فرما تھے پس آپ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی اور اس میں اتنا طویل قیام کیا کہ اتنا قیام نماز باجماعت میں کبھی نہیں فرمایا تھا ہمیں آپ کی قرأت کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی پھر ایسے ہی انتہائی طویل رکوع فرمایا کہ اتنا طویل رکوع باجماعت نماز میں کبھی نہیں فرمایا ہمیں آوز سنائی نہیں دیتی تھی پھر ایسے ہی انتہائی طویل سجدہ کیا ہم آپ کی آواز

نہیں سن رہے تھے پھر دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کیا۔ صحابی کہتے ہیں کہ سورج دوسری رکعت کی التحیات میں روشن ہو گیا تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کی اور اپنے اس کے بندے اور رسول ہونے کی گواہی دی پھر راوی احمد بن یونس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا خطبہ نقل کیا الحدیث۔ یہ راوی سمرہ بن جندبؓ ہیں انکی روایت میں صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد کیلئے حاضر ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقے کو دیکھیں کہ آپ ایسی حالت میں کیا فرماتے ہیں، لہٰذا لامحالہ یہ صحابی پہلی صف میں کھڑے ہوئے ہونگے اور انہوں نے اپنے کان و دل (ظاہر و باطن) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو محفوظ کیا ہوگا۔

دیگر راوی صحابہ کی روایت پر جرح: لہٰذا ان صحابی کی روایت پر دوسرے اُن صحابہ کی روایت کیسے راجح ہو سکتی ہے جو اس واقعہ میں خاص اسی مقصد کیلئے نہیں گئے اور انکے واقعہ کا سیاق حضرت سمرہؓ کے واقعہ کے سیاق کی طرح نہ ہو اور نہ وہ اس نماز کی گہرائی تک پہنچے ہوں۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کی روایتیں انکی روایت پر راجح نہیں ہو سکتیں۔ صلوٰۃ الکسوف میں احادیث کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت طویل قرأت فرمائی تھی جیسا کہ حضرت سمرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے لہٰذا جو صحابہؓ اگلی صفوں میں نہیں تھے تو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تکبیر کہتے تھے اور کبھی تسبیح اور کبھی صحابہؓ کو ایک آیت با آواز بلند سنا دیتے تو صحابہؓ نے ان تکبیرات کو سن کر یہ سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں جا رہے ہیں اسلئے صحابہ کرام بھی رکوع میں چلے جاتے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ کبھی قرأت کی آواز سنتی اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکبیرات کی اسی لئے انہوں نے جیسا سنا ویسے ہی نقل کر دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسوف کی نماز میں مختلف احادیث وارد ہونے کا سبب[1] یہ امر بنا۔

---

[1] ورنہ ایک ہی واقعہ میں اسقدر طویل اختلاف کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، جمہور کا یہ کہنا کہ ہر ایک رکعت میں دو رکوع والی رویت صحیح ہے اور باقی روایات ضعیف ہیں تو اولاً تو صرف یہ ایک دعویٰ ہے ثانیاً یہ کہ جن روایات میں ہر ایک رکعت میں دو سے زیادہ رکوع کا ذکر ہے وہ دو رکوع والی روایات کے مقابلے میں کثرت سے مروی ہیں، محدثین کی ایک جماعت نے انمیں سے بعض روایات کو صحیح بھی قرار دیا ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ کا قول آپ کے سامنے آ رہا ہے۔

احناف کے دلائل: نیز حضرت ابوبکرہ، سمرہ بن جندب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو، قبیصہ الہلالی، نعمان بن بشیرؓ کی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف میں دو رکعت نماز پڑھائی جیسا کہ عیدین کی نماز ہوتی ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ تمام احادیث مشہور اور صحیح السند میں سب سے اصح حدیث ابو قلابہ عن النعمان والی روایت ہے۔ قلت: اوجز میں ان روایات اور انکی تخریج پر مفصل کلام ذکر کیا گیا ہے نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اذا رایتموھا فصلوا کاحدث صلاۃ صلیتموھا من المکتوبۃ رواہ النسائی واحمد۔ اس حدیث میں فجر کی نماز کی طرح دو رکعت پڑھنے حکم دیا گیا ہے۔ نیموی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلوٰۃ الکسوف کا واقعہ صرف ایک مرتبہ ہوا: لیکن یہ یاد رہیکہ واقعہ صرف ایک ہی دفعہ ہوا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ منورہ میں صرف ایک بار سورج گرہن ہوا ہے، مکہ مکرمہ میں نہ صحابہؓ کا اجتماع ہوسکتا تھا اور نہ ہی اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ہوسکتی تھی، تو وہاں پر باجماعت نماز کا تصور ہی نہیں۔

باب ماجاء فی صفة القراءة فی الکسوف

باب نمازِ کسوف میں قرأت کیسے کی جائے؟

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وکیع حَدَّثَنَا سفیانُ عن الاسود بن قیس عن ثعلبة بن عباد عن سمرة بن جندب قال: صلّٰی بنَا النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی کُسُوفٍ لَا نَسْمَعُ له صوتاً۔قال: وفی الباب عن عائشةَ قال ابو عیسی: حدیث سمرة حدیث حسن صحیحٌ۔ وقد ذهب بعضُ اهل العلم الی هذا۔ وهو قولُ الشافعیِّ۔ ☆حدثنا ابو بکرٍ محمد بن اَبَانَ حَدَّثَنَا ابراهیم بن صدقة عن سفیان بن حسین عن الزهریِّ عن عروة عن عائشة: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم صلّٰی صلاةَ الکسوفِ، وجَهَرَ بالقراءةِ فیها۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔ورواه ابو اسحٰق الفزاری عن سفیانَ بن حسینٍ: نحوهَ۔ وبهٰذا الحدیث یقولُ مالکُ بن انسٍ ، واحمدُ واسحٰقُ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کسوف کی نماز پڑھائی جس میں ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نہیں سنی (قرأت میں)۔ اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ بعض اہل علم نے قرأتِ سریہ (یعنی آہستہ آواز سے قرأت) ہی کو اختیار کیا ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ کسوف پڑھی اور اس میں بلند آواز سے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) قلت: حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہے کہ قول وفعل میں جب تعارض ہوجائے تو محدثین کے ہاں یہ مشہور قاعدہ ہے کہ قولی حدیث کو ترجیح دیتے ہیں نیز فعلی روایات میں تعارض ہے اور قولی روایات سالم عن المعارضہ ہے اس کے ساتھ ساتھ قولی روایات اصول کے موافق ہے اور قیاس سے بھی انہی کو ترجیح ہوتی ہے حنفیہ کے مسلک کے وجوہ ترجیحات کی تفصیل اوجز المسالک میں مذکور ہے۔

قرأت کی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابواسحٰق فزاری بھی سفیان بن حصین سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں اور امام مالک، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ بھی اسی حدیث کے قائل ہیں۔

﴿تشریح﴾

(قد اختلف اهل العلم فی القرأة فی صلوٰة الکسوف) آپ کو اس اختلاف[1] کی وجہ معلوم ہے نیز ہم نے سمرہؓ کی جو حدیث ذکر کی ہے تو اس حدیث کے ذکر کرنے کے بعد حدیث باب کے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔

امام ترمذیؒ پر رد: (وهذا عند اهل العلم جائز علی قدر الکسوف) ہائے کاش ان محدثین نے یہ کیسے ثابت کیا کہ احادیث میں متعدد رکوع کرنا صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، یہ ثابت ہی نہیں کہ اسے جائز کہا جائے کیونکہ سورج گرہن صرف ایک مرتبہ ہوا ہے اور چھ رکوع، دو رکوع والی روایات سے یہ مراد نہیں لیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے رکوع فرمائے تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی مرتبہ صلوٰۃ الکسوف پڑھی ہے لہٰذا ان احادیث میں سے صرف ایک حدیث پر عمل کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر طریقے کا اختیار دیا جائیگا۔

چاند گرہن کی صورت میں نمازِ باجماعت پر استدلال: (یصلی صلوٰة الکسوف فی جماعة فی کسوف الشمس والقمر) امام ترمذیؒ کے اس نقل کردہ مذہب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سورج گرہن کی صورت میں باجماعت نماز کا ثبوت ہے تو چاند گرہن کی صورت میں بھی باجماعت نماز کا ثبوت ہونا چاہیئے۔

احناف کا جواب: حنفیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ نفل کی جماعت فی نفسہ مکروہ ہے ہاں جن مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ مستثنیٰ ہیں اور چاند گرہن کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باجماعت نماز کا ثبوت نہیں لہٰذا یہ حکم نہی والی حدیث کے عموم میں داخل رہیگا اور نفل کی جماعت ممنوع ہوگی۔

(قوله عن سمرة بن جندب) اس روایت سے حنفیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز کسوف کی ہر رکعت میں ایک ایک رکوع

---

[1] **صلوٰۃ الکسوف میں قرأۃ سری ہوگی یا جہری؟ اختلاف ائمہ:** امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صلوٰۃ الکسوف میں قراۃ سری ہوگی اور امام ابویوسف واحمد کے ہاں جہری قرأت ہوگی، امام محمدؒ سے دونوں روایتیں ہیں، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا مذہب اور امام مالک، ابوحنیفہ، لیث بن سعد اور جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ سورج گرہن میں سری قرأت ہوگی اور چاند گرہن میں جہری قرأت ہوگی، انتہی۔ امام نوویؒ نے امام مالک کا جو مذہب نقل کیا ہے یہ انکی مشہور روایت ہے مازری کہتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے امام مالکؒ کے متعلق سری قرأت والا جو مذہب نقل کیا ہے وہ ایک شاذ روایت ہے کذا فی الاوجز

ہوگا یہ حدیث اسی طریقہ پر مروی ہے جسطرح ہم نے ذکر کیا تھا امام شافعیؒ نے اس حدیث[1] پر عمل کیا ہے اور انہوں نے عائشہؓ کے قول کونہیں لیا۔

باب ماجاء فی صلاة الخوفِ

باب نمازِ خوف کا بیان

☆ حَدَّثَنَا محمد بن عبد الملك بن ابی الشَّوَارِبِ حَدَّثَنَا يزيد بن زُرَيع انا مَعْمَرٌ عن الزهریٌ عن سالمٍ عـن ابيـه: ان الـنبیٌ صلی اللہ علیه وسلم صلّی صلاةَ الخوف بِاحدَی الطائفتين ركعةً، والطائفةُ الاخرىَ مُـواجهة العدو، ثم انصرفوا، فقاموا فی مقام اولئك، وجاء اولئك فصلّی بهم ركعة اخری، ثم سلم عليهم ،فـقـامَ هـولاء فقضوا ركعتهم، وقام هولاء فقضوا ركعتهم۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح وقـد روى مـوسـى بـن عـقبة عـن نـافع عن ابن عمرعن النبیﷺ: مثل هذا۔ قال: وفی الباب عن جابر، وحـذيفة ، وزيد بن ثـابـت،وابـن عبـاس، وابـی هـريرة، وابن مسعودٍ، وسهل بن ابی حثمة، وابی عياش الـزرقـی واسـمه زيد بن صامت وابی بكرةَ۔ قال ابو عيسى: وقد ذهب مالك بن انس فی صلاةِ الخوف الی حديث سهل بن ابی حثمة۔ وهو قول الشافعیٌ۔ وقال احمد: قدروی عن النبی صلی اللہ علیه وسلم صـلاةُ الـخـوفِ عـلـى اَوْجُـه، وما اعلم فی هذا الباب الا حديثا صحيحاً، واختار حديث سهل بن ابی حثمة۔ وهـكـذا قـال اسـحٰق بن ابراهيم، قال: ثبتت الروايات عن النبی صلی اللہ علیه وسلم فی صلاة الـخـوف۔ ورای ان كـل ماروی عن النبی صلی اللہ علیه وسلم فی صلاةِ الخوف فهو جائز، وهذا علی قَـدْرِ الـخـوف۔ قال اسحٰق: وَلَسْنَا نختار حديث سهل بن ابی حثمة علی غيره من الروايات۔ ☆حدثنا مـحـمـد بـن بشـار حَـدَّثَنَا يحيى بن سعيدٍ القطان حَدَّثَنَا يحيى بن سعيد الانصاری عن القاسم بن مـحـمـد عن صالح بن خوات بن جبير عن سهل بن ابی حثمة انه قال فی صلاةِ الخوف، قال: يقوم الامـام مسـتـقبـل القبلة،ويقوم طائفة منهم معه وطائفة من قبل العدو، ووجوههم الی العدو، فيركع بهم ركعة، ويركعون لانفسهم ركعة، ويسجدون لانفسهم سجد تين فی مكانِهم، ثم يذهبون الی مقاماولئك، ويجیء اولئك فيركع بهم ركعة ويسجد بهم سجدتين، فهی له ثنتان ولهم واحدة، ثم يركعون ركعة ويسجدون سجدتين۔☆قال ابو عيسى: قال محمد بن بشار سالت يحيى بن سعيد

---

[1] یعنی امام شافعیؒ نے قرأت سری کے مسئلہ میں حضرت سمرہؓ کی حدیث پر عمل کیا ہے البتہ رکوع کی تعداد کے متعلق انکا حدیث سمرہ پر عمل نہیں

عن هذا الحديث؟ فحدثنی عن شعبة عن عبد الرحمٰن بن القاسم عن ابيه عن صالح بن خوات عن سهل بن ابی حثمة عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم : بمثل حديث يحيی بن سعيد الانصاری۔ وقال لی يحيی اكتبه الی جنبه، ولست احفظ الحديث، ولكنه مثل حديث يحيی بن سعيد الانصاریؒ۔ قال ابو عيسی: وهذا حديث حسن صحيحٌ۔لم يرفعه يحيی بن سعيد الانصاری عن القاسم بن محمد، وهكذا رواه اصحاب يحيی بن سعيد الانصاری موقوفاً، ورفعه شعبة عن عبد الرحمٰن بن القاسم بن محمد۔

☆وروی مالك بن انسٍ عن يزيدَ بن رُومَانَ عن صالح بن خوات عن من صلّی مع النبی ﷺ صلاةَ الخوف: فذكر نحوَه۔ قال ابو عيسی: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ وبه يقول مالك ، والشافعی، واحمدُ، واسحٰق۔ وروی عن غير واحد: ان النبی صلی اللّٰه عليه وسلم صلی باحدی الطائفتين رَكعَةً رَكعَةً ، فكَانَتْ لِلنَّبِیِّ ﷺ ركعتانِ ولهم ركعة ركعة۔ قال ابو عيسی: ابو عياش الزرقی اسمه زيد بن صامت۔

﴿ترجمہ﴾

سالم سے روایت ہے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز خوف میں ایک رکعت ایک گروہ کو پڑھائی جب کہ دوسرا گروہ دشمن کے مقابل میں تھا پھر یہ پہلا گروہ انکی جگہ چلا گیا اور دوسرے طائفہ نے آکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں دوسری رکعت پڑھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر دیا اور اس گروہ نے کھڑے ہوکر اپنی چھوڑی ہوئی رکعت پوری کی، اس کے بعد دوسرا گروہ کھڑا ہوا اور اس نے بھی اپنی دوسری رکعت پڑھی۔ اس باب میں جابر، حذیفہ، زید بن ثابت، ابن عباس، ابوہریرہ، ابن مسعود، ابوبکرہ، سہل بن ابوحثمہ اور ابوعیاش زرقی رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں امام مالک نمازِ خوف میں سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت پر عمل کرتے ہیں اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ نمازِ خوف آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی طرح مروی ہے اور میں اس باب میں صرف صحیح حدیث کو ہی جانتا ہوں یعنی میرے علم کے مطابق صلوٰۃ الخوف کے باب میں مروی تمام احادیث صحیح ہیں اور میں سہل بن ابی حثمہؓ کی حدیث کو اختیار کرتا ہوں۔ اسحٰق بن ابراہیم بھی اسی طرح کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ الخوف میں کئی روایات ثابت ہیں ان سب پر عمل کرنا جائز ہے یعنی یہ خوف کی مقدار پر ہے۔ اسحٰق کہتے ہیں کہ ہم سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کو دوسری روایات پر ترجیح نہیں دیتے۔ ابن عمرؓ کی حدیث حسن صحیح ہے، اسے موسیٰ بن عقبہ نے نافع سے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں۔

سہل بن ابی حثمہ نماز خوف کے متعلق فرماتے ہیں کہ امام قبلہ کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ایک گروہ کھڑا

ہو جبکہ دوسرا گروہ دشمن کے مقابل رہے اور انہی کی طرف رخ کئے رہے۔ پھر امام پہلے گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور یہ پہلا گروہ دوسری رکعت از خود پڑھے اور اسی جگہ دو سجدے کرنے کے بعد دوسری جماعت کی جگہ دشمن کے مقابل آ جائے پھر وہ دوسری جماعت آ کر امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور دو سجدے کرے امام کی دو رکعتیں ہو جائیں گی اور اس دوسری جماعت کی پہلی رکعت ہوگی۔ پھر یہ لوگ کھڑے ہو جائیں اور دوسری رکعت پڑھیں اور دو سجدے کریں۔ محمد بن بشار کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے شعبہ کے حوالے سے مجھے بتایا کہ شعبہ، عبدالرحمٰن بن قاسم سے وہ اپنے والد قاسم سے وہ صالح بن خوات سے وہ سہل بن ابی حثمہؓ سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یحییٰ بن سعید انصاری کی روایت کے مثل بیان کرتے ہیں پھر یحییٰ بن سعید القطان نے مجھ سے کہا کہ اس حدیث مرفوع کو گذشتہ سند موقوف کے پہلو میں لکھ دو۔ مجھے یہ حدیث اچھی یاد نہیں لیکن یہ یحییٰ بن سعید انصاری کی حدیث کے مثل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسے یحییٰ بن سعید انصاری نے قاسم بن محمد کی سند سے مرفوع نہیں کیا۔ یحییٰ بن سعید انصاری کے شاگرد بھی اسے موقوف ہی روایت کرتے ہیں۔ جبکہ شعبہ، عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد کے واسطے سے اسے مرفوع روایت کرتے ہیں مالک بن انس، یزید بن رومان سے وہ صالح بن خوات سے اور وہ ایک ایسے شخص سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں جو نماز خوف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھ چکے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔ اور یہ کئی راویوں سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں گروہوں کو ایک ایک رکعت نماز پڑھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دو رکعتیں ہو گئیں اور ان دونوں جماعتوں کیلئے ایک ایک رکعت تھی۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں ابو عیاش زرقی کا نام زید بن صامت ہے

﴿تشریح﴾

بحثِ اول: سب سے پہلے یہ بات جاننی چاہیئے کہ صلوٰۃ الخوف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد طریقوں کے ساتھ مختلف احادیث میں مروی ہے انمیں سے بعض احادیث حسن کا درجہ رکھتی ہیں اور بعض صحیح السند ہیں احادیث میں صلوٰۃ الخوف کی ۲۵ صورتیں[1] مذکور ہیں۔

---

[1] ابن العربی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ الخوف ۲۴ مرتبہ پڑھی ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ ۱۶ طریقوں سے مختلف روایات میں یہ نماز مروی ہے، ابن العربی نے ان روایتوں کو بیان نہیں کیا لیکن عراقی نے ترمذی کی شرح میں ان طریقوں کو بیان کیا ہے والبسط فی الاوجز۔

بحثِ ثانی: دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام طریقوں سے صلوٰۃ الخوف پڑھنا تمام ائمہ کے ہاں جائز ہے[1] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کونسی صورت کو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔

بحثِ ثالث: صلوٰۃ الخوف میں مذکورہ دوصورتیں غیر معمول بہا ہیں: ہاں امام ابوحنیفہ[2] نے صلوٰۃ الخوف کی دوصورتوں کو ناجائز فرمایا ہے اور وہ دونوں صورتیں اور طریقے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہیں: ۱۔ حدیث شریف میں صلوٰۃ الخوف کا یہ طریقہ مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طائفہ کو دو رکعت نماز پڑھائی پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو چار رکعتیں ہوئیں اور ہر طائفہ کی دودو۔ اس صورت میں دوسرے طائفہ کے نماز پڑھنے کی صورت میں صلاۃ المفترض خلف المتنفل لازم آئیگی لہٰذا امام صاحب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کیلئے اس صورت کو جائز قرار نہیں دیا، ۲۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر جماعت کو ایک ایک رکعت نماز[3] پڑھائی تو یہ صورت بھی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مؤول ہے اسکی تاویل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی صرف ایک رکعت ہوئی تھی نہ کہ یہ کہ صحابہؓ کی پوری نماز صرف ایک رکعت تھی، اگر یہ تاویل نہ کی جائے اور اس حدیث کو اس کے ظاہر پر رکھا جائے کہ صحابہؓ نے صرف ایک ہی رکعت پڑھی تھی تو یہ صورت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ آپ کے علاوہ کسی کیلئے یہ صورت جائز نہیں۔

---

[1] شوکانی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ الخوف کے جتنے طریقے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں انمیں سے ہر ہر طریقے پر علماء کی ایک جماعت کا عمل ہے بیہقی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ اور محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک صلوٰۃ الخوف کے جتنے طریقے احادیث میں مروی ہیں تو انمیں سے ہر ہر حدیث پر عمل کرنا صحیح ہے۔ حافظ نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ صلاۃ الخوف میں چھ یا سات حدیثیں صحیح سند سے ثابت ہیں جو آدمی انمیں سے جس طریقے پر بھی صلاۃ الخوف پڑھیگا تو اسکی وہ نماز صحیح ہوگی والبسط فی الاوجز

[2] صرف امام صاحب نے ان دونوں طریقوں کا انکار نہیں کیا بلکہ صلوٰۃ الخوف کے پہلے طریقے کے قائل صرف وہی لوگ ہیں جو صلاۃ المفترض خلف المتنفل کو صحیح قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے ابن العربی نے اس طریقہ کو غرائب اور متفردات میں شمار کیا ہے۔ رہا دوسرا طریقہ تو ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں بیہقی فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف میں یہ حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر جماعت کو ایک رکعت نماز پڑھائی پھر سلام پھیر دیا یہ حدیث صحیح سند سے ثابت نہیں۔ ہم نے اس طریقہ کو اس لئے چھوڑ دیا کہ صلوٰۃ الخوف کی باقی تمام احادیث اس پر متفق ہیں کہ مقتدی بھی نماز کی اتنی رکعتیں پڑھینگے جتنی کہ امام پر ضروری ہیں اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ نماز تمام لوگوں پر ایک ہی طریقے سے فرض ہے۔ انتہی۔ قلت: اوجز المسالک میں صلوٰۃ الخوف کی مباحث میں سے پانچویں بحث میں اس مسئلہ کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے اور وہاں یہ تصریح ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک اگر یہ حدیث صحیح السند ہو تو یہ حدیث مؤول ہے۔

[3] تو صحابہ کی ایک روایت ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو رکعتیں ہوئیں۔ ابوداؤد میں زید بن ثابتؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

بحثِ رابع: تیسری بات یہ ہے کہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ دشمن کے خوف کے وقت صلاۃ الخوف جائز اور مشروع ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک مشروع رہیگی البتہ امام ابو یوسف نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے لوگوں کیلئے اس صلوٰۃ الخوف کو غیر مشروع[1] قرار دیا ہے اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے شمار کیا ہے اسی لئے فقہاء میں سے کسی نے بھی امام ابو یوسفؒ کے قول کو[2] نہیں لیا اور کیوں انکے قول کو لیا جاتا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ نے صلوٰۃ الخوف پڑھی ہے اور اس حکم پر عمل کیا ہے تو کیا اس جماعت صحابہؓ پر یہ مخفی رہا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی اور کسی بھی صحابی نے اس فعل پر نکیر نہیں کی اور کیا صحابہؓ کا ایک غیر مشروع طریقے پر اجماع منعقد ہو گیا اور انہوں نے اپنی فرض نماز کے جائز ہونے کی تحقیق میں مبالغہ نہیں کیا کہ ہم نے اس طرح جو نماز پڑھی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔

بحثِ خامس: امام ترمذیؒ نے صلوٰۃ الخوف کی تین صورتیں ذکر فرمائی ہیں: چوتھی بات یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی جامع ترمذی میں صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتوں کے جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو امام ترمذیؒ کی نقل کردہ احادیث سے تین صورتیں ثابت ہوتی ہیں: ۱۔ وہ طریقہ جس کی طرف ابن عمرؓ کی حدیث سے مصنفؒ نے اشارہ کیا ہے، ۲۔ وہ طریقہ جو حدیث سہل بن ابی حثمہ میں موجود ہے، ۳۔ جس طریقے کی طرف مصنف نے باب کے آخر میں وروی عن غیر واحد ان النبی صلی علیہ وسلم صلی باحدی الطائفتین رکعة رکعة فکانت للنبی صلی الله علیه وسلم رکعتان ولهم رکعة رکعة سے اشارہ کیا ہے۔

یہاں چار احتمالات ہیں: (قوله والطائفة الاخری مواجهة العدو) پہلے طائفہ کے دشمن کے سامنے ہونے کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں: ۱۔ دشمن ان لوگوں کے سامنے جانبِ قبلہ میں[3] ہو، ۲۔ دشمن انکے پیچھے ہو، ۳۔ دائیں ہو، ۴۔ انکے بائیں طرف ہو۔ لیکن حدیث کے بعض الفاظ اس طرح ہیں کہ دوسرا طائفہ دشمن کے سامنے تھا پھر وہ طائفہ آیا اور پہلی جماعت وہاں سے چلی گئی ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جہتِ قبلہ میں نہیں تھا کیونکہ اگر دشمن انکے سامنے ہوتا

---

[1] یہ امام ابو یوسفؒ کی مشہور روایت ہے اور اس پر انکے شاگرد حسن بن زیاد لولوئی، ابراہیم بن علیہ اور شوافع میں سے مزنی نے اختیار کیا ہے کمافی الاوجز

[2] یعنی مشہور فقہاء میں سے کسی نے امام ابو یوسفؒ کا قول نہیں لیا ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ کن علماء نے انکا مذہب اختیار کیا ہے۔

[3] یعنی دشمن پہلے طائفہ کے سامنے ہو یعنی وہ طائفہ جو امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے کیونکہ دشمن تو ہر حالت میں دوسرے طائفہ کے سامنے ہی ہوگا ورنہ دو جماعتیں بنانے کا کیا فائدہ حضرت گنگوہیؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث باب میں دشمن ہر جہت میں ہوسکتا ہے ہاں حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جہتِ قبلہ میں نہیں تھا۔

تو حدیث میں یہ تخصیص کہ دوسرا طائفہ دشمن کے سامنے تھا اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اگر دشمن سامنے ہوتا تو سب کے سب دشمن کے مدمقابل ہوتے نہ کہ صرف دوسرا طائفہ، ہاں یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جب پہلا طائفہ سجدے میں گیا تو اس وقت صرف دوسرا طائفہ دشمن کے مدمقابل تھا۔ رہا حدیث میں یہ الفاظ کہ جاء، وانصرف کہ ایک طائفہ آیا اور دوسرا پیٹھ پھیر کر چلا گیا اس کی بھی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ اس کے بھی حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ یہ کنایہ ہے پچھلی صف کے آگے ہونے سے اور اگلی صف کے پیچھے ہونے سے تو اس صورت میں دشمن چار جہتوں میں سے کسی بھی جہت میں ہوسکتا ہے کسی ایک جہت میں دشمن کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی تخصیص نہیں۔

حدیث باب کی شرح: بہر حال جو بھی صورت ہو اس حدیث میں فقام ھولاء فقضوا رکعتھم سے حنفیہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے اور یہ لفظ ایک احتمال کے مطابق ہمارے مذہب کے موافق ہے اور دوسرے احتمال کے مطابق مخالف، کیونکہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں قام ھولاء فقضوا رکعتھم وقام ھولاء فقضوا رکعتھم یعنی دونوں نے اپنی اپنی رکعت پوری کر لی تو اس سے معلوم ہوا کہ دونوں طائفوں نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی نماز پوری کی ہاں اس حدیث میں اس کی وضاحت نہیں کہ دونوں طائفوں نے ایک ہی وقت میں اپنی نماز پوری کی تھی یا پہلے طائفہ نے پہلے پڑھی اور دوسرے طائفہ نے بعد میں کیونکہ واؤ مطلق جمع کیلئے ہے اس سے تقدیم وتاخیر نہیں سمجھی جاسکتی لہٰذا اگر حدیث کا یہ معنی ہوا کہ سب صحابہؓ نے اکٹھے بقیہ نماز پوری کی تو یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے موافق نہیں ہوگی اور اگر یہ مراد لیا جائے کہ پہلے طائفہ نے پہلے اپنی نماز پوری کی تھی تو اس صورت میں یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے موافق ہے[1] اور اگر یہ مراد لیا جائے کہ دوسرے طائفہ نے پہلے نماز پوری کی تب بھی یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے خلاف ہوگی لیکن دوسرا احتمال پہلے اور تیسرے احتمال پر راجح ہے کیونکہ نمازِ خوف کی مشروعیت اس غرض سے ہوتی ہے کہ دورانِ نماز اطمئنان قلب کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوا جائے تو اگر پہلی صورت ہوتی ہو کہ دونوں طائفوں نے اکٹھے نماز پوری کی ہو تو اس صورت میں طمانیت بالکل ہی ختم ہو جائیگی ہاں جب ایک طائفہ نماز پوری کر رہا ہو اور دوسرا طائفہ دشمن کے سامنے ہو تو اس صورت میں تمام

---

[1] یہ صورت راجح ہے اگر چہ حدیث کے ظاہر سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے حافظ فرماتے ہیں صلوٰۃ الخوف میں ابن عمرؓ سے ایک ہی طریقہ پر روایات اور احادیث مروی ہیں ان احادیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ نے ایک ہی حالت میں بقیہ نماز پوری کی ہوگی اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ انہوں نے پے در پے نماز پوری کی ہو اور یہ دوسرا احتمال معنوی طور پر راجح ہے ورنہ اگر اکٹھے نماز پوری کی ہوتی تو اس طریقے سے جو مقصود ہے کہ ہر وقت دشمن پر پہرہ برقرار رہے، یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے اور امام اکیلے ہی پہرہ کیلئے رہ جاتا ہے اس احتمال کی تائید ابوداؤد کی اس روایت سے ہے جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے اس میں تصریح ہے کہ دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک نے پے در پے نماز پوری کی۔ انتہی کذا فی الاوجز

صحابہ کو اطمینان ہوگا۔ اور اگر دونوں طائفہ اکٹھے نماز کی دوسری رکعت ادا کریں گے تو اطمینان نہ رہے گا۔ رہا تیسرا احتمال[1] کہ دوسرا طائفہ پہلے نماز کو پورا کرے تو اس میں بعد میں شریک ہونے والے طائفہ کی نماز پہلے شریک ہونے والے طائفہ کی نماز ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجائیگی شریعت میں اس کی نظیر نہیں ملتی[2] جبکہ ہماری اختیار کردہ صورت میں ان دونوں خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی نہیں ہے کیونکہ جس پہلے طائفہ نے پہلے امام کی تحریمہ کے ساتھ نماز شروع کی تھی وہ طائفہ دوسری رکعت پہلے پڑھے گا اور دوسرا طائفہ بعد میں نماز کی دوسری رکعت پڑھے گا نیز ہماری اس مختار صورت میں اور بہت سے ایسے امور کی رعایت کی گئی ہے[3] جو نماز کی حالت کے شایانِ شان ہیں اور جو اشیاء نماز کی حالت کے شایانِ شان نہیں ان سے اجتناب کیا گیا ہے۔

وفی الباب کی تشریح: (قولہ وفی الباب عن جابر و حذیفۃ و زید بن ثابت الخ) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان تمام صحابہؓ سے یہی پہلے والا طریقہ نمازِ خوف مروی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان صحابہؓ سے صلوٰۃ الخوف کے متعلق مختلف طریقوں سے روایات مروی ہیں۔

اس جملہ کی تشریح: (قولہ ما اعلم فی ھذا الباب الا حدیثا صحیحاً[4]) یعنی اس باب صلوٰۃ الخوف میں نماز کے جتنے طریقے مروی ہیں سب کے سب صحیح حدیث سے ثابت ہیں انمیں سے کوئی بھی روایت ضعیف نہیں، لہٰذا کسی بھی ایک طریقہ کو بقیہ طریقوں پر سنداً ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ حنفیہ نے نمازِ خوف کے پہلے طریقے کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس طریقہ میں کوئی ایسا کام نہیں جو نماز کے افعال کے منافی ہو جیسا دوسرے ائمہ کی اختیار کردہ صورتوں میں ہے کہ مثلاً امام سے پہلے ہی مقتدی نماز کے ارکان سے فارغ ہوجاتا ہے اور امام مقتدیوں کا انتظار کرتا ہے حنفیہ کے مذہب میں یہ خرابیاں نہیں ہیں۔

---

[1] یعنی تیسرا احتمال کہ دوسرا طائفہ پہلے طائفہ سے پہلے اپنی دوسری رکعت سے فارغ ہوگیا ہو تو یہ بھی اسلئے مرجوح ہے کہ الخ

[2] نیز الفاظ حدیث سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی بخلاف پہلے احتمال کہ الفاظ حدیث سے اسکی تائید ہوسکتی ہے۔

[3] یعنی پہلے احتمال میں نماز کے شایانِ شان افعال کی رعایت ہوتی ہے اسطرح کی وجوہ ترجیحات اس احتمال میں موجود ہیں۔

[4] اثرم کہتے ہیں: میں نے ابوعبداللہ (امام احمد) سے سوال کیا کہ آپ تمام احادیث پر عمل کے قائل ہیں یا صرف ایک طریقے کو اختیار کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان طریقوں میں سے جو شخص جس طریقے کو بھی اختیار کریگا تو اس کیلئے یہ کرنا صحیح ہے لیکن میں حدیث سہل کو اختیار کرتا ہوں۔ انتہی۔ یہ بات یاد رکھیں کہ امام ترمذیؒ نے یہ جو نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ کا مذہب شوافع والا ہی ہے تو یہ امام مالکؒ کا مرجوع عنہ قول ہے کیونکہ امام مالکؒ نے اس قول کی طرف رجوع کرلیا تھا کہ امام تو منفرداً خود ہی سلام پھیر دیگا اور وہ دوسرے طائفہ کے فارغ ہونے کا انتظار نہیں کریگا جبکہ شافعیہ کے نزدیک امام دوسرے طائفہ کے انتظار میں تشہد میں بیٹھا رہیگا پھر اس کے فارغ ہونے کے بعد ان لوگوں کے ساتھ اکٹھے سلام پھیرے گا۔ کذا فی الاوجز

حنابلہ شافعیہ پر اعتراض: (قولہ لسنا نختار حدیث سھل) خلاصہ یہ ہے کہ امام اسحٰق، امام احمد و شافعی پر یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ ترجیح بلا مرجح صحیح نہیں ہے، تو آپنے حدیث سہل کو بقیہ احادیث پر کیوں راجح قرار دیا حالانکہ اس کی کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے۔ حنفیہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے ترجیح بلا مرجح نہیں کی بلکہ ہماری اختیار کردہ صورت حدیث ابن عمرؓ کا مرجح موجود ہے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: حنفیہ کی اختیار کردہ صورت میں نماز کے منافی بہت سے افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے، (آنا جانا، ذہاب وانصراف)۔

جواب: یہ افعال شارع علیہ السلام کے حکم سے ثابت ہیں لہٰذا جب شارع نے ان افعال کو نمازِ خوف کے منافی قرار نہیں دیا تو یہ افعال نمازِ خوف میں ممنوع نہیں رہے تو نماز میں چلنا پھرنا آنا جانا نمازِ خوف کی صحت کے منافی نہیں۔ اسلئے ان افعال کی کثرت کی وجہ سے نماز میں کوئی خرابی نہیں ہوگی، شوافع یہ جواب دیتے ہیں ہم نے حدیث سہل کو کثرتِ طرق کی وجہ سے ترجیح دی ہے لیکن یہ جواب نامکمل ہے کیونکہ کثرت طرق اور تعدد علل کی وجہ سے کوئی روایت راجح قرار نہیں دی جاتی لہٰذا جب خود شوافع بھی باقی روایات کو ضعیف قرار نہیں دیتے بلکہ ان باقی روایات کو حسن اور صحیح کہتے ہیں تو اس حدیث سہل کی بقیہ روایات پر کوئی وجہ ترجیح سمجھ میں نہیں آتی۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: صلوٰۃ الخوف میں استقبالِ قبلہ کی شرط جمہور کے نزدیک ساقط کردی گئی ہے حالانکہ حنفیہ کے مذہب میں جو حکم کتاب اللہ سے ثابت ہو تو خبرِ واحد سے وہ حکم ساقط نہیں ہوسکتا (تو یہاں کتاب اللہ سے ثابت شدہ حکم فول وجھك الخ خبر واحد یعنی صلوٰۃ الخوف والی حدیث سے کیسے ساقط ہوگیا؟) جواب: اینما تولوا فثم وجہ اللہ، قرآن کی اس آیت نے سواری پر نفل پڑھنے والے اور جس شخص کو صحرا یا اندھیرے میں قبلہ معلوم نہ ہو اور ایسا بیمار جسے کوئی قبلہ رخ کرنے والا نہ ہو ان سب لوگوں کو قرآن کی آیت "فول وجھك وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم" الخ کے عموم سے خاص کردیا گیا ہے تو "اینما تولوا فثم وجہ اللہ" انکے لئے مخصص بن گیا لہٰذا خبر واحد سے نمازِ خوف کو بھی خاص کیا جاسکتا ہے۔ جواب ۲: صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت متواتر احادیث سے ثابت ہے، ورنہ کم از کم یہ روایت شہرت کی حد تو پہنچی ہوئی ہیں لہٰذا مطلق کتاب اللہ کو ان صلوٰۃ الخوف والی مشہور متواتر احادیث سے خاص کیا جاسکتا ہے۔

قال ابوعیسیٰ کی مفصل تشریح: (قولہ حدثنا محمد بن بشار عن یحییٰ بن سعید القطان نا یحییٰ بن سعید الانصاری عن القاسم بن محمد) اور دوسری روایت میں سند اس طرح ہے محمد بن بشار عن یحییٰ بن سعید القطان عن شعبہ عن عبدالرحمن بن القاسم عن ابیہ القاسم بن محمد (عن صالح بن خوات عن سھل بن ابی حثمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔ خلاصہ یہ ہوا کہ محمد بن بشار اس حدیث کو قطان راوی نے نقل کررہے ہیں اور یحییٰ بن سعید القطان کے دو استاذ ہیں: ا۔ یحییٰ بن

سعید الانصاری، ۲۔شعبہ، تو یحییٰ قطان نے اپنے شاگرد محمد بن بشار کو کبھی اپنے استاذ یحییٰ بن سعید الانصاری والی روایت نقل کی جس میں عبدالرحمٰن بن قاسم کا واسطہ نہیں ہے لیکن یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور کبھی یحییٰ قطان اپنے دوسرے استاذ شعبہ سے روایت حدیث نقل کرتے ہیں جسمیں عبدالرحمٰن کا واسطہ ہے لیکن یہ دوسری سند مرفوع ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قال جو آگے آنے والے کلام میں آرہا ہے، اس قال کا فاعل شعبہ[1] ہے تو ایک اور قال محذوف نکالنا ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یحییٰ بن سعید القطان نے جب اس حدیث کو شعبہ سے نقل کیا تو کہا کہ شعبہ نے مجھ سے کہا: مجھے حدیث کے بعینہ الفاظ یاد نہیں لیکن میں اپنی حدیث میں بعینہ وہی الفاظ ذکر کروں گا جو تمہارے استاذ یحیی بن سعید الانصاری کی حدیث کے الفاظ ہیں، لہٰذا تم میری حدیث کو انکی حدیث کے ساتھ لکھ لو کیونکہ یہ دونوں حدیثیں درحقیقت ایک ہی مفہوم پر دلالت کر رہی ہیں انکے درمیان کوئی فرق نہیں یا یہ معنی ہوگا کہ یحییٰ بن سعید القطان کو چونکہ شعبہ کی حدیث کے الفاظ میرے دوسرے استاذ یحییٰ الانصاری کی حدیث کے الفاظ کے مثل ہیں اگرچہ مجھے حدیثِ شعبہ کے بعینہ الفاظ یاد نہ رہے تھے ہاں انہیں یحییٰ بن سعید الانصاری کی حدیث کے الفاظ یاد تھے اسلئے قطان یہ کہہ رہے ہیں کہ میرے استاذ شعبہ کی حدیث کے الفاظ میرے دوسرے استاذ یحییٰ الانصاری کی حدیث کے الفاظ کے مثل ہیں اگرچہ مجھے شعبہ کی حدیث کے بعینہ الفاظ یاد نہ رہے۔شعبہ اور یحییٰ کی حدیثوں میں یہ فرق ضرور موجود ہیکہ ایک نے حدیث کو مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیا ہے اور دوسرے نے موقوف علی سہل بن ابی حثمہ، لیکن یہ اختلاف مضر نہیں کیونکہ یہ موقوف غیر مدرک بالقیاس ہے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلانے ہی سے صحابی کو اسکا علم ہوا ہوگا اسلئے یہ موقوف مرفوع کے حکم میں ہے۔

---

[1] **کلام مصنف کی وضاحت:** یعنی مصنف کے قول قال لی اکتبه الی جنبه ولست احفظ الحديث اس قال کا فاعل شعبہ ہوگا حضرت گنگوہیؒ کے اس فرمان کا مضمون مشائخ سے اسی طرح حاصل کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اسی محشی سے تقریر کے حوالے سے اس جملہ کی یہی وضاحت کی ہے۔شاید کہ شراح حدیث کو اس وضاحت کی ضرورت اسلئے پڑی کہ سیاق کلام سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وقال لی اکتبه الخ میں قال کا عطف فحدثنی پر ہوگا اسلئے حضرت نے جو توجیہ فرمائی ہے اس کو ذکر کرنا ضروری ہے لیکن مجھ ناقص کے خیال میں یہ سمجھ میں آتا ہیکہ قال لی اکتبه الی جنبه الخ یہ ابن بشار کا مقولہ ہے اور قال کا فاعل یحییٰ القطان ہے خلاصہ یہ ہوا کہ یحییٰ القطان نے مجھے کہا کہ اس مرفوع حدیث کو موقوف حدیث کے ساتھ لکھ لو تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حدیث دونوں سندوں سے مروی ہے مرفوعاً بھی اور موقوفاً بھی۔(لست احفظ الحديث) اس قول میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ قطان کا مقولہ ہو تو یہ کلام دوسرا سبب بنے گا اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ لکھنے کا کیونکہ جب قطان کو شعبہ کی حدیث کے الفاظ یاد نہ رہے لیکن اتنا ضرور یاد رہا تھا کہ اس حدیث کے الفاظ یحیی الانصاری کی حدیث کے الفاظ کی طرح تھے لہٰذا حدیث شعبہ کو حدیث انصاری کے ساتھ ہونا زیادہ بہتر ہے تاکہ حدیث یحییٰ کے الفاظ لکھدیئے جائیں اور حدیث شعبہ میں انہی الفاظ کا حوالہ دیدیا جائے اس معنی کیطرف حضرت گنگوہیؒ نے اشارہ کیا ہے اور میرے نزدیک یہی معنی راجح ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ ابن بشار کا مقولہ ہو تو اس صورت میں قال لی اکتب الخ یہ جملہ نیا کلام ہوگا۔اس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہ ہوگا (یعنی لست احفظ الحديث ابن بشار کا مقولہ ہوگا اور اس کا قال لی اکتب سے تعلق نہ ہو) یعنی ابن بشار نے کہا کہ جو حدیث قطان نے مجھے شعبہ استاذ سے سنائی تھی وہ حدیث مجھے یاد نہ رہی لیکن وہ حدیث یحییٰ الانصاری کی حدیث کے مثل تھی۔فتامل

باب ماجاء فی سجود القرآن

باب قرآن مجید کے سجدوں کے بیان میں

☆حدثنا سفیان بن وکیع حَدَّثَنَا عبد اللّٰہ بن وھب عن عمرو بن الحرث عن سعید بن ابی ھلال عن عمر الدمشقی عن ام الدرداء عن ابی الدرداء قال: سجدت مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احدی عشرۃ سجدۃ، منھا التی فی النجم۔☆حدثنا عبد اللّٰہ بن عبد الرحمٰن اخبرنا عبد اللّٰہ بن صالح حَدَّثَنَا اللیث بن سعد عن خالد بن یزید عن سعید بن ابی ھلال عن عمر، وھو ابن حیان الدمشقی ، قال: سمعتُ مخبراً یخبرنی عن ام الدرداء عن ابی الدرداء قال سجدت مع رسول اللّٰہ ﷺ احدی عشرۃ سجدۃ منھا التی فی النجم : وھٰذا اصح من حدیث سفیانَ بن وکیعٍ عن عبد اللّٰہ بن وھبٍ۔قال: وفی الباب عن علی، وابن عباسٍ، وابی ھریرۃَ، وابن مسعودٍ، وزید بن ثابتٍ، وعمرو بن العاصِ۔قال ابو عیسی: حدیث ابی الدرداء حدیث غریب ، لانعرفہ الا من حدیث سعید بن ابی ھلال عن عمر الدمشقی۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گیارہ سجدے کئے جن میں سورہ نجم والا سجدہ بھی شامل ہے۔اس باب میں حضرت علی، ابن عباس، ابوہریرہ، ابن مسعود، زید بن ثابت اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے۔ہم اسے سعید بن ابو ہلال کی عمر دمشقی سے روایت کے علاوہ نہیں جانتے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ گیارے سجدے کئے ان میں سے ایک سورہ نجم کا سجدہ ہے یہ روایت سفیان بن وکیع کی عبداللہ بن وہب سے مروی حدیث سے اصح ہے۔

باب ماجاء فی خروج النساء الی المساجد

باب عورتوں کا مسجدوں کی طرف جانا

☆حدثنا نصر بن علی حدثنا عیسی بن یونس عن الاعمش بن مجاھد قال: کنا عند ابن عمر، فقال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ائذنوا للنساء باللیل الی المساجد، فقال ابنہ : واللہ لَانَأْذَنُ لھن یتخذنہ دغلا فقال: فعل اللہ بك وفعل! اقول: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

وتقول: لاناذن لهن؟ـقال : وفی الباب عن ابی هريرة وزينب امراة عبد الله بن مسعودٍ، وزيد بن خالدٍ۔ قال ابو عيسی: حديث ابن عمر حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

مجاہد سے روایت ہے کہ ہم ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھے کہ انہوں نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں جانے کی اجازت دو۔اس پر ان کے بیٹے نے کہا اللہ کی قسم ہم ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کیونکہ یہ اسے فساد کا حیلہ بنائیں گی۔ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تیرے ساتھ ایسا کرے اور ویسا کرے (یعنی بد دعا دی) میں تمہیں بتارہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور تم کہتے ہو ہم اجازت نہیں دینگے۔ اس باب میں ابو ہریرہ، زید بن خالد اور زینب جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی زوجہ ہیں سے بھی روایت ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

باب موجودہ اور آئندہ کا سجود القرآن کی مباحث کے درمیان آنا بے ربط ہے: مصنف نے اس باب کو اور اس سے اگلے باب کو یہاں پر ذکر کیا ہے شاید ان دونوں ابواب کا ذکر یا تو لکھنے والوں سے غلطی سے لکھ دیا گیا ہے یا مصنفؒ سے سہو ہو گیا ہے ورنہ یہ دونوں باب اپنے محل پر نہیں ہیں اگر یہاں پر یہ تلاش کیا جائے کہ ان دونوں ابواب کو کس مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ بخاری کے ابواب میں مناسبتیں ڈھونڈی جاتی ہیں تو بے شمار مناسبتیں نکل سکتی ہیں لیکن یہ ایک نامناسب فعل ہوگا۔

اس قول کی شرح: (قوله قال ابنه والله لا ناذن لهن يتخذنه دغلا) دغل کہتے ہیں غلط اور غیر مشروع کاموں کے کرنے کیلئے حیلہ تلاش کرنے کو یعنی یہ عورتیں مسجد جانے کے بہانے سے غیر مشروع کام کیلئے نکلنا شروع ہو جائینگی۔

ابن عمرؓ کے صاحبزادے کے نام کی تعیین: ان صاحب زادے کے نام میں اختلاف ہے ایک قول میں ان کا نام واقد ہے، اور دوسرے قول میں بلال (از مترجم: صحیح مسلم میں دونوں سندیں مروی ہیں ایک سند میں تصریح ہیکہ ان کا نام واقد تھا اور دوسری سند میں تصریح ہے کہ انکا نام بلال تھا صحیح مسلم جلد ۱/ص ۱۸۳۔ باب خروج النساء الی المساجد اذا لم يترتب عليه فتنة) ان صاحبزادے کے انکار کرنے کا مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا انکار نہیں تھا اور نہ ہی آپ کے حکم کا مقابلہ کرنا مقصود تھا بلکہ

انکا مقصد اس قول سے یہ بتلانا تھا کہ دوسری احادیث میں عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ممانعت آئی ہے اسلئے ہم اس حدیث اور حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کے فرمان کے پیش نظر عورتوں کو گھر سے نکلنے نہیں دیں گے۔

ابن عمرؓ کی ناراضگی کی وجہ: لیکن چونکہ بظاہر انہوں نے اپنا کلام اس طرح ذکر کیا جیسے حدیث کا انکار یا اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو ابن عمرؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس بے ادبی کی وجہ سے ان پر ناراض ہوگئے۔(صلوۃ اللہ علی نبیہ وسلامہ ما غرد[1] طائر الایك و حمامہ) انکے قول "فعل اللہ بك" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ایسا ایسا کرے یا تمہیں ایسا بدلہ دے جس کے تم مستحق ہو۔

باب ماجاء فی کراھیة البزاق فی المسجد

باب مسجد میں تھوکنے کی کراہت کے بیان میں

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا یحیی بن سعیدٍ عن سفیان عن منصورٍ عن ربعی بن حراش عن طارق بن عبد اللّٰہ المحاربی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اذا کنت فی الصلاۃِ فلا تبزق عن یمینك، ولکن خلفك، او تلقاء شمالك، او تحت قدمك الیسری۔قال: وفی الباب عن ابی سعیدٍ، وابن عمرَ، وانسٍ، وابی ھریرۃَ۔ قال ابو عیسی: وحدیث طارق حدیث حسن صحیحٌ۔والعملُ علی ھذا عند اھل العلم۔قال: وسمعتُ الجارودَ یقول:سمعتُ وکیعاً یقول: لم یکذب ربعی بن حراش فی الاسلام کذبةً۔ قال: وقال عبد الرحمٰن بن مھدی: اثبت اھل الکوفة منصور بن المعتمر۔

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو عوانة عن قتادۃ عن انس بن مالك قال: قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: البزاق فی المسجدِ خطیئة، وکفار تھا دفنھا۔قال ابو عیسی: وھذا حدیث حسن صحیحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت طارق بن عبداللہ محاربی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز میں

---

[1] غرد الطائر یہ فعل فرح کے وزن پر ہے اور غرد تغریداً غرد تغرد سب کے معنی یہ ہیں کہ اپنی آواز کو بلند کرنا اور خوش ہونا۔ الایك اس درخت کو کہتے ہیں جو خوب گھنا ہو یا اس گہری زمین کو کہتے ہیں جو بیری اور پیلو وغیرہ اگاتی ہے، اسی طرح بہت سے درختوں کے مجموعے کو بھی الایک کہتے ہیں (اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور سلامتی ہوں اسکے نبی پر جب تک کے گھنے درختوں کے پرندے اور کبوتر چہچہاتے رہیں)۔

ہو تو اپنے دائیں طرف نہ تھوکو بلکہ اپنے پیچھے یا بائیں طرف یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوک دو۔ اس باب میں ابوسعید، ابن عمر، انس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں طارق کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے۔ (امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) اور میں نے جارود سے وکیع کے حوالے سے سنا کہ ربعی بن حراش نے اسلام میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ منصور بن معتمر اہل کوفہ میں اثبت ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کرنا ہے (یعنی تھوک کو دبا دینا) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

مسجد میں تھوکنے کی ممانعت کی علت؟: مسجد میں تھوکنے کی ممانعت کی علت یا تو تعظیمِ مسجد ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ چونکہ لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں لہٰذا نمازیوں کو اس تھوک سے تکلیف ہوگی اور دونوں علتیں بھی ہوسکتی ہیں رہا حدیث شریف میں داہنی طرف تھوک کی ناپسندیدگی تو اس کی وجہ فرشتے کی تعظیم ہے نیز دائیں طرف والا حصہ شرافت اور اعزاز رکھتا ہے اور قبلہ کی جانب تھوکنے کی ممانعت کیوجہ یہ ہے کہ ایک تو قبلہ قابلِ تعظیم ہے دوسری بات یہ ہیکہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتا ہے بائیں جانب بھی اگرچہ فرشتہ موجود ہے لیکن اس آدمی کیلئے اس طرف تھوکنے کی اجازت ہے کہ وہ یہ نیت کریگا کہ اس جانب شیطان ہے میں تو اس شیطان کی جہت ہونے کی حیثیت سے اس جہت میں تھوک رہا ہوں فرشتے کی نیت نہ کرے اس حدیث باب میں مسجد اور غیر مسجد میں مطلقا تھوکنے کی ممانعت ہے لہٰذا اس حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت ظاہر ہے[1]۔

(قولہ ولکن خلفك) رکوع، سجدہ اور قیام میں اپنے پیچھے تھوک سکتا ہے جبکہ اس کا قبلہ سینہ سے نہ پھرے، یا اسکا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تھوک اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے اپنے پیچھے پھینک دے۔

باب ماجاء فی السجدة فی اقرا باسم ربک الذی خلق و اذا السماء انشقت

باب سورۃ انشقاق اور سورۃ العلق کے سجدے

☆حدثنا قتیبة بن سعید حدثنا سفیانُ بن عیینة عن ایوب بن موسی عن عطاء بن میناء عن ابی

---

[1] یا اس حدیث کی مناسبت ترجمۃ الباب سے اسطرح ہے کہ عموماً پکا نمازی مسجد ہی میں فرائض پڑھتا ہے جو کہ کامل نماز ہے لہٰذا حدیث میں اس نماز کا بیان ہے جو مسجد میں پڑھی جارہی ہے (گویا اس حدیث میں خاصکر مسجد میں تھوکنے کی ممانعت ہے۔ از مترجم)۔

هريرة قال: سجدنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فى اقرا باسم ربك واذاالسماء انشقت۔

☆حدثناقتيبة حَدَّثَنَا سفيان بن عيينه عن يحيى بن سعيد عن ابى بكر بن محمد هو ابن عمرو بن حزم عن عمر بن عبد العزيز عن ابى بكر بن عبد الرحمٰن بن الحرث بن هشام عن ابى هريرة عن النبى صلى الله عليه وسلم: مثلَه۔ قال ابو عيسى: حديث ابى هريرةَ حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ على هذا عندا كثر اهل العلم: يَرَوْنَ السجودَ فى اذا السماء انشقت واقرا باسم ربك۔وفى هذا الحديث اربعة من التابعين بعضُهم بعض ۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ "اقرا باسم ربك الذى خلق" اور "اذا السماء انشقت" میں سجدہ کیا۔ہم سے بیان کیا قتیبہ نے انہوں نے سفیان سے انہوں نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے انہوں نے عمرو بن عبدالعزیز سے انہوں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام سے انہوں نے ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل۔اس حدیث میں چار تابعی ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے کہ "اذا السماء انشقت" اور "اقرا باسم ربك الذى خلق" دونوں سورتوں میں سجدہ ہے۔

باب ماجاء فى السجدة فى النجم

باب سورہ نجم کا سجدہ کرنے کا بیان

☆حدثنا هرون بن عبد الله البزار البغدادى حَدَّثَنَا عبد الصمد بن عبد الوارث حَدَّثَنَا ابى عن ايوب عن عكرمة عن ابن عباسٍ قال: سجد رسول الله ﷺ فيها ، يعنى النجم، والمسلمون والمشركون والجن والانس۔قال: وفى الباب عن ابن مسعودٍ، وابى هريرةَ۔ قال ابو عيسى: حديث ابن عباسٍ حديث حسن صحيحٌ۔ والعملُ على هذا عند بعض اهل العلم: يَرَوْنَ السجودَ فى سورة النجم۔ وقال بعضُ اهل العلم من اصحاب النبى ﷺ وغيرهم: ليس فى المفصل سجدة۔وهو قولُ مالك بن انسٍ۔ والقول الاول اصحُّ۔ وبه يقولُ الثورى، وابن المبارك، والشافعى، واحمدُ، واسحٰق۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم میں سجدہ کیا تو مسلمانوں،

مشرکوں، جنوں اور انسانوں سب نے سجدہ کیا۔ اس باب میں ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے کہ سورۃ نجم میں سجدہ کیا جائے جبکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ مفصلات میں کوئی سجدہ نہیں یہ مالک بن انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور وہ سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحٰق کا بھی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

ابن عباسؓ کو جنات کے سجدہ کرنے کا علم کیسے ہوا؟: (وسجد معه المسلمون والمشركون والجن والانس)
ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جنوں کے سجدہ کرنے کا علم اس طرح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسی طرح بتلایا تھا کہ جنوں نے بھی ابھی سجدہ کیا ہے۔

مشرکین کا ان آیات کو سن کر سجدہ کرنا اسکی پہلی توجیہ: رہا مشرکین کا سجدہ کرنا تو بعض علماء نے اسکی یہ علت بتلائی ہے کہ شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ایسے کلمات جاری کر دیئے جسکے سننے سے مشرکین خوش ہو گئے لہٰذا مشرکین اس آیت کو سنتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدے میں چلے گئے اور انہیں یہ لالچ تھی کہ آپ دوبارہ اس آیت کو پڑھیں وہ کلمات یہ ہیں "تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى" لیکن یہ توجیہ بالکل غلط اور ناقابلِ اعتماد[1] ہے اگرچہ یہ توجیہ بڑے علماء کرام سے منقول ہے لیکن یہ قرآنی نص کے صراحۃً خلاف ہے۔

دوسری توجیہ: بعض علماء نے دوسری توجیہ یہ کی ہے کہ (یہ توجیہ پہلے کے مقابلہ میں ذرا معمولی ہے) شیطان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آیا اور اس نے یہ کلمات پڑھے جسے تمام مشرکین اور مسلمانوں نے سنا مشرکین خوش ہو گئے اور مسلمان غمگین ہو گئے[2] لیکن یہ توجیہ بھی صحیح نہیں۔

تیسری توجیہ: بعض علماء نے تیسری توجیہ یہ کی ہے کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ شیطان نے ان کلمات کو اپنے بعض چیلوں کے کانوں میں کہہ دیا ہو تو اس سے یہ واقعہ رونما ہوا۔ تو یہ توجیہ کوئی بعید نہیں۔

---

۱ حافظ نے فتح الباری میں اس قصہ کو تفصیل سے نقل کیا ہے اور حضرت سہارنپوری نے بذل میں مختصراً اسکا خلاصہ نقل کیا ہے اور مختلف توجیہات کے نقل کرنے کے بعد اس قول کو ترجیح دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کو ترتیل سے پڑھ رہے تھے تو شیطان آپ کے سکتات میں سے کسی سکتہ کا انتظار کرنے لگا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں ان کلمات کو اسطرح پڑھ دیا کہ آپ کے قریب ہی سامعین یہ سمجھے کہ یہ آپ ہی فرما رہے ہیں اسلئے انہوں نے اسکو پھیلا دیا (از مترجم: حافظ نے فتح الباری کتاب الحج کی تفسیر میں اس احتمال کو احسن الوجوہ فرمایا ہے)۔ بیضاوی نے اس احتمال کو بھی رد کیا ہے۔

۲ الشجن شین اور جیم دونوں کے زبر کے ساتھ ہے بمعنی غم وحزن۔

صحیح توجیہ: لیکن صحیح توجیہ[1] مشرکین کے سجدہ کرنے کی یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی قرأت کی تو اللہ تعالیٰ کا جلال و کبریاء تمام دنیا کے کناروں اور گوشوں پر چھا گیا۔ یہاں تک کہ پورے عالم میں کوئی بھی مسلمان ہو یا مشرک ہر ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدہ کرنے کے بعد سجدہ میں چلا گیا اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے۔

صاحب جلالین پر رد: قرآن کریم کی آیت "وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطٰن فی امنیته" اس آیت کے وہ معنی نہیں جو معنی تفسیر جلالین[2] میں بیان کیئے گئے ہیں صاحب جلالین نے اس روایت سے یہ تفسیر بیان کی ہے کہ جس روایت کا باطل ہونا ہم ظاہر کر چکے بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نبی بھی جب اللہ کے فرمان کی[3] تلاوت کرتا ہے تو شیطان ان کی تلاوت کے دوران اپنی طرف سے کچھ کلمات ملا کر ان الفاظ کو نبی و رسول کی طرف منسوب کرتا ہے اور ان الفاظ کو اسکی قرأت میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو القی الشیطان کی یہی تفسیر ہے نہ کہ مفسرین نے جو لکھا ہے وہ تفسیر غلط ہے۔

بیضاوی کی تفسیر: بیضاوی میں[4] اس آیت کی وہ تفسیر بیان کی گئی ہے جو ہماری اور تفسیرِ جلالین دونوں کی تفسیر کے علاوہ

---

۱ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے کہ اس حدیث کی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس وقت حق اتنا ظاہر ہو گیا تھا کہ کسی کو بھی عاجزی اور سپردگی کے سوا چارہ نہ تھا مگر جب وہ دوبارہ اپنی طبیعتوں کی طرف لوٹے تو کفار نے کفر کیا اور مسلمان ہونے والے مسلمان ہوئے، ہاں قریش کے ایک بوڑھے شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس جلال کو قبول نہیں کیا کیونکہ اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی مہر بہت سخت تھی البتہ اس نے مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی کے ساتھ لگالی، تو اللہ تعالیٰ نے بدر ہی میں ہلاک فرما کر اسکو عذاب پہنچا دیا۔

۲ جلالین میں ہے کہ "الا اذا تمنی" یعنی جب نبی تلاوت کرتا ہے تو شیطان اسکی تلاوت کے دوران ایسے الفاظ داخل کرتا ہے جو قرآن کے الفاظ نہیں ہوتے لیکن ان الفاظ سے وہ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ جنکی طرف نبی کو بھیجا گیا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ایک مجلس میں سورۃ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے "افرایتم اللات والعزی ومناۃ الثالثة الاخری" تلاوت فرمانے کے بعد شیطان نے آپ کی زبان مبارک پر آپ کے علم کے بغیر "تلك الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی" یہ الفاظ جاری کیئے تو مشرکین ان الفاظ کو سن کو خوش ہو گئے پھر جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ شیطان نے آپکی زبان پر ایسے ایسے الفاظ جاری کیئے تو اسپر آپ غمگین ہوئے تو اس آیت سے آپ کو تسلی دی گئی تا کہ آپ مطمئن ہو جائیں۔ صاحب جمل نے اس پر تفصیلی کلام نقل کیا ہے جسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳ یہ بات گزر چکی ہے کہ حافظ اور دیگر محققین نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے لیکن بیضاوی نے اس معنی کو رد کیا ہے۔

۴ چنانچہ بیضاوی فرماتے ہیں کہ الا اذا تمنی اسکا مطلب یہ ہے کہ نبی جب اپنے دل میں اپنی محبوب شئے کو بٹھالیتا ہے القی الشیطٰن فی امنیته تو شیطان انکی خواہشات میں ایسی چیز ملا دیتا ہے جس سے وہ دنیا میں مشغول ہو جاتے ہیں جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے بے شک میرے دل پر حجاب اور اللہ تعالیٰ سے دوری پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا میں دن میں اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ استغفار طلب کرتا ہوں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے لیکن بیضاوی کی یہ تفسیر کچھ بعید معلوم ہوتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن یعنی اللہ تعالیٰ شیطان کے اس وسوسہ کو ختم کر دیتا ہے اور نبی کی اس طرف متوجہ ہونے سے حفاظت فرماتا ہے اور ایسی چیز کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس وسوسہ کو زائل کر دے۔

اضافہ از مترجم نقل کلامِ حافظ: حافظ نے فتح الباری کتاب التفسیر سورۃ الحج کے تحت لکھا ہے کہ یہ واقعہ کہ شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر تلک الغرانیق العلی جاری کروا دیا تھا اس واقعہ کو کثرت طرق کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کی کچھ نہ کچھ اصل موجود ہے نیز دو مرسل سندیں جن کے رجال علی شرط الصحیحین ہیں ان سے بھی اس واقعہ کی صحت اور اس کے کچھ نہ کچھ اصل ہونے کا علم ہوتا ہے جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اس کی تاویل کی جائیگی کیونکہ اس واقعہ کو اسکے ظاہر پر رکھنا صحیح نہیں ہے بعض علماء نے یہ تاویل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس وقت اونگھ طاری ہوئی تو آپ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے، بعض نے یہ توجیہ کی ایک کہ کفار کی توبیخ کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کہے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ الغرانیق العلی سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ کفار فرشتوں کو بنات اللہ کہتے اور انکی عبادت کرتے تھے تو اللہ نے الکم الذکر ولہ الانثی کہہ کر ان پر رد فرمایا لیکن مشرکین نے ان آیات کو سن کر یہ کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معبودوں کی تعریف کی ہے تو اس پر اللہ نے ان دونوں آیتوں کو منسوخ فرمایا۔ ایک توجیہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو ترتیل سے پڑھتے تھے تو شیطان نے آپ کے سکتات میں سے ایک سکتہ میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے مشابہ آواز نکال کر تلک الغرانیق العلی پڑھ دیا۔ وھذا احسن الوجوہ۔ (ثم یحکم اللہ آیاتہ) یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ان آیات کو برقرار رکھتے ہیں جو آخرت کے امور میں استغراق کی طرف داعی ہوتی ہیں بعض علماء کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ آیا کہ فقر و فاقہ زائل ہونا چاہیئے تو اس پر یہ آیت اتری اور بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قوم کے ایمان لانے کی بہت زیادہ طمع و حرص تھی لہٰذا آپ چاہتے تھے کہ ایسی آیات نازل ہوں جو میری قوم کو اسلام کے قریب کر دے پھر بیضاوی نے غرانیق کا قصہ نقل کر کے اس پر رد کیا ہے۔

نقلِ کلامِ بیضاوی از مترجم: اس سب تفصیل کے بعد امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے آپ پر سورۃ نجم نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کی تلاوت فرمائی جب ومناۃ الثالثۃ الاخری پر پہنچے تو شیطان کے وسوسے کے سبب آپ کی زبان پر سہواً یہ جملہ جاری ہوگیا تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی اس پر مشرکین نے خوشی منائی اور اس سورت کے آخر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ فرمایا تو مسلمانوں کیساتھ تمام مشرکین نے بھی سجدہ کیا پھر جبرئیل امین نے آپ کو تنبیہ فرمائی اس پر آپ غمزدہ ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی یہ واقعہ محققین کے ہاں ناقابلِ قبول ہے اس کے بعد امام بیضاوی نے اس واقعہ کو صحیح ماننے کی صورت میں اس کی توجیہ ذکر کی ہے۔

باب ماجاء من لم يسجد فيه

باب سورۃ نجم میں سجدہ نہ کرنے کا بیان

☆حدثنا يحيى بن موسى حَدَّثَنَا وكيع عن ابن ابى ذئب عن يزيد بن عبد الله بن قسيط عن عطاء بن يسار عن زيد بن ثابت قال: قرات على رسولِ الله صلى الله عليه وسلم النجم فلم يسجد فيها۔ قَال ابو عيسى: حديث زيد بن ثابتٍ حديث حسن صحيحٌ۔ وتاول بعض اهل العلم هذا الحديث فقال: انما ترك النبى صلى الله عليه وسلم السجود لان زيد بن ثابتٍ حينَ قرا فلم يسجد لم يسجد النبيُّ صلى الله عليه وسلم۔ وقالوا السجدة واجبة على من سمعها، فلم يرخصوا فى تركها۔ وقالوا: ان سمع الرجلُ وهو على غير وضوءٍ فِاذا توضا سجد۔وهو قولُ سفيان الثورى واهل الكوفة۔وبه يقولُ اسحٰق وقال بعضُ اهل العلم: انما السجدةُ على مَن اراد ان يسجد فيها والتمس فضلها، ورخصوا فى تركها، ان اراد ذلك۔واحتجوا بالحديث المرفوع، حديث زيد بن ثابت، حيث قال: قراتُ على النبى صلى الله عليه وسلم النجم فلم يسجد فيها۔ فقالوا: لو كانت السجدة واجبة لم يترك النبى صلى الله عليه وسلم زيداً حتى كان يسجد ويسجد النبى صلى الله عليه وسلم۔ واحتجوا بحديث عمر: انه قرا سجدة على المنبر، فنزل فسجدَ، ثم قراها فى الجمعة الثانية، فَتَهَيَّأ النَّاسُ للسجود، فقال: انها لم تكتب علينا الا ان نشاء، فلم يسجد ولم يسجدوا۔فذَهَبَ بعضُ اهل العلم الى هذا۔ وهو قولُ الشافعىِّ، واحمدَ۔

﴿ترجمہ﴾

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۃ نجم پڑھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ نہیں کیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زید بن ثابت کی حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض اہل علم اس حدیث کے متعلق یہ تشریح فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلیئے سجدہ نہیں کیا کہ زید نے جب پڑھا تو انہوں نے بھی سجدہ نہیں کیا اسلیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ نہیں کیا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ جو شخص سجدہ کی آیت سنے اس پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر آدمی نے اس حالت میں سنا کہ وضو سے نہیں تھا تو جب وضو کرے اس وقت سجدہ کرے۔ سفیان ثوری، اہل کوفہ اور اسحٰق کا یہی قول ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ سجدہ اس کیلئے ہے جو کرنا چاہے اور ثواب وفضیلت کی خواہش رکھتا ہو لہٰذا اس کے ترک کرنے میں بھی رخصت ہے ان کی دلیل

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۃ نجم پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ نہیں کیا پس اگر سجدہ واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زید کو اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ اور آنحضرت خود سجدہ نہ کر لیتے ان کی دوسری دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے منبر پر سجدے کی آیت پڑھی اور اتر کر سجدہ کیا پھر دوسرے جمعہ کو دوبارہ وہی آیت پڑھی تو لوگ سجدے کیلئے مستعد ہو گئے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ سجدہ ہم پر فرض نہیں ہے اگر ہم چاہیں تو سجدہ کریں چنانچہ نہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ کیا اور نہ ہی لوگوں نے سجدہ کیا۔ اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ واجب نہیں اور امام شافعی اور احمد کا یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

مذاہب مختلفہ کا بیان: (قرأت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم النجم فلم یسجد فیھا) اس حدیث سے بہت سے مذاہب اور ائمہ کے مسالک پیدا ہو گئے: ۱۔ بعض علماء[۱] کے نزدیک اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن کا ہر سجدہ کرنا ضروری نہیں بلکہ اختیار ہے اسی لئے تو اس حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ نہیں فرمایا، ۲۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صرف سورۃ نجم کا سجدہ[۲] اختیاری ہے باقی سجدے وجوبی ہیں، ۳۔ اور بعض علماء[۳] کہتے ہیں کہ قرآن میں جتنے بھی سجدے ہیں تو وہ مقتدیوں اور سننے والوں پر اس وقت واجب ہونگے جب کہ امام اور تلاوت کرنے والے پر بھی سجدہ واجب ہوا ہو، اور اگر امام پر اور تلاوت کرنے والے پر سجدہ واجب نہیں تو مقتدیوں پر بھی واجب نہ ہوگا کیونکہ حدیث باب میں زید بن ثابتؓ نابالغ تھے[۴] جب ان پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی واجب نہ ہوا، اسلئے آپ نے سجدہ نہیں کیا، ۴۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ سجدہ فوری کرنا ضروری

---

۱ ائمہ ثلاثہ کا یہی مسلک ہے۔

۲ ابھی تک مجھے یہ نہیں ملا کہ کسی امام کے نزدیک سورۃ نجم کا سجدہ اختیاری ہے ہاں میں نے اوجز میں جو بارہ مذاہب ذکر کئے ہیں انمیں سے پانچواں مذہب ابوثور کا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں چودہ سجدے ہیں انمیں نجم کا سجدہ نہیں ہے علامہ عینیؒ نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ انکے نزدیک سورۃ نجم کا سجدہ مشروع نہیں ہے۔

۳ اس قول کو امام ترمذیؒ نے بعض اہل علم سے حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے ذکر کیا ہے اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے نخعی کہتے ہیں کہ اگر تلاوت کرنے والا سجدہ نہ کرے تو سامعین بھی سجدہ نہ کریں کذا فی الاوجز۔ حنابلہ کا بھی یہی مذہب ہے کما فی نیل المارب

۴ یعنی زید بن ثابتؓ چھوٹے بچے تھے اسلئے ان پر سجدہ واجب نہیں تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو انکی عمر گیارہ سال تھی جیسا کہ حافظ کی تہذیب التہذیب میں ہے۔

۱ نہیں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے سجدہ نہیں کیا کہ فوراً سجدہ کرنا ضروری نہیں، نیز شاید آپکا وضو نہ ہو حنفیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ ۲ نے جن احادیث سے سجدہ کے واجب نہ ہونے پر استدلال کیا ہے انکا بھی یہی جواب ہے۔

مصنف کا استدلال اور اسکے جوابات: (واحتجوا بحدیث عمر) چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سورۃ نجم میں آیت سجدہ تلاوت کرنے کے بعد سجدہ نہ کرنے سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید یہ حکم (عدمِ سجود کا) سورۃ نجم کے سجدہ کے ساتھ خاص ہو جبکہ ان حضرات کا مقصود یہ تھا کہ تمام سجدوں میں عدمِ وجوب کو ثابت کیا جائے لہٰذا مصنف نے اپنے اس دعویٰ پر یہ دلیل پیش کی "بحدیث عمر انه قرأ سجدة علی المنبر" تو یہاں پر لفظ سجدہ نکرہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً سجدہ تلاوت واجب نہیں صرف اختیاری ہے۔ جواب نمبر ۱: اس عام حکم کا ثبوت لامحالہ کسی خاص سجدے کے ضمن میں ہوگا اسلئے مصنف کا جو مقصود ہے کہ تمام سجدے اختیاری ہیں لازمی نہیں ہیں یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا بلکہ حضرت عمرؓ نے جو خاص آیت سجدہ تلاوت فرما کر سجدہ نہیں کیا تھا صرف اس سجدہ کا اختیاری ہونا معلوم ہوتا ہے نہ کہ قرآن کریم کے تمام سجدوں کا عدم وجوب معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اگر حضرت عمرؓ کوئی ایسی بات ارشاد فرماتے جس سے معلوم ہوتا کہ تمام سجدے اختیاری ہیں وجوبی نہیں تو استدلال تام ہوسکتا تھا۔ حدیث باب میں "ثم قرأها فی الجمعة الثانية" کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے جمعہ میں بھی بظاہر وہی آیت تلاوت کی تھی جسکی تلاوت پہلے جمعہ میں کر چکے تھے لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ضمیر اس سجدہ تلاوت کی طرف راجح ہو جسکی تلاوت دوسرے جمعہ میں کی گئی ہے تو اس صورت میں دوسرے جمعہ میں پڑھی جانے والی آیت سجدہ پہلے جمعہ میں تلاوت کیجانے والی آیت کا غیر ہوگی۔

جواب: اسکا جواب یہ ہیکہ اس احتمال میں بھی صرف دوسرے جمعہ میں تلاوت کیجانی والی آیت سجدہ میں سجدہ کرنا اختیاری ثابت ہوگا نہ کہ پہلے جمعہ میں تلاوت کی گئی آیت سجدہ میں اور مخالفین کا مقصود حاصل نہیں ہوگا۔

---

۱ حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ سجدہ واجب ہے لیکن فوراً کرنا ضروری نہیں۔

۲ یعنی حنفیہ کے علاوہ دوسرے علماء نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں کیونکہ ان احادیث میں سجدہ کا ذکر نہیں تو اس کا بھی حنفیہ یہ جواب دیتے ہیں کہ سجدہ نہ کرنا شاید بے وضو ہونے کی وجہ سے ہو تو ان احادیث میں سجدہ علی الفور کی نفی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ حضرت گنگوہیؒ نے حدیث باب میں بہت سے مذاہب ذکر کئے ہیں امام ترمذیؒ نے جن مذاہب کو ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں کل تین مذاہب ہیں: ۱۔ انہوں نے بعض اہل علم کی تاویل ذکر کی ہے، ۲۔ انہوں نے بعض اہل علم کا مذہب ذکر کیا ہے کہ السجدة واجبة الخ یہ کلام مستانف ہے۔ حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ سجدہ سننے والے پر واجب ہو جاتا ہے اگر چہ سننے والا بے وضو ہو لہٰذا وضو کر کے سجدہ کرے، ۳۔ امام ترمذیؒ نے وقال بعض اهل العلم الخ سے بعض اہل علم کا ذکر کیا ہے اور باب کے آخر تک اس قول کی دلیل پیش کی ہے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: جو علماء قرآن کے سجدوں کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے وہ علماء جو عدم وجوب کے قائل ہیں تو ان دونوں کے درمیان میں کوئی تیسرا مذہب نہیں کیونکہ جو علماء سجدہ تلاوت کو واجب کہتے ہیں انکے نزدیک تمام کے تمام سجدے واجب ہیں اور جو علماء عدم وجوب کے قائل ہیں تو انکے نزدیک کوئی بھی سجدہ واجب نہیں ہے، تو اس طرح ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا مذہب نہیں ہے، لہٰذا جب کسی ایک سجدہ کا اختیاری ہونا اور اسکا واجب نہ ہونا ثابت ہو جائے تو بقیہ تمام سجدوں کے اختیاری ہونے کا حکم خود بخود ثابت ہو جائیگا۔

جواب: تمام سجدہ تلاوت واجب نہیں ہیں یا تمام کے تمام سجدۂ تلاوت واجب ہیں یہ اجماعی مسئلہ نہیں بلکہ جیسا کہ گذشتہ باب[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو مذہبوں کے علاوہ کوئی تیسرا مذہب بھی موجود ہے۔ اصل اعتراض کا صحیح جواب یہ ہیکہ حضرت عمرؓ کے فعل کا جواب معترض کے اس اعتراض کے پیش نظر صحیح نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ "لم تکتب علینا الا ان نشاء" کا مطلب یہ ہے کہ فوراً سجدہ ادا کرنا ضروری نہیں ہے اسیطرح حدیث میں "فلم یسجد ولم یسجدوا" کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اسی مجلس میں سجدہ نہیں کیا۔

باب ماجاء فی السجدة فی صٓ

سورۃ ص کے سجدے کا بیان

☆حدثنا ابن ابی عمر حَدَّثَنَا سفیانُ عن ایوبَ عن عکرمةَ عن ابن عباسٍ قال: رایتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یسجدُ فی صٓ۔ قال ابن عباسٍ: ولیست من عزائم السجود۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ۔ واختلف اهل العلم فی ذٰلك: فرای بعض اهل العلم من اصحابِ النبیِّ صلی اللّٰه علیه وسلم وغیرهم ان یَسْجُدَ فیها۔ وهو قولُ سفیانَ الثوری وابن المبارکِ، والشافعیِّ، واحمدَ، واسحٰق۔ وقال بعضُهم، انها تَوْبَةُ نبی، ولم یروا السجود فیها۔

---

[1] یعنی جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ بعض علماء نجم کے سجدے کے قائل نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ بعض سجدہ تلاوت واجب ہیں اور بعض واجب نہیں۔

ائمہ اربعہ کے مذاہب: اوجز میں اس بارے میں بارہ مذاہب ذکر ہیں، ائمہ اربعہ بھی آپس میں اختلاف رکھتے ہیں امام مالکؒ سے مشہور اور ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ انکے نزدیک گیارہ سجدے ہیں مفصلات کے سجدے کے وہ قائل نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ کا قول قدیم یہی ہے امام شافعیؒ کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ قرآن میں کل ۱۴ سجدے ہیں۔ انمیں ص کا سجدہ نہیں ہے اور یہی امام احمد کی ایک روایت ہے، امام احمدؒ کا مشہور مذہب شروح میں یہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں کل ۱۵ سجدے ہیں، حج کا دوسرا سجدہ اور ص کا دوسرا سجدہ دونوں ہی کے وہ قائل ہیں، مسئلہ کی تفصیل اوجز میں ہے۔ عزائم السجود کے متعلق سلف صالحین کا اختلاف آرہا ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ صٓ میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہ لازمی سجدوں میں سے نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس میں علماء صحابہ وغیرہ کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اس میں سجدہ کرے۔ سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحٰق کا یہی قول ہے لیکن بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ یہ نبی علیہ السلام کی توبہ ہے لہٰذا یہاں سجدہ واجب نہیں۔

﴿تشریح﴾

اس جملہ کی تشریح: (قولہ ولیست من عزائم السجود) یعنی ص کا سجدہ موکد سجدوں میں سے نہیں ہے یہ حدیث ص کے سجدہ کو واجب ہونے سے نہیں[1] نکالتی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آیت یا حدیث میں اس پر سجدہ کرنے کا حکم نہیں ہوا۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا داؤد علیہ السلام کے سجدے کی وجہ سے یہ سجدہ پھر بھی واجب رہا اور اگر ہم تسلیم کریں کہ یہ حدیث باب وجوب سجدہ کے منافی ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں، ابن عباسؓ کا اپنا قول ہے۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: ایسے احکام میں حدیث موقوف مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلانے ہی سے تو انکا علم ہوسکتا ہے؟ جواب: شاید ابن عباسؓ نے اس سجدے کے واجب نہ ہونے پر ان الفاظ سے استدلال کیا جو شاید دوسرے معنی پر دلالت کرتے ہوں، اور انہوں نے اپنی سمجھ کے اعتبار سے حدیث کے ایسے معنی سمجھے جس سے عدمِ وجوب معلوم ہوا، شاید کہ انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے[2] صٓ کی تلاوت فرمائی اور فوراً سجدہ نہیں کیا تو وہ یہ سمجھے کہ ص کا سجدہ مشروع نہیں پھر دوسری مرتبہ دیکھا کہ ص کی آیت تلاوت فرمانے کے بعد فوراً سجدہ کیا ہے تو ابن عباسؓ نے یہ سمجھا کہ ص کا سجدہ

---

[1] **عزائم السجود کی تعیین میں اقوالِ ثلثہ:** سلفِ صالحین کا اس میں اختلاف ہے کہ عزائم السجود کون کون سے ہیں ایک قول یہ ہے کہ عزائم السجود پانچ ہیں، اعراف، بنواسرائیل، نجم، انشقاق، اقرأ، ان پانچ سورتوں کے سجدے عزائم السجود ہیں۔ یہ ابن مسعودؓ کا قول ہے۔ دوسرے قول میں عزائم السجود چار ہیں، الم تنزیل، حم تنزیل، نجم، اقرأ، یہ حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ تیسرے قول میں عزائم السجود تین ہیں اسکے علاوہ اور بھی اقوال ہیں بہرحال انکی تفصیل اوجز میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ص لیس من عزائم السجود سے حنفیہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا جو اس سجدے کو واجب کہتے ہیں۔

[2] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نسائی نے ان سے یہ جو روایت نقل کی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ص میں سجدہ کیا اور فرمایا کہ داؤدؑ نے یہ سجدہ بطور توبہ کے کیا تھا اور ہم بطور شکرانے کے کرتے ہیں تو ابن عباسؓ نے اس سے یہ سمجھا کہ اس سجدۂ ص کا سجدہ شکر ہونا اسکے عزائم السجود ہونے کے منافی ہے کیونکہ جو بھی سجدہ شکر ہوتا ہے وہ ضروری نہیں ہوتا۔ فتامل۔ اوجز میں سجدۃ فی ص کے وجوب کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔

مشروع تو ہے لیکن عزائم السجود میں سے نہیں بلکہ اختیاری ہے چاہے اس سجدہ کو کرے یا نہ کرے۔ یہی توجیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر میں ہوسکتی ہے جسکی ہم پہلے ہی دو توجیہات بیان کر چکے ہیں۔

(قولہ قال بعضهم انها توبة النبی) نبی کی توبہ ہونا اس کے سجدہ ہونے کے منافی نہیں کیونکہ جتنے بھی سجدہ تلاوت ہیں وہ اسطرح ثابت ہوئے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی مختلف جگہوں پر سجدہ فرمایا ہے تو اس سے سجدہ مشروع ہوگیا یہاں پر بھی جب داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے سجدہ شکر کیا لہٰذا ہم بھی اس سجدے کو کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده"

حج کے سجدۂ ثانیہ کی تحقیق اور مشہور مذہب احناف پر رد: حنفیہ کا یہ کہنا[1] کہ حج کا دوسرا سجدہ واجب نہیں تو اس قول کو طبیعت قبول نہیں کرتی کیونکہ صحابی کے سوال پر کہ کیا سورۃ حج کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں؟ تو اسپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ہاں اور جو یہ دونوں سجدے نہ کرے انکی تلاوت بھی نہ کرے تو یہ حدیث صراحۃً حنفیہ کے خلاف ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ مصنف نے اس کا اقرار کیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ چونکہ حدیث تین طرق سے مروی ہے لہٰذا اس کا ضعف ختم ہو جاتا ہے، اور اس پر محدثین کا اجماع ہے کہ حدیث ضعیف مختلف طرق کی بناء پر حدیث حسن[2] کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ شاید کہ حنفیہ نے بنا بر احتیاط یہ قول کیا ہوتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نماز کے درمیان انسان کا سجدہ تلاوت کرنا لازم آئے حالانکہ واقع پر وہاں سجدہ نہ ہو۔

باب ماجاء فی السجدة فی الحج

باب سورۃ حج کا سجدہ

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا ابن لهيعة عن مشرح بن هاعان عن عقبة بن عامر قال: قلتُ: يارسولَ اللّٰه، فُضلت سورة الحج بان فيها سجدتين؟ قال: نَعَمْ، ومَنْ لم يسجد هما فلا يقرأهما۔ قال ابو عيسى: هذا حديث ليس اسناده بذاك القويّ۔ واختلف اهل العلم فى هذا: فرُوِىَ عن عمرَ بن الخطاب

---

[1] یعنی احناف کا یہ کہنا کہ حج میں صرف پہلا سجدہ مشروع ہے دوسرا سجدہ مشروع ہی نہیں۔

[2] **حنفیہ کے دلائل: قلت:** لیکن سجدے کو واجب کہنے کا معاملہ بڑا اہم ہے لہٰذا اس سجدے کو اس طرح واجب نہیں کہا جاسکتا چنانچہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ حج کے دوسرے سجدے کو ہم نماز میں مشروع نہیں کہتے لیکن اگر کوئی نماز میں کرے تو نماز باطل نہ ہوگی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث اسکے متعلق صحیح سند سے ثابت نہیں اور نہ ہی اس پر اجماع ہے بلکہ ص کے سجدے کے متعلق صرف ایک اثر موجود ہے جو کہ مرسل ہے، ابن عباسؓ اور نخعی فرماتے ہیں کہ حج میں صرف ایک سجدہ ہے برہان میں ہے کہ ہمارا مذہب ابن عباسؓ، ابن عمرؓ سے مروی ہے وہ دونوں فرماتے تھے کہ حج میں پہلا سجدہ سجدۂ تلاوت ہے اور دوسرا سجدہ سجدۂ صلاتیہ ہے۔ انتہی

وابن عمرَانهما قالا: فضلت سورة الحج بان فيها سجدتين۔ وبه يقولُ ابن المبارك، والشافعيُّ، واحمد، واسحٰق۔ ورای بعضهم فيها سجدةً۔ وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ، ومالك، واهل الكوفةَ

﴿ترجمہ﴾

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ سورہ حج کو دوسری سورتوں پر اسی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے کہ کیونکہ اس میں دو سجدے ہیں؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں! جو یہ دو سجدہ نہ کرنا چاہے وہ ان دو آیتوں کی تلاوت نہ کرے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں۔ اس مسئلے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا سورہ حج کو اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ ابن مبارک شافعی، احمد، اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔ بعض کے نزدیک اس میں ایک ہی سجدہ ہے اور یہ سفیان ثوری، مالک اور اہل کوفہ کا قول ہے۔

باب ما يقول فی سجود القرآن

باب قرآن کے سجدوں میں کیا پڑھے؟

☆ حَدَّثَنَا قتيبة حَدَّثَنَا محمد بن يزيد بن خنيس حَدَّثَنَا الحسنُ بن محمد بن عبيد الله بن ابی يزيد قال: قال لی ابن جريج ياحسن، اَخْبَرَنِی عبيد الله بن ابی يزيد عن ابن عباسٍ قال: جاء رجلٌ الی النبیِّ صلی الله عليه وسلم فقال: يارسولَ الله، انی رَاَيْتُنِی اللَّيْلَةَ وانا نائم كانی اصلی خلف شجرة، فَسَجَدْتُ فَسَجَدَتِ الشجرةُ لسجودِی، فسمعتُها وهی تقولُ: اللهمَّ اكتب لی بها عندك اجراً، وضَعْ عنی بها وزراً، واجعلهالی عندك ذخراً، وتقبلها منی كماتقبلتها من عبدك داود۔ قال الحسنُ قال لی ابن جريج قال لی جدك: قال ابن عباس: فَقَرَاَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم سَجْدَةً ثُمَّ سَجَدَ۔ قال فقال ابن عباسٍ: فسمعتُه وهو يقولُ مِثْلَ مااخبره الرجلُ عن قول الشَّجَرَةِ۔قال : وفی الباب عن ابی سعيدٍ۔

قال ابو عيسی: هٰذا حديث حسن غريب من حديث ابن عباس، لانعرفه اِلَّا من هٰذا الوجه۔

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا عبد الوهاب الثقفی حَدَّثَنَا خالد الحذاء عن ابی العالية عن عائشة قالت: كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يقولُ فی سجود القرآن بالليل: سَجَدَ وَجْهِیَ لِلَّذِی خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ۔قال ابو عيسی: هٰذا حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے رات کو سوتے ہوئے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں میں نے سجدہ کیا تو درخت نے بھی سجدہ کیا پھر میں نے اس سے کہتے ہوئے سنا کہا" اللھم اکتب الخ" (اے اللہ! میرے لئے اس سجدہ کا ثواب لکھ دیجئے اور اس کی وجہ سے میرے گناہ کم کر دیجئے اور اسے اپنے پاس میرے لئے ذخیرہ آخرت بنا دیجئے اور اسے مجھ سے قبول فرما جیسا کہ تو نے اپنے بندے داؤد علیہ السلام سے قبول فرمایا)۔ حسن کہتے ہیں کہ ابن جریج نے مجھے بتایا کہ تمہارے دادا نے مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے کہا کہ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے کی آیت پڑھی اور سجدہ کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سجدے میں وہی دعا پڑھ رہے تھے جو اس شخص نے درخت کے متعلق بیان کی تھی۔ اس باب میں حضرت ابوسعید سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے غریب ہے ہم اسے اس سند کے علاوہ نہیں جانتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو قرآن کے سجدوں میں یہ دعا (سجد وجهی للذی خلقه وشق سمعه وبصره بحوله وقوته) پڑھا کرتے تھے۔ یعنی میرے چہرے نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے بنایا اور اپنی قوت وقدرت سے اس میں کان اور آنکھ بنائی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

سجدہ تلاوت میں پڑھی جانے والی مسنون دعا اور احناف کا مذہب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سجدہ تلاوت میں یہ کلمات "اللھم اکتب لی بھا عندك اجرا وضع عنی بھا وزرا الخ" پڑھے تھے لہٰذا سجدہ تلاوت میں ان دعاؤں کا پڑھنا سنت ہے البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سجدہ تلاوت میں سجدہ کی تسبیحات بھی پڑھنا اولیٰ ہے کیونکہ سجدہ کی تسبیحات کتاب اللہ سے ثابت ہیں اور انکا قرآن میں ذکر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ تلاوت میں اس دعا کے پڑھنے میں دوام اس قدر نہیں ہے جیسا کہ تسبیحات سجود پر آپکا دوام تھا۔

(قولہ یقول فی سجود القرآن باللیل) رات کی قید کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی نماز میں یہ دعا سنی تھی اسکا یہ مقصد نہیں کہ دن کی نماز میں اسکا حکم اسکے برعکس ہو بلکہ دن اور رات دونوں میں، نمازوں میں سجدہ تلاوت میں اس دعا کا پڑھنا سنت ہے۔

باب ماذکر فیمن فاته حزبه من اللیل فقضاه بالنهار

باب جسکا رات کا وظیفہ رہ جائے تو وہ اسے دن میں قضا کرلے

☆ حدثنا قتيبة حدثنا ابو صفوان عن يونس بن يزيد عن ابن شهابٍ الزهری : إن السائب بن يزيد وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعودٍ اخبراه عن عبد الرحمٰن بن عبد القاری قال:سمعتُ عمر بن الخطاب يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَنْ نَامَ عن حزبه اوعن شیء منه فقراه مابين صلاة الفجرِ وصلاةِ الظهر كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَاَهٗ مِنَ اللَّيْلِ۔قال ابوعيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ قال: وابو صفوان اسمه عبد الله بن سعيد المكی وروى عنه الحميدی و كبارُ الناس۔

﴿ترجمہ﴾

عبدالرحمٰن بن عبدالقاری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سو گیا اپنے وظیفہ سے (اس نے رات کا وظیفہ نہ پڑھا) یا کچھ اس میں سے باقی رہ گیا ہو تو وہ فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان اسے پڑھ لے۔ وہ اس کیلئے اسی طرح لکھا جائیگا جیسے کہ اس نے رات ہی کو پڑھا ہو۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابوصفوان کا نام عبداللہ بن سعید مکی ہے ان سے حمیدی اور بڑے علماء نے روایت کی ہے۔

﴿تشریح﴾

باب کی غرض آیتِ قرآنی کی تفسیر ہے: اس باب کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت "وهو الذی جعل الليل والنهار خلفة لمن اراد اَن يَّذَّكَّرَ او اراد شكورا" کی تفسیر حدیث باب سے بیان کی جارہی ہے کہ دن اور رات میں سے ہر ایک دوسرے کا نائب ہے لہٰذا دن میں عبادت رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیگی اسی طرح اس کے برعکس حکم ہوگا اور اسکو قضا نہیں کہا جائیگا کیونکہ نوافل کی قضا نہیں ہوتی بلکہ اس طرح نماز پڑھنے سے اس نماز اور عبادت کا ثواب مل جاتا ہے البتہ اس نماز کی تعیین کے اعتبار سے اسے قضا کہا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان اور فضل ہے ورنہ اپنے وقت پر عبادت کی جو فضیلت ہوتی ہے وہ اس وقت کے علاوہ میں نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس شخص کا ارادہ یہی تھا کہ اس نماز کو اسکے متعین وقت میں پڑھے اور پھر پڑھ نہ سکا تو غیر وقت میں پڑھنے پر بھی اسکو اسقدر ثواب ملیگا کہ جس قدر ثواب اسے روزانہ ملتا تھا۔ حدیث باب میں "من فاته حزبه من الليل فقضاه بالنهار" میں ایک صورت کو ذکر کیا گیا ہے کہ رات

کی عبادت کی قضا دن میں ہوسکتی ہے، دوسری صورت کو ذکر نہیں کیا گیا کہ دن کی عبادات کی قضا رات میں کی جاسکتی ہے اسکی وجہ یہ نہیں کہ ان دونوں صورتوں کے حکم میں کوئی فرق ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ کے اکثر اوراد واشغال رات میں مقرر تھے، تو دن کے اوراد کا حکم بطور قیاس کے سمجھا جاسکتا ہے لہٰذا حدیث شریف میں اس صورت کو ذکر کیا گیا ہے جس کی صحابہ کرامؓ کو عموماً ضرورت پیش آتی تھی۔

باب ماجاء من التشديد فى الذى يَرْفَعُ راسه قبلَ الاِمامِ

باب جو شخص رکوع اور سجدے میں امام سے پہلے سر اٹھائے اس کیلئے وعیدِ شدید

☆حدثنا قتيبة حَدَّثَنَا حماد بن زيدٍ عن محمد بن زِيَادٍ وهو ابو الحرث البصرى ثقةٌ عن ابى هريرة قال: قال محمد صلى الله عليه وسلم: اما يخشى الذى يرفع راسه قبلَ الامام ان يحول الله رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ۔ قال قتيبة: قال حمادٌ قال لى محمد بن زِيَادٍ وانما قال: اما يخشى۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيحٌ۔ ومحمد بن زيادٍ هو بَصْرِيٌّ ثِقَةٌ ويكنى ابا الحرثِ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص امام سے پہلے سر اٹھالیتا ہے اسے اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر سے بدل دیں۔ قتیبہ، حماد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ محمد بن زیاد نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے "اما یخشی" کا لفظ کہا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ محمد بن زیاد بصری ثقہ ہیں اور ان کی کنیت ابو حارث ہے۔

﴿تشریح﴾

اس وعیدِ شدید کی علت: (قبلَ الامام) حدیث باب[1] میں اس شخص کی یہ جزا ذکر کی گئی ہے کہ اس کا سر گدھے کے

---

[1] یعنی جو شخص امام کے رکوع، سجدے سے پہلے سر اٹھائے تو حدیث میں اس کیلئے سخت وعید ہے، حافظ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف کے ظاہر کا تقاضہ یہ ہے کہ امام سے پہلے سر اٹھانا حرام ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ فعل حرام ہے، لیکن اس کا کرنے والا گناہ گار ہوگا البتہ اسکی نماز ہو جائیگی، ابن عمرؓ کے نزدیک اس کی نماز باطل ہوگی، یہی امام احمد کی ایک روایت ہے اور اہل ظواہر کا بھی یہی مذہب ہے انکی دلیل یہ ہے کہ یہ نہی نماز کے فاسد ہونے کا تقاضہ کرتی ہے۔ انتہی۔ قلت: یہ مسئلہ اس وقت ہے جب کہ نماز کے دوران ارکان میں امام سے جلدی کی جائے اور اگر کوئی شخص تکبیر تحریمہ اور سلام میں امام سے جلدی کرے تو پھر یہ مسئلہ علماء میں بڑا مختلف فیہ ہے جسکو میں اوجز میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

سر سے بدل دیا جائیگا کیونکہ اسکا یہ کام گدھے کے کام کے مناسب[1] ہے کیونکہ یہ امام سے پہلے رکوع وسجدے سے سر اٹھا کر ایسا کر رہا ہے گویا کہ یہ متبوع ہے حالانکہ یہ متبوع نہیں بلکہ تابع ہے۔ تو یہ شخص اپنے اس برے فعل میں احمق اور بے وقوف ہے کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی اس جلدی سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا اور یہ وقت سے پہلے نماز ختم نہیں کرسکتا بلکہ امام جب نماز سے فارغ ہوگا تب ہی یہ شخص بھی نماز سے فارغ ہو سکے گا لہٰذا اس کی یہ کوشش لغو اور عبث ہے۔

ایک اہم اشکال وجواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت محمدیہ کیلئے یہ دعا فرمائی تھی کہ یہ امت کبھی مسخ میں مبتلا نہ ہو اور آپ نے اس دعا کی قبولیت کے بارے میں خبر دی تھی لیکن حدیث باب سے اسکے برعکس[2] معلوم ہو رہا ہے کہ امت محمدیہ میں مسخ ہوسکتا ہے؟ جواب: پوری کی پوری امت مسخ کر دی جائے جیسا کہ بنو اسرائیل میں اس طرح ہوا تھا اسکی نفی کی گئی ہے ایک دو افراد کے مسخ ہونے کی نفی نہیں لہٰذا جب ہر ہر نمازی کے حق میں فرداً فرداً مسخ ہونا ممکن ہے تو ہر ایک کو لازماً اس سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔

باب ماجاء فی الذی یصلّی الفریضة ثُمَّ یَؤُمُّ النَّاسَ بعد ماصلّی

باب فرض نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی امامت کرنے کے بیان میں

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا حماد بن زید عن عمرو بن دینارٍ عن جابر بن عبد اللّٰہ: ان معاذ بن جبل کان یصلی مع رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المَغرِبَ ثم یرجعُ الی قومه فیومهم۔قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔ والعملُ علی هذا عند اصحابنا: الشافعیُّ، واحمدَ، واسحٰقَ۔ قالوا: اِذَا اَمَّ

---

[1] حضرت سہارنپوریؒ بذل میں لکھتے ہیں کہ اس وعید کو اس فعل کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا کیونکہ اس نے اپنا سر اٹھا کر یہ گناہ کیا ہے لہٰذا اس کے سر کو گدھے کے سر کے مشابہ کیا جاسکتا ہے۔

[2] **مسخ کے دیگر معانی:** یہ اشکال اس وقت ہوگا جبکہ مسخ سے اس کا ظاہری معنی مراد لیا جائے ورنہ علماء نے اس وعید کے مختلف معنی بیان کئے ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد معنوی طور پر گدھے کی مشابہت مراد ہے، کیونکہ گدھے میں بے وقوفی کی صفت ہے تو جس مقتدی کو نماز کے ضروری احکام معلوم نہ ہوں اسکو گدھے کے مشابہ کہا گیا ہے۔ ابن بزیزۃ فرماتے ہیں کہ تحویل سے مسخ بھی مراد ہوسکتا ہے یا حسی یا معنوی طور پر ہیئت کی تبدیلی بھی مراد ہوسکتی ہے، یا حسی اور معنوی دونوں تبدیلیاں اکٹھے کر دی جائیں یہ بھی ہوسکتا ہے۔ **بعض علماء** نے اسکا ظاہری معنی مراد لیا ہے اور ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی مانع بھی نہیں ہے کیونکہ اس امت میں مسخ کے وقوع کے جواز کی دلیل ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے یہ **الفاظ ہیں** "ویمسخ آخرین قردة و خنازیر الی آخر" ما افاده الشیخ فی البذل **قلت:** راجح قول میں یہ سزا عام ہے کہ انسان اسکا مستحق ضرور ہے اب اللہ کو اختیار ہے کہ دنیا میں یہ سزا دے یا آخرت میں سزا دے، یا اپنے فضل سے معاف فرمادے۔

الرجلُ القومَ فی المکتوبۃِ وقد کان صلّاھا قبل ذلک۔ انّ صلاۃَ مَنِ ائتم بہ جائزۃٌ۔واحتجوا بحدیث جابرٍ فی قِصّۃِ مَعَاذٍ۔وھو حدیث صحیحٌ، وقد رُوِیَ من غیر وجہٍ عن جابرٍ۔ ورُوِیَ عن ابی الدَّرْدَاءِ:انہ سُئِلَ عن رجل دخل المسجدَ والقومُ فی صلاۃ العصرِ وھو یَحْسَبُ انھا صلاۃُ الظھرِ فائتم بھم؟ قال: صلاتہ جائزۃ۔ وقد قال قومٌ من اھل الکوفۃِ: اذا ائتم قوم بامام وھو یصلّی العصرَ وھم یحسَبون انھا الظھرُ فصلّی بھم واقتدوابہ: فإنّ صلاۃَ المُقْتَدِی فاسدۃٌ، اِذا اختلفَ نِیَّۃُ الإمام ونیۃ الماموم۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے اور پھر اپنی قوم میں جا کر ان کی امامت کرتے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہےاوراسی پر ہمارے اصحاب شافعی، احمد واسحٰق کا عمل ہے کہ اگر کوئی شخص فرض نماز کی امامت کرے باوجودیکہ وہ فرض نماز پڑھ چکا ہو تو مقتدیوں کیلئے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ان کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہےاور یہ حدیث صحیح ہےاور کئی سندوں سے جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے اس شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو مسجد میں داخل ہوااور عصر کی نماز میں اہل مسجد مشغول ہوں لیکن وہ شخص ظہر کی نماز سمجھ کر ان کے ساتھ شریک ہو جائے؟فرمایا کہ اسکی نماز ہوگئی لیکن اہل کوفہ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اگر امام عصر پڑھ رہا ہواور مقتدی اسے ظہر سمجھ کر اس کی اقتداء میں ظہر کی نماز پڑھ لیں تو مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائیگی کیونکہ امام اور مقتدی کی نیت میں اختلاف ہے۔

﴿تشریح﴾

کان یصلی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المغرب: یہاں مغرب سے مراد نمازِ عشاء ہے: حدیث باب میں مغرب[1] کی نماز کا اطلاق مجازاً عشاء کی نماز پر کر دیا گیا ہے۔

---

[1] **ترمذی میں لفظ مغرب کی تحقیق اور حافظ کی رائے:** یعنی حدیث باب میں ہے کہ حضرت معاذؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مغرب کی نماز ادا فرماتے تھے لیکن مشہور روایات میں یہ واقعہ اسطرح ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عشاء پڑھکر جاتے تھے حضرت سہارنپوری نے بذل میں لکھا ہے کہ مغرب کا لفظ ترمذی میں وہم ہوگیا ہے۔ابن رسلان کہتے ہیں جس طرح دیہاتی مغرب کو عشاء کہتے تھے تو اسی طرح راوی نے وہم کر کے عشاء کو مغرب کہہ دیا (حدیث میں ہیکہ دیہاتی مغرب کی نماز کو عشاء کہتے ہیں تو وہ تمہاری اس نمازِ مغرب کے نام پر غالب نہ آئیں)۔قلت: تلخیص میں حافظ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعے ہیں وحکاہ عن ابن حبان۔

حدیث باب سے صلاۃ المفترض خلف المتنفل کے جواز کے قائلین کا استدلال: صلاۃ المفترض خلف المتنفل کے جواز کے قائلین[1] نے اس حدیث معاذ سے استدلال کیا ہے۔

پہلا جواب: ہمارے بعض علماء احناف[2] نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب فرض نماز دو دفعہ پڑھی جاتی تھی پھر جب دو مرتبہ ایک فرض پڑھنا منسوخ ہوا تو اقتداء المفترض خلف المتنفل بھی منسوخ ہو گیا۔

دوسرا جواب: نیز دوسرا جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حدیث کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انکے اس فعل پر تقریر ثابت نہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ صحابی کا فعل اس وقت حجت ہوتا ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس فعل پر تقریر ثابت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا اور یہاں پر یہ بات ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو اس طرح کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد گرامی ہے اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالو گے۔ پھر فرمایا: یا تم میرے ساتھ نماز پڑھو (اور لوگوں کو مت پڑھاؤ) یا تم اپنی قوم کو اگر نماز پڑھاؤ تو مختصر اور ہلکی نماز پڑھایا کرو یعنی اس صورت میں تم میرے ساتھ یہ نماز نہ پڑھنا۔

اس جواب ثانی پر اشکال: لیکن اس جواب پر یہ اشکال ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی جانیوالی نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو عشاء کی نماز دو مرتبہ پڑھنے سے جو منع کیا تھا اس کا مقصد ان لوگوں پر آسانی پیدا کرنا تھی۔ یا "اما ان تصلی معی واما ان تخفف عن قومك" میں او مانعۃ الخلو کیلئے ہے یعنی تم یہ دونوں کام ضرور کرو یعنی میرے ساتھ نماز پڑھنا اور اپنی قوم کو مختصراً نماز پڑھانا البتہ دونوں کو جمع کر سکتے ہو کہ میرے ساتھ بھی نماز پڑھو اور اپنی قوم کو مختصراً ہلکی نماز اسکے بعد پڑھا سکتے ہو۔

اسکا جواب: کسی شئی کا عدم ذکر اسکے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدیوں کیلئے اعادہ کا حکم حدیث میں ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقع میں انہیں اعادہ کا حکم بالکل دیا ہی نہ ہوگا۔

منشأ اختلاف: ہمارے اور شوافع کے درمیان اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ شوافع کہتے ہیں کہ جماعت کی نماز درحقیقت ایسی نماز ہے کہ لوگ اکٹھے ہو کر اسے ادا کرتے ہیں مقتدی امام کی نماز پر اپنی نماز کی بنا نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں

---

[1] یہ شافعیہ کا مذہب ہے ان سے صرف یہی ایک قول مروی ہے مالکیہ کا مشہور مذہب اور حنابلہ کے اکثر ائمہ کی راجح روایت بھی اسی طرح ہے۔ کذا فی الاوجز

[2] امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس توجیہ کو ذکر کیا ہے۔ اس پر اشکال اور جواب بذل میں مفصلاً موجود ہے۔

"الامام ضامن" کا صرف یہی مطلب ہے کہ امام سورۃ فاتحہ کے علاوہ سورۃ کی قرأت مقتدیوں کی طرف سے کرتا ہے اور بس ۔حنفیہ کے مذہب میں جماعت کی نماز اس کا نام نہیں کہ چند لوگ اکٹھے ہو کر نماز ادا کر رہے ہوں بلکہ مقتدی اپنی نماز کی بنا امام کی نماز پر کرتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "الامام ضامن" کا مطلب ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کی کفیل ہے لہٰذا امام کی نماز مقتدی کی نماز کی کفیل ہے لہٰذا امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کی حالت سے کمتر نہیں ہونی چاہیئے اور نہ ہی امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کے علاوہ[1] ہو لہٰذا فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے صحیح نہیں اسی طرح ایک فرض پڑھنے والے کی دوسرے فرض پڑھنے والے کے پیچھے صحیح نہیں ۔اسی طرح جب امام کی نماز فاسد ہوگی تو مقتدی کی نماز بھی فاسد ہوگی کیونکہ مقتدی کی نماز کی بنا امام کی نماز پر تھی ۔امام شافعیؒ ان تمام مسائل میں ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہیں ۔

بالغ کی اقتداء نابالغ کے پیچھے صحیح ہونے کی دلیل: تو اسی بنیادی اختلاف پر بالغ مردوں کی نماز نابالغ بچوں کے پیچھے جائز ہے یا نہیں یہ مسئلہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ امام شافعیؒ عمرو بن سلمہؓ کی حدیث سے اسکے جواز پر استدلال کرتے[2] ہیں کہ انکی حدیث میں ہے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں امامت کرایا کرتا تھا حالانکہ میری عمر چھ یا سات سال کی تھی الخ تو چونکہ بچہ کی نماز نفل ہوتی ہے لہٰذا فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے صحیح ہوگی۔

حدیث عمرو بن سلمہ کے جوابات: اس حدیث کی کبار ائمہ[3] ،امام احمد، حسن بصری وغیرہ نے تضعیف کی ہے،

---

[1] یہ لفظ پچھلے جملہ کے لفظ اقل پر عطف ہے یعنی امام کی نماز نہ تو مقتدی کی نماز سے کمتر ہو اور نہ ہی اسکی نماز کا غیر مثلاً ظہر کے فرض پڑھنے والا نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھے یا یہی شخص عصر کے فرض پڑھنے والے کے پیچھے ظہر پڑھے یہ ناجائز ہے۔

[2] یعنی امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے اس اصول کی وجہ سے عمرو بن سلمہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

حنفیہ کے دلائل: قلت: حنفیہ نے اپنے اصول پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "انما جعل الامام لیؤتم بہ" سے استدلال کیا ہے۔ ابن عبد البرؒ الاستذکار میں لکھتے ہیں کہ معن نے موطا میں امام مالکؒ سے اس حدیث میں فلا تختلفوا علیہ کی زیادتی نقل کی ہے تو حدیث شریف کا یہ جزو امام مالک، سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور اکثر تابعین کا مستدل ہے کہ جس مقتدی کی نیت نماز میں امام کی نیت کے علاوہ کی ہو تو مقتدی کی نماز باطل ہو جائیگی کیونکہ جب امام اور مقتدیوں کی نیتیں الگ الگ ہوں تو نیتوں پر ہی تو تمام اعمال کا دارومدار ہے اسلئے نیتوں میں اختلاف تمام اختلافات سے بڑھ کر ہے۔ اسلئے مقتدیوں کی نماز باطل ہو جائیگی التمہید میں ہے کہ اس زیادتی کو ابن وہب، یحییٰ بن مالک، ابو علی اور ایک جماعت نے نقل کیا ہے۔ ابی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام مالک اور جمہور کا استدلال ہے کہ امام اور مقتدی کی نمازوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیئے خصوصاً حدیث شریف کا ٹکڑا "فلا تختلفوا علیہ" ہمارے مذہب پر صراحۃً دلالت کر رہا ہے۔ کذا فی الاوجز

[3] خطابیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بن عمرو بن سلمہؓ کی حدیث کو ضعیف کہتے تھے ایک مرتبہ فرمایا "دعہ لیس بشیء بین" امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ امام احمد سے حدیث عمرو کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "لا ادری ما ھذا" مجھے اس عجیب وغریب حدیث کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ کذا فی البذل

۲۔ یہی عمرو راوی اس حدیث میں کہتے ہیں کہ جب میں سجدے میں جاتا تو سرین ظاہر ہو جاتے تھے اور بغیر ستر کے تو بالاجماع نماز ہوتی ہی نہیں۔

دوسرے جواب پر اشکال وجواب: لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ امام شافعیؒ کا جو اصول ہے اس اصول کے اعتبار سے یہ نماز صحیح ہو کیونکہ انکے ہاں امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز[1] فاسد نہیں ہوگی لہٰذا مقتدیوں کی نماز صحیح ہوگئی ہوگی اور عمرو بن سلمہ کی نماز فاسد چونکہ یہ بچے تھے اسلئے انہیں نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا۔

حدیثِ جابر سے خصم کا استدلال اور اسکے جوابات: (قولہ واحتجوا بحدیث جابر فی قصة معاذ وھو حدیث صحیح) حدیث جابر کی صحت کا تو حنفیہ بھی انکار نہیں کرتے لیکن حدیث کی صحت سے شوافع فائدہ نہیں اٹھا سکتے رہا اس حدیث سے استدلال کرنا تو اس میں خصم کیلئے بہت زیادہ دشواریاں[2] ہیں کیونکہ خصم اسپر کیا دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو نماز پڑھی تھی وہ فرض کی نیت سے پڑھی تھی اور اپنی مسجد میں نفل کی نیت سے نماز پڑھائی بلکہ اس کے برعکس بھی تو ہوسکتا ہے جس حدیث میں وھی لہ نافلة کی زیادتی ہے تو یہ زیادتی ثقہ راویوں[3] سے مروی نہیں بلکہ بعض راویوں نے اس کو حدیث کا ٹکڑا سمجھ کر اسکو اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے اور انہیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مراد ظاہر نہ ہوسکی نہ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان سے کچھ وضاحت فرمائی تھی اور نہ ہی حدیث میں اس کا ثبوت ہے۔

---

[1] **متن میں مذکور اشکال کا جواب:** قلت: لیکن یہ اصول شوافع کے مذہب میں قاعدہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے مسائل میں شوافع نے تصریح کی ہے کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے فاسد ہونے سے فاسد ہو جائیگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی امام کو ایک رکعت پڑھانے کے بعد یاد آئے کہ وہ تو جنبی ہے پھر وہ مسجد سے نکل کر غسل کرے اور مقتدی اسکا انتظار کرے پھر یہی امام غسل کے بعد پہلی رکعت پر اس نماز کی بنا کرے تو امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہو جائیگی کیونکہ مقتدی اس امام کی اس حالت میں اقتداء کر رہے تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ امام کی نماز فاسد تھی۔ کذا فی الاوجز۔ فروعِ شافعیہ میں تصریح ہے کہ اس شخص کا اقتداء کرنا صحیح نہیں جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ اس کے امام کی نماز باطل ہے لہٰذا اس قصہ میں جب سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ انکے امام بچے کی نماز فاسد ہے کشف عورۃ کی وجہ سے تو انکا اقتداء کرنا کیسے صحیح ہوگا۔

[2] خرط القتاد لغت میں کہتے ہیں خرط الشجر وہ درخت جس کے پتے تیزی سے جھڑنے لگیں اور قتاد وہ سخت درخت ہوتا ہے جس میں سوئی کیطرح کانٹے ہوتے ہیں انتہی۔ مقصد یہ ہے کہ حدیث جابرؓ سے اپنے مستدل پر استدلال کرنے میں بہت زیادہ اور بہت مشکل موانع موجود ہیں۔

[3] **قصہ معاذ میں وھی لہ نافلة کی زیادتی متکلم فیہ ہے:** بلکہ وھی لہ نافلة کی زیادتی پر محدثین نے کلام کیا ہے ابوالبرکات ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ امام احمد نے اس زیادتی کو ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ جملہ غیر محفوظ ہو کیونکہ ابن جریج نے یہ ایسا کلام زائد کیا ہے جس کو کسی راوی نے ذکر نہیں کیا ہے ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ یہ زیادتی صحیح نہیں اور اگر اسکو صحیح تسلیم بھی کیا جائے تو یہ حضرت جابرؓ یا اور کسی راوی کا اپنا گمان ہے۔ عارضة الاحوذی، بذل المجھود

حضرت ابوالدرداءؓ کے قول کی توجیہ: (قوله وروی عن ابی الدرداء) ابودرداء رضی اللہ عنہ کے اس قول کا یہ مقصد ہوسکتا ہے کہ مقتدیوں کی نماز علی الاطلاق صحیح ہوگئی (گویا یہ نماز مطلق نفل بن جائیگی۔ از مترجم) یہ مراد نہیں کہ انکی فرض کی نیت سے پڑھی جانیوالی نماز صحیح ہوگئی اسی طرح

مصنف کے کلام کا مطلب: (وقال قوم من اهل الكوفة اذا ايتم قوم فان صلوٰة المقتدى فاسدة) میں نماز کے فاسد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فرضیت میں فساد آئیگا نہ کے یہ کہ مطلق نماز ہی فاسد ہوگئی یہی تو حنفیہ کا مذہب ہوا اور اس کے جواب دینے کی ضرورت نہیں اور اگر اس قول کا یہ مقصد ہے کہ اس کی فرض کی نیت سے پڑھی جانیوالی نماز صحیح ہوگی تو حدیث کے مقابلے[1] میں صحابی کے قول کو ماننا ضروری نہیں۔

ایک اشکال اور اسکا جواب: حدیث شریف کا ایسا معنی[2] مراد لینا چاہئے جو صحابی کے قول کے معارض نہ ہو جیسا کہ امام شافعیؒ نے یہاں پر کیا ہے (یعنی الامام ضامن کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ امام سورۃ فاتحہ کی قرأت کے علاوہ قرأت کا ضامن ہے اس طرح صحابی کے قول اور حدیث میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ از مترجم)۔

بَابُ ماذكر من الرخصة فى السجود على الثوب فى الحَرِّ والبرد

باب گرمی یا سردی میں کپڑے پر سجدہ کرنے کی اجازت

☆حدثنا احمد بن محمد حَدَّثَنَا عبد الله بن المبارك اخبرنا خالد بن عبد الرحمن قال حدثنى غالب القطان عن بكر بن عبد الله المزنى عن انس بن مالك قال: كنا اذا صليناخلف النبى صلى الله عليه وسلم بِالظَّهَائِرِ سَجَدْنَا على ثيابنا اتِّقَاءَ الحرِّ۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ قال: وفى الباب عن جابر بن عبد الله، وابن عباسٍ۔ وقد رَوَى وكيعٌ هذا الحديثَ عن خالد بن عبد الرحمٰن۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت گرمیوں میں نماز پڑھتے تھے تو گرمی سے بچنے کیلئے اپنے اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس باب میں جابر

---

[1] اس حدیث سے مراد الامام ضامن الخ ہے جیسا کہ مولانا رضی الحسن مرحوم کی تقریر میں مذکور ہے۔ قلت: نیز صحابی (ابودرداءؓ) کا قول دوسری حدیث انما جعل الامام لیوتم بہ کے بھی معارض ہے۔

[2] **متن کے اشکال کا جواب:** قلت: لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ دوسری حدیث لا تختلفوا علیہ اور حضرت ابودرداءؓ صحابی کے اس قول میں پھر بھی تعارض ختم نہیں ہوگا۔

بن عبداللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی روایات ہیں وکیع نے بھی یہ حدیث خالد بن عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے۔

﴿تشریح﴾

حنفیہ کا مستدل: ثیاب سے ثوب سے متصل بالجسد مراد ہے: (قولہ سجدنا علی ثیابنا) یہاں پر کپڑوں سے مراد وہ کپڑے ہیں جو صحابہ کرامؓ پہنے ہوتے تھے کیونکہ پہن ہوئے کپڑوں کے علاوہ کپڑوں پر سجدہ کا جائز ہونا[1] سب کو معلوم تھا۔ (اتقاء الحر) ہوسکتا ہے کہ یہ صحابی ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے جس پر چھت نہیں تھی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد مراد ہو کیونکہ اس مسجد نبوی کی چھت اس قدر بلند نہ تھی کہ وہ دھوپ کو زمین پر پہنچنے سے روکے رکھتی، بلکہ وہ چھت نیچی تھی زیادہ اونچی نہ تھی۔

عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرنا: عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرنے کا مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر عمامہ کا یہ پیچ پیشانی کے زمین پر لگنے سے مانع ہو تب تو وہ سجدہ ناجائز ہے ورنہ دوسرے کپڑے کی طرح عمامہ کے پیچ پر بھی سجدہ صحیح ہو جائیگا۔

باب ذکرْ مایُستَحَبُّ من الجلوس فی المسجِدبعد صلاۃِ الصبح حتی تطلعَ الشمسُ

باب فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مسجد میں بیٹھنا مستحب ہے

☆حدثنا قتیبة حَدَّثَنَا ابو الاحوصِ عن سماك بن حرب عن جابر بن سمرة قال: كان النبیُّ صلی اللّٰہ علیه وسلم اِذا صلَّی الفجرَ قَعَدَ فی مُصَلَّاهُ حتی تَطْلُعَ الشمسُ۔قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔

☆حدثنا عبد اللّٰہ بن معاویة الجُمَحی البصری حَدَّثَنَا عبد العزیز بن مسلم حَدَّثَنَا ابو ظلال عن انس بن مالك قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: مَن صلَّی الغداةَ فی جماعةٍ ثم قعدَ یذکرُ اللّٰهَ حتی تَطْلُعَ الشمسُ ثم صلَّی رکعتین: کانت له کاجْرِ حَجَّةٍ وعمرة، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن غریبٌ۔قال : وسالتُ محمد بن اسمٰعیل عن ابی ظلال ؟ فقال: هو مقارب الحدیث قال محمد: واسمه هلال

﴿ترجمہ﴾

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہتے یہاں تک کہ سورج نکل آتا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

---

[1] **مختلف فیہ مسئلہ:** ثوب متصل پر سجدہ کرنے میں اختلاف ہے حنفیہ اور جمہور کے ہاں مباح ہے اور شافعیہ کے ہاں ناجائز ہے جیسا کہ حافظؒ نے امام نوویؒ سے نقل کیا ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا رہے یہاں تک کہ سورج نکل آئے پھر دو رکعتیں پڑھے۔اس کیلئے ایک حج اور عمرے کا ثواب ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا مکمل مکمل مکمل (یعنی حج اور عمرہ کا مکمل ثواب ملیگا) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے اور میں نے سوال کیا امام بخاریؒ سے ابوظلال کے متعلق تو انہوں نے کہا کہ وہ مقارب الحدیث ہے (یعنی انکی احادیث قابلِ قبول ہیں) اور ان کا نام ہلال ہے۔

﴿تشریح﴾

غرضِ مصنف: شاید کسی کو یہ وہم ہو کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفل عبادات گھر میں ادا کرنے کا حکم دیا ہے اسلئے مسجد میں نمازِ فجر کے بعد عبادت کیلئے بیٹھنا ناجائز ہوگا اسی طرح یہ بھی وہم ہوسکتا ہے کہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنے پر ثواب نہیں ملنا چاہیئے کیونکہ مسجد میں بیٹھنے پر اس وقت ثواب ملتا ہے جبکہ نماز کے انتظار میں بیٹھے اور فجر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں جسکا انتظار کیا جائے۔مصنف نے اس باب سے ان اوہام باطلہ کا رد کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا باعثِ ثواب ہے اور نماز کے انتظار سے مراد عام ہے کہ فرض نماز کے انتظار کیلئے بیٹھے یا نفل نماز کے انتظار کیلئے (تو یہاں نفل نماز کے انتظار میں بیٹھا جاتا ہے) اور مسجد میں نوافل ادا کرنا بلا کراہت مشروع ہے۔

اس جملہ کی تشریح: (كانت له كاجر حجة وعمرة) واو اپنے اصل معنی یعنی جمع کیلئے بھی ہوسکتا ہے تو مطلب ہوگا کہ فجر کی نماز سے اشراق تک عبادت کیلئے بیٹھنے والے کو حج اور عمرہ دونوں عبادتوں کا ثواب ملیگا۔یا واو بمعنی او ہوسکتا ہو تو اس صورت میں نمازی کے اخلاص نیت اور اس کی عبادت کے خشوع وخضوع کے اعتبار سے ثواب میں کمی بیشی ہوگی (کہ کسی اشراق پڑھنے والے کو حج کا ثواب ملیگا اور کسی کو عمرہ کا ثواب ملیگا۔ازمترجم)۔

حدیثِ باب میں تشبیہ کی وضاحت: حج اور عمرہ کرنیوالے اور مسجد میں بیٹھنے والے کے درمیان مناسبت بالکل ظاہر ہے کیونکہ حاجی اور عمرہ کرنے والا شخص بھی اپنے آپ کو اللہ کی مہمانی اور اس کے معزز گھر میں باندھے رکھتا ہے جیسا کہ مسجد میں بیٹھنے والا اللہ کے گھر میں اپنے آپ کو روکے رکھتا ہے،اسلئے اس شخص کیلئے بھی وہی مہمانی ہے جو حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کیلئے ہے۔

ایک لطیف نکتہ: یہاں پر ایک لطیف نکتہ ہے جس سے بہت سی مشکل احادیث حل ہوجاتی ہیں وہ یہ کہ نیکی کے کاموں میں سے ہر کام کیلئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب کی ایک خاص مقدار اس عمل کیلئے مقرر ہے (جسے اجر یا ثواب اصلی کہہ سکتے ہیں) مثلاً ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ حج کا ثواب اصلی اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکیوں سے بھرے ایک ہزار خزانے ہیں اسی طرح ہر

عمل کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور فضل اور انعام کے اس متعین ثواب پر زیادتی بھی کی جاتی ہے یہ بندوں پر اللہ کا احسان ہے مثلاً حج پر نیکیوں سے بھرے ایک ہزار خزانوں کے بجائے ثواب کے دس لاکھ خزانے عنایت فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکیوں میں تضعیف کی کوئی انتہا نہیں چنانچہ قرآن اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا دیا جاتا ہے اور قرآن کریم میں سات سو گنا تک بھی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے "مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضعف لمن یشاء" یہی حال صدقہ کے علاوہ دوسرے اعمال میں تضعیف حسنات کا بھی ہے تو اس طرح ہر نیکی پر اللہ تعالی بے شمار زیادتیاں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ ثواب[1] جو اللہ تعالیٰ بطور فضل کے بہت زیادہ عطا کرتے ہیں وہ نفس عمل (کے ثواب اصلی) سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور نفس عمل کا ثواب وہی ہے جو ثواب زائد کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کا ثواب متعین کیا ہے تو اسی قاعدہ پر بنا کرتے ہوئے ہم یہ سمجھاتے ہیں کہ طلوع شمس کے بعد اشراق کے وقت دو رکعتیں پڑھنے سے حج کا ثواب اصلی عطا کیا جاتا ہے لیکن جب آدمی[2] حج کریگا تو اس کا ثواب اس ثواب سے بہت زیادہ ہوگا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "قل ھو اللہ احد" ایک تہائی قرآن کے مساوی ہے اور سورۃ یٰس کا پڑھنا دس مرتبہ قرآن کی تلاوت کے مساوی ہے تو ان سب حدیثوں کا مطلب بھی یہی ہے کہ انکے پڑھنے پر قرآن کا ثواب اصلی اس قدر ملیگا لیکن اگر ایک آدمی پورا قرآن پڑھے تو اسے یہ ثواب بھی ملیگا اور اس ثواب پر لا متناہی انعامی ثواب بھی حاصل ہوگا۔ واللہ الھادی الی سواء السبیل

تکرار کی وجہ: (قولہ تامۃ تامۃ تامۃ) کیونکہ اتنے تھوڑے عمل پر اس قدر زیادہ ثواب بظاہر بعید معلوم ہو رہا ہے لہٰذا کسی کو یہ وہم ہوسکتا ہے کہ یہ حج اور عمرہ تو ناقص ہونگے اور یہ ثواب اس حج اور عمرے کا نہیں ملیگا جن کے بے شمار فضائل آئے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "تامۃ تامۃ تامۃ" فرما کر اسکو دور فرمایا۔

غرضِ مصنف: (وسالت محمدا عن ابی ظلال فقال ھو مقارب الحدیث) اس سوال کا منشا بھی بظاہر یہ ہے کہ راوی کو اس قدر ثواب بعید معلوم ہو رہا ہوگا کہ شاید کسی راوی نے بھولے سے اسقدر ثواب ذکر کیا ہے تو امام بخاریؒ نے اس وہم کو دور فرمایا اور اسی وجہ سے امام ترمذیؒ شروع میں اس حدیث کو حسن کہہ چکے ہیں۔

---

[1] مشائخ اسے اپنی تقریر میں اجرِ انعامی کہتے ہیں۔

[2] یعنی نفس حج کا نفس ثواب اس سے بہت بڑھا ہوا ہے اس میں خرچہ کرنا، جانا، بیت اللہ کی زیارت اور مسجد حرام میں نمازیں پڑھنا وغیرہ دوسرے افعال کا ثواب تو شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔

باب ماذکر فی الالتفات فی الصلاۃِ

باب نماز میں ادھر ادھر متوجہ ہونے کا بیان

☆حدثنا محمود بن غَيْلَانَ وغير واحد قالوا: حَدَّثَنَا الفضلُ بن موسى عن عبد الله بن سعيد بن ابى هندٍ عن ثَوْرِ بن زيدٍ عن عكرمةَ عن ابن عباسٍ: اَنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يَلْحَظُ فى الصَّلاةِ يَميناً وشِمَالاً، ولايَلْوِى عنقه خَلْفَ ظَهْرِه۔ قال ابو عيسى: هذا حديث غريبٌ۔ وقد خالفَ وكيعٌ الفضل بنَ موسى فى روايته۔

☆ حَدَّثَنَا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا وكيعٌ عن عبد الله بن سعيد بن ابى هندٍ عن بعض اصحاب عكرمة: ان النبیَّ صلى الله عليه وسلم كان يَلْحَظُ فى الصَّلاةِ فذَكَرَنحوهَ۔قال : وفى الباب عن انسٍ، وعائشة۔

☆حدثنا ابوحاتم مسلم بن حاتم البصرى حَدَّثَنَا محمد بن عبد الله الانصارى عن ابيه عن على بن زيد عن سعيد بن المسيب قال: قال انس بن مالك: قال لى رسول الله صلى الله عليه وسلم: يابنى اياك والالتفاتَ فى الصلاة، فاِنَّ الالتفاتَ فى الصلاة هَلَكَةٌ، فاِنْ كان لابد ففى التطوع ،لافى الفريضةِ۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسنٌ۔

☆حدثنا صالح بن عبد الله حَدَّثَنَا ابو الاحوصِ عن اَشْعَثَ بن ابى الشَّعثاء عن ابيه عن مَسْرُوقٍ عن عائشةَ قالت: سالتُ رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم عن الالتفاتِ فى الصلاةِ؟ قال :هو اختِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشطانُ مِن صلاة الرجلِ۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسن غريب۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں دائیں بائیں دیکھتے تھے لیکن اپنی گردن کو پیٹھ کے پیچھے کیطرف نہیں موڑتے تھے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہےاور وکیع نے اپنی روایت میں فضل بن موسیٰ سے اختلاف کیا ہے۔چنانچہ محمود بن غیلان نے وکیع کے واسطے سے عن عبداللہ بن سعید بن ابی ہند کے بعد عکرمہ کے بعض شاگردوں سے نقل کیا ہے۔کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے (یعنی بغیر گردن موڑے صرف آنکھوں سے) اور پھر مذکورہ بالا حدیث کے مثل نقل کرتے ہیں۔اس باب میں حضرت انس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے میرے بیٹے !نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھنے سے پرہیز کرو، کیونکہ یہ ہلاکت ہے۔اگر دیکھنا ضروری ہی ہو تو نفل نماز میں دیکھ لو فرض نماز میں نہ

دیکھو۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔

☆ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھنے کے متعلق سوال کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شیطان کا اچک لینا ہے۔ شیطان آدمی کی نماز سے رحمت الٰہی کا حصہ اچک لیتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

التفات کی اقسامِ ثلثہ: نماز میں التفات[1] کی تین قسمیں ہیں: ا۔ کن انکھیوں[2] سے دیکھنا، ۲۔ چہرہ پھیر کر دیکھنا، ۳۔ سینہ قبلہ سے پھر جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب[3] یہ ارشاد فرمایا کہ اے میرے بیٹے نماز میں التفات کرنے سے بچتے رہنا اور آپ نے ایک سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ یہ التفات کرنا نماز میں کمی کر دیتا ہے جس کے ذریعہ انسان کی نماز کے ثواب کو شیطان اچک لیتا ہے۔

اختلاس کی تین قسمیں: اس اختلاس (کمی) کی بھی چند قسمیں ہیں: ا۔ بعینہ وہ چیز چھین لی جائے اور تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے، ۲۔ اس طرح وہ چیز لی جائے کہ اس میں کچھ حصہ بھی ہاتھ سے نہ نکلے، ۳۔ اس طرح اس چیز کو تمہارے ہاتھ سے چھڑائے کہ اکثر حصہ تمہارے پاس رہ جائے اور چونکہ عموماً جب کسی شئی کو مطلق ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے فرد کامل مراد ہوتا ہے تو ان دونوں حدیثوں سے یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ التفات کرنے سے نماز ٹوٹ جائیگی کیونکہ اختلاس کی تین قسموں میں سے پہلی قسم فردِ کامل ہے اور اس حدیث "یبنیّ ایاك والالتفات فی الصلوٰۃ" کے ظاہر سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ نماز میں التفات کرنا حرام ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں التفات فرما کر ان تمام اوہام کو رد کر دیا لہٰذا آپ کے فعل سے یہ ثابت ہو گیا کہ اختلاس سے مراد اس کی پہلی قسم نہیں کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنے سے نماز بالکل ہی ختم ہو جائے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں التفات کرنا خشوع وخضوع کے منافی ہے تو یہ التفات اس وقت مکروہ ہوگا جبکہ سینہ قبلہ سے نہ پھرے ورنہ نماز ہی فاسد ہو جائیگی۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز میں التفات کرنے کو اختلاس کہا گیا ہے اس سے اشارہ ہے کہ التفات کی کمی زیادتی سے حکم تبدیل ہوگا لہٰذا اگر ایک شخص بہت زیادہ نماز میں التفات کرے تو اسی قدر شیطان نماز میں سے اسکا ثواب چھین کر لے جائیگا تو اس سے معلوم ہوا کہ سینہ کے قبلہ سے پھر جانے کی صورت میں نماز فاسد ہو جائیگی اور اگر التفات معمولی قسم کا ہو مثلاً ہلکا سا چہرے کو موڑنے پر اکتفاء کرے تو

---

[1] درمختار میں ہے کہ اپنے پورے چہرے کے ساتھ یا چہرے کے ایک حصہ کے ساتھ التفات کرنا مکروہ ہے کیونکہ حدیث میں اسکی ممانعت ہے۔ نماز میں آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنا مکروہ تنزیہی ہے اور سینہ کو قبلہ سے پھیرنا نماز کیلئے مفسد ہے۔

[2] لفت یلفت کے معنی موڑنا۔

[3] لما حرفِ شرط ہے اس کی جزا فکان یقض ہے۔

اس صورت میں پورے ثواب کی کمی نہ ہوگی البتہ اللہ تعالی کی ذاتِ گرامی سے حضوری والی کیفیت ختم ہو جائیگی، پھر اس حضوری کی کیفیت کے ہونے، نہ ہونے کے بھی کئی درجات ہیں جیسا کہ التفات کے مختلف درجات ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے التفات کی ایک قسم کا ثبوت ہے تو گویا اس کلی میں سے اس ایک جزئی کا علم صراحۃً فعلی طور[1] پر ذکر کیا گیا اور جو صورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تو انہیں دوسرے قواعد اور اصول پر پرکھا جائیگا کہ یہ التفات کی اقسام میں سے کونسی قسم ہے اور اس صورت میں اختلاس کی کونسی نوع واقع ہوئی ہے لہٰذا ہم نے غور کیا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو شخص اس طرح اپنی گردن موڑے کہ اس کا سینہ قبلہ سے نہ پھرے تو یہ تھوڑا سا التفات اسکی نماز کیلئے مفسد نہ ہوگا کیونکہ استقبالِ قبلہ جو کہ فرض تھا وہ بالکلیہ فوت نہ ہوگا۔

تحویل صدر مفسد ہے لی عنق غیر مفسد ہے: (قوله لا يلوى عنقه خلف ظهره) گردن کو پیٹھ کے پیچھے موڑنے کی صورت میں لامحالہ سینہ قبلہ سے پھر جائیگا۔ ہاں مطلقاً گردن کو موڑنا یہ اس طرح بھی ممکن ہے کہ سینہ قبلہ سے نہ پھرے مثلاً کوئی شخص اپنے دائیں بائیں جناب دیکھے یہ صورت مفسد صلوٰۃ نہیں اور اگر پورے طور پر اپنے چہرے کو پھیرے جسے حدیث میں کہا گیا ہے کہ گردن پیٹھ کے پیچھے نہیں موڑتے تھے تو یہ صورت نماز میں صحیح نہیں چونکہ یہ صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ راوی نے نماز کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نفی کی ہے لہٰذا یہ صورت مفسدِ صلوٰۃ ہے اور التفات کی پہلی دو قسمیں کہ دائیں یا بائیں جانب چہرہ پھیرے مفسدِ صلوٰۃ نہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب راوی نے اس بات کی نفی کی ہے کہ آپ گردن کو پیٹھ کی جانب نہیں موڑتے تھے تو سینہ کو قبلہ سے پھیرنے کی نفی بطریق اولیٰ ہو جائیگی نیز استقبال قبلہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی نماز فاسد ہو جائیگی۔

قال ابوعیسیٰ کی تشریح: (قوله وقد خالف وكيع الفضل) گذشتہ روایت فضل بن موسیٰ راوی سے مروی تھی اور اگلی روایت وکیع سے مروی ہے دونوں روایتوں میں دو طرح[2] فرق ہے: ۱۔ فضل راوی نے اس روایت کو عبداللہ بن سعید بن ابی الھند کے بعد ثور بن یزید سے اس روایت کو نقل کیا ہے جبکہ وکیع نے اس روایت کو عبدالله بن سعید بن ابی الهند کے بعد عن بعض اصحاب عکرمہ سے نقل کیا ہے، ۲۔ وکیع نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ذکر نہیں کیا اور فضل راوی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ذکر کیا ہے۔

---

[1] بظاہر کان کا اسم ضمیر ہے جو ما ثبت عنہ کی طرف راجع ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان جزئیات میں سے جو جزئی صراحۃً ثابت ہے وہ یہ ہے۔

[2] خلاصہ یہ ہے کہ حدیث میں یہ اختلاف ہے کہ یہ موصول ہے یا مرسل حافظ نے درایہ میں نقل کیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے ارسال کو ترجیح دی ہے۔ فتأمل (از مترجم: فتأمل سے شاید حضرت شیخ نے اس طرف اشارہ کیا ہیکہ امام ترمذیؒ نے یہاں پر کسی ایک روایت کو دوسری پر ترجیح نہیں دی۔ ہوسکتا ہے کہ شاید کہ ترمذی کے کسی دوسرے نسخہ میں یہ ترجیح ہو اور اس عاجز کے خیال میں شاید کہ امام ترمذیؒ نے پہلی روایت جس کو فضل بن موسیٰ نے ابن عباسؓ سے متصلاً نقل کیا ہے اسکو ھذا حدیث غریب فرمایا شاید اس سے حافظ نے یہ سمجھا کہ یہ روایت متصل مرجوح ہے اور قد خالف الوکیع الخ والی روایت راجح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)۔

اس فرق کی وجہ: (فان کان لا بد ففی التطوع لا فی الفریضة) کیونکہ نوافل میں جو وسعت ہوتی ہے وہ فرائض میں نہیں ہوتی اسلئے کہ نوافل میں سختی کرنے سے حرج واقع ہوگا کیونکہ اس کا کوئی وقت نہیں ہے بخلاف فرائض کے کہ انکا وقت مقرر ہے۔

باب ماذکر فی الرجل یدرک الامام وھو ساجد کیف یصنع

باب اگر کوئی شخص امام کو سجدے میں پائے تو کیا کرے؟

☆حدثنا ھشام بن یونسَ الکوفیُّ حَدَّثَنَا المحاربی عن الحجاج بن ارطاۃ عن ابی اسحٰق عن ھبیرۃ بن یریمَ عن علی وعن عمر وبن مرۃ عن ابن ابی لیلی عن معاذ بن جبل قالا: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اذا اتی احدکم الصلاۃ والامام علی حال فلیصنع کمایصنع الامام۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث غریب، لانعلم احداً اسندہُ الامارُوِیَ من ھذا الوجہ۔ والعملُ علی ھذا عند اھل العلم۔ قالوا: اِذا جاء الرجلُ والامامُ ساجدٌ فلیسجدْ، ولا تجزئہ تلک الرکعۃ، اذا فاتہ الرکوعُ مع الامام۔ واختار عبد اللّٰہ بن المبارک ان یسجدَ مع الامام۔ وذکر عن بعضھم فقال: لَعَلَّہٗ لا یَرْفَعُ راسَہ فی تلک السجدۃ حتی یُغْفَرلہ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی ومعاذ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی نماز کیلئے آئے تو امام کسی بھی حال میں ہو تو تم اسی طرح کرو جس طرح امام کر رہا ہو۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے اسے اس روایت کے علاوہ کسی اور کے متصل کرنے کا ہمیں علم نہیں اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ اگر کوئی شخص امام کے سجدے میں ہونے کی حالت میں آئے تو وہ بھی سجدہ کرے لیکن اگر اسکا رکوع چھوٹ جائے تو اس کیلئے سجدہ میں ملنا رکعت کیلئے کافی نہیں۔ عبداللہ بن مبارک بھی یہی کہتے ہیں کہ امام کے ساتھ سجدہ کرے اور انہوں نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ شاید وہ شخص سجدے سے سر اٹھانے سے پہلے ہی بخش دیا جائے۔

﴿تشریح﴾

یہاں تحویلِ سند مذکور نہیں ہے: (حدثنا ھشام بن یونس الکوفی نا المحاربی عن الحجاج بن ارطاۃ عن ابی اسحق عن ھبیرۃ عن علی) یہاں پر سند میں تحویل[1] ہے جس کو مصنف نے ذکر نہیں کیا۔ یعنی وہ اسطرح ہے کہ اسکے بعد

---

[1] حضرت گنگوہیؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند مصنف سے محاربی راوی تک مشترک ہے اسکے بعد دو راویوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے وہ اسطرح کہ محاربی حجاج اور عمرو بن مرۃ دونوں سے حدیث کو نقل کرتے ہیں یہ حضرت گنگوہیؒ کے کلام کا خلاصہ ہے لیکن حافظ نے لکھا ہے کہ عمرو بن مرۃ سے نقل کرنے والوں میں ابو اسحٰق السبیعی ہیں نہ کہ محاربی اسلئے اس مقام کی تحقیق کرنی چاہیئے۔

عمرو بن مرۃ سے محاربی راوی نقل کررہے ہیں تو سند اس طرح ہوگی "وحدثنا ھشام بن یونس الکوفی نا المحاربی عن عمرو بن مرۃ عن ابن ابی لیلیٰ"۔

یہ حکم نماز شروع کرنے سے قبل بھی ہے اور دورانِ نماز بھی: (فلیصنع کما یصنع الامام) یہ حکم مقتدی کیلئے نماز شروع ہونے سے پہلے[1] بھی ہے اور اسکے بعد بھی یعنی اگر نماز کے دوران کوئی مقتدی آجائے تو وہ اس کا انتظار نہ کرے کہ امام دوسری رکعت شروع کرے بلکہ یہ شخص آتے ہی تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائے۔ امام جس رکن میں بھی ہو کیونکہ اگر یہ نو وارد کھڑا رہیگا تو اس میں یہ شخص مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کا بھی مرتکب ہوگا اور عبادت میں تاخیر کا بھی اسی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا ہے (از مترجم: اس سے مراد علامہ ابن مبارک ہیں) کہ کیا معلوم یہ شخص امام کے ساتھ اس مسجد سے سر اٹھائے اور اللہ تعالیٰ اس کے سبب اسکی بخشش فرمادیں۔ (اسی طرح نماز شروع کرنے کے بعد بھی مقتدی ہر ہر فعل میں امام کا اتباع کرے)۔

رکوع نکلنے کی صورت میں رکعت شمار نہ ہونے کی وجہ: بہر حال نماز کے دوران نو وارد کے رکوع کے بعد کسی بھی رکن میں شریک ہونے کی صورت میں اس رکعت کے شمار نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ (نماز کی ایک رکعت میں تین اہم رکان ہیں وہ اسطرح کہ) نماز کے ارکان میں سے دو رکن قیام اور قرأت ہیں اور یہ دونوں ایسے رکن ہیں کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک کو پائے گا تو وہ دونوں کو پالے گا ورنہ یہ دونوں ہی ارکان اس سے فوت ہو جائینگے، تو یہ دو رکن ایک رکن کے قائم مقام ہوگئے بہر حال یہ دو ارکان لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح نماز کے ارکان میں سے رکوع اور سجود بھی دوسرے تیسرے رکن ہیں تو قیام، قرأت، رکوع، سجود میں سے جب رکوع بھی نکل گیا تو اکثر ارکان اسکے فوت ہوگئے (تین ارکان میں سے دو رکن فوت ہوگئے) لہٰذا یہ رکعت شمار نہ ہوگی۔ اگر دو سجدوں کو دو رکن شمار کریں تو اس وقت بھی اکثر ارکان اسکو نہیں ملے، کیونکہ اس صورت میں چار ارکان میں سے دو رکن اس کو ملے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث میں اس اشکال کا جواب دیا جارہا ہے کہ جب یہ دونوں سجدے نماز میں شمار نہیں کئے جائینگے تو پھر امام کے ساتھ شریک ہونے کا کیا فائدہ؟ تو حدیث شریف میں فلیصنع کما یصنع الامام کہکر اس کو رد کردیا کہ ہر حال میں مقتدی کو امام کے ساتھ شریک ہونا چاہیے۔

---

[1] یعنی مقتدی اگر نماز کے دوران آئے تو امام کا انتظار نہیں کریگا اپنی نماز شروع کرنے میں بلکہ آتے ہی نماز شروع کردے اور نہ ہی مقتدی نماز شروع کرنے کے بعد امام کی دوسری رکعت شروع کرنے کا انتظار کرے گا۔

باب كَرَاهِيَةِ ان ينتظر الناسُ الامام وهم قيام عند افتتاح الصلاة

باب نماز کے وقت لوگوں کا کھڑے ہوکر امام کا انتظار کرنا مکروہ ہے

☆حدثنا احمد بن محمد اخبرنا عبد الله بن المبارك اخبرنا معمر عن يحيى بن ابى كثير عن عبد الله بن ابى قتادة عن ابيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا اقيمت الصلاةُ فلا تقوموا حتى ترونى خرجت۔قال: وفى الباب عن انسٍ، وحديث انسٍ غيرُ محفوظٍ۔قال ابو عيسى: حديث ابى قتادة حديث حسن صحيحٌ۔ وقد كره قوم من اهل العلم من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم وغيرهم ان ينتظر الناسُ الامامَ وهم قيامٌ۔وقال بعضهم: اذا كان الامام فى المسجد فاقيمتِ الصلاة فانما يقومون اذا قال المؤذن قد قامت الصلاة قد قامت الصلاة۔ وهو قول ابن المبارك۔

﴿ترجمه﴾

حضرت عبداللہ بن ابوقتادہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر نماز کی اقامت ہوجائے تو تم لوگ اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک مجھے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لو۔ اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ ان کی روایت غیر محفوظ ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابوقتادہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ علماء صحابہ کی ایک جماعت لوگوں کے کھڑے ہوکر امام کا انتظار کرنے کو مکروہ سمجھتی ہے بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اگر امام کے مسجد میں ہوتے ہوئے اقامت ہو تو اس وقت کھڑے ہوں جب موذن قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ کہے۔ ابن مبارک کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

اس کراہت کی علت: مقتدیوں کو کھڑے ہوکر امام کا انتظار کرنے سے اسلئے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح کھڑے ہونے سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کے کمرے سے باہر آنے کا تقاضہ ہے[1] اور یہ بات امام پر شاق گزرے گی۔ نیز جب امام کو مسجد آنے میں تاخیر ہوگی تو مقتدیوں کو کھڑے ہوکر انتظار کرنا انتہائی ثقیل معلوم ہوگا۔ نیز اس طرح کھڑے ہونے سے مقتدی تھک جائینگے تو نماز کے اندر حالت قیام میں کھڑے ہونے سے دشواری پیش آئیگی۔

مقتدی جماعت کیلئے کسوقت کھڑے ہوں؟: (قال بعضهم اذا كان الامام فى المسجد) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر امام پہلے سے مسجد میں موجود نہ ہو تو مقتدیوں کو اس وقت کھڑا ہونا چاہیئے جب امام مسجد میں داخل ہو۔

---

[1] التقاضی کا مطلب مطالبہ ہے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حسن التقاضی کا باب قائم کیا ہے جسکی تفسیر علامہ عینیؒ نے حسن مطالبہ کیساتھ کی ہے

اور اگر امام مسجد میں پہلے ہی سے موجود ہو تو پھر مقتدیوں کو کس وقت کھڑا ہونا چاہیئے تو امام ترمذیؒ فرمار ہے ہیں کہ مقتدی اسوقت کھڑے ہوں کہ جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہے اور ایک قول کے مطابق حیعلتین کے وقت کھڑا ہونا چاہیئے یہ دونوں قول قریب قریب ہیں۔ یہ اس وقت ہے کہ لوگوں میں جلدی سے صفیں سیدھی کرنے کی عادت ہو۔

ہمارے زمانے میں حکم؟: اور اگر حالت وہ ہو جائے جو ہمارے زمانے میں ہے کہ لوگوں کو صفیں سیدھی کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے تو سب کو تکبیر شروع ہونے پہلے ہی کھڑا ہو جانا چاہیئے۔

باب ماذکر فی الثناء علی اللّٰہ والصلاۃ علی النبی ﷺ قبلَ الدُّعَاء

باب دعا سے پہلے اللہ جل مجدہ کی حمد وثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا یحیی بن آدمَ حَدَّثَنَا ابو بکر بن عیاش عن عاصم عن زر عن عبد اللّٰہ قال: کنتُ اُصَلِّی والنبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وابو بکرٍ وعمر معہ، فلماً جسلتُ بَدَاتُ بالثناء علی اللّٰہ ، ثم الصلاۃِ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم دعوتُ لنفسی ، فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: سَلْ تُعْطَہ، سَلْ تُعْطَہُ۔قال : وفی الباب عن فَضَالَۃَ بن عبیدٍ۔قال ابو عیسی: حدیث عبد اللّٰہ بن مسعودٍ حدیث حسن صحیحٌ۔قال ابو عیسی: ھٰذا الحدیث رواہ احمدُ بن حنبلٍ عن یحیی بن آدم مختصَراً۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ایک ساتھ تھے۔ جب میں بیٹھا تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا پھر اپنے لئے دعا کی تو آپ نے فرمایا مانگو جو مانگو گے عطا کیا جائیگا۔ دو مرتبہ اسی طرح فرمایا۔ اس باب میں فضالہ بن عبیدؓ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے احمد بن حنبل نے یہی حدیث یحییٰ بن آدم سے مختصراً بیان کی ہے۔

﴿تشریح﴾

(عن زرؒ) اکثر نسخوں میں زر بن حبیش ہے۔

اسکی ترکیبی حیثیت: (کنت اصلی والنبی ﷺ) یہ مبتداء ہے اس کی خبر جالس یا حاضر ہے ومعہ یہ لفظ خبر ہے وابو بکر وعمر کی۔ حدیث میں مذکور نماز ابن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی کی نفل نماز بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی فرض نماز کی جماعت میں سے ایک آدھ رکعت نکل گئی ہوگی اسکے پورا کرتے وقت یا اس کے بعد انہوں نے یہ فعل فرمایا۔

اس جملہ کے دومطلب ہیں: (سل تعطہ) اسکا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نماز کے اندر جو دعائیں مانگو گے تو تمہاری وہ دعائیں قبول ہونگی اس معنی کے مطابق فلما جلست کا مقصد تشہد کیلئے بیٹھنا ہوگا۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نماز کے بعد دعائیں مانگنے سے وہ دعائیں قبول ہونگی اس صورت میں جلست کا مطلب نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں بیٹھا۔ "تعطہ" اسمیں ھاء ھاءِ سکت بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ضمیر مفعول کی ہو۔ بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ابھار رہے ہیں کہ جس طرح ان صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی ہے اسی طرح تم بھی پڑھو کیونکہ اس طریقے پر پڑھی جانیوالی نماز قبولیتِ دعامیں زیادہ اثر رکھتی ہے۔

باب ماذُکِرَ فی تطییبِ المساجدِ

باب مسجدوں میں خوشبو کرنا

☆حدثنا محمد بن حاتم المودب البغدادی البصری حَدَّثَنَا عامر بن صالح الزبیری هو من ولد الزبیر حَدَّثَنَا هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة قالت: امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ببناءِ المساجدِ فی الدُّورِ، وان تُنَظَّفَ وَتُطَیَّبَ۔ ☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا عبدة ووکیع عن هشام بن عروة عن ابیه: ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم امر فذکر نحوه۔ قال ابو عیسی: وهٰذا اصحُّ من الحدیث الاول۔

☆حدثنا ابن ابی عمر حَدَّثَنَا سفیان بن عیینة عن هشام بن عروة عن ابیه: ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم امر فذکر نحوهٗ۔ قال سفیانُ: قولهٗ ببناء المساجد فی الدُّورِ یعنی القبائلَ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجد بنانے، انہیں صاف ستھرا رکھنے اوران میں خوشبو (چھڑکنے) کا حکم دیا۔ ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا پھر حدیث ذکر کی اوپر کی حدیث کے مثل اور یہ زیادہ صحیح ہے پہلی حدیث سے۔

روایت کی ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا پھر اوپر کی حدیث کے مثل ذکر کیا اور کہا سفیان نے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا دور میں مسجدیں بنانے کا یعنی قبیلوں میں۔

﴿تشریح﴾

دور کے دومطلب: (قولہ فی الدور) اس سے محلہ بھی مراد ہوسکتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ محلہ میں مسجد بناؤ اور دور

سے گھر بھی مراد ہو سکتے ہیں تو یہ مطلب ہوگا کہ گھروں میں نماز کیلئے جگہ مختص کرو۔

غرضِ مصنف: (ھذا اصح من الحدیث الاول) یعنی اس حدیث کا موقوف ہونا[1] حدیث کے مرفوع ہونے سے زیادہ اصح ہے۔

(وقال سفیان ببناء المساجد فی الدور) سفیان نے اس معنی کی تعیین اسلئے فرمائی کہ قاعدے کے اعتبار سے امر وجوب کیلئے ہوتا ہے لہٰذا محلّہ میں مسجد بنانا واجب ہے اور مساجد کے گھروں میں بنانے کا حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے[2]۔

باب ماجاء فی ان صلاۃَ اللیل و النھار مثنی مثنی

باب نماز رات اور دن کی (یعنی نفل) دو دو رکعت ہے

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا عبد الرحمٰن بن مھدی حَدَّثَنَا شعبة عن یعلی بن عطاء عن علی الازدی عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: صلاۃُ اللیل و النھار مثنی مثنی۔قال ابو عیسیٰ: اختلف اصحاب شعبةَ فی حدیث ابن عمر: فرفعه بعضُھم واوقفه بعضُھم۔ ورُوی عن عبد اللّٰہ العمری عن نافعٍ عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم نحوھذا۔ والصحیحُ مارُویَ عن ابن عمر: ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: صلاۃُ اللیل مثنی مثنی۔ وروی الثقات عن عبد اللّٰہ بن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم، ولم یذکروا فیه صلاۃ النھار۔ وقد روی عن عبید اللّٰہ عن نافعٍ عن ابن عمر: انه کان یصلی باللیل مثنی مثنی، وبالنھار اربعاً۔وقد اختلف اھل العلم فی ذٰلك: فرای بعضُھم ان صلاۃَ اللیل والنھار مثنی مثنی۔ وھو قول الشافعی، واحمد۔ وقال بعضھم: صلاۃ اللیل مثنی مثنی، وراو صلاۃَ التطوع بالنھار اربعا، مثلَ الاربع قبل الظھر وغیرِ ھا من صلاۃ التطوعِ۔ وھو قولُ سفیان الثوری، وابن المبارکِ، واسحٰق۔

﴿ترجمه﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات اور دن کی (نفل نماز) دو دو رکعت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں شعبہ کے شاگردوں نے اس حدیث میں اختلاف کیا ہے بعض اسے موقوف اور بعض مرفوع

---

[1] یعنی حضرت گنگوہیؒ کے کلام میں مجاز سے کام لیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا اس کے متصل ہونے سے زیادہ صحیح ہے ابن العربی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کا سند میں ذکر نہ ہونا زیادہ صحیح ہے۔

[2] حضرت گنگوہیؒ کے کلام کی وضاحت اس طرح ہے کہ سفیان نے جب یہ غور کیا کہ قاعدہ کی رو سے امر وجوب کیلئے ہوتا ہے اور گھروں میں مسجدوں کا بنانا واجب نہیں بلکہ صرف مستحب ہے اسلئے انہوں نے دوسرے احتمال کو ذکر کیا کہ دور سے مراد محلات ہیں نہ کہ گھر

روایت کرتے ہیں عبداللہ عمری، نافع سے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے مثل روایت کرتے ہیں جبکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت صحیح ہیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ کئی ثقہ راوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں لیکن وہ اس میں دن کی نماز کا ذکر نہیں کرتے۔ عبیداللہ سے بواسطہ نافع مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما رات کو دو دو رکعتیں اور دن میں چار چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ دن اور رات کی نماز دو دو رکعت ہے یہ شافعی اور احمد کا قول ہے بعض کا کہنا ہے کہ صرف رات کی نماز دو دو رکعت ہے اور اگر دن میں نوافل پڑھے جائیں تو چار چار پڑھے جائیں گے جیسے کہ ظہر وغیرہ سے پہلے کی چار رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ سفیان ثوری، ابن مبارک اور اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔

﴿تشریح﴾

لفظِ والنہار کا اضافہ صحیح نہیں: (صلاۃ اللیل والنہار مثنی مثنی) پہلے گزر چکا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر دو رکعت پر تشہد پڑھنا چاہیئے (دو رکعت پر سلام پھیرنا مراد نہیں) صحیح حدیث میں صرف صلاۃ اللیل مثنی مثنی لفظ النہار کے ذکر کے بغیر ہے یہ صحیح حدیث ہمارے مذہب کے مخالف نہیں کیونکہ ہم مفہوم مخالف کے قائل نہیں۔

(قولہ الصحیح ما روی عن ابن عمر عن النبی ﷺ انہ قال صلاۃ اللیل مثنی مثنی) یعنی ابن عمرؓ سے صحیح روایت جو ثقہ راویوں نے ذکر کی ہے اس میں الفاظ صلاۃ اللیل مثنی مثنی کے ہیں ابن عمرؓ کے علاوہ دوسرے راوی سے صلاۃ اللیل والنہار لیل ونہار دونوں الفاظ مروی ہیں۔

باب کیف کان یتطوع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالنہار

باب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن میں کس طرح نوافل پڑھتے تھے؟

☆حدثنا محمود بن غَیْلَانَ حَدَّثَنَا وھب بن جریر حَدَّثَنَا شعبة عن ابی اسحق عن عاصم بن ضمرة قال: سالنا علیا عن صلاة رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من النھار ؟ فقال: انکم لاتُطیقُونَ ذلك۔ فقلنا من اطاق ذلك منا فقال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کانت الشمسُ من ھھنا کھیئتھا من ھھنا عند العصر صلی رکعتین، واذا کانت الشمس من ھھنا کھیئتھا من ھھنا عند الظھر صلی اربعا ویصلی اربعا قبل الظھر وبعدھا رکعتین، وقبل العصرِ اربعا، یفصل بین کل رکعتین بالتسلیم علی الملائکة المقربین، والنبیین والمرسلین، ومن تبعھم من المومنین والمسلمین۔

☆حدثنا محمد بن المثنی حَدَّثَنَا محمد بن جعفرٍ حَدَّثَنَا شعبة عن ابی اسحق عن عاصم بن ضمرة

عن علی عن النبی ﷺ: نحوہ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن۔وقال اسحق بن ابراھیم: احسن شیء روی فی تطوع النبی ﷺ فی النھار ھذا۔وروی عن عبد اللّٰہ بن المبارک: انہ کان یضعف ھذا الحدیث۔ وانما ضعفہ عندنا۔ واللّٰہ اعلم۔ لانہ لایروی مثل ھذا عن النبی ﷺ الا من ھذا الوجہ، عن عاصم بن ضمرۃ عن علی۔ وعاصم بن ضمرۃ ھو ثقۃ عند بعض اھل العلم۔ قال علی بن المدینی: قال یحیی بن سعید القطان: قال سفیانُ: کنا نعرف فضل حدیث عاصم بن ضمرۃ علی حدیث الحرث۔

﴿ترجمہ﴾

عاصم بن ضمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن کی نماز کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا تم میں اتنی سکت نہیں۔ ہم نے کہا اگر جس میں اتنی طاقت ہو تو (وہ پڑھ لیگا) اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب سورج (یعنی مشرق میں) اتنا بلند ہو جائے جتنا عصر کی نماز کے وقت جانب مغرب میں بلند ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتیں پڑھتے پھر جب سورج مشرق کی طرف اتنا بلند ہو جائے جتنا جانب مغرب میں ظہر کے وقت بلند ہوتا ہے تو آپؐ چار رکعتیں پڑھتے پھر ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد دو رکعت پڑھتے۔ پھر عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے اور دو رکعتوں کے درمیان ملائکہ مقربین، انبیاء و رسل اور ان کے پیروکار مومنین، مسلمین پر سلام کے ذریعے فصل کرتے۔

☆ روایت کی ہم سے محمد بن مثنی نے ان سے محمد بن جعفر نے انہوں نے کہا روایت کی ہم سے شعبہ نے انہوں نے ابو اسحٰق سے انہوں نے عاصم بن ضمرہ سے انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر کی حدیث کے مثل۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اسحٰق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دن میں نوافل کے متعلق مروی احادیث میں یہ سب سے بہتر حدیث ہے۔ ابن مبارک اس حدیث کی تضعیف کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک ابن مبارک کی اس تضعیف کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی روایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف اسی سند (یعنی عاصم بن ضمرہ) سے مروی ہے۔ واللہ اعلم، یعنی عاصم بن ضمرہ بحوالہ علی بیان کرتے ہیں۔ عاصم بن ضمرہ بعض محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔ علی بن مدینی، یحیٰی بن سعید قطان کے حوالے سے کہتے ہیں کہ سفیان نے کہا ہم عاصم بن ضمرہ کی حدیث کو حارث کی حدیث کے مقابلے میں افضل سمجھتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

حضرت علیؓ کے قول کی تشریح: (فقال انکم لا تطیقون ذلک) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ علم سے مقصود عمل ہے تو انکے خیال میں جب مخاطب اس پر مداومت نہیں کر سکیں گے تو انہوں نے یہ چاہا کہ انہیں یہ نہ

بتلائیں تا کہ اس سوال کا جواب عبث نہ ہو جائے لیکن جب مخاطبین نے کہا کہ ہم میں جو طاقت رکھے گا وہ تو کرہی لیگا اور جو طاقت نہیں رکھ سکتا تو وہ طاقت رکھنے والوں کو بتا دیگا اسلیئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رات کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی۔

خلاصہ کلام: خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا اور انکے معاش کیلئے اتنا طویل وقت چھوڑا ہے کہ اس میں وہ روزی کمائیں اور دیگر مشاغل کو نمٹا سکتے ہیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سنن اور نوافل کی تعلیم دی تا کہ وہ ان پر عمل کر کے دین اور دنیا کی فضیلتوں کو جمع کرلیں اور آخرت کی زندگی میں خائب و خاسر لوگوں میں سے ہونے سے محفوظ رہیں لہٰذا اس حدیث میں دن کے نوافل پڑھنے کا مسنون طریقہ ذکر کیا گیا جس پر عمل کر کے انسان اپنے تمام اوقات کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے گا تا کہ غافلوں میں شمار نہ کیا جائے اور کلام الٰہی رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله کا مصداق بن جائے لہٰذا دن میں عصر کی نماز کے مقابلہ میں اشراق کی نماز اور ظہر کے مقابلہ میں چاشت کی نماز مشروع فرمائی۔ قلت: میرے خیال میں عشاء کی نماز تہجد کے مقابلہ میں مشروع ہوئی اگر چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نماز کو بطور [۱] شفقت کے ذکر نہیں کیا کیونکہ انہیں یہ ڈر تھا کہ وہ اپنے علم پر عمل نہ کریں گے تو خسارے میں پڑیں گے کیونکہ جس طرح عشاء کی نماز رات کے پہلے ثلث میں ہوتی ہے اسی طرح تہجد کی نماز رات کے اخیر ثلث میں ہوتی ہے۔

باب فی کراهية الصلاة فی لُحُفِ النساء

باب عورتوں کی چادر میں نماز پڑھنے کی کراہت کے بیان میں

☆حدثنا محمد بن عبد الاعلی حَدَّثَنَا خالد بن الحرث عن اشعث وهو ابن عبد الملك عن محمد بن سيرين عن عبد الله بن شقيق عن عائشة قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لايصلي في لحف نسائه۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔ وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم رُخْصَةٌ في ذلك۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کی چادروں میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میں اجازت بھی مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

غرضِ مصنف: مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی چادروں کو اوڑھ کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اس پر عورتوں کے دیگر کپڑوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] یا اسلیئے کہ چونکہ عشاء کی نماز اور تہجد کا آپس میں مدمقابل ہونا بالکل واضح تھا شاید اسلیئے حضرت علیؓ نے اسے ذکر نہیں فرمایا۔

وجہِ کراہت: اس کراہت کی وجہ فضل طہور المرأۃ میں گزری ہے کہ عورتیں پاکی اور ناپاکی کے معاملہ میں احتیاط نہیں کرتیں نیز عورتوں کی چادر اوڑھنے کی صورت میں نمازی کے دل میں عورتوں کے تصور کی وجہ سے غلط خیالات آسکتے ہیں کیونکہ اس کپڑے میں ایسی علامات ہوسکتی ہیں جس سے ذہن عورتوں کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔ بہرحال پھربھی جب تک یقینی طور پر نجاست نظر نہ آئے تو عورتوں کے کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہولیکن اگراس کپڑے میں نماز پڑھنے سے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو کہ غلط وساوس آئینگے تو اسکے لئے عورتوں کے استعمال کے کپڑے نماز میں استعمال کرنا ناجائز ہوگا لیکن اگر ان کپڑوں میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہوجائیگی۔

باب ذکر مایجوزُ من المشی والعمل فی صلاۃ التطوُّع

باب نفل نماز میں چلنا اور عمل قلیل کرنا جائز ہے

☆ حَدَّثَنَا ابو سَلَمَۃَ یحیی بن خَلفٍ حَدَّثَنَا بشرُ بن المفضل عن برد بن سنان عن الزهری عن عروۃَ عن عائشۃ قالت: جئتُ وَرسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلِّی فی البیتِ، والبابُ علیه مُغْلَقٌ، فَمَشٰی حتی فَتَحَ لی، ثم رجع الی مکانه۔ ووصفَتِ البابَ فی القبلۃِ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن غریب۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ گھر آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں نماز پڑھ رہے تھے اور گھر کا دروازہ بند تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چل کر میرے لئے دروازہ کھولا اور پھر اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دروازہ قبلہ کی طرف ہی تھا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔

﴿تشریح﴾

شرحِ حدیث: (قولہ ووصفت الباب فی القبلہ) یعنی دروازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا یہ دروازہ آپ کے دائیں یا بائیں جانب یا پیچھے نہ تھا تو اس سے اسطرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ (دروازہ کھولنے کیلئے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک اور سینہ قبلہ سے نہیں پھرا تھا اسلئے نماز فاسد نہ ہوئی۔

ایک جغرافیائی اشکال اور اسکا جواب: پہلے گزر چکا ہیکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجرۂ مبارکہ مسجد کی بائیں طرف تھا اور اس کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا تو یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کس طرح فرما رہی ہیں کہ دروازہ جہتِ قبلہ میں تھا (کیونکہ جب دروازہ مسجد میں کھلے گا تو دروازہ جانب مغرب میں قبلہ کی جانب ہوا جنوب میں دروازہ نہ تھا حالانکہ اس حدیث میں وصفت الباب فی القبلہ کے الفاظ ہیں۔ از مترجم)۔ جواب: اس حدیث باب کا مقصد یہ ہے کہ دروازہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے واقع تھا[1] لہٰذا آپ کو دروازہ کھولنے کیلئے قبلہ سے رخ موڑنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے کی جانب چلے۔ یہاں تک کہ جب دروازہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داہنے طرف قریب آ گیا تو آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولدیا پھر آپ علیہ السلام دوبارہ اپنی جگہ کیطرف لوٹ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دروازہ کی دیوار سے متصل نماز نہیں پڑھ رہے تھے لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے انتظار میں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں پڑی ہوگی بلکہ اس دیوار اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ جگہ تھی جس میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گزر سکتی تھیں۔

باب ماذكر في قراءة سورتين في ركعةٍ

باب ایک رکعت میں دو سورتیں پڑھنا

☆ حَدَّثَنَا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود قال: انبانا شعبة عن الاعمش قال سمعتُ ابا وائل قال: سال رجل عبد الله عن هذا الحرفِ غير آسن او ياسن قال: كل القرآن قرات غير هذا الحرف ؟ قال: نعم، قال: انَّ قوماً يقراء ونه ينثرونه نثر الدقل لايجاوز تراقيهم انى لاعرف السور النظائر التى كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرن بينهن، قال: فامرنا علقمة فساله؟ فقال: عشرون سورةً من المفصَّل، كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَقْرِنُ بين كلِّ سورتين في ركعةٍ۔ قال ابو عيسى: هٰذا حديث حسن صحيحٌ۔

---

[1] حضرت گنگوہیؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دروازہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنی طرف کی دیوار میں تھا لیکن (اس نماز پڑھنے والے واقعہ میں یہ دروازہ) آپ کے آگے واقع تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے چلے یہاں تک کہ جب دروازہ کے مد مقابل ہو گئے تو اسکو کھول دیا۔

دوسرا جواب: یہ بہترین توجیہ ہے ہمارے شیخ نے بذل میں ایک اور توجیہ بھی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دروازہ سے معروف دروازہ مراد نہیں جو مسجد کی جانب کھلتا تھا بلکہ یہ ایک دوسرا دروازہ تھا جو جانب قبلہ تھا اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے کمرہ میں واقع تھا۔

اشکال ثانی: جاننا چاہیئے کہ اس حدیث میں نسائی کی حدیث کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرا اشکال ہے وہ یہ کہ نسائی میں یہ الفاظ ہیں والباب على القبلة فمشى عن يمينه او يساره تو اس پر اشکال یہ ہیکہ جب دروازہ جانب قبلہ میں تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دائیں یا بائیں جانب چلنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ حضرت سہارنپوریؒ نے بذل میں اسکا بھی جواب دیا ہے جو وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

(از مترجم: اسکا نقشہ اس طرح ہوگا:
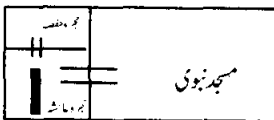
جنوب

مشرق | حجرہ عائشہ / باب حجرہ عائشہ / مسجد نبوی | مغرب

شمال

نوٹ: حجرہ عائشہ میں موٹی لکیر نبی کریم ﷺ کی سمت صلوٰۃ ہے

حضرت سہارنپوری کی توجیہ کے مطابق اس طرح ہوگا

حجرہ حفصہ / حجرہ عائشہ / مسجد نبوی
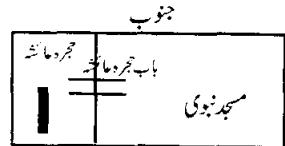
﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس قرأت "غیر آسن او یاسن" کے متعلق ایک آدمی نے پوچھا تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم نے اس کے علاوہ پورا قرآن پڑھ لیا ہے؟ اس نے کہا ہاں! ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کچھ لوگ قرآن کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی ردی کھجوروں کو بکھیرتا ہے اور قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ مجھے ایسی ہم معنی سورتوں کا علم ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں ملا کر پڑھتے تھے۔ راوی کہتے ہیں ہم نے علقمہ سے کہا تو انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان سورتوں کے بارے میں پوچھا تو اس پر انہوں نے فرمایا وہ مفصل کی بیس سورتیں ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رکعت میں دو دو سورتیں ملا کر پڑھتے تھے امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث میں آ رہا ہے کہ آپ ایک رکعت میں دو سورتوں کو جمع کرتے تھے تو اس سے ترجمۃ الباب ثابت ہو رہا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کے قول کی غرض: (سأل رجل عبدالله بن مسعود رضي الله عنه عن هذا الحرف غير اسن او ياسن الخ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اپنے علوم کے حاصل کرنے میں ترتیب کی رعایت رکھنی چاہیئے نیز اس طرف بھی اشارہ تھا کہ جب سوال کرنے والا ایسا سوال کریگا جو کہ اسکی سمجھ سے بالاتر ہو یا سائل کو اس سوال کے معلوم کرنے کی زیادہ ضرورت نہ ہو تو اسکے سوال کرنے پر ٹال مٹول سے کام لیا جا سکتا ہے اس طرح کہ گویا اس نے کوئی اور سوال کیا ہے یا اسکو کسی دوسری شئی کے متعلق کچھ باتیں بتا کر مشغول رکھا جائے یا یہ بتلایا جائے کہ یہ بات ابھی تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے اسطرح اور کوئی عذر کر دیا جائے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا تھا کہ سائل قرآن نہیں پڑھا ہوا اور اس سائل کے اس سوال کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ سبحانہ کے کلام کی تحقیق کرنا نہیں تھا بلکہ جسطرح عوام الناس بے مقصد بکثرت سوالات کرتے رہتے ہیں اور ایسی اشیاء کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں جو انکی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے تو بالکل اسی طرح اس شخص نے بھی ایسا ہی یہ سوال کیا تھا۔ البتہ یہاں انکے خیال کے برعکس اس سائل نے قرآن پڑھا ہوا تھا پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو یہ بتلایا کہ علم حاصل کرنے میں ترتیب کا خیال رکھنا چاہیئے لہٰذا تمہیں سب سے پہلے قرآن کی آیات میں غور و خوض کرنا چاہیئے اور قرآن کے نصوص اور اشارات میں خوب سوچ و بچار کرنی چاہیئے تم نے قرأت کی جو تحقیق شروع کر دی ہے تو یہ ایک زائد شئے ہے جسکی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور ضرورت پڑیگی بھی تو بعد میں پڑے گی[1]۔

---

[1] پھر لفظ آسن میں دو قرأتیں ہیں بالمد اور قصر کیساتھ۔ یاسن ی کے ساتھ مشہور قرأت میں نہیں ہے۔

سوالِ مقدر کا جواب: (ان قوما ینثرون نثر الدقل) اس سے اس شخص کے سوال کا جواب دینا مقصود ہے لیکن سوال یہاں پر مذکور نہیں سوال یہ تھا کہ اس نے کہا تھا کہ میں نے طوال مفصل ایک رکعت میں پڑھ لی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس پر رد کرتے ہوئے فرمایا کہ بہت سے لوگ اس طرح قرآن پڑھتے ہیں کہ اس سے لذت حاصل نہیں کرتے اور شعر کے کاٹنے کی طرح قرآن کے حروف کاٹ دیتے ہیں تم نے بھی شاید اسی طرح پڑھا ہوگا۔

وجہ تشبیہ: (الدقل) کہتے ہیں ردی کھجوروں کو اس سے ان کی قرأت کی کیفیت بتلا رہے ہیں کہ سامع کے ذہن میں اس کی تصویر کشی اس طرح ہو جائے کہ اس شخص کو ناقص قرآن پڑھنا محسوس ہی نہیں ہوتا حالانکہ اس میں بڑی کمی واقع ہوئی ہے۔ نیز اس میں وہ شیئے جو عموماً واقع ہوتی رہتی ہے اور لوگ اسے غلطی بہت کم سمجھتے ہیں اسکی نشاندہی بھی مقصود ہے جس طرح انسان جب گھٹیا کھجور کھاتا ہے تو اسے اپنے منہ میں بہت زیادہ نہیں دباتا بلکہ صرف ہلکے سے چبانے پر اکتفاء کرتا ہے اسی طرح یہ قراء حضرات الفاظ قرآن کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے اور نہ ہی ان حروف کو تجوید سے پڑھتے ہیں بلکہ قرآن کے نثر کو اس تیزی سے پڑھتے ہیں اور اس کے حروف اس طرح ادا کرتے ہیں جیسے ردی کھجور کہ اس میں کوئی مٹھاس نہیں ہوتی کہ اسے چوسیں اور اس سے لذت حاصل کریں بلکہ منہ میں ڈالتے ہی پھینک دیتے ہیں بخلاف عمدہ اور رطب کھجور کے کہ اسے انسان اس وقت تک چباتا رہتا ہے جب تک کہ اس میں مٹھاس باقی ہو یہی حال تلاوت کا بھی ہے۔

شرحِ حدیث: (لا یجاوز تراقیھم) یعنی اس کی قرأت اوپر کی طرف نہیں چڑھتی تو یہ کنایہ ہوگا قرآن کے عدمِ قبول ہونے سے یا اس کی قرأت اسکے دل میں داخل نہیں ہوتی تو مطلب ہوگا کہ انکی تلاوت تاثیر سے خالی ہوتی ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ترتیل میں مبالغہ کئے بغیر بکثرت قرآن پڑھنا افضل ہے یا قرآن کی تھوڑی مقدار تجوید کے ساتھ اور اس میں مبالغہ کر کے پڑھنا افضل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی تلاوت جو تجوید کے ساتھ کی جائے اگر چہ تھوڑی ہی ہو یہ بہت افضل ہے اس تلاوت سے جو مقدار میں زیادہ ہو لیکن اس میں حروف کی صحیح طرح ادائیگی نہ ہو اور نہ ہی ان حروف کو انکے مخارج سے ادا کیا گیا ہو۔

سور النظائر کی وجہ تسمیہ: (انی لاعرف النظائر اللاتی الخ) ان سورتوں کو نظائر اسلئے کہا گیا کہ ان سورتوں کا مضمون ایک دوسرے کے قریب تھا یا ان سورتوں کی مقدار یا انکی آیات کی تعداد تقریباً ایک دوسرے کے برابر تھی لیکن ان بیس سورتوں میں سے ہر سورت کا بقیہ سورتوں کے مساوی ہونا ضروری نہیں بلکہ ان بیس سورتوں میں سے ایک رکعت میں جو دو سورتیں پڑھی جا رہی ہیں ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مشابہہ ہونا چاہیئے ۔ واللہ اعلم بالصواب

باب ماذُكرَ فی فضل المشی الی المسجد، ومایُكتَبُ له من الاجر فی خُطاهُ

باب مسجد کی طرف چلنے کی فضیلت اور ہر قدم پر جو ثواب لکھا جاتا ہے اس کا بیان

☆حدثنا محمود بن غَيْلَانَ حَدَّثَنَا ابو داود قال: انبانا شعبة عن الاعمشِ سمع ذكوان عن ابی هريرة عن النبی صلى الله عليه وسلم قال: اذا توضا الرجلُ فاحسن الوضوء ثم خرج الى الصلاة، لايخرجه او قال لاينهزه الاايا ها: لم يَخْطُ خطوة الارفعه الله بها درجة او حط عنه بها خطيئة۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کرکے نماز کیلئے نکلتا ہے بشرطیکہ اسے نماز کے علاوہ کسی اور چیز نے نہ نکالا ہو یا فرمایا نہ اٹھایا ہو تو اس کے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا اور ایک گناہ مٹاتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

غرضِ مصنف: یعنی مسجد جاتے ہوئے ہر قدم پر کس قدر ثواب لکھا جاتا ہے اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ دور دراز گھر سے اور اندھیروں میں اور رات کے وقت ہر حال میں نماز مسجد میں ادا کرنی چاہیئے (الا رفعه الله بها درجة او حط عنه بها خطيئة) ایک درجہ کا بلند ہونا گناہ کے معاف ہونے کو مستلزم ہے کیونکہ جس آدمی کے گناہ بہت سارے ہوں تو جب بھی اسکا ایک گناہ معاف ہوتا ہے تو گناہ کی معافی سے پہلے جو اس کو درجہ حاصل تھا اس سابقہ درجہ سے ایک درجہ اسکا بلند ہو جاتا ہے، یہ بھی کہہ سکتے ہیں جس آدمی پر گناہ ہونگے تو اس کے حق میں تو ہر ہر قدم پر گناہ معاف ہونگے اور جو آدمی پہلے تو یہ کر چکا ہے یا کوئی ایسا کام کر چکا ہے جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن گیا تو ایسے شخص کا مسجد کی طرف چلنا اسکے ان افعال کا کفارہ بنے گا[1] جو اس پر ادا کرنے ضروری تھے پھر یہ شخص گناہوں کی آلودگی سے پاک صاف ہو جائیگا اور باقی راستے میں اس کے یہ قدم اسکے درجات کی ترقی کا سبب بنیں گے۔ واللہ اعلم۔ او حط عنه میں او شک کیلئے بھی ہو سکتا ہے اور تردید کیلئے بھی۔

---

[1] **ایک اشکال وجواب:** یہاں تو ایسا شخص مراد ہے جسکا کوئی گناہ ہی نہیں تو پھر اسکے یہ قدم کس چیز کا کفارہ بنیں گے؟ جواب: ما علی الرجل سے مراد عام ہے گناہ وغیرہ خلافِ اولیٰ کام لہٰذا خلافِ اولی کاموں کیلئے بھی یہ قدم اٹھانا کفارہ بنیں گے۔

باب ماذکر فی الصلاۃ بعد المغرب انه فی البیتِ افضلُ

باب مغرب کے بعد گھر میں نماز پڑھنا (نوافل) افضل ہے

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا ابراهیم بن ابی الوزیر البصری ثقة حَدَّثَنَا محمد بن موسی عن سعد بن اسحق بن کعب بن عجرة عن ابیه عن جده قال: صلّی النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم فی مسجد بنی عبدِ الاشهل المغربَ، فقام ناسٌ یَتَنَفَّلُونَ، فقال النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم: علیکم بهٰذه الصلاة فی البیوتِ۔قال ابو عیسی: هٰذا حدیث غریب من حدیث کعب بن عجرة لانعرفه الا من هٰذا الوجه۔ والصحیح مارُوِیَ عن ابن عمر قال: کانَ النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم یُصَلِّی الرکعتین بعدَ المغربِ فی بیته۔ قال ابو عیسی: وقدرُوِیَ عن حُذَیْفَةَ: ان النبیَّ صلی اللّٰه علیه وسلم صلّی المغربَ، فما زال یصلّی فی المسجد حتی صلّی العشاءَ الآخِرَةَ۔ففی هٰذا الحدیثِ دلَالَةٌ اَنَّ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم صلّی الرکعتین بعد المغرب فی المسجد۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت سعد بن اسحٰق بن کعب بن عجرہ اپنے والد سے اور وہ انکے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عبدالاشہل کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی پس کچھ لوگ نفل پڑھنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کو چاہیئے کہ یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھو۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے ہم اس روایت کے علاوہ اسے نہیں جانتے۔اور صحیح وہ ہے جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کے بعد گھر میں دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز پڑھی اور پھر عشاء تک نماز پڑھنے میں مشغول رہے پس اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد مسجد میں بھی نماز پڑھی۔

﴿تشریح﴾

شرح حدیث: ھٰذہ کے مرجع میں احتمالات: (قولہ علیکم بھٰذہ الصلوٰۃ فی البیوت) اس سے اشارہ مغرب کے بعد کی نفل نماز کی طرف ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ صرف مغرب کی سنتیں اور نفل گھر میں پڑھنے چاہیئے باقی نمازوں کے بعد کی سنتیں اور نوافل مسجد میں جیسا کہ بعض لوگوں نے بھٰذہ الصلوٰۃ کے اشارے سے یہ سمجھا ہے کہ خاص مغرب کی سنتیں مسجد میں پڑھنا ہے نہ کہ اس کے علاوہ، صحیح بات یہ ہے کہ مغرب کی سنتوں کی طرف خصوصیت سے اسلیئے اشارہ فرمایا کہ صحابہ کرامؓ

اس مقام پر مسجد ہی میں مغرب کی سنتیں وغیرہ پڑھ رہے تھے اسلیئے مغرب کی ان سنتوں سے منع فرمایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بھذہ الصلاۃ سے تمام نوافل کی جنس کی طرف اشارہ ہولیکن اس صورت میں بظاہر علیکم بھذہ الصلوات جمع کے صیغہ کے ساتھ کہنا چاہیئے تھا۔

یہ حکم استحبابی ہے: بہرحال حدیث باب میں یہ حکم وجوب کیلئے نہیں [1] ہے کہ گھر میں ہی سنتیں پڑھنا ضروری ہو البتہ اہل ظواہر کی ایک جماعت کے ہاں یہ حکم [2] وجوب کیلئے ہے تو ان اہل ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ خاص یہ نماز (نوافل) گھر میں پڑھنا ضروری ہے۔

مصنف کا اہلِ ظواہر پر رد: لیکن امام ترمذیؒ نے انکے رد میں اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث غیر معمول بہ ہے بلکہ امت کا تعامل اس پر ہے کہ سنتیں مسجد میں پڑھنا جائز ہے کیونکہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز پڑھی پھر عشاء تک مسجد میں نماز میں مشغول رہے تو وہاں "فما زال یصلی" کے جملہ میں یہ احتمال ہی نہیں کہ مغرب کے بعد کی سنتیں گھر میں پڑھی ہوں پھر دوبارہ مسجد تشریف لے آئے ہوں۔

باب ماذکر فی الاغتسال عند مایُسْلِمُ الرجلُ

باب جب کوئی شخص مسلمان ہوتو غسل کرے

☆حدثنا محمد بن بشار حَدَّثَنَا عبد الرحمن بن مهدی حَدَّثَنَا سفیانُ عن الاغر بن الصباحِ عن خلیفة بن حصین عن قیس بن عاصم انه اسلم فامر النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم ان یغتسلَ بماء وسدر۔ قال: وفی الباب عن ابی هریرةَ۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن لانعرفه الّا من هذا الوجه والعملُ علیه عند اهل العلم: یَسْتَحِبُّونَ للرجل اذا اسلم ان یغتسلَ ویغسلَ ثیابَه۔

﴿ترجمه﴾

حضرت قیس بن عاصم سے راویت ہے کہ وہ اسلام لائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پانی اور بیری کے پتوں سے نہانے کا حکم دیا۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں اور اسی پر اہل علم کا عمل ہے کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرے تو اس کیلئے غسل کرنا اور کپڑے دھونا مستحب ہے۔

---

[1] ابن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ مغرب کی سنتیں مسجد میں پڑھنا صحیح نہیں اوجز المسالک۔

[2] ابن عبدالبرؒ نے ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدک مسجد میں مطلقاً نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ اوجز المسالک

﴿تشریح﴾

غسلِ اسلام کا حکم: یہ غسل اسلام سنت ہے تا کہ جس طرح اس کا باطن کفر اور شرک کی ناپاکیوں سے پاک ہوا ہے اسی طرح اس کا ظاہر بھی ان گندگیوں سے پاک ہو جائے جو اس پر کفر کی علامتیں اور میل کچیل لگا ہوا ہے اسی وجہ سے اس کو چاہیے کہ اپنی چوٹیوں (لمبے بالوں) کو کاٹے اور مشرکانہ پٹکے کو ہٹائے لیکن غسل کی وجہ[1] سے مسلمان ہونے میں تاخیر نہ کرے بلکہ ہر حالت میں اسلام لانے میں جلدی کرنا ضروری ہے۔ (بماء وسدر) بیری کے[2] پتے پانی میں ڈالنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس پانی سے میل کچیل آسانی سے دور ہو جاتا ہے اسلئے میت کے غسل میں پانی کے اندر بیری کے پتوں کو ڈالا جاتا ہے کیونکہ میت کو رگڑنا نہیں چاہیئے۔

باب ماذكر من التسمية فى دخول الخلاء

باب بیت الخلاء جاتے وقت بسم اللہ پڑھے

☆ حدثنا محمد بن حميد الرَّازِيُّ حَدَّثَنَا الحكمُ بن بشير بن سلمان حَدَّثَنَا خلاد الصفار عن الحكم بن عبد الله النصرى عن ابى اسحق عن ابى جحيفة عن على بن ابى طالب رضى الله عنه ان رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: ستر مابين اعين الجن وعورات بنى آدم اذا دخل احدُهم الخلاء ان يقولَ: بسم اللهِ۔ قال ابو عيسى: هذا حديث غريب، لانعرفه الا من هذا الوجه۔ واسناده ليس بذاك القوىِّ۔ وقد رُوىَ عن انسٍ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم شىء فى هذا۔

---

[1] **غسلِ اسلام کے حکم میں ائمہ اربعہ کے مذاہب:** یعنی شافعیہ اور حنفیہ کے نزدیک یہ غسل سنت ہے اور حنابلہ و مالکیہ کے نزدیک واجب ہے امام ترمذیؒ سے تعجب ہے کہ انہوں نے کس طرح مسئلہ کو مجمل چھوڑ دیا انہوں نے تمام اہل علم سے مطلقاً استحباب نقل کیا ہے لیکن صحیح بات وہ ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی۔

اہم تنبیہ: یاد رکھنا چاہیئے کہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہ غسل اسوقت مستحب ہے جبکہ حالتِ کفر میں کوئی غسل کو واجب کرنے والی شئی نہ پائی جائے لیکن اگر غسل کو واجب کرنے والی شئی پائی گئی تو شافعیہ کے نزدیک اسلام کے بعد غسل کرنا ضروری ہے اگر چہ اس نے اسلام سے پہلے غسل کر لیا ہو لیکن ہمارے نزدیک اگر وہ اسلام سے پہلے غسل کر چکا ہے تو اسپر غسل ضروری نہیں۔

وجہِ اختلاف: خلاصہ یہ ہے کہ حالتِ کفر میں کافر کا غسل ہمارے نزدیک معتبر ہے شافعیہ کے نزدیک غیر معتبر۔ مسئلہ کی تفصیل بذل المجہود پر میرے حواشی میں موجود ہے۔

[2] جس پانی کے اندر بیری کے پتے ڈالے جائیں اس مسئلہ میں یہ حدیث ماء مقید کے مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل ہے ائمہ ثلاثہ کا اس میں مشہور اختلاف ہے اس کی تفصیل اوجز کی کتاب الجنائز میں میں نے ذکر کی ہے۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنوں کی آنکھوں اور انسانوں کی شرمگاہوں کا پردہ یہ ہے کہ جب کوئی بیت الخلاء جائے تو بسم اللہ پڑھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، ہم اسے اس کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور اس کی سند قوی نہیں حضرت انس سے بھی اس باب میں کچھ مروی ہے۔

﴿تشریح﴾

اس حدیث باب سے معلوم ہو رہا ہے کہ صرف لفظ بسم اللہ پڑھنا چاہیئے۔ آبادی میں جو بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں ان میں داخل ہونے سے قبل یہ بسم اللہ پڑھے اور صحراء میں ستر کھولنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیئے۔

باب ماذکر من سیما هٰذه الامة یوم القیامة من آثار السجودِ والطهور

باب قیامت کے دن اس امت کی علامت وضو اور سجدوں کے نشانات مذکور ہونے کا بیان

☆حدثنا ابو الولید احمد بن بکار الدمشقی ثنا الولیدُبن مسلمٍ قال: قال صفوان بن عمرو: اخبرنی یزیدُ بن خمیر عن عبد اللّٰه بن بسر عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: امتی یومَ القیامةِ غر من السجود، محجلون من الوضوءِ۔ قال ابو عیسی: هٰذا حدیث حسن صحیحٌ غریب من هٰذا الوجه، من حدیث عبد اللّٰه بن بسر۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے چہرے سجدوں کی وجہ سے روشن ہونگے اور ہاتھ پیر وضو کی وجہ سے چمک رہے ہوں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث اس سند سے حسن صحیح غریب ہے۔ یعنی عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی روایت سے۔

﴿تشریح﴾

(امتی یوم القیامة غر من السجود محجلون من الوضوء) یہ امتِ محمدیہ کی علامت ہوگی۔

گذشتہ امتوں میں وضو مشروع تھا؟؟: ایک قول کے مطابق گذشتہ امتوں میں وضو مشروع ہی نہ تھا بلکہ انکے صرف انبیاء علیہم السلام وضو کرتے تھے، دوسرا قول یہ ہے کہ وضو اس امت محمدیہ کی خصوصیت نہیں بلکہ وضو سے ہاتھ پاؤں کا روشن ہونا امت محمدیہ کی خصوصیت ہے بہر حال یہ اس امت کی علامت ہوگی جس روز قیامت یہ امت پہنچانی جائیگی۔

غرضِ مصنف: اس حدیث سے مقصود باوضو رہنے کی ترغیب ہے اور نمازوں کی مداومت پر برانگیختہ کرنا ہے کیونکہ وضو بذاتِ خود کوئی عبادت نہیں جب تک کہ اس سے عبادات نہ کی جائیں۔ سجدوں کی وجہ سے پیشانی کے روشن ہونے کا اس حدیث میں ذکر ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وضو کا اثر پیشانی پر نہ ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیشانی پر سجدوں کا اثر غالب ہوگا کیونکہ سجدہ میں اصل عضو پیشانی ہی تو ہوتی ہے، پیشانی کے علاوہ دوسرے اعضاء میں شاید وضو کا اثر[1] سجدوں کے اثرات پر غالب ہوگا یا اسکے برابر ہوگا اسلئے دوسرے اعضاء میں لفظ سجود ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یوں فرمایا (غر من السجود محجلون من الوضو)۔ تحجیل لغت میں گھوڑوں کے پاؤں کی سفیدی کو کہتے ہیں۔

باب مایُستَحَبُّ من التَّیَمُّنِ فی الطُّهورِ

باب وضو اور پاکی دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا ابو الاحوص عن اشعث بن ابی الشعثاء عن ابیه عن مسروقٍ عن عائشة انَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان یحب التیمن فی طهوره اذا تطهر، وفی ترجله اذا ترجل، وفی انتعاله اذا انتعل۔ قال ابو عیسی: هذا حدیث حسن صحیحٌ۔ وابو الشعثاء اسمه سلیم بن اسود المحاربیُّ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طہارت (وضو وغیرہ) میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند کرتے تھے اسی طرح کنگھی کرتے وقت اور جوتی پہنتے وقت بھی داہنی طرف سے ہی شروع کرنا پسند کرتے تھے۔ ابوشعثاء کا نام سلیم بن اسود محاربی ہے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

داہنے ہاتھ اور بائیں ہاتھ سے کئے جانے والے کام: وہ تمام افعال جو کہ معزز و قابل تکریم ہیں جیسے کنگھی کرنا، جوتے پہننا ان سب میں داہنے طرف سے ابتداء کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت ہے اور جو افعال اس کے برعکس ہیں اور خسیس و رذیل قسم کے ہیں تو ان میں بائیں طرف سے بھی ابتداء کرنا مستحب ہے مثلاً موزے اتارنا کپڑے اتارنا، بیت الخلاء میں داخل ہونا وغیرہ، کانوں کے مسح میں داہنے طرف سے ابتداء نہ ہوگی (بلکہ اکٹھے مسح کیا جائیگا) کیونکہ کان سر کے تابع ہیں اور سر کے مسح میں دایاں و بایاں نہیں اسلئے اس میں داہنی طرف[2] سے مسح تو ہوتا نہیں لہٰذا سر کے تابع کان کا

---

[1] فَعَلٌ یہ لعل کی ایک لغت ہے جیسا کہ علماء نحو نے لفظ لعل میں گیارہ لغتیں بیان کرتے ہوئے اس میں ایک لغت یہ بھی لکھی ہے۔

[2] یعنی سر کا مسح اکٹھے ہی ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے اس میں دائیں حصہ کا بائیں حصہ سے پہلے مسح نہیں کیا جاتا۔

بھی اکٹھے ہی مسح ہوگا کیونکہ تابع متبوع کی مخالفت نہیں کرتا۔

باب قدر مایُجزِئُ من الماء فی الوضوء

باب وضو میں کتنا پانی کافی ہے اس کا بیان

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا وکیع عن شریك عن عبد اللّٰه بن عیسی عن ابن جبر عن انس بن مالكٍ ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: یجزی فی الوضوء رطلان من ماء۔قال ابو عیسی: هذا حدیث غریب، لانعرفه الا من حدیث شریك علی هذااللفظ۔وروی شعبة عن عبد اللّٰه بن عبد اللّٰه بن جبر عن انسٍ بن مالكٍ اَنَّ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان یتوضا بالمکوك، ویغتسل بخمسة مَکَاکِیَّ۔ وروی عن سفیان الثوری عن عبد اللّٰه بن عیسی عن عبد اللّٰه بن جبرٍ عن انسٍ: ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان یتوضا بالمدویغتسلُ بِالصَّاعِ۔ وهذا اصحُّ من حدیث شریكٍ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وضو کیلئے دو رطل پانی کافی ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ہم اس کے یہ الفاظ شریک کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے، شعبہ،عبداللہ بن عبداللہ بن جبیر سے اور وہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکوک (پانی) سے وضو فرماتے اور غسل کیلئے پانچ مکوک (پانی) استعمال فرماتے۔

﴿تشریح﴾

تکرار مسئلہ کی توجیہ: مصنف اس مسئلہ کو پہلے بیان فرما چکے ہیں لیکن پہلے الگ عنوان تھا[1] اور یہاں پر دوسرا عنوان ہے نیز محدثین کرام خصوصاً امام ترمذیؒ تکرار کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

غرضِ مصنف: (یجزی فی الوضوء رطلان) یہاں پر مصنف کی اس حدیث کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ شروع میں جو یہ بیان کیا گیا تھا کہ وضو اتنے پانی سے کرنا سنت ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ اتنا پانی وضو میں استعمال کیا جا سکتا ہے یہ پانی کی مقدار کوئی ایسی مقدار نہیں[2] کہ اس پر کمی بیشی ناجائز ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے خود ثابت ہو رہا ہے کہ

---

[1] مصنف رحمہ اللہ کتاب الطہارۃ میں باب الوضو بالمد قائم کر چکے ہیں۔

[2] ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ وضو اور غسل کی اتنی مقدار پانی سے مراد تعیین نہیں۔ابن قدامہ نے اکثر اہل علم کا یہی مذہب اختیار کیا ہے اور اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اختلاف نقل کیا ہے لیکن یہ غلط ہے ابن رسلان کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ابن شعبان مالکی کا اختلاف ہے

دو رطل سے زیادہ پانی سے بھی وضو ہو سکتا ہے (کیونکہ یہاں پر لفظ تجزی وارد ہوا ہے)۔

صاع کتنے رطل کا ہوتا ہے؟: جاننا چاہیئے کہ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ثابت ہو رہا ہے کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے کیونکہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اس پر تو اتفاق ہے لیکن مد کی تعیین میں اختلاف ہے۔

حدیث باب سے احناف کا استدلال: تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے یہ بیان فرمایا کہ وضو کا پانی دو رطل ہوتا ہے معلوم ہوا کہ اس حدیث سے مد کی تفسیر کی گئی ہے۔ چنانچہ راوی ابن جبر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو اس حدیث کے راوی ہیں...... سے نقل کرتے ہیں کہ وضو میں دو رطل پانی کافی ہے۔ یہی راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکوک سے وضو فرماتے اور پانچ مکوک سے غسل فرماتے تھے۔

لفظ مکوک کے معنی مرادی کی تعیین: اس حدیث میں لفظ مکوک ایک مشترک لفظ ہے جس کے دو معنی ہیں: ا۔ مد، ۲۔ صاع، اور یہاں پر اس لفظ کو خمسۃ مکاکی کے مقابلہ میں ذکر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں مکوک سے مد ہی مراد ہے تو اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ ایک مد دو رطل کا ہوتا ہے ورنہ ابن جبر نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو دو روایات نقل کی ہیں انمیں تعارض لازم آئیگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابن جبر راوی انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وضو کا پانی دو رطل ہے اور یہی راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکوک کے بقدر پانی سے وضوء فرماتے۔ یہاں مکوک سے صاع مراد لینا صحیح نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاع سے وضو کرنے کا ثبوت کسی روایت سے نہیں ہوتا لہٰذا مکوک سے لازماً مد مراد ہوگا معلوم ہوا کہ ایک مد دو رطل کا ہوتا ہے اسطرح ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہ رہیگا۔

ایک اہم اشکال اور اسکا جواب: مخالفین یہ اعتراض کرتے ہی کہ انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مختلف فعل نقل کئے ہیں دونوں سے ایک ہی واقعہ مراد نہیں لیا جائیگا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ میں ایک مد پانی سے وضو فرمایا اور دوسرے واقعہ میں دو مد پانی سے؟ جواب: ہم دوسری روایت سے استدلال کرینگے جس میں تصریح ہے کہ "انہ توضا بالمد[1] رطلین" نیز یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ صاعِ عراقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج تھا، ہشام[2] کی طرف اسکی نسبت اسلیئے نہیں کی کہ وہ اس کا واضع تھا بلکہ چونکہ اسکے زمانہ میں بہت سے ممالک میں یہ صاع عراقی مشہور ہو گیا اسلیئے اسکی طرف نسبت کی گئی۔

---

[1] امام طحاویؒ وغیرہ نے حدیث کے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں اور حضرت سہارنپوریؒ نے بذل میں ان احادیث پر تفصیلی کلام ذکر کیا ہے۔

[2] اور حضرت عمرؓ کا صاع بھی اتنا ہی تھا جیسا کہ امام طحاویؒ نے مختلف سندوں سے اس کو ذکر کیا ہے اور حضرت سہارنپوری نے بذل میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

باب ماذكر فی نضح بول الغلام الرضيع

باب دودھ پیتے بچے کے پیشاب پر پانی کا چھڑکاؤ کافی ہے

☆ حَدَّثَنَا محمد بن بشار حَدَّثَنَا معاذ بن هشام حدثنی ابی عن قتادة عن ابی حرب بن ابی الاسود عن ابيه عن علی بن ابی طالب رضی الله عنه ان رسول اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم قال فی بَولِ الغُلَامِ الرَّضِيعِ: يُنضَحُ بولُ الغلامِ ويُغسَلُ بولُ الجاريةِ۔ قال قتادةُ: وهذا مالَمْ يَطْعَمَا، فإذا طَعِمَا غُسِلاَ جميعاً۔ قال ابو عيسى: هذا حديث حسن صحيح۔ رَفَعَ هِشَامٌ الدَّسْتَوائی هذا الحديثَ عن قتادةَ، واوقفه سعيدُ بن ابی عروبة عن قتادة ولم يرفعه۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیتے بچے کے پیشاب کے بارے میں فرمایا کہ لڑکے کے پیشاب پر پانی کا چھینٹا مارا جائے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے۔ قتادہ کہتے ہیں یہ اس صورت میں ہے جب تک لڑکا لڑکی کھانا نہ کھاتے ہوں (یعنی ان کی غذا صرف ماں کا دودھ ہو) جب لڑکا لڑکی کھانا کھانے لگیں تو اس صورت میں دونوں کا پیشاب دھویا جائیگا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اس حدیث کو ہشام دستوائی نے قتادہ کے واسطے سے مرفوع اور سعید بن ابوعروبہ نے قتادہ ہی کے واسطے سے موقوف روایت کیا ہے۔

﴿تشریح﴾

(ويغسل بول[1] الجارية) لڑکی کے پیشاب کو دھونے کا حکم اسلئے دیا گیا کہ اسکے پیشاب میں چکناہٹ ہوتی ہے بخلاف لڑکے کے پیشاب کے کہ اس میں کم دھونا (غسل خفیف) بھی کافی ہے جس کو حدیث میں رش کہا گیا ہے۔

باب ماذُكِرَ فی الرخصة للجنب فی الاكل والنوم اذا توضا

باب جب جنبی آدمی وضو کرلے تو اس کیلئے کھانے اور سونے کی اجازت ہے

☆حدثنا هناد حَدَّثَنَا قبيصة عن حماد بن سلمة عن عطاء الخراسانی عن يحيى بن يَعْمَرَ عن

---

[1] **مسئلہ میں مذاہب ثلثہ**: اس مسئلہ میں علماء کے تین مذہب ہیں اور شوافع سے یہی تینوں روایتیں مروی ہیں: ا۔ شافعیہ کا راجح مذہب اور یہی امام احمد، اسحٰق، داؤد ظاہری کا مذہب ہے کہ بچے کے پیشاب میں پانی چھڑک دینا کافی ہے اور بچی کے پیشاب کو دوسری تمام ناپاک چیزوں کی طرح دھونا ضروری ہے، ۲۔ امام اوزاعی کے مذہب میں دونوں کے پیشاب میں نضح کافی ہے، ۳۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور تمام اہل کوفہ کا مذہب یہ ہے کہ دونوں کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے۔ ھٰکذا فی الاوجز

• عمار: ان النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رَخَّصَ لِلجنبِ اذاراد ان یَاکلَ او یشربَ او ینامَ ان یتوضَّأَ وُضُوءَہُ للصلاۃِ۔ قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن صحیح۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی کے بارے میں رخصت دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ کھانا پینا یا سونا چاہے تو اس طرح وضو کرے جیسا نماز کیلئے وضو کرتا ہے امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

(قولہ ان یتوضا وضوءہ للصلوٰۃ) اس وضو کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بے وضوء کھانا پینا یا سونا خلافِ اولیٰ ہے اسلئے نماز والا وضوء کرنا بہتر ہے، البتہ کلی اور ہاتھوں کو گٹوں تک دھونا بھی کافی ہے۔

باب ماذکر فی فضل الصلاۃِ

باب نماز کی فضیلت کے بیان میں

☆حدثنا عبد اللّٰہ بن ابی زیاد القطوانی الکوفی حَدَّثَنَا عبید اللّٰہ بن موسی حَدَّثَنَا غالب ابو بشر عن ایوب بن عائذ الطائی عن قیس بن مسلم عن طارق بن شھاب عن کعب بن عجرۃ قال: قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: أُعِیذُکَ بِاللّٰہِ یاکعبُ بن عجرۃَ من اُمَرَاءَ یکونون من بعدی فمن غشی ابوابھم فصدقھم فی کذبھم واعانھم علی ظلمھم فلیس منی ولست منہ، ولا یردُ علی الحوضَ، ومن غشی ابوابھم اولم یغش فلم یصدقھم فی کذبھم ولم یعنھم علی ظلمھم فھو منی وانا منہ، وسیرد علی الحوضَ، یاکعب بن عجرۃ! الصلاۃُ برھانٌ، والصومُ جنۃ حصینۃ والصدقۃ تطفی الخطیئۃ کمایطفیُٔ الماءُ النار، یاکعب بن عجرۃ انہ لایربو لحم نبت من سحت الا کانت النار اولی بہ۔قال ابو عیسی: ھذا حدیث حسن غریب من ھذا الوجہ، لانعرفہ الا من حدیث عبید اللّٰہ بن موسی۔و أَیُّوبُ بن عَائِذٍ الطائی یُضَعَّف، ویقال کان یَرَی رَاَیَ الإِرْجَاءِ۔وسالت محمداً عن ھذا الحدیث فلم یعرفہ اِلَّا من حدیث عُبید اللّٰہ بن موسی، واسْتَغْرَبَہُ جدًّا۔☆وقال محمدٌ: حَدَّثَنَا ابن نُمَیْر عن عُبید اللّٰہ بن موسی عن غالبٍ بھذا۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے کعب بن عجرہ میں

تجھے ان امراء سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں جو میرے بعد ہونگے جو شخص ان کے دروازوں پر آکر ان سے جھوٹ کو سچ کہے گا اور ان کے ظلم میں ان کی اعانت کریگا اس کا مجھ سے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور وہ حوض (کوثر) پر نہ آسکے گا۔ اور جو ان کے دروازوں کے قریب آئے یا نہ آئے لیکن نہ تو اس نے انکے جھوٹ کی تصدیق کی اور نہ ہی ظلم پر انکا مددگار رہا وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے وابستہ ہوں، ایسا شخص میرے حوض (کوثر) آسکے گا۔ اے کعب بن عجرہ نماز (مومن کے ایمان کی) دلیل و حجت ہے اور روزہ مضبوط ڈھال ہے (گناہوں سے) اور صدقہ گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے کہ پانی آگ کو۔ اے کعب بن عجرہ کوئی گوشت ایسا نہیں جو حرام مال سے پرورش پاتا ہو مگر یہ کہ جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں اور میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے اس کے متعلق پوچھا وہ بھی اسے عبید اللہ بن موسی کی روایت کے علاوہ نہیں جانتے اور اسے بہت غریب کہتے ہیں امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ ہم سے اس حدیث کی روایت ابن نمیر نے کی ہے اور وہ عبید اللہ بن موسیٰ سے غالب کے حوالے سے روایت کرتے ہیں۔

﴿تشریح﴾

لفظِ علی جارّہ ہے یا پھر یاء متکلم کے ساتھ بتشدید الیاء: (قولہ ولا یرد علی الحوض) حدیث میں لفظ علیّ یٰ متکلم کے بغیر علی جارہ بھی ہوسکتا ہے تو لفظ حوض مجرور ہوگا اور یٰ متکلم کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے تو لفظ حوض منصوب ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اوّل وہلہ میں میرے حوض پر نہ آئیگا۔

شرحِ حدیث میں دو اقوال: (لیس منی) کا معنی یہ ہے کہ اس شخص نے میرے افعال کے مشابہ اور میری امتیوں والے افعال نہ کئے تو گویا کہ وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ شخص میری جماعت میں سے نہیں ہے کیونکہ اس نے وہ کام کیا ہے جو میری جماعت والے نہیں کرتے۔ (والصلاۃ برھان) یعنی نماز، نمازی کے ایمان ویقین پر دلیل ہوتی ہے۔

(والصوم جنۃ حصینۃ) یعنی یہ شخص اپنی دنیا میں پیاس اور بھوک کر گرمی برداشت کرتا ہے تو اس طرح جہنم کی آگ کی گرمی سے یہ روزہ اسے بچالیتا ہے (تو اسطرح روزہ بطور ڈھال کے ہوا)۔

باب منه

باب اسی نماز کے فضائل سے متعلق

☆حدثنا موسی بن عبد الرحمٰن الکِندِیُّ الکوفیُّ حَدَّثَنَا زیدُ بن الحُبَابِ اخبرنا معاویۃ بن صالحٍ حدثنی سُلَیم بن عامرٍ قال: سمعت ابا اُمَامَۃَ یقول: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَخْطُبُ فی

حَـجَّةِ الوَدَاعِ فقال: اتَّقُو اللّٰهَ رَبَّكُمْ وصَلُّوا خَمْسَكُمْ ، وصُومُوا شَهْرَكُم، وأَدُّوا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ، وأَطِيعُوا ذَا أَمْرِكُمْ، تَـدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ۔ قال: فقلتُ لابی امامۃ مُنْذُ كَمْ سَمِعْتَ من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم هذا الحديث؟ قال : سمعته وانا ابنُ ثلاثين سنةً۔قال ابو عيسى: هذا حديث حسنٌ صحيحٌ۔

﴿ترجمہ﴾

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے پروردگار اللہ رب العزت سے ڈرو! پانچ نمازیں پڑھو! رمضان کے روزے رکھو! اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو! اپنے (حکمرانوں) کا حکم مانو! اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ! راوی کہتے ہیں میں نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ نے یہ حدیث کب سنی؟ انہوں نے فرمایا میں اس وقت تیس سال کا تھا جب میں نے یہ حدیث سنی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

﴿تشریح﴾

تقویٰ کی حکم کی وجہ تخصیص: (فقال اتقوا الله ربكم) اللہ تعالیٰ کا تقویٰ تمام اشیاء کی جڑ ہے کیونکہ اس تقویٰ کے اختیار کرنے کے عموم میں یہ بھی داخل ہیکہ تمام احکامات الٰہیہ پر عمل کیا جائے اور تمام گناہوں سے بچا جائے لیکن حدیث شریف میں بعض احکام کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے انکی عظمتِ شان اور انکے مہتم بالشان ہونے کیوجہ سے۔ گویا کہ یہ احکام گزشتہ جملے میں داخل ہی نہیں اسی لئے ان کو صراحۃً ذکر کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔

حج کے حکم کے ذکر نہ کرنے کی وجہ: حدیث میں حج کو ذکر نہیں کیا گیا اس وجہ سے نہیں کہ حج فرض نہیں ہوا تھا یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ خطبہ حجۃ الوداع میں دیا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان احکام کے مخاطب ابھی حج سے فارغ ہوئے تھے تو اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ اپنے رب کے گھر کا حج کرو تو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ آئندہ سال انکو دوبارہ حج کرنے کا حکم دیا جارہا ہے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے حکم کو بیان نہیں فرمایا کیونکہ دوسرے مواقع پر اس کی فرضیت بیان فرما چکے تھے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ حج ہر ایک پر فرض نہیں بخلاف ان مذکورہ بالا احکامات کے کہ یہ ہر ایک پر ضروری ہیں۔

غرضِ صحابیؓ: (قلت: منذ كم سمعت ؟قال سمعت وانا ابن ثلاثين) یعنی جس وقت میں نے یہ حدیث سنی تھی اس وقت میں بچہ نہیں تھا کہ میری بات پر اعتماد نہ کیا جاسکتا ہو یا میرے بارے میں یہ گمان ہو کہ میں حدیث کو نہیں سمجھا یا مجھے صحیح طرح یاد نہ رہی ہو (بلکہ میں اس وقت تیس سال کی عمر کا تھا)۔

وهذا آخر ابواب الصلوٰة ويليه الجزء الثاني واوّله ابواب الزكوٰة